صحابۂ کرامؓ کا عہدِ زریں

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ
محدث، فقیہ، مؤرخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

صحابۂ کرامؓ کا عہدِ زریں

ترتیب:

سید الملۃ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ

محدث، فقیہ، مؤرخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

ناظم جمعیۃ علماء ہند

رحمان پلازہ مچھلی منڈی اردو بازار، لاہور فون: 042-37361339

E-Mail: jamiatbooks@gmail.com

Sahaba Keram Ka Ahde Zareen
By
Maulana Momammad Mian
ISBN: 969-8793-01-1

ضابطہ

نام کتاب	صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم کا عہدِ زریں
مصنف	مولانا سیّد محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ
اشاعتِ اوّل	اشاعت اوّل ستمبر ۱۹۹۸ء
اشاعت چہارم	(جدید ایڈیشن) ستمبر ۲۰۱۲ء
ناشر	محمد ریاض درانی
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پریس، لاہور
قیمت	-/600 روپے
بہ اہتمام	محمد بلال درانی
قانونی مشیر	سید طارق ہمدانی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

انتباہ

فہرست

عرضِ ناشر

حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت اپنی مذہبی، تاریخی، سیاسی اور ملی خدمات کے حوالے سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ نصف صدی کے عرصے میں آپ نے تن تنہا جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں ایک انجمن اور ایک تحریک کے افراد کامل کر بھی ان خدمات کو انجام دینا مشکل نظر آتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کو گوناگوں خصوصیات سے نوازا تھا۔ ایک ہی وقت میں آپ مفتی بھی تھے، فقیہ بھی تھے، محدث بھی تھے، مؤرخ بھی تھے، مفکر بھی تھے، مبصر بھی تھے، دینی رہنما بھی تھے، سیاسی لیڈر بھی تھے۔ لکھنا پڑھنا آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، آپ کے قلم حقیقت رقم سے چھوٹی بڑی تقریباً سو کتابیں نکلیں جن میں بعض مدارس کے نصاب میں داخل ہوئیں۔ بعض کو مراجع کی حیثیت حاصل ہوئی۔ کچھ نے شہرت دوام پائی۔

آپ کو ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ عشق کے درجے کا تعلق تھا اس لیے سب سے زیادہ آپ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر لکھا اور اس اچھوتے انداز سے لکھا کہ قلم توڑ کر رکھ دیا۔ سیرتِ مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عہد زریں، تاریخ اسلام، اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ آپ کی انتہائی قیمتی کتابوں کو ان کے شایانِ شان طبع کر کے عوام الناس تک پہنچایا جائے۔ اس ضرورت کے تحت اللہ تعالیٰ کی توفیق و مدد سے جمعیت پبلی کیشنز نے مکتبہ محمودیہ کی رفاقت وشراکت میں اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کتاب "صحابہ کرام کا عہد زریں" جو مولانا ممدوح کی ممتاز ترین کتابوں میں سے ہے۔ عمدہ کمپیوٹرائزڈ کتابت وطباعت کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ پہلے یہ کتاب لیتھو پر دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اب اسے ایک جلد میں آفسٹ طباعت کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ نیز پہلے اس میں حواشی ہر صفحہ پر نیچے دیے گئے تھے جو بسا اوقات طویل ہونے کے سبب تسلسل مطالعہ پر اثر انداز ہوتے تھے۔ موجودہ طباعت میں تمام حواشی کو یکجا کر کے ترتیب وتدوین کے جدید طریقوں کے مطابق کتاب کے آخر میں دے دیا گیا ہے تاکہ مضمون کی سلاست بھی باقی رہے اور عام قاری کو اخذ مطالب میں سہولت بھی رہے۔ اسی طرح عربی عبارات کی تصحیح پر بھی زور دیا گیا ہے اور حتی الوسع اغلاط کو درست کر کے عبارات پر اعراب لگا دیے گئے ہیں تاکہ پڑھنے میں آسانی رہے۔

قارئین کا تعاون اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد شامل حال رہی تو انشاء اللہ مولانا مرحوم کی ترتیب وار تمام کتب کی اشاعت عمل میں لائی جائے گی۔

وما توفیقی الا باللہ

محمد ریاض درانی
یکم محرم ۱۴۱۹ ہجری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سببِ تالیف۔ مقصد اور منشاء

☆ صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) واجب الاحترام کیوں ہیں؟

☆ یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد ''جماعت صحابہ کائنات عالم کی آنکھ کا تارا ہے'' محض ایک عقیدہ ہے یا حقیقت۔

☆ جماعت صحابہ کا ظہور تاریخ کا ایک اتفاقی واقعہ تھا یا ایک ایسا منصوبہ تھا جس کو مشیت الٰہی اور ارادہ خداوندی نے ازل سے طے کر رکھا تھا۔ انبیاء علیہم السلام اس جماعت کے لیے دُعائیں کرتے رہے تھے اور کتب سابقہ بشارتیں دیتی رہی تھیں۔

☆ کلام الٰہی نے ان کے کیا فضائل ومناقب بیان کیے اور ان کے کارناموں کو کس طرح سراہا۔

☆ وہ غیر معمولی کارنامے کیا ہیں جو انسانیت کی پوری تاریخ میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ جن کی بنا پر ان کا احترام نہ صرف اخلاقی فریضہ بلکہ شرافت وانسانیت کا ایک تقاضہ بن چکا ہے۔

☆ خلافت، خلافت راشدہ، خلافت راشدہ کے مراتب۔ تاریخ اسلام میں خلافت راشدہ اور خلفاء راشدین کی اہمیت۔ قرآن وحدیث سے اس اہمیت کے دلائل اور شواہد۔

موجودہ دور میں جب کہ ایک بہت بڑا فتنہ یہ بھی ہے کہ

احترام صحابہ رضی اللہ عنہم کے عقیدہ کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ کہیں معاذ اللہ تکفیر کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور کہیں تنقید کو جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ ضرورت ہے اور بہت سخت ضرورت ہے کہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور تاریخی شواہد کی روشنی میں مذکورہ بالا سوالات کے فیصلہ کن جوابات دیے جائیں۔ جو تاریکیاں پھیلائی جا رہی ہیں ان کے پردے چاک کیے جائیں۔ یہ سلسلہ جس کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے۔ اسی غرض سے اسی منشاء اور مقصد کی تکمیل کے لیے جاری کیا جا رہا ہے۔

واللہ الموفق وھو المستعان

خوش نصیبی

اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت اور اپنی خوش نصیبی پر ہم جتنا ناز کریں کم ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے مشہور محدث وفیلسوف سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ المحدث الدہلوی (قدس سرہ العزیز) تقریباً دوسو برس پہلے اس ضرورت کو پورا کر چکے ہیں اور اس فرض کو نہایت خوبی اور اعلیٰ قابلیت سے انجام دے چکے ہیں۔ آپ نے اپنی مشہور تصنیف ''ازالۃ الخلفاء عن خلافۃ الخلفاء'' میں انہیں مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے اور سوالات مذکورہ کے فاضلانہ جوابات بہترین قابلیت اور نہایت سلیقہ سے اس انداز سے دیے ہیں کہ پھر کسی انصاف پسند کو شک و ارتیاب کی گنجائش نہیں رہتی اور اطمینان قلب کی دولت میسر آ جاتی ہے۔

مگر حضرت شاہ صاحب کے زمانہ میں ہندوستان کی علمی زبان فارسی اور مذہبی زبان عربی تھی۔ یہ کتاب انہی دو زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ کیونکہ قرآن پاک کی آیات اور احادیث جن کا مجموعہ پوری کتاب کے ایک ثلث سے کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ ان کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ کہیں کہیں ان کا مفہوم عربی آمیز فارسی میں بیان کر دیا گیا ہے۔

نصف صدی سے زیادہ مدت گزری کہ امام اہل سنت حضرت الحاج مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا جو بڑی تقطیع کی (غالبًا) آٹھ جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ اب اگرچہ پاکستان میں ایک ترجمہ شائع کیا گیا ہے مگر وہ کچھ اس طرح کا ہے کہ اس سے استفادہ ممکن نہیں ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب جب انگریزی دور میں بسلسلہ تحریک آزادی زیر حراست تھے تو آپ نے اس کتاب کی خدمت کو اپنے مشاغل میں داخل کر لیا تھا۔ (۱) عربی اور فارسی کے بجائے اس کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ (۲) انداز تحریر ایسا اختیار کیا کہ عام فہم بھی ہو اور دلچسپ بھی ہو، جو مولانا کی ایک خصوصیت مانی جاتی ہے۔ (۳) اس کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے کہ کوئی مضمون چھوٹنے نہ پائے اور مفہوم پورا ادا ہو جائے۔ ترتیب ابواب میں ایسی تبدیلی کر دی کہ پوری کتاب دور حاضر کے علمی نفسیات اور فکری تقاضوں کے بموجب ایک نئی کتاب بن گئی۔ (۴) موضوع سے تعلق رکھنے والے مضامین جن کو حضرت شاہ صاحب نے قرۃ العینین وغیرہ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے یا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے (حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ) نے ''منصب امامت'' میں ان کو واضح کیا ہے ان کا اضافہ کر دیا۔ (۵) ابتداء میں ایک مقدمہ کا اضافہ کیا ہے۔ پھر جگہ جگہ حاشیہ میں قابل قدر تشریحات بڑھا دی ہیں جن کی وجہ سے موجودہ دور کے علمی مذاق کے بموجب بھی کتاب کی جامعیت مکمل ہوگئی ہے۔

مولانا محمد میاں صاحبؒ اسارت وحراست سے رہائی کے بعد عام سیاسی زندگی کی مصروفیتوں اور جماعتی

خدمات سے جو وقت بچا سکے وہ علماء ہند کا شاندار ماضی اور علماء حق وغیرہ اور بے شمار مضامین و مقالات کی ترتیب میں صرف ہوا اور اس کا موقع نہ مل سکا کہ ازالۃ الخلفاء کی ترتیب جدید اور ترجمہ کے مسودوں پر نظر ثانی کر سکیں۔

متفرق قسم کی جماعتی خدمات اور متعدد اسلامی اداروں کی اعزازی ذمہ داریوں نے اگرچہ دامان فرصت کو اب بھی بہت تنگ اور حد سے زیادہ محدود کر رکھا ہے لیکن ترجمہ ازالۃ الخلفاء و ترتیب جدید کی یہ خدمت ایسی نہیں ہے جس کے (معاذ اللہ) رائیگاں ہو جانے پر کوئی بھی علم دوست صبر کر سکے جبکہ مولانا کی تشریحات اور آپ کے جدید اضافوں نے اس کتاب کو بفضلہٖ تعالیٰ اس موضوع کا دائرۃ المعارف اور انسائیکلوپیڈیا بنا دیا ہے۔

چنانچہ بنام خدا کتابستان نے طے کر لیا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس بیش بہا علمی ذخیرے کو زیور طبع سے آراستہ کر کے منصۂ شہود پر جلوہ گر کیا جائے تا کہ علم دوست حضرات محظوظ اور مستفید ہوں۔ اُردو ادب کے ذخیرہ میں ایک بلند پایہ علمی اضافہ ہو اور ہماری جماعتی اور ذاتی لائبریریاں جو حضرت شاہ صاحب کی اس مایہ ناز تصنیف سے محروم ہیں، اس ''دائرۃ المعارف'' سے آراستہ ہو کر اس کمی کو پورا کر سکیں۔

اضافہ اور توسیع

سیّدنا حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ کی مذکورہ بالا تصانیف کا موضوع ''خلافت راشدہ، امامت اُمت اور خلفاء راشدین'' ہے لیکن مولانا محمد میاں صاحب نے ان تصانیف کی ترتیب جدید اور تشریح کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھا کہ یہ دائرہ ''حضرت خلفاء راشدین'' (رضی اللہ عنہم) تک محدود نہ رہے بلکہ

① حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت اور ان کا وہ دور مسعود جو پہلی صدی کے آخر تک پھیلا ہوا ہے اس کا موضوع قرار دیا جائے۔

② جماعت صحابہ کا پہلا دور جس کو سیّد الانبیاء خاتم المرسلین رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت باسعادت کا شرف حاصل تھا۔ سیرت مقدسہ کے دامنوں سے وابستہ ہے۔ لہٰذا سیرت مقدسہ کے ضروری ابواب بھی جماعت صحابہ اس تاریخ مکمل میں شامل کیے جائیں۔

پس یہ سلسلہ تصنیف جس کا عنوان ''عہد زریں اور مثالی حکومتیں'' ہے۔ صرف ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' نہیں ہوگا بلکہ یہ ازالۃ الخفاء عن جماعۃ الصحابہ ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اسی ترتیب جدید کے بموجب یہ پہلی جلد ہے جو آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لله الذی بعث الینا اشرف الرسل داعیا الی اقوم السبل وجعل اصحابا له وزراء فی عهده وخلفاء ه من بعده لتتم النعمة وتعم الرحمة واشهد ان لا اله الا الله وحده واشهد ان محمدا عبده ونبیه الذی لا نبی بعده صلی الله علیه وعلی اله وصحبه اجمعین۔

کائنات کی آنکھ کا تارا

انبیاء علیہم السلام کے بعد جماعت صحابہ اس پوری کائنات کی آنکھ کا تارا ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ الفاظ کہیں نہیں لکھے۔ مگر ان کی مشہور و معروف تصنیف ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' کا حاصل یہی ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد جماعت صحابہ کائنات میں سب سے افضل ہے اور حضرات خلفاء اس افضل جماعت میں سب سے افضل ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک سلسلہ سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے قائم کیا ہے اور فضائل و مناقب صحابہ کا رابطہ اس سلسلہ سے جوڑا ہے۔ اس حقیر وفقیر کا خیال ہے کہ یہ سلسلہ سیدنا حضرت آدم علیہ السلام بلکہ ابتداء کائنات یعنی روز ازل سے جڑ سکتا ہے۔ سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو اتنا ضروری یا اتنا واضح نہیں سمجھا۔ اس لیے نظر انداز فرما دیا ہے۔ احقر کا خیال یہ ہے کہ اس غیر ضروری کو بھی یہاں ضروری سمجھا جائے تا کہ مطالعہ مکمل ہو جائے۔ بیشک منطقی استدلال کے لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ مگر اضافہ معلومات اور تکمیل مطالعہ کے لحاظ سے غیر ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا ہم قصہ ازل سے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

والله الموفق وهو المعین

سلسلۂ کائنات میں جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کی حیثیت

سب سے پہلے قصہ ازل ملاحظہ فرمائیے۔ جب وہ عہد ہوا تھا جس کا نام عہد الست ہے کلام اللہ شریف کے الفاظ یہ ہیں۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی (سورہ اعراف ع ۲۳ پ ۸)

مفہوم:

رحمت عالم محمد ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہورہا ہے کہ:

''ایک وقت یہ تھا کہ جب تمہارے پروردگار نے اولاد آدم کی پشتوں سے وہ تمام ذریت برآمد کی تھی جو قیامت تک وجود میں آنے والی ہے اور خود ان کو خود ان کی فطرت کو خود ان کے حق میں شاہد اور گواہ گردانتے ہوئے دریافت فرمایا تھا۔

الست بربکم ''کیا میں تمہارا پروردگار (رب) نہیں ہوں''۔

سب نے جواب دیا تھا۔ضرور (آپ ہمارے پروردگار ہیں) ہم شاہد ہیں ہمیں اس کا اعتراف ہے (۱)

(خلاصہ آیت)

آج ہمیں یہ اعتراف اور یہ اقرار یاد نہیں جیسے وہ سبق یاد نہیں جو ہم نے اپنے پہلے استاد سے پہلی مرتبہ پڑھا تھا۔مگر بسم اللہ اور الف، با کا پہلا سبق پتھر کی لکیر بن چکا ہے جو ذہن کی تختی پر کندہ ہے، وہ کسی وقت بھی محو نہیں ہوتا۔اسی طرح یہ اعتراف واقرار بھی لوح فطرت پر کندہ ہے۔البتہ اس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب فطرت مادیات کے تمام رشتوں سے منقطع ہوکر اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے اور کبر ونخوت خود بینی اور خودنمائی کا غبار ہلکا ہوتا ہے اس وقت اعتراف واقرار ربوبیت کی فطری لکیریں چمکنے لگتی ہیں۔قرآن حکیم کی ایک آیت سے اس کی مثال ملاحظہ فرمایئے:

سمندر میں سفر کرنے والے جب گرداب بلا میں گرفتار ہوجائیں، ہوائے تند کے جھونکے نمودار ہوں اور ہر طرف سے سمندر کی موجیں حملہ کرنے لگیں اور یہ مسافر خیال کرنے لگیں کہ بس اب ہم گھر گئے اور اب بچنے کی کوئی امید نہیں اس وقت سویا ہوا وجدان دفعۃً چونکتا ہے، اس وقت انہیں خدا کے سوا کوئی ہستی یاد نہیں آتی، وہ پورے اخلاص کے ساتھ خدا کے سامنے گڑگڑاتے ہیں:

''اگر اس مصیبت سے نجات مل گئی تو وہ ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔'' (سورہ یونس ع ۲ ج)

سوال یہ ہے کہ اس مضطرب فطرت کو جو اس وقت خدا یاد آیا یہ کون سا نقش ہے جو اس وقت نکھر رہا ہے جب مادیات کے تمام سہارے ٹوٹ چکے ہیں اور خود بینی اور خودنمائی کے بادل چھٹ چکے ہیں۔بلاشبہ یہ عہد الست کا وہی نقش ہے جو ازل میں کندہ ہوا تھا۔

ایک دوسرا معاہدہ:

ابھی قصہ ازل پورا نہیں ہوا سنیئے:

ایک اور معاہدہ بھی اسی وقت ہوا تھا۔یہ معاہدہ خاص ان ارواح سے ہوا تھا جن کو نبوت اور رسالت کی دولت ملنے والی تھی۔قرآن حکیم میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اس کی یاددہانی بھی

کرائی گئی ہے، ارشاد ہے:

''وہ وقت بھی یاد رہنا چاہیے جب اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے عہد لیا تھا کہ جو کتاب اور جو علم و حکمت تم کو عطا ہوئی ہے اگر ایسا ہو کہ کوئی رسول مبعوث ہو جو اس کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے خزانہ علم و ایمان میں ہے تو تمہارا فرض ہوگا کہ تم اس کی تصدیق کرو اس پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو۔ اس وقت ان سب انبیاء علیہم السلام نے کہا تھا ہم نے اقرار کیا۔'' (سورہ آل عمران ع ۸)

انبیاء علیہم السلام کے اس اقرار و اعتراف کی تائید و توثیق کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

''تم گواہ رہو اور (دیکھو) تمہارے ساتھ میں خود بھی اس پر گواہ ہوں۔'' (سورہ آل عمران ع ۸ ج ۲)

یہ قصہ ازل تھا جہاں پہلے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا عہد لیا گیا پھر انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا عہد انبیاء علیہم السلام سے لیا گیا۔ یا سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب کے مسلک کے بموجب یہ اقرار بھی جملہ بنی آدم سے لیا گیا۔ (۲)

ورودِ آدم علیہ السلام:

روز ازل کے ان معاہدوں کے بعد وہ وقت آیا کہ آدم علیہ السلام کو دنیا میں نازل کیا گیا اور ذریتہ آدم جو پہلے عالم مثال میں تھی اب عالم شہود میں آنے لگی۔

اولادِ آدم علیہ السلام میں مدارِ فضیلت:

یہاں قتل ہابیل اور طوفان نوح علیہ السلام کے قصے خارج از بحث ہیں۔ ہمارے موضوع سے متعلق یہ بات ہے کہ جس طرح سیدنا آدم علیہ السلام کو سجدہ ملائک کا قبلہ بنا کر ان کی فضیلت ملائک پر ثابت کی گئی (جو لامحالہ پوری کائنات میں سب سے افضل ہیں) اسی طرح اولادِ آدم میں سب سے زیادہ واجب التعظیم وہ قرار دیا گیا جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ یعنی سب سے زیادہ اس عہد کا پابند اور اس میثاق کا احترام کرنے والا ہو جو اس نے ازل میں اپنے رب اور خالق سے کیا تھا۔

تقویٰ کی عملی شکل اور اس کی ارتقائی منزلیں:

عہد الست کی پابندی کس طرح ہو۔ کیا فقط یاد رکھنا پابندی ہے؟ کیا زبان سے اقرار کر لینا پابندی ہے؟ کیا کچھ حقیقتیں ہیں ان کو تسلیم کر لینا پابندی ہے؟ کیا کچھ احکام ہیں ان کی تعمیل کرنا پابندی ہے؟ پابندی کا مطلب کیا ہے؟ جواب کسی قدر تفصیل طلب ہے، ملاحظہ فرمائیے:

انسان پیدا ہوا تو مادر زاد برہنہ تھا، کھانے پینے، رہنے سہنے، اپنے آپ کو محفوظ رکھنے، دشمن کو شکست دینے اور پچھاڑنے کے طریقوں سے ناواقف تھا۔ بے شک اس کو ایک عقل عطا ہوئی اسی عقل کی شمع لے کر اس نے ترقی کے راستہ میں قدم بڑھانا شروع کیا۔ لیکن اس کی منزل کہاں ہے؟ وہ کہاں جائے؟ کس سمت میں قدم

بڑھائے؟ اس کو منھ چلانا آتا ہے، وہ چبانا اور چبا کر نگلنا بھی جانتا ہے، مگر وہ کیا کھائے اور کس طرح کھائے اور کھانے کا سامان کیسے مہیا کرے، اس کو کیسے محفوظ رکھے۔ ہر ایک قدم پر کچھ ایسے جھونکے آئے کہ عقل کی شمع بجھ گئی۔ ہاں عقل کے علاوہ ایک قلب بھی انسان کو عطا ہوا تھا۔ وہ عقل سے روشنی نہیں لیتا بلکہ خود اس پر ایک روشنی کبھی کبھی چمکا کرتی ہے اور یہ اس وقت چمکتی ہے جب عقل کا چراغ گل ہو جاتا ہے یا ایسا ماند پڑ جاتا ہے کہ اس کا نور بے نور ہو جاتا ہے اس کو آپ موجد کا ذہنی تصور کہہ سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس ذہنی تصور کی تخلیق کون کرتا ہے عقل درماندہ اور فکر نارسا اس کی تخلیق کر سکتی ہے؟ یا کوئی اور ہے جو عقل سے بھی بالا ہے؟ وہ کیا ہے اس سے اس وقت بحث نہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ انسان نے ترقی کے راستوں میں قدم رکھنا شروع کیا تو عقل کے سوا یہ ذہنی تصور جو نور بن کر اس کے قلب پر چمکتا رہا۔ وہ ہی انسان کا رہنما تھا۔ اس طرح اس نے عقل اور اس ذہنی نور کی مدد سے تمدن کی بہت سی منزلیں طے کر لیں۔

مگر سوال یہ رہا کہ تمدن کی جو منزلیں یہ طے کر رہا ہے کیا ان کے متعلق اس رب کے کچھ احکام ہیں جس سے اس نے ازل میں عہد کیا تھا؟ اور جیسے جیسے تمدن بڑھ رہا ہے جیسے جیسے مادیات میں ارتقاء کی منزلیں طے ہو رہی ہیں کیا اس رب کے تصور میں بھی فرق آ رہا ہے۔ اگر استعداد انسانی کی ترقی کے ساتھ رب کے تصور میں بھی فرق آ رہا ہے تو اس فرق میں غلط اور صحیح کا امتیاز کرنے والی چیز کیا ہے کونسی کسوٹی ہے جو کھرے اور کھوٹے کو جدا کر سکے، وہ رب کیا ہے؟ وہ ازلی اور ابدی یعنی فلسفی اصطلاح میں وہ قدیم ہے یا حادث اور فانی۔ جب انسان نے زمانہ اور قدیم اور حادث کے معنے سمجھے ہوں گے تو اس زمانہ کے اہل علم کے سامنے یہ سوال بھی آیا ہوگا۔ وہ کہاں ہے۔ کس طرح ہے۔ جب انسان نے ظرف اور مکان کی حقیقت پر تحقیقی نظر ڈالی ہوگی تو یہ سوال بھی سامنے آیا ہو گا۔ وہ مادہ ہے یا مادہ سے بالا۔ جب سالہا سال بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں برس کے بعد ترقی پذیر انسان کے سامنے مادہ کی کچھ حقیقت منکشف ہوئی ہوگی تب یہ سوال سامنے آیا ہوگا۔

عقل درماندہ کی حد تو مشاہدہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ مشاہدات اور محسوسات سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اسی میں جوڑ توڑ کر کے وہ نتیجہ اخذ کرتی ہے۔ پھر اس کو تجربہ کی کسوٹی پر کستی ہے اسی سے تھیوریاں اور سائنسی نظریات مرتب ہوتے ہیں۔

''رب'' جب مشاہدہ اور احساس سے بالا ہے تو اس کے متعلق نہ کوئی وثوق اور قابل اعتماد تھیوری قائم ہو سکتی ہے اور نہ کوئی قابل اطمینان نظریہ (عقیدہ) قائم ہو سکتا ہے جو کچھ ہوگا وہ محض ظن، تخمین اور قیاس ہوگا جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور بہت زیادہ امکان اس کا ہے کہ غلط ہو۔ کیونکہ اس کا مدار اس غور و فکر پر ہے جو خود اپنے بارے میں نارسا ہے۔ جو خود اپنے آپ کو نہیں معلوم کر سکا کہ وہ کیا ہے۔ اس کی یہ کیا ہمت کہ وہ رب اور خالق کے بارے میں اپنے بل بوتے پر کوئی حقیقی اور صحیح فیصلہ کر سکے۔

بیسویں صدی عیسوی کا یہ دور بہت تیز رفتار ہے، سائنسی ایجادات نے ہر چیز میں تیزی پیدا کر دی ہے تب

بھی کسی تھیوری کے قائم ہونے اور اس کے متعلق غلط یا صحیح فیصلہ صادر کرنے میں عمریں گذر جاتی ہیں اور بسا اوقات صدیاں گذر جاتی ہیں۔

زمین اور آسمان سے زیادہ آشکار کونسی چیز ہوسکتی ہے جو ہر وقت ہمارے سامنے ہے۔ مگر دنیا ہزاروں برس تک اس نیلے گنبد کو آسمان سمجھتی رہی اور ہزاروں برس کے بعد اس کو یقین ہوا کہ جو کچھ اس کے سامنے ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ فریب نظر ہے۔ اس سے بڑھ کر فریب کیا ہوسکتا ہے کہ وہ خلا کو جسم اور جسم بھی گنبد جیسا جسم سمجھتا رہا۔ مشاہدہ کی شکستہ پائی اور لاچارگی کا یہ تماشہ کس قدر عبرت آموز ہے کہ وہ اس کے بارے میں آج تک صحیح فیصلہ نہیں کرسکا جو ہر وقت اس کے سامنے ہے اور جب بھی نظر اوپر اٹھتی ہے وہ بے حجابانہ جلوہ گر ہوتا ہے۔

زمین اس کے قدموں کے نیچے ہے۔ مگر سینکڑوں نسلیں یہی تصور کرتی رہیں کہ یہ چپٹی ہے اور آج بھی اس کا گول ہونا دلائل ہی سے ثابت کیا جاتا ہے۔ شاید ہوائی جہازوں اور راکٹوں کی ایجاد کے بعد زمین گول ہونے کا مشاہدہ ہوسکے مگر اس کا مشاہدہ پھر بھی مشکل ہوگا کہ گھومنے والا کون ہے۔ آسمان یا زمین۔

آج اگرچہ یہی یقین کیا جاتا ہے کہ زمین گھومتی ہے مگر مشاہدہ اس کا بھی نہیں ہوسکا۔ جس طرح دنیا کے مدعیان عقل ہزاروں برس یہ یقین کرتے رہے کہ آسمان گھومتا ہے وہ اپنے اس یقین کی بنا پر نہ صرف طرح طرح کے نظریات قائم کرتے رہے بلکہ ان کو صحیح مان کر جوتش، نجوم، رمل وغیرہ کے بہت سے فنون ایجاد کرتے رہے جن پر آج بھی بہت سے مدعیان علم کو ناز ہے، کس طرح یقین کیا جاسکتا ہے کہ زمین گھومنے کا موجودہ یقین بھی اسی طرح پادر ہوا نہیں ہوگا۔ یہ تمام نظریات اور ان کی یہ شکست وریخت اور ترمیم واصلاح مادیات کے سلسلہ میں ہے جن سے انسان کے موجودہ تمدن کا آب وگل تیار ہوا ہے اور جن سے موجودہ زندگی کا تعلق ہے۔ لیکن انسان اسی زندگی کے آخری سانس پر ختم نہیں ہوجاتا۔ وہ بعد الموت بھی کچھ رہتا ہے، کیا رہتا ہے، کس طرح رہتا ہے، کس طرح رہے گا، اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ بہت ہی پیچیدہ اور تشویش انگیز سوالات ہیں۔ ایسے عام کہ ہر ایک متنفس سے ان کا تعلق ہے۔ ایسے ضروری جیسے موجودہ زندگی کے لیے غذا کا مسئلہ ضروری ہے۔

اس سنگلاخ میدان میں عقل انسانی کے گھوڑے کس طرح دوڑے۔ اس کی عجلت پسندی اور خود بینی نے کتنے فیصلے غلط کیے۔ پھر اس کی برخود غلط طبیعت نے ان فیصلوں کو کیا رنگ دیا۔ ان کو تسلیم کرانے میں کس طرح بار بار قیامت سے پہلے کشت وخون کی قیامت برپا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ نے بار بار انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے جن کے قلوب پر وحی الٰہی کا نور چمکا اور اس نے خارستان بحث ومباحثہ میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو روشنی بخشی اور نہ صرف روحانی مسائل بلکہ بسا اوقات تمدن کے نازک مسئلوں کو بھی حل کیا۔ پھر کس طرح عجلت پسند، خود بین اور برخود غلط انسان کے غلط ماحول کی تاریکیاں اس پر چھا گئیں۔ جن کے نتیجہ میں طوفان نوح اور بربادی عاد وثمود جیسے حادثوں سے نسل انسانی کو دوچار ہونا پڑا۔ اس کی تاریخ بہت طویل ہے۔ اس کے لیے ایک ''الف لیلیٰ''، نہیں بلکہ ہزاروں ''الف لیلیٰ'' درکار ہیں۔ یہاں ان کا دہرانا دور از کار بھی ہے اور ناممکن بھی۔

اس وقت اس طویل تمہید کا حاصل یہ ہے کہ اگر چہ دین اور دنیا، روح اور مادہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ لیکن ان متضاد اور جداگانہ حقیقتوں کے درمیان انسان جس کی تخلیق کو خالق دو جہان نے احسن تقویم فرمایا ہے۔ ایسا اعجوبہ ہے کہ اگر وہ ایک میں ترقی کرتا ہے تو لامحالہ اس کا اثر دوسرے پر بھی پڑتا ہے۔ جیسے جیسے تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے انسان آگے بڑھتا رہا۔ ایسے ایسے مادیات کے سلسلہ میں نئے نئے سوالات اس کے سامنے آتے رہے۔ مثلاً زمانہ کیا ہے، ظرف اور مکان کی کیا حقیقت ہے، حرکت کی ماہیت کیا ہے، مادہ کیا ہے؟ خود انسان کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جیسے جیسے مادیات کے سلسلہ میں یہ سوالات سامنے آتے رہے۔ یہ سوالات ان حقیقتوں کے سلسلہ میں بھی آتے رہے جن کا تعلق روح یا عالم بالا یا بعد الموت سے ہے کہ وہ مادی ہیں یا مادہ سے بالا۔ زمانہ سے ان کا تعلق کیا ہے ان کو ابدی کہا جائے یا حادث، وہ کسی ظرف کے مظروف ہیں یا ظرف سے آزاد، پھر وہ رب جس کا اقرار رگ جان سے وابستہ ہے اس کے متعلق بھی یہ سوالات سامنے آئے کہ وہ جسم ہے، اس کے لیے کوئی مکان ہے، برسوں اور سالوں کی گنتی طول وعرض کی پیمائش اس کو بھی گھیرے ہوئے ہے یا وہ ان سب سے بالا قدیم لازوال اور لامکان ہے۔ حرکت اور سکون کے عوارض سے بلند تر ہے۔ اس پر کوئی حاوی نہیں ہے۔ وہ ہر ایک پر حاوی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

پھر جب انسان نے ایک معاشرہ اور سوسائٹی قائم کر کے اس کے طول وعرض میں نظری اور فکری سیاحت شروع کی تو یہ سوالات ابھرے کہ کوئی نظام قائم کیا جائے یا نہیں۔ قائم کیا جائے تو کس طرح؟ کس قسم کا؟ دولت افراد کی ملک ہو یا جماعت کی۔ افراد کی ملک ہو تو اس کے متعلق مالک کے فرائض کیا ہوں؟

پس جس طرح مادیات کے سلسلہ میں یہ سوالات پیدا ہوئے۔ ان کو حل کیا گیا۔ وہ حل صرف عقل نے کیا۔ یا عقل نے اس نور کی مدد سے کیا جو گاہے گاہے قلب پر چمکتا ہے۔ وہ قلب کسی ماہر فن موجد کا قلب تھا۔ یا بعض اوقات کسی ایسے مقدس اور پاکباز کے قلب نے مدد کی جس کو مذہبی اصطلاحات میں ''نبی'' کہتے ہیں۔ بہر حال اس وقت اس سے بحث نہیں کہ کس طرح حل کیا گیا۔ مقصد یہ ہے کہ جب یہ سوالات حل کیے گئے تو جس طرح انسان کے لیے عمل کا میدان وسیع ہوا۔ اس کی ذمہ داریوں کا سلسلہ بھی دراز ہوتا رہا۔

آپ یقین فرمایئے کہ بعینہٖ یہی صورت روحانیات کے بارے میں بھی ہوئی کہ جیسے جیسے سوالات پیدا ہوئے ان کے جوابات سامنے آئے تو احکام الٰہی کا دائرہ بھی وسیع ہوتا رہا اور ساتھ ساتھ تقوے کا دامن بھی پھیلتا رہا۔ دولت کے متعلق جب تک کوئی سوال انسانی سوسائٹی اور معاشرہ میں نہیں پیدا ہوا تھا کیونکہ انسان دولت کی بنیادیں دریافت نہیں کر سکا تھا تو اس وقت تک دولت کے متعلق رب ذوالجلال کے یہی کچھ احکام نہیں تھے اس وقت تک دولت سے تقوے کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن جب دولت کے وجود پر اس کی کثرت نے بہت سے سوالات پیدا کر دیئے۔ لوگوں کے نفع نقصان کے ڈانڈے دولت سے جڑ گئے۔ تو ہر سوال کے جواب میں رب ذوالجلال کا کوئی حکم بھی ظہور پذیر ہو گیا اور اب تقوے کا مطلب یہ ہو گیا کہ دیگر عبادتوں کی طرح اس کی بھی

پابندی کی جائے۔

اب تک متقی وہ تھا جو ہر وقت یاد خدا میں مصروف رہے۔ لیکن دولت کے متعلق جب احکام ربانی صدور فرما ہوگئے تو اب یہ عابد وزاہد اگر متقی کا درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوگیا کہ وہ ان احکام کی بھی پوری تعمیل کرے جو دولت سے متعلق ہیں۔

اب اس تمہید کا حاصل یہ ہوا کہ جس طرح کسی بھی دور میں ترقی یافتہ مہذب اور متمدن اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اس دور کے تہذیبی اور تمدنی قدروں کو پہچانتا ہو اور ان کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔ اسی طرح کوئی بھی دور ہو اس دور کا متقی اس عابد وزاہد کو کہا جائے گا جو زہد اور عبادت گذاری کے ساتھ ساتھ اس دور کے تقاضوں کو پہچانتا ہو اور ان تقاضوں کے لحاظ سے جو خداوندی احکام ہوں ان کی پوری پابندی کرتا ہو۔ اس موقع پر قرآن پاک کی یہ آیت بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا

''اللہ کے بندوں میں صرف علماء ہی ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور خشیہ رکھتے ہیں۔''

یہ انحصار بظاہر اسی وجہ سے ہے کہ عالم کہلانے کا مستحق وہی صاحب بصیرت ہے جو اپنے دور اور اپنے ماحول کے تقاضوں کو پہچانتا ہو اور اتنی بصیرت رکھتا ہو کہ ان تقاضوں کے بموجب احکام الٰہی کا استنباط کرسکے اور ان پر عمل پیرا ہوسکے۔ (۳)

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

بیشک یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب تک انسانی معاشرہ کا تمدن نامکمل رہا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت تک تقویٰ بھی نامکمل ورنہ کم از کم اس کی اصولی تعلیم ہی نامکمل رہی اور اس بنا پر اہل تقویٰ کا درجہ بھی کم رہا تو ہمیں اس میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اس کا جواب اثبات میں دیں۔ اگر آپ کتاب اللہ سے اس کی تائید چاہتے ہیں تو یہ ملاحظہ فرمایئے کہ تکمیل دین کی وہ مشہور آیت جس پر امت اسلامیہ کو ناز ہے یعنی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ (آج میں نے مکمل کردیا تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کردی تم پر اپنی نعمت) یہ آیت کہاں ہے؟ آپ اس آیت سے اگلی پچھلی آیتیں بلکہ سورہ مائدہ کا یہ پہلا رکوع جس میں تکمیل دین کی یہ آیت ہے پورا پڑھ لیجیے۔ مزید برآں اگلا رکوع بھی پڑھ لیجیے۔ آپ ان دونوں رکوع میں وہ ہی احکام پائیں گے جن کا تعلق تہذیب وتمدن اور سماجی زندگی کی ضرورتوں سے ہے۔ مثلاً قول کی پابندی، شعائر الٰہیہ کا احترام، تعاون اور امداد باہمی، کھانے پینے کی حرام اور حلال چیزیں، ذبیحہ، مردار، شکاری جانوروں کی تعلیم و تربیت اور ان کے شکار کردہ جانور کے احکام اہل کتاب سے نکاح اور ان کے یہاں کا پکا ہوا کھانا، پاکی، صفائی، عدل وانصاف وغیرہ۔ بظاہر یعنی عام خیالات کے لحاظ سے تکمیل دین کی یہ آیت اس موقع پر بے جوڑ ہے۔ اس کو

ایسی جگہ آنا چاہیے تھا جہاں رکوع، سجود، نماز، ذکر وفکر اور مراقبہ کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن اگر تہذیب وتمدن اور تقویٰ کے باہمی رابطہ پر نظر کی جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ آیت برمحل ہے بلکہ ایسی موزوں ہے کہ اس سے زیادہ کسی اور سیاق میں موزوں نہیں ہوسکتی۔

ایک اور سوال بھی یہاں پیدا ہوتا ہے کہ کیا تکمیل دین کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمدن سے متعلق تمام سوالات سامنے آچکے ہوں۔؟

ہم اس کا جواب بھی اثبات میں دیں گے اور ہر وہ شخص ہماری تائید کرے گا جو تہذیب وتمدن کے بنیادی سوالات پر غور کرتے ہوئے دو ہزار سال کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ پر نظر ڈالے۔ تہذیب وتمدن، اخلاق و معاشرت اور سماجی زندگی سے متعلق جو سوالات آج ہمارے سامنے ہیں کیا دو ہزار سال پہلے کی تاریخ سے ان کا رشتہ جوڑنے میں کوئی بھی تردد ہوسکتا ہے؟

یورپ کے مہذب ماہرین آج بھی ان نشانات پر ناز کرتے ہیں جو تہذیب یونان کے عروج کے زمانہ کے ان کو کہیں سے مل جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرونِ وسطیٰ کا جرم یہی ہے کہ اس نے ان نشانات کو مٹایا۔ صرف مسلمانوں کا طفیل ہے کہ تہذیب یونان کے علمی آثار ونشانات ان کی جدوجہد کے نتیجہ میں ان کی عربی تصانیف کے واسطہ سے آج کے یورپ کو نظر آرہے ہیں۔

صرف الٰہیات اور اخلاقیات ہی نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی مسائل بھی جو آج دنیا کی فضا پر چھائے ہوئے ہیں اپنی طویل تاریخ رکھتے ہیں اور ماہرین سائنس بھی اگر انصاف سے کام لیں تو موجودہ ایجادات کو انہیں نظریات کا تجربہ اور مشاہدہ قرار دیں گے جن کی بنیادیں بہت قدیم ہیں۔

معاہدہ انبیاء علیہم السلام کی حکمت:

یورپ میں جس دور کو قرونِ وسطیٰ کہا جاتا ہے اگر اس کا قصور اور جرم یہ ہے کہ اس نے ان علوم وفنون اور اس تہذیب وتمدن کی حفاظت نہیں کی جو یونان کے ماہرین اور دانش مندوں کا اندوختہ اور ان کا فراہم کردہ سرمایہ تھا تو اس سے اس معاہدہ کا ایک عظیم الشان مقصد بھی واضح ہوجاتا ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام سے ازل میں لیا گیا تھا کہ ہر ایک نبی دوسرے کی تصدیق وتائید کرے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ تردید اور مخالفت کا اکھاڑہ قائم کر دے۔ بے شک انبیاء علیہم السلام کے اس عہد و پیمان کی بنیاد یہ ہے کہ دین ایک ہے۔ (۴) دین کی بنیادی حقیقتیں لازوال ہیں۔ لہٰذا اس دین کے رہبروں اور رہنماؤں کے اصول بھی واحد اور متحد ہوں گے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام تعمیر عالم کے معمار ہیں۔ آنے والے معمار اگر ان بنیادوں کو اکھیڑنے لگیں جو پہلے معمار رکھ گئے تھے تو عمارت کبھی بھی مکمل نہیں ہوسکتی۔

کوئی عمارت اگر متعدد معماروں کے سپرد ہو جو یکے بعد دیگرے آنے والے ہیں تو عمارت کی تکمیل کے

لیے یہ شرط ہوگی کہ آنے والے معمار پہلی بنیادوں کو مضبوط کرتے رہیں اور آگے بڑھتے رہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ اس تعمیر میں ایک اینٹ (باریک ردہ) کی کمی رہ گئی تھی جس کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی کما قال صلی اللہ علیہ وسلم۔

(بعثت لاتمم مکارم الاخلاق)

''میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کردوں''

بلاشبہ امت محمدیہ (علی رسولہا الصلوٰۃ والسلام) کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ اللہ کا دین مکمل ہو چکا لیکن مکمل اسی لیے ہوسکا کہ ہر آنے والے نبی نے پہلی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ انبیاء سابق کی بنیادی تعلیمات کو برحق سمجھا۔ پھر تعمیر کی دوسری اینٹ استوار کی۔

نتیجہ:

جب کمال دین اور تکمیل تقویٰ کے لیے ضروری ہوا کہ انسان کی استعداد وصلاحیت اس درجہ ترقی پا جائے کہ نہ صرف روحانیات والٰہیات بلکہ عمرانیات معاشیات اقتصادیات وسیاست سے متعلق بھی جملہ بنیادی سوالات سامنے آ چکے ہوں تو ظاہر ہے جب تک ترقی اور عروج کا یہ درجہ نہیں آئے گا تقویٰ بھی انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر اپنے دامن نہیں پھیلا سکے گا اس لیے تقویٰ نامکمل رہے گا۔

تقویٰ کا یہ پھیلاؤ اس دور میں ہوا جس کو ہم تکمیل دین کا دور کہتے ہیں۔ اب جس طرح تکمیل دین کے دور میں یہ گنجائش نہیں رہی کہ کسی سابق دین پر قناعت کر لی جائے اور مکمل کو نظرانداز کر دیا جائے (معاذ اللہ) اسی طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ متقی کامل جن کی نظیر دنیا کی تاریخ سابق میں نہیں مل سکتی وہی ہوں گے جو اس تقویٰ کامل کے حامل اور عالم اور تربیت یافتہ ہوں۔

یہ کون ہیں؟ یہ صرف وہ ہیں جن کو ''صحابہ کرام'' کہا جاتا ہے۔ رضی اللہ عنہم۔ ہوسکتا ہے کہ پہلے لوگوں کے مجاہدے اور ان کی ریاضتیں زیادہ ہوں۔ لیکن نویں دسویں جماعت کا طالب علم کتنی ہی محنت کر لے جب تک وہ اس جماعت میں ہے اس کو یونیورسٹی کی آخری سند نہیں مل سکتی۔ دست درازی وہیں کارآمد ہے جہاں قدرت نے بھی دست و بازو کو درازی بخشی ہو۔

بیشک عقلاً ممکن تھا کہ تکمیل دین کے دوسرے اور تیسرے یا بعد کے قرن اور دور کے عابد و زاہد افضل ہو جائیں۔ بیشک کمال دین کے نقطہ نظر سے یہ ممکن تھا اور اس کے امکان کی پیش گوئی بھی لسان نبوت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے فرمادی جب حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

جو یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں ان تک پہونچا دیں جو یہاں حاضر نہیں ہو سکے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو کوئی بات پہنچائی جائے وہ اس بات کو اس سے زیادہ سمجھتا ہے اور اس

سے زیادہ اس پر غور وفکر کرتا ہے جو پہونچا رہا ہے۔

لیکن اخلاص، ایثار، قربانی اور صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ جیسے محامد اور محاسن کی بنا پر جو فضیلت مجموعی لحاظ سے صحابہ کرام کو حاصل تھی وہ کسی دوسرے دور کو نصیب نہ ہوسکی۔ بس اب یہ کہنا درست ہوگیا کہ جماعت صحابہ ''کائنات عالم کی آنکھ کا تارا ہے''۔

جماعت انبیاء علیہم السلام

یہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اس سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ بحث ان سے ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے آراستہ ہوکر جلوہ افروز عالم ہوئے۔ انبیاء علیہم السلام طالب اور مرید نہیں ہیں بلکہ وہ معلم اور مرشد ہیں۔

کتاب اللہ کے انداز پر نظر فرمایئے صحابہ کرام کو خطاب کر کے ارشاد ہو رہا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ، كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطاً

یہاں صحابہ کے متعلق یہ اعلان ہے کہ وہ خیر اُمت، اُمت وسط اور افضل ترین جماعت ہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ بحث آفتاب و ماہتاب سے نہیں۔ بحث ان جواہر ریزوں سے ہے جو آفتاب و ماہتاب کی کرنوں سے روشن ہورہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

سیدنا حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام اور امت مسلمہ کی بنیاد

ابتداء یعنی عہد الست کا قصہ آپ نے پڑھا۔ پھر اس کی انتہاء یعنی تکمیل دین اور تکملہ تقویٰ کا بھی کچھ تذکرہ آپ کے مطالعہ سے گذرا بیچ کا دور باقی رہ گیا۔ کچھ سرگذشت اس دور کی بھی ملاحظہ فرمایئے۔

سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا قافلہ تغیر وانقلاب کے طوفانوں کو جھیلنے، بقاء اور تنازع للبقاء کے معرکوں کو سر کرنے اور مادی اور روحانی ترقیات کے میدانوں کو طے کرنے کے بعد جب اس منزل پر پہونچا جہاں سے وہ صراط مستقیم شروع ہوتا تھا جس کی انتہا الیوم اکملت لکم دینکم (یعنی انسانی صلاحیتوں کے سب سے اعلیٰ مقام اور روحانیت وللّٰہیت کے بلند ترین ''موقف'') پر ہونے والی تھی۔ تو خالق ارض وسماء رب العالمین عز اسمہ وجل مجدہ نے اس برگزیدہ اور صاحب العزم رسول کو مبعوث فرمایا جس کو دنیا ابراہیم علیہ السلام کے نام سے پہچانتی ہے جس نے خلیل اللہ کا لقب حاصل کیا اور جس کے ماننے والوں کو مسلم (۵) کا خطاب دیا گیا ہے۔

ماحول:

اس وقت کا ماحول یہ تھا کہ شرک وکفر اور پرستش غیر اللہ کی تاریکیوں نے فہم وفراست کے چراغ گل کر رکھے تھے۔ انسانی ذہن عجائبات عالم کی رنگینیوں میں گم تھے۔ نگارستان عالم کی چمک دمک نے چشم بصیرت کو

خیرہ کر رکھا تھا۔ غور وفکر کی جولانیاں محسوسات کی چار دیواری میں بند عقل کی بلند پروازیاں ادراک ماوراء سے نا آشنا اور حریم معرفت سے کوسوں دور تھیں۔

چشم ظاہر بیں کے دائرہ نظر میں سب سے عجیب آفتاب تھا۔ عقل ظاہر پرست اسی کے سامنے سرنگوں ہوگئی اور ھذا ربی ھذا اکبر (۶) کا اعتراف صبح وشام کرنے لگی۔ عجائب پرست ذہن ودماغ ماہتاب کی کشمکش سے بھی مسحور ہوئے۔ اور ربوبیت کا ایک حصہ اس کے لیے بھی تسلیم کر لیا گیا۔

ان ارباب باطل اور فرضی معبودوں کے آستانوں تک رسائی ممکن نہ تھی تو ان کے نام کے ہیکل اور مندر زمین پر بنالیے گئے تھے اور ان کی چوکھٹوں پر پیشانیاں رگڑ کر مصنوعی نیازمندی اور بندگی کے جذبات کو سکون دیا جانے لگا تھا۔

تلاش اور جستجو:

لیکن خانوادہ آزر کا وہ در یتیم جس کو قدرت نے حقیقت کی نقاب کشائی کے لیے پیدا کیا تھا جو باطل کی ظلمتوں میں حق کو اجاگر کرنے کے لے منتخب کیا گیا تھا۔ اس نے ایک ہی نظر میں چاند کے متعلق فیصلہ کر دیا:

اِنِّیْ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ

''جو اس قدر جلد طلوع وغروب کے تغیرات سے متاثر ہو جاتا ہو، جو آفتاب کی ایک شعاع کے سامنے اپنی ساری تابانی اور درخشانی ختم کر دیتا ہو ہرگز اس قابل نہیں کہ انسان کی شریف اور بلند فطرت اس سے عبودیت اور بندگی کا تعلق پسند کر سکے۔''

آفتاب پر نظر ڈالی تو ایک خیال آیا ''ھذا ربی'' ''یہ میرا رب ہے اور ذہن نے اس کی ایک دلیل بھی گھڑ دی ''ھذا اکبر'' ''یہ بہت بڑا ہے یعنی جب اس کو یہ ظاہری عظمت حاصل ہے تو ربوبیت اور معبودیت کی عظمت بھی اسی کا حصہ ہے۔ لیکن جب خود اس کو ایک معینہ پروگرام میں جکڑ بند دیکھا اور اس کی تمام عظمت وکبریائی جو افق مشرق سے انـــا لا غیـــری کا اعلان کرتے ہوئے بڑے طمطراق سے نمودار ہوئی تھی مغرب کی گھاٹیوں میں حسرت اور زردی کے ساتھ روپوش ہونے لگی تو اس نوجوان ''ابن آزر'' کی طبیعت اس سے بھی ہٹ گئی اور تب اس کا فیصلہ یہ ہوا کہ لامحالہ کوئی ہے جس نے ان تمام ہستیوں کو وجود بخشا جس نے وہ مضبوط نظام قائم کیا جس میں ان چمکدار ہستیوں کا صدر اعظم اور ان روشن تاروں کی بے شمار فوج کا بادشاہ بھی ایک معمولی قیدی کی طرح پابہ زنجیر ہے۔

لَا الشَّمْسُ یَنْبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ

(سورہ یٰسین)

''نہ آفتاب کے لیے ممکن ہے کہ وہ چاند کو پکڑے۔ نہ رات کے لیے ممکن ہے کہ وہ دن

سے آگے بڑھ جائے (شمسی سنہ کی کسی تاریخ پر کسی افق کے لحاظ سے آفتاب کے طلوع و غروب اور دن ورات کی آمدورفت کا جو وقت جو منٹ مقرر ہے ہزاروں سال گذر گئے ان میں کوئی فرق نہیں آیا) حالانکہ یہ سب ایک ہی فضا میں جس کا نام فلک (۷) ہے تیر رہے ہیں۔''

چنانچہ اس کی فطرت سلیم نے بلا جھجک اعلان کر دیا:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (سورہ انعام ع ۹)

''میں نے ان سب سے ہٹ کر اپنا رخ اس کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے میں اسی کا ہو رہا اور میں ان میں بھی نہیں ہوں جو کسی کو اس کا شریک مانتے ہیں۔''(۸)

نیز اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (سورہ انعام ع ۹)

''میں ان سب سے بے تعلق ہوں جن کو تم شریک گردانتے ہو''

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورہ ممتحنہ ع ۱)

''ہم تم سے بھی بے تعلق ہیں اور ان سے بھی جن کی تم خدا کے سوا عبادت کرتے ہو۔''

توحید کا یہ کھلا ہوا اعلان اور معبودان باطل سے بیزاری کا اظہار ان کو کب برداشت ہو سکتا تھا جن کے ذہنوں اور دماغوں میں کواکب پرستی رچی ہوئی تھی جنہوں نے چاند سورج زحل مریخ اور ثریا کے ناموں پر مندروں کی بلند عمارتیں کھڑی کر رکھی تھیں چنانچہ حق کے مقابلہ میں باطل کی رگ حمیت پھڑکی اور باطل پرستوں کے لاتعداد ہجوم نے اس ایک بندہ خدا کے مقابلہ میں متحدہ محاذ قائم کر لیا۔

طعن وتشنیع، سب وشتم، زدوکوب، مقاطعہ اور سوشل بائیکاٹ کی کون سی مصیبت ہوگی جس سے اس سخت جان خدا پرست کو آزمایا نہ گیا ہوگا۔ لیکن جب صداءِ حق ہر ایک مصیبت اور آزمائش کے بعد پہلے سے زیادہ کرخت ہو کر نکلتی رہی تو آخری فیصلہ یہ کیا گیا:

''اگر کچھ کرنا ہے تو اس کو جلا ڈالو اور اس طرح اپنے معبودوں کی مدد کرو۔''

لیکن دست قدرت نے جس کو ایک ابدی اور لازوال مقصد کے لیے پیدا کیا تھا کس کی مجال تھی کہ اس کا بال بیکا کر سکے، رب ابراہیم نے حکم فرمایا:''

یٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ

''اے آگ ابراہیم کے لیے سراسر ٹھنڈک اور سلامتی بن جا۔''

اس طرح داعئ حق کے برخلاف جو منصوبے بھی باندھے گئے سب ناکام اور نامراد رہے اور ہر ایک تدبیر کو

شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ [۹]

ادھر سے دعوت حق و پیغام صداقت اور اس طرف سے تردید و تصادم، انتہا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پوری قوم سے مایوس ہو کر ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ [۱۰]

غریب الوطنی کے دور میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر بھی تشریف لے گئے۔ شاہ مصر جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم [۱۱] وطن تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی رفیقہ حیات حضرت سارہ کے تقدس اور اعلی اخلاق سے یہاں تک متاثر ہوا کہ خاندان شاہی کی معزز خاتون ہاجرہ [۱۲] کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دیا کہ آپ کی باندی بن کر رہنا ملکہ بن کر رہنے سے بہتر ہے [۱۳]

حضرت ابراہیم علیہ السلام مقدس زندگی کے تقریباً نوے سال پورے کر چکے ہیں۔ شباب اور کہولت کے خوشگوار دور عرصہ ہوا ختم ہو چکے ہیں۔ بڑھاپے کا دور ہے۔ بڑھاپا بھی ایسا کہ کم از کم حضرت سارہ تو اولاد کے تصور کو بھی مضحکہ انگیز سمجھنے لگی ہیں [۱۴] لیکن ابھی جس کو ترک زن و فرزند کی سب سے اونچی مثال پیش کرنی تھی جس کو لخت جگر اور نور نظر کی بے نظیر قربانی دے کر ''خلت اور فدا کارانہ دوستی'' کے مراتب طے کرنے تھے اور جس کو ''امت قانت'' کا ابدی خطاب ملنے والا تھا وہ اولاد سے کب محروم ہو سکتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دعا مانگی تھی:

رب ھب لی من الصّالِحِین (سورہ والصافات ع ۳)

''اے رب بخش دے مجھ کو کوئی نیک بیٹا''

اب وقت آیا کہ اس کی قبولیت کا ظہور ہو۔ سیدنا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اس دعا کا پہلا نتیجہ تھے [۱۵] یہ فرزند سعید شیر خواری کے چند ماہ پورے کرنے پایا تھا کہ خلیل اللہ لقب پانے والے کی دوستی کے امتحان کا وقت آ گیا۔

الہام ربانی اور اشارہ غیبی کی تعمیل کے لیے بے آب و گیاہ لق و دق سنگلاخ میں جہاں مونس و غمخوار تو درکنار کسی آدم زاد کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ اپنے اکلوتے فرزند چہیتے نور نظر اور وفادار رفیقہ حیات کو چھوڑ آنا خلت اور دوستی کا پہلا امتحان تھا۔ جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خندہ پیشانی سے انجام دیا کھجوروں کی ایک تھیلی اور پانی کا ایک مشکیزہ حضرت ہاجرہ کے حوالہ کیا۔ اور ماں بیٹے کو اس وادی غیر زرع میں جس کا مکہ نام ہونے والا تھا چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ البتہ اس قادر ذوالجلال کی بارگاہ میں جس کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا ایک درخواست پیش کر دی:

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (سورہ ابراہیم)

''اے ہمارے پروردگار! میں نے بسائی ہے اپنی کچھ اولاد ایسے بیابان میں جہاں کھیتی کا

نام ونشان نہیں ہے تیرے معزز گھر کے پاس۔اے ہمارے رب تا کہ یہ قائم رکھیں نماز۔
پس تو (اپنے فضل وکرم سے) ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اوران
کے لیے زمین کی پیداوار سے سامان رزق مہیا کر دے تا کہ وہ تیرے شکر گذار ہوں۔''

امام الحدیث محمد بن اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ نے اس درخواست کی ہیئت بھی بیان کر دی کہ ان کلمات کو ادا کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دونوں ہاتھ اٹھائے (۱۶)

اس تپتے ہوئے صحرا میں جہاں آفتاب کی کرنیں ہر ایک سنگریزہ کو انگارہ بنا دیتی ہوں۔ جہاں نہ کوئی سائبان ہو، نہ کوئی سایہ دار درخت۔ایک شیر خوار معصوم بچہ اوراس کی تنہا ماں صرف ایک اللہ کے سہارہ پر ہیں۔ اسی کی رحمت کا سایہ ہے اوراسی کے فضل وکرم کی امید زندگی کا سرمایہ ہے۔وہ مادی ساز وسامان یعنی کھجوروں کی تھیلی اور پانی کا مشکیزہ جوان کے حوالہ کیا گیا ہر ایک مادی چیز کی طرح چندروز میں ختم ہو گیا۔بھوک اور پیاس نے اس کی جگہ لے لی۔ پیاس کی وجہ سے معصوم بچہ لب دم ہو گیا تو شفقت مادری نے حضرت ہاجرہ کو ادھر ادھر دوڑنے پر مجبور کیا۔ چند قدم پر دو پہاڑیاں تھیں جن کو بعد میں صفا اور مروہ کہا گیا۔بھوکی اور پیاسی ماں چل نہیں سکتی تھی مگر بچہ کی جاں بلب صورت نے اس کو بے چین کر دیا بچہ کو گود میں لینے کی طاقت نہیں تھی۔اس کو زمین پر چھوڑا اور پانی کی جستجو میں سامنے کی پہاڑی پر چڑھ گئی،سب طرف نظر دوڑائی،مگر پہاڑوں کے کالے اور سرخ پتھروں یا ریت کے میدان کے سوا کچھ نظر نہ آیا،آہستہ آہستہ اتری،لیکن نشیب میں پہونچی تو بچہ نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔وہ دوڑی اور دوسری پہاڑی پر چڑھ گئی۔ پہلے بچہ پر نظر ڈالی کہ وہ اپنی جگہ خیریت سے ہے پھر پانی کے لیے نگاہ دوڑائی۔مگر وہی پہاڑ تھے وہی پتھر اور وہی ریت اور بالو۔ پانی کا کہیں بھی نام ونشان نہ تھا۔اسی اضطراب اور بے چینی میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر بار بار چڑھی اور اتری اور جب نشیب میں پہونچ کر بچہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو دوڑی۔ دفعتہً رحمت حق کو حرکت ہوئی۔ایک بہتا ہوا چشمہ بچہ کے پیروں میں تھا۔ پہاڑی کی بلندی سے ماں نے قدرت کا یہ کرشمہ دیکھا تو بے ساختہ دوڑی۔ بچہ کو پانی پلایا۔خود سیراب ہوئی۔کوئی برتن موجود نہ تھا جس میں پانی بھر لیتی تو چشمہ کے گرداگرد مٹی کی ڈول باندھنے لگی کہ پانی ختم اور ضائع نہ ہو۔ (۱۷)

یہ چشمہ رحمت جو حضرت ہاجرہ اور ان کے جگر پارہ کے صبر وامتحان کا انعام تھا۔ چشمہ زمزم تھا۔اس اضطراب اور بے چینی میں حضرت ہاجرہ نے تو یقیناً نہ گنا ہوگا کہ کتنی مرتبہ پہاڑی پر چڑھیں اور کتنی مرتبہ نشیب میں دوڑیں۔مگر جس کے ہاں انسان کی ہر ایک حرکت اوراس کا ہر ایک سکون،ہر ایک فعل اور ہر ایک قول لکھا جاتا ہے وہ حضرت ہاجرہ کے قدم گن رہا تھا۔ان کے چڑھنے اور اترنے کو گن رہا تھا اور نشیب میں دوڑنے کی تعداد بھی قلم بند کر رہا تھا۔اس کے برگزیدہ انبیاء علیہم السلام نے بتا دیا کہ حضرت ہاجرہ نے چشمہ دیکھا تو وہ سات مرتبہ نشیب میں دوڑ چکی تھیں۔

زمزم یوں تو پانی کا چشمہ ہے مگر قدرت نے اس پانی کو یہ خصوصیت بخشی ہے کہ کچھ کھانے کو نہ ملے تو یہ پانی

ہی غذا کا کام دیتا ہے۔

حضرت ہاجرہ اب بھی تنہا تھیں۔ تہی دست تھیں۔ مگر وہ بہت بڑی دولت مند ہوگئی تھیں کیونکہ ان کے پاس ایک چشمہ تھا جو ارض حجاز کی سب سے بڑی دولت ہے۔

پانی کو دیکھ کر پرندوں نے اس طرف کا رخ کیا اور پانی کے گرد منڈلانے لگے۔ بنو جرہم جو اس طرف کہیں قریب ہی تھے پرندوں کو دیکھ کر پانی کی تلاش میں اس طرف آ پہونچے جہاں ایک چشمہ کے کنارہ صرف ایک عورت بچہ کو لیے بیٹھی تھی۔ بنو جرہم کو پانی کی تلاش تھی اور حضرت ہاجرہ کو مونس کی جستجو، بنو جرہم نے قیام کی اجازت چاہی۔ حضرت ہاجرہ نے اجازت دیدی۔ مگر یہ شرط لگادی کہ چشمہ کی مالک وہ رہیں گی۔ یہ مکہ کی آبادی کا سنگ بنیاد تھا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کتنے عرصے کے بعد دوبارہ تشریف لائے۔ البتہ عقل وقیاس کا یہ فیصلہ ضروری ہے کہ وہ رفیقہ حیات کی خبر گیری اور لخت جگر کی دیدہ بوسی کے لیے گاہے گاہے تشریف لاتے رہے ہوں گے۔ (جیسا کہ بخاری شریف کی روایت سے ثابت ہوتا ہے جس سے یہ تمام بیان ماخوذ ہے)

ذبح اسمٰعیل (علیہ السلام)

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شیر خواری کا دور طے کر کے چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے ہیں، والد ماجد تشریف لاتے ہیں تو ان کے ساتھ رہتے ہیں، ادھر ادھر جاتے ہیں۔ ابھی حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت نہیں ہوئی۔ لہٰذا آپ اپنے باپ کے اکلوتے (۱۸) فرزند ہیں جو تقریباً نوے سال کی عمر میں نصیب ہوا۔ یکا یک منصب خلت کے ایک اہم امتحان کا وقت آجاتا ہے۔ یعنی رویاء صادق میں اشارہ ہوتا ہے کہ پارہ جگر کو راہ خدا میں ذبح کردو۔ پہلے روز خواب کی صداقت میں کچھ تردد رہتا ہے تو دوسرے روز اور پھر تیسرے روز یہی خواب دیکھتے ہیں تو قلب مبارک یقین واذعان سے روشن ہو جاتا ہے اور تعمیل حکم کا عزم کر لیتے ہیں۔ لیکن فرزند ارجمند سے بھی مشورہ کرتے ہیں تاکہ باپ کی تسلیم ورضا میں فرزند سعید بھی برابر کے حصہ دار ہو جائیں۔

برگزیدہ باپ کی طرح یہ نونہال نبوت بھی سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ خلیل اللہ اور ابن خلیل اللہ کی تسلیم ورضا بارگاہ رب العزت میں شرف قبولیت حاصل کر لیتی ہے اور رب العرش العظیم کا سلام ابد الآباد تک ان دونوں کا طرہ امتیاز بن جاتا ہے۔

رب العالمین کا ازلی اور ابدی کلام حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کے اس بے نظیر ایثار وقربانی کی شہادت ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَابُنَيَّ إِنِّيْ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (صافات)

''پس جب یہ فرزند جس کی بشارت دی گئی تھی اس قابل ہو گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بیٹا میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں پس تم سوچ سمجھ لو، تمہاری رائے کیا ہے (حضرت اسمعیل علیہ السلام نے) کہا ابا جان جس بات کا آپ کو حکم کیا جا رہا ہے اس کو کر ڈالیے۔ آپ مجھے انشاء اللہ صابر پائیں گے۔ پس جب باپ بیٹے دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور (ایسا ہوا کہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کو) پیشانی کے بل پچھاڑ دیا (یہ عجیب وغریب سماں تھا۔ اس کا بیان کرنا مشکل ہے بہر حال جیسے ہی باپ بیٹے سے ایثار و فدائیت کا یہ مظاہرہ سامنے آیا) ہم نے پکارا اے ابراہیم! بیشک تم نے خواب کو سچا کر دکھایا (جذبہ اخلاص و فدائیت کی عملی تصدیق پیش کر دی) بیشک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بیشک یہ ہے کھلی ہوئی آزمائش اور ایک واضح امتحان اس کے فدیہ میں دیا ہم نے ذبح کے لیے ایک بڑا جانور اور باقی رکھا بعد کی آنے والی تمام نسلوں میں اس کا ذکر خیر سلام حضرت ابراہیم پر۔''

زن و فرزند کی یہ قربانی کیوں؟

یہ کیا بات ہوئی، معصوم بچے اور اس کی ماں کو لے جاؤ اور اس بے آب و گیاہ جلتی ہوئی اور تپتی ہوئی وادی میں چھوڑ آؤ۔

کیا معاذ اللہ یہ نافرمان تھے؟ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان سے نفرت تھی؟ کیا حضرت سارہ کی بات کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اتنا پاس و لحاظ تھا کہ اس کی خاطر محبت کے فطری جذبہ کو بھی تج دیا۔

ایک سنگدل سے سنگدل انسان بھی ایک بیوی کی خاطر دوسری کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ بیوی (حضرت جرہا رضی اللہ عنہا مجرم تھی تو معصوم بچے کا کیا قصور تھا جو بڑھاپے میں دعاؤں [19] اور تمناؤں کے بعد اللہ تعالیٰ کی بشارت [20] بن کر پیدا ہوا تھا۔

مگر کبھی آپ نے اس طرف بھی توجہ کی یہ کاشتکار ہر موسم کے آغاز میں کیا کرتا ہے۔ جس بیج کو اس نے سال بھر محفوظ رکھا۔ نمی اور تری، کوڑے، کرکٹ، کیڑے اور مکوڑوں سے اس کی حفاظت کی، ہر طرح احتیاط سے رکھا، اس کو اپنا قیمتی سرمایہ سمجھا، وہ اسی تخم کو لیتا ہے، لق و دق میدان میں پہونچتا ہے اور ایک ایک دانہ کو مٹی میں ملا کر چلا آتا ہے۔

اس سے بڑھ کر ستم ظریفی، جہالت اور نادانی کیا ہوگی کہ وہ اپنا قیمتی سرمایہ خود اپنے ہاتھوں خاک میں ملا رہا ہے۔ آپ کاشتکار کی یہ نادانی دیکھتے ہیں مگر ملامت نہیں کرتے۔ کیونکہ آپ فطرت وقدرت کے اس دستورالعمل کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جس تخم کو زیادہ گہرا دبایا جاتا ہے۔ جس کو زیادہ بے نام ونشان کیا جاتا ہے وہ اتنا ہی مضبوط اور تن آور درخت بن کر نمودار ہوتا ہے۔ اس کی شاخیں دور دور پھیلتی ہیں اور اس کا سایہ دارز ہوتا ہے۔

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاۗءِ

''اس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے اور اس کی شاخ آسمان میں''

کی مثال وہ بن جاتا ہے۔

توریت میں ہے۔ خدا نے ابراھام سے کہا:

''اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے بردمند کردوں گا اور اسے بہت بڑھا دوں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔'' (پیدائش ۱۷، ۲۰)

بے شک یہ ''وادی غیر ذی زرع'' تھی جہاں کھیتی نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر وہ چشمہ جو فوارہ بن کر اُبلتا ہے، جو نہروں اور دریاؤں کا سرچشمہ بنتا ہے، جس سے پورے پورے علاقے شاداب اور بڑے بڑے ملک سرسبز ہوتے ہیں۔ اس کے آس پاس کھیتی کہاں ہوتی ہے۔ اس کے اردگرد پتھروں کی چٹانیں اور سنگ خارا کے تودے ہوتے ہیں۔

سورہ ابراہیم کی جو آیت پہلے گذر چکی ہے۔ اس کے الفاظ پر نظر ڈالیے بیت محرم، معزز گھر، واجب الاحترام مکان جس کے گرداگرد یہ وادی غیر ذی ذرع ہے۔ کسی ایک شخص کے لیے، ایک خاندان، ایک قبیلہ، ایک قوم یا ایک ملک کے لیے نہیں بلکہ تمام عالموں اور نوع انسان کے تمام طبقات کے لیے برکتوں کا مرکز اور ہدایتوں کا سرچشمہ ہونے والا ہے۔ اب کوئی قوم، کوئی ملت چاہیے جو اس کی محافظ ہو، جو اس کی خادم ہو اور خادم بھی ایسی کہ برکتوں کے مان سون یہاں سے جذب کرلے اور تمام عالم انسانیت پر ابر بہاری بن کر برسے۔ ہدایت کی شعاعیں یہاں سے سمیٹے اور عالم بشریت کے تمام آبگینوں کو ان کی عکاسی سے روشن کردے۔

نظر ظاہر بیں وحشت زدہ [۲۱] ہے کہ بوڑھا باپ معصوم بچے کو بے یار و مددگار چھوڑ رہا ہے لیکن کار پردازان مشیت کا اعلان یہ ہے کہ بچہ کو ضائع نہیں کیا جارہا بلکہ اس امت اور اس ملت کا تخم تہ نشین کیا جارہا ہے جس کا نتیجہ، جس کا ثمر خوشگوار وہ طبقہ ہوگا جو اعلیٰ اخلاق، مکمل انسانیت، ہمہ گیر شرافت کا بابرکت نمونہ ہوگا [۲۲]

کسی خاص حلقہ اور گروہ یا کسی جماعت کے لیے نہیں بلکہ اس پوری نوع اور اس پوری جماعت کے لیے جس کو ''الناس'' کہا جاتا ہے جس طبقہ پر دین وایمان کی تکمیل ہوگی اور جو ابدالاباد تک اللہ تعالیٰ کے پیغام حق کا حامل ہوگا۔ لتکونوا شھداء علی الناس

مختصر یہ کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا تھی۔

''اے اللہ ہماری ذریت اور نسل میں ایک ایسی امت پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو'' (سورہ بقرہ ع ۱۶)

یہ جو کچھ ہوا مقبولیت دعا کی تمہید تھی اور عالم انسانیت کے متعلق حضرت جل مجدہ کے ایک عظیم الشان منصوبہ کا اظہار تھا۔

آپ نے دیکھا! یہ امت مسلمہ جس کے مصداق اوّل صحابہ کرام تھے (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اس کی بنیاد کس شان سے رکھی گئی۔ زن وفرزند کی یہ قربانی اس کی خشت اول تھی اور ذبح اسمٰعیل خشت دوم۔ علیہ و علی نبینا الصلو والسلام

بیشک حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی زبان مبارک پر یہ دعا ایک عرصہ کے بعد آئی جب ان دونوں نے بیت اللہ کی تعمیر شروع کی۔ مگر مشیت الٰہی کا فیصلہ اس کے حق میں ایک عرصہ پہلے ہو چکا تھا اور نہ صرف فیصلہ بلکہ قضا وقدر کے مخفی کارخانہ میں اس پر عمل بھی شروع ہو گیا تھا۔

وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

''تم نہ چاہو گے مگر جو چاہے اللہ بیشک اللہ تعالیٰ ہے سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا۔''

بناء بیت اللہ الحرام

(خانہ کعبہ کی بنیاد)

تلاش حق کا جذبہ جو حضرت خلیل اللہ (ابراہیم علیہ السلام) کے قلب مبارک میں موجزن ہوا تھا اس نے آفتاب و ماہتاب جیسے معبودان باطل کی حقیقت بے حقیقت اور ان کی ہیچ در ہیچ ہستی پر نظر ڈال کر یہ فیصلہ تو کر لیا تھا کہ میں نے ان سب سے ہٹ کر اپنا رخ اس کی طرف کر لیا جس نے زمین و آسمان پیدا کیے۔ میں اسی کا ہو رہا۔ کواکب پرستوں اور بندگان اصنام کو خطاب کر کے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ:

''میں تم سے بھی بیزار بے تعلق اور ان معبودان غیر اللہ سے بھی بیزار ہوں جن کی تم پوجا کرتے ہو۔''

لیکن جس ''وحدہ لاشریک لہ'' کی پرستش شروع کی، جس کے لیے زندگی وقف کر دی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جس کے ہو رہے بیشک نظر انسان میں یہ طاقت نہیں کہ اس کی تجلی برداشت کر سکے۔ جب یہ نظر کوتاہ بین قرص آفتاب پر نہیں جم سکتی تو وہ اس پر کس طرح ٹھہر سکتی ہے جو خالق آفتاب ہے۔ جس کا نور بے چون و بے مثال نور آفتاب سے ہزاروں گنا بلکہ بے انتہا گنا زیادہ ہے۔

یہ بھی قطعاً غلط ہے کہ اس کا کوئی پیکر یا مجسمہ بنایا جائے۔ کیونکہ وہ مجسمہ لامحالہ مادی ہوگا اور ذات برحق مادہ سے بہت بلند و بالا، وہ پیکر لامحالہ ایک مثال ہوگا اور وہ ذات بے کیف اور وہ حقیقت بے چون و بے چرا، ہر ایک تمثیل سے منزہ ہے۔ کیونکہ کوئی بھی اس کے مثل نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے نہ کبھی ہوا۔

لیکن کیا اس کی کوئی علامت، کوئی نشانی اس عالم آب وگل میں قائم کی جا سکتی ہے۔ بیشک ہر ایک مخلوق خالق کی علامت ہے۔ گلشن کا ہر ایک پودا باغبان کی خبر دیتا ہے اور ہر ایک غنچہ جب چٹختا ہے تو بانی گلشن کی مدح وثنا کرتا ہے اور بیشک سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نظر حقیقت شناس نے آسمان و زمین کی انہیں علامتوں [۲۳] سے خالق ارض وسما کو پہچانا۔ ایمان و یقین کا درجہ [۲۴] حاصل کیا۔ مگر ہر ایک کو نظر ابراہیم میسر نہیں اور نہ صرف یہ کہ نظر ابراہیم میسر نہیں بلکہ بسا اوقات کور باطنی یہاں تک بڑھ جاتی ہے اور دل و دماغ کی بصیرت یہاں تک مفقود ہو جاتی ہے کہ اہل نظر کے ساتھ وہ کچھ کیا جاتا ہے جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) کے ساتھ کیا گیا۔

پس سوال یہ ہے کہ وہ صاحب فکر سلیم اور وہ صاحب نظر جو خدا واحد کے اعتراف و اقرار تک رسائی حاصل کر چکا ہے اور بندہ عجائبات یا مخلوق پرست نہیں رہا بلکہ خالق پرست بن چکا ہے۔ کیا اس کی توجہات کو مرتکز اور منضبط کرنے کے لیے کوئی ایک مرکز ہونا چاہیے۔ کیا قدرت الٰہی اور مشیت ایزدی نے مادیات کی اس دنیائے پر آشوب میں کوئی ایک نقطہ مقرر کیا ہے جو اس کی توجہات کا مہبط اور اس کی تجلیات کا مطلع ہو۔

یہ فعل غلط سہی کہ فکر نارسا نے چاند اور سورج کو معبود سمجھا اور جب ان تک رسائی نہیں ہوئی تو ان کے نام کے ہیکل اور مندر بنا لیے۔ مگر اس سے فطرت انسانی کا پتہ تو چلتا ہے کہ وہ معبود کا پیکر نہ سہی معبود کا ہیکل اور اس کے نام کا کوئی مرکز، کوئی مقام، کوئی بیت ضرور چاہتی ہے۔

اور یہ جو قرآن شریف میں بار بار ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے فرشتوں سے کہا کہ اس کو سجدہ کرو یا اس کی طرف سجدہ کرو تو کیا اس سے اس سانچہ کا پتہ نہیں چلتا جس میں فطرت انسانی ڈھلی تھی۔ یعنی کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قبلہ کی تلاش اس کی فطرت بن گئی۔

پس دین فطرت کا تقاضا تھا کہ فطرت کے اس روحانی تقاضے کو پورا کرے۔ روایات سے ثابت ہے اور کتاب اللہ کے کلمات اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ تقاضائے فطرت کبھی بھی نظر انداز نہیں ہوا چنانچہ سیدنا حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اتارے گئے تو جس طرح کھانے پینے اور غذا کے فطری تقاضے کو قدرت کے مخفی ہاتھوں نے درختوں کے پھلوں وغیرہ سے پورا کیا۔ اسی طرح فطرت سلیم کے اس روحانی مطالبہ کو بھی پورا کیا گیا اور یہ بیت اللہ جس کو ہم بناء ابراہیم کہتے ہیں اس کی بنیاد سیدنا آدم علیہ السلام [۲۵] ہی نے رکھ دی۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ

''سب سے پہلا گھر جو انسانوں کے لیے مقرر کیا گیا وہ ہے جو بکہ (مکہ) میں ہے۔''

یہ بتانا مشکل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے اس دور معصوم میں جب اینٹ اور چونہ تو کیا پتھروں کے گھڑنے کے آہنی اوزار بھی ایجاد نہیں ہوئے تھے تعمیر بیت اللہ کی نوعیت کیا تھی۔ ظاہر ہے باضابطہ تعمیر نہیں ہوئی ہو گی۔ ناتراشیدہ پتھر اوپر نیچے رکھ کر کسی طرح کی چھت ڈال دی گئی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کسی طرح حد بندی کر دی گئی ہو۔ کیونکہ قبلہ اینٹ پتھر یا دیواروں کا نام نہیں ہے بلکہ قبلہ وہ فضا ہے جو ان دیواروں میں محدود ہے۔ (جو اگرچہ بلندی میں آسمان ہفتم اور عرش و کرسی تک پہونچتی ہے مگر طول و عرض کے لحاظ سے تقریباً سات سو مربع گز ہے)

قرآن پاک کے محتاط الفاظ بھی کچھ اس کی غماضی کرتے ہیں کہ پہلی مرتبہ اس سب سے پہلے بیت کی صرف حد بندی ہوئی ہے باقاعدہ تعمیر نہیں ہوئی۔ کیونکہ قرآن کریم میں وضع فرمایا گیا ہے۔ سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ مقرر کردہ شد اور حضرت شاہ عبدالقادر نے ''ٹھہرا''[۲۶] فرمایا ہے۔ مقرر کرنے اور ٹھہرانے کے لیے تعمیر کی ضرورت نہیں صرف حد بندی کافی ہے وہ کسی طرح بھی ہو۔

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے تو اگرچہ ہمیں فن تاریخ پر بہت ناز ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کی نظر بہت محدود ہے۔ زیادہ سے زیادہ تین ہزار برس ہوئے جب سے فن تاریخ نے قلم سنبھالا ہے کاغذ تب بھی میسر نہیں آیا۔ تین ہزار سال سے پہلے اس کی حقیقت وہ خاندانی روایتیں اور وہ کہانیاں تھیں جو بڑے بوڑھوں کو یاد ہوا کرتی تھیں۔ مگر حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ کی کہانی بھی کسی کو یاد نہیں تھی۔ نتیجہ یہ کہ تاریخ سے اس مسئلہ میں مدد نہیں مل سکتی۔

بہر حال وضع کی عملی شکل کچھ بھی ہو، صرف حد بندی ہوئی ہو یا کسی طرح کی دیواریں بھی بنادی گئی ہوں۔ قرآن شریف اور احادیث کے اشارات[۲۷] یہی ثابت کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ کے بانی اول حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور قبلہ ایک فطری مطالبہ ہے۔ جس کو حضرت آدم علیہ السلام نے اسی وقت پورا کر دیا تھا جب فطرت کے دوسرے مطالبات (غذا وغیرہ) کو پورا کر رہے تھے۔

اس وقت ہمارے سلسلہ کلام سے متعلق یہ بات ہے کہ تمام باطل معبودوں سے کٹ کر اور ہر ایک ہوا پرستی سے ہٹ کر خدا واحد کی طرف جھک جانے والے اور اسی کے ہو رہنے والے ابراہیم علیہ السلام نے اس وادی غیر ذی زرع میں وہ پودا لگایا جس کی شاخوں پر امت مسلمہ کا پھل آنے والا تھا تو اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ان ہیکلوں اور مندروں کے مقابلہ پر جو چاند تاروں یا خیالی اور وہمی دیوتاؤں کے نام پر بنائے گئے ہیں ایک بیت تعمیر کیا جائے۔ جس کی نسبت اس معبود برحق کی جانب ہو جو خالق ارض و سما ہے جو رب العالمین ہے۔ یہی بیت جو اس امت مسلمہ کا مرکز عبادت ہو اور یہی قبلہ توحید ہو۔ جہاں اللہ کا کلمہ بلند ہو، شعائر اللہ کی تعظیم و تکریم ہو، جہاں دنیا بھر کے توحید پرستوں کا اجتماع ہوا کرے۔

اس ''بیت'' کی تعمیر کے لیے اس لق و دق وادی میں کوئی نشیبی یا ہموار خطہ بھی منتخب کیا جا سکتا تھا لیکن سیدنا

ابراہیم علیہ السلام کی نظر دقیقہ رس نے جس رقبہ کو منتخب کیا وہ ایک ٹیلہ تھا (۲۸)۔

یہ عجیب بات تھی کہ آس پاس کے پہاڑوں پر جب بارش برستی تو سیلاب کا پانی نشیب کی تمام چیزوں کو تہ و بالا کر دیتا۔ مگر یہ ٹیلہ اپنی جگہ اسی طرح قائم رہتا جیسا مدت غیر معلوم سے قائم تھا۔ نہ سیلاب کے پانی سے اس کی بنیادیں کٹتی تھیں اور نہ موسلا دھار بارش اس کی بلندی کو پست کرتی تھی۔ (۲۹)

ایک خلجان اور تضاد:

آپ کو ہمارے کلام میں تضاد معلوم ہو رہا ہوگا اور خود ہمیں بھی یہ خلجان ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس فعل کو ان کے غور وفکر کا نتیجہ اور خود ان کا اجتہاد قرار دیں جیسا کہ سطور بالا سے معلوم ہو رہا ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل کو اشارات خداوندی کی تعمیل اور منشاء الٰہی کی تکمیل قرار دیں۔

کلام اللہ کی آیات پر نظر ڈالی جائے تو یہ خلجان اور بڑھ جاتا ہے۔ ایک آیت میں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بیت اللہ کی دیواریں اونچی کر رہے تھے اور دعا کرتے رہتے تھے۔ اے اللہ ہمارے اس فعل کو قبول فرما۔ (۳۰) (سورہ بقرہ ع ۱۵)

ایک دوسری آیت میں ہے:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیت کی جگہ ہم نے مقرر کی اور ہم نے حکم دیا کہ میرے اس بیت کو پاک کر دو۔'' (یا بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب ''پاک رکھو'') (۳۱) (سورہ حج ع ۴)

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام ایک عمل کر رہے ہیں مگر آس اور یاس، بیم اور رجا کی موجیں دلوں میں اضطراب پیدا کیے ہوئے ہیں چنانچہ عمل کے ساتھ ساتھ دعا بھی کرتے جاتے ہیں کہ خداوندا ہمارے اس اقدام کو قبول فرما۔

دوسری آیت کا مفہوم اس کے برخلاف یہ ہے کہ حضرت حق جل مجدہ کا ایک منشاء ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے اس وقت یہ منشاء اس طرح پورا کیا جا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ بتائی گئی اور ان کو حکم دیا گیا کہ اس کو ٹھیک کر کے ہمیشہ پاک صاف رکھو۔

ایک راز کی بات:

اس سے پہلے کہ اس کا جواب دیا جائے ایک راز کی بات سن لیجئے۔ خلق وتکوین کا سلسلہ کچھ اس طرح قائم ہوا ہے کہ ایک بات کو آپ دعاؤں کا نتیجہ بھی کہہ سکتے ہیں اور اسی بات کو آپ رب العالمین کا منشاء ازلی بھی قرار دے سکتے ہیں۔

کچھ دعائیں وہ ہوتی ہیں جن کے لیے انسان کا دل گڑگڑاتا ہے اور اس کے لیے لب متحرک ہوتے ہیں کچھ دعائیں وہ ہوتی ہیں جن کی زبان فطرت کی زبان ہوتی ہے۔ ہمارے ہونٹ اس کے لیے حرکت نہیں کرتے

مگر ہماری فطرت اس کے لیے گڑگڑاتی ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے فرعون سے اپنے معبود برحق اور رب العالمین کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (سورہ طٰہٰ ع ۲)

''ہمارا رب وہ ہے جس نے بخش دی ہر چیز کو اس کی صورت پھر راہ سوجھائی۔''

یعنی ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کا خلق اور اس کا وجود نوعی عطا فرما کر راستہ بتا دیا۔ بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب۔ کھانے پینے کا ہوش دیا بچہ کو دودھ پینا وہ نہ سکھائے تو کوئی نہ سکھا سکے۔

مگر راستہ بتا دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب وہ خود بخود قدم بڑھاتا رہے گا۔ رب العالمین سے مستغنی ہو جائے گا اور چونکہ اس کا قدم خود اٹھے گا اس لیے رب العالمین کی طرف سے فیضان قدرت کا محتاج نہیں ہوگا۔

بلکہ اس کے برخلاف کلام اللہ کے اشارات اور بعض موقعوں پر اس کی تصریحات یہ ہیں کہ ہر ایک قدم کا ارادہ ایک سوال اور ایک درخواست ہے جو فطرت اپنے فاطر اور خالق سے کر رہی ہے اور فاطر ہستی اس کی درخواست منظور کر رہا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں! آفتاب کی شعاعیں گرم ہوتی ہیں، فضا میں انگارے دہکنے لگتے ہیں، تیز ہوائیں چلتی ہیں، بادسموم کے تھپیڑے ہر شاداب اور سرسبز کو جھلس کر رکھ دیتے ہیں، زمین کا کلیجہ گرم ہوتا ہے، لبوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں، سینہ شق ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ تقاضائے فطرت ہے۔ مگر یہ تقاضا ایک سوال بھی ہے۔ یہ ایک انقلاب عظیم کی درخواست بھی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں سمندروں کے کھولتے ہوئے سینوں سے مان سون اٹھتا ہے، فضا پہ چھا جاتا ہے، پہاڑ نما بادل آسمان کے کھلے میدان میں دوڑنے لگتے ہیں، ہواؤں کے انجن انہیں کہیں سے کہیں کھینچ لے جاتے ہیں پھر وہ وقت آتا ہے کہ بارش برستی ہے، زمین کا پیاسا کلیجہ آسودہ ہوتا ہے، سبزہ لہلہاتا ہے، گلشن و بوستان شاداب ہو جاتے ہیں، پہاڑوں کے آبشاروں سے پانی کے فوارے اچھلتے ہیں، ندیاں سمندر بن جاتی ہیں اور نشیبی حصے تالاب اور جھیلوں کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ تم نے سمجھا یہ یوں ہی ہو گیا۔ مگر کلام اللہ کہتا ہے: وہ دعا تھی یہ قبولیت دعا ہے، وہ فطرت کی طرف سے درخواست تھی اور خالق فطرت کی طرف سے اس کی منظوری ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (سورہ ابراہیم ع ۵)

اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی نازل کیا جس کی

سیرابی نے پھل پیدا کیے جو تمہارا رزق ہیں اور تمہارے لیے جہاز مسخر کر دیئے کہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتے ہیں۔ نیز دریا بھی تمہارے لیے مسخر کر دیئے۔ اسی طرح سورج اور چاند بھی مسخر کر دیئے ہیں کہ ایک خاص دستور پر برابر چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کا ظہور بھی مسخر ہے اور تم کو دی ہر وہ چیز جو تم نے اس سے مانگی۔ (حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے الفاظ میں ''دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگا۔'' (سورہ ابراہیم ع ۴)

آپ شاید کہیں اور آپ نہ کہیں تو وہ کہہ سکتے ہیں جو خدا کو بھی نہیں مانتے (معاذ اللہ) کہ ہم نے کب کہا تھا آسمان سے پانی برساؤ، ہم نے کب دعا مانگی تھی کہ پانی سے پھل پیدا ہوں، ہم نے کبھی کشتیوں اور جہازوں کے مسخر کرنے کی بھی دعا نہیں مانگی، نہ ہم نے کسی سے یہ التجا کی کہ یہ ندیاں ہمارے تصرف میں آ جائیں یا آفتاب و ماہتاب ہمیشہ درخشاں رہیں یا شب و روز کی گردش یونہی پابندی کے ساتھ ہمیشہ جاری رہے۔

مگر یہ آپ کی فراموشی ہے۔ جس طرح انسان اس فطری عہد کو بھول گیا تھا جس کو عہد الست کہا جاتا ہے۔ جس میں اس نے رب العالمین کی ربوبیت کا اعتراف و اقرار کیا تھا۔ اسی طرح وہ اس سوال کو بھی بھول جاتا ہے جو اس کی فطرت گڑگڑا کر کرتی ہے اور نہ صرف اس کی فطرت بلکہ پوری کائنات کی فطرت گڑگڑاتی ہے اور دعائیں مانگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی دعا سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے:

يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (سورہ رحمان ع ۲)

''اس سے مانگتے ہیں جو کوئی ہیں آسمانوں میں اور زمین میں ہر دن اس کو ایک (۳۲) دھندا ہے۔'' (شاہ عبدالقادر صاحبؒ)

ملاحظہ فرمایئے بچہ کی بے بسی ایک فطری دعا ہے کہ خداوندا! وہ طریقہ بتا جس سے یہ جان ناتوان زندہ اور باقی رہ سکے۔

موسم گرما کی دہکتی ہوئی فضا اور اس انگاروں بھری فضا سے تڑپنے والی ہر چیز کی حدت اور تمازت ایک سوال ہے۔ یہ سوال زبان پر آئے یا نہ آئے۔ بقول ''صورت بیں حالت مپرس'' طبیعت کا قدرتی اضطراب خود سوال ہے۔ کسی بھی تدریجی اور ارتقائی سلسلہ میں آپ کا ہر ایک قدم، اس قدم کے لیے آپ کی تیاری ایک سوال ہے۔

جس طرح ہر ایک ذرہ اپنی تابانی کے لیے آفتاب سے بھیک مانگ رہا ہے کہ وہ اپنی کرن سے نور دے۔ جس طرح آپ ٹیلی فون کا رسیور اٹھا کر کہربائی سلسلہ سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ ٹیلی فون کے تاروں میں کرنٹ دوڑائے۔ اسی طرح ہر ایک قدم بلکہ ہر ایک عمل کے لیے آپ کی تیاری سرچشمہ قدرت سے التجا کر رہی ہے کہ وہ اپنے فیض سے نوازے۔ بیشک مشیت ایزدی یہی ہے کہ شمس منیر جب جلوہ افروز ہو تو اس کی کرنیں زمین کے ذروں کو تاباں اور درخشاں بنائیں۔ بیشک نظام قدرت کا دستور یہی ہے کہ جب موسم کی حدت و تمازت انتہا کو پہنچ جائے تو مان سون اٹھے اور کہرسا کے بجائے موسم برسات اپنا جلوہ دکھائے۔ مگر یہ مشیت جس

طرح اللہ تعالیٰ کا ایک ارادہ اور اس کا طے کردہ منصوبہ ہے اسی طرح وہ فطری اور طبعی دعا کے اثر کا ظہور بھی ہے۔

اب آیئے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یاد پھر تازہ کیجئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ صعوبت اور یہ دوہری محنت کیوں برداشت کی کہ کھلے میدان میں خانہ کعبہ کی تعمیر کے بجائے ٹیلہ تراشنا شروع کیا اور وہاں سے بنیادوں کی داغ بیل ڈالی۔

بیشک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہدایت یافتہ، مقدس، سلیم اور پاک فطرت کا جذبہ تھا کہ اللہ کے نام کا بیت زمین کی پیشانی پر سجایا جائے۔ مگر یہ رہنمائی قدرت حق کی تھی کہ عزم ابراہیم میں وہ جگہ معین کر دی جو ازل سے اسی مقصد کے لیے تاکی گئی تھی۔

جو لوگ ہماری راہ میں اپنی سرگرمیاں صرف کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور بتا دیتے ہیں)۔

اب ملاحظہ فرمایئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ جن کی تمام سرگرمیاں ابتداء سے تلاش حق میں صرف ہو رہی تھیں حضرت حق جل مجدہ نے ان کو اپنا راستہ کس طرح بتایا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (سورہ حج ع ۵)

خلاصہ کلام

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام جو آتش نمرود کے واقعہ کے بعد اپنے وطن سے یہ کہتے رخصت ہوئے تھے:

إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ

''میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں وہ عنقریب میری رہنمائی کرے گا۔''

قدرت کی دستگیری ملاحظہ فرمایئے کہ ان کو اس مقام پر پہونچایا جہاں وہ ملت مبعوث ہونے والی تھی جو ابدالآباد تک پیغام حق کی حامل ہو، جو تمام دنیا اور دنیا کے تمام گروہوں، تمام قوموں اور تمام ملتوں کے لیے ارشاد و ہدایت کا قطب مینار بنے۔

اور جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو یہاں آباد کر کے ہزاروں برس پہلے اس ''اُمت مسلمہ'' اور ''اُمت وسط'' کی بنیاد رکھ دی تو ساتھ ساتھ اس بقعہ مقدس کو بھی سینہ زمین پر اُبھار دیا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مہبط انوار، مرکز ارشاد و ہدایت اور سرچشمہ رحمت و رضاء خداوندی ہونے والا تھا۔

پھر اسی دور میں ذبح اسمٰعیل (علیہ السلام) کا وہ انوکھا اور نرالا واقعہ جس کی مثال سے پوری دنیا کی تاریخ

محروم ہے، جس کو خود رب ذوالجلال نے بلاء عظیم اور سب سے بڑا امتحان فرمایا۔ وہ کیا تھا؟ وہ نشان تھا امت مسلمہ کے مسلک کا امت مسلمہ کا مسلک ہوگا فدائیت، قربانی اور ایثار، راہ خدا میں مرمٹنا، فنا ہو جانا۔

تعمیر کعبہ کے وقت دعا

کائنات کی چشم حیرت ایک عجیب تماشا دیکھ رہی ہے۔ وہی ربع مسکون یعنی کرہ زمین کا وہی آباد حصہ جس کے چپہ چپہ پر کفر، شرک، اصنام پرستی اور کواکب پرستی کی اندھیری چھائی ہوئی ہے۔ اسی دنیا کے ایک غیر آباد حصہ میں جو عرب کے ایک کنارہ پر حجاز مقدس کے تقریباً وسط میں اونچے نیچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اسی کی ایک وادی میں جہاں کچھ دنوں سے ایک عورت اپنے معصوم بچہ کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے جہاں چودہ پندرہ برس پہلے وہ عجیب ماجرا دیکھا گیا تھا کہ تشنہ لب بلکہ جاں بلب بچہ کی ایڑیوں کے پاس دفعتہً ایک چشمہ ابلنے لگا تھا۔ اس چشمہ سے چند گز کے فاصلہ پر ایک بوڑھا ایک پتھر پر بیٹھا ہوا ہے اس کے ساتھ ایک نوخیز نوجوان ہے۔ ایک مکان کی بنیاد کھدی ہوئی ہے۔ بوڑھے کے ہاتھ میں کچھ تعمیر کا سامان ہے۔ بوڑھے کی عمر سو سال سے متجاوز ہے۔ اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وزنی پتھر اٹھا سکے۔ یہ نوجوان پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا ہے اور بوڑھا دیوار چن رہا ہے۔

یہاں نہ تختے ہیں نہ بانس اور بلیاں جن سے سیڑھی بنائی جا سکے اور پیڑ باندھی جا سکے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ پتھر جس پر یہ بڑے میاں بیٹھے ہیں قدرت ایسا معجزہ دکھا رہی ہے کہ یہ پتھر دیوار کی بلندی کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا جا رہا ہے۔

اچھا ان بڑے میاں اور ان کے نوجوان کے ہاتھ تو کام میں مصروف ہیں ان کے چہرے بشرے اور انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ دل یاد خدا میں مصروف ہوگا۔ مگر دل کی آواز ہم سن نہیں سکتے۔ ہاں زبان پر کچھ کلمے جاری ہیں کچھ گنگناہٹ بھی سنی جا رہی ہے۔ یہ دونوں کیا کہہ رہے ہیں؟

کلام اللہ نے خبر دی ہے کہ اس وقت ان دونوں کے دلوں کی گہرائیوں سے جو کلمات زبان پر آ رہے تھے، یہ تھے:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

(سورہ بقرہ ع ۱۵)

”اے پروردگار! ہمارا یہ عمل قبول فرما۔ بیشک تو ہی ہے دعاؤں کا سننے والا (کائنات عالم کی مصلحتوں کو جاننے والا۔

اے ہمارے پروردگار! ہمیں توفیق عطا فرما کہ سچے مسلم (اور تیرے احکام کے

فرمانبردار) ہو جائیں۔

اور ہماری نسل میں سے ایسی امت پیدا کر جو مسلمہ (یعنی تیرے حکموں کی فرمانبردار) ہو۔

اور اے خدا ہمیں ہماری عبادت گذاری کے سچے طور وطریق بتا دے اور ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرما۔ بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو اپنی رحمت سے گناہوں کو معاف کرتی ہے اور جس کی رحیمانہ درگذر کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اور خدایا! اپنے فضل وکرم سے ایسا کرنا کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو انہیں میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنائے، کتاب اور (دینی بصیرت وحکمت کی تعلیم دے اور اپنی (پیغمبرانہ تربیت سے) ان کے دلوں کو مانجھ دے۔

اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے۔''

دعا کے الفاظ دہرایئے اور ان سے اس عجز وانکسار کا سبق لیجئے جو دعا کے وقت ہونا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا اولوالعزم رسول، جس کا خطاب ''خلیل اللہ'' ہے اس کی یہ عاجزی کس قدر سبق آموز ہے۔

ایک طرف یقین رکھنا ضروری ہے کہ وہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں یعنی ایک ایسی شخصیت ہیں جس کو خدا نے خود منتخب فرمایا ہے کہ ارشاد وہدایت اور روحانی ترقی کے سلسلہ میں منشاء خداوندی پورا کرے۔ دوسری طرف اپنے ہیچ در ہیچ ہونے کا یہ احساس کہ اس کی نظیر کسی بے کس ولاچار کے قلب مضطر میں بھی نہیں مل سکتی۔ کیا یہ سراسر معجزہ نہیں (۴۳)

الفاظ کے بعد معنی پر نظر ڈالئے۔ دعا کے اجزاء کیا ہیں اور وہ کس طرح قبول ہوتے ہیں۔ پہلی التجا یہ ہے کہ خداوندا یہ عمل قبول ہو چنانچہ قبول ہوا۔ قرآن پاک کی آیتوں میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ مثلاً اسی رکوع کے پہلے حصہ میں ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى

''اور وہ واقعہ بھی یاد رکھو جب ہم نے اسی بیت (خانہ کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کا مرکز اور امن وحریت کا مقام ٹھیرا دیا اور یہ ہدایت کردی کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ نماز کی جگہ بنائی جائے۔''

اس سے بڑھ کر مقبولیت کیا ہو سکتی ہے کہ مقام ابراہیم کو مصلےٰ بنا دیا گیا یعنی ابدالاباد تک بندوں کو حکم ہو گیا کہ جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی وہاں نماز پڑھا کرو، سر بسجود ہوا کرو۔

سورہ حج میں ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہدایت فرمائی گئی:

وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (ع ۴)

''اور پکار دو لوگوں میں حج کا اعلان۔ وہ آیا کریں گے تمہارے پاس پا پیادہ اور دنیا کے

دور دراز راستوں سے ایسی اونٹنیوں پر سوار ہو کر جو چلتے چلتے دبلی ہو چکی ہوں گی۔''

غور کرو! کتنے بندگان خدا ہیں جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اعلان اور اس اذان پر لبیک کہا۔ اعداد و شمار کے تمام آنکڑے ختم ہو جائیں گے مگر ان کی شمار پوری نہ ہو سکے گی جنہوں نے اس اعلان پر اب تک عمل کیا اور جو آئندہ عمل کرتے رہیں گے۔

دعاء کا دوسرا جز یہ ہے کہ ہم دونوں کو مسلم بنا۔ یعنی اپنا تابعدار بنا اور تابع فرمان رکھ۔ آپ کے سامنے قرآن پاک کی وہ آیتیں ضرور ہوں گی جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر سلام نازل کیا گیا ہے۔ مثلاً

تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ۔ سَلَامٌ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ

''ہم نے آنے والی نسلوں میں ابراہیم کا ذکر خیر باقی رکھا۔ سلام ہو ابراہیم پر''

تابع فرمان ہونے کی شہادت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ خود فرماں روا سلام نازل فرما رہا ہے جو اسلام کا آخری نصب العین اور مسلم کے لیے معراج کمال ہے۔

دعا کا ایک جز یہ ہے کہ ہمیں مناسک بتا اور اس طرح بتا کہ ان کا مشاہدہ کرا دے:

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا

''اور جتا دے ہم کو حج کے دستور''

آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب کے معنی یہ سمجھے تھے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو لٹا کر ان کے گلے پر چھری چلانے لگ گئے۔ ابھی یہ عمل پورا نہیں ہوا تھا کہ تعلیم مناسک مکمل ہو گئی اور حضرت حق جل مجدہ نے خود اپنی جانب سے ذبح عظیم کا فدیہ پیش فرما دیا۔

دعا کا اہم جز یہ ہے کہ ہماری ذریت میں امت مسلمہ پیدا کر، اس امت مسلمہ میں ایک رسول مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، ان کو کتاب کی تعلیم دے، کتاب میں غور و فکر اور اس سے اخذ و استنباط کے طریقے بتائے، ان کی روحانیت کو جلا بخشے، زمانہ جاہلیت کا لگا ہوا زنگ دور کرے اور نور تقدس سے ذہنوں کو تاباں اور درخشاں بنائے۔

سوال یہ ہے کہ یہ دعا پوری ہوئی تو کب اور کس طرح۔ بیشک حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی وفات کے وقت وصیت فرمائی تھی:

يَا بُنَيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (سورہ بقرہ ع ۱۶)

''میرے بیٹو! خدا نے چن کر دیا ہے تم کو دین بس دیکھو دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم تابع فرمان (مسلم) ہو۔''

بیشک حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد (بنی اسرائیل) میں انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ کئی ہزار برس تک جاری رہا اور اسی کی برکت تھی کہ تمام عالموں پر ان کو فضیلت حاصل رہی۔ چنانچہ قرآن کریم میں بار بار اس انعام

کا ذکر فرمایا گیا ہے:

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ (سورہ بقرہ ع ۱۵)

''میں نے تم کو دنیا کے بندوں میں برگزیدگی عطا فرمائی ہے۔''

مگر بنی اسرائیل کی اس فضیلت مآبی کو اس دعا کی تکمیل نہیں کہا جا سکتا جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام دونوں نے مل کر مانگی تھی۔

بنو اسرائیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے خلف رشید حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی مشترک دعا کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ یہ امۃ مسلمہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہو۔

آپ اقوام عالم کی فہرست سامنے رکھیے، ان کی تاریخ پر نظر ڈالئے اور تلاش فرمایئے کہ وہ امۃ مسلمہ جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی اولاد ہو، جس کے دائرہ میں ایسا نبی مبعوث ہوا ہو جو آیات الٰہیہ کی تلاوت کرتا ہو، کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہو، تزکیہ نفس کرتا ہو۔ اس اُمت مسلمہ کا اگر آپ تعارف کرانا چاہیں تو اس کے لیے کیا لفظ لائیں گے۔ یہودی، نصرانی، مجوسی یا وہ جو اپنے آپ کو مسلم کہتے ہیں اور صرف یہی ایک ان کا عنوان ہے یعنی مسلم۔ پھر یہ بھی غور فرمایئے کہ اس کا سب سے پہلا طبقہ اور اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی یعنی وہ جو سراسر دعاء ابراہیم کی قبولیت بن کر جلوہ افروز ہوئے کون ہیں؟ اور کیا صحابہ کے علاوہ کوئی اور لفظ ان کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔

خلاصہ تمہید:

تمہید کا یہ سلسلہ جس کا آغاز قصہ ازل سے ہوا تھا چند سطروں میں اس کا خلاصہ ملاحظہ فرمایئے۔

① اللہ تعالیٰ کو ''رب'' ماننے کا وہ معاہدہ جس کو ''عہد الست'' کہا جاتا ہے پھر اسی دورِ ازل میں انبیاء علیہم السلام سے باہمی تصدیق وتائید کا عہد و پیمان۔ اس کا تقاضا تھا کہ جب ذریت آدم علیہ السلام عالم آب وگل میں جلوہ افروز ہو تو اس معاہدہ کی عملی شکلیں بھی ظہور پذیر ہوں۔

② درجہ بدرجہ ترقی اور ارتقاء اس عالم کی فطرت ہے تو ضروری تھا کہ اعتراف ربوبیت اور عہد الست کی پابندی جس کا نام تقوی ہے وہ بھی ترقی کے مراحل طے کرے اور ایک ایسی حد پر پہنچے جو فی الحقیقت تقویٰ کامل اور دین مکمل ہو۔

③ اللہ تعالیٰ کی مشیت جس طرح یہ طے کر چکی تھی کہ ایک ایسی امت جو عہد الست کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرے، جو تقویٰ کامل سے آراستہ اور دین مکمل کی حامل ہو، ایسے ہی یہ بھی طے کر چکی تھی کہ اس کا ایک مرکز ہو، اس کا ایک قبلہ ہو۔ اس کا وجود ایک ایسی شخصیت کی نسل سے ہو جو عہد وفا اور پیمان اطاعت میں کامل ومکمل ہو،

جس کی نظر بالغ اور فکر صحیح۔ اگر ایک طرف آفاق عالم اور کائنات ارضی وسماوی پر تنقیدی نظر ڈال کر صحیح نتیجہ پر پہنچ سکے تو دوسری طرف عملی لحاظ سے اس کا مسلک ایثار وفدائیت اور قربانی ہو۔

④ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ممتاز ترین شخصیت جب اس مشیت الہیہ کا نقطۂ عمل بنی تو جس طرح اس نے فکر صحیح پھر ایثار وفدائیت کا ثبوت دیا۔ اس نے ایک امت کی بنیاد بھی ڈالی۔ وادی غیر ذی ذرع میں اس کا مرکز معین کیا جہاں اس نے اپنی نسل کے اس نونہال کو آباد کیا جو قربانی کے امتحان میں تسلیم ورضا کی سب سے اونچی سند حاصل کرنے والا تھا۔ جس کے آباد کرنے کی نوعیت سراسر ایثار تھی بلکہ ایثار وفدائیت کی پوری تاریخ میں ایک انوکھی مثال تھی۔

⑤ اس امت کا مرکز معین کیا، اس کا خطاب ''مسلمہ'' تجویز کیا تو ساتھ ہی اس قبلہ کو بھی نمایاں کر دیا جو ازل سے ربانی تجلیات کا جلوہ گاہ تھا۔ جہاں حضرت آدم علیہ السلام نے ملائک کے نغمے سنے تھے، جہاں ذات حق کے انوار کا مشاہدہ کیا تھا۔

⑥ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کے لیے کچھ دعائیں مانگیں، اس کی علامتیں تجویز کیں، اس کے لیے ایک رسول کی درخواست کی۔

⑦ قرآن حکیم میں یہ تمام شہادتیں موجود ہیں۔ اب آیئے دیکھیں کہ یہ علامتیں جو اس امۃ مسلمہ کی تجویز کی گئی تھیں کیا وہ جماعت جس کو ہم جماعت صحابہ کہتے ہیں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جس کو ہم نے کائنات عالم کی آنکھ کا تارا کہا تھا۔ کیا وہ علامتیں اس جماعت میں نمایاں اور درخشاں ہیں۔ کیا ان اوصاف اور علامتوں کے متعلق قرآن حکیم کی شہادتیں موجود ہیں۔ کیا احادیث رسول اللہ ﷺ اور آثار صحابہ سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیا عہد قدیم (بنواسرائیل) کی کتابوں سے بھی اس کی تائید میں شہادتیں ملتی ہیں۔

⑧ خلفاء راشدین جن کو جماعت صحابہ نے سرگروہ اور سرتاج تسلیم کیا۔ کیا قرآن پاک کی آیتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عہد بنی اسرائیل کی روایات اس فیصلہ کی بھی اسی طرح تصدیق کرتی ہیں؟ اگر تصدیق وتائید کرتی ہیں تو کہاں تک اور کس طرح؟

⑨ کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ ﷺ کی تصریحات جن اصولوں کی تلقین کرتی ہیں کیا ان کے منطقی دلائل حضرات خلفاء کی افضلیت اور برتری کا یقین دلاتے ہیں؟ اگر دلاتے ہیں تو کس طرح؟ یہ سوالات ہیں جن کے جوابات ازالۃ الخفاء کے تقریباً ایک ہزار صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اب ہم آپ سے رخصت ہوتے ہیں۔ اب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ارشادات آپ کے سامنے آتے ہیں۔ زبان اور ترتیب اپنی ہوگی مضامین حضرت شاہ صاحب کے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ پوری کتاب کا کوئی ایک مضمون بھی نظرانداز نہ ہو سکے۔ واللہ الموفق وھو المعین وعلیہ التکلان

موضوع کتاب اوراصول استدلال

① کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء یعنی حضرات خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت راشدہ کے متعلق ایسے دلائل مہیا کر دینا کہ شک وشبہ کا کوئی حجاب حائل نہ رہے۔ اور تردد وتذبذب کا ہر ایک گرد صاف ہو جائے۔

یہ موضوع دو لفظوں سے مرکب ہے۔ خلافت اور خلفاء۔

خلافت کیا ہے؟ جب لفظ خلافت کی تشریح کی جاتی ہے تو اس کی چند قسمیں سامنے آتی ہیں مثلاً خلافت عامہ، خلافت خاصہ۔ جس کا دوسرا عنوان خلافت راشدہ ہے۔ خلفاء خلیفہ کی جمع ہے۔ جب خلافت کی قسمیں نکلتی ہیں تو ان کا تعلق لفظ خلیفہ سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایسا خلیفہ جس کی خلافت عامہ ہو یا ایسا خلیفہ جس کی خلافت خاصہ یعنی خلافت راشدہ ہو۔

چونکہ خلافت عامہ اور خلافت راشدہ کا تعلق خلیفہ کے شخصی حالات اور اس کے کردار وعمل سے ہے تو خلیفہ کی شخصیت بھی زیر بحث آتی ہے۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ان سب کی مدلل اور مفصل تشریحات کا بہترین ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرہ کے تمام جواہر آپ کے سامنے آئیں گے (انشاء اللہ) ہم نے چونکہ کتاب کے عنوان میں جماعت صحابہ کے فضائل ومناقب کا اضافہ کر دیا ہے اس لیے ہم ترتیب میں بھی رد وبدل کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے وہ آیتیں پیش کریں گے جن کا تعلق صحابہ کرام کی پوری جماعت سے ہے جس کا تذکرہ تمہید میں گذرا ہے۔

② جن آیتوں کو ہم جماعت صحابہ کے فضائل ومناقب کے سلسلہ میں پیش کر رہے ہیں حضرت شاہ صاحب نے ان کو خلفاء راشدین کے باب (۳۴) میں ذکر فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے جس طرح ان سے استدلال کیا ہے وہ ان آیتوں کی تشریح کے سلسلہ میں متن کتاب یا حاشیہ میں واضح کیا جائے گا (انشاء اللہ) البتہ استدلال کا اصول آپ نے یہ مقرر کیا ہے:

> (الف) قرائن بسیار حالیہ وقالیہ جمع شوند کہ مضطر گردانند تالی را بجزم بانکہ اینجا شخصے ہست کذا وکذا کہ اشارہ سخن بجانب اوست۔
>
> ’’مختلف قسم کے بہت سے قرائن ایسے موجود ہوں کہ تلاوت کرنے والے کو اس یقین پر مجبور کر دیں اور یہ بات بلا منطقی استدلال کے اس کے ذہن میں روشن ہو جائے کہ اس آیت میں کسی شخصیت کی طرف اشارہ ہوا ہے جو ان اوصاف سے متصف ہے۔‘‘

شاہ صاحب فرماتے ہیں اگر ایسے قرائن نہیں پائے جاتے تو ایسی آیت سے جس کا مفہوم عام ہو اور جس کے مصداق بہت سے حضرات ہو سکتے ہوں یا پوری جماعت صحابہ اس کی مصداق بنتی ہو ایسی آیت سے ہم کسی

خلیفہ کی افضلیت کے متعلق استدلال نہیں کریں گے۔

(ب) کسی آیت کے سلسلہ میں کوئی ایسی روایت ہے جو اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ حضرات خلفاء رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت پر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع اور اتفاق تھا اور خود اس راوی کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ حضرات خلفاء تمام صحابہ سے افضل تھے تو ایسی آیت بھی استدلال میں پیش کر دی گئی ہے۔ مگر ایسی آیتیں بہت کم ہیں۔

عمومات اور تعریضات قرآن جو مقصد اول کی فصل ششم کا عنوان ہے اس کا منشا حضرت شاہ صاحب نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس فصل میں:

(الف) وہ آیات پیش کی جائیں گی جن سے واضح طور پر خلافت خاصہ کا ثبوت ہوتا ہے۔

(ب) وہ آیات پیش کی جائیں گی جن سے صحابہ کرام کی فضیلت واضح طور پر معلوم ہوتی ہے اور بضمن فضیلت صحابہ خلفاء راشدین کی فضیلت اور ان کی کوئی خصوصیت بھی ثابت ہوتی ہے۔

(ج) وہ احادیث اور صحابہ کرام کے وہ اقوال جن سے مندرجہ بالا دونوں مفہوموں کی وضاحت یا تائید ہوتی ہے۔

(د) عمومات اور تعریضات قرآن کے ضمن میں وہ آیتیں بھی بیان کی جائیں گی جن میں صحابہ کرام یا کسی خلیفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت تو نہیں ہے لیکن تاریخی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آیت ان کی تمنا کی تکمیل یا کسی صحابی کے تصور کی تصویر ہے۔

یعنی صحابہ کرام یا کسی ایک صحابی نے کسی مسئلہ میں ایک رائے ظاہر کی۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ اس مسئلہ میں جو آیت حضرت حق جل مجدہ کی جانب سے نازل ہوئی وہ اس رائے کی تصویب اور تصدیق کرتی تھی۔ مثلاً کسی صحابی نے کہا کہ کیا اچھا ہو شراب حرام ہو جائے۔ مسلمانوں کو جس تقدس اور پاکبازی کی تعلیم دی جارہی تھی اس کے پیش نظر اس کی یہ ایک رائے یا آرزو تھی۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت حق جل مجدہ کی جانب سے اس مضمون کی آیت بھی نازل ہوگئی۔ متعدد مرتبہ ایسا ہوا ہے۔ ایسی آیتوں کو موفقات صحابہ کہا جاتا ہے۔ یعنی ان آیتوں میں ان کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا گیا۔

ایسی آیتوں میں اگرچہ کسی صحابی یا صحابہ کی کوئی خصوصیت یا فضیلت نہیں بیان کی گئی ہے بلکہ ان میں شریعت کا کوئی امر یا نہی ہے مگر ایسی آیتوں کا نزول خود صحابہ کرام یا اس صحابی کی فطرت سلیم کی بہت بڑی شہادت ہے کہ ان کے خیالات و جذبات کس درجہ تقدس اور اطاعت خداوندی کے سانچہ میں ڈھل گئے تھے کہ ان کے جذبات وہی ہوتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خداوند عالم کا حکم ہوتا تھا۔ کہاں بنی اسرائیل کی وہ فطرت معکوس کہ حکم خدا ہوتا ہے کہ اس دروازہ میں گردن جھکا کر داخل ہو۔ یہ اس کے برعکس سرین کے بل رینگتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور کہاں یہ فطرت صالح کہ ضمیر منیر کے آئینے منشاء ربانی کی عکاسی کر رہے ہیں اور ان کے جذبات فرمان خداوندی کے استقبال کے لیے مضطرب ہیں لامحالہ یہ آیتیں بھی اس فصل میں پیش کی گئی ہیں۔

چونکہ احادیث اور آثار کا تذکرہ آیا ہے تو حضرت شاہ صاحب نے ان کے متعلق بھی چند مفید نکتے ارشاد فرمائے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:

(الف) آنحضرت ﷺ کی احادیث کو حضرات محدثین نے مختلف ترتیبوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ کچھ محدثین نے صرف وہ حدیثیں جمع کی ہیں جن کا تعلق فقہی ابواب سے ہے۔ ایسی کتابوں کو سنن کہا جاتا ہے۔ چونکہ فقہی مسائل میں حضرات مجتہدین کے فتاویٰ اور اجتہادات مختلف رہے اور یہ بات ضروری تھی کہ ہر مجتہد اپنے فتوے کا ماخذ بیان کرے کہ کس حدیث یا آیت کی روشنی میں یہ فتوے دے رہا ہے اور یہ بھی ضروری تھا کہ جو حدیث پیش کرے اس کی سند صحیح اور قابل وثوق ہو تو لامحالہ فقہی مسائل سے متعلق احادیث کی سندوں پر کافی بحث اور جرح وتنقید ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنن میں ایسی حدیثیں لائی جاتی ہیں جن کی سندیں چھنی چھنائی قابل اعتماد ہوں۔ پس سند کے لحاظ سے سنن کا درجہ اور مرتبہ سب سے اونچا ہے۔ شاہ صاحب نے سنن کی مثال میں موطا امام مالک اور جامع سفیان دو کتابوں کا نام لیا ہے۔

(ب) اس کے بعد دوسرے درجہ پر وہ کتابیں ہیں جو آنحضرت ﷺ کی سیرت مقدسہ (سوانح حیات) سے متعلق ہیں۔ جیسے کتاب محمد بن اسحاق، کتاب موسیٰ بن عقبہ۔ اسی درجہ میں ان احادیث کو بھی شامل کر لیجئے جو آنحضرت ﷺ کے خصائل وعادات یعنی شمائل سے متعلق ہیں۔ (مثلاً شمائل ترمذی شریف)

(ج) تیسرا فن فن تفسیر ہے۔ یعنی وہ احادیث جن میں آیات کتاب اللہ کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔ جیسے تفسیر عبدالرزاق۔ تفسیر بخاری۔ ترمذی وابن ماجہ وحاکم وغیرہم۔

(د) چوتھا فن زہد ورقائق۔ یعنی وہ کتابیں جن میں وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جن میں زہد (دنیا سے بے رغبتی کی تلقین ہے اور عذاب وثواب اور انسانی اعمال کے محاسبہ سے متعلق آنحضرت ﷺ کے وہ ارشادات جمع کیے گئے ہیں جن سے رقت طاری ہوتی ہے۔ جیسے متقدمین کی کتابوں میں سے کتاب الزہد مصنفہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ اور متاخرین کی کتابوں میں سے قوت القلوب اور اس سے متعلق رسائل۔ ابواب فتن علامات قیامت اور جنت ودوزخ سے متعلق احادیث بھی اسی میں داخل ہیں۔

(ہ) پانچواں فن ہے معرفۃ الصحابہ کا فن یعنی وہ کتابیں یا ابواب جن میں صحابہ کرام کے حالات بیان کیے گئے ہیں جیسے کتاب استیعاب، مناقب صحابہ بھی اسی فن میں داخل ہیں۔

اس تفصیل کے بعد یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ عموماً ایک ایک حدیث میں متعدد مضامین آجاتے ہیں جس کا تعلق متعدد ابواب سے ہوتا ہے مثلاً ارشاد ہوا "نہ بلا طہارت نماز قبول ہوتی ہے نہ مال خیانت کا صدقہ قبول ہوتا ہے۔" ایسی حدیثیں متنوع مضامین کی بنا پر متعدد فنون میں داخل ہیں۔ لہٰذا ایسی حدیثوں کو متعدد ابواب میں لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی حدیث ابواب وضو اور طہارت میں بھی آ سکتی ہے۔ صدقہ میں بھی اور خیانت کے سلسلہ میں بھی۔ مزید وضاحت اور تکمیل افادہ کے لیے یہ تحریر کرنا مناسب ہے کہ ارشادات رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کرنے یعنی کتب حدیث کی تالیف میں حضرات مولفین نے سات طریقے اختیار کیے ہیں ہر طریقہ ایک قسم بن گیا ہے اور اس بناپر مولفات حدیث کی قسمیں سات ہوگئیں۔

۱-الجامع: ایسی تصنیف جس میں مندرجہ ذیل آٹھ مضمون ہوں۔

(۱) عقائد (۲) احکام (۳) آداب (۴) فتن (۵) مناقب (۶) اشراط الساعہ (علامات قیامت) (۷) تفسیر (۸) سیرت مبارکہ۔

ان آٹھ عنوانوں کو ایک شعر میں جمع کر دیا گیا ہے، شعر یہ ہے:

سیر آداب و تفسیر و عقائد

فتن احکام و اشراط و مناقب

ترمذی شریف اور بخاری شریف میں ان آٹھوں مضامین کے متعلق احادیث ہیں۔ لہٰذا ان کو جامع ترمذی یا جامع بخاری کہا جاتا ہے۔ مسلم شریف میں تفسیر کا حصہ بہت کم ہے اس لیے اس کو جامع نہیں کہا جاتا۔

۲-سنن: حدیث شریف کی ایسی تصنیفیں جن میں ابواب فقہ کی ترتیب کے بموجب صرف وہ احادیث جمع کر دی گئی ہوں جن کا تعلق احکام سے ہے ابوداؤد شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف سنن ہیں اور اس بنا پر کہ ترمذی شریف کا بڑا حصہ ان احادیث پر مشتمل ہے جن کا تعلق فقہی احکام سے ہے اور ان کی ترتیب بھی کتب فقہ کی ترتیب کے بموجب ہے۔ علماء نے ترمذی شریف کو بھی سنن میں شمار کرایا ہے۔

۳-مسند: حدیث کی ایسی تصنیف جس میں ایک ایک صحابی کی روایتیں ترتیب وار جمع کی گئی ہوں۔ مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جو روایتیں مروی ہیں وہ سب یکجا کر دی گئی ہوں اور یہ مجموعہ پہلے لایا گیا ہو۔ پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیثوں کا مجموعہ۔ پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی رضی اللہ عنہم کی روایتوں کا مجموعہ۔ (وغیرہ من الصحابہ الافضل منہم فالافضل) اس ترتیب میں ابواب فقہ کی ترتیب ملحوظ نہیں ہوتی۔

۴-معجم: ایسی تصنیف جس میں ایک ایک استاد کی روایتیں علی الترتیب (بلالحاظ ترتیب ابواب فقہ) جمع کی گئی ہوں۔

۵-الجزء: ایسی تصنیف جس میں کسی ایک مسئلہ کے متعلق احادیث جمع کی گئی ہوں مثلاً قرأت فاتحہ خلف الامام کے متعلق تمام احادیث امام بخاری نے ایک مختصر سی تصنیف میں جمع کر دی ہیں اس کو جزء القرأت لمحمد بن اسمٰعیل کہا جاتا ہے یا جزء رفع الیدین۔

۶-المفرد: حدیث کی ایسی کتاب جس میں صرف کسی ایک شخصیت کی احادیث جمع کی گئی ہوں مثلاً صرف حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یا مثلاً صرف عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کردہ روایتیں جمع ہوں۔

۷-الغریبہ: ایسی تصنیف جس میں تفردات جمع ہوں۔ یعنی وہ احادیث جمع ہوں جو اس مؤلف نے اپنے اساتذہ سے سنیں اور ان اساتذہ کے اور شاگردان کو روایت نہیں کرتے صرف یہی مؤلف ان روایتوں کو اپنے

استادوں اور مشائخ سے نقل کر کے اس میں جمع کر دیتا ہے۔ ان کے علاوہ مستخرجہ اور مستدرک وغیرہ بھی قسمیں ہیں۔

ایک جامع تبصرہ

سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

چوں صورت محمد یہ علی صاحبہا الصلو والسلام در ازل الآ زال برائے نبوت معین شد۔ پیرامون او امت نیز ظاہر شد زیرا کہ نبوت اسمے ست اضافی تا امت نباشد نبوت صورت نہ گردد:

تشریف دست سلطان چوگان بز دولیکن
بے گوے روز میدان چوگان چہ کار دارد

آ نانکہ وسائط بودند در میان آنحضرت ﷺ وامت او بصورت واسطگی ظاہر شدند وھم الشہد علی الناس۔ و نشو ونما باز انحطاط ونقصان دین بظہور رسید مثل آ نکہ اگر کرہ متحرکہ تصور کنی محور وقطبین ودائرہ عظمہ از صلب این تصور لازم آ ید۔ من حیث تدری اولا تدری۔

لہٰذا در کتب الٰہیہ جائیکہ ذکر آں محمد صلی اللہ علیہ وسلم آ مدہ ست ذکر امت او نیز آ مدہ وایں نیز در میان موطن مشخص شد کہ آ خر کار ایشان مغفرت باشد وبشریعت سہلہ سمحہ ایشان را مکلّف سازند۔

''جب حقیقت محمد یہ علی صاحبہا الصلو والسلام ازل میں نبوت کے لیے معین ہوئی اسی کے ساتھ ساتھ ان کی امت کا بھی نمود ہو گیا۔ کیونکہ نبوت ایک اضافی امر ہے جب تک امت نہ ہو نبوت کی تصویر نہیں بن سکتی۔

ترجمہ شعر۔ دست سلطان نے چوگان کو یہ شرف ضرور بخش دیا کہ اس کو مارنے کی حرکت دیدی لیکن جب تک گیند نہ ہو تو کھیل کے میدان میں صرف چوگان (بلہ) کیا کام دے سکتا ہے۔

جو آنحضرت ﷺ اور آپ کی امت کے درمیان واسطہ تھے۔ وہ واسطہ بن کر ظہور فرما گئے پھر یہ حضرات تمام نوع انسان کے لیے ایک نمونہ بن گئے۔ دین کا نشو ونما ہوا پھر اس کا تنزل ظہور پذیر ہوا یعنی نبی کے ساتھ نبوت پھر اس کی امت کا ظہور ان سب کا ساتھ ساتھ تصور پھر ساتھ ساتھ ظہور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کرہ متحرکہ کا تصور جب کسی کرہ کو آپ متحرک تصور کریں گے تو دانستہ یا نادانستہ لازمی ہوگا کہ دائرہ قطب اور محور کا تصور بھی دماغ میں آ جائے کیونکہ جب بھی کرہ متحرک ہوگا یہ چیزیں لازمی طور پر قائم ہو جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ کتب الٰہیہ میں جہاں بھی آنحضرت ﷺ کا ذکر مبارک آیا ہے آپ کی امت کا ذکر خیر بھی موجود ہے اور اسی موقع پر یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ اس امت کا انجام مغفرت ہوگا اور اس کو ایسی شریعت دی جائے گی جو نہایت سادہ سلجھی ہوئی اور آسان ہوگی۔

جماعت صحابہ اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق

دعائیں اور بشارتیں (۳۵)

دعاء ابراہیم علیہ السلام:

پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام جب بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے تو ان کے ہاتھ عمل میں مشغول تھے اور دل کی یہ صدا تھی:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورہ بقرہ ع ۱۵)

''اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا مطیع وفرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسی جماعت پیدا فرما جو تیری فرمانبردار ہو اور ہمیں ہمارے مناسب عبادت کے طریقے سمجھا اور ہم پر عنایت اور الطاف مبذول فرما، بے شک تو توبہ قبول فرمانے والا بہت بڑا مہربان ہے۔

اے ہمارے پروردگار! ان میں (ہماری اولاد میں) انہیں میں کا رسول مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیات کی تلاوت کرے۔ کتاب الٰہی اور حکمت وبصیرت کی ان کو تعلیم دے اور بری خصلتوں، برے جذبات اور بری عادتوں سے ان کو پاک وصاف کردے بے شک تو غالب ودانا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں التجا کی:

واكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ (سورہ اعراف ع ۱۹)

''ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی مقرر کردے اور آخرت میں بھی بیشک ہم جھک چکے ہیں تیری ہی طرف۔''

بارگاہ رب العزت سے جواب صادر ہوا آپ کی دعا قابل قبول ہے مگر یہ بھی واضح رہے کہ یہود کی ایک حالت نہیں رہے گی ان میں ایک جماعت ایسی ہوگی وہ عذاب خداوندی میں مبتلا ہوگی۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ وَقَضَيْنَا

اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ فِی الْکِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ الایۃ۔

ہاں ایک جماعت ایسی ہو گی جو رحمت خداوندی سے سرفراز ہو گی۔ ان میں نبی ہوں گے بادشاہ ہوں گے اور ان کو بے نظیر نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ البتہ ابدی سعادت اور خوش نصیبی جس کا مقدر ہو گی وہ ایک اور جماعت ہو گی جس کی شان یہ ہو گی:

لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورہ اعراف ع ۱۹)

''وہ متقی ہوں گے اور زکوٰۃ ادا کیا کریں گے اور وہ ہوں گے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے جو اس رسول کا اتباع کریں گے جو نبی امی ہے جس کو لکھا[۳۷] ہوا پاتے ہیں اپنے یہاں تورات اور انجیل میں جو ان کو معروف کا حکم کرے گا اور بری باتوں سے روکے گا۔ پاکیزہ اور حلال چیزیں ان کے لیے حلال اور خبیث پلید اور گھناؤنی چیزیں ان کے لیے حرام کرے گا اور وہ بوجھ (پابندی) اور وہ قیدیں ان سے اٹھا دے گا جو ان پر (بنی اسرائیل پر خود ان کی غلط کرتوتوں کے سبب سے) لگا دی گئی تھیں۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے اس کی رفاقت کا حق ادا کریں گے، اس کی مدد کریں گے اور اس نور کے پیچھے چلیں گے جو اس کے ساتھ اتارا جائے گا (یعنی احکام قرآنی) کی تعمیل کریں گے۔ پس یہ لوگ ہوں گے کامیاب و بامراد۔''

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

① اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد) آنے والے زمانہ میں ایک امت پیدا ہو گی جس کی صفات یہ ہوں گی کہ اس کے افراد متقی اور پرہیزگار ہوں گے۔ زکوٰۃ ادا کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی آیات اور نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس امت کے لیے حسنہ مقدر ہو گا۔ حسنہ کیا ہے؟ دنیاوی حسنہ یہ ہے کہ فتح و نصرت حاصل ہو، رزق میں فراخی ہو اور سیاسی دنیا میں اقتدار اعلیٰ ان کو حاصل ہو۔ ان کی حکومت غیر مسئول ہو: دنیا میں کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو اور دنیا کی تمام حکومتیں اور قومیں زیردست اور باجگذار ہوں یا ان کے سامنے اسیر و غلام ہوں۔

حسنہ آخرت یہ ہے کہ مغفرت اور نجات حاصل ہو اور درجات بلند ہوں۔

(۲) ان آیتوں میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے منطوقاً اور صراحۃً فلاح ثابت کی گئی ہے۔ کیونکہ آیت میں فرمایا گیا ہے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ لیکن فَسَاَكْتُبُهَا (الخ) سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت کا وہ حسنہ جس کی دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لیے کی تھی اور یہود کے صرف ایک گروہ کو وہ عطا ہوا تھا یہ حسنہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ اس امت کو دیا گیا جس کے سرگردہ حضرات صحابہ ہیں۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

(۳) اب حضرات خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خدمت میں حاضر ہو جیے۔ اس آیت کریمہ کے آئینہ میں ان کے رخ زیبا کا مشاہدہ کیجئے۔ غور سے دیکھئے۔ ہو بہو ہی تصویر ہے یا کہیں فرق نظر آ رہا ہے؟

احادیث و آثار:

(۱) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: میں نے راہ خدا میں ایک اونٹنی دے دی۔ پھر میں نے اس کی نسل کا بچہ خریدنے کا ارادہ کیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ فرمایا چھوڑ دو۔ (۳۸) قیامت کو یہ اونٹنی اور اس کے بچے تمہاری میزان (۳۹) میں ہوں گے۔

(۲) حضرت حسن رضی اللہ عنہ: میں نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما ہیں اور فرما رہے ہیں اے لوگو اللہ سے ڈرو ان کاموں کے بارے میں جن کو پوشیدہ طور پر کرتے ہو کیونکہ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے۔ جب بھی کوئی شخص کوئی کام چھپ کر کرتا ہے تو خداوند عالم اس کو علانیہ کی چادر اڑھا دیتا ہے۔ (وہ پوشیدہ عمل چھپنے کے بجائے ظاہر ہو جاتا ہے) اگر عمل خیر ہو تو خیر کی چادر اور عمل شر ہو تو شر اور بدنامی کی چادر اس پر ڈالدی جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی۔

وَرِيَاشًا وَّلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ قال السمت الحسن

(۳) حسن رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے صاحبزادے (حضرت عبداللہ بن عمر) کے یہاں تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ان کے سامنے گوشت رکھا ہوا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا یہ گوشت کیسا؟ صاحبزادہ نے جواب دیا۔ گوشت کو جی چاہ رہا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: کیا جب بھی کسی چیز کی خواہش ہوا کرے گی تم اس کو کھایا کرو گے۔ ایک شخص کی فضول خرچی کے لیے یہی (بات) کافی ہے کہ ہر اس چیز کو کھانے لگے جس کو اس کا دل چاہے۔

(۴) حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ: شکم سیر ہو کر کھانے پینے سے پرہیز کرو۔ کیونکہ یہ شکم سیری بدن کو خراب کر دیتی ہے۔ بیماری کو جنم دیتی ہے۔ نماز میں کسل اور سستی پیدا کرتی ہے۔ تم پر لازم ہے کہ کھانے پینے میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو۔ کیونکہ کھانے پینے میں اعتدال بدن کو صالح اور درست اور فضول خرچی سے

بھی دور رکھنے والی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے عالم و فاضل سے بھی نفرت کرتا ہے جو موٹا تازہ (تن پرور) ہو اور ایک شخص کی بربادی اور ہلاکت کی حد یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہش کو دین پر مقدم رکھنے لگے۔ (۴۳)

⑤ حضرت ابن مسیّب رضی اللہ عنہ: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخمی کر دیئے گئے تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی موت کو پیچھے ہٹا دے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے عرض کیا گیا کہ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے۔ (۴۴) کہ جب اجل آ جاتی ہے تو وہ اپنی اجل کو نہ ایک ساعت پیچھے ہٹا سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھا سکتے ہیں۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ: بیشک۔ مگر یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے:

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ

''جس کو عمر دی گئی ہے اس کی عمر میں نہ اضافہ کیا جاتا ہے نہ اس میں کمی کی جاتی ہے مگر یہ سب کھاتہ میں (لوح محفوظ میں) درج ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جتنا چاہتا ہے عمر میں اضافہ اور کمی کرتا رہتا ہے پس جب (اس اضافہ یا کمی کے بعد) اس کی اجل آ جاتی ہے تو اس کو نہ ایک ساعت وہ پیچھے ہٹا سکتے ہیں نہ آگے بڑھا سکتے ہیں۔

(منشاء یہ ہے کہ آیت سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ عمر میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ باقی جہاں تک لوح محفوظ میں اندراج کا تعلق ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوگی کیونکہ اس میں وہ درج ہے جو کمی بیشی کے بعد آخری نتیجہ نکلنے والا ہے۔ واللہ اعلم۔ (۴۵) (مترجم)

⑥ حضرت ابن ملیکہ رضی اللہ عنہ: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خنجر مار دیا گیا تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور آپ ابھی دروازہ پر تھے کہ آپ پر گریہ طاری ہو گیا۔ آپ رو رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ واللہ اگر امیر المومنین اللہ تعالیٰ کو قسم دیں اور پوری پختگی سے یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی موت موخر کر دے اور عمر میں اضافہ کر دے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس قسم کو پورا کرے گا۔

اسی اثناء میں حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) داخل ہوئے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ امیر المومنین: یہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ حاضر ہیں اور وہ یہ کہہ رہے ہیں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ۔ اگر یہ صورت ہے کہ خداوند عالم میری دعا پر موت کو مؤخر اور میری عمر میں اضافہ کر دے گا تو میں یہ دعا ہرگز نہیں کروں گا۔

⑦ حضرت سالم بن عبداللہ حضرت ابان بن عثمان اور حضرت زید بن حسن۔ یہ تینوں صاحب روایت کرتے ہیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں ایک شخص پیش کیا گیا جو قریش کے ایک لڑکے کے ساتھ خلاف فطرت فعل کا مرتکب ہوا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا۔ کیا یہ محصن (شادی شدہ) ہے لوگوں نے جواب دیا۔ شادی تو کر چکا ہے مگر ازدواجی تعلق کی ابھی تک نوبت نہیں آئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا۔ اگر یہ ازدواجی عمل کر چکا ہو تو یقیناً رجم لازم ہو جاتا ہے لیکن جب یہ صورت نہیں ہے تو کوڑے لگانے کی سزا نافذ کیجئے۔

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ: میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی فرمایا تھا جو ابوالحسن حضرت علی رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوڑے لگانے کا حکم دیا اور اس کو یہی سزا دی گئی۔

⑧ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: خداوندا اس شخص کا کیا اجر ہوگا جو کسی غم زدہ عورت کی (جس کا لڑکا مر گیا ہو) تعزیت کرے۔ حضرت حق جل مجدہ کی بارگاہ سے جواب ملا۔ میں اس کو اپنے مخصوص سایہ میں رکھوں گا اس روز کہ میرے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔ (یعنی قیامت کے دن) (۳۶)

⑨ حضرت خالد الربعی: میں نے ایک کتاب میں جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی ایک آسمانی صحیفہ) میں پڑھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قیامت کے دن خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے ہوئے یہ کہتے ہوئے آئیں گے۔ خداوندا! مجھے تیرے مومن بندوں نے قتل کیا۔

⑩ حضرت مسلم بن یسار جھنی رضی اللہ عنہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے آیت کریمہ واذ اخذ ربك من بنی آدم کے متعلق دریافت کیا گیا۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تھا۔ میں نے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا پھر ان کی کمر پر دست مبارک پھیرا اور ان کی ذریت کو برآمد کیا اور فرمایا: میں نے ان کو جنت کے لیے پیدا کیا ہے یہ اہل جنت کے کام کریں گے اس کے بعد دوبارہ کمر کو چھوا اور ذریت کو برآمد کیا اور فرمایا میں نے ان کو نار کے لیے پیدا کیا ہے یہ اہل نار کے کام کریں گے۔

ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر عمل کا مقصد؟

ارشاد ہوا: عمل کی توفیق بھی من جانب اللہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا کیا تو اس کو اہل جنت کے کام میں لگا دیتا ہے یہاں تک کہ کسی ایسے ہی عمل پر اس کی موت آتی ہے جو اہل جنت کا عمل ہوتا ہے۔ پس اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب بندے کو جہنم کے لیے پیدا کرتا ہے تو اہل نار کے کام پر اس کو لگا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت بھی ایسے ہی عمل پر آتی ہے جو اہل جہنم کا عمل ہوتا ہے۔ پس اس کو نار میں داخل کر دیتا ہے۔

⑪ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ: آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ جابیہ میں خطبہ دیا۔ اللہ کی حمد و ثنا کی اس کے بعد فرمایا: جس کو اللہ ہدایت دے کوئی نہیں جو اس کو گمراہ کر سکے اور جس کو اللہ گمراہ کر دے کوئی نہیں جو اس کو ہدایت کرنے والا ہو۔ تو مجوسیوں کے ایک مذہبی پیشوا نے آپ سے فارسی زبان میں ایک کلمہ کہا۔ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ نے ترجمان سے دریافت کیا کہ کیا کہتا ہے۔ ترجمان نے کہا: یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دشمن خدا غلط کہتا ہے۔ اللہ ہی نے تجھ کو پیدا کیا، اسی نے تجھ کو گمراہی میں مبتلا کیا اور وہی انشاء اللہ تجھ کو نار میں داخل کرے گا (۴۷) اور اگر ہمارے درمیان معاہدہ نہ ہوگیا ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقریر سن کر لوگ منتشر ہوئے تو تقدیر کے مسئلہ میں ان میں اختلاف نہیں رہا تھا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ عیینہ بن بدر (مدینہ منورہ میں) آئے اور اپنے برادرزادہ حر بن القیس کے یہاں قیام کیا۔ حر بن القیس ان لوگوں میں سے تھے جن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ معاملہ رکھا کرتے تھے اور قراء (۴۸) حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اہل مجلس اور آپ رضی اللہ عنہ کے مشیر رہا کرتے تھے۔ خواہ وہ نوجوان ہوں یا سن رسیدہ۔ حضرت عیینہ نے اپنے بھائی سے کہا۔ کیا امیر المومنین کی بارگاہ میں آپ کا کچھ رسوخ ہے کہ آپ میری ملاقات کی اجازت بھی حاصل کر لیں۔ چنانچہ حضرت حر نے عیینہ کے لیے اجازت حاصل کر لی۔ جب عیینہ بارگاہ فاروقی میں حاضر ہوئے تو کہنے لگے: نہ تو آپ ہمیں بہت سا مال دیتے ہیں نہ ہمارے ساتھ انصاف کرتے ہیں (یعنی ان کے نزدیک انصاف کا معیار یہ تھا کہ ان کو بہت سا مال مل جائے خواہ کسی حق دار کو ملے یا نہ ملے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی بات پر غصہ آ گیا۔ یہاں تک کہ ممکن تھا کہ ان کو مار بیٹھتے۔ حضرت حر نے (آگے بڑھ کر) عرض کیا۔ یا امیر المومنین! اللہ عزوجل نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ

''عفو و درگذر کو اپنا مسلک بنالو اچھی بات کا حکم کرو اور نادانوں کی بات پر دھیان نہ دو۔''

امیر المومنین! یہ بھی نادان ہیں۔ حضرت حر فرماتے ہیں کہ یہ آیت ختم نہیں کی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور حضرت عمر رضی اللہ کی شان بھی یہ تھی کہ کان وقافاً عند کتاب اللہ جیسے ہی کتاب اللہ کی کوئی آیت پڑھی جاتی تھی آپ ٹھہر جاتے تھے اور غور سے سنا کرتے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ

(ع ۷ سورہ انبیاء ح ۱۷)

''ہم لکھ چکے ہیں زبور میں ذکر کے بعد کہ یہ زمین اس کے وارث ہوں گے میرے وہ بندے جو شائستہ ہوں۔'' (صلاحیت رکھنے والے ہوں)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے:

''ہر آئینہ نوشتہ ایم در صحیفہا ء بعد از توریت کہ زمین معمورہ وارث آن شوند بندگان شائستہ من''،(۴۹) یعنی زبور سے صحیفے مراد لیے ہیں چنانچہ ترجمہ کے بعد توضیح فرماتے ہیں:

''زبور سے یا تو صحیفوں کی جنس مراد ہے۔ کیونکہ زبور کے لغوی معنی ہیں لکھا ہوا اس صورت میں جس صحیفہ میں بھی یہ بشارت ہوگی زبور سے وہی صحیفہ مراد ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ زبور سے وہی صحیفہ مراد ہو جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل فرمایا گیا تھا۔''

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''کلام اللہ کی آیتیں ایک دوسری کی تصدیق اور توضیح کیا کرتی ہیں۔ چنانچہ یہاں یہ مضمون اس انداز اور ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے اور دوسرے موقع پر ارشاد ہے۔''

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ (سورہ فتح ع ۴)

''یہ ان کی مثال ہے تورات میں اور ان کی ممتاز خصوصیت (بقول حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ ان کی کہاوت) جو انجیل میں ہے یہ ہے کہ جیسے کھیتی۔ نکالا اس نے اپنا پٹھا (یعنی کیلیں نمودار ہوئیں) پھر ان کو قوی کیا (بقول حضرت شاہ صاحب ان کی کمر مضبوط کی (یعنی وہ کیلیں بڑھیں اور مضبوط ہوئیں پھر موٹی ہوئیں پھر کھڑی ہوگئیں اپنی نال پر (یعنی تنہ دار پودا بن گئیں) جن کو دیکھ کر کاشتکار خوش ہونے لگے۔'' (دوسری جانب) کافروں کے لیے یہ غیظ وغضب کا باعث بن گئیں''۔ (بقول حضرت شاہ صاحب ان کا جی جلنے لگا)۔

حضرت شاہ صاحب اس آیت کو پیش فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

بات ایک ہی ہے تعبیریں مختلف ہیں۔ پہلی آیت میں زبور اور ذکر کے الفاظ بولے گئے ہیں اور دوسری آیت میں توریت اور انجیل کے الفاظ ہیں۔ پہلی آیت میں میراث ارض فرمایا گیا ہے اور دوسری آیت میں اخرج شطاہ فرمایا گیا ہے۔ مراد ایک ہے یعنی ''غلبہ دولت اسلامیہ''

پہلی آیت میں عبادی الصالحون (میرے شائستہ اور صالح بندے) ارشاد ہوا ہے۔ دوسری آیت میں محمد رسول اللہ والذین معہ (۵۰) ارشاد ہوا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اس آیت میں لفظ ارض تشریح طلب ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کچھ علماء (۵۱) نے ارض سے زمین جنت مراد لی ہے۔ حضرت شاہ صاحب (۵۲) اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ قرآن یا حدیث میں کسی جگہ ارض بول کر جنت مراد لی گئی ہو۔ بلکہ صحیح بات یہی ہے کہ ارض سے وہ ممالک مراد ہیں جو آب وہوا کے اعتبار سے معتدل ہیں۔ جہاں معتدل اخلاق والے انسان پیدا ہوتے

ہیں یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرزمین شام مراد ہے۔ کیونکہ بنو اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام شام میں ہی گذرے ہیں اور سرزمین شام کے واقعات کا تذکرہ بنی اسرائیل کے یہاں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ مال کا لفظ عام ہے۔ مگر ایک تاجر جب مال بولتا ہے (مثلاً کہتا ہے کہ مال منگایا ہے مال کا وی پی آ گیا ہے۔ مال روانہ ہو رہا ہے) تو اس صورت میں اس عام لفظ سے وہ خاص مال مراد ہوتا ہے جس کی یہ تجارت کرتا ہے۔ اس مضمون کی تائید کے لیے خصائص شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ سے اخذ کر کے چند روایتیں بھی یہاں درج کی جاتی ہیں:

① ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تورات اور زبور میں اور اپنے اس علم سابق وقدیم میں جو زمین وآسمان کی پیدائش سے پہلے سے ہے، یہ خبر دی ہے کہ امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وارث ارض ہوگی۔

② نیز ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی پھر فرمایا: صالح ہم ہی ہیں۔

③ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مجھے زبور کا ایک نسخہ مل گیا۔ اس میں ڈیڑھ سو سورتیں تھیں۔ میں نے چوتھی سورت میں دیکھا کہ یہ الفاظ ہیں:

> یَا دَاوٗدُ اسمع ما اقول ومر سليمان فليقله للناس من بعدك ان الارض لی اورثها محمدا صلی اللہ علیه وسلم وامته
>
> اے داؤد۔ جو میں کہتا ہوں اس کو سنو اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو بتا دو تا کہ وہ آپ کے بعد بھی لوگوں سے کہتے رہیں کہ زمین میری ہے۔ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت کو اس کا وارث بناؤں گا۔

④ ابن عساکر بروایت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے یمن گیا۔ وہاں قبیلہ ازد کے ایک بوڑھے عالم کے یہاں قیام کیا جنہوں نے آسمانی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ تین سو نوے سال ان کی عمر تھی۔ مجھ سے فرمانے لگے میرا خیال ہے کہ تم حرم کے رہنے والے ہو۔ میں نے جواب دیا: درست ہے۔ پھر کہنے لگے میرا خیال ہے کہ تم قریشی ہو۔ میں نے عرض کیا۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر فرمایا: تم خاندان تیم سے تعلق رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا صحیح ہے۔ فرمانے لگے آپ سے ایک بات اور معلوم کرنی باقی رہ گئی آپ ذرا اپنا پیٹ کھول کر دکھا دیجئے۔ یہ کیوں؟ میں نے عرض کیا۔ فرمایا۔ میں نے علم صادق میں یہ مطالعہ کیا ہے کہ حرم (مکہ) میں ایک نبی پیدا ہوگا۔ ان کی ایک نوجوان اور ایک سن رسیدہ (ادھیڑ عمر کا) آدمی امداد کرے گا۔ نوجوان کی شان تو یہ ہوگی کہ سخت سے سخت کاموں میں پوری مستعدی سے حصہ لینے والا اور مشکلات کو سامنے سے ہٹا دینے والا ہوگا اور ادھیڑ عمر والے کی علامتیں یہ ہوں گی کہ سفید رنگ، کمزور۔ اس کے پیٹ پر ایک تل ہوگا اور اس کی بائیں ران پر ایک نشان ہوگا۔

تو اب اس میں آپ کا کیا حرج ہے کہ آپ پیٹ کھول کر دکھا دیں کیونکہ اور علامتیں تو آپ میں پائی جا رہی ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں نے پیٹ کھول کر دکھایا تو انہوں نے یہ کالا تل دیکھا جو میری ناف کے اوپر ہے اور کہا ''آپ وہی ہیں قسم رب کعبہ کی''

⑤ ابن عساکر۔ بروایت حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کتاب اول میں لکھا ہوا ہے ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی مثال بارش جیسی ہے۔ جہاں برستی ہے نفع دیتی ہے۔

⑥ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے یہاں گیا۔ آپ کے سامنے کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ آخر میں ایک شخص تھا آپ نے اس پر نظر ڈالی اور فرمانے لگے۔ جو کتابیں تم پہلے پڑھا کرتے تھے ان میں تم نے کیا پایا۔ اس شخص نے جواب دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ان کے صدیق ہوں گے۔ (ابن عساکر)

⑦ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

زمانہ جاہلیت میں قریش کے کچھ آدمیوں کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں شام گیا۔ جب ہم وہاں سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تو میں ایک ضرورت پوری کرنی بھول گیا۔ میں نے ساتھیوں سے کہا میں ابھی آپ کے پاس پہنچنے والا ہوں (میں ان کے پاس سے ہٹا تو) واللہ میں نے دیکھا کہ میں ایک بازار میں ہوں اور ایک بطریق (پادری) کے سامنے کھڑا ہوں۔ بطریق نے میری گردن پکڑی۔ میں اس سے گردن چھڑانے کی کوشش کرتا رہا وہ اسی طرح مجھے اپنے کنیسہ میں لے گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ مٹی کا ایک تودہ ہے تہ بتہ جما ہوا۔ بطریق نے کدال اور ایک ٹوکری میرے ہاتھ میں دی اور کہا۔ اس مٹی کو ہٹاؤ۔ اب میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کس طرح کروں۔ وہ بطریق دوپہر میں پھر آیا اور کہنے لگا کہ میں تو دیکھتا ہوں تم نے کچھ بھی مٹی نہیں ہٹائی۔ پھر مٹھی بنا کر میرے سر کے بیچ میں ماری اب میں بھی کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی کھوپڑی پر مارا تو اس کا بھیجا نکل پڑا۔ اب میں فوراً وہاں سے نکلا۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ کہاں جاؤں۔ بہرحال میں اس تمام دن اور پھر ساری رات چلتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی تو میں ایک دیر (گرجا) پر پہنچا اور اس کے سایہ میں بیٹھ کر آرام لینے لگا۔ ایک آدمی میری طرف نکل کر آیا۔ کہنے لگا بندہ خدا یہاں کیسے آیا۔ میں نے کہا میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر بھٹک رہا ہوں۔ وہ میرے لیے کھانا اور پانی لایا اور بہت غور سے مجھے اوپر نیچے دیکھا۔ پھر کہنے لگا۔ دیکھو صاحب اہل کتاب جانتے ہیں کہ آج روئے زمین پر مجھ سے زیادہ کتاب (بائبل) کا ماہر کوئی نہیں ہے۔ مجھے آپ کی وہ شان نظر آ رہی ہے کہ آپ اس دیر سے ہمیں نکالیں گے اور اس شہر پر قابض ہوں گے۔ میں نے کہا۔ بھائی یہ بے محل باتیں کیا کر رہے ہو۔ اس شخص نے کہا۔ تمہارا نام کیا ہے میں نے کہا عمر نام ہے۔ ابن خطاب۔ کہنے لگا واللہ! بے شک آپ ہی ہیں۔ لہٰذا اب مہربانی فرما کر میرے نام یہ دیر اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب لکھ دیجئے۔ میں نے کہا۔ بھائی تم نے ایک احسان کیا ہے۔ ایسی باتیں کر کے اس کا مزہ کرکرا مت کرو۔ مگر اس نے پھر بھی یہی

مطالبہ کیا کہ تحریر دے دو اور اب یہ بھی کہ چمڑے کے ورق میں یہ تحریر با قاعدہ لکھ دو۔ کہنے لگا اس میں آپ کا بگڑتا کیا ہے۔ اگر آپ واقعی وہی شخص ہیں تو پھر ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا اور اگر آپ وہ نہیں ہیں تب بھی آپ کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔

میں نے قصہ ختم کرنے کے لیے کہا۔ اچھا لاؤ۔ چنانچہ میں نے تحریر لکھ کر دے دی اور اس پر مہر بھی لگا دی۔ پھر جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں شام آئے تو یہی راہب حاضر خدمت ہوا۔ اس وقت یہ بات کھلی کہ یہ شخص قدس کے دیر کا راہب تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھا تو بہت تعجب ہوا اور ہم سے یہ بیتا ہوا واقعہ بیان کرنے لگے۔ راہب نے کہا جو شرط تھی وہ پوری کرو۔ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: جو کچھ فتح ہوا ہے نہ عمر کا ہے نہ ابن عمر کا''

(دینوری فی المجالسہ و ابن عساکر من طریق زید بن اسلم)

⑧ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ: حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار ہو رہے تھے۔ ران کے اوپر سے آپ کا کپڑا ہٹ گیا تو نجران کے عیسائیوں نے آپ کی ران پر ایک کالا تل دیکھا۔ کہنے لگے یہی ہے وہ شخص جس کے متعلق ہم اپنی کتاب میں یہ پاتے ہیں کہ وہ ہمیں ہماری سرزمین سے نکالے گا۔ (ابن سعد)

⑨ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ اتفاقاً قبا کے نیچے سے ران کا کچھ حصہ کھل گیا۔ نجران کے ایک شخص کی نظر اس تل پر پڑی جو آپ کی ران پر تھا۔ اس نجرانی نے فوراً کہا یہ وہی شخص ہیں جس کے متعلق ہم اپنی کتابوں میں یہ پیشین گوئی پاتے ہیں کہ وہ ہمیں اس وطن سے خارج کر دیں گے۔ (زوائد الزہد)[۵۳]

⑩ حضرت کعب رضی اللہ عنہ: میں نے شام میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ ان کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ یہ شہر خدا کے صالح بندوں میں سے ایک ایسے صالح کے ہاتھ پر فتح ہوں گے جو مومنین کے لیے رحیم، کفار کے حق میں شدید ہوگا۔ اس کا باطن ظاہر جیسا ہوگا۔ اس کے قول اور فعل میں اختلاف نہ ہوگا، اس کے سامنے دور اور پاس کے آدمی حق میں مساوی حیثیت رکھیں گے۔ اس کے پیرو اور حکم بردار رات کے راہب ہوں گے اور دن کے شیر۔ آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرنے والے، حسن سلوک کے عادی، بر اور نیکی کے خوگر۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: جو آپ کہہ رہے ہیں کیا واقعی درست ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ: خدا کی قسم بالکل درست۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ: اللہ تعالیٰ کا شکر جس نے ہمیں ہمارے آقا اور مولا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عزت بخشی، ہماری عظمت بڑھائی، ہمیں شرافت عطا فرمائی اور ہم پر رحم کیا۔ (ابونعیم)[۵۴]

⑪ عبید بن آدم[۵۵] ابو مریم، ابو شعیب: یہ تینوں حضرات راوی ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جابیہ (شام کا ایک مقام) میں نزول فرما تھے۔ اس دوران میں حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ بیت

المقدس پہنچے۔ بیت المقدس کے باشندوں نے دریافت کیا۔ آپ کا نام؟
''میرا نام خالد ہے'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔
بیت المقدس والے: آپ کے صاحب (خلیفہ) کا نام کیا ہے؟
حضرت خالد: ہمارے امیر کا نام عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے۔
بیت المقدس والے: ان کا کچھ حلیہ بیان کیجئے۔
حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا حلیہ بیان کیا تو بیت المقدس والوں نے کہا۔ آپ بیت المقدس کو فتح نہیں کر سکتے یہ کام عمر کا ہے کیونکہ ہم اپنی کتابوں میں یہ پڑھتے ہیں کہ بیت المقدس سے پہلے قیساریہ فتح کیا جائے گا۔ آپ جائیے اور پہلے قیساریہ فتح کیجئے۔ پھر اپنے صاحب (عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کو لے کر آیئے۔ تب آپ فتح کر سکیں گے۔

⑫ **حضرت مغیث اوزاعی:** (۵۶) حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کعب احبار رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ تورات میں میرے متعلق تم نے کیا پڑھا ہے۔
حضرت کعب نے جواب دیا۔ تورات میں یہ ہے۔
ایک بہادر خلیفہ، لوہے کا بنا ہوا، مضبوط، صاحب امر، جو اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرے گا۔ پھر آپ کے بعد میں ایک خلیفہ ہوگا جس کو ظالموں کی جماعت قتل کر ڈالے گی۔ پھر اس کے بعد فتنہ وفساد واقع ہوگا۔

⑬ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے موذن خاص جن کا نام اقرع تھا۔ راوی ہیں کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے علماء یہود کے ایک پیشوا کو بلا کر دریافت کیا۔ تم نے اپنے مذہب کی کسی کتاب میں ہمارے متعلق بھی کچھ پڑھا ہے۔ اس سردار نے جواب دیا۔ ہماری کتابوں میں آپ لوگوں کے اوصاف لکھے ہوئے ہیں اور کارناموں کی پیشین گوئیاں ہیں۔ مگر نام کسی کا نہیں ہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اوصاف کیا ہیں۔
سردار: یہ وصف لکھا ہے کہ قرن من حدید
عمر فاروق رضی اللہ عنہ: قرن من حدید۔ کی تشریح کیجئے۔
سردار: امیر شدید، ایک مضبوط صاحب امر (فولادی عزم وہمت والا)
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تعجب ومسرت کے لہجہ میں فرمایا ''اللہ اکبر''
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: اچھا جو شخص میرے بعد ہوگا۔
سردار: ایک مرد صالح ہوگا جو اپنے اقربا کو مقدم رکھے گا۔
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: اللہ عثمان رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔
حضرت فاروق اعظم: جو شخص ان کے بعد ہوگا۔ جواب دیا۔ لوہے کا مگر زنگ خوردہ۔

عمر فاروق: وادفراہ (ا)''ہائے ذلت''
سردار: امیر المومنین کچھ توقف فرمائیے۔ یہ شخص مرد صالح ہوگا مگر ان کا دور خلافت خونریزی اور شمشیر برہنہ کی مصیبت میں مبتلا رہے گا۔

⑭ حضرت ابن سیرین (۵۹) راوی ہیں۔ حضرت کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ امیر المومنین کیا آپ سوتے ہوئے کچھ دیکھا کرتے ہیں۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو جھڑک دیا۔ حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ ہم تو کتابوں میں یہ پڑھتے ہیں، ایک ایسا شخص جو خواب میں اُمت کی پیش آنے والی ضرورتوں کو دیکھ لیا کرے گا۔

⑮ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام یعنی حضرت افلح کی روایت (۶۰) ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برخلاف جب بغاوت ہورہی تھی تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (جو پہلے یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے) مصر کے بلوائیوں کی آمد سے پہلے قریش کے سرغنہ حضرات کے پاس پہنچتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔ اس شخص کو (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو) قتل نہ کرنا۔

سرداران قریش قسم کھا کر کہتے ہم ان کے قتل کو کب گوارا کر سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ کہتے ہوئے واپس ہوتے۔ واللہ وہ لوگ ضرور قتل کر دیں گے۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قریش کے نمایاں افراد سے یہی کہا اور یہ بھی فرمایا کہ قتل ہرگز نہ کرو وہ چالیس روز کے اندر خود ہی وفات پا جائیں گے۔ مگر اس مرتبہ لوگوں نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ کچھ روز بعد حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پھر تشریف لے گئے اور اسی طرح گفتگو ہوئی۔ اس مرتبہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ان کو قتل مت کرنا وہ پندرہ روز کے اندر وفات پا جائیں گے۔ (۶۱)

⑯ حضرت طاؤس رحمہ اللہ: (۶۲) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا گیا۔ کتب سابقہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق تم نے کیا مطالعہ کیا ہے۔ فرمایا: ہم نے یہ پڑھا ہے کہ وہ قیامت کے دن امیر ہوں گے ان کے بھی جنہوں نے آپ کو شہید کیا اور ان کے بھی جنہوں نے آپ کی امداد سے پہلوتہی کی۔ (یعنی آپ امیر برحق ہیں لہٰذا میدان قیامت میں بھی آپ کی امارت کا ظہور ہوگا۔

⑰ محمد بن یوسف رحمہ اللہ: (۶۳) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا۔ بلوائیوں سے جنگ کرنے نہ کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ جنگ نہ کرنا اتمام حجت کے لیے زیادہ کامیاب طریقہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ آسمانی کتابوں میں یہ ہے کہ آپ قیامت کے دن امیر ہوں گے۔ قاتلوں پر بھی اور ان پر بھی جو ان قاتلوں کو قتل وخون کا مشورہ دے رہے ہیں۔

⑱ محمد بن یوسف رحمہ اللہ: (۶۴) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے مصری بلوائیوں سے فرمایا تھا ان کو قتل مت

کرو کیونکہ ماہ ذی الحجہ ختم نہ کرنے پائیں گے کہ وہ خود وفات پا جائیں گے۔

(۱۹) ابو اسود دوئلی رحمۃ اللہ علیہ (۶۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میرے پاس حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اس وقت پہنچے کہ میں عراق کے لیے پا برکاب تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے عرض کیا آپ عراق تشریف نہ لے جایئے کیونکہ اگر آپ وہاں پہنچ گئے تو آپ کو تلوار کی دھار کا نشانہ بننا پڑے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کی قسم! آپ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مجھ سے یہی فرما چکے ہیں۔

حضرت ابوالاسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ جیسا میں آج دیکھ رہا ہوں ایسا میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ایک شخص جو جنگ کی تیاری کر رہا ہے وہ لوگوں سے اس طرح کی باتیں کر رہا ہو۔ (۶۶)

(۲۰) حضرت سعید بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ: (۶۷) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو یہودیوں کے ایک بہت بڑے عالم سے (جس کو ''ذی قربات'' کہا جاتا تھا اور قبیلہ حمیر سے اس کا تعلق تھا) دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کون ہوگا۔ ذی قربات نے جواب دیا۔ الامین یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ دریافت کیا گیا۔ آپ کے بعد؟ جواب دیا۔ ایک فولادی عزم والا بہادر یعنی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ۔ دریافت کیا گیا۔ آپ کے بعد؟ جواب دیا۔ الازہر (روشن) یعنی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ دریافت کیا گیا۔ آپ کے بعد کون ہوگا۔ ذی قربات نے جواب دیا۔ الوضاح المنصور روشن چہرہ والا۔ صاحب نصرت و کامیابی یعنی حضرت معاویہ (۶۷)

(۲۱) حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ: (۶۹) جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ شہید کیے گئے تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا۔ یہ چالیس سال پورے ہو رہے ہیں۔ عنقریب (اسی سال) صلح بھی ہو جائے گی۔

(۲۲) حضرت ابوصالح رضی اللہ عنہ: (۷۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حدی خواں گا رہا تھا۔

ان الامیر بعدہ علي، وفي الزبیر خلف مرضي

ترجمہ: آپ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر ہیں اور زبیر (رضی اللہ عنہ) میں خلافت اور جانشینی کی پسندیدہ صلاحیت ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فوراً لقمہ دیا: نہیں بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس گفتگو کی خبر دی گئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میاں ابواسحاق جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر مصاحبین موجود ہیں تو میرے لیے کیا موقع ہے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ آپ ہی اس کے حامل ہوں گے۔

احادیث اور آثار نقل کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

معلوم ہونا چاہیے کہ سنۃ اللہ اس طرح ہے کہ جب عالم غیب میں کوئی عظیم الشان معاملہ مقدر ہو جاتا ہے تو اس کی مثالی صورت اور اس کا نقشہ ملاء اعلیٰ میں قائم ہو جاتا ہے اور پھر ملاء سافل بھی یہی اس نقش کا کچھ اثر اور اس کے کچھ خطوط ونشانات حاصل کر لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاہن اپنی کہانت سے کچھ تعارف حاصل کر لیتے ہیں اور صاف ذہن والے تیز طبع نفوس خواب میں اس کے آثار پا لیتے ہیں۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی جسم میں یا کسی جسمانی چیز میں اس واقعہ کی صورت منعکس ہو جاتی ہے۔ چند روایتین اس سلسلہ کی (۷۲) پیش کی جاتی ہیں۔

① شیخ جلال الدین رحمہ اللہ نے خصائص میں عرب کے مشہور کاہن سطیح کی پیشین گوئی نقل کی ہے اس میں سید الانبیاء ﷺ کے تذکرہ کے بعد یہ ہے۔

آپ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد آپ کی تحریک کی قیادت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں آئے گی جن کی شان یہ ہوگی کہ جب بھی وہ فیصلہ کریں گے وہ سچا فیصلہ ہوگا اور مظلوموں کو ان کا حق دلوانے میں بہت مضبوط اور چست ہوں گے۔ نہ کسی مظلوم کی دادرسی میں کسی ناتجربہ کاری اور تذبذب کو دخل ہوگا اور نہ کبھی ان کا اقدام اوچھا رہے گا۔ رضی اللہ عنہ۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد زمام قیادت ایک حنیف یعنی ایک ایسے بزرگ کے ہاتھ میں آئے گی جو اپنے دین میں نہایت صائب اور صحیح ہوگا۔ ایک تجربہ کار سردار ہوگا۔ مہمانوں کا بہترین میزبان ہوگا اور حق وصداقت کی طرف مائل کرنے اور اسلامی جذبات ورجحانات پیدا کرنے میں بہت بہتر اور بہت مضبوط قوت کا مالک ہوگا۔ ان کے بعد ولی امر اور صاحب اقتدار ایک ذرہ پوش ہوگا جو اپنے کام کا بہت تجربہ کار ہوگا۔ اس کے گرد بہت سی جماعتیں اور بہت سے گروہ اکٹھے ہو جائیں گے۔ پھر اس کو شہید کر ڈالیں گے۔ یہ شہادت ان کے حق میں انتقام اور غضب ہوگا۔ شیخ کو پکڑ کر ذبح کر دیا جائے گا پھر اس کے قصاص کا مطالبہ کرنے کے لیے بہت سے آدمی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد ''ولی امر'' اور صاحب حکومت ایک صاحب نصرت ہوگا جو اپنی رائے میں سیاسی تدبیروں کی آمیزش کرتا رہے گا اور روئے زمین میں فوجوں کا مظاہرہ کرے گا۔ اس روایت میں (ناصر) صاحب نصرت (۷۳) سے مراد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

② ابو الطیب (۷۴) عبد النعیم بن غلبون المقری۔ جب عمودیہ فتح کیا گیا تو لوگوں نے دیکھا ایک کنیسہ (مندر) پر سونے سے لکھا ہوا تھا۔

بدترین خلف وہ ہیں جو اپنے اسلاف کو برا کہیں۔ سلف کا ایک شخص خلف کے ہزار افراد سے بہتر ہے۔ اے صاحب غار۔ آپ نے فخر ومباہات کی عزت حاصل کر لی۔ کیونکہ ملک جبار (خداوند عالم) نے آپ کی ثناء کی۔ چنانچہ اپنی اس کتاب میں جو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی ارشاد فرمایا ہے:

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ

''دو شخصوں میں سے ایک جب کہ وہ دونوں غار میں تھے۔''

اے عمر آپ ''والی'' (حاکم) نہیں ہیں بلکہ ''والد'' ہیں۔

اے عثمان آپ کو مغلوب کر کے شہید کر ڈالا اور جب آپ کو دفن کیا جارہا تھا تو لوگوں نے آپ کے چہرہ کی زیارت بھی نہیں کی تھی۔

اے علی آپ ابرار (نیک لوگوں) کے مقتدا اور پیشوا ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کفار کی مدافعت کرنے والے۔

پس دیکھو! یہ صاحب غار ہیں۔ یہ یکتاء اخیار (نیک لوگوں میں یکتا) ہیں۔ یہ غیاث الامصار ہیں (شہروں اور باشندگان کے دادرس اور مددگار) اور یہ امام الابرار ہیں (نیک لوگوں کے مقتداء) جو شخص ان کی توہین و تنقیص کرے اس پر جبار (خداوند عالم) کی لعنت ہو۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اس عبارت کو پتھر پر دیکھنے کے بعد ہم نے یہاں کے پادری سے جو اس قدر بوڑھا تھا کہ اس کی بھنویں بھی لٹک کر آنکھوں پر آپڑی تھیں۔ دریافت کیا کہ تمہارے اس کنیسہ کے دروازہ پر یہ کتنے عرصہ سے لکھا ہوا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت سے دو ہزار سال پہلے سے۔ (ابن عساکر)

③ **حضرت کعب رضی اللہ عنہ:** حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان کا سبب اور محرک ایک آسمانی الہام تھا اس کی تفسیر یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تجارتی سامان لے کر شام گئے ہوئے تھے۔ وہاں آپ نے ایک خواب دیکھا۔ بحیرا۔ جو شام کے مشہور راہب تھے ان کے سامنے اپنا یہ خواب بیان کیا۔ بحیرا نے خواب سن کر دریافت کیا۔ آپ کا وطن؟ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ: مکہ۔ بحیرا: مکہ کے کس خاندان سے۔ حضرت صدیق رحمتی اللہ عنہ: قریش۔ بحیرا: کیا کام کرتے ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ: تجارت۔ بحیرا: خدا آپ کی خواب کو سچا کرے گا۔ آپ کی قوم میں سے ایک نبی مبعوث ہوں گے (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کی زندگی میں ان کے وزیر ہوں گے اور ان کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ ہوں گے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس خواب کو چھپائے رکھا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ نے نبوت کا اعلان کیا۔ تب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا آپ کی نبوت کی دلیل کیا ہے۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ وہ خواب جو آپ نے شام میں دیکھا تھا۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ یہ جواب سن کر سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ گئے۔ آپ سے معانقہ کیا پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور عرض کیا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ (ابن عساکر فی تاریخ دمشق) ازالۃ الخفاء تفسیر آیت مذکورہ فصل سوم (ص ۳۴)

④ **ابوالحسن علی بن عبداللہ الہاشمی الرقی:** میں ہندوستان گیا۔ میں نے ایک شہر میں ایک کالے گلاب کا درخت دیکھا۔ جس پر ایک سیاہ رنگ کا بڑا پھول کھلا ہوا تھا۔ خوشبو بہت عمدہ۔ اس پھول پر سفید رنگ میں لکھا ہوا تھا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ابوبکر الصدیق عمر الفاروق۔ اس پھول کو دیکھ کر مجھے کچھ شبہ ہوا کہ یہ بنایا ہوا ہے۔ پھر

میں نے آزمائش کے لیے ایک کلی توڑی جو ابھی کھلی بھی نہ تھی میں نے اس کو توڑا تو میں نے اس میں بھی یہی لکھا ہوا دیکھا جو دوسرے کھلے ہوئے اور شگفتہ پھولوں میں تھا اس واقعہ کا شہر میں چرچا تھا۔ (اخرجہ ابن عساکر وابن النجار فی تاریخہما۔ ازالۃ الخفاء ص۳۴)

⑤ **حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما:** ایک روز بخت نصر نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا صبح کو یہ تو یاد تھا کہ ایک نہایت حیرت انگیز خواب دیکھا ہے لیکن تفصیل یاد نہ رہی۔ فوراً ساحروں اور کاہنوں کو طلب کیا۔ جب یہ حاضر ہوئے تو کہا میں نے رات ایک خواب دیکھا تھا جو نہایت ہی عجیب تھا۔ بتاؤ وہ خواب کیا تھا اور اس کی تعبیر کیا تھی ورنہ تمہاری گردنیں اڑا دوں گا۔ ساحروں اور کاہنوں نے کہا۔ حضور خواب تو بیان فرمائیں۔

بخت نصر: خواب مجھے یاد نہیں۔ بھول گیا۔

ساحر و کاہن: سرکار! بھولی ہوئی چیز کو پہچان لینے کا علم تو ہمیں آتا نہیں۔ اس کے لیے کہانت اور سحر کارگر نہیں۔ کسی کے پاس کرامت ہو وہ شاید بتا سکے انبیاء علیہم السلام کے صاحبزادگان آپ کے یہاں حراست میں موجود ہیں۔ ان کو طلب فرمایئے شاید وہ جواب دے سکیں۔

بخت نصر نے ان حضرات کو طلب کیا اور یہی سوال دہرایا۔ ان حضرات نے اول معذرت کی کہ یہ غیب کی بات ہے۔ غیب داں صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ہم غیب کے جاننے والے نہیں ہیں۔ مگر جب اس نے قتل کی دھمکی دی تو ان صاحبزادگان نے فرمایا کہ ہمیں مہلت دیجئے کہ ہم وضو کر کے نماز پڑھ لیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ ان حضرات نے پاک صاف ہو کر ایک پاک صاف جگہ میں نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اصل خواب ان پر منکشف ہو گیا۔

ان حضرات نے فرمایا کہ آپ نے خواب میں دیکھا تھا کہ آپ کا سر ذہب کا ہے، سینہ فخار کا۔ ذہب سونے کو کہتے ہیں اور ذہب فعل ماضی کا صیغہ ہے اس کے معنی ہیں گیا۔ اسی طرح فخار کے معنی مٹی (ٹھیکرا) ہیں اور زیادہ فخر کرنے والا بھی اس کے معنی ہیں کمر نحاس (تانبہ) کی اور پیر (حدید) لوہے کے۔

بخت نصر نے کہا۔ ہاں مجھے یاد آیا۔ خواب میں یہی دیکھا تھا۔ اچھا اب اس کی تعبیر بتاؤ۔ ان حضرات نے معذرت کی تو پھر قتل کی دھمکی دی۔ صاحبزادگان نے پھر مہلت مانگی اور باوضو ہو کر نماز پڑھی اور بارگاہ رب العزت میں دعا کی۔ ان حضرات کی دعا قبول ہوئی اور خواب کی تعبیر منکشف ہوئی۔

صاحبزادگان نے فرمایا۔ آپ کا اصرار ہے تو ہم تعبیر بیان کرتے ہیں۔ تعبیر یہ ہے کہ آپ کا سر ذہب کا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آج کی اس شب سے لے کر جیسے ہی ایک سال پورا ہوگا آپ کا ملک ہاتھ سے نکل جائے گا۔

بخت نصر: پھر کیا ہوگا؟

صاحبزادگان: آپ کا سینہ فخار کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد ایک ایسا بادشاہ ہوگا جو لوگوں

پر فخر کیا کرے گا۔ اور نحاس (تانبے) کی کمر سے مراد یہ ہے کہ پھر ایک ایسا بادشاہ ہوگا کہ لوگ اس کی سختی سے خائف رہا کریں گے اور پاؤں حدید (لوہے) کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر ایسی حکومت ہوگی کہ کوئی چیز اس میں کوئی رخنہ پیدا نہ کر سکے گی۔ وہ فولاد جیسی ہوگی۔ اس سے مطلب ہے اسلام (۷۵)

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بشارت حضرات شیخین پر صادق آتی ہے کیونکہ انہیں کے دور خلافت میں شام فتح ہوا۔

صاحبزادگان انبیاء علیہم السلام پر تعبیر کا اس طرح منکشف ہونا یہ خود الہام ہے۔

مختصر یہ کہ ان روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ظہور اسلام اور صحابہ وخلفاء راشدین کا دور چونکہ اس عالم کا سب سے زیادہ عظیم الشان واقعہ تھا۔ جس طرح ملا اعلیٰ میں اس کا نقشہ قائم ہوا۔ اس کی چھاپ ملاء سافل پر بھی پڑی۔ یہاں تک کہ کاہنوں کی کہانت اس سے متاثر ہوئی۔ ذہین انسانوں نے عالم رویا میں اس کو دیکھا اور بعض لطیف جسمانی چیزوں میں اس کا عکس نمودار رہا۔

اس کے بعد مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے چند حدیثیں معراج شریف کے سلسلہ کی بیان فرمائیں جن میں یہ تصریح ہے کہ یہ نام عرش معلیٰ پر بھی درخشاں تھے۔

① حضرت علی رضی اللہ عنہ: (۷۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شب معراج میں، میں نے دیکھا کہ عرش پر لکھا ہوا ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ابوبکر الصدیق۔ عمر الفاروق عثمان ذوالنورین۔

② حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ: (۷۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا شب معراج میں جس آسمان پر بھی میرا گذر ہوا میں نے دیکھا کہ میرا نام اس طرح لکھا ہوا ہے۔ محمد رسول اللہ اور میرے نام کے بعد ابوبکر الصدیق لکھا ہوا تھا۔

③ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ: (۷۸) معراج کی رات میں میں نے عرش پر ایک سبز ہیرا دیکھا اس پر نور سے لکھا ہوا تھا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ابوبکر الصدیق عمر الفاروق۔

نظرِ ثانی اور خلاصہ

(از حضرت مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ)

① قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ حقیقت کا نہیں بلکہ بہت سی حقیقتوں کا آئینہ ہے وہ عظیم الشان پس منظر کی نشان دہی کرتا ہے۔ جس آیت سے یہ بحث شروع ہوئی تھی اس کے مفہوم پر دوبارہ نظر ڈالیے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ بہت عرصہ پہلے ہم زبور میں لکھ چکے تھے کہ ارضِ شام کے وارث میرے ''عبادِ صالح'' ہوں گے۔

معمولی حاکم بھی کوئی تحریر دے دیتا ہے تو اس کی حیثیت بہت بلند ہوتی ہے۔ خاص اسباب ہوتے ہیں جن کی بنا پر تحریر دی جاتی ہے۔ پھر تمام کار پردازوں کو اس کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ ماحول میں ایک خاص فضا بن جاتی ہے جو اس تحریر سے متاثر بلکہ اس کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر کسی کو نائب السلطنت بنایا جاتا ہے یا کسی کو ولی عہد مقرر کیا جاتا ہے تو اس کی دھوم کس قدر رہوتی ہے۔ ہر ایک سرکاری حلقہ کس طرح اس عہد و پیمان کے ساز پر نوا سنجی کرنے لگتا ہے اب آپ غور فرمایئے۔ جب رب العالمین اور احکم الحاکمین نے یہ دستاویز اپنے ان صحیفوں میں مسجل (رجسٹرڈ) کر دی جو اس کے عرشِ معلّٰی سے اس کے پاک نبیوں پر نازل ہوتے تھے تو اس ربانی سرکار سے تعلق رکھنے والا ہر ایک حلقہ کس طرح اس سے متاثر نہیں ہوگا۔ یقیناً اس کے اثرات طرح طرح ظاہر ہوئے اور یہ دستاویز ایسی مسلمہ حقیقت بن گئی کہ اگر اس کے اثرات کو مٹانے کی کوشش نہ کی جاتی تو حضرت خاتم الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرنے میں کوئی بھی رکاوٹ نہ ہوتی۔ ذہن اس کے استقبال کے لیے تیار ہوتے اور جیسے ہی حضرت خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان کانوں کے پردوں تک پہنچتا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

''اے لوگو میں تم سب کے لیے (پوری نوع انسان) کے لیے اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

ذہنوں کے دروازے تصدیق و تائید کے لیے کھل جاتے۔

② اب آپ ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈالیے۔ آپ تحقیق کیجیے کہ قرآن حکیم میں یہود کی ان بدترین خصلتوں کا ذکر بار بار کیوں کیا گیا ہے کہ:

(الف) جو کچھ ان کو بتایا گیا تھا اس کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے۔ جو محفوظ ہے اس کو طرح طرح کے معنے پہناتے ہیں۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (سورہ مائدہ، رکوع ۳)

''کلمات یعنی اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور اس کے ارشادات کا جو موقع اور محل ہے ان آیات کو اس سے ہٹا دیتے ہیں۔ ان کو جو نصیحت کی گئی تھی اس سے بہرہ اندوز ہونے کو فراموش کر چکے ہیں اور ہمیشہ تم کو ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر پہنچتی رہتی ہے اور بہت ہی کم ہیں وہ جو ان عیوب سے مستثنیٰ ہیں۔'' (سورہ مائدہ ع ۳)

(ب) جن کے معنی اور مطلب واضح اور معین ہو چکے تھے ان میں بھی تحریف اور ردوبدل کرتے رہتے ہیں:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (سورہ مائدہ رکوع ۶)

''آیتوں اور ارشادات الٰہیہ کے (جو تورات میں تھے) جن کے موقع اور محل معین ہو چکے تھے وہ اس کے بعد بھی ان کو اپنے محل سے ہٹا دیتے ہیں اور بات کو بے اسلوب کر دیتے ہیں۔''

(ج) سابق انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کا معاملہ یہ رہا کہ تورات اور زبور کے معیار پر نہیں بلکہ اپنے اغراض اور اپنے شیطانی جذبات کے معیار پر ان کو پرکھتے تھے۔ باوجودیکہ نبی کی تعلیم تورات کے عین مطابق ہوتی تھی لیکن اگر ان کے اغراض فاسدہ کی مخالفت ہوتی تو کتاب اللہ کو معاذ اللہ پس پشت ڈالتے اور نبی کے برخلاف علم بغاوت بلند کر دیتے اور اس طرح جان بوجھ کر جاہل نادان اور وحشی بن جاتے۔

وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِھِمْ كَاَنَّھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (سورہ بقرہ رکوع ۱۲)

''اور جب آیا ان کے پاس کوئی رسول اللہ کی طرف سے جو تصدیق کر رہا تھا ان باتوں کی جو خود ان کے پاس (تورات میں) موجود تھیں تو یہی لوگ جن کو تورات کا امانت دار بنایا گیا تھا ان ہی میں سے ایک فریق اٹھا اور اس نے کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈال دیا گویا اس کا ان کو کبھی علم ہی نہیں تھا۔''

(د) پھر بغاوت سرکشی اور جہالت کی انتہا یہ ہوتی:

فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ (سورہ مائدہ ع ۱۰)

''کتنے ہی انبیاء علیہم السلام تھے جن کی انہوں نے تکذیب کی اور کتنے ہی تھے جن کو قتل کر ڈالا۔''

(ہ) اور صرف یہی نہیں بلکہ انتہا یہ تھی کہ وہ حد سے گری ہوئی اس وحشیانہ حرکت پر فخر کیا کرتے تھے:

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۙ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ (سورہ نساء ع ۲۲)

''یعنی یہود کو ملعون قرار دینے کی ایک وجہ یہ تھی کہ حضرت مریم پر بہت بڑا بہتان لگایا

کرتے تھے اور یہ کہ بڑے فخر و ناز سے کہا کرتے تھے کہ وہ مسیح جس کو عیسیٰ کہا جاتا ہے جو مریم کا بیٹا تھا جو اللہ کا رسول تھا بیشک ہم نے اس کو قتل کیا۔"

یہ چند آیتیں ہیں۔ اسی طرح قرآن حکیم کی بہت سی آیتیں ہیں جن میں یہود کی ان خصلتوں کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہود کی ان بدترین خصلتوں نے ایک طرف رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کو بہت دشوار کر دیا اور دوسری طرف پوری بنی نوع انسان کو سخت ترین نقصان پہنچایا ہے کہ وہ معلومات جو انبیاء علیہم السلام نے انہیں فراہم کی تھیں جن کے ذریعہ وہ راہ حق اور ابدی فلاح و بہبود حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے ان سب پر اس طرح پردہ ڈال دیا کہ حق و باطل مشتبہ ہو کر رہ گیا۔ دولت علم کو برباد کر دینا کیا وہ جرم عظیم نہیں جس پر زیادہ سے زیادہ ملامت کی جائے اور بار بار کی جائے۔

آپ غور فرمایئے۔ قرآن حکیم بظاہر ان تمام پیشین گوئیوں کی تصدیق کر رہا ہے۔ جو حضرت شاہ صاحب نے کتب حدیث و تفسیر اور تاریخ کے حوالوں سے یہاں جمع کر دی ہیں۔

آپ غور فرمایئے کتاب اللہ میں یہ بھی ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (سورہ بقرہ ع ۱۷)

"لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس رسول کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بعض لوگ ان میں سے وہ بھی ہیں جو دیدہ دانستہ امر حق کو چھپاتے ہیں۔"

آیت کے بین السطور کو آپ غور سے پڑھیے۔ آپ یہی فیصلہ کریں گے کہ:

قرآن حکیم شہادت دے رہا ہے کہ کتب سابقہ صداقت پسند علماء اور صلحا (احبار اور ربانیوں) اور انبیاء علیہم السلام کے اشارات، ارشادات اتنے زیادہ ہیں اور ان کی بنا پر اتنی واضح علامتیں موجود ہیں کہ یہ اہل کتاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اس امت کو جو امت وسط ہے ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچان لیتے ہیں مگر کتمان حق اور آفتاب جیسی صداقت سے منہ موڑ لینے اور اس کے مقابلہ پر سینہ تان کر ہر طرح کی وحشت و بربریت کو عمل میں لانے کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ تمام بشارتیں اور علامتیں جو طالب حق کے لیے شمع راہ بن سکتی تھیں آج اس طرح فراموش ہو گئیں کہ گویا کبھی ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ کہیں کہیں کوئی پاک ذہن باقی رہ گیا جس میں وہ شمع ٹمٹا رہی ہے ورنہ عام ذہن تاریک ہو گئے۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن حکیم بظاہر ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کر رہا ہے جو حضرت شاہ صاحب نے کتب تفسیر و حدیث اور تاریخ کے حوالہ سے یہاں جمع کر دی ہیں اور بظاہر یہی پیشین گوئیاں ہیں جن کی بنا پر قرآن حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ یہود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنی اولاد کو۔

جانی پہچانی حقیقت کا انکار کر دینا کتنا بڑا جرم ہے اور یہود اس جرم کا ارتکاب اس لیے کر رہے ہیں کہ حقائق کا انکار کرنا، اہل حق کی مخالفت حتی کہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب اور نہ صرف تکذیب بلکہ ان کو قتل کر دینا، شہید کر ڈالنا ان کی قومی خصلت بن چکی ہے۔

(۳) یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم بار بار اپیل کرتا ہے کہ تم خود اپنی کتابوں کو دیکھو۔ ایمانداری سے اپنے صحیفوں کا مطالعہ کرو۔ تم اگر صحیح طور سے مطالعہ کرو گے اور خود اپنی مقدس کتابوں پر صحیح اعتقاد رکھو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصدیق کرو گے اور ان کی تعلیمات کے سامنے بھی سر تسلیم خم کرو گے۔ کیونکہ یہ رسول ان پیشین گوئیوں اور ان بشارتوں کے حامل ہیں جو تمہاری کتابوں میں موجود ہیں اور ان کی تعلیم وہی ہے جو انبیاء سابقین دیتے چلے آئے ہیں۔ کہیں بھی اختلاف نہیں ہوگا وجہ یہ ہے کہ اختلاف تم نے خود گھڑ لیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اختلاف قطعاً نہیں۔

اے یہود! تمہارے سامنے انجیل آئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل کی تعلیمات پیش کیں وہ سراسر توریت کی تصدیق کرتی تھیں، وہی اصول تھے، وہی عقائد و خیالات تھے، وہی جذبات و احساسات تھے پھر قرآن حکیم آیا اس کی شان بھی یہی ہے کہ جو کتاب ربانی تمہارے پاس ہے اس صحیح اور سچی کتاب کی یہ قرآن تصدیق کرتا ہے البتہ کہیں کہیں اس میں کچھ ترمیم بھی کرتا ہے۔ مگر یہ واضح کرتے ہوئے کہ پہلا حکم یہ تھا جو تورات میں ہے اور اب حکم یہ ہے کیونکہ پہلا حکم شریعت برحق کا حقیقی منشا نہیں تھا بلکہ کسی خاص سبب کی بنا پر تھا جو اب ختم ہو گیا حقیقی منشاء شریعت اور دین کی مکمل و اعلیٰ تعلیم یہ ہے جو اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ پیش کی جا رہی ہے۔

> ''ان کے بعد ہم نے عیسیٰ بن مریم (علیہما اسلام) کو مبعوث کیا جو تصدیق کر رہے تھے توریت کی جو ان سے پہلے آ چکی تھی اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو انجیل دی اس میں ہدایت اور روشنی ہے یہ تصدیق کر رہی ہے تورات کی جو اس سے پہلے آ چکی ہے اور یہ انجیل ہدایت و نصیحت ہے اہل تقویٰ کے لیے۔''

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (سورہ مائدہ)

> ''اور ہم نے نازل کی آپ پر کتاب (قرآن) مکمل سچائی کے ساتھ یہ تصدیق کر رہی ہے اس کتاب کی جو پہلے آ چکی ہے (بائبل کی) اور اس پر نگراں (چیکنگ کرنے والی تحریف اور اصل میں امتیاز (قائم کرنے والی) ہے۔''

قرآن خود اپنے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت یہی دیتا ہے کہ اس کی تعلیمات بعینہ وہ ہیں جو کتب سابقہ میں تھیں جو خداوندی تعلیمات مانی گئیں، ان میں سر مو فرق نہیں۔ اگر معاذ اللہ کتب سابقہ یا قرآن شریف دونوں کے منبع اور سرچشمے جدا جدا ہوتے تو یقیناً اختلاف ہوتا اور جس طرح دو مرکزوں کے رجحانات علیحدہ علیحدہ ہوا

کرتے ہیں ان کی تعلیمات میں بھی بہت کچھ اختلافات ہوتے۔

④ غیر مناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر سابقہ اُمتوں اور امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کی استعدادوں اور صلاحیتوں کا بھی ہلکا سا موازنہ ہو جائے۔

یہ تو آپ نے سیرت کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ غزوہ بدر کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین سے استمزاج کیا تو انصار کے نمائندوں نے جواب دیا تھا:

''یارسول اللہ ہم بنو اسرائیل نہیں ہیں کہ کہدیں کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر جنگ کر لیں ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے ہم امت محمدیہ ہیں۔ آپ حکم فرمایئے۔ خدا کی قسم حکم ہوگا تو ہم سمندروں میں گھوڑے ڈال دیں گے۔ ہم وہ ہیں کہ آپ کے دائیں، بائیں آگے، پیچھے لڑیں گے۔ جانیں دیں گے ناموس رسول پر قربان ہوں گے۔''

یہ بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ وہ حواری جنہوں نے دعویٰ کیا تھا۔ نحن انصار الله (ہم اللہ کے مدد گار ہیں) جب وقت آیا تو انہوں نے اللہ میاں سے وظیفہ کا مطالبہ کر دیا کہ ''ہمارے کھانے پینے کا انتظام ہو جائے تو ہم عبادت بھی کریں گے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اس کی تائید کرتے ہوئے سفارش کرنی پڑی۔ سورہ مائدہ ے رکوع (۴) کی آخری آیتیں ملاحظہ فرمایئے جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حواریوں کا مکالمہ بیان کیا گیا۔

حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تیرے خدا کو یہ قدرت ہے کہ ہمارے لیے آسمان سے مائدہ اتار دیا کرے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فورا فرمایا: توبہ توبہ کیا کہہ رہے ہو۔ اگر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو تو اس توہین آمیز لب ولہجہ سے پرہیز کرو۔

حوارئین۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری خوراک کا انتظام ہو جائے اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم پوری طرح جان لیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سچ ہے اور ہم دنیا بھر کے لیے شاہد بن جائیں۔

یہ تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور کے انصار اللہ۔

لیکن یہ انصار اللہ جن کو خاتم الانبیاء ﷺ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا وہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ سے وظیفہ کا مطالبہ تو کیا کرتے جو کچھ خود ان کے پاس تھا اس میں بھی حضرات مہاجرین کو برادر حقیقی کی طرح شریک کیا۔ خوراک کے لیے اللہ تعالیٰ سے مائدہ کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس دوسروں کے لیے مائدہ رساں بنے۔ مسلمان تو مسلمان، اسیرانِ جنگ کی خوراک کا مسئلہ پیش آیا تو اس کو بھی اسی طرح حل کیا کہ خود بھوکے رہے اور ان کا پیٹ بھرا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ان کی حراست اور نگرانی میں دیئے گئے تھے۔

یہی جوہر ہے جس کی تصدیق کے لیے عرش معلیٰ سے فرمان ربانی کی آیتیں نازل ہوئیں۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورہ حشر ع ۱)

''یعنی وہ حضرات جو پہلے سے دارالسلام (مدینہ) میں سکونت پذیر تھے جنہوں نے ایمان میں بھی اپنا ایک مقام بنایا (یعنی حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین) ان کی شان یہ ہے کہ وہ ان سے محبت کرتے ہیں جو اپنا وطن چھوڑ کر ان کے یہاں آتے ہیں اور جو کچھ ان مہاجرین کو دیا جاتا ہے اس سے یہ باشندگان قدیم (انصار) اپنے دل میں کوئی گھٹن نہیں محسوس کرتے (بلکہ اس کے برخلاف) ان مہاجرین کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں اور اگرچہ انصار خود بھوک اور فاقہ میں مبتلا ہوں خود ان کو خالی پیٹ رہنا پڑے تب بھی یہ ان (مہمانوں) کو مقدم رکھتے ہیں (بیشک یہ وہ ہیں جو حرص سے بری ہیں) اور جو بچایا گیا حرص نفس سے تو وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔''

اب یہاں زیر بحث مسئلہ میں موازنہ کیجئے:

ایک طرف یہود اور نصاریٰ ہیں جو تعلیمات خداوندی کو فراموش کر رہے ہیں، مسخ کر رہے ہیں، ان کو اس طرح چھپا رہے ہیں کہ ان تعلیمات کی کرن بھی ملنی مشکل ہو رہی ہے اور دوسری جانب یہ امت محمدیہ ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال گذرنے کے بعد بھی اپنے افعال و اعمال میں خواہ کتنی بھی کمزور ہے، اس کے اخلاق و روحانیت کے جوہر خواہ کتنے ہی زنگ خوردہ ہو گئے ہیں مگر وہ ذکر، وہ قرآن حکیم جس کی حفاظت کی بشارت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس کو سینہ سے لگائے ہوئے تقریباً چودہ سو برس گذر چکے ہیں مگر اس کے کسی ایک حرف، کسی ایک شوشہ یا کسی ایک زیر یا زبر میں بھی فرق نہیں آیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جو اس وقت قلمبند نہیں ہو سکے تھے کچھ اغراض پرستوں نے یا کچھ نادان دوستوں نے ان میں کچھ آمیزش کر دی تھی تو علماء محدثین کی جماعت پیدا ہوئی اس نے تحقیقات میں عمریں صرف کیں اور دودھ کا دودھ اور پانی الگ کر کے رکھ دیا۔ آج صحاح ستہ خصوصاً صحیحین کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی ارشادات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان وحی ترجمان سے صادر ہوئے تھے۔ وللہ الحمد۔ محمد میاں عفی عنہ

صحابہ کرام اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم

تورات اور انجیل کی شہادت

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰاةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (سورہ فتح ع ۴)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو آپ کے ساتھ (۸۰) ہیں وہ سخت ہیں کافروں پر مہربان ہیں اپنے آپس میں، تم ان کو دیکھو گے رکوع کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہوئے طلب کرتے رہتے ہیں خدا کا فضل اور اس کی خوش نودی، ان کی نیکی کی علامت ان کے چہروں میں (نمایاں) ہے سجدہ کے اثر سے یہ ہے ان کی شان (اور بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب ان کی کہاوت) تورات میں اور ان کی ممتاز خصوصیت (کہاوت) جو انجیل میں ضرب المثل ہے یہ ہے جیسے کھیتی۔ نکالا اس نے اپنا پٹھا (یعنی کیلیں نمودار ہوئیں) پھر ان کو قوی کیا (بقول حضرت شاہ صاحب۔ ان کی کمر مضبوط کی) یعنی وہ کیلیں بڑھیں اور مضبوط ہوئیں۔ پھر موٹی ہوئیں۔ پھر کھڑی ہو گئیں اپنی نال پر یعنی تنہ دار پودا بن گئیں جن کو دیکھ کر کاشتکار خوش ہونے لگے۔ دوسری جانب۔ یہ کافروں کے غیظ و غضب کا باعث بن گئیں (بقول حضرت شاہ صاحب) ان کا جی جلنے لگا۔''

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سباق آیت میں ان بااخلاص صحابہ کرام کا ذکر ہے جن کو سفر حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا تھا اس آیت میں بشارت دی گئی ہے کہ دنیا کی تمام امتوں اور اقوام عالم پر ان کو غلبہ اور اقتدار حاصل ہوگا۔ (۸۱)

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ فضائل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے ہم جنسوں سے اچھا معاملہ ہو۔ دوسرے یہ کہ خود اپنے نفس کی تہذیب و اصلاح بہترین ہو۔ مذکورہ بالا آیات میں دونوں قسم کی فضیلتیں صحابہ کرام کے لیے ثابت کی گئی ہیں۔

آیت بالا میں شدت اور رحم کا مدار کفر اور اسلام کو قرار دیا گیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہوا کہ ان حضرات کا معاملہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اپنی نفسانی اغراض اور ذاتی نفع و نقصان کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ ان حضرات کی قوت

غضب اور قوت رحم دونوں خداوند عالم کے غضب اور اس کے لطف وکرم کے تابع ہیں۔
جو لوگ بارگاہ الٰہی میں مردود ہیں جو حق وصداقت سے منکر ہوکر غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے ہیں ان سے یہ ناراض بھی ہیں۔ ان کی نگاہیں بھی ان کے حق میں سخت ہیں اور جو لوگ حق پرستی اور حق پسندی کے باعث حضرت حق جل مجدہ کی بارگاہ میں مقبول ہیں اور جو اپنی راست بازی کے سبب سے رحمت الٰہی کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان پر یہ مہربان بھی ہیں۔ ان کے لیے ان کے دل بھی شفقت ورحمت سے لبریز ہیں۔ یہ تخلقوا باخلاق اللہ کی ایک مکمل صورت ہے کہ یہ حضرات غضب خداوندی یا رحم وفضل یزدانی کے مظہر بن گئے ہیں۔
فضیلت کی دوسری قسم یہ ہے کہ یہ حضرات کثرت رکوع وسجود اور کثرت نماز کے ذریعہ اپنے نفس کی تہذیب واصلاح میں مشغول رہتے ہیں جب بھی آپ ان کو دیکھیں گے تو وہ رکوع میں ہوں گے یا بارگاہ خداوندی میں اپنی پیشانیوں کو زمین پر رکھے ہوئے ہوں گے یہی نماز جو مومنین کی معراج ہے (۸۲) ان حضرات کا شب وروز کا محبوب ترین مشغلہ ہے حتی کہ نور باطن کا اثر ان کے ظاہر پر بھی پڑ گیا ہے۔ چہرے کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ ان پر نظر پڑ جائے تو خدا یاد آنے لگے۔ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود اسی کیفیت کا اعجازی بیان ہے۔ کمال اخلاص کو بیان کرتے ہوئے۔ یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا ارشاد ہوا ہے کہ ان کا نصب العین اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش ہے رات دن اسی تگ ودو میں رہتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو رضاء الٰہی حاصل کی جائے۔ یہ تمام کیفیت اور یہ خشوع وخضوع جس کے آثار چہرے پر ہیں عارضی اور وقتی نہیں ہے کہ وسوسہ یا خاطر نفس کے طور پر ایک طرف سے آئے اور دوسری طرف کو نکل جائے بلکہ ایک ملکہ راسخہ ہے جو ان کی طبیعتوں میں جم گیا ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے ان پاکبازوں نے اپنی زندگیاں صرف کر دی ہیں۔
یہ تورات کی بشارت تھی۔ اب ملاحظہ فرمایئے انجیل میں ان کی مثال پیش کرتے ہوئے ارشاد ربانی ہے۔ کزرع اخرج شطاہ (الایۃ)
حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں: اس فقرہ کا پہلا حصہ تحریک اسلام کے ابتداء وآغاز پر دلالت کرتا ہے اور آخری حصہ اسلام کے نشوونما کے مکمل ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور شجرہ اسلام کی اس افزائی کو بتا رہا ہے کہ اس کے بعد افزونی اور بڑھتی کا کوئی درجہ نہیں رہا کرتا۔
اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور آپ کے مقدس پیغام نے تدریجی طور پر ابتدا سے انتہا کی طرف ترقی کرتے ہوئے اتنے مدارج اور مراحل طے کیے کہ ان کی گنتی مشکل ہے لیکن کلی اور اصولی طور پر اس سفر کی صرف چار منزلیں سامنے آتی ہیں۔
اوّل: یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں مبعوث ہوتے ہیں تمام اہل مکہ شرک وکفر میں مبتلا ہیں اور دین ابراہیمی میں جو تحریفات آباؤ اجداد کے زمانہ سے چلی آ رہی ہیں ان کو صحیح اور درست سمجھ کر ان پر مطمئن ہیں۔ جیسے ہی رسول اللہ ﷺ ان کے سامنے دعوت اسلام پیش کرتے ہیں یہ لوگ اس کے رد وانکار کے لیے اٹھ کھڑے

ہوتے ہیں۔ یہ اسلام کی ابتدا ہے۔ اس پرآشوب دور میں اس کی بھی قدرت نہیں ہے کہ اعلانیہ اسلام کا اظہار کیا جاسکے۔

دوم: یہ کہ مشرکین کے پنجہ سے رہائی پاکر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی جاتی ہے دشمنان خدا کے ساتھ جہاد کا سلسلہ ہوتا ہے۔ قریش کے ساتھ براہ راست اور بالقصد اور غیر قریش کے ساتھ ضمنی اور تبعی طور پر معرکہ آرائیاں ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ مکہ معظمہ فتح ہوجاتا ہے اور سارا حجاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری کے لیے گردن جھکا دیتا ہے اور زمین کے ایک رقبہ اور علاقہ پر حکمرانی کی شکل نمایاں ہوجاتی ہے۔ جب یہ مرحلہ انتہا کو پہنچتا ہے۔ آنحضرت ﷺ دار دنیا سے رفیق اعلیٰ کی طرف انتقال فرماجاتے ہیں۔

سوم: یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت صدیق اکبر اور پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہم دنیا کے دو عظیم الشان بادشاہ قیصر اور کسریٰ سے جہاد کا قصد کرتے ہیں۔ ان دو بادشاہوں کا اقتدار تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے اور ان کی حکومتیں اس زمانہ کی سیاسیات میں دنیا کی مرکزی طاقتیں (یا دو بلاک) ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں شہنشاہوں کی شوکت وحشمت اسلامی سطوت واقتدار کے سامنے پامال ہوجاتی ہے اور اس کا نام ونشان بھی دنیا میں باقی نہیں رہتا۔ (۸۳)

چہارم: وہ کام جو پہلے کے مقابلہ میں چھوٹے تھے مگر اپنے مفاد اور مقصد کے لحاظ سے بہت اہم تھے یعنی مفتوحہ ممالک میں نظام اسلام کو قائم کرنا۔ مثلاً وہ راجہ مہاراجہ جو چھوٹے چھوٹے ملکوں پر حکمراں تھے اور قیصر وکسریٰ کے باجگذار ہوتے ہوئے اپنے اپنے علاقوں میں مستقل حکمراں اور قوت وشوکت کے مالک تھے ان کو زیرنگیں کرنا۔ مفتوحہ ممالک میں مسجدیں تعمیر کرانا۔ قاضیوں (اسلامی ججوں) حدیث وقرآن کے معلمین مفسرین اور مفتی صاحبان کا تقرر کرنا۔ (وغیرہ)

تاریخ کے ان کھلے ہوئے واقعات کو سامنے رکھ کر آیت کریمہ کی دوبارہ تلاوت کیجئے۔ پس اخرج شطاه فـــازره (کھیتی کی کپلیں نمودار ہوئیں (سبزہ نمایاں ہوا) پھر ان کو قوی کیا) یہ پہلے دو مرحلوں کی طرف اشارہ ہے۔ فاستغلظ (موٹی ہوئی) سے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کی جانب ایما ہے۔ فاستوی علی سوقه پھر کھڑی ہوگئیں اپنی نال پر) کی مثال ان کارناموں پر صادق آتی ہے جو حضرت عثمان ؓ کے زمانہ میں واقع ہوئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اگر چہ کچھ عرصہ تک مسلمانوں میں اختلاف وافتراق پیدا ہوگیا تھا لیکن پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ افتراق ختم ہوا اور پھر صورت یہ ہوئی کہ کبھی تو خلیفہ وقت کی جدوجہد سے اور کبھی محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی حکمت بالغہ سے دعوت اسلام کی اشاعت وتبلیغ کے لیے مسلمانوں میں اتحاد واتفاق پیدا ہوا اور اسلامی مقاصد کے لیے ان کی متفقہ جدوجہد جاری ہوگئی۔ یہ صورت بھی فاستوی علی سوقه کی مثال کا مصداق بن سکتی ہے۔ یعجب الزراع جس کو دیکھ کر کاشتکار خوش ہونے لگے۔ یہ لفظ حضرت حق جل مجدہ کی مکمل رضامندی کی طرف اشارہ کررہا ہے

کیونکہ اس کھیتی کے بونے والے حضرت حق ہی ہیں جل مجدہ۔ (۸۵)

حضرت شاہ صاحب ان آیات کی تشریح وتفسیر کے بعد فرماتے ہیں:

یہاں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرات خلفاء راشدین کی عظمت و جلالت اور اسلام کی حمایت میں ان کا استقلال و استقامت۔ پھر ان بزرگوں نے اسلام کی تائید وتقویت کے لیے جو کچھ جدوجہد کی اور دشمنان خدا سے جو کچھ جہاد و غزوات کیے اور جس طرح کلمۃ اللہ کو بلند کیا یہ سب عنداللہ مقبول ہے ایسا مقبول کہ اس کی بشارت بہت پہلے سے حضرت حق آسمانی کتابوں میں دے چکے ہیں۔ (۸۶)

دعاؤں اور بشارتوں کے باب کو ہم مندرجہ ذیل دو روایتوں پر ختم کرتے ہیں۔ (۸۷)

حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کے متعلق تورات میں کیا لکھا ہے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ سطر اول میں ہے (یعنی پہلا فقرہ یہ ہے) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اللہ کے برگزیدہ اور پسندیدہ بندے ہیں نہ سخت گو نہ سخت مزاج نہ بازاروں میں شور مچانے والے۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور بخش دیتے ہیں۔ جاء پیدائش مکہ ہو گی۔ دار ہجرت طیبہ (مدینہ) ہو گا۔ ان کا ملک شام میں ہو گا۔ (شام پر ان کی حکومت ہو گی)

دوسری سطر میں ہے (دوسرا فقرہ یہ ہے)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی اُمت بہت حمد کرنے والی ہو گی۔ مسرت اور مصیبت، نرمی اور سختی۔ غرض ہر حالت میں خدا کی حمد کیا کرے گی۔ ہر ایک منزل۔ ہر ایک مرتبہ اور درجہ میں خدا کی شکر گذار رہے گی۔ ہر بلندی کے موقعہ پر خدا کی بڑائی اور اس کی عظمت کا اعتراف و اظہار کرے گی۔ آپ کے امتی دھوپ کا ہر وقت لحاظ رکھا کریں گے۔ (تا کہ نمازوں کو وقت پر ادا کر سکیں) جب نماز کا وقت آیا کرے گا خواہ وہ کسی حالت میں ہوں نماز ادا کریں گے۔ حتی کہ اگر کوڑے کرکٹ کی میلی جگہ پر ہوں جب بھی نماز وقت پر ادا کریں گے۔ کمر پر تہ بند (ازار) باندھا کریں گے۔ اپنے اعضا (وضو کے ذریعہ) ہاتھ پاؤں اور چہروں کو پاک صاف اور روشن رکھا کریں گے۔ اوقات شب میں ان کی آوازیں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح گونجا کریں گی۔ (۸۸)

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ نے حضرت کعب احبار ؓ سے دریافت کیا کہ تورات میں رسول اللہ ﷺ کے کیا اوصاف تم نے پڑھے ہیں۔ حضرت کعب ؓ نے وہی اوصاف بیان فرمائے جو پہلی روایت میں گذر چکے ہیں۔ (۸۹) فرق صرف اتنا ہے کہ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ نمازوں میں ایسے ہی صف بندی کیا کریں گے جیسے میدان جنگ میں۔ (۹۰) نیز یہ کہ ان کی گونج ان کی سجدہ گاہوں میں ایسی ہو گی جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔

تنبیہ: (۱) نماز میں چلا کر رونا جائز نہیں۔ اس سے بعض صورتوں میں نماز فاسد ہو جاتی ہے اب ایک طرف نماز کا یہ احترام ہو اور دوسری جانب قلب پر رقت طاری ہو تو اس صورت میں تنفس کی آواز عجیب طرح کی ہو جاتی

ہے۔اس آواز کوان روایتوں میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے تعبیر کیا گیا ہے اور بظاہر زیادہ صحیح تعبیر وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق صحیح احادیث میں وارد ہے کہ شب کو تہجد پڑھتے ہوئے ان کے سینوں سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے جوش کے وقت ہنڈیا سے آواز نکلتی ہے۔جس کو ہماری اصطلاح میں کھدکھداہٹ کہا جاتا ہے۔

(۲) یہاں حضرات ارباب طریقت یہ بھی خیال فرمائیں کہ یہ کیفیت آسانی سے پیدا نہیں ہوتی بہت سے مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد حاصل ہوتی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تمام مجاہدوں ریاضتوں اور سلوک وطریقت کے تمام اعمال کا منشاء اور انتہائی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ خشوع وخضوع اس طرح طبیعت ثانیہ بن جائے کہ جیسے ہی اللہ کا ذکر شروع ہو۔قلب پر رقت طاری ہو جائے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا

(سورہ انفال ع ۱)

''مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے ان کے دل لرز جائیں ان پر رقت اور خشیہ طاری ہو جائے اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیتیں پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جائے حسن قبول کے لیے ان کے سینے کھل جائیں۔''

(۳) ہمارا ایمان ہے کہ تزکیہ باطن،تقرب الی اللہ،خشوع،عشق خدا اور محبت مولا کا جو درجہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حاصل تھا وہ پوری امت میں کسی کو نصیب نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت وہ تریاق اور وہ کیمیا تھی جو چشم زدن میں سنگریزہ کو پارس کی پتھری اور لعل بدخشاں بنا دیتی تھی۔یہ آیت اور مذکورہ بالا روایتیں ہمارے اس عقیدہ کی تصدیق کرتی ہیں۔

(۴) کچھ وہ ہیں جو سلسلہ ارشاد وطریقت کا انکار کرتے ہیں اگر ان منکرین کے دلوں میں رقت وتضرع کی یہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے تو بیشک ان کا انکار کر دینا صحیح ہو سکتا ہے لیکن اگر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی تو ان کو حق نہیں پہونچتا کہ وہ سلسلہ ارشاد وطریقت اور اہل تصوف کے ان مشاغل کا انکار کریں جن کا مقصد یہی ہے کہ خشوع و خضوع اور حضور وشہود کی وہ کیفیت پیدا ہو کہ ایک عبادت گذار اس طرح عبادت کر سکے جیسے وہ خدا کو دیکھ رہا ہے جس کی نماز صحیح معنی میں مناجات رب ہو اور جس کی مناجات سوز جگر کا ساز ہو۔

صحابہ کرام اور ارشادات ربانی

مدح وستائش۔اوصاف وخصائل جلیل القدر کارنامے

انبیاء سابق اور تورات وانجیل کی شہادتوں کے بعد صحابہ کرام کے متعلق خود قرآن پاک کی شہادتیں ملاحظہ فرمایئے۔کس طرح ان کے اوصاف وکمالات کو سراہا گیا ہے اور کس طرح واضح کیا گیا ہے کہ ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے جو دعا کی تھی اس کا مصداق یہی حضرات ہیں۔رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

دعاء ابراہیمی کا ظہور:

① لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ٥

(سورہ آل عمران ع ۱۷ ج ۴)

''اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا اہل ایمان پر کہ بھیجا ان میں رسول انہیں میں کا۔پڑھتا ہے ان کے سامنے اللہ کی آیتیں (اور اخلاقی اور روحانی طور پر) سنوارتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور دانائی (بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب۔کام کی بات) اگرچہ تھے وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا پہلے نقل کی جاچکی ہے۔اس کے الفاظ کو ملاحظہ فرمایئے اور پھر اس آیت کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو الفاظ ارشاد فرمائے گئے ہیں ان کو ملاحظہ فرمایئے اور غور کیجئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کس طرح لفظ بلفظ پوری ہو رہی ہے۔

② بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ کیوں قرار دیا اس کی وجہ اور اس حکم پر اہل کتاب اور کفار مکہ کے لایعنی مضحکہ خیز اعتراضات کا جواب دینے کے بعد ارشاد ہے:

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (سورہ بقرہ ع ۱۸ ج ۲)

''پس نہ ڈرو ان سے اور ڈرو مجھ سے اور (یہ سب کچھ اس لیے بھی کیا کہ) پورا کروں تم پر فضل اپنا اور شاید تم راہ پا جاؤ (جس طرح اللہ تعالیٰ کے یہ انعامات ہیں کہ حقیقی قبلہ جو اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا گھر ہے وہ مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا اور جس طرح مسلمانوں کو

امت وسط (افضل امت) قرار دیا گیا۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا یہ انعام بھی ہے کہ) بھیجا تم میں رسول تم میں کا پڑھتا ہے تمہارے سامنے ہماری آیتیں اور سنوارتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب اور دانش مندی اور سکھاتا ہے تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ پس یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو۔"

③ سورہ جمعہ میں ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیَاتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ (سورہ جمعہ، رکوع ۱)

وہ اللہ (جس کی ہر چیز تسبیح پڑھتی رہتی ہے جو ملک قدوس عزیز و حکیم ہے۔) وہی ہے جس نے مبعوث فرمایا ان پڑھوں میں رسول انہیں میں کا۔ جو پڑھتا ہے ان کے سامنے اس کی آیتیں اور سنوارتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے کتاب اور عقلمندی اور اس سے پہلے پڑے تھے صریح بھلاوے میں۔ (شاہ عبد القادر صاحب)

ایمان واطاعت:

① اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔ (سورہ بقرہ ع ۴۰)

"مانا رسول نے اس کو جو نازل کیا گیا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے سب نے مانا اللہ کو، اس کے فرشتوں کو، اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو کہ ہم فرق نہیں کرتے اس کے رسولوں میں اور سب نے کہا (اعلان کیا) ہم نے اللہ کے احکام سنے۔ ان کو قبول کیا۔ اے ہمارے رب ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور ہم سب کو تیری ہی طرف واپس آنا ہے۔"

② اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ کَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ (سورہ محمد ع ۱)

"وہ لوگ جو منکر ہوئے اور جنہوں نے روکا اللہ کی راہ سے اللہ تعالیٰ نے کھودیئے ان کے کیے (عمل) اور جو یقین لائے اور کیے بھلے کام اور مانا اس کو جو اترا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وآلہ وسلم پر اور وہی ہے سچا دین۔ ان کے رب کی طرف سے ان سے اتاریں ان کی برائیاں اور سنوارا ان کا حال یہ اس (بنا) پر کہ جو منکر ہیں وہ چلے جھوٹی بات پر اور جو یقین لائے انہوں نے مانی سچی بات اپنے رب کی طرف سے۔ یوں بتاتا ہے اللہ لوگوں کو ان کے احوال۔''

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ سورہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) کو اول سے آخر تک پڑھا جائے تو واضح ہوگا کہ اس سورت کا موضوع ہی یہ ہے کہ سچے مومن اور کافر و منافق کے درمیان افعال واقوال اور نتائج وعواقب کے لحاظ سے جو امتیازات ہیں ان کو واضح کر دیا جائے۔ اس کے ضمن میں وہ چیزیں بھی آ گئی ہیں جو خلافت خاصہ کے لوازم یا خلافت خاصہ کے اضداد ہیں اور اگرچہ آیات کے الفاظ عام ہیں مگر نہایت لطیف پیرایہ میں ان مسلمانوں یا منافقوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو نزول سورت کے وقت موجود تھے اور ان کے اوصاف بیان کیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا اور اس کے بعد وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ کی دلالت اور اس انداز تعبیر کا مفہوم یہی ہے کہ دونوں جماعتیں نزول آیت کے وقت موجود ہیں۔

② ایسے ہی ارشاد ربانی اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ پر غور کیجئے۔ ترجمہ یہ ہے (اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم ثابت رکھے گا۔) ہم نے دیکھا کہ نصرت خداوندی نے صحابہ کرام اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی مساعدت کی اور جب کہ یہ مساعدت اور نصرت ان کے لیے مخصوص ہے جو اللہ کے دین کی مدد کریں تو گویا کلام ربانی نے اعتراف کر لیا کہ صحابہ کرام اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کی۔ لہٰذا دخول جنت کا وہ ثواب جس کا اعلان اگلی آیت میں ہے یہ حضرات اس کے بھی مستحق ہو گئے۔ آیت یہ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ

''بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان کو جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے جنتوں میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔''

③ اس کے بعد کی آیات میں ارشاد ہے۔

وَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ ھِیَ اَشَدُّ قُوَّۃً مِّنْ قَرْیَتِکَ الَّتِیْٓ اَخْرَجَتْکَ اَھْلَکْنٰھُمْ فَلَا نَاصِرَ لَھُمْ۔

''کتنی ہی بستیاں تھیں جو کہیں زیادہ تھیں زور وقوت میں تیری اس بستی سے جس نے تجھ کو نکالا (یعنی مکہ) ہم نے ان کو تباہ کر دیا (بقول حضرت شاہ صاحب کھپا دیا) پس نہیں ہے ان کا کوئی مددگار۔''

اس آیت میں معین طور پر ایک جماعت کا ذکر ہے جس نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے شہر سے نکالا ہے یہ جماعت کوئی وہمی یا خیالی جماعت نہیں بلکہ قریش کی وہی جماعت ہے جس کے مظالم آج تک دنیا کو

معلوم ہیں اس کے بالمقابل دوسری جانب ارشادِ ربانی ہے:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (الآیۃ)

''کیا وہ شخص جو اپنے رب کی جانب سے کھلی ہوئی واضح دلیل رکھتا ہو اس کی مانند ہوگا جس کی نظر میں اس کا عمل بد آراستہ اور خوبصورت ہو اور جو لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے نفس کے بندے ہیں۔''

اس آیت میں ہوا پرستوں اور ان عقل پرستوں کے مقابلہ میں (جو اپنی تھیوریوں اور اپنے اختراعی نظریات پر نازاں ہیں) ایسی جماعت کا ذکر ہے جس کے پاس اس کے رب کا دیا ہوا بیّنہ موجود ہے یہ مقابل جماعت کون سی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ مہاجرین اور انصار تھے۔ جو رسول اللہ ﷺ کے فیض زیارت سے قابل رشک ابدی سعادت حاصل کر کے علی بینۃ من ربہ کا زندہ ثبوت اپنے ایقان واذعان اور اپنے کردار سے پیش کر رہے تھے۔ اس سے متصل آیت میں (جو درج ذیل ہے) ان مخلصین کا ثواب ذکر کر دیا گیا ہے آیت یہ ہے:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (۴۷-۱۵)

''احوال اس بہشت کا جس کا وعدہ کیا گیا ہے اہل تقویٰ سے یہ ہے کہ اس میں نہریں ہیں پانی کی جو بو نہیں کرے گا اور نہریں ہیں دودھ کی جس کا مزہ نہیں بدلا اور نہریں ہیں شراب کی جس میں مزہ ہے پینے والوں کو اور نہریں ہیں شہد کی جھاگ اترا (صاف وشفاف) اور ان کے لیے وہاں سب طرح کے میوے ہیں اور معافی ہے ان کے رب کی طرف سے۔''

اس کے بعد اسی سورہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آیت ہے:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ

''پھر کیا تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو خرابی ڈالو ملک میں اور توڑ و اپنے رشتے ناتے۔''

اس آیت میں ان منافقین اور فاسقین کے اوصاف کی طرف بھی اشارہ ہے جو خلافت راشدہ کے مخالف ہوں گے یعنی ان کا کام ہوگا خدا کے ملک میں فساد بپا کرنا اور قطع رحمی۔

اس سے مفہوم مخالف کے طور پر خلافت راشدہ کے اوصاف بھی معلوم ہو جائیں گے یعنی خلافت راشدہ ایسی حکومت ہوگی جو فساد فی الارض کے بجائے ملک میں اصلاحات نافذ کرے گی۔ ملک وملت کی تعمیر، صلہ رحمی اور ہر ایک چیز کو جانچ تول کر اس کی جگہ پر قائم کرنا خلافت راشدہ کے اوصاف ہوں گے۔

اس سلسلے میں چند روایتیں بھی درج کی جاتی ہیں۔ان میں اگر چہ حضرات صحابہ یا حضرات خلفاء رضی اللہ عنہم کے فضائل نہیں بیان کیے گئے مگر حضرات خلفاء رضی اللہ عنہم کا ان میں تذکرہ اس طرح ہے جس سے لامحالہ ان کا علمی اور عملی کمال ثابت ہوتا ہے یہی اس باب کا مقصد ہے۔

① حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا لا الہ الا اللہ اور استغفار جہاں تک کثرت سے ممکن ہو پڑھتے رہو۔کیونکہ ابلیس کہا کرتا ہے کہ میں نے گناہ کرا کر لوگوں کو ہلاک اور تباہ کر دیا اور انسانوں نے لا الہ الا اللہ پڑھ کر مجھ کو برباد کر دیا جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے (مذہبی رنگ کی) خواہشات پیدا کر کے ان کو برباد کرنا شروع کر دیا۔اب وہ کفر و شرک میں مبتلا ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہدایت یافتہ ہیں (یہ بدعات کی شان ہے کہ انسان اپنے رجحانات اور خواہشات کو مذہب کی رنگت دے دیتا ہے اور غیر دین کو دین سمجھ کر گمراہ ہو جاتا ہے)

② حضرت طلحہ بن عبید اللہ۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ کو غمگین دیکھا،فرمایا: کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے تھے کہ مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر مرنے کے وقت انسان اس کو کہہ لے تو خدا اس کے کرب کو لامحالہ دور کر دے گا اور اس کے رنگ کو روشن کر دے گا اور اس کے سامنے وہ چیزیں آئیں گی جو اس کو مسرور کریں گی مجھے افسوس ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تک مجھے ایسا موقع نہ مل سکا کہ میں وہ کلمہ دریافت کر سکتا۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے وہ کلمہ معلوم ہے۔حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا بظاہر آپ کو کوئی ایسا کلمہ معلوم نہ ہوگا جو اس کلمہ سے زیادہ عظیم المرتبہ ہو جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا (ابو طالب) کو ان کی وفات کے وقت فرمائش کی تھی۔یعنی لا الہ الا اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔واللہ یہی کلمہ ہے۔

③ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔جو شخص وفات کے وقت لا الہ الا اللہ کا عقیدہ رکھتا ہو،وہ جنت میں داخل ہوگا۔

④ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔آپ نے ایک چیخنے والے کی آواز سنی۔آپ نے اپنے غلام "یرفا" سے فرمایا۔دیکھو کیسی آواز ہے۔یرفا دیکھنے گئے اور پھر واپس آ کر بیان کیا کہ قریش کی ایک لڑکی کی ماں فروخت کی جا رہی ہے۔وہ لڑکی رو رہی ہے (یعنی کسی قریشی نے زر خرید باندی کو ام ولد بنا رکھا تھا جس سے لڑکی پیدا ہوگئی۔اب وہ اس باندی کو بیچ رہا ہے تو اس کی لڑکی جو قریشی شخص کی صلب سے ہے رو رہی ہے) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فوراً حضرات مہاجرین اور انصار کا اجلاس طلب کر لیا۔چنانچہ تھوڑی دیر میں مہاجرین اور انصار جمع ہو گئے یہاں تک کہ حجرہ اور مکان سب بھر گیا۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

اما بعد۔کیا آپ حضرات کے علم میں ہے کہ جو تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائیں کیا ان میں قطع رحمی کی تعلیم بھی ہے (کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلقات قرابت کو توڑنے اور رشتہ داروں سے بدسلوکی

کی تعلیم دی ہے) صحابہ کرام نے عرض کیا: ہرگز نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (مگر) آپ لوگوں میں یہ گناہ پھیلنے لگا ہے (حالانکہ شرعاً حرام ہے) اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت کی:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ

''کیا تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو خرابی ڈالو ملک میں اور توڑو اپنے رشتے ناتے۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اس سے بڑھ کر قطع رحمی کیا ہوسکتی ہے کہ ایک عورت جو تمہارے یہاں ہے اس کی ماں فروخت کی جارہی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو وسعت اور استطاعت دے دی ہے۔

حضرات حاضرین نے عرض کیا۔ آپ جو مناسب سمجھیں حکم فرمادیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام صوبجات کو ہدایت بھیج دی کہ کسی آزاد شخص کی ماں فروخت نہ کی جائے کیونکہ یہ قطع رحمی ہے اور یہ جائز نہیں (چنانچہ یہی فتویٰ ہے کہ اگر کوئی آزاد شخص کوئی باندی خرید کر اس سے ایسا تعلق قائم کرلے جس سے اس کے بچہ پیدا ہو جائے تو بچہ آزاد ہوگا اور اس کی ماں (جس کو ام ولد کہا جاتا ہے) کی بیع ناجائز ہوگی۔ وہ اس کو بیوی کی طرح رکھے گا)

⑤ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ۔ ایک روز ایسا ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ (پس کیا قرآن پاک کو غور سے نہیں پڑھتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں) یمن کا ایک نوجوان مجلس میں حاضر تھا۔ اس نے برجستہ کہا۔ بات یہی ہے ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ ہی یہ کرسکتا ہے کہ ان کو کھول دے یا ان کے دلوں میں ایسی کشادگی پیدا کردے کہ تالے بیکار ہوجائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نوجوان کی بات پسند آئی۔ فرمایا۔ بیشک ٹھیک کہتے ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے۔ اس نوجوان کی شائستہ گفتگو نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں جگہ کرلی۔ یہاں تک کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ نے اس نوجوان کو تلاش کرایا اور اس کو عامل بنادیا (کوئی خدمت سپرد کردی) یہ روایت حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ مگر حضرت سہل بن سعد فرماتے ہیں کہ اس کو عامل نہیں بنایا گیا کیونکہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تلاش کرایا تو معلوم ہوا کہ اس کی وفات ہوگئی ہے۔ (ازالۃ الخفاء ص ۲۳۵)

ایثار:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (سورہ بقرہ ع ۹)

''اور کوئی ہے کہ بیچتا ہے اپنی جان۔ تلاش کرتا ہے خوشنودی اللہ تعالیٰ کی اور اللہ شفقت

رکھتا ہے بندوں پر۔‘‘

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دو متضاد اور مختلف جماعتوں کا ذکر فرما رہے ہیں ایک کی ستائش فرما رہے ہیں اور دوسری کی مذمت۔ تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی رضا جوئی میں وہ اپنی جانوں کا سودا کر چکے ہیں وہ اللہ کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ جب دین وملت کا مطالبہ ہوتا ہے وہ سربکف میدان میں نکل آتے ہیں۔ پس وپیش کا کوئی خدشہ زنجیر پا نہیں بنتا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو آپ کے سامنے بڑے لمبے لمبے دعوے اور چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے وہی مرد میدان ہیں۔ وہ قسمیں کھا کھا کر اور اللہ کو گواہ بنا کر اپنے دعوؤں میں قوت پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ (۱) عمل کے نام پر صفر (۲) دل میں کینہ بھرا ہوا (۳) باتیں سلجھی ہوئی مگر طبیعت حد درجہ جھگڑالو پس پردہ فتنہ پرور اور فساد انگیز (۴) زبان پر نعرہ امن اور عملی سرگرمی سراسر تخریب۔

ارشاد ربانی کے الفاظ یہ ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (سورہ بقرہ ع ۲۵ ج ۲ ع ۹)

’’اور کوئی ہے کہ اچھی لگے تم کو اس کی بات دنیا کی زندگی میں وہ شاہد بناتا ہے اللہ کو اپنے دل کی بات پر کہ خدا شاہد ہے جو کہہ رہا ہوں سچ ہے۔ میرے دل میں کوئی برائی نہیں) حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور اگر اس کو حکومت مل جائے تو اس کی دوڑ اس لیے ہو کہ ملک میں فساد پھیلے اور وہ کھیتی زراعت اور مویشی کو برباد کر ڈالے اور اللہ فساد پسند نہیں کرتا۔‘‘

جانی ایثار (ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ):

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورہ بقرہ ع ۲۷ ج ۲)

یہ آیت مہاجرین اور مجاہدین کی فضیلت میں نص صریح ہے۔

جو لوگ ایمان لائے۔ جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں یہ لوگ امیدوار ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی کے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فضائل اعمال جن سے بارگاہ رب العزت میں تقرب حاصل ہوتا ہے دو قسم کے ہیں۔ کچھ اعمال تو وہ ہیں جن کو تمام مذہبوں نے مساوی طور پر کار خیر اور باعث اجر وثواب قرار دیا

ہے اور ہر زمانہ میں انسان ان کے ذریعہ سے تقرب الی اللہ کی سعادت حاصل کرتے رہے ہیں۔ ایسے اعمال کو برحقیقی (اصل نیکی) کہنا چاہیے۔ برحقیقی کی تفسیر قرآن حکیم میں اس طرح کی گئی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ (سورہ بقرہ ع ۲۲)

''نیکی یہی نہیں ہے کہ منہ کرو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف۔ البتہ نیکی وہ ہے کہ ایمان لائے اللہ پر پچھلے دن پر فرشتوں پر کتاب پر اور نبیوں پر اور ایسی حالت میں کہ اس کو مال محبوب ہو (اس کو ضرورتیں در پیش ہوں) وہ رشتہ داروں کو یتیموں اور مسکینوں کو مسافروں کو اور مانگنے والوں کو دیتا رہے اور خرچ کرے گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے اقرار کو (اپنے قول کو) جب وہ قول کرلیں اور صبر کرنے والے (جمنے والے) سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی میں (خطرہ کے وقت)۔''

فضائل اعمال کی دوسری قسم یہ ہے کہ ہر مذہب اور ہر زمانہ میں وہ باعث اجر و ثواب نہیں رہتے بلکہ کسی مذہب میں وہ مدار فضیلت اور قرب خداوندی کا ذریعہ رہے ہیں اور کسی مذہب میں نہیں رہے ہیں۔

ہجرت اور جہاد اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قسم کے فضائل قرآن حکیم میں شرح اور تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور دنیا و آخرت کی سربلندیوں کو انہیں فضائل پر دائر کیا گیا ہے اس کے دلائل اس کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ ان کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن حکیم ایسے دلائل سے بھرا ہوا ہے۔ (ازالۃ الخفاء فصل ہشتم تفسیر آیت مذکورۃ الصدر ص ۵)

مالی ایثار:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (سورہ بقرہ ع ۳۸ ج ۳ ع ۶)

''وہ لوگ جو خرچ کرتے رہتے ہیں اپنے مال رات دن، پوشیدہ اور علانیہ۔[۹۲] ان کے لیے ان کے رب کے یہاں اجر ہے اور ان پر کوئی خوف نہیں (مستقبل کے لحاظ سے) اور نہ غمگین ہوں گے (نہ اپنے پہلے کاموں پر پچھتائیں گے)''

مذکورہ بالا تین آیتیں جو ایثار کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں حضرت شاہ صاحب جلد اول فصل ششم میں ان کو

نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرات خلفاء کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رب العالمین جل شانہ کی رضا جوئی میں اپنی جانوں کا سودا کرلیا تھا۔

اپنی عزیز زندگیوں کو راہ خدا میں پیش کر دیا تھا۔ مثلاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ میں کفار مکہ کے سامنے دعوت اسلام پیش کی جس کی پاداش میں ان کو مارا گیا پیٹا گیا اور بیشمار ایذائیں پہنچائی گئیں۔ پھر باوجودیکہ کفار مکہ نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کے منصوبے باندھ رکھے تھے۔ مگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے تمام خطرات سے بے نیاز ہوکر سید الانبیاء ﷺ کی ہمرکابی میں مدینہ منورہ تک سفر کیا۔ کفار نے آپ صاحبان کی تلاش میں گھوڑے دوڑا دیئے گرفتار کر کے لانے والے کے لیے انعام مقرر کیا (وغیرہ وغیرہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت سے پہلے جیسے ہی توحید کا اعلان کیا ان کو مارا گیا پیٹا گیا اور طرح طرح سے ستایا گیا اور ہجرت کے موقع پر بھی آپؓ نے بے مثال جاں بازی اور سرفروشی کا ثبوت دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ ہجرت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر ے پر سوئے (تاکہ کفار بستر اخالی دیکھ کر فوراً ہی تلاش نہ شروع کر دیں) حالانکہ صورت یہ تھی کہ اگر کفار حملہ کرتے تو آپ ہی اس کی زد میں تھے۔

حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ نے اپنے چچا اور اپنی برادری کی طرف سے بہت کچھ تکلیفیں برداشت کیں لیکن ایمان کا جو رشتہ قائم ہو چکا تھا وہ منقطع نہ ہوا۔ آپ نے دو مرتبہ ہجرت کی (ایک مرتبہ حبشہ کی طرف۔ دوسری مرتبہ مدینہ طیبہ کو) اس کے بعد ان چاروں بزرگوں نے ہر ایک معرکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے داد شجاعت دی۔ حالانکہ دوستوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور دشمنوں کی گنتی بہت زیادہ۔ لہٰذا یہ تمام حضرات ان آیات کے مصداق ہیں بلکہ ان آیات کے سر دفتر ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

ممکن ہے کوئی متعصب اعتراض کرے کہ ان آیات کے الفاظ عام ہیں ضروری نہیں کہ یہی حضرات ان کے مصداق ہوں ممکن ہے ان آیات کے مصداق دوسرے حضرات ہوں لیکن اس کا جواب بہت واضح ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ عام ہوتے مگر مراد خاص افراد ہوا کرتے ہیں۔ لیکن وہ مخصوص حضرات جن میں وہ اوصاف سب سے زیادہ نمایاں ہوں اور اپنے کارناموں میں سب سے زیادہ پیش قدم اور سب سے زیادہ مشہور ہوں۔ اس عام کے مصداق میں سب سے پہلے آئیں گے اور مخاطب کی توجہ سب سے پہلے انہیں مخصوص اور ممتاز افراد کی طرف منعطف ہوگی۔ ایسے حضرات کو ان عام الفاظ کے مصداق سے کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا اور جو نظر انداز کرنا چاہے گا وہ اپنی جہالت انداز کلام سے ناواقفیت اور اپنی کوتاہ بینی اور نادانی کا ثبوت دے گا۔ سبحانک هذا بهتان عظیم ممکن ہے کوئی متعصب یہ بھی کہہ بیٹھے کہ یہ فضائل ومناقب پہلے ان

حضرات کے لیے ضرور تھے مگر بعد میں کسی گناہ کے باعث ختم ہو گئے۔ تو جواب یہ ہے کہ یہ پہلے سے بھی زیادہ نادانی اور جہالت ہے اور قرآن عظیم پر معاذ اللہ بہت بڑا طعن ہے کیونکہ یہ آیتیں اس وقت سے جب سے کہ اسلام کا نشو ونما ہوا آج تک محفوظ ہیں۔ نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ تمام علمی مجلسوں، تدریسی حلقوں میں ان کی تلاوت ہوتی ہے اور قیامت تک (انشاء اللہ) یہ آیتیں اسی طرح پڑھی جائیں گی۔

اب اگر ان آیتوں سے وہ افراد مراد نہیں جن کی طرف ذہن سب سے پہلے منتقل ہوتا ہے تو گویا یہ آیتیں اپنے مصداق کے لحاظ سے معاذ اللہ فریب نظر اور شاعرانہ سخن سنجیاں ہیں۔ اور بات یہیں تک نہیں رہتی بلکہ کتاب اللہ پر الزام آتا ہے کہ اس نے ایسے الفاظ استعمال کیے جو سننے والوں کو دھوکے میں مبتلا کر دیں اور پھر یہ دھوکا وقتی اور عارضی نہیں بلکہ کہنا پڑے گا کہ کلام اللہ سینکڑوں سال سے تدلیس اور تلبیس کرتا چلا آ رہا ہے (معاذ اللہ) ظاہر ہے حضرت حق جل مجدہ کی شان اس قسم کی تدلیس اور فریب دہی سے بہت منزہ اور بہت بلند ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آیت کریمہ امنوا کما امن الناس (ایمان لاؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے) کی تفسیر میں فرمایا کرتے تھے کہ الناس سے مراد حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ مگر اپنے مدلول اور مقصود کے لحاظ سے قوی ہے۔ مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر آیہ اھدنا الصراط المستقیم (ازالۃ الخفاء ص ۱۶۱)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ارشادات ربانی

اتحاد و تعاون اور باہمی اخلاص:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِيْ

الْأَرْضِ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ (سورہ آل عمران رکوع ۱۱ ج ۴ ع ۲)

''مسلمانو! ڈرتے رہو اللہ سے جیسا چاہیے ڈرنا اور دیکھو دنیا سے نہ جاؤ۔ مگر اس حالت میں کہ تم ایمان پر ثابت قدم رہو اور دیکھو سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور پھوٹ نہ ڈالو اور اللہ تعالیٰ نے جو تم پر احسان فرمایا ہے اسے یاد رکھو۔ تمہاری حالت یہ تھی کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے الفت ڈال دی تمہارے دلوں میں۔ پس اس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ تم بھائی بھائی بن گئے اور تم تھے آگ کے گڑھے کے کنارے پر (ذرا پیر پھسلتا یعنی موت آجاتی تو دہکتے ہوئے جہنم میں پہنچ جاتے) پس اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس حالت سے نجات بخشی۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح کھولتا ہے تم پر اپنی (کارفرمائیوں کی) نشانیاں تا کہ تم (منزل مقصود کی) راہ پالو اور ایسا ہونا چاہیے کہ تم میں ایک جماعت ہو جو خیر کی دعوت دیتی رہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی رہے۔ ایسے ہی لوگ ہوں گے کامیاب اور ان کی طرح مت ہو جانا جو الگ الگ ہو گئے اور اختلاف کرنے لگے۔ باوجود یہ کہ روشن دلیلیں ان کے سامنے آچکی تھیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے ہے دردناک عذاب۔ جس روز کتنے ہی چہرے چمک اٹھیں گے اور کتنے ہی چہرے ہوں گے جو کالے پڑ جائیں گے۔ پس وہ لوگ جن کے منہ کالے ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) تم نے ایمان کے بعد پھر انکار حق کی راہ اختیار کر لی تھی تو (جیسی کچھ تمہاری منکرانہ چال تھی اسی کے بموجب) عذاب کا مزہ چکھو اور جن لوگوں کے چہرے چمک رہے ہوں گے وہ اللہ کی رحمت (کے سائے) میں ہوں گے۔ وہ ہمیشہ رحمت خداوندی (کے سایہ) میں رہیں گے اور یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں پوری سچائی کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ جہان والوں پر ظلم نہیں چاہتا اور یاد رکھو آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کا ہے اور ساری باتیں بالآخر اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔''

ان آیات میں (۱) تقوے، اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنے، اتحاد و اتفاق کی خوبی، اختلاف و افتراق کی مذمت کی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس اختلاف کی مذمت کی گئی ہے جس میں عرب جاہلیت کے لوگ مبتلا تھے۔ جو ہدایت پالینے کے بعد خیر امت ثابت ہوئے (۲) ان آیات میں اتحاد و اتفاق کی نعمت کو اللہ تعالیٰ کا انعام فرمایا گیا ہے (۳) یہ آیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اتحاد پر ایک واضح نص ہے۔ (۴) اتحاد و اتفاق کے بقاء کی صورت بھی بتادی گئی ہے کہ ایک مرکزی جماعت ہو جس کا نصب العین ہو احیاء علوم دین، جہاد، اقامت حدود، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور باقی لوگ اس کی ہدایت پر عمل پیرا ہوں۔

افادات:

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ آیتیں فصل ششم میں خلافت خاصہ کے تحت میں بیان فرمائی ہیں۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں خلافت خاصہ کی حقیقت بیان فرمائی ہے اور پھر ان فتنوں کی

حقیقت پر روشنی ڈالی ہے جو خلافت خاصہ کے بعد پیش آنے والے تھے۔ حضرت حق جل مجدہ نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ ایک حالت وہ ہوگی جس کو خداوندی خوشنودیوں کا شرف حاصل ہوگا اور دوسری حالت خداوند عالم کے نزدیک ناپسند اور مستحق غضب ہوگی۔

ان آیتوں میں سب سے پہلے تقویٰ کا حکم ہے اور یہ کہ تقویٰ اور طہارت میں ثابت قدم رہو۔ اس کے بعد حکم ہے کہ اعتصام بحبل اللہ میں سب متحد رہو اور انتشار وافتراق نہ پیدا ہونے دو۔

ان احکام کے بعد یہ بھی اشارہ کر دیا کہ اجتماع اور اتفاق سے مقصود یہ ہے کہ دو باتوں میں متحد و متفق رہو۔ اول یہ کہ فہم قرآن میں یعنی کتاب اللہ سے شرعی احکام کے سمجھنے اور اخذ کرنے میں اختلاف نہ ہونے دو کہ ایک شخص ایک بات کو اپنا مذہب بنالے اور دوسرا شخص دوسری بات کو اس مضمون کو واعتصموا بحبل اللہ میں مجمل طور پر بیان فرمایا ہے اور لا تکونوا کالذین تفرقوا میں تفصیل کے ساتھ۔

پس اگر کسی آیت کے متعلق ذہنوں میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اجتماع کلمہ اور اتحاد کا طریقہ یہ ہے کہ سب مل کر باہمی تبادلہ خیالات سے ایک رائے پر متفق ہو جائیں لیکن یہ بھی عادت اللہ ہے کہ رفع اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب کوئی خلیفہ راشد موجود ہو جو رشد اور نیکی کے ساتھ مسلمہ عالم بھی ہو۔ جس کے علم وفضل کے آگے لوگوں کی گردنیں جھکی ہوئی ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ کلمۃ اللہ کو سر بلند کرنا ہر ایک کا مقصود ہو اور اس مقصد عظیم کے سامنے وہ تمام کینے اور عداوتیں جو زمانہ جاہلیت میں تھیں ذہنوں سے محو ہوگئی ہوں قرآن حکیم نے اس کو نعمة الله سے تعبیر کیا ہے اور دوسری آیت میں اسی کا تذکرہ ہے۔

اس کے بعد ارشاد الٰہی یہ ہے کہ سنت اللہ اور عادت الٰہی کے بموجب اس اجتماع اور اتفاق کے باقی رکھنے کا راستہ یہ ہے کہ ایک مرکزی جماعت ایسی موجود رہے جس کا وظیفہ عمل ہو۔ (۱) علوم دین کی تبلیغ واشاعت (۲) جہاد فی سبیل اللہ (۳) حدود (شرعی تعزیرات اور سزائیں) جاری کرنا (۴) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (۵) اور باقی مسلمان اس جماعت کی اتباع کریں۔ اس طرح اسلام کا یہ فرض کفایہ خوبی سے ادا ہوتا رہے۔

لیکن عادت اللہ یہ بھی ہے کہ نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کسی ایسے شخص کی اتباع اور پیروی نہ ہو جس کی افضلیت اور برتری پر سب کا اتفاق ہو۔ اس کے بعد اس جماعت کی فضیلت اور اس کی مخالف جماعت کی قباحت اور مذمت بیان فرمائی ہے کہ قیامت کے روز ایک کے چہرے روشن ہوں گے اور دوسرے سیاہ رو ہوں گے۔ پھر یہ اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں جو جماعت ان فرائض کی ادائیگی کے لیے قائم ہوگی وہ سابق امتوں کی جماعتوں سے افضل ہوگی کیونکہ امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ یہ فرائض جو ساری مخلوق کے لیے سراسر نفع ہیں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ ان کی اشاعت ہو اور یہی وجہ ہے کہ اس امت کو آگے بڑھایا جا رہا ہے اور یہود ونصاریٰ جن کی افادیت صرف اپنے گروہ کے لیے مخصوص تھی اس کو پیچھے ہٹایا جا رہا ہے۔ انہیں آیات سے متصل دوسرے

رکوع کی پہلی آیت ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(سورہ آل عمران ۱۱۰ ج ۴ ع ۳)

"تم بہتر گروہ ہو ایک ایسی امت کے جو انسانوں کے (نفع) کے لیے پیدا کی گئی۔ اچھی باتوں کا (ایسی باتوں کا جن کی عمدگی اور بھلائی معروف ہے) حکم کرتے ہو اور منع کرتے ہو منکر سے (ایسی باتوں سے جن کی قباحت یہاں تک عام ہو چکی ہے کہ ہر شخص انکار کی نظر سے ان کو دیکھتا ہے) اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔"

اس آیت کے مخاطب صحابہ کرام ہیں۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ وہ امت محمد یہ جو نوع انسان کے فائدے اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہے تم اس امت میں سب سے بہتر ہو۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اس کی توضیح و تفسیر کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

خلافت خاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں باتوں کے لحاظ سے مسلمانوں کا اتفاق موجود ہو۔ ان کے مذاہب میں بھی اختلاف و افتراق نہ ہو اور نفس کی درندگی اور بہیمیت کے سیلاب سے جو عداوتیں اور دشمنیاں سینوں میں بھر جاتی ہیں وہ بھی ناپید ہو گئی ہوں۔ یہ دور خیر القرون ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کو خیر القرون فرمایا ہے اس کے بعد اس دور کو جو اس سے متصل ہو، پھر وہ دور جو اس دوسرے دور سے متصل ہو۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ دور فتنہ وہ ہوگا کہ مذہبوں میں اختلاف پیدا ہو جائے اور باہمی عداوت و مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں کی الگ الگ جماعتیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں محاذ قائم کریں (اس دور پر فتن کی تفصیل دوسرے موقع پر آئے گی۔ انشاء اللہ)

حضرت شاہ صاحب اس آیت سے خلافت راشدہ پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ صحابہ کرام کی معظم و محترم جماعت خیر امة اخرجت للناس کی مصداق تھی اور یہ بات تواتر سے ثابت ہو چکی ہے کہ اقامت دین اور دین حق کی ترویج و اشاعت اور اس کو مظفر و منصور کرنے کے لیے اس جماعت نے ایک شخص کو اپنا رئیس اور امیر بنا لیا تھا اور یہ ساری جماعت اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اس کی زیر قیادت مشین کے پرزوں کی طرح کام کرتی تھی۔ خلافت راشدہ اسی حقیقت کا نام ہے۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ باطل پرست جماعت بھی کسی ایک لیڈر کے ماتحت متحد ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی جذبہ کی بنا پر ایک جماعت کسی ایسے شخص کو لیڈر تسلیم کر لے جو اس کا اہل نہ ہو۔ لیکن اگر صحابہ کرام کے متعلق معاذ اللہ یہ خیال کیا جائے تو قرآن حکیم کا ان کو خطاب کرتے ہوئے یہ فرمانا کہ تم خیر امتہ ہو غلط ہوگا۔

ایک شق یہ بھی نکالی جا سکتی ہے کہ کچھ لوگوں نے غیر مستحق کو رئیس اور امیر قرار دے لیا تھا۔ دوسروں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس لیے ظاہری طور پر اجتماع کی شکل نکل آئی۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے

ہیں کہ جس امتہ کو خیر امتہ کہا جا رہا ہو اس سے ناممکن ہے کہ وہ ایسے موقع پر سکوت اختیار کر لے۔ اب اگر امیر بنانے والی جماعت اس لیے خیر امت سے خارج ہوئی کہ اس نے غیر مستحق کو امیر بنالیا تھا تو یہ دوسری جماعت اس لیے خیر امت سے خارج ہو جائے گی کہ اس نے ایسے موقع پر سکوت اختیار کیا اور فریضہ نہی عن المنکر کی ادائیگی سے پہلوتہی کی (ص۵۵) تفسیر آیت مذکورہ فصل ششم)

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ انفال ج ۱۰ ع ۸)

''وہی ہے جس نے اپنی نصرت و مدد اور مسلمانوں کے تعاون کی تمہیں قوت بخشی اور ان کے دلوں میں الفت و محبت پیدا کی۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے تب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہے غالب حکمت والا۔ اے نبی اللہ تیرے لیے کافی ہے اور ان مسلمانوں کے لیے جو تیرے پیچھے چلنے والے ہیں۔''

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ (سورہ حجر ع ۴ ج ۱۴)

''ان کے دلوں میں جو کچھ خفگی تھی ہم نے سب نکال دی وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔''

افادات:

(۱) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ راوی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ علیہ نے فرمایا واللہ یہ آیت ہمارے ان ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو جنگ بدر میں شریک تھے۔

(۲) کثیر النواء: میں نے ابو جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ فلاں شخص حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے روایت کرتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

حضرت ابو جعفر: واللہ یہ آیت انہیں حضرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ان کے سوا اور کون ہے جس کے بارے میں ایسی آیت نازل ہو۔

کثیر النواء: وہ کون سا غل (کینہ) ہے۔ جس کے متعلق آیت ظاہر کر رہی ہے کہ ان کے سینوں سے نکال دیا گیا۔

حضرت ابو جعفر۔ وہ کینہ اور بغض جو زمانہ جاہلیت میں تھا۔

دور جاہلیت میں بنوتیم، بنوعدی اور بنی ہاشم کے درمیان بہت سخت عداوت تھی لیکن جب ان قبیلوں کے آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے تو آپس میں ایک دوسرے کے محبوب دوست بن گئے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ علیہ کی پسلی میں درد ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنا ہاتھ گرم کرتے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پسلی کو سینک رہے تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (۹۳)

(۲) مختلف سندوں سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سے فرمایا کہ:

میں توقع رکھتا ہوں کہ میں اور تمہارے والد ماجد ان لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ (سورہ حجر ع ۴ ج ۱۴)

''ہم نے ان کے سینوں کے کینے نکال دیئے ہیں وہ بھائی بھائی کی طرح آمنے سامنے سریر آراہوں گے۔''

ایک ہمدانی شخص نے (بطور طنز) کہا اللہ تعالیٰ کا عدل وانصاف اس سے بالا ہے۔ حضرت علیؓ نے اس کو اتنی سختی سے ڈانٹا کہ سارا محل (جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ رونق افروز تھے) گونج اٹھا۔ اور آپ نے (جوش میں) فرمایا۔ اگر ہم لوگ اس آیت کے مصداق نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے۔ (۹۴)

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ مجھے توقع ہے کہ میں اور حضرت عثمان۔ حضرت زبیر اور حضرت طلحہ (رضی اللہ عنہم) ان لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے۔ (۹۵)

اعتماد علی اللہ، اذعان و یقین، ایثار و فدائیت اور خداوند عالم کا فضل و احسان

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ۔ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (سورہ آل عمران رکوع ۱۸)

''جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا (اور جہاد کے لیے تیار ہو گئے) باوجودیکہ (ایک سال پہلے جنگ احد کا) زخم کھا چکے تھے تو جو لوگ ان میں سے نیک کردار اور متقی ہیں ان کے لیے اجر عظیم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے لوگوں نے کہا تھا کہ ان لوگوں (دشمنوں) نے تم سے جنگ کرنے کے لیے بہت بڑی تیاری کر رکھی ہے۔ پس تم ان سے ڈرتے رہو (مقابلہ کے لیے باہر نہ نکلو) لیکن (بجائے اس کے کہ وہ یہ بات سن کر ڈر جاتے) ان کا ایمان اور زیادہ مضبوط ہو گیا اور وہ ہر خطرہ سے بے نیاز ہو کر بول اٹھے: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ہمارے لیے اللہ کا سہارا کافی ہے اور جس کا سہارا اللہ ہو تو کیا ہی اچھا ہے اس کا سہارا اور کیسا اچھا ہے وہ کارساز۔ پھر یہ ہوا کہ یہ لوگ بے خطر راہ خدا میں نکلے اور اللہ کے فضل و کرم سے شاد کام واپس آئے اور کوئی گزند انہیں چھو نہ سکا اور یہ اللہ کی خوشنودیوں میں گامزن ہوئے۔ (یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا) اور اللہ تعالیٰ بڑا فضل رکھنے والا ہے۔ اور یہ (جو دشمنوں کا بھیجا ہوا مخبر تمہیں خوف زدہ کرنا چاہتا تھا) تو اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ شیطان تھا جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا تھا۔ اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو شیطان کے ساتھیوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو۔''

اس آیت میں دو فضیلتیں ایسی ہیں کہ ان پر جتنا ناز بھی کیا جائے کم ہے۔

① اللہ کی نعمت اور اس کا فضل لے کر واپس ہوئے۔

② رضاء الٰہی اور خوشنودئ خداوندی کی اتباع اور پابندی کی۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین کا رجحان یہی ہے کہ یہ آیت بدر صغریٰ (۹۶) کے موقع پر نازل ہوئی۔ بدر صغریٰ کے موقع پر حضرات خلفاء راشدین حاضر اور پوری ذمہ داریوں کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ لہٰذا یہ آیت اور صحابہ کی طرح حضرات خلفاء راشدین کے فضل و شرف کی بھی شہادت دے رہی ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

قیام لیل:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَه وَثُلُثَه وَطَائِفَةٌ مِنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ

(سورہ مزمل ع ۲)

''تیرا رب جانتا ہے کہ تو اٹھتا ہے۔ قریب دو تہائی رات کے اور آدھی رات اور تہائی رات اور جماعت ان کی جو آپ کے ساتھ ہیں (وہ بھی اسی طرح اٹھتی ہے اور عبادت کرتی ہے)''

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اِنَّنَا اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّه لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ع ۲ سورہ آل عمران ج ۳ ع ۱)

''وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب۔ بیشک ہم ایمان لے آئے۔ پس بخش دے ہمارے گناہ اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے۔ شدت ومصیبت میں صبر کرنے والے (بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب۔ محنت اٹھانے والے) (قول وعمل میں) سچے، بندگی میں لگے رہنے والے، نیکی کی راہ میں خرچ کرنے والے (شب بھر عبادت کے بعد بھی اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے) رات کی آخری گھڑیوں میں اس کی مغفرت کے طلب گار۔ اللہ تعالیٰ شاہد ہے کہ نہیں کوئی معبود مگر اس کی ذات عدل وتوازن کے ساتھ تمام کارخانہ ہستی میں تدبیر وانتظام کرنے والی اور فرشتے بھی اسی کی شہادت دیتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو علم رکھنے والے ہیں ہاں نہیں کوئی معبود مگر وہی ایک جو طاقت وغلبہ والا اور حکمت والا ہے۔''

تفکر فی اللہ، حکمت، بصیرت، ذکر خدا، خوف ورجا، ہجرت، جہاد

بارگاہ رب العزت سے وعدۂ مغفرت

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَا اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (سورہ آل عمران ع ۲۰ ح ۴)

''بیشک زمین وآسمان کے بنانے میں اور رات ودن کے بدلتے رہنے میں بڑی نشانیاں ہیں ارباب دانش کے لیے جو اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں کھڑے، بیٹھے اور جب وہ اپنے پہلوؤں پر (کروٹ) پر لیٹے ہوئے ہوں جو دھیان کرتے رہتے ہیں آسمان وزمین کی پیدائش میں۔ اس عجیب وغریب کارخانہ ہستی پر غور کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ خدایا یہ سب کچھ تو نے پیدا کیا ہے تو بلاشبہ بیکار وعبث نہیں پیدا کیا۔ بلاشبہ تیری ذات اس سے پاک اور بلند وبالا ہے کہ اتنا بڑا کارخانہ بیکار پیدا کردے اور اس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ پس اے خدا بچا ہم کو عذاب دوزخ سے (کہ ہم بے مقصد زندگی گذار کر دوزخ کا ایندھن بنیں) اے ہمارے رب جس کو تو دوزخ میں جھونک دے۔ بیشک تو نے اس کو رسوا کردیا۔ بڑی ہی ذلت وخواری میں ڈالدیا۔ اور نہیں ہوگا (اس روز) ظلم کرنے والوں کا کوئی مددگار خدایا ہم نے ایک ندا دینے والے کی ندا سنی، وہ پکار رہا تھا ایمان کی طرف اور کہہ رہا تھا۔ لوگو اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور ایمان لے آئے۔ پس خدایا۔ ہمارے گناہ بخش دے۔ ہماری برائیاں مٹادے اور (اپنے فضل وکرم سے ایسا کر) کہ ہماری موت نیک اور اچھے آدمیوں کے ساتھ آئے۔ اے ہمارے رب۔ ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی وعدہ

فرمایا ہے اور (اپنے لطف و کرم سے ایسا کر) کہ ہمیں قیامت کے روز ذلت و رسوائی نصیب نہ ہو۔ بلاشبہ تو ہی ہے کہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا (جب اربابِ دانش کے فکر و عمل کی صدائیں یہ تھیں) تو ان کے پروردگار نے بھی ان کی دعائیں قبول فرمالیں (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) بلاشبہ میں کبھی کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ مرد ہو خواہ عورت۔ تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو (اور بلاشبہ نتائج عمل کا قانون سب کے لیے یکساں ہے) پس (دیکھو) جنہوں نے راہ حق میں ہجرت کی اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ میری راہ میں ستائے گئے۔ پھر (راہ حق میں) لڑے اور قتل ہوئے تو یقینی بات ہے کہ میں ان کی خطائیں محو کردوں انہیں ابدی نعمتوں کے باغوں میں پہونچادوں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں یہ اللہ کی طرف سے ان کے اعمال کا ثواب ہوگا اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بہتر ثواب ہے۔''

مندرجہ بالا آیات شہادت دے رہی ہیں کہ:

① یہ حضرات کائنات اور انقلاب کائنات میں اسی نظر سے غور وخوض کرتے ہیں جو ایک خدا پرست کے شایانِ شان ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علم وعرفان، بصیرت اور فراست کے ساتھ یہ بول اٹھتے ہیں کہ یہ عظیم الشان نظام کائنات بے کار و بے سود نہیں ہے۔

② کھڑے، بیٹھے، چلتے پھرتے، غرض ہر حالت میں ذکر اللہ ان کا شیوہ ہے۔

③ عذاب الٰہی سے خوف اور رحمت خداوندی کی امید ان کی شان ہے۔

④ ان اوصاف کا حامل وہی ہوسکتا ہے جس کا نفس پاک وصاف اور جس کا دماغ حکمت و دانش سے روشن ہو چکا ہو۔ یعنی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مظہر اور مصداق ہو۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ آیتیں مہاجرین اولین کی فضیلت میں نازل ہوئی ہیں۔ بیشک ان آیات کے عنوان میں مہاجرین کا نام نہیں ہے۔ مگر جب آخر میں یہ ارشاد ہے۔ انی لا اضیع عمل عامل منکم (تا) فالذین ھاجروا واخرجوا۔ (یعنی) میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا۔ لہٰذا جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے وطنوں سے نکال دیئے گئے۔ الخ) تو یہ ارشاد گرامی لازمی طور پر مہاجرین اولین ہی کو مصداق آیت کے لیے معین کر دیتا ہے۔ کیونکہ حضرات مہاجرین اولین اپنے وطنوں اور اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ یہی وہ حضرات ہیں جن کو راہ خدا میں محض خدائے واحد کی توحید کی خاطر ایذائیں اور تکلیفیں دی گئیں۔

ان حضرات نے غزوات میں حصہ لیا۔ کچھ شہید ہو گئے اور کچھ وہ تھے جو منتظر شہادت رہے۔ وہ تیار تھے کہ راہ خدا میں ان کے بدن کا جوڑ جوڑ جدا کر دیا جائے۔ ان کی بوٹیاں کاٹ دی جائیں۔ ان کی تمنا تھی کہ راہ مولا

میں اپنی جانیں نچھاور کریں۔ محض اتفاق تھا کہ جنگ کے میدانوں سے صحیح سالم واپس ہوتے رہے۔

فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ

یہی وہ پیکرِ اخلاص تھے جن کی دعائیں جذباتِ قلبی کا نغمہ دل سوز ہوا کرتی تھیں۔ اگر بالفرض ان بزرگوں سے کوئی گناہ ہو بھی گیا تو وہ معاف ہوگا کیونکہ یہ وہ پاکباز ان اخلاص کیش ہیں جن کو دنیا ہی میں جنت اور مغفرت کی بشارت دے دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں حضرات کے متعلق ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر پر خاص عنایت فرمائی، فرمادیا: جو چاہو کرو میں تمہیں بخش چکا، ان بزرگوں کا مآل اور انجام دخولِ جنت ہے کس قدر عظیم الشان بشارت ہے۔ (ازالۃ الخفاء، ج۱)

افادات:

آیت کریمہ میں اولوا الالباب۔ یعنی دانشمندوں کی تعریف کرتے ہوئے تفکر فی خلق السموات والارض (یعنی آسمان وزمین کی پیدائش میں غور وخوض کو بھی) ایک نمایاں درجہ دیا گیا ہے لیکن اگلے جملہ یعنی ماخلقت ھذا باطلا (تونے اس کو بے کار نہیں پیدا کیا۔ تا آخر) سے یہ اشارہ بھی کر دیا گیا ہے کہ اس نظر وفکر اور اس غور وخوض کا منشا اور مقصد صرف مادیات تک محدود نہ رہنا چاہیے بلکہ مادیات کی الجھن سے آگے بڑھ کر وہ ذات منشاء اور مقصد ہونی چاہیے جس نے اس تمام سلسلہ کائنات کو پیدا کیا۔ کائنات کے اس وسیع نظام میں انسان کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ ان سب پر نظر ڈالنی چاہیے۔ اگر یہ تفکر اور یہ غور وخوض اس کے لیے ہوتا ہے صحیح اور درست ہے اور اگر محض فلسفیانہ موشگافیاں اس تفکر اور غور وخوض کا مقصد ہوں تو وہ سراسر عبث ہیں آخرت کے لحاظ سے بے سود بلکہ وبالِ عظیم۔ اسی مقصد کو واضح کرنے کے لیے حضرت شاہ صاحب نے اس آیت کے تحت میں حضرات خلفاء راشدین کے حوالہ سے متعدد احادیث اور آثار پیش کیے ہیں۔ سب سے پہلے اولوالالباب یعنی اہلِ دانش کی تفسیر کے لیے مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے:

''حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جو شخص سورہ بقرہ، سورہ نساء اور سورہ آل عمران پڑھ لے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں دانشمندوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ نظر وفکر اور غور وخوض کی حقیقت واضح کرنے کے لیے حضرت شاہ صاحب نے صبیغ سے متعلق چند حدیثیں پیش کی ہیں۔

(۱) حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ: ایک شخص مدینہ میں آیا۔ صبیغ اس کا نام تھا۔ وہ متشابہات قرآنیہ کے متعلق بحث کرنے لگا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو بلا بھیجا۔ کھجور کی قمچیاں پہلے سے تیار کر کے رکھ لیں۔ جب صبیغ حاضر ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: تم کون ہو؟ میں ایک بندہ خدا ہوں۔ میرا نام صبیغ ہے۔ (صبیغ نے جواب دیا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ: میں بھی خدا کا بندہ ہوں۔ میرا نام عمر ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک قمچی لی اور اس کے سر پر ماری۔ صبیغ کے سر سے خون نکل آیا۔ فوراً ہوش آ گیا کہنے لگا۔

امیر المومنین۔ بس کیجئے۔ جو کچھ سر میں تھا سب جاتا رہا۔ (دارمی)

(۲) حضرت عثمان نہدی: حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے بصرہ والوں کے نام فرمان بھیجا۔ کہ صبیغ کے ساتھ مت بیٹھا کرو۔ حضرت عثمان نہدی فرماتے ہیں کہ اس فرمان کا یہ اثر تھا کہ اگر ہم کسی جگہ سو آدمی ہوتے تھے اور صبیغ وہاں پہنچ جاتا تو سب منتشر ہو جاتے۔ (اطاعت شعاری، ضبط و نظم اور سوشل بائیکاٹ کی عجیب و غریب مثال ہے۔ محمد میاں)

(۳) محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو تحریر فرمایا صبیغ کے پاس نہ بیٹھا جائے۔ اس کا وظیفہ اور اس کا روزینہ بند کر دیا جائے۔

(۴) حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل کلام کے بارے میں میرا وہی فیصلہ ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صبیغ کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ان کو قمچیوں سے پیٹا جائے۔ اونٹ پر ان کو سوار کرا کر قبائل میں ان کی تشہیر کرائی جائے اور یہ اعلان کیا جائے کہ یہ سزا ہے اس کی جو کتاب و سنت کو چھوڑ کر علم کلام میں منہمک ہو گیا ہو۔

(۵) عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے عنقریب وہ لوگ ہوں جو قرآن کریم کے متشابہات کو لے کر تم سے بحث کیا کریں گے۔ تم احادیث کا دامن سنبھالے رکھنا۔ کیونکہ جو حدیث کے ماہر ہوتے ہیں وہی کتاب اللہ سے صحیح واقفیت رکھتے ہیں (دارمی)

(۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ: ہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے یہاں تھے۔ ایک شخص آیا اور دریافت کرنے لگا۔ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا کپڑا پکڑا اور کھینچتے ہوئے اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور فرمایا۔ یا ابا حسن آپ سن رہے ہیں یہ کیا کہتا ہے یہ مجھ سے دریافت کرتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ خطرناک کلمہ ہے اس کا نتیجہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ اگر مجھے وہ اختیار ہوتا جو آپ کو حاصل ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا۔

(۷) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ: آیت کریمہ۔ قُل انبئکم بخیر من ذلکم (آپ یہ فرمایئے کہ کیا میں آپ لوگوں کو وہ چیز بتاؤں جو اس سے بہتر ہے) کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق فرمایا کرتے تھے۔ خداوندا! آپ نے ہمارے سامنے دنیا کو مزین کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ مابعد دنیا، دنیا سے بہتر ہے۔ پس ہمارا حصہ اسی میں لگا دے جو بہتر ہے اور جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

(۸) حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ اگر لوگ حج چھوڑ دیں تو میں ان سے ایسی ہی جنگ کروں جیسے نماز یا زکوٰۃ چھوڑ دینے پر کر سکتا ہوں۔

(۹) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ آیت کریمہ:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

میں ایک لفظ کا اضافہ کر کے اس طرح فرمایا کرتے تھے۔

وَيَسْتَغِيثُوْنَ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

یعنی یستغیثون علی ما اصابھم کا اضافہ کر دیا کرتے تھے۔

ترجمہ: ''تمہارے اندر ایک جماعت ہونی چاہیے جس کے افراد خیر کی دعوت دیتے رہیں۔ معروف کا حکم کرتے رہیں۔ منکر سے منع کرتے رہیں، جو حوادث سامنے آئیں ان میں داد رسی کرتے رہیں۔ یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔''

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس لفظ کو آیت قرآن کا جز سمجھتے تھے۔ کیونکہ ملت اسلامیہ میں تواتر کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع کردہ قرآن پاک میں یہ لفظ نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مفہوم آیت کو سمجھانے کے لیے یہ لفظ بڑھا دیا کرتے تھے جیسے مثلاً کوئی مفسر واسئل القریۃ (گاؤں سے پوچھو) کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہہ دے واسئل اھل القریۃ (گاؤں والوں سے پوچھو)۔

بہر حال اس آیت کی تفسیر میں اس مفہوم کی توضیح یا اس لفظ کے اضافہ کرنے سے حضرت عثمان یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ خلیفہ راشد (یعنی وہ امت جو اس آیۂ کریمہ کا مصداق ہے اس کے امام اور زعیم) کا صرف یہی کام نہیں کہ قانون نافذ کرتا رہے۔ یا محض زبان سے اچھی باتوں کی فرمائش اور بری باتوں کی ممانعت کرتا رہے۔ بلکہ اس کی پوری توجہ اس طرف بھی رہتی ہے کہ جو مصائب اور جو بلائیں پیش آنے والی ہوں ان کے دفعیہ کے لیے بارگاہ رب العزت جل مجدہ میں گریہ وزاری کرتا رہے۔ مختصر یہ کہ خلافت راشدہ کا تکملہ یہ ہے کہ اس کی دعاؤں سے امت کی مصیبتیں ٹلیں اور بلائیں دور ہوں۔

(۱۰) آیت کریمہ۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (ترجمہ) تم ایک ایسی امت کا بہترین گروہ ہو جو تمام انسانوں کے نفع کے لیے پیدا کی گئی۔ الخ۔ اس آیت کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس آیت میں کنتم وارد ہوا ہے۔ کنتم کے بجائے انتم بھی آ سکتا تھا۔ مگر بجائے انتم کے کنتم لانے کا نکتہ یہ ہے کہ یہ اشارہ کر دیا گیا کہ ساری امت اور اس کا ہر گروہ اور ہر فرد مراد نہیں ہے بلکہ خاص صحابہ کرام مراد ہیں یا وہ جو صحابہ کرام کے نقش قدم پر چلیں اور ان کی طرح عمل کریں۔ نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ یہ آیت پڑھی اور فرمایا۔ یہ اس امت کے پہلے لوگوں کے لیے ہے۔ پچھلے لوگوں کے لیے نہیں۔

(۱۱) حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا۔ اے لوگو جس کو اس بات کی خوشی ہو کہ وہ اس کا مصداق بنے اس کا فرض ہے کہ اس کی شرط کو پورا کرے۔

(۱۲) حضرت عیاض اشعری رضی اللہ عنہ: میں جنگ یرموک میں حاضر تھا۔ ہمارے پانچ کمانڈر (امیر)

تھے۔ ابوعبیدہ، یزید بن ابی سفیان، ابن حسنہ، خالد بن الولید، عیاض۔ (ایک دوسرے بزرگ) رضی اللہ عنہم۔ عیاض اشعری (راوی حدیث) بیان کرتے ہیں کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے ہدایت فرمادی تھی کہ جنگ کے وقت حضرت ابوعبیدہ امیر ہوں گے۔ میدان جنگ میں بہت نازک صورت پیدا ہوگئی اور ہمارے سامنے موت کا بازار گرم ہوگیا۔ ہم نے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ سے کمک کی درخواست کی۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تمہاری درخواست موصول ہوئی۔ آپ کمک چاہتے ہیں۔ میں تمہیں وہ کمک بتاتا ہوں جس کی امداد واعانت بہت زیادہ قوی ہوگی اور ایک ایسے لشکر کا پتہ دیتا ہوں جو بہت مضبوط اور ناقابل تسخیر ہے وہ اللہ عزوجل ہے۔ اس سے کمک کی درخواست کرو اور یاد رکھو کہ سید الکونین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی گنتی جنگ بدر کے موقع پر تم سے بہت کم تھی۔ مگر اس ناکافی اور قلیل تعداد کو خداوندی نصرت حاصل ہوئی۔ لہٰذا اب فیصلہ یہ ہے کہ جیسے ہی میرا خط تمہیں ملے۔ تم دفعتہً ہلہ بول دو اور میری امداد کا تصور بھی مت کرو۔ چنانچہ ہم نے حملہ کردیا اور غنیم کو چار فرسخ (۱۲ میل) پیچھے دھکیل دیا۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو شخص استغفار کرتا رہتا ہے وہ اگر ایک دن میں ستر مرتبہ بھی توبہ توڑے تب بھی محروم نہ ہوگا۔ (ازالۃ الخفاء فصل ششم)

استدلال:

مذکورہ بالا آیتوں میں غور وخوض، ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ اور خدا کی طرف رجوع کرنے اور اس سے دعا مانگنے کا ذکر ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے یہ روایتیں پیش فرما کر یہ ظاہر فرمایا کہ خلفاء راشدین ان آیات کے اشاروں پر کس طرح عمل پیرا تھے۔

مہاجرین وانصار کے ایمان صادق کی تصدیق اور وعدۂ مغفرت

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُھَاجِرُوْا مَا لَکُمْ مِّنْ وَّلَایَتِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ۔ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا مَعَکُمْ فَاُولٰٓئِکَ مِنْکُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔

”جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مکہ کے مہاجرین کو مدینہ میں) جگہ دی تو یہی لوگ ہیں کہ ان میں ایک دوسرے کا رفیق و کارساز ہے اور جو لوگ ایسے ہیں کہ ایمان تو لائے (مگر) ہجرت نہیں کی تو تم کو ان کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک وہ اپنے وطن سے ہجرت کر کے نہ آ جائیں (اور تمہارے رفیق نہ بن جائیں) ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد چاہیں تو بلاشبہ تم پر لازم ہے ان کی مدد کرنا۔ الا یہ کہ کسی ایسی قوم کے مقابلہ میں مدد چاہی جائے جس سے تمہارا معاہدہ ہے (کہ اس صورت میں معاہدہ کے خلاف نہیں کر سکتے) اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔

اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی وہ بھی (راہ کفر میں) ایک دوسرے کے رفیق و مدد گار ہیں (مسلمانوں کے آپس کے تعاون اور رفاقت و امداد باہمی کا جو حکم دیا گیا ہے) اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ پیدا ہو جائے گا اور بڑی ہی خرابی پھیلے گی (غرضکہ) جو ایمان لائے، ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو) پناہ دی اور مدد کی تو فی الحقیقت یہی ہیں سچے مومن۔ ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی اور جو لوگ بعد کو ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کیا۔ وہ بھی تم ہی میں داخل ہیں۔ اور (باقی رہے) قرابت دار تو وہ اللہ کے حکم میں ایک دوسرے کے میراث کے زیادہ حق دار ہیں (باہمی بھائی چارگی میں ان کے حقوق

فراموش نہ ہوں گے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر بات کا علم رکھتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اولین کی دنیاوی و اخروی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ نیز ارشاد ہوا ہے کہ مہاجرین و انصار ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ اگر کوئی ایک کسی مشکل میں مبتلا ہو جائے تو دوسرے پر اس کی امداد لازم ہے۔ لیکن ان مسلمانوں کے ساتھ جو اپنے وطن سے ہجرت کر کے ان مہاجرین و انصار کے شریک کار نہیں ہوئے ہیں ان کے ساتھ تعاون اور تناصر کی یہ صورت لازم نہیں ہے۔ البتہ اگر ان غیر مہاجر مسلمانوں اور اہل حرب (۹۷) غیر مسلموں کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں تو بیشک ان غیر مہاجر مسلمانوں کی امداد بھی لازم ہے۔ خواہ یہ جنگ کسی دنیاوی عداوت کے سبب سے ہی ہو۔ (۹۸) وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اگر مسلمان ان مسلمانوں کی امداد نہ کریں گے تو غلبہ کفر لازم آئے گا جس کا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ لوگ اسلام سے منحرف ہونے لگیں۔ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ الخ۔ کا مطلب یہی ہے۔

آیت کریمہ میں اولاً مہاجرین اور انصار کی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) ستائش اور ان کے راستبازانہ ایمان کی تصدیق و توثیق ہے۔ اس کے بعد متاخر مہاجرین کو بھی انہیں حضرات کے زمرہ میں منسلک فرمانے کا اعلان ہے۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین

افادات:

اس آیت شریفہ میں ان کو سچا مومن فرمایا گیا ہے جنہوں نے ہجرت کی، راہ خدا میں جہاد کیا اور بے پناہوں کو پناہ دی جن کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا ان کو ٹھکانا دیا۔ حضرت شاہ صاحب خلافت خاصہ کے ضمن میں آیت کو پیش کرتے ہوئے یہ واضح فرما رہے ہیں کہ ان محامد کے سب سے زیادہ مستحق حضرات شیخین ہیں یعنی ابوبکر صدیق اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما۔ اس مضمون کی تائید میں جو احادیث پیش کی ہیں ان کا ترجمہ درج ذیل ہے:

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ: اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان کا تمام اہل ارض کے ایمان سے موازنہ کیا جائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پلہ جھکا رہے گا۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فقیر کہتا ہے کہ جنگ بدر کے روز حضرت شیخین رضی اللہ عنہما سے بہت سے ایسے کارنامے سرزد ہوئے جو منشاء الٰہی کے عین مطابق تھے اور ایک ایسی فراست اور دانشمندی کا ظہور ہوا جو گویا مستقبل کے نتائج کے لیے شفاف آئینہ تھی۔ مثلاً موسیٰ بن عقبہ نے جنگ بدر کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

جب جنگ بدر کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اس جنگ کے متعلق ہمیں مشورہ دیجئے اور یہ بھی طے کیجئے کہ اگر جنگ ہوتی ہے تو غنیم کے محاذ تک پہنچنے کے لیے کونسا راستہ

اختیار کرنا چاہیے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے مسافت کے متعلق پوری معلومات حاصل ہیں۔ حضرت عدی نے اطلاع دی ہے کہ قریش کا قافلہ فلاں فلاں راستہ پر تیزی سے جا رہا تھا۔ پس گویا ہمارے ساتھیوں میں اور قریش کے لشکروں میں دوڑ ہو رہی ہے کہ مقام بدر پر پہلے کون پہنچتا ہے۔ بہر حال بدر پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے پھر فرمایا: مجھے مشورہ دو اب کیا کرنا چاہیے۔ اب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یہ قریش اور ان کا تاریخی وقار سامنے ہے جب سے ان کو عزت حاصل ہوئی ہے آج تک کبھی ذلیل نہیں ہوئے۔ اور جب سے انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے ایمان کی طرف رخ نہیں کیا۔ وہ یقیناً آپ سے جنگ کریں گے۔ آپ بھی پوری طرح تیاری کیجئے اور اپنے ساز و سامان کے ساتھ کمر بستہ ہو جائے۔

(منشا یہ کہ یہ دونوں بزرگ نہ صرف یہ کہ جنگ بدر میں شریک ہوئے بلکہ آپ کے بلند حوصلہ مشیر کار رہے جو دوسروں کا بھی حوصلہ بلند کرتے رہے)

(۲) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ کی فراست اور دانشمندی کے سلسلہ میں موسیٰ بن عقبہ نے ایک یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ غزوۂ بدر کے موقعہ پر جب مشرکین مکہ سامنے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ خداوندی میں التجا کی: اے اللہ یہ قریش اپنی آن بان اور پوری شان و شوکت سے آئے ہیں تا کہ تیرے رسول سے جنگ کریں اور اس کے پیغام کی تکذیب کریں۔ الہ العالمین میں آپ سے اس کی درخواست کرتا ہوں جس کا آپ نے وعدہ فرمایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر کا بازو پکڑے ہوئے یہی دعا کر رہے تھے کہ خداوندا میں آپ سے ایفاء وعدہ کی درخواست کرتا ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ کو بشارت ہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یقیناً اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصرت و امداد کی درخواست کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اور مسلمانوں کی دعا قبول فرمائی۔

(۳) موسیٰ بن عقبہ نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ جب مسلمانوں نے دیکھا کہ جنگ قطعی اور یقینی ہو گئی ہے تو خداوند عالم سے دعا کرنے لگے۔ دعا کے وقت ان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ اٹھائے ہوئے بارگاہ خداوندی میں دعا کر رہے تھے۔ اے اللہ اگر اہل ایمان کی اس مٹھی بھر جماعت پر اہل شرک غالب آ گئے تو شرک عام ہو جائے گا اس کا پرچم بلند ہو گا اور پھر آپ کے دین کا نام و نشان بھی کہیں باقی نہ رہے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کر رہے تھے اور ابوبکر کہہ رہے تھے۔ یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائیں گے اور یقیناً آپ سرخرو ہوں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا ایک لشکر دشمنوں کے محاذ پر اتار دیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی امداد نازل فرما دی اور فرشتے اتر آئے۔ اے ابوبکر بشارت ہو! میں نے جبریل امین کو دیکھا ہے عمامہ باندھے ہوئے اپنے گھوڑے کو آسمان و زمین کے درمیان لے جا رہے تھے جب وہ زمین پر اتر

آئے تو تھوڑی دیر تک میری نظر سے اوجھل رہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان کے لبوں پر غبار ہے۔

(۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ: جبرئیل امین ایک ہزار ملائک کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب جس طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے نازل ہوئے اور حضرت میکائیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے میسرہ میں (بائیں جانب) جس طرف خود میں (علی رضی اللہ عنہ) تھا نازل ہوئے۔

(۵) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ: اس آیت کریمہ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ سے آپ لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ یہ آیت جنگ بدر کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے (اس روز) میں ہر ایک مسلمان کا پناہ گاہ اور مرجع بنا ہوا تھا۔ (آیت کریمہ کا مضمون یہ ہے کہ معرکہ جنگ سے جو لوگ پیٹھ پھیر لیں وہ خدا کا غضب لے کر لوٹ رہے ہیں البتہ وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو جنگ ہی کا پینترا بدلنے کے لیے لوٹ رہے ہیں)

(۶) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا۔ غزوہ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب پر نظر فرمائی، وہ کچھ اوپر تین سو دس تھے۔ آپ نے مشرکین کو دیکھا۔ وہ ایک ہزار سے بھی زیادہ تھے۔ آپ فوراً بارگاہ قادر ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوئے اور ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے لگے دعا میں یہاں تک انہماک ہوا کہ رداء مبارک مونڈھوں سے ڈھلک گئی۔ آپ دعاء میں مشغول تھے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ پہنچے۔ چادر اٹھا کر سید الانبیاء علیہم السلام کے مونڈھوں پر ڈالی اور پشت کی جانب سے چمٹ کر عرض کرنے لگے۔ یا نبی اللہ آپ بہت کچھ اپنے رب کو قسمیں دے چکے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ وعدہ فرمایا ہے عنقریب وہ اس کو پورا کرے گا۔ بس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ ...... مردفین (یاد رکھو اس وقت کو جب تم اپنے رب سے التجا کر رہے تھے خداوند عالم نے تمہاری دعائیں قبول فرمائیں اور یہ بشارت دی کہ میں ایک ہزار فرشتوں کی کمک بھیج رہا ہوں)

بہرحال جب جنگ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو شکست دی۔ ستر مشرک مارے گئے، ستر گرفتار کئے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کے بارے میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ہم اور یہ ایک دادا کی اولاد ہیں۔ خاندان کے بھائی ہیں۔ نسل اور خون میں شریک ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیں جو کچھ فدیہ میں مال ملے گا اس سے مسلمانوں کی طاقت بڑھے گی اور بہت ممکن ہے خداوند عالم ان کو ہدایت بھی فرما دیں تو یہ ہمارے قوت بازو ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: آپ کی کیا رائے ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے عرض کیا (حضرت) ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو رائے پیش فرمائی ہے میری یہ رائے نہیں ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ فلاں شخص کو (حضرت عمر نے اپنے ایک عزیز کا نام لیا) میرے حوالے کیجئے۔ میں اس کی گردن اڑا دوں۔ عقیل (بن ابی طالب) کو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے حوالے کیجئے وہ ان کی گردن

ماریں۔ فلاں شخص کو (جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے عزیز تھے) حضرت حمزہ کے حوالے کیجئے وہ ان کو قتل کریں تاکہ ہم بارگاہ رب العزت میں عملاً ثبوت پیش کردیں کہ ہمارے دلوں میں ان مشرکوں کی محبت کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ یہی لوگ ان مشرکین کے عمائدین ان کے پیشوا اور ان کے زعماء ہیں (مگر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا میری رائے کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور نہیں فرمایا اور ان سے فدیہ لے لیا۔ یہ دن گذر گیا اگلے روز حضرت عمر صبح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی عنہ بیٹھے ہوئے ہیں اور گریہ ان پر طاری ہے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ میں نے گریہ کا سبب دریافت کرنا چاہا۔ اگر گریہ کی وجہ کوئی ایسی تھی جس کا تعلق مجھ سے بھی تھا تو لامحالہ مجھے بھی رونا چاہیے تھا اور اگر کوئی ایسی بات تھی جس کا تعلق صرف انہیں دو بزرگوں سے تھا تو ان کی پریشانی میری پریشانی تھی ان کی تکلیف میری تکلیف۔ ان کو روتا ہوا دیکھ کر ہی مجھے رونا چاہیے تھا۔ بہرحال میں نے وجہ معلوم کی آپ دونوں کیوں رو رہے ہیں۔ اگر میری بھی رونے کی بات ہوئی میں بھی رؤوں گا اگر مجھ سے متعلق نہیں ہوئی تو آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے میں رؤوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس مشورہ کی وجہ سے رو رہا ہوں جو فدیہ لینے کے متعلق تمہارے ساتھیوں نے دیا تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے سامنے وہ عذاب پیش کردیا گیا ہے جو میرے ساتھیوں پر آنے والا ہے۔ جو اس درخت سے بھی قریب ہے (ایک قریب کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اسی واقعہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ (تا) لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ (سورہ انفال ع ۹)

"یعنی نبی کے لیے سزاوار نہیں ہے کہ اس کے قبضہ میں قیدی ہوں جب تک کرلے۔ مسلمانو! تم دنیا کی متاع چاہتے ہو۔ اللہ چاہتا ہے کہ (تمہیں) آخرت (کا اجر دے) اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔ اگر اس بارے میں پہلے سے اللہ کا حکم نہ ہوگیا ہوتا تو جو کچھ تم نے جنگ بدر میں مال غنیمت حاصل کیا اس مال غنیمت کے لینے میں تمہیں بہت بڑا عذاب پہنچتا۔"

منشاء آیت یہ ہے کہ (۱) نبی دنیا میں اس لیے نہیں آتے کہ ان کے پیرو دشمنوں کو قید رکھ کر فدیہ کا روپیہ وصول کریں بلکہ مقصود اصلی دعوت حق کا اعلان ہوتا ہے۔ لہٰذا نبی کو سزاوار نہیں کہ جب تک اس کی دعوت ملک میں ظاہر و غالب نہ ہوجائے اسیران جنگ کو فدیہ کے لیے روکے رکھے۔

(۲) ان قیدیوں میں سے بہت سے وہ تھے جنہوں نے کچھ دنوں بعد اسلام سے مشرف ہوکر عظیم الشان کارنامے انجام دیئے۔ یہی وہ حکم تھا جو عنداللہ مقدر ہوچکا تھا جس کی بنا پر یہ فعل یعنی فدیہ لے لینا نظرانداز کیا گیا

اور اس پر عذاب نہیں ہوا۔

وہ عذاب اخروی جو حقیقی عذاب ہے اس سے صحابہ کرام محفوظ رہے لیکن ان مقدس نفوس کی پاکیزگی کا تقاضا تھا کہ یہ معمولی دھبہ جو ان کے جماعتی رجحانات اور جماعتی کیرکٹر پر آ گیا تھا وہ بھی صاف کر دیا جائے۔ یہ تزکیہ اور صفائی اس طرح ہوئی کہ جنگ احد میں فتح کے بجائے شکست ہوئی۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر فراست اسی شکست کو دیکھ رہی تھی اور اسی بنا پر یہ افسردگی تھی کہ گریہ طاری تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

چنانچہ جب اگلے سال جنگ احد ہوئی تو اس سزا کا ظہور اس طرح ہوا کہ ستر صحابہ کرام شہید ہوئے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجروح ہوئے۔ دشمن کی ضرب سے خود ٹوٹ گیا۔ اس کی کڑیاں رخسار مبارک میں گڑ گئیں۔ دندان مبارک شہید ہو گیا۔ جب مسلمانوں کو شکست کا احساس ہوا تو یہ سوال بھی طبیعتوں میں پیدا ہوا کہ فدا کاران حق کو یہ شکست کیوں ہوئی۔ تب آیت کریمہ نازل ہوئی۔

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّى هَٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ (سورہ آل عمران ع ۱۷)

''کیا جب پہنچے تم کو کوئی تکلیف کہ تم پہنچا چکے اس سے دو چند تو تم پوچھو گے یہ کہاں سے آئی کیسے آئی۔ آپ فرما دیجئے۔ خود تمہارے ہاتھوں آئی۔''

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ارشادات سے ہٹ کر یہاں چند باتیں قابل توجہ ہیں:

(۱) یثخن فی الارض کے معنی عام طور پر قتل اور خون کرنے کے لیے گئے ہیں۔ یعنی ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ جب تک نہ خون کرے ملک میں۔ مگر امام بخاری نے یثخن کی تفسیر میں فرمایا ہے حتے یغلب فی الارض یعنی جب تک غالب نہ ہو جائے ملک میں۔ ہم نے امام بخاری کی تفسیر کے بموجب ترجمہ کیا ہے۔

(۲) ایک عجیب وغریب بات یہ ہے کہ فدیہ لینا اس وقت بھی جائز تھا جب وہ فدیہ لیا گیا۔ چنانچہ واقعہ بدر سے ایک سال پہلے حضرت عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں ایک دستہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا۔ اس نے ایک شخص کو گرفتار کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا تھا۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت جس کو مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم فدی رجلین من المسلمین برجل من المشرکین۔

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک کے فدیہ میں دو مسلمانوں کو رہا کرایا۔''

پھر جنگ بدر کے بعد قانون یہی بن گیا کہ اگر مفاد ملت کے پیش نظر فدیہ لینا بہتر سمجھا جائے تو فدیہ لے لیا جائے اور یہ جو اسی آیت میں ارشاد خداوندی ہے۔ لولا کتاب من الله سبق (اگر پہلے سے اللہ کا حکم نہ ہو گیا ہوتا) اس کے معنی بھی یہی لیے گئے ہیں کہ اگر پہلے سے اللہ کے یہاں یہ طے نہ ہوتا کہ اس امت کے لیے مال

غنیمت حلال ہوگا تو عذاب آ جاتا۔

اس کے باوجود اس موقع پر فدیہ کے مشورہ کو پسند نہیں کیا گیا اور عتاب آمیز خطاب کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ احد میں شکست اٹھانی پڑی۔ تو اس عتاب وعذاب کا سبب اس لطیف نکتہ کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ شفاف آئینہ جس میں اپنا چہرہ دیکھا جاتا ہے جتنا زیادہ شفاف ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ صاف رکھا جاتا ہے۔ بدن اور کپڑوں پر مکھی کی بیٹ کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن آئینہ کی شفاف سطح پر بیٹ کا معمولی سے معمولی دھبہ بھی آپ کے لیے خلش بن جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس کو آپ صاف کرتے ہیں پھر اپنا چہرہ دیکھتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاکیزہ قلوب جس طرح کفر وشرک سے متنفر تھے ان علمبرداران کفر وشرک سے بھی متنفر تھے لیکن اس موقع پر فدیہ لے لینے کا مشورہ قرابتی دلچسپی اور منفعت کی طرف رجحان کا شبہ پیدا کرتا تھا جو فدا کاران حق اور محبین کاملین کی شان کے خلاف ہے۔ اس رجحان کی جھلملاہٹ ایک دھبہ تھی جو قلوب صحابہ کے شفاف آئینوں پر برداشت نہیں ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم نے اس کو صاف کرنا صحابہ کی شان بالا وبرتر کے تحفظ کے لیے ضرور سمجھا۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(۳) پھر اس واقعہ سے اگر چہ بظاہر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک منقبت اور فضیلت معلوم ہوتی ہے لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عظمت شان پر بھی یہ واقعہ دلالت کرتا ہے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا مزاج اور ان کے رجحانات سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحانات کے کس قدر مشابہ تھے۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم رحمتہ للعالمین تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق سید الموجودات کا ارشاد ہے۔ ارحم امتی میری پوری امت میں سب سے زیادہ رحم رکھنے والا سب سے زیادہ مہربان۔

یہی وصف تھا جس نے ان قیدیوں کے بارے میں دونوں کی رائے کو متفق کر دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ محمد میاں

(۷) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ جنگ بدر کے موقع پر ایک مشرک آگے آگے بھاگ رہا تھا اور ایک انصاری صحابی اس کا تعاقب کرتے ہوئے دوڑ رہے تھے کہ اوپر سے کوڑا مارنے کی آواز کان میں پڑی ساتھ ساتھ ایک شہسوار کی آواز سننے میں آئی اقدم خیزوم (خیزوم آگے بڑھ) دیکھا تو وہ مشرک چت پڑا ہوا تھا۔ آگے بڑھ کر دیکھا کہ کوڑے کی ضرب کا یہ اثر ہے کہ ناک چھد گئی ہے۔ چہرہ پھٹ گیا ہے اور سارا بدن نیلا پڑ گیا ہے۔ اس انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا۔ فرمایا۔ درست ہے۔ تیسرے آسمان سے جو فرشتوں کی کمک آئی تھی یہ اس کا فعل تھا۔ بہر حال اس روز ستر مشرک مقتول ہوئے

اور ستر گرفتار ہوئے۔

(۸) حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک لڑکے کو سنا کہ دعا کر رہا تھا۔ اے اللہ تو انسان کے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جایا کرتا ہے۔ پس میرے درمیان اور میری خطاؤں کے درمیان حائل ہو جا کہ میں کوئی برا کام نہ کروں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ رحمک اللہ اور آپ نے اس لڑکے کے لیے دعاء خیر کی۔

(۹) حضرت مطرف رضی اللہ عنہ ہم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا۔ اے ابوعبداللہ (حضرت زبیر کی کنیت) آپ حضرات نے خلیفہ اسلام (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ وہ شہید کر دیئے گئے اب تم ان کے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہو۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے دور میں قرآن شریف کی یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔ واتقوا فتن لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصہ

ترجمہ! بچو اس فتنہ سے جو صرف ان لوگوں کے لیے خاص نہیں رہے گا جو ظلم کریں گے) ہمیں کبھی بھی یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ اس فتنہ میں ہم بھی مبتلا ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ جس طرح بھی ہوا یہ فتنہ ہمارے اندر ہی پیدا ہو گیا۔

(۱۰) مفسر قرآن حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی واللہ اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دانشمند طبقہ یقین رکھتا تھا کہ عنقریب فتنے ہونے والے ہیں۔

(۱۱) حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر (رضی اللہ عنہم) کے بارے میں نازل ہوئی (یعنی یہ حضرات اس آیت کے مصداق بنے کہ باوجودیکہ ظالم نہیں تھے مگر اس فتنہ میں مبتلا ہو گئے)

(۱۲) حضرت ضحاک رحمہ اللہ مفسر قرآن: یہ آیت خاص طور پر صحابہ کرام کے بارے میں ہے۔ یعنی صحابہ کرام کے دور کے بعد یہ شکل نہیں ہو سکتی کہ ناکردہ گناہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں کیونکہ اس دور کے بعد جب بھی کوئی فتنہ آئے گا تو ہر ایک فریق کا دامن اس میں ملوث ہو گا البتہ صحابہ کرام میں ایسی جماعت ضرور تھی کہ فی الواقع ناکردہ گناہ تھی۔ پھر بھی وہ مبتلا ہو گئی۔

(۱۳) ''سدی رحمہ اللہ مفسر قرآن: مجھے خبر دی گئی کہ یہ لوگ اصحاب جمل ہیں (کہ ناکردہ گناہ مبتلاء فتنہ ہوئے)

(۱۴) حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ اپنی قوت کے آدمیوں کو (یعنی قریشی حضرات کو) جمع کر کے میرے پاس لاؤ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے سب کو جمع کیا۔ جب وہ سب بارگاہ رسالت کے باب عالی پر پہنچے (صلی اللہ علیہ وسلم) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

اندر جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع دی۔ اس کی اطلاع انصار کو بھی ہوگئی تھی کہ قریشی صاحبان کو آج جمع کیا گیا ہے۔ ان کو خیال ہوا کہ قریشی صاحبان کے بارہ میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے کہ ان کو خاص طور سے بلایا گیا ہے۔ بس کچھ لوگ چلے کہ دیکھیں ان سے کیا کہا جائے گا۔

القصہ جب قریشی صاحبان کا اجتماع ہوا تو حضور ﷺ حجرہ شریف سے باہر تشریف لائے آپ نے فرمایا: آپ لوگوں میں کوئی غیر قریشی بھی ہے۔ حاضرین نے جواب دیا: کچھ ہیں۔ اس مجمع میں کچھ تو وہ ہیں جن سے ہمارا معاہدہ ہے۔ کچھ ہمارے بھانجے ہیں اور کچھ ہمارے آزاد کردہ غلام ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ سب ہمارے اپنے ہیں جو ہمارے حلیف ہیں وہ اپنے ہیں۔ ہمارے خاندانی بھانجے ہیں وہ اپنے ہیں۔ جو ہمارے آزاد کردہ غلام ہیں وہ اپنے ہیں۔ تم سنا کرتے ہو۔ ان اولیای منکم الا المتقون۔ (میرے ولی نہیں ہیں مگر تقویٰ کرنے والے) پس اگر تم متقی ہو تو فبہا۔ ورنہ پھر غور کرلو ایسا نہ ہو کہ اور لوگ تو قیامت کے دن عمل لے کر آئیں اور تم لوگ (گناہوں کے) بوجھ لے کر آؤ۔ پس تم لوگوں سے منہ پھیر لیا جائے۔

(۱۵) حضرت عبدالرحمٰن بن یعلی میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا۔ خمس میں جو آپ کا (ذوی القربی کا) حصہ تھا اس کے متعلق حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کا کیا طرز عمل رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں تو خمس کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ سلسلہ چلا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر خمس میں مجھ کو حصہ دیتے رہے، یہاں تک کہ سوس اور نیسا پور کے لشکر کا خمس سامنے آیا۔ اس وقت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھا۔ آپ نے اہل بیت کو خطاب کر کے فرمایا۔ یہ آپ حضرات کا حصہ موجود ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ کچھ مسلمان بہت پریشان ہیں اور ان کی ضرورتیں بہت شدید ہیں۔ میں نے عرض کیا بالکل درست۔ فوراً حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے۔ فرمانے لگے جو ہمارا حق ہے اس میں آپ کسی کا حصہ مت لگایئے۔ میں نے عرض کیا۔ مسلمانوں کو نفع پہنچانے کا فریضہ کیا سب سے زیادہ ہم پر عائد نہیں ہوتا؟ حضرت امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے بھی سفارش کی۔ پس اس خمس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے لیے لے لیا۔ اس کے بعد ہم کو ادا نہیں کیا اور نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مجھے یہ موقع مل سکا کہ خمس وصول کروں۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر صدقہ حرام کیا تھا۔ اس کے عوض میں آپ کو خمس عطا فرما دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ آپ کے اہل بیت پر بھی صدقہ حرام کیا۔ اہل بیت کے ماسوا ساری امت کو صدقہ لینے کی اجازت دی۔ اس کے عوض میں خمس کا ایک حصہ اہل بیت کے لیے جائز قرار دیا اور صدقہ کو ہاتھوں کا دھوون فرماتے ہوئے اس سے اجتناب کی ہدایت فرمائی۔ اس لیے کہ خمس کا خمس اہل بیت کے لیے کافی ہوتا تھا۔

(۱۸) حضرت علی رضی اللہ عنہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور میں خمس الخمس کی تقسیم کا کام

میرے سپرد کر رکھا تھا۔ میں اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی مستحق حضرات کو تقسیم کرتا رہا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی میں ہی تقسیم کرتا رہا۔

(۱۹) حضرت قتادہ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے مال میں سے پانچواں حصہ خیرات کرنے کی وصیت کی اور فرمایا جو حصہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے پسند فرمایا ہے وہی میں بھی اختیار کرتا ہوں۔ آپ نے استدلال میں یہ آیت پڑھی۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ یاد رکھو جو غنیمت حاصل کرو اس کا پانچواں حصہ اللہ کا ہے۔ (یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا شوق اور جذبہ سخاوت تھا ورنہ خمس کل مال غنیمت کا ہوتا ہے۔ جس میں سے اہل حق کو دیا جاتا ہے۔ ان اہل حق پر لازم نہیں ہے کہ وہ بھی اپنے حصہ میں سے خمس دیں)

(۲۰) حضرت عیان بن واسع بن حبان رحمۃ اللہ علیہ: اپنی قوم کے بزرگوں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے موقع پر اپنے اصحاب کی صف بندی کی اور جھونپڑی میں تشریف لے گئے جو اسی روز تیار کی گئی تھی۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہاں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غنودگی کا کچھ اثر تھا۔ آپ بیدار ہوئے اور فرمایا: ابوبکر! بشارت ہو۔ تمہارے پاس خدا کی نصرت پہنچ گئی۔ یہ جبرئیل ہیں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے اس کو کھینچے لیے جارہے ہیں۔ ان کے چہرے پر غبار ہے۔

(۲۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ: اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ میں اپنے نبی پر یہ آیت نازل فرمائی سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ''عنقریب شکست دے دی جائے گی اس جماعت کو (کفار مکہ کو) اور بھاگیں گے پیٹھ دے کر'' تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ یہ کون سی جماعت ہے (یہ جنگ بدر سے پہلے کا واقعہ ہے) اس کے بعد جب جنگ بدر ہوئی اور قریش کو ہزیمت ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ قریش کے پیچھے تھے تلوار دست مبارک میں لیے اور پڑھ رہے تھے۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔

(۲۲) حضرت حرام بن معاویہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ ہمیں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہہ کر بھیجا کہ ہرگز ہرگز تمہارے آس پڑوس میں بھی خنزیر نہ ہو اور تمہارے حلقہ میں صلیب بلند نہ کی جائے اور اس دستر خوان پر کھانا مت کھاؤ جس پر شراب ہو، اپنے گھوڑوں کو اچھی طرح سدھاؤ اور آہستہ چلو دونوں نشانوں کے درمیان (نشانوں سے مراد رکن یمانی اور حجر اسود ہے) مطلب یہ ہے کہ جب بیت اللہ شریف کا طواف کرو تو اس حصہ میں جو رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان ہے تیز مت چلو بلکہ پاپیادہ اور آہستہ چلو کیونکہ اس حصہ میں ہجوم زیادہ رہتا ہے۔ تیز چلنے سے دوسروں کو تکلیف ہوگی۔ (فصل ششم مقصد اول آیت ۲۸)

جماعت صحابہ کرام کا بہترین مستقبل اور مبارک انجام:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (سورہ توبہ ع ج ۱۰ ع ۹)

''کیا تم نے یوں ٹھہرا رکھا ہے کہ حاجیوں کے لیے سبیل لگا دینا اور مسجد حرام کو آباد رکھنا بھی اسی درجہ کا کام ہے جیسا اس شخص کا کام جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک تو یہ سب کام برابر نہیں ہیں اور اللہ کا قانون ہے کہ وہ ظلم کرنے والوں پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا اور جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے یہاں بہت بڑھا ہوا ہے اور یہی ہیں کامیاب بامراد۔ ان کو بشارت دیتا ہے ان کا رب اپنی جانب سے پوری رحمت کی اور پوری خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی پائیدار نعمت ہو گی یہ کامیاب و بامراد ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

کفار قریش حضرات مہاجرین اور خصوصا حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ مسجد حرام کو آباد کیے ہوئے ہیں، ہم لوگ حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں، ان کی سیرابی کا انتظام کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا افضل و بہتر ہونا ظاہر و باہر ہے۔

حضرات مہاجرین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جواب دیا کرتے تھے کہ ہم پیغمبر اسلام علیہ السلام پر اور روز قیامت پر ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہوئے ہیں ہم نے یہ حقیقی سعادت حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ (عملاً) ہم نے راہ خدا میں گھر بار چھوڑا۔ وطن عزیز کو خیر باد کہا۔ ہم راہ خدا میں جہاد کرتے رہتے ہیں لہٰذا ہم عند اللہ بہتر اور افضل ہیں۔

اللہ تعالیٰ عزوجل نے ان دونوں جماعتوں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰى اُولٰئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ

(سورہ ع ۳ ج ۱۰ ع ۱۱)

''مشرکوں کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں جب کہ وہ خود اپنے

اوپر کفر کا اعتراف کر رہے ہیں یہی وہ ہیں جن کے سارے عمل اکارت گئے اور آگ میں رہیں گے وہ ہمیشہ۔ فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو وہ ہے جو اللہ پر ایمان لایا، آخرت پر ایمان لایا، نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانا۔ انہیں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ (سعادت اور کامیابی) کی راہ پانے والے ہوں گے۔"

مقصد یہ ہے کہ مسجد حرام کا آباد کرنا بیشک ایک اچھا کام ہے۔ لیکن کوئی اچھا کام اس وقت تک قبولیت حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کی بنیاد درست نہ ہو۔

اچھے کام کی قبولیت کے لیے شرط یہ ہے کہ اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان ہو۔ نماز و زکوٰۃ جیسے بنیادی فرائض کو ادا کرتا ہو، اللہ تعالیٰ سے خوف وخشیہ میں اخلاص ہو، نمائشی زہد وتقویٰ نہ ہو۔ یہ صفات کفار قریش میں مففقود ہیں۔ ان کے وہ کام جو بظاہر اچھے معلوم ہوتے ہیں اکارت، لا حاصل اور کالعدم ہیں۔ جب وہ عمل ہی لا حاصل اور اکارت رہا اور خود اس عمل کی فضیلت اور خوبی ہی ختم ہوگئی ہے تو مہاجرین کے مقابلہ میں افضیلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ بفرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بے بنیاد اور کھوکھلے اعمال کچھ حقیقت رکھتے ہیں۔ تاہم ہجرت و جہاد سے تو ان کی کوئی نسبت ہی نہیں ہجرت و جہاد سے ان کا موازنہ قطعاً غلط ہے۔ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللّٰهِ

اس کے بعد مضمون بالا کی مزید تائید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا یعنی جو لوگ ایمان لا چکے ہیں۔ جنہوں نے خدا کے لیے وطن چھوڑا اور اپنی جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کیا ان کا درجہ خدا کے یہاں ان سے بہت بڑھا ہوا ہے جو مسجد حرام کی آبادکاری اور حجاج کے لیے سبیل لگا دینے پر نازاں ہیں۔

یہ مجاہد اور صاحب استقامت مومن ہی عند اللہ بامراد اور کامیاب ہوں گے انہیں کو ان کا رب ذوالجلال اپنی رحمت بیکراں اور اپنی خوشنودی اور رضامندی کی ان جنتوں کی بشارت دے رہا ہے جن میں ان کے لیے ابدی نعمت اور لازوال راحت مہیا کی گئی ہے۔ جن میں یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ کے یہاں ان کا درجہ بہت بڑا ہے۔ اِنَّ اللّٰـهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ بیشک اللہ کے یہاں ہے اجر عظیم۔ یعنی ثواب دینا اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جس کو چاہے اور جس کام پر چاہے۔ بڑے سے بڑا اجر عطا فرما سکتا ہے۔

بہرحال اس آیت نے مہاجرین (۱) اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے اجر، ہجرت اور جہاد کی فضیلت (تمام اعمال سے) اور اس جماعت صحابہ کرام کے بہترین مستقبل اور مبارک انجام کا نہایت واضح انداز میں اعلان کر دیا ہے۔ (فصل ششم)

فقراء صحابہ مقبول بارگاہ ہیں، صبح شام یادِ خدا میں مشغول رہتے ہیں

لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (سورہ انعام ع ۱۲ ج ۷)

''اے نبی! وہ لوگ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح شام جو چاہتے رہتے ہیں اس کی نظر کرم۔ ان کو اپنے پاس سے نہ ہٹاؤ۔ ان کے کاموں کی جوابدہی تمہارے ذمہ نہیں ہے۔ نہ تمہاری جوابدہی ان کے ذمہ ہے کہ اس ڈر سے ان کو تم اپنے پاس سے ہٹاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو زیادتی کرنے والوں میں سے ہو گے۔''

آیت کریمہ کے الفاظ عام ہیں۔ آیت کریمہ ایسے بزرگان ملت کو سند مقبولیت دے رہی ہے جو صبح شام یادِ خدا میں مشغول رہتے ہیں۔ جن کا نصب العین رضاء الٰہی ہوتا ہے اور ان کے متعلق ہدایت کر رہی ہے کہ ان کو نظر انداز کرنا ظلم ہے۔ مسلم شریف کی مندرجہ ذیل روایت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت فقراء صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ روایت یہ ہے:

''حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ: ہم چھ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ چند مشرکوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کی کہ ان کو ہٹا دیجئے۔ ہم اس کو پسند نہیں کرتے کہ یہ لوگ ہمارے برابر بیٹھیں اور بے باکانہ بات چیت کریں۔ یہ چھ آدمی یہ تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قبیلہ ہذیل کا ایک شخص، حضرت بلال رضی اللہ عنہم اور دو اور اصحاب تھے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن مبارک میں بھی کچھ خیال آیا ہوگا کہ شاید اسی طرح ان کو ہدایت نصیب ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ رعایت پسند نہیں آئی لہٰذا یہ آیت نازل فرمائی۔'' (مسلم شریف)

ان ہی با اخلاص اہل ایمان کی رفاقت اختیار کیجئے

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (سورہ کہف ع ۴ ع ۱۶ ج ۱۵)

''اور جو لوگ صبح شام اپنے رب کو پکارتے رہتے ہیں۔ اس کی محبت میں سرشار اور اسی کی رضاء کے خواہاں رہتے ہیں تم انہیں کی صحبت پر اپنے جی کو قانع کر لو (اسی پر اپنے من کو جما لو) اور ایسا نہ ہو کہ تمہاری آنکھیں ان سے پھر کر دنیاوی زندگی کی رونق کی تلاش میں دوڑنے لگیں اور ایسا بھی نہ ہو کہ تم اس کا کہنا ماننے لگو اور اس کی اطاعت کرنے لگو جس

کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور اپنی خواہش اور من مانی باتوں کے پیچھے پڑ گیا
ایسے آدمی کی باتوں پر کان نہ دھرو اس کا معاملہ حد سے گذر چکا ہے۔''

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں یہ سورہ مکی ہے۔لہٰذا اس آیت میں جس جماعت کا ذکر کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو جس جماعت کے ساتھ رہنے کی فرمائش کی گئی ہے اور جس کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ صبح وشام ذکر خدا میں مشغول رہتے ہیں اور جس کے متعلق ابدی نعمتوں کا وعدہ ہے۔وہ لامحالہ مہاجرین اولین ہیں۔جن کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بکثرت کرتے ہیں اور جو پہلے ہی سے تہی دست تھے یا محض اللہ کے لیے (للہ فی اللہ) اپنا مال فقراء پر اور اسلام کی ضرورتوں پر صرف کر کے فقیر ہو گئے ہیں یہ سب سے بڑا اشرف ہے جو اس جماعت کو حاصل ہوا ہے کہ خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی ہے کہ ان کی رفاقت اور صحبت اختیار کریں۔

افادات:

ان آیتوں سے پہلے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۔

''تم پر تمہارے رب کی طرف سے جو وحی بھیجی جاتی ہے اس کی تلاوت کرو (یہ ابدی اور دائمی وحی ہے) کوئی نہیں ہے جو اس کے کلمات اور خداوندی ارشادات کو بدل سکے اور نہ اس سے ہٹ کر نجات پانے کی کوئی جگہ ہے۔''

ازالۃ الخفا میں اس آیت کو سَاءَتْ مُرْتَفَقًا تک نقل کیا ہے۔ان آیات کے تحت میں جو فوائد پیش کیے ہیں ان کو نظر انداز کرنا بہت بڑی کوتاہی ہے۔لہٰذا درج ذیل ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر چہ سرور کائنات سید الانبیاء والمرسلین علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام خلق عظیم سے متصف تھے آپ کو آداب زہد کے تلقین کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر اس لیے کہ امت کو دستور العمل معلوم ہو اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو آداب زہد کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۱) سب سے پہلی ہدایت ہے کہ وحی خداوندی یعنی کلام اللہ کی تلاوت کرتے رہو (۲) اس کے بعد ارشاد ہوا کہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے وابستہ رکھیے اور انہیں کی صحبت اختیار کیجیے جو صبح وشام اپنے رب کی یاد میں مشغول رہتے ہیں۔اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہل تنعم اور اصحاب ثروت کے ساتھ محض بقدر ضرورت صحبت اختیار کیجیے۔ضرورت سے زیادہ ان کے ساتھ نشست وبرخاست مت رکھیے نہ ان کی دعوت کو پسند کیجیے اور نہ ان کے دنیاوی تکلفات کو نظر استحسان سے دیکھیے۔(۳) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عیش پرست کفار کے عذاب اور فقراء مومنین کے ثواب کا ذکر فرمایا ہے۔(۴) اللہ تعالیٰ نے سرمایہ دار کافر اور ایماندار غریب مسلمان کی تمثیل ایک

حکایت کی شکل میں بیان فرما کر(۵) دنیاوی تنعمات کو زمین کے اس سبزہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بہت جلد خشک ہو کر پراگندہ ہو جائے گا۔ ایسے ہی دولت وثروت اور اہل وعیال کی مسرتیں بھی عنقریب زوال پذیر ہو جائیں گی۔ البتہ ارشاد ہوتا ہے کہ باقیات صالحات یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر بقاء سرمد اور حیات جاوید رکھتا ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے سورہ کہف کے متعلق چند احادیث اور آثار نقل کیے ہیں:

(۱) حضرت زید بن وہب رضی اللہ عنہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز صبح میں سورہ کہف کی قرأت کی، حضرت صفیہ بنت عبید سے بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

(۲) حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ باقیات صالحات کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا: لا الہ الا اللہ، سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر اور لاحول ولا قو الا باللہ

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ: ایک شخص پکار رہا تھا اے ذی القرنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا فرمایا۔ آپ لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے نام تو رکھ لیے، اب فرشتوں کے نام رکھنے ہیں۔

(۴) حضرت خالد بن معدان رحمہ اللہ (مرسلاً) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذی القرنین کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ فرمایا ایک بادشاہ تھا جو زمین کی تہ کو اپنے آلات کے ذریعہ چھونے لگا تھا (یعنی اس کی حکومت اتنی وسیع اور مستحکم ہوگئی تھی۔ (واللہ اعلم)

(۵) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رات کو سورہ کہف کی آخری آیت فمن کان یرجو القاء ربہ آخر تک پڑھ لے اس کو پھیلا ہوا نور عطا ہوگا جس کی طوالت عدن سے مکہ تک ہوگی۔ (فصل ششم آیت ۳۶ ص ۱۶ ج ۲)

حضرات صحابہ کے متعلق لطف وعنایت کی فرمائش

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (سورہ شعراء ع ۱۱ ج ۱۵ ۱۹)

''جھکاؤ اپنا بازو ان ایمان والوں کے لیے جو آپ کے پیروکار ہوتے ہیں۔''

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ یہ سورہ مکی ہے، اس وقت جو اہل ایمان تھے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کر رہے تھے وہ وہی مہاجرین اولین تھے جو سب سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئے تھے۔ یہ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ رب العالمین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرما دیں کہ ان کے لیے اپنا بازو جھکاؤ۔ یعنی ان کے ساتھ پوری مراعات اور ملاطفت سے پیش آؤ۔ کیا ایک امتی کے لیے اس سے زیادہ کوئی فخر کی بات ہو سکتی ہے۔

افادات:

یہ سورہ شعراء کی آیت ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس آیت کے تحت میں جو افادات سپرد قلم فرمائے اس سے پوری سورہ کا خلاصہ اور آیات کا باہمی ربط معلوم ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے سورہ شعراء میں سات پیغمبروں کے قصے بیان فرمائے ہیں۔ حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم السلام۔ ان تمام قصوں کے بعد آخری رکوع میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے واسطہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر قرآن حکیم نازل فرمایا۔ دلیل ہدایت یہ ہے کہ علماء اہل کتاب اس کی حقیقت کے معترف ہیں کیونکہ کتب سابقہ میں اس کا تذکرہ پاتے ہیں۔

پھر اس پر روشنی ڈالی ہے کہ قرآن پاک ایک عربی شخص پر عربی زبان میں کیوں نازل کیا گیا ہے۔ کسی عجمی شخص پر عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا۔ کیونکہ عربوں کو سب سے پہلے مسلمان بنانے کا جو مقصد تھا وہ فوت ہو جاتا کیونکہ عجمی پر اگر عربی میں نازل ہوتا تو عرب اس کا مذاق اڑاتے اور اگر عجمی زبان میں ہوتا تو اس کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔ پس عربوں کو احسان ماننا چاہیے کہ وہ اس دولت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد کذلك سلکناہ سے یہ بتا دیا گیا ہے کہ سرکش اور شورہ پشت مخالفین کی ایک جماعت وہ ہے کہ حق وصداقت سے انکار کرنا ان کے دلوں میں جم گیا ہے اور گویا طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ ان تمام واضح اور روشن دلائل اور ان غیر معمولی احسانات کے بعد بھی وہ اسلام سے مشرف نہ ہوگی۔ اس کے بعد صداقت وحقانیت قرآن کریم پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن حکیم شیطانی الہام اور شیطانی وسوسہ کے قسم کی چیز نہیں ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ملاء اعلیٰ جہاں جمہور بنی آدم کے مصالح کے لیے احکام الٰہیہ کا انعقاد ہوتا ہے اور جو خداوندی فرامین کے نزول کا مرکز ہے وہاں تک شیطان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ مفید اور مستفید یعنی الہام کرنے والے اور الہام حاصل کرنے والے کے درمیان مناسبت ہونا ضروری اور شرط کے درجہ پر ہے چنانچہ سنت اللہ اور دستور خداوندی اس طرح پر جاری ہے کہ شیاطین سے وہی نفوس فائدہ اٹھاتے ہیں جو خبیث اور کمینہ ہوتے ہیں اور یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفس مبارک حد درجہ مقدس اور آپ کے اعمال واخلاق انتہائی درجہ پاک اور برگزیدہ ہیں لہٰذا آپ میں اور شیطانی سلسلوں میں مشرق ومغرب کا بعد اور نور وظلمت کا تضاد موجود ہے۔ اس لیے ناممکن ہے اس کا کوئی تعلق شیطانی سلسلہ سے ہو۔

اس کے بعد یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ قرآن حکیم شعر وشاعری کے سلسلہ کی چیز بھی نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق واعمال اور شعراء کی طبیعت وفطرت میں زمین وآسمان کا فرق ہے مثلاً شعراء کی فطرت عموماً یہ ہے کہ ان کو عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خیالات کی دنیا میں ہر میدان میں جست لگاتے رہتے

ہیں، اعتدال سے نا آشنا ہوتے ہیں، مدح کرتے ہیں تو حد سے زیادہ اور کسی کی ہجو کرتے ہیں تو وہ بھی اسی طرح بے پناہ۔ حسن کی تعریف کرتے ہیں تو سراسر مبالغہ۔ اس کے بغیر شعر میں رنگ پیدا نہیں ہوتا۔ اعمال واخلاق کی اصلاح اور خلق خدا کی ہدایت اور ان کے ساتھ ہمدردی جیسے اعلیٰ اخلاق سے ان کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی اور یہاں صورت یہ ہے کہ ہر ایک مسئلہ میں اعمال واخلاق کی اصلاح مقصود اول ہے۔ مبالغہ سے کوئی تعلق نہیں جو کچھ ہے حقیقت کی تعبیر صادق ہے۔ لہٰذا اس کلام مقدس کو شعر سے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو شعراء سے بھی کوئی نسبت نہیں ہے۔

اسی تقریر شریف کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے۔ فلا تدع الخ۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوتی ہے کہ صرف ذات واحد کی پرستش اور عبادت کو اپنا مستقل شعار اور دائمی طریقہ بنائے رکھئے۔ جو کنبہ یا خاندان آپ سے سب سے زیادہ قریب ہے پہلے اس کو ہدایت کیجئے۔ سب سے پہلے اس کے سامنے اپنی دعوت پیش کیجئے اور ان کے ساتھ تواضع سے پیش آیئے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ آپ کی پیروی قبول نہیں کرتے اور آپ کی رہنمائی سے سرتابی کرتے ہیں تو اپنے خدا پر بھروسہ رکھئے۔ ان کے انکار کی وجہ سے مایوس مت ہوجئے۔ اپنی طبیعت کو تشویش میں مبتلا مت کیجئے۔

اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا۔ یعنی شعراء کی جو مذمت کی گئی ہے اس سے وہ مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے، جو نیک کام کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بکثرت کرتے ہیں۔

اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس استثناء کے مصداق حضرت ابو بکر حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن رواحہ ہیں (رضی اللہ عنہم) جو بکثرت ذکر کیا کرتے تھے اور شعر سے بھی مناسبت رکھتے تھے۔

متعدد سندوں سے روایت ہے کہ جب حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے جو اسلام کے مشہور شاعر ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ وہ کفار قریش کی ہجو میں کچھ لکھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت صادر فرماتے ہوئے حضرت حسان کو ہدایت فرمائی کہ وہ حضرت ابو بکر کی خدمت میں حاضر ہوں وہ آپ کو قریش کی پوری تاریخ، ان کے جنگی کارنامے اور ان کے خاندانوں کے حسب نسب بتائیں گے (مقصد یہ ہے کہ اگرچہ حضرت حسان شاعر تھے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی شعر سے مناسبت تھی مگر ان حضرات کے اشعار حقائق و واقعات کی نقش آرائی ہوتے تھے۔ مبالغہ اور افراط وتفریط سے مبرا ہوتے تھے لہٰذا یہ اس استثناء میں داخل ہیں)۔

اس کے بعد پھر اسی سورت اور اسی رکوع کی آیت ہے۔ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔ اس آیت کی مناسبت سے حضرت شاہ صاحب نے مندرجہ ذیل روایت پیش کر دی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا: میرے والد ماجد نے اپنی وصیت میں دوسطریں تحریر کرادیں وصیت نامہ یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ یہ وہ وصیت ہے جس کو ابوبکر بن قحافہ دنیا سے روانگی کے وقت لکھ رہا ہے۔ جب کہ کافر ایمان لے آتا ہے۔ بدکار پرہیز گار ہو جاتا ہے۔ اور جھوٹا سچ بولنے لگتا ہے میں عمر بن خطاب کو مسلمانوں کا خلیفہ بنا رہا ہوں۔ اگر وہ انصاف سے کام لیں تو جو میرے خیالات ان کے متعلق ہیں اور جو میری توقع ان سے ہے اس کی تصدیق کر دیں گے اور اگر وہ ظلم وزبردستی سے کام لیں اور یہ میری توقعات کو بدل دیں تو میں غیب داں نہیں ہوں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ظالم بہت جلد جان لیں گے کہ وہ کس گردش کی جگہ پلٹ کر جا رہے ہیں
(ازالۃ الخفاء فصل ششم آیت سورہ شعراء)

مہاجرین کرام کی عظیم الشان قربانی اور بینظیر صداقت

اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا وَیَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اُوْلٰئِکَ ھُمُ الصّٰادِقُوْنَ (سورہ حشر ع۱)

''وہ جو نکال دیئے گئے ہیں اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے جو تلاش کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی خوشنودی اور مدد کرتے ہیں اللہ کی اور اس کے رسول کی یہی ہیں سچے۔''

اس آیت کی تفسیر میں امام المفسرین حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ یہ مہاجرین جن کا اس آیت میں ذکر ہے وہ ایثار شیوہ محبین اسلام ہیں جنہوں نے اپنے مکانات اپنے تمام مال واسباب اہل وعیال اور تمام کنبہ اور خاندان کو چھوڑا اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں نکل کھڑے ہوئے اور ان تمام سختیوں اور پریشانیوں کے باوجود اسلام کو اختیار کیا جن کے تصور سے پتہ پانی ہوتا ہے۔ فقر و فاقہ کی انتہا تھی کہ کئی کئی وقت کے فاقہ کی وجہ سے کمر کو سیدھا رکھنا مشکل ہوتا تھا مجبوراً پیٹ پر پتھر باندھا کرتے تھے تا کہ کمر سیدھی رہ سکے۔ سردیوں میں گڑھے اور غار میں چھپ کر گھاس لیا کرتے تھے۔ ان کے برہنہ بدن کے لیے گڑھا ہی لحاف ہوتا تھا۔

افادات:

سورہ حشر کی ان آیتوں میں ان جائیدادوں کے متعلق احکام ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دولت اسلام کے زیر نگیں آئیں۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ کی ضبط شدہ جائیدادوں اور فدک وغیرہ کے احکام ان آیات میں واضح ہوتے ہیں۔ دور حاضر کے چند مسائل پر بھی (جو سیاسیات اور اقتصادیات میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں) ان آیات سے روشنی پڑتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس موقع پر مختصر سی بحث فرمائی

ہے۔ ہم مسئلہ کو واضح اور مدلل کرنے کے لیے مناسب سمجھتے ہیں کہ پہلے ان آیتوں کو نقل کر دیں۔ پھر حضرت شاہ صاحب کے افادات زیب تحریر کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (سورہ حشر ع ۲)

''اور اللہ تعالیٰ نے جو فے عطا کیا اپنے رسول کو ان سے لے کر (بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اور جو ہاتھ لگایا اللہ نے اپنے رسول کو۔ یعنی اللہ کے فضل سے رسول کے ہاتھ لگا) پس تم نے نہیں دوڑائے اس پر گھوڑے نہ اونٹ۔ لیکن اللہ جتا دیتا ہے۔ (غلبہ بخشتا ہے) اپنے رسول کو جس پر چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ کرسکتا ہے)

اور جو فے عطا کر دے۔ (ہاتھ لگا دے) اللہ نے رسول کو بستیوں والوں سے تو وہ اللہ کے واسطے ہے رسول کے لیے ہے اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے (یہ تقسیم اس لیے ہے تا کہ وہ) دولت مندوں کے دست برد میں نہ آ جائے (بقول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کہ دست گرداں نہ ہو جائے اور بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب تا نہ آوے لینے دینے میں دولت مندوں کے) اور جو دے تم کو رسول وہ لے لو۔ اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ کی مار سخت ہے۔

واسطے ان مفلسوں وطن چھوڑنے والوں کے (ان مفلس مہاجرین کے لیے) جو اپنے گھروں اور مالوں سے نکال دیئے گئے۔ جو تلاش کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی خوشنودی اور مدد کرتے رہتے ہیں اللہ کی اور اس کے رسول کی یہی ہیں (اپنے قول

وفعل کے) سچے۔

اور وہ لوگ جو ٹھیرے ہوئے ہیں اس گھر علاقہ (مدینہ) میں پہلے سے اور ایمان میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں (یعنی حضرات انصار) وہ محبت کرتے ہیں ان سے جو ہجرت کر کے ان کے یہاں آئے ہیں اور ان مہاجرین کو جو کچھ دیا جائے اس سے یہ (باشندگان قدیم یعنی انصار) اپنے دلوں میں کوئی غرض اور دغدغہ محسوس نہیں کرتے (اور اس کے برخلاف) ان مہاجرین کو خود اپنی جان سے مقدم رکھتے ہیں۔ اگرچہ خود ان کو بھی کتنی ہی شدید حاجت وضرورت درپیش ہو۔ اور جو اپنے نفس کے لالچ (حرص وطمع) سے بچا لیا جائے تو وہی ہیں کامیاب و بامراد۔ فلاح پانے والے اور یہ فے (ہاتھ لگا ہوا مال) ان کے لیے ہے جو ان کے بعد آئیں یہ کہتے ہوئے کہ اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جو ایمان لانے میں ہم سے سبقت کر چکے ہیں۔ اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں بیر۔ (کینہ) ایمان والوں سے اے ہمارے رب بیشک تو بہت مہربان ہے۔ بہت رحم کرنے والا۔''

اللہ تعالیٰ نے آیات مذکورہ بالا میں ان تمام جائیدادوں کو جو ان بستیوں کے باشندوں سے بطور فے کے حاصل ہوئیں یعنی اس طرح حاصل ہوئیں کہ نہ ان کے حاصل کرنے کے لیے اونٹ اور گھوڑے دوڑانے پڑے نہ جنگ کرنی پڑی۔ ان اراضی کی پیداوار کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ وہ بھی لشکر کشی کے بغیر حاصل ہوئی ہے۔ خدا، رسول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں، یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل (تہیدست مسافر) کے لیے معین کر دیا ہے۔ اس کے بعد فقراء مہاجرین، انصار اور مہاجرین وانصار کے وہ پیروکار اور تابع جو عمدگی اور خوبی سے ان کی اتباع کرتے ہیں یعنی ان کے خیرخواہ و خیراندیش ہیں اور ان کے لیے دعاء خیر کرتے رہتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور اس فے میں ان کا حصہ مقرر کیا ہے۔ یہ غیر محدود اور غیر منحصر تعداد ہے۔ جس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ بہرحال جب یہ فے اور یہ آمدنی غیر منحصر اور غیر محدود جماعت کے لیے ہوگئی تو یہ بات بالکل واضح اور بالکل قطعی ہوگئی کہ یہ جائیدادیں اور ان کی آمدنیاں کسی شخص کی ملک نہیں ہوسکتیں بلکہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق یہ پیداوار دی جائے گی اور خلیفہ کا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے قائم کردہ دستور کے مطابق تقسیم کرتا رہے۔ چونکہ اسی کام کے لیے اس کو منصب خلافت دیا جاتا ہے۔

ان آیات نے اس آمدنی کو اس طرح تقسیم کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ جائیداد اور ان کی آمدنیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک نہیں ہیں۔ لہٰذا ان جائیدادوں یا ان کی آمدنیوں کے متعلق نہ میراث کا سوال پیدا ہو سکتا تھا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رشتہ داروں میں سے کسی خاص شخص کو کوئی جائیداد ہبہ کر سکتے تھے۔

مندرجہ ذیل احادیث اس مضمون کو واضح کر دیتی ہیں۔

(۱) حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ: بنی نضیر کی جائیدادیں اس آیت کے تحت میں داخل تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھیں۔ آپ ان کی آمدنی میں سے اپنے متعلقین کو ایک سال کا نفقہ دے دیا کرتے تھے۔ پھر باقی آمدنی مسلمانوں کے لیے سامان جہاد فراہم کرنے میں صرف کر دیا کرتے تھے۔

(۲) حضرت مالک بن اوس بن الحدثان: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ تا عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (سورہ توبہ)

''زکوٰۃ حق ہے مفلسوں کا، محتاجوں کا اور ان کا جو اس کی وصولی کے کام پر مقرر کئے جائیں۔ (بقول حضرت شاہ صاحب اس کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا ہے۔ یعنی جن کے دلوں میں کلمہ حق کی الفت پیدا کرنی ہے (نومسلم جن کے دلوں میں اسلام پوری طرح رچا نہیں) اور وہ کہ ان کی گردنیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ نیز قرض داروں کے لیے جو قرض کے بوجھ سے دب گئے اور ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے جو گھر نہیں پہنچ سکتے اور مفلسی کی حالت میں پڑ گئے۔''

یہ آیت پڑھنے کے بعد آپ نے فرمایا۔ یہ تو ان کے لیے ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھا۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (تا ختم آیت)

''اور جان رکھو جو کچھ مال تمہیں غنیمت میں ملے اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے، رسول کے لیے، رسول کے قرابت داروں کے لیے، یتیموں کے لیے، مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے۔''

پھر آپ نے فرمایا یہ ان کا ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے تلاوت کی۔ مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ...... اور شَدِيْدُ الْعِقَابِ تک پڑھ کر فرمایا۔ یہ مہاجرین کے لیے ہے۔ پھر آپ نے پڑھا وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ آخر آیت تک اور فرمایا یہ انصار کے لیے ہے۔ پھر پڑھا وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ آخر تک اور فرمایا اس نے تمام مسلمانوں کو اپنے اندر شامل کر لیا۔ اور ایک مسلمان بھی ایسا نہ رہا کہ اس مال میں اس کا حصہ نہ ہو۔ ہاں صرف یہ صورت ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اپنا حصہ اپنے ساتھیوں کو دیدے۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں زندہ رہا تو ایک چرواہا جو سرحمیر (یمن کا ایک مقام) میں بکریاں چراتا ہوگا۔ اس کے پاس اس کا حصہ پہنچ جائے گا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ بھی نہ آیا ہوگا۔ یعنی بغیر دوڑ دھوپ کے گھر بیٹھے اس کا حصہ اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ (کہاں ہیں کمیونزم کے حامی کیا وہ کوئی ایسا پروگرام پیش کر سکتے ہیں؟)

(۳) حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ اپنے والد ماجد اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ صحابہ کرام کو دعوت دی کہ جمع ہو کر غور کریں کہ ان اراضی کی آمدنی کس کس پر صرف کی جائے۔ آپ نے اس اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ کلام اللہ شریف کی آیتیں ہمیں بتا رہی ہیں کہ کن کن پر ان آمدنیوں کو صرف کیا جائے۔ آپ نے ما افاء اللّٰہ سے اولئك هم الصادقون تک پڑھا اور فرمایا واللہ یہ مال یہ صرف ان کے لیے نہیں ہے جن کا تذکرہ اس آیت میں ہے۔ پھر آپ نے والذین تبوؤا سے المفلحون تک پڑھا اور فرمایا خدا شاہد ہے یہ مال صرف انہیں کے لیے نہیں ہے۔ پھر آپ نے والذین جاؤوا من بعدهم سے رحيم تک پڑھا اور فرمایا خدا کی قسم ایک بھی مسلمان نہیں رہتا جس کا اس مال میں حق نہ ہو۔ یہاں تک کہ عدن میں بکریوں کا چرانے والا بھی حق دار ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کو اس کا حق دیا جائے یا روک لیا جائے۔

(۴) حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک روز مال تقسیم کیا۔ لوگ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا یہ کیا حماقت ہے؟ جو کچھ میں نے آپ لوگوں کو دیا ہے، اگر اس میں ایک درہم بھی میرا ہوتا تو میں شکریہ کا مستحق تھا۔ جب میرا مال ہی نہیں آپ ہی لوگوں کا ہے تو آپ کو آپ کا مال دینے میں شکریہ کیسا؟

(۵) حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ: اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے ہاتھ عجم سے بھر دے گا۔ (ان کی دولت تمہارے پاس آ جائے گی) پھر اللہ ان عجمیوں کو ایسے شیر (درندے) بنا دے گا جو فرار اور ہزیمت سے ناآشنا ہوں۔ یعنی عجمی عربوں پر بھاری ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے یعنی عربوں کے جنگجو بہادروں کو قتل کریں گے اور تمہارا فئے (اراضی) حکومت کی آمدنیاں مستحقین کو دینے کے بجائے) خود کھائیں گے۔

(۶) حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے تین دفعہ فرمایا والذی لا الہ الا ھو (قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں) کوئی ایک آدمی بھی نہیں ہے جس کا اس مال میں حق نہ ہو اس کو وہ حق دیا جائے یا روک لیا جائے) نیز کوئی شخص بھی دوسرے سے زیادہ مستحق نہیں ہے البتہ زرخرید غلام۔ اس سلسلہ میں میں بھی مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ میری کوئی جدا حیثیت نہیں ہے۔ ہاں کتاب اللہ کے لحاظ سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کے لحاظ سے ہمارے مراتب اور منازل ہیں۔ لہٰذا ہر ایک شخص کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ اسلام کی تاریخ میں اس نے کیا قربانی پیش کی۔ کتنی مصیبتیں جھیلیں۔ اس کا اسلام کتنا قدیم ہے۔ وہ اسلام کے لیے کس درجہ کار آمد ہوا اور ہر ایک شخص کی ضرورت کو بھی دیکھا جائے گا۔ اگر میں زندہ رہ گیا تو خدا کی قسم ایک چرواہے کو جو کہ صفا میں رہتا ہو اس کا حصہ اس کے مکان پر پہنچ جایا کرے گا۔

(۷) حضرت حسن رضی اللہ عنہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ لوگوں کو ان کے حصے اور ان کے وظیفے ادا کر دو۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ہم ادا کر چکے ہیں اور پھر بھی

بہت کچھ باقی رہ گیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے (دوبارہ) لکھا۔ یہ انہیں کا فئے (مال) ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان کو مال غنیمت کے طور پر دیا ہے۔ یہ نہ عمر کا ہے اور نہ اولاد عمر کا، اس کو انہیں پر تقسیم کر دو۔

(۸) حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ: الذین تبو والدار الخ کے بارے میں فرماتے ہیں یہ انصار کا وہ قبیلہ ہے جو اپنے اپنے وطن اور مکانوں میں رہتے ہوئے سعادت اسلام حاصل کر چکے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے دو سال قبل وہاں مسجدیں بنا چکے تھے۔ یعنی اپنے اپنے محلوں میں نماز پڑھنے کی جگہ مقرر کر لی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں ان کی بہت اچھی تعریف کی ہے۔ یہ دو جماعتیں (مہاجرین اولین اور انصار) اس امت میں اولیت کا شرف اور مسابقت کی فضیلت حاصل کر چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فئے میں ان کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔ اس کے بعد حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے تیسری جماعت کا ذکر کیا اور قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت کی والذین جاؤوا من بعدھم (تا آخر) اور فرمایا ان کو یہ حکم ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعاء مغفرت کرتے رہیں۔ ان کو یہ حکم نہیں ہے کہ صحابہ کرام کو برا بھلا کہیں اور ان پر سب وشتم کریں۔

(۹) حضرت حسن رضی اللہ عنہ: اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو انصار کے مقابلہ میں فضیلت عطا فرمائی ہے۔ انصار نے اپنے سینوں کے اندر اس پر کوئی احتیاج یعنی کسی قسم کا کوئی حسد محسوس نہیں کیا۔

(۱۰) حضرت عمر رضی اللہ عنہ: میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین اوّلین کا پورا احترام ملحوظ رکھے، ان کے حق کو پہچانے، ان کی حرمت وعظمت کا پورا احترام کرے نیز حضرات انصار کے متعلق جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے رہنے کا انتظام کیا اور ایمان کو پناہ دی۔ اپنے بعد کے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ اچھی خدمت کرنے والے کی اچھی خدمت کو قبول کرلے اور خراب کام کرنے والے کی خرابی سے درگذر کرے۔

(۱۱) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ: مسلمانوں کے تین درجے تھے، دو درجے تو گذر چکے ایک باقی ہے۔ جو رفتار چل رہی ہے اس کے پیش نظر سب سے بہتر یہ ہے کہ جو ایک درجہ باقی رہ گیا ہے اس پر قائم رہو (اس تمہید کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی) لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ (الایۃ) آپ نے فرمایا: یہ حضرات مہاجرین ہیں۔ یہ ایک درجہ ہے اور یہ درجہ گذر چکا۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی۔ وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ (الایۃ) پھر فرمایا یہ انصار ہیں اور یہ ایک درجہ تھا۔ یہ بھی گذر چکا۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی وَالَّذِينَ جَاؤُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا (الایۃ) آپ نے فرمایا وہ دونوں درجے تو گذر چکے یہ درجہ اور اس درجہ کے مسلمان باقی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے دور میں جو پیش آ رہی ہیں سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ تم اس درجہ پر قائم رہو (یعنی حضرات مہاجرین اور انصار کا احترام دلوں میں رکھو اور ان کے لیے دعائے خیر کرتے رہو۔ ان پر تنقید اور طعن وتشنیع نہ کرو (معاذ اللہ)

(۱۲) حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ: آپ نے آیت کریمہ والذین جاؤوا من بعدھم کا حوالہ دیتے

ہوئے فرمایا۔ اس آیت میں بعد میں آنے والے مسلمانوں کو حکم کیا گیا ہے کہ وہ پیشرو حضرات کے لیے دعائے خیر کریں اور حال یہ ہے کہ آپ دیکھ رہے ہیں لوگوں نے کیسی کیسی باتیں گھڑ لی ہیں (حضرات صحابہ بالخصوص خلفاء راشدین پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔ روافض حضرات شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم پر معاذ اللہ تبرا کرتے ہیں۔ خوارج ان کے برخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ وغیرہ ذالک)

(۱۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔ مسلمانوں کو حکم کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام کے لیے دعائے خیر کریں اور لوگ ان بزرگوں پر سب وشتم کرنے لگے۔ آپ نے دلیل میں یہ آیت پیش کی۔ والذین جاؤوا من بعدھم (الآیۃ)

(۱۴) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما: آپ نے دیکھا کہ ایک شخص کسی مہاجر کی شان میں گستاخی کر رہا ہے آپ نے یہ آیت پڑھی۔ للفقراء المهاجرین الخ۔ پھر اس شخص کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ قرآن حکیم نے مہاجرین کی یہ شان بیان فرمائی ہے۔ کیا تم مہاجر ہو۔ اس نے جواب دیا نہیں۔ پھر آپ نے دوسری آیت پڑھی۔ والذین تبوؤا الدار اور فرمایا قرآن کریم نے یہ انصار کی شان بیان فرمائی ہے۔ کیا تم انصاری ہو۔ اس نے جواب دیا نہیں۔ پھر آپ نے تیسری آیت پڑھی۔ والذین جاؤوا من بعدھم اور فرمایا کیا تم ان لوگوں میں سے ہو۔ اس نے کہا امید تو یہی ہے کہ میں ان لوگوں میں شامل ہوں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ: نہیں تم ان میں شامل نہیں ہو۔ جو شخص پہلے بزرگوں کی شان میں گستاخی کرے وہ اس آیت کا مصداق نہیں بن سکتا۔

(۱۵) دوسری سند سے یہ روایت اس طرح ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہہ رہا ہے۔ آپ نے اس کو بلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور مذکورہ بالا آیتیں پڑھ کر دریافت کیا تم مہاجر ہو، تم انصاری ہو۔ اس نے جواب نفی میں دیا۔ پھر تیسری آیت پڑھی اور دریافت کیا تم اس کا مصداق ہو۔ اس نے کہا مجھے توقع ہے کہ میں اس آیت کا مصداق ہوں۔ فرمایا نہیں۔ وہ شخص اس آیت کا مصداق نہیں بن سکتا جو ان پر نکتہ چینی اور اعتراض کرے اور اس کے دل میں ان بزرگوں کی طرف سے کینہ اور عداوت ہو۔

(۱۶) حضرت نعیم بن محمد رحبی رحمہ اللہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا: دیکھو تم ایک ایسی مہلت میں صبح وشام کر رہے ہو۔ جس کی آخری میعاد کی خبر نہیں کہ وہ کب ختم ہوتی ہے۔ پس اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ یہ مہلت ایسی طرح گذر جائے کہ تم پوری احتیاط سے کام لیتے رہو تو اس میں کوتاہی مت کرو۔ لیکن خداوند عالم کی امداد کے بغیر تم ایسا نہیں کر سکتے۔

دیکھو بہت سے ایسے خود فراموش ہیں جو عمل کرتے ہیں مگر اس کا مفاد دوسروں کے لیے ہوتا ہے (وہ ملی یا قومی نصب العین فراموش کر دیتے ہیں اور غلط راستہ پر دوڑتے ہیں۔ ان کی یہ تمام دوڑ دھوپ ان کے بجائے ان

کے حریف کو مضبوط کر دیتی ہے) حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو منع کیا ہے کہ تم اپنے عمل سے ایسے خود فراموش لوگوں کی مثال پیش کرو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (سورہ حشر ع ۳)

''تم ان کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھے۔ یہی لوگ ہیں فاسق۔''

پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ کہاں ہیں تمہارے وہ بھائی جن کو تم پہچانتے تھے ان کے جو کچھ اعمال تھے وہ ختم ہو چکے ہیں اور جو کچھ انہوں نے پہلے مہیا کر دیا تھا وہ ان کے سامنے ہے۔ کہاں ہیں وہ عظمت و جبروت کے مالک جنہوں نے بڑے بڑے شہروں کو آباد کیا، مضبوط چار دیواریوں سے گھیرا، ان کو مستحکم قلعہ بنا دیا۔ آج وہ پتھروں اور تودوں کے نیچے پہنچ چکے ہیں۔ یہ اللہ کی کتاب ہے نہ اس کے عجیب و غریب حقائق و لطائف ختم ہوں گے نہ کبھی اس کا نور ماند پڑے گا۔ اس شمع ہدایت سے یوم ظلمت کے لیے روشنی حاصل کر لو۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے اور اس کے واضح بیان سے نصیحت حاصل کر لو۔ دیکھو اللہ تعالیٰ ان کی تعریف فرماتا ہے جن کی شان یہ ہے:

كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَباً وَرَهَباً وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ

''وہ اچھے کاموں میں بہت تیزی سے سبقت کی کوشش کرتے ہیں وہ ہم کو رغبت و شوق اور ہیبت و خوف کے مختلف جذبات کی کش مکش میں پکارتے ہیں اور ہمارے سامنے خشوع و خضوع کرتے رہتے ہیں۔''

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس قول میں کوئی بھلائی نہیں ہے جس سے اللہ کی مرضی نہ حاصل کی جائے۔ اس مال میں کوئی بہترائی نہیں ہے جو راہ خدا میں خرچ نہ کیا جائے۔ اس شخص میں کوئی خوبی نہیں ہے جس کا تحمل اس کے غصہ پر غالب نہ ہو۔ اس مرد میں کوئی عمدگی نہیں جو اللہ کے بارے میں کسی دینی معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈر جائے۔ (۱۰۰)

فقراء مہاجرین کی خودداری:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْباً فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْئَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافاً (سورہ بقرہ ع ۳۷ ع ۵ ج ۳)

''جو مال تم راہ خدا میں خرچ کرو۔ وہ ان ضرورت مندوں کے لیے ہونا چاہیے جو راہ خدا میں گھر کر رہ گئے ہیں (صرف اسی کام کے ہو گئے ہیں۔ انہیں یہ موقع نہیں ہے کہ روزی کی تلاش میں دوڑ دھوپ کریں اور فقر و فاقہ کے باوجود خودداری کا یہ عالم ہے کہ) جو شخص

ان کے اندرونی حالات سے واقف نہیں ہے وہ ان کو مستغنی سمجھتا ہے۔ (کہ یہ بے نیاز ہیں انہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے) تم ان کے چہرے دیکھ کر ان کی حالت جان سکتے ہو۔ (لیکن) وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کبھی سوال کرنے والے نہیں ہیں۔

حضرات انصار جس طرح اپنے وطن (مدینہ) میں اپنا مقام رکھتے ہیں وہ ایمان میں بھی اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ وہ مہاجرین سے محبت رکھتے ہیں۔ خود بھوکے رہتے ہیں اور مہاجرین کی مدارات کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورہ حشر ع ۲)

’’وہ جو ٹھیرے ہوئے ہیں دارالاسلام (مدینہ) میں پہلے سے جنہوں نے ایمان میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ وہ محبت کرتے ہیں ان سے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ان کے یہاں آئے ہیں اور ان مہاجرین کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس سے اپنے دلوں میں کوئی غرض، کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے اور مقدم رکھتے ہیں وہ (ان نو وارد مہانوں کو) جو خود اپنے نفس اور اپنی جان سے اگر چہ خود ان کو بھوک اور فاقہ ہو۔ اور جو شخص نفس کی طمع سے محفوظ کر دیا گیا وہ ہی ہے کامیاب و بامراد۔

ان آیات کی تفسیر پہلے صفحات میں گذر چکی ہے۔

طبقات صحابہ

فطری صلاحیتیں اور تفاوت مراتب

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتاً فَاَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ـ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكَابِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ـ وَاِذَا جَاءَ تْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَا اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ـ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ـ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ـ (سورہ انعام ع ۱۵ ج ۸ ع ۲)

’’کیا وہ آدمی جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور دے دی اس کو روشنی اور اس کو لے کر چل رہا ہے لوگوں میں، اس کے برابر ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیروں میں گھرا ہوا ہے ان سے باہر نہیں نکل سکتا (وہ کبھی نہیں۔ سو دیکھو جس طرح ایک شخص اندھیروں میں گھرے ہونے کے باوجود اپنی حالت پر قانع ہو جاتا ہے اور اسی کو غنیمت سمجھنے لگتا ہے) اسی طرح کافروں کی نظروں میں وہی باتیں خوشنما معلوم ہوتی ہیں، جو وہ کرتے رہتے ہیں اور (دیکھو جس طرح مشرکین مکہ کے سرگروہ اور سردار دعوت حق کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں) اسی طرح ہر بستی میں اس کے مجرمین اور غلط کاروں کے سرگروہ اور سردار مقرر کر دیئے ہیں تا کہ وہاں مکر وفریب کے جال پھیلائیں (قانون قدرت یہی ہے) اور فی الحقیقت وہ مکر وفریب نہیں کرتے مگر اپنے ساتھ۔ لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے (حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ یعنی ہمیشہ کافروں کے سردار حیلے نکالتے ہیں جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ سحر اور جادو کے زور سے سلطنت لینا چاہتا ہے) اسی طرح ایک حیلہ یہ ہے کہ) جب ان کے پاس سچائی کی کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم کبھی یقین کرنے والے نہیں ہیں۔ جب تک ہمیں ایسی بات نہ ملے جیسی اللہ کے

رسولوں کو مل چکی ہے (حالانکہ) اللہ ہی اس بات کو بہتر جانتا ہے کہ کہاں اور کس طرح اپنے پیغام پہونچانے کا سلسلہ قائم کرے (لیکن یہ بھی باور کرلو) کہ جو لوگ (انکار حق کے) جرم کے مرتکب ہوئے عنقریب انہیں خدا کے حضور ذلت اور حقارت ملے گی۔ اور جیسی کچھ وہ مکاریاں کرتے ہیں اس کی پاداش میں انکے لیے ہے سخت عذاب۔ پس جس کو خدا چاہتا ہے کہ (سعادت اور کامرانی کی) راہ دکھائے کھول دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے اور جس کسی پر (سعادت اور کامرانی کی) راہ گم کر دینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی راہ بھلا دے۔ کر دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ رکا ہوا۔ گویا وہ زور لگا کر چڑھ رہا ہے آسمان پر جس کی وجہ سے سانس پھول گیا ہے سینہ تنگ ہو گیا ہے۔ اسی طرح ڈالدیتا ہے عذاب ان پر جو ایمان ویقین سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ ہے تیرے رب کا راستہ سیدھا۔ بلاشبہ ہم نے ان لوگوں کے واسطے جو نصیحت پر دھیان دیتے ہیں (راہ حق) کی نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں۔ ان لوگوں کے لیے (جنہوں نے خدا کی سیدھی راہ پر قدم اٹھایا) ان کے لیے ان کے پروردگار کے حضور سلامتی اور عافیت کا گھر ہے اور جیسے ان کے نیک عمل رہے ہیں ان کی وجہ سے ان کا پروردگار ان کا مددگار اور رفیق ہے۔''

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ

(سورہ انعام ع ۷ ج اع ۱۳)

'' (اور اے پیغمبر) ان لوگوں کو جو (دعوت حق پر ایمان رکھتے ہیں) اور صبح شام خدا کے حضور مناجات کرتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں ان کو اپنے پاس سے نہ نکالو۔ ان کے کاموں کی جوابدہی تمہارے ذمہ نہیں ہے نہ تمہاری جوابدی ان کے ذمہ ہے کہ (اس ڈر سے) ان کو نکال دو۔ اگر ایسا کرو گے تو زیادتی کرنے والوں میں سے ہو گے (اور دیکھو) اس طرح (لوگوں کی حالتیں مختلف کر کے) بعض انسانوں کو بعض انسانوں کے ساتھ آزمایا ہے (کہ وہ جاہ و دولت کا گھمنڈ رکھنے والے غریبوں کو دیکھ کر کہنے لگیں) کیا یہی لوگ ہیں جن کو خدا نے اپنے انعام کے لیے ہم میں سے چن لیا ہے (اے گھمنڈ کرنے والو) کیا خدا (تم سے) بہتر جاننے والا نہیں ہے کہ کون اس کی نعمت

کی قدر کرنے والے ہیں۔ اور اے پیغمبر جب وہ لوگ تمہارے پاس آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہیں تو تم شفقت و رحمت سے پیش آؤ اور کہو تم پر سلام ہو۔ تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم ٹھیرالی ہے۔ تم میں سے جو کوئی نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے اور پھر توبہ کرے اور اپنی حالت سنوار لے تو خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔''

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ آیتیں حضرات مہاجرین اولین کے تین طبقوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

(۱) ان بزرگوں کا طبقہ جن کو خداوند عالم نے غیر معمولی ذکاوت عطا فرمائی تھی جو بعثت کے پہلے ہی دور میں ایمان لے آئے اور اس اجمالی علم کی شہادت سے (جس کی روشنی ان کی فطرت کو عطا ہوئی تھی) پہلے ہی مرحلہ میں نبی برحق کی تصدیق کر لی۔ حضرت ابوبکر صدیق حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اسی طبقہ کے بزرگ اور بالخصوص حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اس طبقہ کے عنوان اور سرفہرست ہیں۔ کہ بت پرستی سے احتراز، خدا کی وحدانیت کا تخیل، زنا سے اجتناب اور شراب اور جملہ قبائح سے نفرت ان کی فطرت میں سرشت ہوئی تھی۔ یہ اذکیاءِ امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی کے متعلق بہت سی بشارت آمیز خوابیں پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ ان بزرگوں کے سامنے جیسے ہی دعوت توحید پیش کی گئی فوراً ایمان لے آئے۔ یہ دعوت گویا ان کے دل کی آواز تھی جس کی کامیابی کے لیے نہ بار بار کہنے کی نوبت آئی نہ معجزات کی ضرورت پڑی اور نہ مناظرہ اور مباحثہ کی حاجت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اسی طبقہ بالخصوص اس طبقہ کے سردفتر (حضرت صدیق رضی اللہ عنہ) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کفار کی اس جماعت سے مقابلہ کر رہے ہیں جو اپنی فطرت وطبیعت کے لحاظ سے ان بزرگوں کے برعکس واقع ہوئی ہے اور ان دو متضاد صلاحیتوں کو نور و ظلمت یا رات اور دن کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اسی طبقہ کے حضرات میں جن کے سینے اللہ تعالیٰ نے نور ایمان کو جذب کرنے کے لیے کھول دیئے تھے۔ فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔

(۲) وہ جماعت جو عرصہ دراز تک موت معنوی یعنی کفر، عداوت نبی برحق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں مبتلا رہی۔ پھر توفیق الٰہی نے ان کی دستگیری کی ان کو حیات معنوی عطا ہوئی اور توفیق خداوندی نے ان کو عمائد ملت بنا دیا۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما اسی طبقہ کے بزرگ ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس زمرہ کے سرفتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں حضرات بالخصوص ان کے سردفتر کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ او من کان میتا الخ۔ ان کے برعکس وہ جماعت ہے جو ہمیشہ کفر پر جمی رہی اور کفر پر ہی اس کا خاتمہ ہوا۔

(۳) تیسرا درجہ ان کمزور مسلمانوں کا ہے جو قریش کے غلام یا آزاد کردہ غلام یا اس درجہ کے غریب لوگ تھے کہ رؤسا قریش ان کے پاس بیٹھنے میں بھی عار محسوس کرتے تھے۔ ان حضرات کے بارے میں نازل ہوا: لا

تطرد الذین ۔مت ہٹاؤان کو جو اپنے رب کو صبح شام پکارتے ہیں ۔ (یہ آیت شرح وتفسیر کے ساتھ فقراء صحابہ کے زیر عنوان پہلے گذر چکی ہے)

مذکورہ آیتوں کے الفاظ عام ہیں مگر قرائن شہادت دے رہے ہیں کہ ان عام الفاظ سے خاص خاص حضرات اور بالخصوص حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما مراد ہیں کیونکہ:

(۱) مفسرین کا اتفاق ہے کہ سورہ انعام از اول تا آخر مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے ۔ یہ وہی زمانہ ہے جب کہ حال ہی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اسلام سے مشرف ہوئے تھے ۔ البتہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس سے بہت عرصہ پہلے مسلمان ہو چکے تھے ۔ لہٰذا اس آیت کے الفاظ اگر چہ عام ہیں لیکن متاخر مہاجرین، انصار کرام اور وہ حضرات جو بعد میں آنے والے ہیں نزول آیت کے وقت مصداق نہیں ہو سکتے ۔ آیت کا مصداق قرار دینے کے لیے لامحالہ ان ہی پچاس ساٹھ نفوس میں سے کچھ نفوس تلاش کرنے ہوں گے جو نزول آیت کے وقت ان صفات سے متصف تھے ۔

او من کان میتا فاحییناہ (جو مردہ تھا پھر اس کو زندہ کیا ہم نے) ان الفاظ کا مصداق کوئی ایسا شخص ہی ہوسکتا ہے جو (الف) نبی برحق کی بعثت کے بعد ایک عرصہ دراز تک ایمان سے مشرف نہ ہوا ہو ۔ اس کے بعد وہ ایمان لایا ہو اور اس کا قدم مضبوطی سے اسلام پر قائم ہو گیا ہو (ب) وہ ایک خاص قوت وطاقت اور ایک خاص اہمیت کا مالک ہو ۔ تا کہ دوسری طرف جو اکابر مجرمیھا (یعنی گروہ مجرمین کے روساء اور عمائدین) کا لفظ ارشاد ہوا ہے اس کا موازنہ صحیح ہو سکے ۔ اور من یرد اللہ الخ ۔ (جس کو اللہ ہدایت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ کھول دیتا ہے) اسلام کے لیے اسی شخص پر منطبق ہوسکتا ہے ۔

(الف) جو بار بار دعوت اسلام اور کسی مناظرہ یا بحث ومباحثہ کے بغیر خود ہی تہ دل سے ایمان لے آیا ہو ۔

(ب) اس کی طرف سے کوئی ایسا شک وشبہ یا معجزہ کے متعلق کوئی مطالبہ نہ پیش کیا گیا ہو جیسا کہ عام طور پر پیش کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا ۔ لن نومن حتی نوتی مثل ما اوتی رسل اللہ (ہم تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمارے سامنے بھی ایسے ہی معجزات نہ پیش کئے جائیں جیسے کہ اللہ کے رسولوں کو دیئے گئے تھے) ۔

(ج) اس کو ایسا شرح صدر ہو جائے اور اس کا سینہ اس طرح کھل جائے کہ اسرار شریعت مکمل طور پر وہ خود سمجھنے لگیں ان قرائن کے پیش نظر ان افراد کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے جو اس آیت کے مصداق ہوں ۔

(۳) اس آیت میں ارشاد ہے ۔ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس (یعنی اس کا دل مردہ تھا اس کو زندگی عطا فرمائی گئی اور ایک ایسا نور اس کو دے دیا گیا کہ اس کو لے کر چل رہا ہے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مہتدی (یعنی ہدایت یافتہ) بھی ہے اور دوسروں کے لیے ہادی اور رہنما بھی ہے اور اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہونچے گا ۔ یہ وصف اس طبقہ کے افراد میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخصوص ہے ۔

(۴) اس شخص کے مقابلہ میں اکابر مجرمیھا (مجرمین کے روساء اور عمائدین) کا ذکر کیا گیا ہے اور

حدیث شریف میں ہے کہ جنگ بدر میں جب ابو جہل مارا گیا تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا آج اس امت کا فرعون مارا گیا نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ خداوندا عمر بن الخطاب اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) ان دو میں سے جو تجھے محبوب ہو اس سے میری تائید اور امداد فرما پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا حضرت عمر بن الخطاب الفاروق الاعظم کے حق میں قبول ہوئی۔ جب یہ تمام قرائن سامنے آتے ہیں تو ذہن حضرات شیخین (صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما) کی طرف ہی سبقت کرتا ہے کہ اس آیت میں بطور سر دفتر انہیں حضرات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پھر یہ نکتہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ حضرت حق جل مجدہ ایک کی تعریف میں فرماتے ہیں اسلام کے لیے اس کا سینہ کھول دیا۔ یہ صدیقیت کی حقیقت ہے۔ دوسرے کے متعلق یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان کو حیات معنوی بخشی گئی اور وہ نور عطا کیا گیا کہ اس کا اثر لوگوں پر پڑتا ہے۔ یہ خلافت خاصہ کی شان اور محدثیت کی حقیقت ہے۔

اس طرح مدح وستائش کے بعد ان کے لیے دارالسلام کا وعدہ ہوتا ہے۔ صراط مستقیم کا اعلان فرمایا جاتا ہے اور یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ ان کا ولی ہے۔ اس سے بڑھ کر مدح وستائش اور اس سے اعلیٰ اور بالا شرف کیا ہو سکتا ہے؟ یہ سب خلافت خاصہ کی صفات ہیں۔

تیسرے طبقہ کی مدح وستائش میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ صبح وشام خدا کو یاد کرتے ہیں پھر ان کے اخلاص کو واضح فرمایا جاتا ہے کہ صرف رضا خداوندی ان کا مقصود اور ان کی مراد ہے۔ پھر ان کے لیے مغفرت کا وعدہ ہوتا ہے اس سے بہتر کون سی فضیلت ہو سکتی ہے۔ کدام فضیلت بہتر ازیں فضائل خواہد بود۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اپنی تفسیر کی تائید میں مندرجہ ذیل روایتیں پیش کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ فرماتے ہیں۔ میت۔ یعنی کافر وضال۔ فاحییناہ [۱۰۲] یعنی فھدیناہ [۱۰۳] نور۔ یعنی قرآن۔ اور فی الظلمات [۱۰۴] یعنی فی الکفر و الضلال [۱۰۵]

حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں: اومن کان میتا تا فی الظلمات یہ آیت حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ دونوں اپنی گمراہیوں میں مرے ہوئے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اسلام کی زندگی اور دین کی عزت بخشی اور ابوجہل کو اس کی گمراہی اور موت پر قائم رکھا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی کہ خداوندا اسلام کو ابوجہل یا عمر بن الخطاب کے ذریعہ سے تقویت عطا فرما۔

حضرت حسن نے بھی مفسر قرآن حضرت ضحاک یہی مضمون نقل فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں: اومن کان میتا فاحییناہ۔ عمر بن الخطاب پر منطبق ہے اور کمن مثلہ فی الظلمات الخ ابوجہل بن ہشام پر۔ ابوسفیان سے مروی ہے۔ اومن کان میتا فاحییناہ۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوا۔

اسی طرح اور بھی روایتیں ہیں۔ مختصر یہ کہ جمہور مفسرین ان آیتوں کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ ان میں

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور ابو جہل کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں پر نظر فرمائی۔ قلب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خیر القلوب تھا اس کو اپنے لیے منتخب فرمالیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت عطا فرما کر مبعوث فرمایا۔ پھر قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی قلوب پر نظر ڈالی۔ پس آپ کے اصحاب کے قلوب باقی بندوں میں سب سے بہتر تھے۔ پس ان کو اپنے محبوب کے لیے وزراء بنادیا۔ جو اس کے دین کی حمایت میں جہاد کرتے ہیں اور اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں۔ لہٰذا جس بات کو یہ مسلمان پسند فرمادیں وہ اللہ کے نزدیک بھی پسندیدہ ہے اور جس کو برا سمجھیں وہ اللہ کی نظر میں بھی بری ہے۔ (۱۰۶)

حضرت ابو الصلت الثقفی رحمہ اللہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ومن یرد ان یضله یجعل صدرہ ضیقا حَرَجًا۔ آپ نے حرجا کی راء کو زبر پڑھا آپ کے پاس جو دوسرے صحابہ کرام تھے اس میں سے کسی نے حَــرِجًــا راء کو زیر کے ساتھ پڑھا۔ جب حرج اور حرج میں بحث ہوئی۔ تو آپ نے فرمایا۔ قبیلہ کنانہ کے کسی آدمی کو جو بکریاں چراتا ہو۔ تلاش کر کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ کنانہ کے ایک چرواہے کو تلاش کر کے لایا گیا۔ آپ نے فرمایا۔ میاں نوجوان آپ کے یہاں حرجہ کسے کہتے ہیں۔ نوجوان نے جواب دیا۔ حرجہ ہمارے یہاں ایسے درخت کو کہتے ہیں جو بہت سے درختوں کے بیچ میں ہو۔ مگر اس طرح ہو کہ اس تک کوئی چیز نہ پہنچ سکے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ منافق کا دل ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس تک کوئی خیر نہیں پہنچ سکتی۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ: جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (محمد) صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ وہ قبائل عرب سے گفتگو کریں کہ کونسا قبیلہ آپ کو اور آپ کے ساتھ دعوت اسلام کو پناہ دینے کے لیے تیار ہوتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ تشریف لے گئے۔ میں اور حضرت ابوبکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکر انساب کے بہترین ماہر تھے۔ پس جہاں جہاں قبائل عرب کے خیمے لگے ہوئے تھے اور ان کے پڑاؤ پڑے ہوئے تھے ہم وہاں پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا ان لوگوں نے جواب دیا۔ ان لوگوں میں مفروق بن عمر، ہانی بن قبیصہ، مثنی بن حارثہ، نعمان بن شریک سے ملاقات ہوئی۔

ان سب میں مفروق بن عمر کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے زیادہ قرب تھا اور بیان اور زبان کے لحاظ سے بھی مفروق اپنے ساتھیوں میں سب پر غالب تھا۔ مفروق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوا۔ اور کہا۔ آپ ہمارے سامنے کیا پیغام پیش کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور تشریف فرما ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پاس کھڑے ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اپنی چادر کا سایہ کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ مجھ کو اذیت مت پہنچاؤ۔ مجھے مت مارو اور مجھے مت روکو تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ پیغام پہنچا دوں جس کو پہنچانے کا اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم کیا ہے کیونکہ قریش اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف مظاہرہ کر رہے ہیں وہ اس مخالفت میں متفق ہو گئے ہیں۔ اللہ کے رسول کی تکذیب کر رہے ہیں اور حق کے مقابلہ میں باطل کی امداد کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غنی حمید ہے۔

مفروق نے کہا اور کیا دعوت پیش کرتے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت کی:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا تا تَتَّقُوْنَ

مفروق نے کہا۔ اور کیا؟ واللہ یہ کلام جو آپ نے پڑھا ہے زمین پر بسنے والوں کا کلام نہیں۔ اگر یہ انسانوں کا کلام ہوتا تو ہم بھی انسان ہیں۔ ہم بھی اس طرز کے کلام پر قادر ہوتے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ

مفروق نے کہا واللہ۔ آپ نے مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی طرف دعوت دی ہے۔ بلاشبہ وہ لوگ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور آپ کے برخلاف مظاہرہ کر رہے ہیں۔

ہانی بن ابی قبیصہ نے کہا: میں نے آپ کی گفتگو سنی۔ جو کچھ آپ نے فرمایا مجھے بہت پسند آیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ زیادہ عرصہ نہ گذرے گا کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو فارس کی سرزمین اور کسریٰ کی نہریں عطا فرما دے گا اور وہ اپنی لڑکیاں آپ کے سامنے پیش کریں گے تم اللہ کی تسبیح و تقدیس کرو گے۔

نعمان نے کہا۔ یہ کیسے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (الایة)

”اے نبی ہم نے آپ کو بھیجا ہے کہ آپ شہادت دینے والے ہیں حق کی (پھر ماننے والوں کو) بشارت دینے والے اور (جو انکار کریں ان کو انکار کے) نتائج بد سے آگاہ کرنے والے اور بلانے والے اللہ کی طرف اس حالت میں کہ آپ درخشاں چراغ ہیں۔“

اس کے بعد حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور حضرت ابوبکر کا ہاتھ پکڑے ہوئے واپس تشریف لے آئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ہمارے سامنے تقریر کی اور فرمایا۔ اے لوگو! اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو رجم کی تکذیب کریں گے، دجال کی، مغرب کی جانب سے طلوع

آفتاب کی، عذاب قبر، شفاعت اور اس بات کی کہ ایک ایسی قوم ہوگی جو (قیامت کے دن) دوزخ سے نکلے گی جب کہ وہ جھلس گئی ہوگی۔ (ان سب باتوں کی) تکذیب کریں گے (ازالۃ الخفاء ص ۱۸۱ آیت ۱۴ فصل ششم)

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذَالِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (سورہ فاطر)

''پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا ان کو جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا۔ پھر ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں (کہ وارث کتاب کی شان سے گر کر گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں) کچھ ہیں بیچ کی چال پر (میانہ رو) اور کچھ ان میں سے وہ ہوتے ہیں جو آگے بڑھتے ہیں خوبیوں اور امور خیر کی طرف (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) یہی ہے بہت بڑی فضیلت۔''

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ آیت جس کی مزید توضیح و تائید دوسری آیتوں سے ہوتی ہے تصریح کرتی ہے کہ امت مرحومہ تین قسم پر منقسم ہے۔ سب سے اعلیٰ تو وہ ہیں جو امور خیر کی طرف سبقت کرتے ہیں اور آگے بڑھ کر اچھے کاموں میں حصہ لیتے ہیں جن کو دوسری آیت میں صدیقین۔ شہداء اور صالحین سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور ان کو مقربین بھی فرمایا گیا ہے۔ دوسرے درجہ پر میانہ رو حضرات ہیں جن کو دوسری آیت میں اصحاب الیمین اور ایک آیت میں ابرار سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اور تیسرے مرتبہ پر جو سب سے کم درجہ ہے وہ ہیں جو اپنے حق میں ظلم کرتے رہتے ہیں یعنی ایسے مسلمان کہ ان کے عقائد درست ہیں مگر ان کے اعمال میں کوتاہی ہے لیکن ان کو اپنے افعال پر ندامت بھی ہوتی رہتی ہے اور وہ بارگاہ رب العالمین کی طرف رجوع کرکے اس کے تدارک کی بھی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب خلافت خاصہ کے سلسلہ میں ایک نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ خلافت خاصہ کے لیے شرط یہ ہے کہ خلیفہ اپنے ذاتی عمل کے سلسلہ میں سابقین مقربین میں سے ہو یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سلسلہ میں وہ سب پر سابق ہو اور پھر خلق اللہ کے ساتھ بھی ایسا ہو کہ اس کو مقربیت کا درجہ حاصل ہو اور جہاں تک ملی خدمات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں وہ سابقین اولین میں سے ہو۔ اور جماعتی خدمات میں اس کا قدم سب سے آگے ہو۔

مؤیدات:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے جو شخص امور خیر میں سبقت کرے گا وہ فلاح اخروی میں بھی سابق ہے۔ اور میانہ رو ناجی ہے اور اپنے حق میں ظلم کرنے والا (مومن گنہگار) مغفور ہوگا۔ پھر آپ نے تائید میں یہی آیت پڑھی فمنهم ظالم لنفسه۔ الاٰیتہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کے بارے میں فرمایا۔ سابق مجاہدین ہیں۔ مقتصد (میانہ روی) شہروں میں رہنے والے (جو صاحب علم ہیں اور علماء کی صحبت میں رہتے ہیں) اور ظالم بادیہ نشیں (جو علم اور علمی مجلسوں سے دور رہتے ہیں)

افادات:

یہ سورہ فاطر کے چوتھے رکوع کی آیت ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ لِیُوَفِّیَھُمۡ اُجُوۡرَھُمۡ وَیَزِیۡدَھُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ اِنَّہٗ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ وَالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ ھُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیۡرٌۢ بَصِیۡرٌ۔ (سورہ فاطر)

''بیشک وہ لوگ جو کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں پوشیدہ اور علانیہ (حسب موقع) اور وہ امیدوار ہیں ایسی تجارت (بیوپار) کے جو کبھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ تاکہ ان کو ان کے اجر پورے پورے عطا فرمائے اور بڑھتی دے اپنے فضل سے بیشک وہ ہے بخشنے والا شکریہ کے ساتھ قبول کرنے والا اور وہ جو ہم نے اتاری تم پر کتاب وہی ٹھیک (اور حق) ہے۔ جو تصدیق کرتی ہے کتب سابقہ کی۔ بیشک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے اور دیکھنے والا۔''

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اول اس جماعت کی فضیلت بیان فرمائی ہے جو کتاب اللہ کی تلاوت کرتی ہے۔ باجماعت نماز ادا کرتی ہے اور ظاہر و پوشیدہ راہ خدا میں اپنا مال صرف کرتی ہے۔ ان تمام اعمال و افعال کو اللہ تعالیٰ نے ایک سودمند تجارت (جس کا نفع ابدی اور لازوال ہوگا) قرار دیتے ہوئے ان کے لیے اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ قرآن عظیم حق ہے۔ وہ کتب سابقہ کی تصدیق کرتا ہے۔ آپ پر اس کو نازل کیا ہے اور امت برگزیدہ (ایک منتخب جماعت) کو اس کا وارث بنایا ہے۔ جن لوگوں نے کتاب اللہ اور وحی الٰہی کی تصدیق کی ہے ان کے تین درجے ہیں۔ ایک وہ جو اس تصدیق کے ساتھ اپنے حق میں ظالم بھی ہیں ان کے ظلم کی تفسیر دوسری آیت میں یہ ہے۔ خلطو اعملا صالحا واخر سئیا یعنی اعمال خیر کے ساتھ وہ گناہوں کے مرتکب بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن ارتکاب معصیت کے بعد ان کو ندامت بھی ہوتی ہے۔ دوسرا درجہ ان کا ہے جو میانہ رو ہیں اور تیسرا طبقہ پیشرو حضرات کا ہے جن کے قدم اعمال صالحہ کی طرف سب سے آگے رہتے ہیں۔ اس کے بعد امت مرحومہ کے ثواب اور اس کے مدمقابل یعنی کفار کے عذاب کا ذکر کرتے ہوئے ان کی دردناک سزا کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے:

لَا یُقْضٰی عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا (سورہ فاطر ع ۴)

''نہ ان پر تقدیر پہنچتی ہے کہ ان پر موت آ جائے اور وہ مر جائیں اور نہ ان کے عذاب میں کمی کی جاتی ہے۔''

سورہ فاطر کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت ہے۔ اَفَمَنْ زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ''کیا وہ شخص جس کی نظر میں اس کا عمل بدسجا دیا گیا ہے اور وہ اس کو اچھا سمجھتا ہے۔''

اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق حضرت ضحاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت ابوجہل اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے (یعنی ان پر منطبق ہے) کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی کہ خداوندا ابوجہل یا عمر بن الخطاب میں سے کسی ایک کے ذریعہ دین کو قوت عطا فرما۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہدایت عطا فرمائی اور ابوجہل گمراہ رہا۔

آیت زیرِ بحث کے بموجب جن کو کتاب اللہ کی وراثت ملی ہے اور جو اس وراثت میں سابقین کے زمرہ میں شامل ہیں۔ ان کی فہم و فراست کس درجہ بلند ہو جاتی ہے اس کی مثال کے طور پر حضرت مصنف مندرجہ ذیل روایت پیش فرماتے ہیں:

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اٹھارہ فقرے پیش فرمائے ہیں۔ ہر ایک فقرہ حکمت و دانش کا گوہر ہے۔ ہم ان کو بجنسہ نقل کر کے ترجمہ کریں گے۔

(۱) ماعاقبة من عصی الله فیك بمثل ان تطیع الله فیه

جس شخص نے تمہارے بارے میں خدا کی نافرمانی کی ہے (کہ تم پر کوئی ظلم کیا ہے) اس کی سزا اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی کہ تم اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرو۔

(۲) ضع امر اخیك علی احسنه حتی یجیئك منه ما یغلبك

تمہارے بھائی کو جو بھی معاملہ ہو اس کو سب سے بہتر صورت پر محمول نہ کر۔ (اس کے متعلق بہتر سے بہتر گمان قائم کرو) یہاں تک کہ اس کی جانب سے تمہارے سامنے ایسی بات آ جائے جو تم پر غالب ہو جائے (یعنی جس کے لیے تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے) یعنی جب تک تاویل کی گنجائش ہو اپنے بھائی کے ہر ایک معاملہ کے ساتھ حسن ظن رکھو اور کوئی اچھی توجیہ کرتے رہو۔

(۳) لا تظنن بکلمة خرجت من مسلم شرا وانت تجدلها فی الخیر محملاً

جو بات کسی مسلمان سے صادر ہو۔ جہاں تک تم اس کو خیر اور بھلائی پر محمول کر سکو۔ اس کے متعلق برا گمان مت قائم کرو۔

(۴) من عرض نفسه للتهمة فلا یلو من من رساء به الظن

جو تہمت کے موقع پر خود اپنے آپ کو پیش کر دے (یعنی تہمت کے موقع پر احتیاط سے کام

نہ لے) اس کے متعلق اگر کوئی بدگمانی کرے تو وہ اس کو ہرگز ملامت نہ کرے (بلکہ خود اپنے نفس کو ملامت کرنی چاہیے کہ احتیاط کیوں نہیں برتی)۔

(۵) من کتم سرہ کانت الخیرۃ فی یدہ

جو شخص اپنے راز کو چھپائے ہوئے ہے اختیار اس کے قبضہ قدرت میں ہے (کہہ دینے کے بعد چھپانے کی فرمائش عبث ہے جب خود آپ نے نہیں چھپایا تو دوسرے سے یہ توقع کیوں کرتے ہو)۔

(۶) علیك باخوان الصدق تعش فی اکنافھم فانھم زینۃ فی الرخاء عدۃ فی البلاء۔

ضروری ہے کہ اہل صداقت اور سچے آدمیوں کی صحبت اختیار کرو۔ ان کی حمایت کے سایہ میں اطمینان کی زندگی بسر کرو۔ یہ لوگ فراخی اور خوش حالی میں زینت ہوتے ہیں اور مصیبت اور آزمائش کے وقت میگزین (مال اور اسلحے کا کارآمد خزانہ) ہوتے ہیں۔

(۷) علیك بالصدق وان قتلك

تمہارے اوپر سچائی لازم ہے اگرچہ وہ تمہیں قتل ہی کر ڈالے۔

(۸) لاتعرض فیما لا یعنی

بیکار بات میں دخل مت دو۔

(۹) لاتسال عمالم یکن فان فیما شغلا عمالم یکن

اس کی پوچھ گچھ مت کرو جو اب تک نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ جو ہو چکی ہے اسی کی مشغولیت اتنی ہے کہ فرصت نہیں دے سکتی۔

(۱۰) لاتطلبن حاجتك الی من لا یحب نجاحھالك

اپنی ضرورت کے لیے اس سے درخواست مت کرو جو اس کام میں تمہاری کامیابی پسند نہیں کرتا۔

(۱۱) لاتھاون بالحلف الکاذب فیھلك اللّٰہ

جھوٹی قسم کھا کر ذلیل مت بنو کہ خدا تمہیں جھوٹی قسم کی سزا میں ہلاک کر دے گا۔

(۱۲) لاتصحب الفجار لتعلم من فجورھم

بدکاروں کے ساتھ مت رہو کہ تم بھی ان کی بدکاری سیکھ جاؤ گے۔

(۱۳،۱۴) اعتزل عدوك واحذر صدیقك الا الامین ولا امین الا من خشی اللّٰہ

اپنے دشمن سے علیحدہ رہو دوست سے احتیاط برتو مگر یہ کہ وہ امانت دار ہو۔ اور امانت دار وہی ہے جو اللہ سے ڈرتا رہے۔

(۱۵) تخشع عند القبور
قبروں کے پاس خشوع اور خضوع سے کام لو۔
(۱۶) وذل عند الطاعة
طاعت کے وقت پوری طرح مطیع ہو جاؤ۔
(۱۷) واستعصم عند المعصية
معصیت کے وقت پناہ مانگو۔
(۱۸) استشر في امورك الذين يخشون الله فان الله يقول انما يخشى الله من عباده العلماء

اپنے معاملہ میں ان سے مشورہ کرو جو اللہ سے ڈراتے ہیں (کیونکہ جو اللہ سے ڈرتے ہیں وہ دانا اور واقف کار ہوتے ہیں) کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ سے وہ ہی بندے ڈرتے ہیں جو عالم ہوتے ہیں۔

سابقوں بالخیرات کا مرتبہ خداوند عالم کے یہاں کیا ہوگا؟ مندرجہ ذیل روایت سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔
حضرت صہیب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے متعلق یہ بشارت دی ہے کہ یہی لوگ سابق (پیش رو) ہیں جو خداوند عالم کی بارگاہ میں شفاعت کریں گے اور اپنے رب کے لطف و عنایت پر ناز کریں گے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے وہ قیامت کے دن اس شان سے آئیں گے کہ ان کے مونڈھوں پر اسلحہ ہوں گے۔ وہ باب جنت کو کھٹکھٹائیں گے جنت کے خازن (دربان) ان سے دریافت کریں گے۔ تم کون ہو۔ وہ جواب دیں گے۔ ہم مہاجر ہیں۔ ان سے جنت کے دربان کہیں گے۔ کیا تم حساب دے چکے۔ وہ گھٹنوں کے بل دوزانو بیٹھ جائیں گے۔ اپنے ہاتھوں کو اوپر کی طرف اٹھائیں گے اور کہیں گے اے رب کیا اس پر ہم سے حساب لیا جائے گا۔ ہم اپنے گھروں سے نکلے ہم نے اہل وعیال مال اور اولاد کو چھوڑا۔ بس اللہ تعالیٰ ان کے سامنے سونے کے بازو (پر) جیسی (سواریاں) پیش کردے گا جس پر زبرجد اور یاقوت کی کشیدہ کاری ہوگی۔ وہ ان بازوؤں پر بیٹھ کر اڑ جائیں گے اور جنت میں داخل ہو جائیں گے۔
چنانچہ مندرجہ ذیل آیتوں میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (تا) لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ

(ترجمہ) اور کہا ان لوگوں نے حمد اس خدا کی جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔ بیشک ہمارا رب بہت بخشنے والا اور شکریہ ادا کرنے والا ہے۔ (قبول کرنے والا) وہ رب جس نے ہمیں اتارا رہنے (مستقل قیام کرنے) کے گھر میں اپنے فضل سے نہ پہنچے ہم کو اس سے مشقت اور نہ پہنچے ہم کو اس میں تھکن۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ پس یہ مہاجرین جنت میں اپنی اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ ان کی منزلوں کو میں دنیا میں پوری طرح جانتا ہوں (ازالۃ الخفاء ص ۲۲۵ ج ا فصل ششم)

لَا يَسْتَوِى الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا دَرَجَاتٍ مِنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَحِيْمًا (سورہ نساء ع ۱۳ ح ۵ ع ۱۰)

(ترجمہ) مسلمانوں میں جو لوگ معذور نہیں ہیں اور بیٹھے رہے ہیں (جہاد میں شریک نہیں ہوئے) وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اپنے مال سے اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر باعتبار درجہ کے فضیلت دی ہے (اور یوں تو) خدا نے ہر ایک سے خوبی کا وعدہ کیا ہے (کسی کا بھی عمل نیک ضائع نہیں ہوگا لیکن درجے کے اعتبار سے سب برابر نہیں ہیں) اور (اسی لیے) بیٹھ رہنے والوں کے مقابلہ میں جہاد کرنے والوں کو ان کے بڑے اجر میں بھی اللہ تعالیٰ نے فضیلت عطا فرمائی ہے۔ یہ اس کی طرف سے ٹھیرائے ہوئے درجے ہیں۔ اس کی بخشش اور رحمت ہے اور بڑا ہی بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔

آیت کریمہ جہاد کو مدار فضیلت قرار دے کر صحابہ کرام کے چند طبقے معین کر رہی ہے۔ سب سے اعلیٰ اور افضل وہ حضرات ہیں جنہوں نے جان و مال دونوں کے ذریعہ جہاد کیا۔ یعنی غزوات و سرایا میں خود شریک بھی ہوئے اور اپنے مال اور اسباب سے بھی امداد کی۔ (جیسے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم) یہ طبقہ امت کا طبقہ علیاء اور امت کا سر دفتر ہے۔

(۲) وہ حضرات جنہوں نے جہاد بالنفس کیا مگر جہاد بالمال سے معذور رہے۔

(۳) وہ حضرات جنہوں نے جہاد بالمال کیا مگر جہاد بالنفس سے کسی عذر کی بنا پر معذور رہے۔ مثلاً نابینا تھے یا اس قسم کا کوئی عذر ان کو لاحق تھا جس کی بنا پر اگر وہ شرکت بھی کرتے تو فائدہ پہنچانے کے بجائے ساتھیوں کے لیے بار بن جاتے۔

(۴) وہ صحابہ جنہوں نے جہاد بالمال کیا مگر جہاد بالنفس سے بلا کسی خاص عذر کے قاصر رہے۔

(۵) وہ صحابہ جنہوں نے نہ جہاد بالمال کیا نہ جہاد بالنفس کر سکے۔ صرف سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مثلاً وہ حضرات جو عہد نبوت کے آخری دور میں مشرف باسلام ہوئے یا عہد نبوت میں کم سن نابالغ تھے۔

افادات:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ اس آیت کو خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت خاصہ کی بحث میں پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ وہ مشہور احادیث (جو اس درجہ پایہ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہیں کہ ان کا تسلیم کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور انکار یا تردد کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہتا) ثابت کر رہی ہیں کہ یہ تمام بزرگ (جملہ خلفاء راشدین) تمام غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کی سعادت حاصل کرتے رہے ہیں۔ اگر کوئی صاحب کسی وقت حاضر نہیں ہو سکے تو عذر قوی کے سبب سے۔

حضرات خلفاء راشدین میں سے کچھ تو وہ ہیں جنہوں نے شجاعت اور سپاہ گیری کے جوہر زیادہ سے زیادہ دکھائے۔ (جیسے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما) کچھ وہ ہیں جن کی مالی امداد ممتاز حیثیت حاصل کرتی رہی (جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) اور کچھ وہ ہیں جن کی دونوں حیثیتیں ممتاز اور نمایاں رہیں اور دونوں قسم کے جہاد کامل اور مکمل طور پر کیے (جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (ازالۃ الخفاء ص ۷۰ ج ۱ فصل ششم)

(۴) لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (سورہ حدید ع ۱)

"تم میں سے کوئی بھی ان کے برابر نہیں ہو سکتا جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور قتال (جہاد) کیا۔ یہ لوگ درجہ میں بہت بڑھے ہوئے ہیں ان سے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر ایک سے الحسنٰی (اچھی حالت) کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔"

یہ آیت ان اکابرین کی افضلیت کو واضح کر رہی ہے جنہوں نے فتح سے پہلے جانی اور مالی جہاد کیا اور واضح کر رہی ہے کہ ان کا مرتبہ ان حضرات کے مقابلہ میں بلند و بالا ہے جنہوں نے فتح کے بعد جانی اور مالی جہاد کیا۔

فتح سے کون سی فتح مراد ہے؟ ایک قول یہ بھی ہے کہ فتح سے صلح حدیبیہ مراد ہے۔ قرآن حکیم نے اس صلح کو فتح سے تعبیر کیا ہے لیکن حضرت قتادہ فتح سے فتح مکہ مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے دو قتال ہیں اور دو انفاق ہیں (یعنی سیرت مبارکہ پر اگر نظر ڈالی جائے تو جہاد و غزوات اور فی سبیل اللہ صرف مال کے دو حصے کیے جا سکتے ہیں) ایک فتح مکہ سے پہلے ایک بعد میں جو قتال و انفاق فتح مکہ سے پہلے ہوا وہ اس سے افضل ہے جو بعد میں ہوا۔ حضرت "قتادہ الحسنٰی" کی تفسیر "جنت" کرتے ہیں۔ یعنی جنت کا وعدہ تو دونوں کے لیے مشترک ہے۔ البتہ مراتب میں فرق ہے۔

حضرت مجاہد کا قول ہے کہ من انفق من قبل الفتح سے مراد ہے۔ من اسلم یعنی جو فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو گئے۔ آپ کے نزدیک آیت کا منشاء یہ ہے کہ مہاجر غیر مہاجر کے برابر نہیں۔ کیونکہ جو صحابہ فتح سے

پہلے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ان کو مجبوراً اپنا وطن بھی چھوڑا پڑا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جو مسلمان ہوئے ان کو ہجرت کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ تو جو فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوا وہ لامحالہ مہاجر بھی بنا اور فتح مکہ کے بعد جو مسلمان ہوا وہ مہاجر نہیں بنا اور مشترک طور پر دونوں کے لیے یہ بشارت ہے کہ کلا وعد اللہ الحسنیٰ۔ اچھی حالت (جنت) کا وعدہ ہر ایک سے ہے۔

افادات:

حضرت شاہ صاحب خلافت خاصہ کی بحث میں اس آیت کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چونکہ خلافت خاصہ یا بالفاظ دیگر خلافت کاملہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ خلیفہ سب سے افضل ہو۔ لہٰذا عہد صحابہ میں خلیفہ کامل کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ ان بزرگوں میں سے ہو جو فتح سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے اور جانی و مالی قربانیاں پیش کیں۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب تائید مضمون کے لیے چند روایتیں پیش فرماتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں سب سے زیادہ سخت تھا۔ ایک روز سخت گرمی کا دن تھا دوپہر کا وقت میں مکہ معظمہ کے ایک راستہ سے گذر رہا تھا کہ ایک شخص مجھ سے ملا اور کہا ابن خطاب۔ کس قدر تعجب کی بات ہے۔ آپ اتنی ڈینگیں مارتے ہیں۔ اور حال یہ ہے کہ خود آپ کے گھر میں اسلام گھس گیا ہے۔ میں نے کہا۔ یہ کیا؟ جناب آپ کی بہن مسلمان ہو چکی ہیں۔ اس شخص نے جواب دیا۔ میرے غصہ کی کوئی حد نہ رہی میں واپس ہوا، بہن کے مکان پر پہونچا، دروازہ پر دستک دی، اندر سے آواز آئی کون؟ عمر۔ میں نے کرختگی سے جواب دیا۔ وہ میری آواز سن کر جھپٹے اور اندر جا کر چھپ گئے۔ وہ ایک صحیفہ پڑھ رہے تھے جو ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جب چھپنے کے لیے اندر گئے تو قصداً یا سہواً یہ صحیفہ باہر ہی چھوڑ گئے۔ میں مکان میں داخل ہوا۔ چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ صحیفہ میری نظر پڑا۔ میں نے کہا یہ کیا ہے۔ مجھے دکھاؤ۔ بہن نے کہا۔ تم اس لائق نہیں ہو۔ تمہیں غسل جنابت کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ تم پاک صاف نہیں رہتے۔ یہ وہ کتاب مقدس ہے کہ اس کو صرف پاک آدمی ہی چھو سکتے ہیں۔ اسی طرح سوال و جواب ہوتا رہا۔ بالآخر ہمشیرہ نے صحیفہ مجھے دے دیا۔ میں نے اس کو کھولا اس میں لکھا تھا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جب میں نے پڑھا۔ الرحمٰن۔ تو میرے اوپر ایک دہشت سی طاری ہوئی۔ اور یہ کاپی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ میں نے دوبارہ اپنے آپ کو سنبھالا۔ کاپی کو اپنے ہاتھ میں اٹھایا۔ پھر میں نے پڑھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

جب اللہ کا کوئی نام آتا تھا دل پر ایک ہیبت چھا جاتی تھی۔ یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ

(ایمان لاؤ اللہ پر اس کے رسول پر اور خرچ کرو اس مال میں سے جس میں تم کو اللہ نے ایک دوسرے کا خلیفہ اور قائم مقام بنایا ہے) جیسے ہی میں نے یہ آیت پڑھی بے اختیار بول پڑا۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔ میری زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ چھپے ہوئے حضرات باہر نکل آئے۔ بشارت دینے لگے اور خوشی میں نعرہ تکبیر بلند کیا۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اس جانب سے ایک قوم آئے گی۔ ان کے ظاہری اعمال (نماز روزہ وغیرہ) اتنے زیادہ ہوں گے کہ تم اپنے اعمال کو ان کے مقابلہ میں حقیر سمجھو گے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا۔ ہم افضل اور بہتر ہوں گے یا وہ۔ فرمایا۔ نہیں تم ہی افضل اور بہتر ہو۔ ان میں سے اگر کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر دے تب بھی تمہارے ایک مد یا نصف مد خرچ کرنے کے برابر اس کا ثواب نہیں ہوگا۔ اس آیت کریمہ نے ہمارے اور تمام انسانوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے انفاق و قتال فی سبیل اللہ کے برابر کوئی انفاق کوئی قتال و جہاد ثواب نہیں رکھ سکتا۔ (وجہ ظاہر ہے) ثواب کا مدار اخلاص، ایثار اور مصائب جھیلنے پر ہے۔ فتح مکہ سے پہلے جو ان چیزوں کی گرم بازاری تھی وہ فتح مکہ کے بعد سرد پڑ گئی)۔

حضرت زید بن اسلم بحوالہ عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے صلح حدیبیہ کے سفر کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم عسفان (مقام کا نام) پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اثناء خطاب میں) ارشاد فرمایا۔ عنقریب ایک قوم آئے گی کہ تم ان کے اعمال کے مقابلہ میں اپنے اعمال کو حقیر سمجھو گے۔ ہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا وہ قریش ہوں گے۔ فرمایا۔ نہیں وہ یمن والے ہوں گے۔ ان کے دل بہت نرم ہوں گے۔ ہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ۔ کیا وہ ہم سے بہتر ہوں گے ارشاد ہوا۔ نہیں۔ بہتر تم ہی ہو۔ آپ نے آیت بالا کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اگر ان میں سے کسی کے پاس سونے کا پہاڑ ہو اور وہ راہ خدا میں سارا پہاڑ خرچ کر ڈالے تو اس کو نہ تمہارے ایک مد کے خرچ کا ثواب ملے گا نہ نصف مد کے برابر ثواب ملے گا۔ (اہل ہند کے لیے یہ مسرت بجا ہے کہ ہندوستان یمن کی سمت میں ہے)

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بہت سی حدیثیں واضح کر رہی ہیں کہ متقدمین صحابہ متاخرین سے افضل ہیں۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خالد بن الولید اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کے درمیان کچھ بات چل گئی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کہہ دیا آپ اس سبب سے بڑھ چڑھ کر بول رہے ہیں کہ ہم سے کچھ دنوں پہلے آپ سبقت کر چکے ہیں۔ یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئی۔ آپ نے فرمایا۔ میری خاطر میرے دوستوں کو معاف رکھو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر تم احد کے برابر بھی خرچ کر دو تب بھی ان کے کارناموں تک نہیں

پہنچ سکتے۔

حضرت یوسف بن عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ ہم افضل ہیں یا ہمارے بعد کے مسلمان۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اگر وہ احد کے برابر بھی سونا خرچ کرڈالیں تو نہ تمہارے ایک مد کے برابر ان کو ثواب ملے گا نہ نصف مد کے برابر۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے۔ صحابہ کرام کے بارے میں بے ادبی مت کرو۔ ان کی ایک گھنٹہ کی خدمت بھی تمہارے عمر بھر کے کاموں سے بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہمارے اسلام لانے میں اور اس آیت کے نزول میں جس میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے جھک جائیں۔ الم یان للذین امنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ صرف چار سال کا فصل تھا۔

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ الم یان للذین امنوا الایۃ۔ تو ہم آپس میں ایک دوسرے سے حیرت سے پوچھنے لگے ہم نے کیا کام کرلیا۔ ہم سے کونسا فعل سرزد ہوگیا؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے قلوب میں کچھ سستی دیکھی تو نزول قرآن سے تیرھویں سال یہ تنبیہ فرمائی۔ حضرت اعمش رحمہ اللہ فرماتے کہ جب صحابہ کرام مکہ معظمہ کے مصیبت کدہ سے نکل کر مدینہ طیبہ پہنچے اور مکہ معظمہ کی مصیبتوں کے بعد ان کو یہاں کچھ سکون اور آرام میسر آیا تو غالباً ان میں اس چستی کے مقابلہ میں جو مکہ معظمہ کی پرمحن زندگی میں تھی کسی قدر سستی پیدا ہوگئی تو ان کو اس آیت کریمہ کے ذریعہ تنبیہ فرمائی گئی۔

(الف) یہ تمام حدیثیں نزول آیت کا تقریباً ایک وقت ہی بتارہی ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کا متواتر نزول نبوت سے دو سال بعد شروع ہوا۔ ابتداء میں سورہ اقراء نازل ہوکر ایک عرصہ دراز تک وحی کا سلسلہ تقریباً منقطع رہا۔ تقریباً دو سال بعد تسلسل کے ساتھ نزول وحی شروع ہوا۔

(ب) یہ آیت کریمہ شہادت پیش کررہی ہے کہ صحابہ کرام کی روحانی تربیت کی طرف کس درجہ حضرت حق جل مجدہ کا لطف و کرم متوجہ تھا کہ ذرا سی سستی پائی گئی تو فوراً تنبیہ فرمائی گئی۔ جس جماعت کے لیے خود حضرت حق جل مجدہ مرشد طریقت ہوں اس کے مرتبوں کا کیا ٹھکانا۔

(ج) مذکورہ بالا روایتیں اس پر متفق ہیں کہ اس آیت کا نزول فتح مکہ سے بہت پہلے ہوا۔ تو گویا وہ صحابہ کرام جو ابتدا میں دعوت اسلام قبول کرچکے تھے وہ ایک عرصہ پہلے خداوند عالم کی مخصوص تربیت سے فیض یاب ہو چکے تھے۔ ان حضرات کی فضیلت کے لیے اس سے زیادہ واضح دلیل کیا ہوسکتی ہے۔ (ازالۃ الخفاء ص ۱۳۲ ج ۱ فصل ششم)

⑤ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَاۗءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ (سورہ حدید ع ۳)

’’اور جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر یہی ہیں وہ جو صدیق اور شہداء ہیں اپنے رب کے حضور میں۔‘‘

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص اپنی جان اور اپنے دین کو خطرہ میں گھرا ہوا دیکھ کر حفاظت دین و ایمان کی خاطر ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہو وہ اللہ کے یہاں صدیق لکھا جائے گا اور اگر مر گیا تو شہید ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ثبوت میں یہی آیت تلاوت فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا جو لوگ حفاظت دین و ایمان کی خاطر ہجرت کرتے ہیں وہ روز محشر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کے درجہ میں ہوں گے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ: میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے تھے۔ میری اُمت کے مومن شہداء ہوں گے۔ پھر استدلال میں یہی آیت تلاوت فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ صاحب ایمان بستر پر مر جائے تب بھی شہید ہے۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ: شہید تو وہ ہے جو اگر اپنے بستر پر مر جائے تب بھی جنت میں جائے یعنی جو اس حالت میں وفات پائے کہ اس پر کوئی گناہ نہ ہو۔

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ۔ ہر ایک مومن صدیق و شہید ہے۔ آپ نے یہی آیت دلیل میں پیش کی حضرت عمرو بن میمون کا بھی یہی قول ہے۔ [۱۱۰] (ازالۃ الخفاء ص ۲۴۴)

(۶) وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهَارُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (سورہ توبہ ع ۱۳ ج ۱۱ ع ۲)

’’مہاجرین اور انصار میں جو لوگ سبقت کرنے والے سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی تو اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر دیئے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں یہ ہمیشہ ہمیشہ ان باغوں میں رہیں گے۔ یہ ہے بہت بڑی کامیابی اور فروزمندی۔‘‘

السابقون الاولون سے مراد وہ صحابہ کرام ہیں جو غزوہ بدر یا تحویل قبلہ سے پہلے مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ یہ دونوں واقعات قریب ہی زمانہ میں ہوئے ہیں۔ لہٰذا غزوہ بدر سے پہلے ایمان لانے والے صحابہ کرام مراد لیے جائیں یا تحویل قبلہ سے پہلے ایمان لانے والے حضرات مراد ہوں۔ مصداق میں فرق نہیں آئے گا۔

اس آیت کریمہ میں جس طرح حضرات صحابہ کی رفعت وعظمت شان بیان فرمائی گئی ہے وہ محتاج تفصیل و توضیح نہیں ہے اس سے بڑھ کر اور تعظیم وتکریم کیا ہو سکتی ہے کہ طرفین کی خوشنودی کا اعلان کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہیں اور وہ حضرت حق جل مجدہ سے راضی ہیں۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُوْلٰئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (سورہ واقعہ ع ۱)

''اور سبقت کرنے والے سب سے آگے بڑھنے والے یہی ہیں مقربین باغوں میں نعمت کے۔''

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ سورہ واقعہ میں مکلفین کے تین درجے بیان فرمائے گئے ہیں۔

(۱) سابقین مقربین (۲) اصحاب الیمین (داہنے والے) (۳) اصحاب الشمال (بائیں والے) اصحاب شمال (بائیں والے) کفار بھی ہیں اور فاسق اہل ایمان بھی۔ مگر یہاں خاص طور پر کفار مراد ہیں فاسق اہل ایمان کا تذکرہ اس موقعہ پر نہیں فرمایا گیا۔ بہرحال سابقین مقربین کا مرتبہ سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ ان کی تعداد متقدمین میں زیادہ ہے اور متاخرین کے زمرہ میں کم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ثُلَّةٌ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَقَلِیْلٌ مِنَ الْاٰخِرِیْنَ

(ایک جماعت ہے متقدمین میں سے اور تھوڑی سی متاخرین میں سے)

مکلفین کا دوسرا طبقہ وہ ہے جن کو اصحاب الیمین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کا مرتبہ سابقین مقربین سے کم ہے۔ ان کے متعلق ارشاد ہے۔

ثُلَّةٌ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّةٌ مِنَ الْاٰخِرِیْنَ

(ایک جماعت متقدمین میں سے اور ایک جماعت متاخرین میں سے)

یعنی جیسے زمرہ متقدمین کی ایک جماعت اس مرتبہ پر فائز ہوگی ایسے ہی متاخرین میں سے بھی ایک جماعت کو اس درجہ کا شرف حاصل ہوگا۔ (۱۱۱)

صحابہ کرام اور جہاد فی سبیل اللہ

اس سے پہلے کہ ان آیتوں کو پیش کیا جائے جو ان عظیم الشان کارناموں کی شہادت دیتی ہیں جو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جہاد وغزوات کے سلسلہ میں ظہور پذیر ہوئے۔ ضرورت ہے کہ خود جہاد کی حقیقت پر روشنی ڈالی جائے تاکہ ان مراتب کا بھی اندازہ ہو سکے جو صحابہ کرام کو اس سلسلہ میں حاصل ہوئے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی تصانیف میں متعدد جگہ جہاد کی حقیقت پر بحث کی ہے۔ ہم یہاں ہر ایک تصنیف کا حوالہ دینا طول لاطائل سمجھتے ہیں۔ سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ آپ نے ازالۃ الخفاء کی فصل ششم میں آیت کریمہ ۱۸ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَاءُ کی تفسیر کرتے ہوئے اس پر بحث کی ہے۔ ہم یہاں یہی تقریر نقل کرتے ہیں۔

حقیقت جہاد:

یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی رجحانات، نفسانی جذبات کو فنا کردے اور دست قدرت کا آلہ کار بن کر ان کو مقہور و مغلوب کرنے کی کوشش کرے جن کو قادر ذوالجلال کی حکمت بالغہ مقہور و مغلوب کرنا چاہتی ہے:

تفصیل یہ ہے کہ وہ فضائل جن سے بندگان خدا اپنے معبود کا قرب حاصل کیا کرتے ہیں دو قسم کے ہیں:

ایک وہ فضائل اور خصلتیں جو خود اپنی فطرت و حقیقت کے لحاظ سے انسان کو مادیت سے نجات دلا کر ملاء اعلیٰ سے قریب کر دیتی ہیں۔ مثلاً توکل، صبر، نماز، روزہ، صدقہ اور حضرت حق جل مجدہ کا ذکر ایسی خصلتوں کی تلقین ہر ایک ملت اور ہر ایک مذہب میں کی گئی ہے۔

دوسرے ایسے اعمال و افعال جن کی فطرت تو یہ نہیں ہے لیکن کسی خاص دور میں خداوند عالم کی عنایت خصوصی ان میں یہ جوہر پیدا کر دیتی ہے کہ یہ اعمال و افعال افراد بشر کو مادیت کے بندھن سے نکال کر تقرب کا شرف عطا کر سکیں۔ جہاد، ہجرت اور حج اسی قسم کے فضائل اور خصائل ہیں۔ اس قسم کے اعمال کسی ملت میں تو قرب خداوندی کا ذریعہ بنتے ہیں اور کسی میں نہیں۔ یہ اس ملت کے ماحول کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ مثلاً شریعت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے دور میں ارادہ خداوندی یہ ہوا کہ مشرکین، یہود، نصاریٰ اور مجوس کو مقہور و مغلوب کیا جائے۔ اس ارادہ کو عالم اسباب میں جامہ وجود پہنانے کے لیے لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ الایہ (۱۱۲) کا اصول طے کیا گیا۔ یعنی دفاع اور جنگ۔

بہرحال ایک ترقی پذیر ملت کے لیے جس کو کارگاہ ہستی میں رہتی دنیا تک رکھنا ہو۔ بیشک اقدامی یا دفاعی جنگ کی ضرورت ہے لیکن جہاد فی سبیل اللہ کی حیثیت حاصل کرنے کے لیے شرط یہ ہے کہ مجاہد اپنے ذاتی رجحانات و تعلقات اور نفسیاتی جذبات کو یکسر فنا کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم اس کا ذاتی جذبہ بن جائے۔ جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو وہی اس کو پسند ہو۔ جس سے خدا کو نفرت ہو اس سے اس کو نفرت ہو اپنا بیگانہ ہو جائے اگر اس کا تعلق خدا سے ٹوٹا ہوا ہو اور بیگانہ یگانہ بن جائے اگر اس کا رشتہ خدا سے جڑا ہوا ہو۔ اوقات شب میں یاد خدا میٹھی نیند سے زیادہ محبوب ہو اور لذیذ ترین ماکول و مشروب سے اس کو گھن آئے اگر وہ حکم خدا کے مطابق نہ ہو۔ غرض ہر چیز حتیٰ کہ خود اپنی جان سے زیادہ اس کو اللہ اور اس کا رسول محبوب ہو۔

جب یہ کیفیت (۱۱۳) پیدا ہو جائے گی تو ظاہر ہے کہ اس کی جدوجہد اپنی ذات، اپنے فائدہ یا اپنے کسی مقصد کے لیے نہیں ہوگی بلکہ وہ حکم خداوندی اور رضاء الٰہی کے نفاذ کی ایک عملی شکل ہوگی۔ یعنی عالم اسباب میں یہ فرشتوں کی طرح دست قدرت کا آلہ کار اور نظام عالم کی مشین میں ایک پرزہ کی حیثیت حاصل کرلے گا۔ اس وقت اس کا جہاد حقیقی جہاد اور وہ جہاد ہوگا جس کو للہ اور فی اللہ کہنا چاہیے۔

صحابہ کرام نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے یہی شان حاصل کر لی تھی۔ ان کے تمام

ذاتی جذبات طبعی رجحانات انسانی علائق فنا ہو گئے تھے۔ وہ فرشتوں کی طرح دست قدرت کے آلہ کار تھے ان کے سینے خداوندی ارشادات کے پر جوش استقبال کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ ان کو ملاءِ اعلیٰ اور اللہ کے فرشتوں سے خاص مشابہت اور مناسبت پیدا ہو گئی تھی (جن کے ذاتی رجحانات کچھ نہیں ہوتے بلکہ خداوندی ارشادات ان کے ذاتی جذبات کی حیثیت رکھتے ہیں) اور اس طرح ان کے لیے قرب خداوندی کا ایسا باب کھل گیا تھا کہ جسمانی اور نفسانی ریاضت اگر سو سال تک کی جائے تب بھی یہ دروازہ نہیں کھل سکتا اور ملاءِ اعلیٰ سے مشابہت اور مناسبت جو ان کو حاصل ہو گئی تھی اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب اگر ان کے ذریعہ کوئی قوم تباہ و برباد ہوئی تو اس تباہی و بربادی میں وہ دست قدرت کے اسی طرح آلہ کار تھے جیسے قوم ثمود کو تباہ کرنے کے وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام آلہ کار تھے۔

مختصر یہ کہ چونکہ ملت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مخالف قوتوں کو شکست دینے کے لیے جہاد کا طریق عمل اختیار کیا گیا لہٰذا جہاد اور متعلقات جہاد یعنی ہجرت وغیرہ نے اس ملت میں خاص اہمیت حاصل کر لی اور اس اہمیت کے بموجب اس کی فضیلت بھی بے پایاں ہو گئی۔ دوسری شریعتوں میں دشمنان دین کو مقہور اور مغلوب کرنے کے لیے ارادہ خداوندی نے یہ نوعیت نہیں اختیار کی تھی لہٰذا ان کے لیے جہاد کی اہمیت اور یہ فضیلت بھی نہیں رہی۔ اس تمہید کے بعد آئندہ آیتوں کے مطالعہ میں آپ خاص دلچسپی محسوس کریں گے ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ ان غزوات میں صحابہ کرام کس طرح دست قدرت کے آلہ کار کی حیثیت سے کارفرما رہے اور ملاءِ اعلیٰ کی طاقتوں نے کس طرح ارشاد ربانی کے بموجب ان مجاہدین فی سبیل اللہ کی امداد کی۔

غزوات وسرایا

غزوۂ بدر:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ۔ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ (سورہ آل عمران ج ۴ ب ۴)

''اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی جنگ بدر میں حالانکہ تم بہتی گری ہوئی حالت میں تھے۔ سوڈرتے رہو اللہ سے (وہ جس طرح فتح دیتا ہے وہ شکست دینے پر بھی قادر ہے) تا کہ تم اس کے فضل وکرم کی قدر پہچان سکو۔ (اے پیغمبر) وہ وقت بھی یاد کرو جب تم کہہ رہے تھے مسلمانوں سے کہ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ مدد فرمائے اللہ تعالیٰ تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں سے ہاں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو اور ایسا ہو کہ وہ (دشمن) تم پر اسی دم چڑھ آئیں تو کمک پہنچائے گا تم کو تمھارا رب پانچ ہزار نشان رکھنے والے فرشتوں سے۔ اور (یاد رکھو) یہ بات جو کہی گئی تو صرف اس لئے کہ تمہارے لئے فتح مندی کی خوش خبری ہو اور تمہارے دل اس کی وجہ سے مطمئن ہو جائیں۔ مدد ونصرت جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اس کی طاقت سب پر غالب ہے اور وہ تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔ نیز اس لئے کہ منکرین حق کی طاقت کا ایک حصہ بیکار کردے یا انہیں اس درجہ ذلیل وخوار کردے کہ وہ نامراد ہو کر الٹے پاوں پھر جائیں۔''

یہ آیتیں واضح کر رہی ہیں کہ غزوہ بدر کے موقع پر مجاہدین اسلام بہت بے بس اور کمزور تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مخصوص مدد ان کو حاصل ہوئی۔ فرشتے بھی ان کی مدد کے لیے بھیجے گئے۔ جنگ کرنے والے مجاہدین ہی تھے البتہ فرشتوں کی مدد یہ تھی کہ ہر طرح کی بے بسی اور کمزوری کے باوجود یہ مجاہدین مضطرب نہیں ہوئے، پوری طرح مطمئن رہے۔ ان کی ہمتیں بلند اور حوصلے بڑھے رہے اور کامیابی کی مسرت محسوس کرتے رہے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ منکرین حق کی طاقت کے ایک حصہ کو بیکار کردے۔ بس یہ مجاہدین اللہ تعالیٰ کے

اس ارادہ کو پورا کرنے کے لیے آلہ کار بنے۔ یہاں تک کہ دشمنانِ خدا ذلیل وخوار ہو کر نامراد واپس ہوئے۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (سورہ انفال ع ۲)

”جب ایسا ہوا تھا کہ (جنگ بدر کے موقع پر) تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے کہ ہماری مدد کر پس اس نے تمہاری فریاد سن لی (اور بتا دیا) کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے جو یکے بعد دیگرے آئیں گے، تمہاری مدد کروں گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ بات جو کی تو اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ تمہارے لیے خوش خبری ہو اور تمہارے (مضطرب دل) قرار پائیں اور مدد ہر حال میں اللہ ہی کی طرف سے ہے بلاشبہ وہ سب پر غالب آنے والا اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔ جب ایسا ہوا کہ اس نے چھا جانے والی غنودگی تم پر طاری کر دی تھی کہ یہ اس کی طرف سے تمہارے لیے تسکین و بے خوفی کا سامان تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ تمہیں پاک و صاف ہونے کا موقع دے دے اور تم سے شیطان (کے وسوسوں) کی ناپاکی دور کر دے نیز تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھ جائے اور (ریتلے میدانوں میں) قدم جما دے۔ اے پیغمبر یہ وقت تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں پر وحی کی تھی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بس مومنوں کو جمائے رکھو (ان کے دل ثابت رکھو) عنقریب ایسا ہوگا کہ کافروں کے دلوں میں (مومنوں کی) وہشت ڈال دوں گا۔ سو (مسلمانو) ان (کافروں) کی گردنوں پر ضرب لگاؤ۔ ان کے ہاتھ پاؤں کی ایک ایک انگلی پر ضرب لگاؤ۔“

خلاصہ یہ کہ یہ حضرات مجاہدین۔ دستِ قدرت کا آلہ کار بنے تو قدرت نے ان کی ہر طرح مدد کی۔ میدان جنگ میں محاذ پر کھڑے ہوئے مجاہدین پر ایک غنودگی طاری ہوگئی۔ اس تھوڑی سی نیند کا اثر یہ ہوا کہ ان کا تھکان جاتا رہا، یہ تازہ دم ہو گئے، بارش برسا دی جس سے نہا دھو کر پاک صاف ہو گئے۔ ان کے پیروں تلے ریت تھا جس پر چلنا مشکل تھا۔ گرد نے ہوش وحواس گم کر رکھے تھے۔ بارش برسی تو گرد دب گیا۔ ریت جم گیا جس سے دوڑنا چلنا آسان ہو گیا۔ ان کا رعب دشمن پر چھا گیا۔ ان مجاہدین نے دستِ قدرت کا آلہ بن کر دشمن کے بدنوں پر اور بدنوں کے ہر ایک حصہ پر ضرب لگائی۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاءُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ (سورہ آل عمران ع۲ ع۱۰ اج ۳)

''بلاشبہ تمہارے لیے دو گروہوں میں (کلمہ حق کی فتح مندیوں کی) بڑی ہی نشانی تھی جو بدر کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے۔ اس وقت ایک گروہ (مٹھی بھر بے سروسامان مسلمانوں کا) اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا۔ دوسرا گروہ منکرین حق کا تھا جنہیں مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان سے دو چند ہیں۔ (بایں ہمہ منکرین حق کو شکست ہوئی) اور اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی نصرت سے تائید کرتا ہے اور اس کو قوت پہنچاتا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو صاحب بصیرت ہیں (جو چشم بینا رکھتے ہیں) اس معاملہ میں بڑی ہی عبرت ہے۔''

یہ حضرات دست قدرت کا آلہ تھے کہ اس کی مرضی پوری کریں:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (سورہ انفال ع۲)

''پس تم نے ان کو نہیں مارا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو مارا اور جب تم نے (خاک کی مٹھی) پھینکی تھی تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔''

آیت کریمہ میں جس طرح مسلمانوں کو اس غلط احساس سے روکا جا رہا ہے کہ وہ اس فتح کو خود اپنی تدبیر اور اپنی کوشش کی کامیابی سمجھنے لگیں اور اس پر ناز کرنے لگیں۔ اسی طرح اس آیت میں اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اصل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ فاعل حقیقی وہی ہے اور جہاں تک ان مجاہدین اور خود ذات اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے تو یہ دست قدرت کا آلہ کار ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ان حضرات کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو رضائے مولیٰ کے حوالے اس طرح کر دیا جیسے کوئی بے حس و حرکت آلہ مالک کے حوالہ ہوتا ہے۔ یہ سب سے بلند منزل ہے شان عبدیت کی ارباب طریقت اور اہل تصوف سے پوچھو کہ کیا فنا فی اللہ کا اس سے بلند کوئی درجہ ہے؟ اور سب سے بڑی بات جو اس جماعت کو پوری امت بلکہ جملہ انبیاء علیہم السلام کی تمام امتوں سے ممتاز کر دیتی ہے، یہ ہے کہ کلام اللہ شریف کی آیت اس کا اظہار کر رہی ہے یعنی خوبی یہ ہے کہ جن کے لیے فنا ہو رہے ہیں وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ یہ میرے ہیں۔ مجھ پر فدا ہیں میرے لیے فنا ہیں۔

غزوۂ احد:

یہ وہی غزوہ ہے جس میں ستر صحابہ شہید ہوئے۔ سید الانبیاء ﷺ بھی مجروح ہوئے دندان مبارک شہید ہوا۔ اسباب ظاہری کے لحاظ سے کوتاہی یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کی ڈیوٹی ایک درے پر لگا دی تھی اور ہدایت یہ فرمادی تھی کہ اسلامی فوج کو فتح ہو یا شکست وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ ان حضرات نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان بڑھ رہے ہیں اور انہوں نے غنیم کو دبالیا ہے تو یہ درہ چھوڑ کر میدان میں آ گئے اور باقی مسلمانوں کے ساتھ مال غنیمت فراہم کرنے میں شامل ہو گئے۔ جب درہ خالی ہو گیا تو دشمن نے اسی درہ سے گذر کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اب سامنے والے بھی سنبھل گئے اور مسلمان دو طرف کے حملہ میں گھر کر تتر بتر ہو گئے۔

روحانی لحاظ سے اس کا سبب یہ تھا کہ ستر دشمن جو اس سے پہلے (غزوہ بدر میں) گرفتار ہوئے تھے ان کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا تھا کہ ان کو کچھ لے دے کر رہا کر دیا جائے۔ اگر چہ وہ قانون اسلام کے لحاظ سے صحیح تھا مگر اس کا محرک کسی قدر یہ جذبہ تھا کہ یہ ہمارے عزیز و اقارب ہیں ان کو قتل نہ کیا جائے۔ بیشک رشتہ داروں پر رحم کرنا اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ لیکن رشتہ دار اگر دشمن خدا ہو تو جذبہ للّٰہیت کا تقاضا یہ ہے کہ جذبہ قرابت نظر انداز ہو اور پیش نظر اس کی یہ دشمنی ہو۔ جو خدا سے بیگانہ ہے وہ اپنے سے بھی بے گانہ ہونا چاہیے۔ ورنہ عاشق مولیٰ ہونے کا دعویٰ غلط ہے۔ اس غزوہ میں شہید ہونے والوں کے متعلق ارشاد ربانی ملاحظہ فرمائیے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ

(سورہ آل عمران ع ۱۷)

''ہرگز ہرگز ان کو مردہ مت تصور کرو جو راہ خدا میں قتل کر دیئے گئے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے یہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے وہ شاداں و فرحاں ہی ہیں اس پر جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عنایت فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس غیر معمولی انعام و اکرام کو دیکھ کر وہ ان کے حق میں بھی خوش وقت اور مطمئن ہو رہے ہیں جو ان سے اب تک نہیں ملے ہیں (ان کے پیچھے رہ گئے ہیں) کہ ان کو بھی کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احسان اور اس کے فضل و کرم کی وجہ سے خوش و خرم رہتے ہیں۔ نیز اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔''

آیت کے پہلے حصہ میں شہداء احد کے بلند مرتبہ کا اظہار ہے اور دوسرے حصہ میں ان تمام مسلمانوں کو بشارت ہے جو ان کے راستے پر چلنے والے ہیں۔

دردناک حادثہ احد کی کچھ تفصیل:

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بدر میں قریش کو جو غیر معمولی شکست ہوئی تھی قریش مکہ نے اس کو اپنی غیرت و حمیت اور اپنی تاریخی عظمت کے لیے ایک چیلنج قرار دیا اور پوری قوت سے جوابی کارروائی کی جدوجہد شروع کر دی۔ تجارت شام کا پچاس ہزار مثقال سونا ایک ہزار اونٹ جو ابھی تقسیم نہ ہوئے تھے چندے میں شامل کر دیئے گئے۔ ابوعزہ شاعر نے تہامہ میں گشت لگا کر بنوکنانہ کو قریش کی مدد پر آمادہ کیا۔ اس طرح پانچ ہزار بہادروں کا لشکر دندناتا ہوا مدینہ کے قریب پہونچ گیا۔ اس لشکر میں تین ہزار اشتر سوار تھے، دو سو اسپ سوار، سات سو زرہ پوش پیادے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر مدافعت کی جائے۔ مگر اکثریت کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنا کمزوری کی بات ہے۔ میدان میں دو دو ہاتھ ہونے چاہییں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثریت کے رجحان کا احترام فرمایا اور احد تشریف لے گئے جو مدینہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے اسلامی لشکر کی تعداد ایک ہزار تھی۔ عین وقت پر ابی ابن سلول (منافق) نے دغا دی اور اپنے تین سو ساتھیوں کو راستہ ہی سے واپس لے آیا۔

اب مسلمانوں کی تعداد جس کا پانچ ہزار کے خونخوار جم غفیر سے مقابلہ تھا صرف سات سو تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کی صف بندی کرتے ہوئے کچھ مجاہدین کو ایک درے پر مامور فرما دیا جو اسلامی فوج کے عقب میں تھا اور ان کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ خواہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست۔ لڑائی شروع ہوئی تو سات سو کی اقلیت نے پانچ چھ گنی اکثریت کا منہ پھیر دیا۔ دشمن پسپا ہونے لگا تو مسلمانوں نے ان کے ڈیروں خیموں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ درہ پر متعین تیر اندازوں نے دیکھا کہ دشمن بھاگ رہا ہے اور مسلمان آگے بڑھ رہے ہیں تو فتح کی خوشی میں درہ چھوڑ کر میدان میں آ گئے اور دشمنوں کے مال اسباب پر قبضہ شروع کر دیا۔

سپہ سالار خالد۔ جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور دشمن کی فوج کے ایک دستہ کی کمان کر رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ عقب کا درہ خالی ہے تو وہ اپنے دستہ کو لے کر اس درے سے گذرے اور مسلمانوں پر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا۔ سامنے سے جو لوگ بھاگ رہے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں پر دوسری جانب سے حملہ ہو گیا ہے تو وہ بھی پلٹے اور جم کر حملہ شروع کر دیا۔ اب مسلمان دو طرف سے دشمن کے نرغے میں گھر گئے۔ ان کا نظم تتر بتر ہو گیا۔ گرد و غبار نے پہچان مشکل کر دی۔ مشہور ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس نے اور زیادہ حواس باختہ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد صرف بارہ صحابی رہ گئے۔ ابوبکر، عمر، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبداللہ، زبیر بن عوام، ابوعبیدہ بن جراح اور پانچ اور صحابہ رضی اللہ عنہم۔

تیراندازی کے علاوہ دشمنوں نے سنگ باری شروع کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو نشانہ بنایا گیا۔ ابن قمیہ کے پتھر سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک۔ ابن شہاب کے پتھر سے آپ کا بازو زخمی ہوا۔ عتبہ کے پتھر سے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔ (غزوہ بدر اور احد کے واقعات چونکہ سیرت کی تمام کتابوں میں تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں وہ عام طور پر مسلمانوں کو معلوم ہیں لہٰذا یہاں صرف مجمل تذکرہ کافی سمجھا گیا)۔

بہرحال اس معرکہ میں جو شہید ہوئے ان کے متعلق ارشاد ربانی وہ ہے جو اوپر نقل کیا گیا۔ جن کے پاؤں اکھڑ گئے تھے ان کے متعلق ارشاد ربانی یہ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (سورہ آل عمران ع ۱۵)

''تم میں سے جن لوگوں نے اس دن منہ موڑ لیا تھا جس دن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو ان کی لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے جو انہوں نے پیدا کر لی تھیں شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے تھے (یہ بات نہیں تھی کہ ان کے ایمان میں فتور آ گیا ہو) یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ان کی یہ لغزش معاف کر دی وہ یقیناً بخش دینے والا (انسان کی کمزوریوں کے لیے) بردبار ہے۔''

غزوۂ احزاب:

یہ غزوہ ۴ھ میں پیش آیا۔ یہود بنونضیر اور کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے خلاف سخت پروپیگنڈا کر کے تمام عرب کو اس پر آمادہ کیا کہ ایک متحدہ حملہ مدینہ طیبہ پر کر کے اسلام اور مسلمانوں کا قلع قمع کر دیں۔ چنانچہ عرب قبائل کی تمام جماعتیں اپنی پوری طاقتوں کے ساتھ اس متحدہ حملہ میں شریک ہوئیں۔ اسی لیے اس کو غزوۂ احزاب کہتے ہیں (یعنی تمام جماعتوں کی متحدہ جنگ)۔

یہود کے باقی قبائل جو اب تک مدینہ طیبہ اور اطراف مدینہ طیبہ میں اپنے محفوظ قلعوں میں آباد تھے اور جو اب تک اپنے معاہدہ پر قائم تھے اس موقع پر انہوں نے بھی غداری کی اور اس اجتماعی حملہ کی کامیابی کو یقینی تصور کر کے حملہ آور احزاب کے ساتھ ساز باز اور ان کی امداد و اعانت شروع کر دی۔ ایک وہ یار آستین منافقین کی جماعت تھی جو مسلمانوں کی زندگی میں شریک رہ کر در پردہ ان کے خلاف ریشہ دوانی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتی تھی۔ اس نے اس اجتماع کو دیکھ کر بغلیں بجائی اور مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اور کھلم کھلا کہنے لگے۔

مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا (احزاب ع ۲)

''اللہ اور اس کے رسول نے جو کچھ وعدہ کیا تھا وہ محض دھوکہ تھا۔'' (معاذ اللہ)

انہیں میں وہ بھی تھے جو غزوہ احد کے موقع پر عین معرکہ کے وقت کٹ کر الگ ہو گئے تا کہ باقی مجاہدین کی ہمتیں پست ہو جائیں اور ان کے پاؤں اکھڑ جائیں۔ اس کے بعد اگر چہ بہت کچھ عہد و پیمان کر کے نہایت پختگی سے وعدہ کیا تھا کہ لا یولون الادبار (سورہ احزاب ع ۲) ''آئندہ ہرگز پیٹھ نہ پھیریں گے۔'' مگر آج وہ تمام عہد و پیمان طاق نسیان کے حوالہ ہو گیا تھا اور آج انہوں نے دوسرے بہانوں کے علاوہ ایک حیلہ یہ تراشا تھا کہ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ ہمارے مکانات کھلے ہوئے ہیں (غیر محفوظ ہیں)۔

بہر حال مٹھی بھر مومنین قانتین جو انتہائی پریشانی عسرت، بلکہ کئی کئی وقت کے فاقوں سے آقا دو جہاں سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ کر دفاع کی کوشش میں مصروف تھے۔ ان کے علاوہ باقی تمام عرب اور خود مدینہ منورہ کے یہود اور منافق اسلام کے نوخیز پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی پوری جدوجہد کر رہے تھے۔ اسلام اور حامیان اسلام کے لیے انتہائی نازک وقت تھا۔ قرآن حکیم کے مندرجہ ذیل معجزانہ کلمات سے اس وقت کی نزاکت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اِذْ جَاءُوْكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (سورہ احزاب ع ۲)

''وہ وقت جب کہ وہ تم پر چڑھ آئے تھے اوپر کی جانب سے (مدینہ کی مشرقی جانب سے) اور نیچے کی جانب سے (مدینہ کی غربی جانب سے) اور جب کہ نگاہیں پھر گئی تھیں (بہت سے وہ لوگ جو دوستی اور وفاداری کا اظہار کیا کرتے تھے۔ آج کترا گئے تھے) اور دل دھڑک دھڑک کر گلوں تک پہنچنے لگے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے متعلق طرح طرح کے گمان ہونے لگے تھے۔ اس موقع پر مسلمان پوری طرح آزمائے گئے اور ان کو سختی سے جھنجوڑا گیا۔'' (سورہ احزاب ع ۲)

صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے جس استقلال و استقامت کا ثبوت اس موقع پر دیا کلام ربانی کی مندرجہ ذیل آیتیں اس کی شہادت دے رہی ہیں:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَاءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَحِيْمًا۔ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا

(سورہ احزاب)

''جب مسلمانوں نے مشرکین کی فوجوں کو دیکھا تو کہا یہ وہی ہے جس کا ہم سے وعدہ کیا

ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور سچ فرمایا اللہ نے اور اس کے رسول نے۔ اور اس سے (ان فوجوں کی آمد اور اس ہجوم بے پناہ کے حملہ سے) ان کا ایمان و تسلیم ہی زیادہ ہوا مسلمانوں میں سے کچھ تو وہ مرد (بہادر) ہیں جنہوں نے تصدیق پیش کر دی اس معاہدہ کی جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا (کہ دین برحق اور کلمتہ اللہ کو سر بلند کر دیں گے اور دشمنان حق سے مقابلے کے وقت ثابت قدم رہیں گے) پس ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جنہوں نے اپنی نذر پوری کر دی (اعلاء کلمتہ اللہ کے لیے جہاد کرتے کرتے جان دے دی۔ بعنوان دیگر ان کا حصہ یہی تھا کہ اعلاء کلمتہ اللہ کے لیے جان دے دیں وہ اپنا حق ادا کر چکے) اور کچھ وہ ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں کہ پھر کب موقع آئے کہ وہ اعلاء کلمتہ اللہ کے لیے اپنی قربانیاں پیش کریں اور ان لوگوں نے اپنے عہد میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں کی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے تا کہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا عطا فرمائے اور منافقوں کو عذاب میں مبتلا کرے اگر چاہے یا ان کی توبہ قبول فرمائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (وہ آج کے منافقوں کو مخلص مسلمان بنا کر انکے نفاق کو معاف فرما سکتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو غیض و غضب کے ساتھ (کہ وہ کوئی خیر اور کوئی کامیابی حاصل کر سکے) واپس کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کی طرف سے جنگ کی کفالت کر لی (کہ شدید آندھی کے ذریعہ ان کے نظام کو درہم برہم اور خود ان کو خاطر برداشتہ کر دیا) اور اللہ تعالیٰ قوی غالب ہے۔

آیت کریمہ کے پہلے حصہ میں ہے کہ جب مسلمانوں نے مشرکین کی فوجوں کو دیکھا تو کہا یہ تو وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا۔

وعدہ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

اللہ اور اس کے رسول کا وعدہ تو یہ تھا کہ دین اسلام سر بلند ہوگا اور کافر مقہور اور مغلوب ہوں گے اور وعدہ یہ نہیں تھا کہ دشمن اس طرح تم پر چڑھ کر آئیں گے اور تم اس طرح مصیبت اور پریشانی میں مبتلا ہو گے مگر ہر ایک صاحب فہم و دانش اور ہر وہ سمجھدار شخص جو فلسفہ انقلاب اور ترقی و تنزل اقوام عالم کی تاریخ پر نظر رکھتا ہو فتح و نصرت کے وعدہ کے ساتھ با آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہجوم اعداء اور دشمنوں کا سخت حملہ بھی ہوگا۔ دشمنوں کے حملہ کے بغیر نصرت الٰہی کا وجود میں آنا قانون انقلاب کے خلاف ہے۔ جس طرح بارش کے وعدہ کے لیے بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک ضروری ہے۔ وعدہ شکم سیری کے لیے پہلے گرسنہ اور تہی شکم ہونا ضروری ہے۔ ایسے ہی فتح و نصرت کے لیے ہجوم اعداء ایک لازمی اور قدرتی امر ہے۔ بالخصوص جب کہ قرآن کا یہ اعلان موجود ہو کہ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ لہٰذا اصحابہ کرام کی فراست و دانش نے فتح و نصرت کے وعدہ کو سن کر پہلے ہی یقین کر لیا

تھا کہ اعداء دین کا ہجوم بھی لازمی ہوگا۔ چنانچہ جب انہوں نے دشمنوں کی فوجوں کو دیکھا تو ان کو یقین ہو گیا کہ اس وعدہ کا پیش خیمہ وجود میں آچکا ہے۔ لہٰذا اب باقی حصہ یعنی فتح و نصرت بھی نتیجہ میں آئے گی۔ اسی بناء پر ہجوم اعداء کو دیکھ کر خوف و ہراس کے بجائے امید اور مسرت کی جھلک محسوس کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ فرمایا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کا ارشاد برحق ہے۔

صحابہ کرام کا یہ احساس ان کی انتہائی فراست اور ان کے اعلیٰ تدبر کی روشن دلیل ہے اور یہ آیت ان اکابر ملت کی عظمت و شرافت کی واضح شہادت ہے۔ جو اس معرکہ میں ظاہر و باطن ہر طرح ثابت قدم رہے۔ نہ دلوں میں اضطراب پیدا ہوا، نہ پائے استقامت میں کوئی لغزش آئی اور پوری پامردی سے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ابھی بہت بڑے بڑے کام باقی ہیں۔ بڑے بڑے معرکے پیش آنے والے ہیں اور ایک جماعت ان تمام مقابلوں کے واسطے تیار ہے اور انتظار کر رہی ہے کہ کب یہ عظیم الشان معرکے پیش آتے ہیں کہ وہ اپنے استقلال و استقامت کے جوہر دکھائیں۔

حضرت شاہ صاحب اس کے بعد مزید توضیح کے لیے حضرت کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف مزنی کی روایت پیش کرتے ہیں کہ جب مشرکین و مخالفین اسلام کی ٹڈی دل فوج مدینہ منورہ پر چڑھ آئی اور یہ طے کرلیا گیا کہ باہر نکل کر مقابلہ کے بجائے مدینہ منورہ میں رہ کر دفاع مناسب ہے تو چونکہ مدینہ کے گرد کوئی شہر پناہ نہیں تھی۔ لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ ایک خندق کھودی جائے جو دشمن کے راستہ میں آڑ بن سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے لیے خط کھینچ دیا اور پھر صحابہ کرام کے ساتھ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس خندق کھودنے میں مصروف ہوگئے۔ یہ خندق کھودی جارہی تھی کہ ایک بہت بڑی چٹان نمودار ہوئی۔ یہ چٹان سفید تھی اور گول تھی۔ ہمارے تمام کدال بے کار ہوگئے بہت سے کدال ٹوٹ گئے اور اس کا اکھاڑنا ہمارے لیے ناممکن ہوگیا۔ ہم نے حضرت اقدس رحمتہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صورت حال پیش کی۔ آپ اس جگہ تشریف لائے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں جو کدال تھا اس کو آپ نے لیا اور اس قوت سے چٹان پر مارا کہ چٹان پھٹ گئی۔ یہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی قوت تھی جس نے چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جب پہلی مرتبہ آپ نے کدال ماری تو ایک بہت تیز روشنی نمودار ہوئی جس سے مدینہ منورہ کے وہ سنگلاخ حصے بھی روشن ہوگئے جو شہر مدینہ کے (۲) دو جانب ہیں اور ایسا معلوم ہوا کہ اندھیری رات میں بجلی کوندگئی ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ اکبر کہا۔ صحابہ کرام نے بھی اللہ اکبر کہا۔ اس کے بعد دوبارہ کدال سے اس چٹان پر چوٹ ماری۔ اس کے کچھ اور ٹکڑے ہوگئے اور ایسی ہی روشنی پھر نمودار ہوئی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے تکبیر کہی۔ تیسری مرتبہ پھر آپ نے کدال مارا اور اب چٹان ریزہ ریزہ ہوگئی اور ایسی ہی روشنی پھر نمودار ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرتبہ بھی تکبیر کہی اور صحابہ کرام نے بھی تکبیر کا جواب تکبیر سے دیا۔ جب اس مہم سے فراغت ہوئی تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حیرت انگیز روشنی اور تکبیر کہنے کی وجہ دریافت کی۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پہلی مرتبہ حیرہ (شہر کا نام) اور مدائن کسریٰ (عراق کا پایہ تخت) کے عالیشان محلات اس طرح نمودار ہو گئے جیسے کتے کے (سفید سفید) دانت ہوتے ہیں اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے مجھ کو خبر دی کہ ان تمام محلات پر میری امت کا قبضہ ہو جائے گا۔ دوسری مرتبہ میں ارض روم کے عالیشان سرخ محلات کتے کے دانتوں کی طرح سامنے آ گئے اور جبرئیل علیہ السلام نے خبر دی کہ میری امت کا اس تمام علاقہ پر تسلط ہو جائے گا اور تیسری مرتبہ یمن کے پایہ تخت صنعا کے محل میرے سامنے اسی طرح آ گئے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان کے متعلق بھی یہی بتایا کہ میری امت کے زیر نگیں ہوں گے۔ لہٰذا آپ حضرات کو نصرت خداوندی کی بشارت ہو۔ صحابہ کرام اس بشارت سے محظوظ اور مسرور ہوئے، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ یہ محاصرہ جو اس وقت در پیش ہے کامیابی کے ساتھ ختم ہوگا اور امداد خداوندی شامل حال ہوگی اور ان بزرگوں کو یقین ہو گیا کہ جو وعدہ کیا جا رہا ہے سچا ہے۔ اس کے بعد اعراب کے جتھے اور دشمنوں کی فوجیں سامنے آ گئیں تو صحابہ کرام نے فرمایا کہ جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے کیا تھا۔ اللہ اور رسول کا ارشاد برحق ہے۔ ان لشکروں کو دیکھ کر ان کے ایمان میں تازگی اور تسلیم و رضا میں زیادتی ہوئی۔ مگر منافقین نے اس پر طنز کیا کہ سامنے تو دشمن قلع قمع کرنے کے لیے موجود ہے اور معاذ اللہ باتیں بنا کر سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں اور غلط آرزوئیں دماغوں میں بسائی جا رہی ہیں۔ کس قدر حیرت انگیز دعویٰ ہے کہ مدینہ کی خندق میں حیرہ اور مدائن کسریٰ کے شہر دیکھے جا رہے ہیں اور یہ خیال خام پکایا جا رہا ہے کہ وہ فتح ہو جائیں گے۔ حالت تو یہ ہے کہ دشمن سر پر ہے، میدان میں نکل کر مقابلہ کی طاقت نہیں، بچاؤ کے لیے خندق کھودی جا رہی ہے اور دعویٰ یہ ہے کہ روم و فارس پر تسلط ہوگا۔ (رہنا جھونپڑیوں میں اور خواب دیکھنے محلات کے) کون سی سمجھداری کی بات ہے۔

افادات:

سورہ احزاب میں متعدد آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی معاملات، خانگی زندگی اور ازواج مطہرات سے متعلق ہیں اور چونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قرب حاصل تھا اس لیے ان آیات سے متعلق متعدد روایتیں ان ہی دونوں بزرگوں سے مروی ہیں جو بطور خود ان بزرگوں کے اعلیٰ تقرب کی دلیل ہیں۔ غالباً اسی مقصد سے حضرت شاہ صاحب نے آیت مذکورہ کے ضمن میں سورہ احزاب کی ان آیتوں اور ان سے متعلق احادیث کو بھی نقل کیا ہے۔ ذیل میں ہم آیت کا حوالہ دیتے ہوئے ان احادیث کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

آیت کریمہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ وہ خاص قسم کی چادریں جو یمن کے ایک شہر بولان میں بنا کرتی تھیں ان کے استعمال کی ممانعت کر دیں۔ ایک شخص نے فوراً تنبیہ کی کہ کیا آپ نے دیکھا

نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان چادروں کو استعمال فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اقرار کیا۔ بیشک۔ اس شخص نے جواباً عرض کیا کہ کیا ارشاد خداوندی نہیں ہے۔ لَقَدْ كَانَ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ آپ لوگوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے طرز ادا میں) اچھی اقتداء ہے (عمل کرنے کی بہترین مثال ہے)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو خانہ کعبہ کے اس کونہ پر جھک گئے جہاں حجر اسود ہے اور فرمایا۔ میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے (نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے لہٰذا عقلی طور پر بوسہ دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر میں نے اپنے محبوب (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہ دیکھا ہوتا کہ وہ تجھ کو بوسہ دے رہے ہیں تو میں بھی بوسہ نہ دیتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

حضرت یعلی بن اُمیہ رضی اللہ عنہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ طواف کیا۔ جب میں اس گوشہ پر پہونچا جو باب کعبہ کے قریب ہے اور حجر اسود سے متصل ہے تو میں اس کو بھی بوسہ دینے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً ٹوکا۔ کہ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس موقع پر بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا۔ ہٹو۔ (یہاں بوسہ مت دو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء ہی بہترین اسوہ ہے (اس میں کمی بیشی درست نہیں) جیسا کہ ارشاد ربانی ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں طرز عمل سے سمجھا دیا کہ مدار شریعت عقل نہیں بلکہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں۔ عقل اور اپنی فہم سے کسی شے کو جائز یا ناجائز نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی روایت سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ جو بات قرین قیاس نہ ہو اس کو شریعت کا حکم اسی وقت مانا جا سکتا ہے اور اسی صورت میں اس پر عمل کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ثبوت یقینی اور قطعی ہو جائے (محمد میاں)

حضرت عیسیٰ بن طلحہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں گیا۔ وہاں حضرت طلحہ کی صاحبزادی عائشہ بھی موجود تھیں۔ وہ اپنی والدہ اسماء سے کہہ رہی تھیں۔ میں تم سے بہتر ہوں اور میرے باپ طلحہ تمہارے باپ ابوبکر سے افضل ہیں۔ حضرت اسماء نے ان کو ڈانٹا کہ کیا بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی ہو۔ حضرت عائشہ نے فرمایا۔ بحث ختم کرو۔ میں فیصلہ کیے دیتی ہوں۔ ایک روز ایسا ہوا کہ حضرت ابوبکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو بشارت دی۔ انت عتیق اللہ من النار تم آتش جہنم سے عتیق ہو۔ یعنی آزاد ہو۔ پھر حضرت طلحہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہ سے فرمایا تم ان لوگوں میں سے ہو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ اپنی منت پوری کر چکے یعنی آپ کو بشارت ہوئی کہ آپ راہ خدا میں شہید ہوں گے۔

مختصر یہ کہ دونوں عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں دونوں جنتی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اسی

روز سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عتیق کہا جانے لگا۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے تخییر کے پیش نظر وہ مفصل حدیث نقل کی ہے جس میں ازواج مطہرات کی جانب سے نفقہ کے مطالبہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کبیدگی۔ حضرات شیخین کی طرف سے اپنی اپنی صاحبزادیوں یعنی حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کو تنبیہ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معذرت وغیرہ کا تذکرہ بخاری شریف وغیرہ میں تفصیل سے ہے یہاں اس حدیث کے ذکر کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ لہٰذا اسی قدر حوالہ کافی ہے۔ اس کے بعد آیت کریمہ ان المسلمین والمسلمات الایۃ کے پیش نظر چند روایتیں نقل کی ہیں۔ ترجمہ درج ذیل ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: کون سا مجاہد افضل ہے۔ فرمایا: جو اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا رہتا ہو۔ اس کے بعد روزہ دار، نمازی، صدقہ خیرات کرنے والے اور حج کرنے والے کے متعلق یہی سوال کیا۔ ہر ایک جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا کہ جو مسلمان اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتا ہو وہ افضل ہے۔ اس گفتگو کو سننے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ یا ابا حفص (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت) ذکر کرنے والے ہر ایک خیر اور خوبی کے مالک ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ درست ہے یعنی نماز روزہ وغیرہ فرائض و عبادت کو ادا کرنے والا ان فرائض وعبادت کی ادائیگی کے ساتھ ذاکر وشاغل بھی ہے تب اس کا مرتبہ اس سے بڑھا ہوا ہے جو صرف فرائض وعبادت ادا کرتا ہے مگر ذاکر وشاغل نہیں ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (یعنی اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمتیں نازل فرماتا رہتا ہے اور فرشتے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں) تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ جو خیر وبرکت بھی اللہ تعالیٰ آپ پر نازل فرماتا ہے۔ ہم خدام کو بھی اس میں شریک کر لیتا ہے (مگر اس آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہمیں بھی شرکت کا شرف عطا کیا گیا ہے) تو دوسری آیت نازل ہوئی هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ اللہ تعالیٰ تم پر رحمتیں نازل فرماتا ہے اس کے فرشتے تمہارے لیے دعا رحمت کرتے رہتے ہیں۔

سورہ احزاب میں ازواج مطہرات کے تذکرے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزید نکاحوں کے متعلق بھی چند آیتیں ہیں۔ ان آیات کا لحاظ کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے متعلق پیغام بھی بھیجا۔ میں نے معذرت کی کہ میرے ساتھ بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری معذرت قبول فرمائی۔ اس کے بعد جب بچوں کی پرورش سے فراغت ہوئی تو میں نے خود اس سعادت کے حصول کی درخواست کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذرت فرما دی کیونکہ اس وقت یہ آیت نازل ہو چکی تھی کہ

یاایھا النبی انا احللنالك ازواجك اللاتی اتیت اجورھن۔ الی قولہ اللاتی ھاجرن معك

اس آیت کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف انہیں خواتین سے نکاح کی اجازت تھی جنہوں نے ہجرت کی تھی۔ حضرت اُم ہانی بنت ابی طالب چونکہ مہاجرہ نہیں تھیں اس لیے آپ سے نکاح کی اجازت نہیں تھی (ترمذی وحاکم)

آیت حجاب کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل روایتیں پیش کی ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کے یہاں اچھے برے ہر قسم کے آدمی آتے ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ ازواج مطہرات کو پردہ کا حکم فرمادیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تجویز کی تائید کلام اللہ نے فرمائی۔ چنانچہ آیت حجاب نازل ہوئی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس کی تفصیل ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راحت کدہ پر حاضر ہوا اور دیر تک بیٹھا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند مرتبہ کھڑے بھی ہوئے تاکہ وہ بھی کھڑا ہو جائے اور آپ کے ساتھ ساتھ باہر چلا جائے مگر وہ کچھ ایسا بے حس تھا کہ اٹھا ہی نہیں۔ اتفاقاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے اور آپ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور سے محسوس کرلیا کہ اس شخص کی نشست ناگوار خاطر ہے۔ آپ نے اس شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا شاید ہمارے بیٹھنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اب کچھ اس شخص کی سمجھ میں بھی آیا۔ اور وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور تذکرہ فرمایا کہ میں کئی بار اٹھا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلے۔ مگر اس کو اس کا خیال ہی نہیں ہوا۔ تب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ یارسول اللہ! ازواج مطہرات کو پردہ کرنے کی ہدایت فرمادیجئے۔ کیونکہ آپ کی مستورات کا معاملہ عام عورتوں جیسا نہیں ہے اور پردہ عورتوں کے دلوں کو پاک وصاف رکھنے والی چیز ہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی تائید میں قرآن پاک کی آیت نازل ہوئی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ (الاية)

''اے ایمان والو نہ جایا کرو نبی کے گھروں میں مگر وہاں جب اجازت دی جائے تم کو۔''

جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کسی کو بھیج کر اس کی اطلاع فرمائی۔

عائشہ رضی اللہ عنہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں ایک طشت میں کھانا کھا رہی تھی۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس طرف آ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی بلالیا۔ اب کھاتے ہوئے میری انگلی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اُنگلی سے چھوگئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فوراً چونکے اور فرمانے لگے اُف۔ کیا اچھا ہوتا کہ خواتین کے بارے میں میری بات مانی جاتی تو آج ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کی نظر بھی نہ پڑسکتی

تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس تمنا کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ پردہ کا حکم بھی تدریجی طور پر نازل ہوا۔ یعنی اولاً رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کے لیے کوئی خصوصیت نہ تھی بلکہ جیسے عام خواتین اسلام کے لیے حکم تھا کہ چادر اوڑھ لیں اور گھونگٹ نکال لیں۔ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ایسے ہی ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی حکم تھا۔ چنانچہ ضروریات کے لیے ازواج مطہرات بھی باہر جایا کرتی تھیں۔ البتہ حکم قرآن کی تعمیل کا معیار یہ قرار دیا گیا تھا کہ اس طرح چہرہ چھپا لیں کہ پہچانی نہ جاسکیں۔ مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خواہش یہ تھی کہ باہر نکلنا قطعاً بند ہو جائے۔ چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا اسی دور کی ایک روایت پیش کرتی ہیں کہ حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا جو ازواج مطہرات میں سب سے قدیم تھیں۔ ایک شب عشاء کے وقت ضرورت سے باہر تشریف لے گئیں۔ چہرہ چھپا رکھا تھا۔ مگر چونکہ قد لانبا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پہچان لیا۔ آپ نے فوراً پکارا۔ سودہ تمہیں پہچان لیا حضرت عمر رضی اللہ عنہا کا منشاء ظاہر ہے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ باہر نکلنا بالکل بند ہو جائے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی کہ جس میں بیوت النبی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راحت کدوں) میں داخلہ کی ممانعت کر دی گئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ چار مسئلے ہیں جن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سب پر فضیلت لے گئے۔

پہلا جنگ بدر کے قیدیوں کا مسئلہ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ مگر آقا دو جہان رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس پر آیت نازل ہوئی جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی موافقت اور جو کچھ ہوا تھا اس پر تنقید کی گئی تھی۔

دوسرا مسئلہ: ازواج مطہرات کے حجاب کا معاملہ تھا۔ وہ حضور ﷺ کی ازواج مطہرات سے یہی اصرار کیا کرتے تھے کہ پردہ کریں۔ ایک مرتبہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بگڑ کر کہہ بھی دیا کہ آپ کو ہمارے معاملات میں بڑی غیرت آتی ہے۔ اگر خدا کے نزدیک یہ صورت درست نہیں تھی تو ہمارے گھر میں وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے عرش معلی سے ممانعت نازل ہو جاتی۔ چنانچہ آیت حجاب نازل ہوگئی اور یہ حکم بھی نازل ہو گیا کہ اذا سالتموھن متاعا (الایۃ ع سورہ احزاب) جب ازواج رسول اللہ سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردہ کے پیچھے سے سوال کرو۔

تیسرا مسئلہ: یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء اسلام کے زمانہ میں دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر کو مشرف باسلام کر کے اس کے ذریعہ سے دین کو قوت عطا فرما۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

چوتھا مسئلہ: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا مسئلہ ہے۔ سب سے پہلے آپ کی خلافت کے

متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحریک کی اور سب سے پہلے آپ نے بیعت کی۔

سورہ احزاب میں درود شریف کا تذکرہ ہے اس سلسلہ میں بھی حضرت مصنف نے چند حدیثیں پیش کر دی ہیں۔ترجمہ درج ذیل ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے ایک روز میں بارگاہ رسالت مآب (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں حاضر تھا۔ایک شخص نے حاضر ہوکر سلام عرض کیا۔رحمتہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے گرمجوشی سے جواب دیا۔اس کو اپنے پاس بٹھایا اور پوری شفقت اور انبساط خاطر کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی۔جب وہ فارغ ہوکر جانے کے لیے اٹھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف مخاطب ہوکر فرمایا اس شخص کے روزانہ اتنے اعمال شرف قبولیت حاصل کرتے ہیں جتنے تمام زمین پر بسنے والوں کے۔میں نے حیرت سے وہ گر دریافت کیا جس کی وجہ سے اس کا ثواب اتنا بڑھ جاتا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ شخص ہر روز صبح کو دس مرتبہ ایسا درود پڑھتا ہے جو ساری مخلوق کے درود کے برابر ہوتا ہے۔میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ درود شریف کیا ہے۔

ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِنِ النَّبِيِّ عَدَدَ مَنْ صَلّٰى عَلَيْهِ مِنْ خَلْقِكَ وَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِنِ النَّبِيِّ كَمَا يَنْبَغِيْ لَنَا اَنْ نُّصَلِّيَ عَلَيْهِ وَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِنِ النَّبِيِّ كَمَا اَمَرْتَنَا اَنْ نُّصَلِّيَ عَلَيْهِ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت ہے کہ جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے درود شریف اس سے زیادہ تیزی سے گناہوں کی آگ کو فرو کر دیتا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجنا گردنوں کے رہا کرنے سے بڑھا ہوا ہے۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت سویداء قلب سے زیادہ محبوب اور افضل ہے (یا یہ ارشاد فرمایا) کہ راہ خدا میں شمشیر زنی سے زیادہ افضل ہے۔

آیت کریمہ۔والذین یوذون المومنین الخ ترجمہ۔جو لوگ ناکردہ گناہ مسلمان مردوں یا عورتوں کو ایذا دیتے ہیں وہ بہتان اور بہت بڑے گناہ کا بار اپنے اوپر لادرہے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ہرگز ہرگز مسلمانوں کو ایذا مت پہنچاؤ۔کیونکہ اللہ تعالیٰ صاحب ایمان کی نگہبانی کرتا ہے اور جو اس کی نگرانی میں دخل اندازی کرے اس پر خدا کا غضب ہوتا ہے۔

علماء کرام کی روایت ہے کہ ایک روز حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھا اس کے مضمون کا عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ گھبرا گئے۔یہاں تک کہ پریشان ہوکر وہ مفسر اسلام حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لے گئے اور فرمایا (ابومنذر (حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) میں نے یہ آیت پڑھی تھی اس کا میرے اوپر پورا پورا اثر ہے کیونکہ میں اہل ایمان کو سزا بھی دیتا ہوں، ان کو مارتا بھی ہوں۔حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔یہ آیت آپ سے متعلق نہیں۔آپ جو کچھ سزا دیتے ہیں وہ

ان کے ایمان اور عقیدہ کی بنا پر نہیں بلکہ ایمان کامل اور صحیح اعتقاد کی استواری اور اعمال کی اصلاح کے لیے سزا دیتے ہیں۔لہٰذا آپ تو مودب (اتالیق) اور معلم ہیں۔

حضرت شعبی رحمہ اللہ (مشہور تابعی ہیں جو حافظ حدیث اور جلیل القدر مفسر قرآن بھی ہیں یہی شعبی) راوی ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔فلاں شخص سے میری طبیعت بہت مکدر ہے اس کی طرف سے مجھے بغض ہے۔اس شخص سے پوچھا گیا کہ کیا بات ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تمہاری طرف سے بغض کیوں ہے۔اس نے ابھی کچھ جواب نہیں دیا تھا۔گفتگو ہو رہی تھی کہ اور لوگ بھی آ گئے۔مکان آدمیوں سے بھر گیا۔اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی پہنچ گئے۔تو اس شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا۔کیا میں نے اسلام میں کوئی رخنہ ڈالا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں۔پھر اس شخص نے دریافت کیا۔کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے۔عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔نہیں۔وہ شخص۔کیا میں نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے۔عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔نہیں۔وہ شخص۔پھر آپ کس وجہ سے مجھ سے بغض رکھتے ہیں۔حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ ناکردہ گناہ مسلمان مردوں یا عورتوں کو اذیت پہونچاتے ہیں وہ ایک بہتان اور بہت بڑے گناہ کا بار اپنے اوپر لادرہے ہیں بلاشبہ آپ نے مجھے اذیت دی ہے۔میں معاف نہیں کروں گا خدا بھی آپ کا یہ گناہ معاف نہ کرے گا۔حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔بلاشبہ یہ میرا قصور ہے کہ مجھے آپ اچھے نہیں لگتے۔آپ کی طرف سے دل میں بوجھ رہتا ہے۔بہرحال یہ میرے دل کی خرابی ہے آپ معاف کر دیں۔اب عجیب صورت تھی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ معافی مانگ رہے تھے اور وہ انکار کر رہا تھا بالآخر وہ متاثر ہوا اور اس نے حضرت عمر کو معاف کر دیا۔

بظاہر مفہوم روایت یہ ہے کہ مومن کے دل میں مومن کی طرف سے کوئی بوجھ نہ رہنا چاہیے بلکہ محبت اور یگانگت کا ایسا رشتہ رہنا چاہیے کہ جب بھی ملاقات ہو ایک دوسرے کو مسرت ہو۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دل میں اس شخص کی طرف سے یہ مسرت محسوس نہیں کرتے تھے یہی حضرت فاروق کا جرم تھا اور آپ کے دامن تقدس کا نکھار یہ ہے کہ اتنا بوجھ بھی برداشت نہیں۔اپنے دل کی اس بیماری کا اظہار آپ نے خود کیا۔یہاں تک کہ کھل کر بات چیت ہوئی اور یہ دھبہ صاف ہو گیا۔

حضرت ابوقلابہ رضی اللہ عنہ۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں کسی باندی کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ قناع (بڑی چادر) پردہ کے لیے اوڑھے۔فرمایا کرتے تھے قناع تو آزاد عورتوں کے لیے ہے تاکہ ان کو ستایا نہ جائے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے کسی جاریہ کو دیکھا کہ وہ نقاب پوش تھی۔آپ نے اس کو سخت تنبیہ فرمائی اور فرمایا۔نقاب تو آزاد عورتوں کے لیے ہے۔

چند سبق:

ازالۃ الخفاء کے حدود کی پابندی کرتے ہوئے ہم نے کتاب اللہ کی آیتیں اور چند روایتیں پیش کی ہیں۔ سلسلہ افادات میں بھی جولانی قلم محدود و پابند رہی۔ازالۃ الخفاء کے موضوع کے لحاظ سے یہ حد بندی درست ہے لیکن سلسلہ عہد زریں کا موضوع جماعت صحابہ کی مکمل تاریخ ہے۔اس وسیع موضوع کے لحاظ سے یہ تحریر تشنہ ہے۔ لہٰذا چند سبق یہاں پیش کیے جارہے ہیں۔

جہاں تک حضرات صحابہ کی انفرادی قربانیوں کا تعلق ہے اس کا گلدستہ دوسرا ہوگا۔ جب نام بنام ہر ایک صحابی کے حالات سوانح کے طور پر پیش کیے جائیں گے (انشاء اللہ) اس وقت وہی واقعات پیش کیے جارہے ہیں جن کی حیثیت جماعت کی ہے کسی بزرگ کا نام نامی یا کوئی واقعہ اگر بیان کیا جائے گا تو اسی وقت اور اسی حد تک جو جماعتی کارگذاری کے بیان کے لیے ضروری ہوگا۔

پہلے غزوہ احزاب کے سلسلہ کے چند سبق ملاحظہ فرمائیے۔

تیاری:

سورہ نساء کے رکوع ۸ کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْباً مِنَ الْكِتَابِ (الاية)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

> اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ ان لوگوں کا حال نہیں دیکھتے جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا (یعنی کیا آپ ان یہودیوں کو نہیں دیکھتے جنہیں تورات کا علم دیا گیا تھا) وہ کس طرح بتوں کے اور شیطان کے معتقد ہو گئے ہیں اور وہ کافروں (مشرکین عرب) کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے تو کہیں زیادہ یہی لوگ سیدھے راستہ پر ہیں۔(سورہ نساء ع ۸)۔

اس آیت کریمہ میں انسانی معاشرہ کے ایک مرض کی نشان دہی کی گئی ہے کہ:

جب کسی جماعت میں اتباع حق کی جگہ جتھابندی اور گروہ پرستی کا جذبہ کام کرنے لگتا ہے تو پھر حق و باطل کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔اس کی تمام کوششیں اس پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ جس طرح بھی ہو اس کی پوزیشن اونچی ہو اور مخالف کو زک پہنچے۔اگر ایسا کرنے میں اس کو اپنے عقیدوں اور طے شدہ اصول کے خلاف بھی کچھ کرنا پڑتا ہے تو اس کو تامل نہیں ہوتا وہ سب کچھ کر بیٹھتا ہے۔

غزوہ احزاب کی تیاری میں یہودیوں نے جس طرح ساز باز کی اور جس طرح حق و صداقت کو قربان کیا وہ حق دشمنی اور اس گروہ پرستی کی بدترین مثال ہے۔تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

جنگ بدر کے بعد یہ واقعہ پیش آ چکا تھا کہ متعدد بدعہدیوں کی بنا پر (جس کی تفصیل آگے آئے گی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنونضیر کے یہودیوں کو جلاوطن کیا۔ اب ان لوگوں نے پورے عرب میں سازش کا جال پھیلایا ان کے رہنماؤں اور لیڈروں کی ایک جماعت مکہ معظمہ پہنچی۔ قریش کے سرداروں سے ملی اور ان کو ایک متحدہ حملہ پر آمادہ کیا جس میں عرب کے تمام قبائل شریک ہوں گے اور یہود بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کی مدد کریں گے۔

غطفان ایک نامور جنگجو قبیلہ تھا اس کے سرداروں کے پاس پہنچے وہ پوری طرح تیار نہیں تھے تو ان کو خیبر کی آمدنی کا لالچ دیا کہ سال بھر کی پیداوار ان کو دیدی جائے گی۔ جوڑ توڑ کی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ قریش کے رہنماؤں نے یہودی زعماء سے کہا۔

> ہم سوچا کرتے ہیں کہ ہمارا دین جس پر ہم ہمیشہ سے چلے آ رہے ہیں یہ اچھا ہے یا محمد (علیہ السلام) جو باتیں کہہ رہے ہیں وہ درست ہیں؟ ہماری خدمات پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہزاروں آدمی جو ہر سال حج کے لیے آتے ہیں ہم ان کی خدمت کرتے ہیں ان کے کھانے پینے اور ٹھہرنے کا انتظام کرتے ہیں۔ عام طور پر جو مہمان آتے ہیں ہم ان کی پوری مدارات کرتے ہیں اس کے علاوہ اگر کوئی مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے تو ہم اس کی امداد کرتے ہیں، قیدیوں کو چھڑاتے ہیں، رشتہ داروں کی خدمت کرتے ہیں اور کعبہ مکرمہ جو اللہ کا گھر ہے ہم اس کی خدمت کرتے ہیں، اس کو آباد رکھتے ہیں، اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔ آپ حضرات اہل کتاب ہیں مذہبی باتوں کا آپ کو ہم سے زیادہ علم ہے آپ حضرات ہی فیصلہ کر کے بتائیں کہ ہمارا دین اچھا ہے جس کی پشت پر سیکڑوں سالہ روایات ہیں یا محمد ﷺ کا یہ نیا دین بہتر ہے جسے کوئی تاریخی تائید وحمایت حاصل نہیں ہے۔

یہود کے احبار وعلماء جو اپنے جتھے کی کامیابی کے واسطے ہر ایک سچائی کو قربان کرنے کے لیے تیار تھے انہوں نے بلا تکلف جواب دیا۔ واللّٰہ انتم اھدی سبیلا مما علیہ محمد ہمارا یقین تو یہی ہے ہم اس پر قسم کھا سکتے ہیں کہ بیشک محمد کے مقابلہ میں آپ صاحبان زیادہ سیدھے راستہ پر ہیں۔

ان آیتوں کا شان نزول اسی واقعہ کو بیان کیا گیا ہے (بغوی) پھر یہودیوں کی ضمیر فروشی یہیں تک نہیں رہی بلکہ کعبہ کے پردوں کی بھی انہوں نے پناہ لی۔ یہی کعبہ جس سے ان کو نفرت تھی، جس کو وہ بتکدہ کہا کرتے تھے، جو ان کے نزدیک مرکز جاہلیت تھا۔ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ پھر یہودیوں کا وفد جس کے ارکان بیس تھے اس نے ابوسفیان کے سامنے تجویز رکھی کہ بیس ہم ہیں اور عمائدین قریش میں سے پچاس آدمی منتخب کیجئے۔ ہم سب کعبہ مکرمہ کے پردوں کو ہاتھ میں لیں، کعبہ کی دیواروں کو سینہ سے لگائیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کو اپنا

نصب العین قرار دیں اور اس بات کا عہد کریں کہ جب تک ہم میں سے کوئی ایک بھی زندہ رہے گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرتا رہے گا۔ قریش اور قبیلہ بنو غطفان کی طاقت ہی بہت کافی تھی ان دونوں کے جنگجو بہادروں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہوتی تھی مگر اس وقت پورے عرب کا اسلام کے مقابلہ پر کھڑا کرنا تھا۔ لہٰذا جو قبائل حلیف تھے ان کو بھی شریک کیا گیا۔ مثلاً قبیلہ بنو سعد، یہود کا حلیف تھا۔ قبیلہ بنی اسعد سے غطفان عہد و پیمان کیے ہوئے تھے۔ قبیلہ بنو سلیم بھی طاقتور قبیلہ تھا اس سے قریش کی قرابت تھی۔ غرض اس طرح کے تمام قبائل کو شریک کر کے لشکر گراں تیار کیا گیا۔ فتح الباری میں تصریح ہے کہ ان کی مجموعی تعداد چوبیس ہزار سے زیادہ تھی۔ یہ لشکر تین مستقل فوجوں میں تقسیم کیا گیا۔ غطفان کی فوجیں عیینہ بن محصن فزاری کی کمان میں تھیں جو عرب کا مشہور سردار تھا۔ بنو اسد طلحہ کی افسری میں تھے اور ابو سفیان سپہ سالار کل تھا۔

یہ بات اجمالاً پہلے بھی گذر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاریوں کی خبریں سنیں تو صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ایران و فارس کے رہنے والے تھے انہوں نے اپنے یہاں کندہ دیکھا تھا انہوں نے اس کا طریقہ سمجھایا یہ کندہ فارسی لفظ ہے۔ جس کے معنی ''کھودا ہوا'' زبان کی تبدیلی سے ''کندہ'' خندق ہو گیا۔ حضرت سلمان نے رائے دی کہ کھلے ہوئے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا درست نہیں ہے ایک محفوظ مقام میں مجاہدین کو جمع کیا جائے اور اسی کے گرد خندق کھود لی جائے سب نے اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کیے گئے۔ مدینہ میں ایک جانب گنجان باغات اور دو طرف سنگلاخ پہاڑ تھے۔ یہ شہر پناہ کا کام دیتے تھے صرف شمالی رخ کھلا ہوا تھا اسی جانب خندق کھودی گئی جس کی حدود خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائیں۔ لمبائی چوڑائی اور گہرائی مقرر کی۔ پھر مجاہدین کی ٹولیاں بنا کر ایک ایک ٹکڑا ایک ایک ٹولی کے حوالہ فرما دیا۔ صحیح روایت یہ ہے کہ صحابہ کرام نے چھ روز میں یہ خندق تیار کر دی۔

سلمان ہمارے ہیں:

جب کھدائی ہوئی تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت سلمان کا کام سب سے زیادہ تھا۔ اب انصار اور مہاجرین میں بحث شروع ہوئی کہ سلمان کس کے ہیں۔ مہاجرین کہتے تھے کہ سلمان ہمارے آدمی ہیں، قریش کہتے تھے کہ ہمارے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بحث کا علم ہوا تو فرمایا سلمان میرے ہیں۔ گویا میرے خاندان کا ایک فرد ہیں (۱۱۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزوہ احزاب، جنگ خندق

نقشہ جنگ اور مشکلات

مدینہ منورہ کے دونوں طرف وہ عجیب وغریب سنگلاخ ہیں جن کو لابتین مدینہ کہا جاتا ہے، ان کو حرہ بھی کہتے ہیں۔ لابہ اور حرہ کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی ایسا سنگلاخ جس میں کالے کالے پتھر ہوں، ان کی سیاہی بھی ایسی ہو جیسے کوئی بہت پرانا پتھر مسلسل کائی چڑھتے رہنے سے سیاہ پڑ گیا ہو۔ (مجمع البحار و قاموس)

ہماری زبان میں ان کو لاوے کی چٹان کہا جا سکتا ہے۔ یہ سنگلاخ مدینہ کے مشرق ومغرب میں قدرتی حصار تھے کیونکہ ان کی ناہموار سیاہ چٹانوں پر فوج تو درکنار قافلوں کا گذرنا بھی ناممکن تھا انہیں سنگلاخوں کے درمیانی رقبہ کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کا حرم قرار دیا ہے۔

مدینہ کے جانب جنوب وہ زرخیز علاقہ ہے جہاں اہل مدینہ کے کھیت اور گھنے باغات تھے۔ کسی بڑی فوج کا حملہ اس طرف سے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

یہیں وہ موضع قبا تھا جس کو یہ ابدی سعادت میسر آئی کہ مسلمانوں کا سب سے پہلا فرودگاہ بنا۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ سے پہلے یہیں فروکش ہوئے۔

اسی جانب یہود کے قبائل بنونضیر اور بنوقریظہ وغیرہ آباد تھے۔ بنونضیر کو تقریباً ڈیڑھ سال پہلے یہاں سے ہٹایا گیا تھا تو ان کے باغات اور زمینیں مسلمانوں کی ہوگئی تھیں۔ بنوقریظہ اپنی جگہ قائم تھے مگر ان سے مسلمانوں کا بہت پختہ عہد و پیمان تھا۔

اب مدینہ منورہ کا صرف شمالی حصہ کھلا ہوا تھا۔ جہاں سے غنیم حملہ کر سکتا تھا۔ اسی جانب ایک لابہ سے دوسرے لابہ تک خندق کھودی گئی تھی۔ جس کی لمبائی تقریباً ساڑھے تین میل تھی۔ کوہ سلع اور کوہ احد دونوں اسی جانب تھے۔ مگر کوہ سلع اور خندق مدینہ کے بیچ میں آ گیا تھا اور احد شمال کی جانب تقریباً تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ سمجھنے کے لیے ذیل کا تمثیلی نقشہ ملاحظہ ہو۔

ابتلاء عظیم، ایک زلزلہ شدید:

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا (سورہ احزاب)

''اس موقع پر جانچے گئے ایمان والے اور جھڑجھڑائے گئے زور کا جھڑجھڑانا'' (موضح القرآن)

مشکلات اور پریشانیاں:

اب تک اسلام کی تاریخ میں جماعت صحابہ کے لیے سب سے زیادہ سخت دن یوم احد تھا۔ جس میں ستر صحابہ شہید ہوئے، اتنے ہی زخمی ہوئے اور معمولی ضرب سے تو شاید ہی کوئی بچا ہو۔ لیکن یہ تمام سختی اور مصیبت اور موت کی یہ طوفانی بارش چند گھنٹے کی بات تھی۔ دن گذر کر جب رات آئی تو جس طرح لوگ پہلی رات سوئے تھے۔ آج بھی اطمینان سے سوئے۔ فاتح اور مفتوح کی خلش ضرور تھی مگر حملہ کا خطرہ کسی کو نہ تھا۔ لیکن غزوہ خندق کی شان بالکل جدا تھی یہاں دن اور رات، ہر وقت حملہ کا خطرہ تھا۔ وحشت اور خوف و ہراس کا ایک تسلسل تھا جو کم سے کم ایک ماہ تک لگا تار رہا۔

محنت مزدوری یا کھیت کیار کا جو کام بھی تھا وہ قطعا بند۔ مدینہ میں تھے مگر مکان خالی۔ گھر کا نظام بکھرا ہوا۔ مرد محاذ پر۔ عورتیں پناہ گاہ میں یعنی ان گڑھیوں (چھوٹے چھوٹے قلعوں) میں جو محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ رسد کے نام پر صفر، نہایت سخت کڑاکے کی سردی، کپڑے ناکافی، پیٹ خالی، اس پر پتھریلی زمین کھودنا لیکن جس بات نے صحابہ کرام کے لیے یہ تمام مشکلات آسان کر دی تھیں اور جس نے ان تمام پریشانیوں کو راحت بنا دیا تھا وہ بات یہ تھی کہ اسی آقا کو جس کے قدموں پر جانیں نثار کرنا ان کی زندگی کی آخری تمنا تھی۔ وہ آقا دو جہاں ان تمام مشکلات کے برداشت کرنے میں سب سے آگے تھا اور آگے بھی اس طرح کہ اپنی تکلیف کا احساس نہیں ہاں ساتھ جو زحمت برداشت کر رہے تھے اس سے بے حد متاثر اور دلگیر۔

آقاء دو جہان کی یہ دلگیری وارفتگان محبت میں نیا جذبہ اور نئی امنگ پیدا کر رہی تھی۔ یہی دو طرفہ جذبہ تھا جس نے مشکلات کی چٹانوں کو روئی کے گالے اور مصائب کے کانٹوں کو پھول بنا دیا تھا۔ ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

بخاری شریف مین روایت ہے کہ سرور کائنات ﷺ کی نظر اپنے شکستہ حال ساتھیوں پر پڑی جو صبح کی ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں خندق کھود رہے تھے تو دفعتہً لسان نبوت سے یہ کلمات صادر ہوئے۔

اللھم ان العیش عیش الاخرۃ فاغفر الانصار والمھاجرۃ

"اے اللہ! بیشک زندگی آخرت کی زندگی ہی ہے۔ پس مغفرت سے نواز انصار کو بھی اور مہاجرین کو بھی۔"

ادھر لسان نبوت سے یہ کلمات صادر ہوتے ہیں ادھر صحابہ کرام کے جذبات عقیدت موجزن ہوتے ہیں اور جذبات کی یکسانیت یہ ہے کہ سب کی زبانیں ایک ساتھ پکار اٹھتی ہیں۔

نحن الذین بایعوا محمدا علی الجھاد ما بقینا ابدا

ہم وہ ہیں جنہوں نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عہد کیا ہے کہ جب تک ہم

باقی ہیں ہمیشہ ہمیشہ مصروف جہاد رہیں گے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

سرتاج دوعالم خندق سے مٹی اٹھا اٹھا کر پھینک رہے تھے جسم مبارک پر گرد کی ایسی تہ تھی کہ جلد نظر نہ آتی تھی۔ شکم مبارک پر بال زیادہ تھے اور بالوں کی ایک دھاری سی تھی جو ناف سے سینہ مبارک تک پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن یہ سب بال گرد میں چھپے ہوئے تھے اور اسی حالت میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک ترنم فرما تھی۔

وَاللہ لولا اللہ ما اھتدینا　　ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزل سکینۃ علینا　　وثبت الاقدام ان لا قینا

ان الاولی بغوا علینا　　اذا اراد وافتنۃ ابینا

آخری لفظ ابینا پر آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی۔ اور کبھی مکرر فرماتے تھے ابینا ابینا

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہمیں ہدایت نصیب نہ ہوتی۔ نہ ہم صدقہ خیرات کرتے نہ نماز پڑھ کر خدا کی یاد کرتے۔

اے اللہ ہم پر سکون نازل فرما اور دشمن سے مقابلہ ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ یہ مکہ والے (دشمنان دین) ہم پر چڑھ آئے ہیں۔

(۳) جب انہوں نے فتنہ کا ارادہ کیا کہ اسلام سے ہمیں برگشتہ کر کے اپنے دھرم پر لے آئیں تو ہم نے انکار کر دیا (ہم نے انکار کر دیا)

جب زبان مبارک سے ابینا صادر ہوتا تو صحابہ کرام بھی ہم نوا ہو کر ابینا ابینا کہتے۔ خندق کھودتے وقت سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ تھی۔

اب خندق تیار ہو چکی ہے، دشمن کی ٹڈی دل فوج نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ ان کے نعروں سے مدینہ کے درو دیوار دہل رہے ہیں۔ ایک دہشت سب پر طاری ہے۔ دشمن جس حوصلہ سے آیا تھا۔ وہ خندق کو دیکھ کر ٹھٹک گیا ہے۔ محمد نے یہ نئی چال چلی۔ ہمیں اس کا خیال نہیں تھا۔ بیشک اب مقابلہ مشکل ہو گیا۔ لیکن ہمارے پاس تیر بہت کافی ہیں۔ ہمارے نوجوان نشانہ کے پکے ہیں۔ ہم تیروں اور پتھروں کی بارش برسائیں گے اور خندق کو پاٹتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہماری تعداد اتنی ہے کہ یہ بھنگے ہماری پھونکوں سے ہی اڑ جائیں گے۔ یہ دشمن کے حوصلے ہیں جن کی تعداد لگ بھگ چوبیس ہزار ہے سیکڑوں گھوڑے ہیں اور ہزاروں اونٹ۔ ان پر کافی سے زیادہ سامان لدا ہوا ہے۔ خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا ہے۔ آس پاس یہود کے قلعے اور ان کی گڑھیاں ہیں۔ جہاں سے وقت پر ہر طرح کا سامان مہیا ہو سکتا ہے۔ یہ خندق کے اس طرف کی شان ہے۔

لیکن خندق کے اس طرف مدینہ سے متصل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ صحابہ کرام کی جماعت ہے۔ شکستہ حال، انہیں ایک طرف دشمن کے تیروں کا جواب دینا ہے۔ ساتھ ہی خندق کی حفاظت کرنی

ہے کہ دشمن پاٹ نہ دیں۔ دوسری جانب یہود کا خطرہ ہے کہ وہ کسی اور طرف سے مدینہ پر حملہ نہ کر دیں۔ عورتیں بیشک محفوظ مقام پر پہنچا دی گئی ہیں مگر ان کی حفاظت کے لیے بھی ایک مضبوط دستہ رکھنا ہے کہ کہیں ان پر حملہ نہ کر دیا جائے چنانچہ سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہ کو دو سو مجاہدین کے ساتھ ان کی حفاظت کے لیے مامور کر دیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مکتوم رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر کر دیا گیا ہے وہ اگرچہ نابینا ہیں مگر فرائض امارت بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہے۔ مگر ضروری ہے کہ مسلمان ہر وقت ہوشیار اور چوکنا رہیں۔ دیکھئے دشمن کا وہ دستہ آگے بڑھ رہا ہے کہ خندق پاٹے۔ گھوڑوں پر سوار نوجوانوں کا دستہ اس تاک میں ہے کہ خندق کو پھاند لے۔ وہ اس طرف عقب کی جانب پتھروں کی بارش ہو رہی ہے۔ وہ بائیں جانب دشمنوں کے قدر انداز تیروں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں۔ پورا دن اسی تگ و دو اور دیکھ بھال میں گذر گیا۔ ظہر کا وقت آیا اور نکل گیا۔ عصر کا وقت بھی یونہی گذر گیا۔ مغرب بعد جب تک اجالا رہا یہی سلسلہ رہا۔ اب سب طرف اندھیرا ہو گیا ہے۔ اب کچھ دشمن ہٹا ہے تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع ملا ہے کہ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں پڑھ سکیں۔ یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آ رہے ہیں۔ دشمنوں پر برستے ہوئے کہ خدا ان کو برباد کرے۔ اتنا وقت بھی نہیں مل سکا کہ عصر کی نماز ادا کر سکوں۔ یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔

یہ دن کا ماجرا تھا رات کا وقت ہے۔ آدھی رات سے زیادہ گذر گئی ہے۔ سردی اور ٹھنڈی ہوا نے ہوش بگاڑ رکھے ہیں۔ اچھا ایک مقام ایسا ہے جہاں خندق کی چوڑائی کم ہے۔ یہاں سے خطرہ ہے کہ دشمن اسے پھاند لے۔ یہاں ایک چھوٹا سا خیمہ ہے وہ اسی لیے کہ اس مخدوش مقام کی حفاظت ہوتی رہے۔

اس خیمہ میں کون ہے؟

یہ وہی صاحب المعراج فخر موجودات ہیں جن کی پرواز عرش معلی تک ہوتی ہے جہاں پہنچ کر رب ذوالجلال سے راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ اسی رحمت عالم محبوب رب العالمین نے اس سب سے زیادہ مخدوش مقام کی حفاظت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ وعلی اصحابہ اجمعین۔

یہ خیمہ میں ایک خاتون بھی ہیں۔ یہ کون ہیں۔ یہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غمگسار خادمہ اور اہلیہ محترمہ۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خیمہ سے باہر تشریف لاتے ہیں۔ گشت لگاتے ہیں۔ سردی سے ٹھٹھر کر خیمہ کے اندر پہنچتے ہیں تو عائشہ صدیقہ لحاف ڈال کر دباتی ہیں کہ گرمائی آ جائے۔

خدا جانے کتنی راتیں گذر گئیں۔ نیند پوری نہیں ہوئی۔ آج نیند کا غلبہ ہے۔ کوئی جاں نثار ہے جو پہرہ پر کھڑا ہو جائے تاکہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اطمینان سے آرام فرمائیں۔

رسول خدا۔ خادم حاضر ہے۔ کون۔ میرا نام ہے سعد۔

یہ اس طرف کچھ آہٹ ہے۔ کوئی ہے جو وہاں جا کر دیکھئے۔

بندہ حاضر ہے۔ کون۔ عباد بن بشر۔

یہ ایک دستہ کے سردار ہے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کی حفاظت کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خندق کھودنے میں برابر کے شریک بلکہ بسا اوقات مشکل کشا رہے یہی شان آپ کی ان ایام میں بھی ہے جب دشمن سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت و قیادت مسلم۔ صرف قانونی اور آئینی طور پر بلکہ دھڑکتے ہوئے دلوں کے مضطرب اور بے چین جذبات اس قیادت و سیادت پر قربان ہو رہے ہیں۔ مگر قائد وہ ہے جس کا جذبہ شفقت احساس قیادت پر غالب ہے۔ ماں باپ کے دلوں میں وہ شفقت نہیں ہو سکتی جو اس قائد کی شفقت اپنی امت پر ہے جس کی تپش سے اس کا قلب منور ہمیشہ پرسوز رہتا ہے۔

دنیا کا کون سا باپ ہے جس کی شفقت کی شہادت کتاب اللہ نے دی ہو۔ مگر یہ قائد مشفق وہ ہے کہ عرش اعظم کا خالق و مالک اس کی شہادت دے رہا ہے۔

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَحِيمٌ (سورہ توبہ آخری آیات)

"(تمہاری تکلیف اس کی تکلیف) جو تمہیں ناگوار وہ اس کے لیے باعث زحمت۔

تمہارے نفع کا لالچی اہل ایمان کے لیے بہت بڑا مشفق بہت بڑا مہربان۔"

یہی سورہ احزاب جس میں اس غزوہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے اسی سورت کے پہلے رکوع کی ایک آیت ہے۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ "نبی سے لگاؤ ہے مسلمانوں کو زیادہ اپنی جان سے۔"

اس کا مطلب اہل ایمان کے لیے تو یہ ہے کہ جب بھی نفسانی تقاضے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد میں مقابلہ کی صورت پیدا ہو۔ نفس کا تقاضا کچھ ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس کے مخالف ہو تو ایک صاحب ایمان پر لازم اور فرض (۱۱۸) ہے کہ وہ نفس کے تقاضے کو چھوڑے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی تعمیل کرے لیکن کیا ٹھکانا ہے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و رافت کا کہ آپ نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے اپنے حق میں اس آیت کے معنی یہ لیے:

ایما مومن ترک مالا فیرثه عصبته من کانوا فان ترک دینا اوضیاعا فلیاتنی انا مولاه

(ترجمہ) جو مسلمان مال چھوڑ کر وفات پائے تو اس کے عصبہ جو بھی ہوں گے وہ اس کے وارث ہوں گے اور جس نے وفات کے بعد قرض چھوڑا یا یتیم بچے چھوڑے جن کا کوئی سہارا نہیں ہے تو وہ میرے پاس آئیں میں ان کا مولیٰ، ولی اور ذمہ دار ہوں۔

اسی دوطرفہ الفت کا یہ تماشا ہے کہ عباد بن بشیر ایک دستہ لیے ہوئے خیمہ مبارک کی حفاظت کر رہے ہیں۔ لیکن قائد ہے کہ اس کو احساس قیادت اور جذبہ شفقت چین نہیں لینے دیتا ہے۔ وہ بار بار خیمہ سے نکلتا ہے، سب

طرف گھومتا ہے، ہر ایک کا خیال رکھتا ہے اور جب سردی سے ٹھٹھر جاتا ہے تو خیمہ میں آتا ہے جہاں عائشہ صدیقہ کی جاں نثاری اس پر لحاف ڈالتی ہے۔ بدن دباتی ہے کہ ٹھٹھر دور ہو کچھ گرماہٹ آئے۔

یہی رؤف رحیم جو کمانڈر اور فیلڈ مارشل بھی ہے ایک شب کو ضرورت محسوس کرتا ہے کہ دشمن کی فوج کا بھید معلوم کیا جائے۔ ارشاد صادر ہوتا ہے۔ کون ہے جو دشمن کی خبر لے کر آئے۔

جاں نثار حاضر ہے یا رسول اللہ۔ کون؟۔ زبیر۔

دوسری اور تیسری مرتبہ یہی ارشاد ہوتا ہے اور ہر مرتبہ پہل کر کے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں۔ حضرت زبیر تشریف لے جاتے ہیں اور پوری ہشیاری اور بیدار مغزی سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔

اسی طرح ایک شب کو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ آپ دشمن کی فوج میں جاتے ہیں۔ ابوسفیان اپنے خاص مجمع میں کوئی بات کہنا چاہتا ہے لیکن اندھیری رات ہے۔ ہوا تیز چل رہی ہے کوئی روشنی ٹھیرتی نہیں ہے۔ خطرہ ہے کوئی جاسوس یہاں موجود ہو اور وہ راز معلوم کر لے۔ لہٰذا ہدایت کرتا ہے کہ ہر شخص اپنے برابر کے آدمی کا ہاتھ پکڑ لے اور تحقیق کر لے کہ وہ کون ہے۔

اب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حاضر حواسی کی جتنی داد بھی دی جائے کم ہے۔ یہ فوراً اپنے برابر والے کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں بتا کون ہے؟ وہ گھبرا کر جواب دیتا ہے: سبحان اللہ! مجھے نہیں جانتے، میں فلاں بن فلاں ہوں، فلاں قبیلہ کا، فلاں مقام کا۔ یہ چیکنگ ختم ہوتی ہے، ابوسفیان تقریر کرتا ہے، اپنی پریشانیاں اور ناکامیاں ظاہر کرتا ہے اور روانگی کی تجویز پیش کرتا ہے۔ اس پر بحث ہوتی ہے۔ پھر یہ خفیہ اجلاس ختم ہوتا ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اپنے لشکر میں واپس پہنچتے ہیں، خیمہ میں داخل ہوتے ہیں، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نوافل پڑھ رہے ہیں۔ جب سلام پھیرتے ہیں تو حضرت حذیفہ روئداد سناتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

مگر فوراً ہی ارشاد ہوتا ہے۔ حذیفہ تم ٹھٹھر گئے، آؤ آرام کر لو، حضرت حذیفہ کو لٹاتے ہیں، اپنا لحاف جو اوڑھے ہوئے ہیں اسی میں حذیفہ کو چھپا لیتے ہیں۔ پائے مبارک حضرت حذیفہ کے سینہ کے پاس رکھ دیتے ہیں کہ گرماس آئے۔

حذیفہ کی قسمت کھل جاتی ہے۔ ایسی نیند آتی ہے کہ صبح کی نماز کے وقت بھی آنکھ نہیں کھلتی۔ سرکار دو عالم کا شفقت بھرا ارشاد ہوتا ہے:

قم یانومان۔ بڑے سونے والے ہو، اب تو اٹھو۔

حضرت حذیفہ کو جب اسی مہم پر رحمتہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم روانہ فرما رہے تھے تو ہدایت فرما دی تھی لا تحدثن شیئا حتی ترجع الی جب تک میرے پاس واپس نہ آ جاؤ کوئی نئی بات کھڑی نہ کر دینا۔

حضرت حذیفہ فرماتے ہیں۔ میں جب غنیم کے لشکر میں پہنچا تو ابوسفیان ایک جگہ آگ کے پاس بیٹھا تاپ رہا تھا۔ وہ بالکل میری سیدھ میں تھا۔ ایک تیر میں اس کا کام تمام ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے کمان درست کر

لی اور نشانہ لگانے کا ارادہ کیا۔ مگر مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد آ گیا کہ کچھ کرمت بیٹھنا لہٰذا میں نے تیر ترکش میں ڈال لیا اور کسی کو کچھ نہیں کہا۔

یہود بنو قریظہ:

سلسلہ کلام میں اب تک یہود کا تذکرہ نہیں آیا۔ چند صفحات کے بعد آپ ان کا تذکرہ ملاحظہ فرمائیں گے۔ البتہ اس غزوہ کے سلسلہ میں بنو قریظہ کا تذکرہ ضروری ہے اس کے بغیر یہ بیان نا تمام رہ جاتا ہے اور شدت مقابلہ اور نزاکت حالات کی پوری تصویر سامنے نہیں آتی۔

مدینہ منورہ کے قریب جو یہود آباد تھے ان میں بنو قریظہ بھی تھے۔ یہ بہت خوش حال قبیلہ تھا اور نقشہ میں ظاہر کیا جا چکا ہے کہ مشرقی لابہ (سنگلاخ) کے کنارے پر جنوبی مشرقی گوشہ میں یہ قبیلہ آباد تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیے ہوئے تھا۔ جس کی رو سے ان پر فرض تھا کہ مسلمانوں کی مدد کریں اور ان کے ساتھ ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ مگر یہود بنی نضیر کے سردار جو اس متحدہ محاذ کے بانی تھے جنہوں نے قریش مکہ اور غطفان وغیرہ عرب کے نامور قبائل کو آمادہ جنگ کیا تھا وہ بنو قریظہ کو کب بخش سکتے تھے۔ چنانچہ حیی بن الخطب (بنو نضیر کا سردار) اس قبیلہ میں پہنچا، کعب بن اسد بنو قریظہ کا سردار تھا۔ وہ اپنی گڑھی میں دروازہ بند کیے بیٹھا تھا۔ پہلے تو اس نے حیی بن اخطب سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو میں نے بات کا پکا اور وعدہ کا سچا پایا اس سے بدعہدی ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن جب حیی بن اخطب نے کہا کہ اس مرتبہ پورا عرب امنڈ آیا ہے۔ بے انتہا فوج ہے۔ محمد کی کامیابی ناممکن ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اس کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ مسلمانوں سے دشمنی اور نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے اور متحدہ محاذ میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے تحقیق اور اتمام حجت کے لیے حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہما) کو بھیجا اور فرمادیا کہ اگر بات سچی ہے تو وہاں سے آ کر مجھے اشارہ سے بتا دینا تاکہ لوگوں میں بددلی نہ پھیلنے پائے۔

یہ دونوں صاحب گئے۔ کعب بن اسد اور سرداران بنو قریظہ سے بات کی۔ ان کو معاہدہ یاد دلایا۔ مگر ان پر مخالفین کا جادو چڑھ چکا تھا۔ سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔ بڑی تلخی سے جواب دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم نہیں جانتے کہ محمد کون ہے اور معاہدہ کیا ہے۔

بنو قریظہ کی اس غداری نے حالات کی نزاکت انتہا کو پہنچا دی۔ دشمن اب تک اپنے مرکزوں سے دور ایک کھلے میدان میں تھے اب ان کو مدینہ سے متصل ایک قلعہ مل گیا۔ ادھر مدینہ کی حفاظت کے لیے جو نقشہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جمایا تھا اس میں رخنہ پڑ گیا۔ اس کے علاوہ قدرتی بات تھی کہ دشمنوں کے حوصلے بلند ہوئے اور مسلمانوں کو ایک دھکا لگا۔ مگر:

''دشمن چہ کند چوں مہرباں باشد دوست'' (ابن ہشام)

خودداری اور حمیت اسلامی:

یہ بدعہدوں کی حالت تھی۔ اب وفاداروں کا قصہ سنئے اور سبق لیجئے۔

محاصرے کو کم وبیش تین ہفتے ہو چکے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو اپنی یا اہل وعیال کی فکر نہیں ہے مگر تمام مسلمان آپ کی عیال ہیں ان کی غیر معمولی مشکلات آپ کے لیے پریشانی اور بے اطمینانی کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ تقاضائے تدبر یہ ہے کہ مشکلات میں تخفیف کی جائے اور ساتھیوں کی آزمائش کو جہاں تک ممکن ہو ہلکا کیا جائے۔ غالباً یہی تصور تھا جس نے آنحضرت ﷺ کو ایک پیشکش پر آمادہ کر دیا۔ جس سے دشمن کے محاذ میں خلا پڑ سکتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ غطفان کے سربراہ کے سامنے تجویز رکھی کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی ان کو دے دیا جائے گا اگر وہ جنگ سے دست کش ہو جائیں۔ غطفانی سردار نے اس کو پسند کیا چنانچہ ایک مسودہ قلم بند کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اثناء میں انصار کے سربراہ حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہما) سے بھی مشورہ ضروری سمجھا۔ ان دونوں نے یہ تجویز سنی تو نہایت ادب سے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں لیکن اگر حضرت کی رائے ہے تو گذارش یہ ہے کہ زمانہ کفر میں جب ہم اور وہ شرک کی نحوست میں مبتلا تھے۔ رب حقیقی کی عبادت سے ناآشنا غیر اللہ کے آستانوں پر پیشانیاں رگڑا کرتے تھے تب بھی کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک چھوارہ بھی بطور خراج وصول کر سکے۔ اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی عزت بخش دی ہے۔ آپ کے طفیل میں ہمارا وزن اور وقار بڑھ گیا ہے کس طرح ممکن ہے کہ ہم ان کو خراج ادا کریں۔ ہم ایک حبہ بھی بطور خراج نہیں دیں گے ہم ایک ہی چیز پیش کر سکتے ہیں۔ یعنی فیصلہ کن تلوار۔

آنحضرت ﷺ نے یہ استقلال ملاحظہ فرمایا تو دعا دی۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مسودہ کا کاغذ لے کر تمام عبارت مٹادی اور قبیلہ غطفان کے کچھ نمائندے جو یہاں موجود تھے ان سے کہا کہ جو کچھ تم سے ہو سکے کر دکھاؤ (سیرت ابن ہشام)

مقابلہ:

پہلے یہی ہوتا رہا کہ دشمن کی فوج تیر اور پتھر برساتی رہتی تھی۔ مسلمان اپنا تحفظ کرتے ہوئے جواب دیتے رہتے تھے۔ پھر طے ہوا کہ حملہ قاعدہ سے ہونا چاہیے۔ پوری فوج کا ایک سردار ہو۔ اس کی ہدایت کے مطابق اقدام ہو۔ چنانچہ ابوسفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص ضرار بن الخطاب، جبیرہ۔ جرنیل مقرر کئے گیے۔ ہر ایک کا ایک ایک دن مقرر کر دیا گیا۔ ہر ایک جنرل باری کے دن پوری فوج لے کر لڑتا تھا لیکن کامیابی اس صورت میں بھی نہیں ہوئی۔ یہ فوجیں خندق عبور نہیں کر سکیں۔ تیروں اور پتھروں کی بارش برسانے میں محنت ضرور کرنی پڑتی

تھی مگر فائدہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اب مجبوراً طریق جنگ پر نظر ثانی کرنی پڑی اور فیصلہ کن حملے کی صورت یہ طے کی گئی کہ نامور بہادر گھوڑے پار کر کے مسلمانوں کے جتھوں میں پہنچیں اور وہیں ان کو موت کے گھاٹ اتاریں۔

اتفاق سے ایک جگہ عرض کم تھا (بقول ابن ہشام کوہ سلع کے دامن میں تھا)۔ عرب کے مشہور بہادر ضرار بن جبیر، نوفل، عمر بن عبدود نے گھوڑوں کے ایڑ لگائی تو وہ تڑپ کر اس پار تھے۔ مسلمان فوراً آگے بڑھے اور ان کو وہیں گھیر لیا۔ محمد رسول اللہ (روحی فداہ) ان کے قائد تھے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس زمانے کے قاعدہ کے مطابق پہلے ایک ایک کا مقابلہ ہوتا تھا۔ پھر گھمسان کی لڑائی ہوتی تھی۔ ان پھاندنے والوں میں عمرو بن عبدود تنہا ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ جنگ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک بدلہ نہ لے لوں گا سر میں تیل نہیں ڈالوں گا۔ اتفاق سے جنگ احد کے موقع پر آ نہیں سکا تو اس وقت انتقام کی بھوک میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح یہاں پہونچا اور غرانے لگا۔ مائی کا لال کون ہے جو مقابلہ پر آئے۔

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سامنے تھے فوراً جواب دیا۔ میں ''علی''

عمرو۔ کہنہ مشق بہادر۔ نوے سال کی عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نوجوان۔ عمر تقریباً ۱۴ سال گویا منہ کی رال بھی نہیں جھڑی تھی۔ خود آنحضرت ﷺ کو حیرت ہوئی۔ فرمایا میاں علی جانتے ہو۔ کون ہے۔ عمر بن عبدود ہے۔ حضرت علی بیٹھ گئے۔ عمرو نے دوبارہ للکارا اب بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہل کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرتبہ بھی اجازت نہیں دی۔ تیسری مرتبہ بھی یہی صورت ہوئی عمرو بن عبدود کے چیلنج کو سب سے پہلے حضرت علی رضی عنہ نے منظور کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا۔

عمرو بن عبدود کا قول تھا کہ جو کوئی قریشی میرے سامنے دو باتیں پیش کرے تو ایک ضرور مانوں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو سے دریافت کیا۔ کیا واقعی تمہارا یہ عہد ہے۔

عمرو نے جواب دیا۔ بے شک

حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ تم اسلام قبول کرلو۔

عمرو بن عبدود۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت علی۔ اچھا پھر مقابلہ۔

عمرو بن عبدود۔ برادر زادے میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا۔

حضرت علی۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تمہیں قتل کروں۔

اس پر عمرو کو تاؤ آ گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ نیچے اتر آیا اور تلوار نکال کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھرپور وار کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ڈھال سامنے کر دی۔ مگر تلوار ڈھال کو کاٹتی ہوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیشانی پر پہونچی۔

حضرت علی شیر خدا نے پلٹ کروار کیا تو تلوار حیدری عمرو کے مونڈھے کو کاٹتی ہوئی نیچے تک پہنچ گئی اور یہ ایک ہزار سواروں کی طاقت رکھنے والا بہادر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ عمرو زمین پر گرا تو اس کا گھوڑا خندق پھاندتا ہوا اس طرف پہنچ گیا۔

عمرو کے بعد ضرار اور جبیرہ نے حملہ کیا۔ مگر حملہ حیدری کی تاب نہ لا سکے۔ پیٹھ دے کر بھاگے۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے ضرار کا تعاقب کیا۔ ضرار نے مڑ کر حضرت عمر ؓ پر برچھے کا وار کیا مگر ناکام رہا۔

نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گرا۔ صحابہ نے تیر مارنے شروع کیے۔ اس نے پکار کر کہا۔ مسلمانو میں شریفانہ موت چاہتا ہوں۔ حضرت علی ؓ نے اس کی درخواست منظور کی۔ خندق میں اتر کر اس کا مقابلہ کیا اور ایک ہی ضرب میں اس کا کام تمام کر دیا۔

خطاب ذوالقرنین:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ذوالقرنین بھی کہتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے۔ ایک اسی عمرو کے ہاتھ کا اور ایک ابن ملجم کا جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو زخمی کرنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو گرفتار کیا تھا۔

ایک مخلص کی کامیاب تدبیر:

نعیم بن مسعود اشجعی ایک غطفانی رئیس تھے۔ وہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ آپ کا مخلص خادم ہوں۔ کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کچھ خدمت بتائیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس وقت سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اس مصیبت کو ہٹانے کی کوشش کرو۔ نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں دونوں فریق سے مل کر اپنی صوابدید کے بموجب بات چیت کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آپ کو پوری اجازت ہے۔

اب یہ بات کسی مکر و فریب کی نہیں تھی بلکہ ہر ایک صاحب فہم کے لیے قابل غور تھی کہ قریش کو کامیابی نہ ہوئی اور وہ واپس ہوئے تو بنو قریظہ جو مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی پناہ میں رہتے ہیں ان کا کیا ہوگا۔ کامیابی کا جو یقین پہلے دن تھا جیسے جیسے دن گذر رہے تھے وہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ چوبیس ہزار فوج کا مسلسل انتظام معمولی کام نہیں تھا خصوصاً جب کہ آئے ہوں اس امید اور یقین پر کہ چند روز میں مسلمانوں کا قلع قمع کر دیں گے اور اب حال یہ ہو کہ قلع قمع تو درکنار مسلمانوں تک پہنچنے کے لیے بھی پہلے فرشتہ موت سے پنجہ لڑانا پڑتا ہو۔

کسی سردار کو بطور یرغمال اپنے یہاں رکھ لینے کا رواج عرب میں پہلے بھی تھا اور اس وقت خود بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب نے اس تصور کو زندہ کر دیا تھا۔ کیونکہ پہلے گذر چکا ہے کہ بنو قریظہ اول اول نقض عہد پر راضی

نہیں تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمد سے معاہدہ کیوں توڑیں۔ لیکن حیی بن اخطب نے اسی شرط پر ان کو راضی کیا تھا کہ قریش چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں گا۔

اب محاصرہ کی طوالت اور ناکامی کے آثار نمایاں ہونے کے بعد یہ سوال بھی درپیش تھا کہ کیا حیی بن اخطب کا بنو قریظہ میں آ کر رہنا مفید ہوگا (وہ خود ایک پٹا ہوا مہرہ تھا جو بار بار بازی ہار چکا تھا) یا قریش سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے کسی سردار کو بطور یرغمال بنو قریظہ کے حوالے کر دیں۔ بنو قریظہ کے حلقہ میں جب یہ سوال اٹھا تو ضروری نہیں ہے کہ حضرت نعیم ہی نے اس کو قریش تک پہنچایا ہو۔ بڑی بڑی منظم حکومتوں میں ایسے راز پوشیدہ نہیں رہتے۔ حضرت نعیم بن مسعود اگر قریش میں پہنچے اور انہوں نے اس بحث میں حصہ لیا تو نہ یہ ضروری ہے کہ یہ راز انہوں نے پہونچایا ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ اس کا منشا مکر وفریب ہو۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ قریش کی بہت بڑی حماقت تھی کہ وہ اس موقعہ پر دفعتہً بھاگ گئے، ہوش وحواس اور سیاسی سوجھ بوجھ کا تقاضا تھا کہ جب انہوں نے ناکامی کے آثار دیکھے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ صلح کی طرح ڈالتے۔ وہ رؤف و رحیم جو خود ہی اس کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ بنو غطفان کو مدینہ کی آمدنی کا ثلث دے کر اپنے ساتھیوں (انصار) کو اس آفت سے نجات دلائے۔ اس کی رحیمانہ فطرت قریش کے حق میں بھی ابر رحمت ہی ثابت ہوتی یعنی اگر قریش اس وقت کوئی مصالحانہ اقدام کرتے تو یقیناً توقع سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔ وہ اس معاہدہ صلح میں بنو قریظہ کے لیے پناہ بھی حاصل کر سکتے تھے۔

حضرت نعیم بن مسعود اشجعی جیسے پاک نفس انسان سے یہ توقع بے محل نہیں ہے کہ وہ بنو قریظہ اور قریش کو نزاکت حالات کی طرف توجہ دلا کر معاہدہ صلح پر آمادہ کرنا چاہتے ہوں کیونکہ اب مسلمانوں اور قریش کے بقاء کی صرف یہی صورت تھی۔ چنانچہ اگلے سال حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ صلح ہوا۔ اس وقت بھی صورت حال تقریباً یہی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اس وقت یعنی احزاب کے موقع پر قریش مکہ سے مدینہ آئے تھے اور صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان مکہ پہنچے تھے مگر احزاب میں قیادت ان کے ہاتھ میں تھی جو عداوت دشمنی اور ظلم وعناد کے سبب اپنی سمجھ بوجھ اور عقل وفہم سب کچھ کھو چکے تھے اور حدیبیہ میں قائد وہ تھا جس کے معمولی اشاروں سے عقل وفہم اور عدل و انصاف کے چشمے پھوٹتے تھے اور جس کے ناخن تدبیر سے عقدے حل ہوتے تھے۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ جب ناکامی کے آثار نمایاں ہونے لگے تو یہ سوالات دونوں طرف اُبھرے بنو قریظہ نے حیی بن اخطب کی ضمانت کو ناکافی سمجھ کر قریش سے ضمانت لینی چاہی اور قریش نے اس کو اپنی توہین سمجھا یا وہ اتنے غیر مطمئن تھے کہ ضمانت دینے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ ان سوالات کے پیدا ہونے اور ابھرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ متحدہ محاذ کے حلقوں میں بددلی کے ساتھ بدگمانی بھی پھیل گئی۔ کچھ راویوں نے اس قدرتی بات کو جو حالات کی نزاکت اور پیچیدگی کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت نعیم بن مسعود اشجعی رضی اللہ عنہ کی طرف اس طرح منسوب کیا کہ گویا انہوں نے اس موقع پر مکر وفریب، تفرقہ اندازی اور آپس میں پھوٹ ڈالنے کی خدمت

انجام دی اور اس کے جواز کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی الحرب خدعۃ کا حوالہ پیش کر دیا۔ حالانکہ نہ الحرب خدعۃ کے یہ معنی ہیں کہ مکروفریب کا اخلاقی جرم جنگ کے وقت جائز ہو جاتا ہے اور نہ حضرت نعیم کے متعلق یہ درست ہے کہ انہوں نے مکروفریب کیا۔ واقعات کی قدرتی رفتار تھی جو سامنے آئی۔

مضحکہ انگیز ہزیمت:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا۔

''مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو۔ جب کہ تم پر فوجیں آ پڑیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہ دیتی تھیں اور اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں کی خبر ہے جو تم کرتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے احسان کا تذکرہ فرماتے ہوئے وہ اسباب بیان فرمائے ہیں جن سے احزاب کو ہزیمت ہوئی۔ ان میں سے ایک سبب وہ تھا جس کے اثرات ظاہر ہوئے مگر نظر کچھ نہیں آیا۔ یہ فرشتوں کا لشکر تھا جس نے انسانی نظروں سے اوجھل ہو کر اپنا کام کیا۔ اس نے احزاب کی ہمتوں کو پست کیا، ان میں دہشت و وحشت اور ایسی بدحواسی پیدا کی کہ آپس کے تمام عہد و پیمان بھول گئے اور اس طرح بھاگے کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ کہاں بھاگ رہے ہو کیوں بھاگ رہے ہو۔ کدھر بھاگ رہے ہو۔

دوسرا سبب جو نظر آیا وہ یہ تھا کہ ایک طوفانی آندھی نے ان کے تمام نظام کو درہم برہم کر دیا۔ خیمے اکھڑ گئے۔ سارا سامان واسباب الٹ پلٹ ہو گیا۔ یہاں تک کہ چولہوں پر جو دیگ چڑھے ہوئے تھے وہ بھی اوندھے ہو گئے۔

مادی اسباب تلاش کرنا چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ موسم سخت تھا۔ توقع سے زیادہ محاصرہ کی طوالت نے رسد ختم کر دیا تھا۔ مزید رسد کی فراہمی مشکل ہو رہی تھی۔ پھر بنو قریظہ اور قریش میں آپس میں بدگمانی پھیل گئی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ صنادید قریش اور زعماء عرب جن کو اپنے عقل و تدبر پر ناز تھا وہ کوئی ایسی تدبیر کیوں نہیں سوچ سکے کہ پسپائی شاندار ہوتی، سرزمین عرب میں کچھ بھرم رہ جاتا، بنو قریظہ بھی بے پناہ نہ رہ جاتے وہ یک لخت اتنے بدحواس ہو کر کیوں بھاگے کہ ایک دوسرے کی بات بھی نہ پوچھ سکا۔ یہ سب وہی تھا جس کا شکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع پر کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ جملے آپ کے ورد زبان تھے جو اکثر موقع پر لسان مبارک سے صادر ہوتے رہتے تھے (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے سلسلہ میں نقل کیے جاتے ہیں)۔

لا اله الا الله وحده انجز وعده ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده

''اکیلے اور تنہا اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنے بندے کی مدد

فرمائی اور تن تنہا تمام احزاب کو بھگا دیا۔''

سفر (۱۲۰) سے واپسی پر جو دعا پڑھتے اس کے آخری الفاظ یہ ہوتے تھے۔

صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ

خواتین کا حوصلہ:

خواتین کو اسی علاقہ میں جس طرف باغات تھے محفوظ مقام پر پہونچا دیا گیا تھا لیکن جب بنو قریظہ نے غداری کی تو یہ محفوظ قلعہ بھی مخدوش ہو گیا۔ چنانچہ یہودیوں نے اس طرف سے اقدام شروع کر دیا۔ ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا۔ ظاہر ہے یہ جاسوسی کی خدمت انجام دیتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ نے اس کو بھانپ لیا یہاں مردوں میں صرف حضرت حسان رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق صادق تھے مگر دل کے دورہ نے ان کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اسی وجہ سے ان کو یہاں رکھا گیا تھا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے پہلے حضرت حسان کو توجہ دلائی مگر جب انہوں نے معذرت کی تو خود پھاٹک پر پہونچیں اور خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ کر اچانک یہودی کے سر پر اس زور سے رسید کی کہ اس کے سر کا بھیجہ نکل گیا اور وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

اب حضرت صفیہ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس کے کپڑے اور ہتھیار اتار لو مگر حضرت حسان مردہ لاش کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے پھر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اس یہودی کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دیا۔ اب یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ قلعہ میں کوئی فوج متعین ہے۔ پھر انہوں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔

معجزات:

(۱) خندق کھودتے ہوئے ایک چٹان نکل آنے کا واقعہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جس کا اختصار یہ ہے کہ صحابہ کرام تھک گئے تو مرجع عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا۔ آپ نے بسم اللہ کہہ کر ایک مرتبہ کدال ماری تو چٹان کا ایک تہائی حصہ ٹوٹ گیا اور ایک روشنی نمودار ہوئی اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ اکبر فرمایا جیسے حیرت کے وقت اللہ اکبر کہا کرتے ہیں پھر دوسری مرتبہ بسم اللہ کہہ کر کدال ماری چٹان کا ایک حصہ اس مرتبہ ٹوٹ گیا اور اسی طرح کی روشنی نمودار ہوئی اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح اللہ اکبر فرمایا جس پر صحابہ نے بھی اللہ اکبر کہا پھر تیسری مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ فتح الباری کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے کدال مارتے ہوئے یہ رجز بھی ارشاد فرمایا۔

بسم اللہ بدینا وبو عبدنا غیرہ شقینا فحبذا ربا وحب دینا

''اللہ کے نام سے شروع کر رہے ہیں اور اگر غیر اللہ کی عبادت کرتے تو ہم شقی اور بدبخت ہو جاتے پس کیسا اچھا ہے رب اور کس قدر پیارا ہے دین۔''

بہر حال جب اس مہم سے فراغت ہوئی تو صحابہ نے اس روشنی کے نمودار ہونے اور اس پر حیرت کے انداز میں زبان مبارک سے اللہ اکبر صادر ہونے کی وجہ دریافت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی مرتبہ روشنی نمودار ہوئی تو شام کی کنجیاں مجھے دے دی گئیں اور میں نے اس روشنی میں شام کے محلات دیکھے پھر دوسری مرتبہ روشنی نمودار ہوئی تو فارس کی کنجیاں مجھے عنایت کر دی گئیں اور مدائن (پایہ تخت فارس) کے سفید محل مجھے نظر آئے تیسری نمودار ہوئی تو یمن کی کنجیاں میرے سامنے تھیں۔

اس پر صحابہ کرام کے ایمان پختہ ہوئے اور منافقوں نے مذاق اڑایا کہ مصیبت سر پر ہے دشمن سب طرف چھایا ہوا ہے۔ گھر میں کھانے کو نہیں۔ پیٹوں پر پتھر بندھے ہوئے ہیں اور دعوے ہیں شام اور فارس کی فتوحات کے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو اختصار سے نقل کیا ہے۔ یہ تفصیل نسائی شریف سے ماخوذ ہے۔
(بروایت براء بن عازب)

(۲) امام بخاری کی روایت کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ یہی حضرت جابر چٹان توڑنے کے واقعہ کو نقل کرنے کے بعد بیان فرماتے ہیں:

تین دن ہو گئے تھے کھانا چکھنے کو بھی نہیں ملا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے (اپنے گھر ہو آؤں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی۔ میں گھر پہونچا، میں نے بیوی سے کہا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک پر نظر پڑی تو بھوک [۱۲۱] کے آثار تھے (فاقہ سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں) کیا تمہارے پاس کچھ ہے۔ اہلیہ محترمہ نے جواب دیا۔ ہاں کچھ جو ہیں ایک بکری کا بچہ ہے جو ذبح کیا جا سکتا ہے۔ آپ جایئے ہمارے سرتاج آقاء دوجہاں کو بلا لایئے (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اتنے آٹا پیس کر روٹی پکاتی ہوں۔ ساتھ ہی بکری کا بچہ ذبح کیا اور ہنڈیا چولھے پر چڑھادی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور میں نے چپکے سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کچھ تھوڑا سا کھانا ہے۔ حضور والا تشریف لے چلیں اور ایک دو آدمیوں کو ساتھ لے لیں سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔ کتنا کھانا ہے۔ میں نے کہا۔ تقریباً ایک صاع [۱۲۲] جو ہیں اور بکری کے بچہ کا گوشت ہے ارشاد ہوا کثیر طیب (بہت ہے بہت عمدہ ہے) پھر آپ نے اعلان فرمادیا۔ جابر نے خندق کھودنے والوں کی دعوت کی ہے وہاں چلئے

میں پریشان تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک ہی تو صاع جو ہیں ارشاد ہوا تم گھر جاؤ اور گھر میں کہہ دو جب تک میں پہنچ نہ جاؤں پتیلا چولہے سے نہ اتاریں اور روٹی پکانی بھی شروع نہ کریں۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ہدایت فرمادی کہ کچھ برتن دوسروں کے یہاں سے منگا لینا۔ [۱۲۳]

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے اور تمام جماعت جس کی تعداد اس وقت ایک ہزار کے قریب

تھی پیچھے پیچھے۔ میرے غریب خانہ کی طرف روانہ ہوئے۔ میں آگے بڑھ کر گھر پر پہنچا۔ بیوی سے کہا۔ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں بلکہ جتنے بھی وہاں موجود تھے آپ نے سب ہی کو دعوت دے دی ہے۔ سب ہی آ رہے ہیں۔ بیوی کچھ پریشان ہوئیں۔ ایک روایت میں ہے لڑنے لگیں کہ تم مجھے رسوا کرو گے۔ پھر کہا۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے پوچھا تھا کہ کتنا سامان ہے اور کیا آپ نے بتا دیا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ اس پر بیوی نے کہا۔ جب آپ سب کچھ بتا چکے ہیں تو اب اللہ جانے اور اس کا رسول جانے۔[۱۲۴] (ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے) ہاں ایسا انتظام کر دیجئے کہ بھیڑ نہ ہو۔ یہ حضرات ترتیب وار تشریف[۱۲۵] لاتے رہیں۔ حضرت جابر فرماتے ہیں (رضی اللہ عنہ) بیوی کے اس جواب سے مجھے تسکین ہوئی اور میری ڈھارس بندھ گئی۔

اب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پتیلے کو نہیں کھولا۔ اس کو اسی طرح بند رہنے دیا۔ ایسے ہی آٹے کو بھی چھپا دیا۔ (یعنی اس کے اوپر کپڑا ڈال دیا) اور فرمایا اب روٹی پکانا شروع کرو اور کسی اور کو بھی بلا لو کہ ساتھ ساتھ پکاتی رہے اور تنور پر لگاتی رہے۔

تنور میں نان لگ رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نان کو دست مبارک میں لیتے اور پتیلے کے ڈھکن کے نیچے سے گوشت نکال کر روٹی پر رکھتے اور صحابہ کرام کو تقسیم فرماتے جاتے تھے۔

یہ ایک ہزار کی تعداد جو ساتھ آئی تھی تھوڑی دیر میں شکم سیر ہو گئی پھر بھی کھانا بچ رہا تو حکم ہوا کہ خود کھاؤ اور لوگوں کے یہاں بھیج دو۔ سب ہی بھوکے ہیں۔ چنانچہ دن بھر یہ سلسلہ جاری رہا اور آٹا اور گوشت جتنا تھا اتنا ہی رہ گیا۔

نصرت، مطالبہ صبر اور معجزہ:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (سورہ حج)

''اور اللہ ضرور مدد کرے گا اس کی جو اس کی مدد کرے۔ بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا ہے غلبہ والا ہے۔''

نیز ارشاد ہے:

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (سورہ مومن ع ٦)

''بیشک ہم مدد کرتے رہتے ہیں اپنے پیمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگی میں بھی اور اس روز بھی جب کھڑے ہوں گے گواہ۔'' (سورہ مومن ع ۵)

ایک طرف یہ نصرت کے پختہ وعدے ہیں۔ دوسری جانب اس طرح کے معجزے کہ کدال کی ضرب سے

چٹان شق ہوگئی۔ سوا تین سیر جو کا آٹا ایک ہزار تہی شکموں کے لیے کافی ہوگیا جن کو تین روز سے ایک لقمہ بھی میسر نہیں تھا۔ اگر نبی اس طرح کا تصرف کر سکتے ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم نبی کو یہ طاقت اور یہ کمال بخش دیتا ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ ایک مہینہ تک (غزوہ خندق میں) مصائب جھیلے جا رہے ہیں، سختیاں برداشت کی جارہی ہیں، پریشانیوں کا ہجوم ہے، سخت ترین کش مکش جاری ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخصوص نصرت سے یا نبی نے اپنی قوت روحانی سے پہلے ہی دن دشمن کو شکست کیوں نہیں دی اور اس طرح کی نصرت اور قوت باطنی کے ہوتے ہوئے دشمن کو ہمت ہی کیسے پڑی کہ وہ ہجوم کر کے آیا۔ اس طرح کے سوالات سے بسا اوقات معجزوں کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ ایسے سوالات کا جواب مختصر بھی دیا جا سکتا ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ حقائق پیش کریں اور ان کی روشنی میں جواب دیں۔

(۱) کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ یہاں ہر نتیجہ کے لیے سبب ہوتا ہے موت بھی آتی ہے تو سبب کا نتیجہ بن کر۔ یہاں ترقی کے بھی اسباب تلاش کیے جاتے ہیں اور کوئی تنزل بھی بے وجہ نہیں مانا جاتا۔

قدرت نے ایک قانون بنا رکھا ہے جس کا فیض ہر ایک کے لیے یکساں ہے۔ کافر ہو یا مسلمان نیکوکار ہو یا بدکار جو اسباب مہیا کر لے گا وہ اس کے نتائج سے بہرہ اندوز ہو جائے گا۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (سورہ بنی اسرائیل)

''ہم ہر ایک کی امداد کرتے ہیں ان کی بھی ان کی بھی (مؤمن و متقی کی بھی کافر و شقی کی بھی) اور آپ کے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں۔''

ہوا، پانی، سورج کی گرمی، چاند کی ٹھنڈک، حیوانی اور نباتاتی موجودات وغیرہ وغیرہ سے جس طرح مومن نفع اٹھا سکتے ہیں تجربات اور ترقی پذیر ایجادات کر سکتے ہیں اسی طرح کافر اور شدید ترین منکرین بھی ان سے بے دریغ نفع اٹھا رہے ہیں اور کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ بخشش پروردگار کے دروازے ان پر بند نہیں ہیں۔

اس کارگاہ ہستی اور کارخانہ اسباب میں انسان کو پیدا کیا گیا کہ وہ اسباب مہیا کرے اور ان کے نتائج حاصل کرے۔

اب یہ کہ وہ کن نتائج کو اپنا نصب العین بنائے اور کن نتائج کے لیے اسباب فراہم کرے۔ یہ بہت اہم سوال ہے مگر انسان کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (سورہ بلد) ''اور بتا دیئے ہم نے اس کو دونوں راستے۔'' (۱۲۶)

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (سورہ کہف ع ۴)

''آپ کہہ دیجئے حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا ہے پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔''

وَالَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورہ ملک ع ۱)

''وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ عمل میں کون بہتر ہے۔''
یعنی انسان ایک حقیقت جاوداں ہے جس کی داستان روز ازل سے شروع ہوتی ہے اور زندگی کا یہ دور آزمائش اور امتحان کے لیے ہے انسان کو اچھے برے کا اختیار دیا جاتا یہ بھی آزمائش وامتحان ہے۔
(۳) اس عالم اضداد اور اس رزمگاہ نفی واثبات میں جہاں ہر وقت مثبت اور منفی کا تصادم جاری ہے جس طرح گرمی اور سردی، سیاہی اور سپیدی، روشنی اور تاریکی پیدا کی گئی۔ اسی طرح عالم معنی میں وہ دو حقیقتیں بھی پیدا کی گئیں جن کو حق اور باطل کہا جاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روشنی اثبات ہے اور تاریکی نفی، روشنی نفع ہے اور تاریکی سراسر نقصان اور زیاں، روشنی اس لیے ہے کہ باقی رہے ترقی کرے اور تاریکی اس لیے ہے کہ اس کو ہٹایا جائے اور مٹایا جائے تو ٹھیک اسی طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حق نام ہے اثبات کا یعنی اس کا جو ہمیشہ سے ہے۔ ہمیشہ رہے گا اور وہ اسی لیے ہے کہ رہے بڑھے اور ترقی کرے۔ کیونکہ حق کے معنی ہی ہیں ثابت وقائم۔ اٹل انمٹ اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حق سراسر نفع ہے بلکہ وہ انفع ہے اور اگر دنیا میں بقاء صلح اور بقاء امن کا قانون نافذ ہے اور وہی باقی رکھا جاتا ہے جو زیادہ کارآمد زیادہ نفع بخش ہوتا ہے اور جو بیکار ہو جاتا ہے وہ چھانٹ دیا جاتا ہے۔ اور اس بنا پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس دنیا میں دوام حق ہی کو ہے کیونکہ سراسر نفع اور سراسر خیر حق ہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو باطل ہے اس کا وجود خواہ کتنا ہی بھیانک نظر آئے اور اس کی پرچھائیاں خواہ کتنی ہی گہری معلوم ہوں مگر وہ صرف پرچھائیاں ہیں۔ کیونکہ خود باطل ایک پرچھائیں ہے۔ درخت کی پرچھائیں کبھی درخت سے بھی بڑھ جاتی ہے مگر ظاہر ہے وہ پرچھائیں ہے حقیقت کچھ بھی نہیں ہے محض فریب نظر ہے۔ جیسے ہی روشنی آئے گی یہ پرچھائیں ختم ہو جائیں گی۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (سورہ اسراء)

''حق نمودار ہو گیا اور باطل نابود ہوا۔ باطل نابود ہی ہونے والا تھا۔''
رو آتی ہے تو اس پر کوڑے کرکٹ اور بسا اوقات پانی کا جھاگ اس طرح چھا جاتا ہے کہ پانی کا وجود بھی نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ سارا وجود نمائشی ہوتا ہے۔ پانی جگہ جگہ تالابوں میں بھر کر مرکز فیض بن جاتا ہے اس سے ایک مدت تک تشنہ لب سیراب ہوتے ہیں باغیچے اور کھیت شاداب ہوتے ہیں اور یہ کوڑا کرکٹ جو سیل رواں پر چھایا ہوا تھا جیسے ہی ہوائیں چلتی ہیں تتر بتر ہو جاتا ہے اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا۔
سنار کھٹائی میں سونا ڈال کر اس کو تاپتا ہے۔ بیشک سونے کے لیے ابتلاء عظیم ہے۔ اس کا وجود پگھل کر پانی ہو جاتا ہے۔ مگر باقی رہنے والا جس کی قدر و قیمت دنیا کی ہر ایک متاع سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ یہی سونا ہوتا ہے۔ میل کچیل جو اس پر چھایا ہوتا ہے سنار جب بھٹی کی راکھ نکال کر پھینکتا ہے اسی کے ساتھ اس میل کو بھی خاکروب کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُوْنَ عَلَيْهِ

فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (سورہ رعدع ۲)

''(اللہ تعالیٰ نے) آسمان سے پانی اتارا جس سے وادیاں اپنی سمائی کے مطابق بہ نکلیں۔ پھر وہ سیلاب جھاگ کو اوپر لے آیا اور جن چیزوں کو آگ کے اندر تپاتے ہیں زیور یا اور سامان بنانے کی غرض سے اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہے (میل کچیل ہے جو اوپر آ جاتا ہے) اسی طرح حق و باطل کی مثال اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے پس جھاگ تو نکما ہو کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے کارآمد (نفع بخش) ہے سو وہ زمین میں (دنیا میں) رہ جاتی ہے اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں بیان کیا کرتا ہے۔''

(۴) لیکن بہت بڑی مشکل اور بہت زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ حق اور باطل مشاہدہ کی چیزیں نہیں ہیں۔ ہمیں روشنی نظر آتی ہے۔ تاریکی کو بھی ہم دیکھتے ہیں۔ ہماری نظر سیاہ اور سفید میں امتیاز کر لیتی ہے۔ گرمی اور سردی کو ہم دیکھتے نہیں ہیں مگر ہمارا احساس ان کو محسوس کر لیتا ہے۔ شیریں اور تلخ کو ہم چکھ کر معلوم کر لیتے ہیں۔ لیکن حق اور باطل، خیر اور شر، نافع اور مضر نہ ہمیں آنکھوں سے نظر آتا ہے نہ ہم چھو کر یا چکھ کر ان میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ نہ ہمارے کان غلط یا صحیح بات میں کوئی حد فاصل قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں حدیں مقرر ہیں مقرر حد کے اس پار جس کا نام غیب ہے عقل و دانش اور فہم و فراست بھی اسی طرح عاجز اور پا شکستہ رہ جاتی ہے جیسے کسی بعید فاصلے یا ایک خاص مقدار سے زیادہ مہین باریک اور لطیف چیز کو دیکھنے سے ہماری نگاہ عاجز اور درماندہ رہ جاتی ہے اور اس کے لیے دوربین یا خوردبین کی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ فاصلہ پر پہونچ کر دوربین اور خوردبین بھی ناکام ہو جاتی ہے۔ کبھی عقل و فراست ایک فیصلہ کرتی ہے مگر اس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے یرقان زدہ انسان ایک چیز کو زرد دیکھتا ہے حالانکہ وہ سفید ہوتی ہے۔ آپ کے چشمہ کا شیشہ اگر سبز ہو تو ہر چیز ہری نظر آئے گی اور شیشہ کی رنگت کا اگر آپ کو احساس نہ ہو تو آپ یہی یقین کر لیں گے کہ ہر چیز کا قدرتی رنگ سبز ہے۔

ہزاروں نسلیں گذر گئیں انسان یہی سمجھتا رہا کہ اوپر کی طرف جو نظر آ رہا ہے وہ فلک نیلگوں ہے۔ اب بھی انسان ہے اور اسی کا مشاہدہ ہزاروں سال پرانے تصور کی تردید کر رہا ہے۔

انسان کیا ہے، کب سے ہے، کیوں ہے، کب تک رہے گا۔ عقل نارسا آج تک ان سوالات کا صحیح اور دو ٹوک جواب نہیں دے سکی۔

موت مشاہدہ کی چیز ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں اس میں شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں۔ لیکن اس کی حقیقت کیا ہے۔ یہ فنا ہے یا انتقال اگر انتقال ہے تو منتقل ہو کر انسان کہاں جائے گا۔ یہ سب حالات خود انسان کے حق میں بنیادی سوالات ہیں۔ فہم و فراست کا تقاضا ہے کہ اپنے شعور و ادراک کی سب سے پہلی منزل پر سب

سے پہلی فرصت میں ان سوالات کا دوٹوک جواب معلوم کرے۔

تجارت نفع کے لیے کی جاتی ہے۔تاجر نفع ہی کی خاطر اپنا سرمایہ لگاتا ہے۔لیکن جب وہ روپیہ لگا رہا ہے تو کیا نفع کے متعلق کوئی قطعی یقین اس کو حاصل ہے؟

رات دن یہ تماشا ہمارے سامنے آتا ہے کہ نفع کے امیدواروں کو نقصان پلے پڑتا ہے اور بسا اوقات مایوس اور افسردہ زندہ ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں ان میں نئی زندگی کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ جس کے متعلق نقصان کا یقین تھا وہاں اچانک نفع کی شکل نکل آئی۔

ذاتی فائدہ کس میں ہے۔جماعت یا قوم کے لیے کیا مفید ہے۔نوع انسان کے لیے کیا مناسب ہے اور اس پوری کائنات میں جو مقام انسان کو حاصل ہے اس کے لحاظ سے کیا موزوں ہے۔

انسان پیدا کیا گیا۔اس کا مستقبل یقینی۔مگر اس کی نوعیت اور کیفیت قطعاً مشتبہ۔غیر یقینی گہری تاریکی میں۔

یہ یقینی بات ہے کہ آج کے بعد کل آئے گا۔رات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی نمودار ہوگی۔دن کا طول و عرض سامنے آئے گا۔مگر کل کو کیا ہوگا۔کچھ خبر نہیں۔اس صبح کی شام کس حال میں ہوگی۔کچھ پتہ نہیں۔

مختصر یہ کہ نافع، انفع، کارآمد ہمیشہ کے لیے سودمند، یعنی حق اور خیر کے متعلق انسانی عقل قطعی اور دوٹوک فیصلہ نہیں کر سکتی۔ذات، جماعت، قوم اور نوعِ انسان۔ہر ایک کے حق میں حق کیا ہے۔یہ سوال کچھ اس درجہ مشکل ہے کہ عقل انسانی کی بلند پرواز بھی اس کے کناروں کو نہیں چھو سکتی۔یہی دوراہہ ہے جہاں انسانی قافلہ منتشر ہو جاتا ہے۔راستے جدا ہو جاتے ہیں۔

کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ (سورہ بنی اسرائیل) ہر شخص اپنے اپنے طریقے پر کام کرتا ہے۔''

ہر ایک مذہب کہتا ہے کہ انسان فنا کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ ایک ابدی حقیقت ہے جو ابد تک رہے گا۔لیکن اس ابدی حقیقت کے لیے ابد میں کیا چیز مفید ہے ہر ایک مذہب کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ بات عقل نہیں بتا سکتی اس کا جواب میرے ہی ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے یہ مذہب کا قطعی فیصلہ ہے عقل کے بارے میں۔مگر عجیب بات ہے عقل و دانش کے بارے میں یہ متفقہ فیصلہ صادر کرنے کے بعد مذہب خود مختلف ہو گیا۔خود اپنے اندر اتحاد اور اتفاق نہیں رکھ سکا۔یہاں تک کہ وہ خود کسی جج اور کسی فیصلہ کرنے والے کا محتاج ہو گیا۔

(۵) اچھا اس رنگ برنگ دنیا میں اختلاف تو ضروری ہے۔دن رات سے مختلف ہے۔گرمی سردی سے مختلف ہے۔مسرت اور غم دو مختلف چیزیں ہیں۔خار اور گل کا اختلاف کھلی ہوئی بات ہے۔پھر اگر کانٹا نہ ہو تو پھول کی قدر جاتی رہے۔تلخی نہ ہو تو شیرینی کا لطف ختم ہو جائے گا۔پری جمالوں کا حسن اسی لیے قابل قدر ہے کہ دنیا بدصورتوں سے بھری ہوئی ہے۔اگر سب ہی حسین ہو جائیں تو حسن و جمال بے حقیقت بن جائے۔

حضرت ذوق کا تو فیصلہ یہ تھا۔

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن
اے ذوق اس جہاں میں ہے زیب اختلاف سے

مگر حقیقت اس سے بھی آگے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف رونق وزیبائش ہی نہیں ہے بلکہ دنیا کی ترقی بھی اختلاف سے ہے۔ اختلاف نہ ہوتو عمل کی تمام سرگرمیاں ختم ہو جائیں۔ امیری اور غریبی میں اختلاف نہیں بلکہ مخالفت ہے۔ لیکن اگر امیری نہ ہوتو غریب کی وہ تمام جائز وناجائز سرگرمیاں ختم ہو جائیں جو وہ امیر بننے کے لیے کرتا ہے موت نہ ہوتو وہ تمام دوڑ دھوپ ختم ہو جائے جو انسان اپنی زندگی یا اپنے اہل وعیال کی بقا کے لیے کرتا ہے جس کے لیے نہ دن کو دن سمجھتا ہے نہ رات کو رات۔

کچھ اور آگے بڑھیے۔ ان تمام ترقیات پر نظر ڈالئے جن پر بیسویں صدی کو ناز ہے مگر کیا بیسویں صدی کی آمدان سائنسی ترقیات کو لے کر آئی تھی یا سیاسی دنیا کی اختلاف انگیز اور ہلاکت خیز سیاست نے ان کو جنم دیا اور وجود بخشا۔

مخالف کا خوف نہ ہوتا تو پائے تحقیقات اسی طرح لنگ رہتا اور سائنس کے محقق ومفکر بھی اس طرح ویران گوشوں میں پڑے رہتے جیسے الٰہیات اور اخلاقیات کے ارباب فکر ونظر کس مپرسی میں مبتلا ہیں۔

(۶) سوال یہ ہے کہ اس اختلاف نواز تصادم پرست دنیا میں اگر کسی دوراہہ پر انسانی قافلہ منتشر ہوتو کون ہے جو اس کو سیدھے راستہ پر لگائے۔ کون ہے جو اس کو انفع، کارآمد اور پائیدار، سودمند یعنی حق اور خیر کی طرف لے جائے۔

کتاب اللہ نے اس سوال کا جواب دیا ہے، ارشاد ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِمَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ (سورہ بقرہ ع ۲۲)

''وہ لوگ ایک ہی امت تھے (پھر ایسا ہوا کہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور کسی دوراہہ پر پہونچ کر الگ الگ راستوں پر پڑ گئے) پس اللہ نے انبیاء بھیجے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے (غلط روی اور ٹیڑھی چال کے نتائج بد سے آگاہ کرنے والے غیر نافع (باطل) کی خرابیوں کو واضح کرنے والے) اور ان (انبیاء) کے ساتھ کتاب (فرمان اور منشور خداوندی) نازل کی (جو اگرچہ متعدد تھے۔ مگر ایک ہی مقصد اور ایک ہی نصب العین کے لیے تھے اور اس لحاظ سے ایک ہی منشور والے تھے) یہ کتاب (منشور) حق کو لیے ہوئے تھی (اس چیز کو واضح کر رہی تھی جو انسان کے لیے انفع ہو اور پائیدار ہو)

(مقصد یہ تھا) کہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور یہ لوگ جو باہم دگر مختلف ہوئے تو اس لیے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے۔ وحی الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے مگر پھر بھی آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھادی جس میں لوگ مختلف ہو گئے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔''

(۷) اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں نے آپ کی یہ دست گیری فرمائی کہ حق واضح کر دیا۔ مگر کیا صرف اس وضاحت سے آپ وہ منافع حاصل کر لیں گے جو حق سے وابستہ ہیں۔

پدر مشفق نے یہ ذہن نشین کرا دیا کہ علم سب سے بڑی دولت ہے۔ یہ ایک لازوال دولت ہے جس کو نہ چرایا جا سکتا ہے نہ کوئی راہ زن اس پر ڈاکہ ڈال سکتا ہے اور عجیب بات ہے کہ ہر ایک دولت خرچ کرنے سے ختم ہو جاتی ہے لیکن علم ایسی دولت ہے کہ اس کو جتنا خرچ کیا جائے وہ اتنی ہی زیادہ بڑھتی رہتی ہے۔ جتنا اس کو گھسا جائے وہ اتنی ہی زیادہ نکھرتی ہے اور روشن ہوتی ہے۔ مگر آپ صرف والد ماجد کی نصیحتیں سن کر عالم فاضل بن جائیں گے۔ یا عالم فاضل بننے کے لیے آپ کو جدوجہد کرنی ہوگی، تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں گی، راتوں کو جاگنا ہوگا، سفر کرنے پڑیں گے، بھوک پیاس کی زحمتیں برداشت کرنی ہوں گی اور اس جدوجہد کے سلسلہ میں سرمایہ لٹانا ہوگا۔

پدر مشفق کی نصیحتوں کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کمر باندھ کر تحصیل علم کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں آپ جس قدر زیادہ سرگرم ہوں گے زیادہ محنت کریں گے جان و مال کی قربانی دیں گے اتنے ہی بڑے آپ عالم فاضل ہو جائیں گے بشرطیکہ قدرت نے آپ کو فہم و فراست اور ذہانت و ذکاوت سے بھی نوازا ہو۔

آپ کا دوسرا فرض یہ ہوگا کہ اپنے دوستوں کو بھی علم کی خوبیوں سے آشنا کریں اور تحصیل علم کی محنت میں ان کو بھی آپ شریک کریں کیونکہ دوست کی خیر خواہی آپ کا اخلاقی فرض ہے اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو دوست کے حق میں بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ خیانت کرتے ہیں۔ بخل اور خیانت دونوں اخلاقی جرم ہیں۔

پدر مشفق اگر آپ کی اس محنت پر جو آپ طلب علم کے لیے کر رہے ہیں مہربانی کرتا ہے یعنی آپ کو مطالعہ سے روکتا ہے۔ محنت و مشقت کی اجازت نہیں دیتا تو یہ اس کی شفقت اور خیر اندیشی نہیں بلکہ کوتاہ اندیشی اور نادانی ہے۔

پدر مشفق کی شفقت کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ آپ جتنی زیادہ محنت کریں وہ خوش ہو کہ آپ علم کی تکمیل بھی کر رہے ہیں اور زندگی کی کش مکش میں مشقت برداشت کرنے کی بھی عادت ڈال رہے ہیں جو کلید کامرانی اور کامیابی کا گر ہے۔ پدر مشفق آپ کی محنت پر رحم نہیں کرے گا۔ ہاں اس کا خیر اندیش جذبہ پدری یہ ضرور چاہے گا

کہ آپ کا حوصلہ بلند ہو، آپ میں زیادہ سے زیادہ ہمت پیدا ہو، جو محنت آپ کر رہے ہیں اس سے دل برداشتہ نہ ہوں بلکہ آپ کا دل اور لگے۔ آپ کے اندر اس محنت کے لیے امنگ پیدا ہو، وہ ایسا کرے گا کہ وقتاً فوقتاً آپ کو انعام دے گا۔ کبھی کوئی عمدہ مٹھائی خاص طور سے کہیں سے منگوائے گا اور آپ کو دے گا۔ کبھی آپ کے لیے عمدہ کپڑے بنادے گا۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ایسی کتابیں منگادے جو آپ کے مطالعہ کے لیے معاون ثابت ہوں۔ کبھی آپ کے لیے کوئی ماسٹر مقرر کردے گا جس سے آپ مطالعہ میں مدد لے سکیں۔

(۸) محنتی طالب علم اور اس کے باپ کی جو مثال پیش کی گئی آپ غور کریں تو یہی مثال انسانی زندگی کی کش مکش اور اللہ رب العالمین ارحم الرحمین کی رحمتوں اور اس کی بے انتہا عنایتوں اور مہربانیوں کی ہے۔

خود حضرت حق جل مجدہ کا بیان ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ۔ (سورہ بلد) بلاشبہ ہم نے انسان کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کی زندگی مشقتوں سے گھری ہوئی ہے۔

آپ غور کیجیے۔ جس کو ہم زندگی کہتے ہیں۔ جس کو قرآن حکیم الحیوۃ الدنیا سے تعبیر کرتا ہے وہ زندگی جو سب سے زیادہ قریب ہے یعنی موجودہ زندگی۔ یہ کیا ہے۔ ایک کش مکش ہے جس کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے کچھ ذمہ داریاں ہیں جو سر پڑی ہوئی ہیں مثلاً خود اپنے باقی رہنے اور زندہ رہنے کی ذمہ داری جس کو پورا کرنے کے لیے سیکڑوں جتن کرنا پڑتے ہیں۔ وہ گرمیوں کے تپتے ہوئے دوپہر میں ایک خونچے والا گلیوں میں گھوم رہا ہے اور آواز لگا رہا ہے۔ ملائی کا برف۔ آئس کریم۔ سردیوں کا موسم ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ ٹھنڈی ہوا تیر کی طرح بدن میں گھسی جارہی ہے لیکن اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک آواز لگانے والا آواز لگا رہا ہے۔ گرم چائے۔ اسی بارش اور ٹھنڈی ہوا میں ایک دہقان کھیت میں کھڑا ہوا پانی کاٹ رہا ہے۔ بہشتی مونڈھے پر مشک لادے ہوئے ایک ایک ڈیوڑھی پر پہنچ رہا ہے۔ صبح سویرے اسی ٹھنڈی ہوا سردی اور بارش میں مہتر نالی صاف کر رہا ہے سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔

یہ سب کیا ہے۔ وہی ذمہ داری ہے۔ اپنے بقا کی۔ بال بچوں کی پرورش کی۔ یہ اس کو نباہ رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں یہ عمل کر رہے ہیں اور زبان حال یہ ارشاد خداوندی دہرا رہی ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ

ایک عجیب تماشا ہے۔ تمام دنیا انسان کے لیے ہے۔ اس کے تمام خزانے انسان کے لیے ہیں اس کی تمام رنگ برنگی۔ تمام خوش نمائی اور دل فریبی انسان کے لیے ہے اور خود انسان اس کش مکش میں مبتلا اس کی زندگی مشقتوں کے حصار میں گھری ہوئی۔ لیکن اسی معیشت انسانی کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالیے۔

خاکروب جب ڈبل تنخواہ پاتا ہے اور تنخواہ کے نوٹ لے کر بال بچوں میں پہنچتا ہے تو وہ تمام مشقت زحمت اور مصیبت فراموش ہوجاتی ہے اور نئی امنگ کارفرما ہوتی ہے کہ زیادہ کام کیا جائے تو زیادہ پیسے ملیں زیادہ مسرت حاصل ہو۔

غور فرمائیے۔ رحمت خداوندی کے اس عجیب وغریب کرشمہ پر۔ خاکروب کے اسی محنت زدہ دل میں جو بچوں کی محبت بھری ہوئی ہے اس نے محنت کی تلخیوں کو کس قدر خوشگواریوں سے بدل دیا ہے۔

(۹) یہ صرف ایک مثال ہے بیوی بچوں کی محبت کی۔ لیکن اگر آپ گردوپیش کی رنگینیوں اور ماحول کی تمام تبدیلیوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وہ زندگی جس کا گوشہ گوشہ محنتوں اور کاوشوں سے گھرا ہوا ہے فطرت نے کارخانہ معیشت کا ڈھنگ کچھ اس طرح بنا دیا ہے اور طبیعتوں میں کچھ اس طرح کی خواہشیں، ولولے، امنگیں جذبات اور تاثرات ودیعت کر دیئے ہیں کہ زندگی کے ہر ایک گوشہ میں ایک عجیب طرح کی دل بستگی، مشغولیت، ہماہمی اور سرگرمی پیدا ہوگئی ہے۔ اور یہی زندگی کا انہماک ہے۔ جس کی وجہ سے ہر ذی حیات نہ صرف زندگی کی مشقتیں برداشت کر رہا ہے بلکہ انہیں مشقتوں میں زندگی کی بڑی سے بڑی لذت اور راحت محسوس کرتا ہے۔ یہ مشقتیں جس قدر زیادہ ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ زندگی کی دلچسپی اور محبوبیت بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایک انسان کی زندگی ان مشقتوں سے خالی ہو جائے تو وہ محسوس کرے گا کہ زندگی کی ساری لذتوں سے محروم ہو گیا اور اب زندہ رہنا اس کے لیے ناقابل برداشت بوجھ ہے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ

(سورہ آل عمران ع ۲)

''لوگوں کے لیے آراستہ کر دی گئی ہے مرغوب چیزوں کی محبت یعنی عورتوں اور اولاد کی محبت۔ سونے اور چاندی کے ذخیروں کی محبت۔ نشان پڑے ہوئے نمبری گھوڑوں کی محبت۔ مویشی اور کھیتی کی محبت۔ یہ سب دنیوی زندگی کے سامان (اور دلچسپیاں) ہیں اور حسن انجام اللہ ہی کے پاس ہے۔''

دن گذرتا ہے، رات آتی ہے، شور شغب ختم ہوتا ہے، رات کا سکون میسر آتا ہے، وہ اگر ٹوٹی جھونپڑی میں ٹوٹی کھٹیا پر لیٹا ہوا ہے، تب بھی راحت محسوس کرتا ہے، اس کی مشقت بھری زندگی کے لیے یہی راحت ہے۔ یہی جھونپڑی راحت کدہ ہے، اسی میں وہ راحت وسکون کی تمام دلچسپیاں حاصل کرتا ہے۔ لذتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ پھر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو نیند کہتے ہیں، جس کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں تعطل شعور کہا جاتا ہے اور قرآن حکیم نے اس کو وفات سے تعبیر کیا ہے۔ اس کیفیت کے ختم ہونے کے بعد جب وہ بیدار ہوتا ہے تو وہ تازہ دم ہوتا ہے۔ کل گذشتہ کی تمام مشقتوں کو دوبارہ جھیلنے کے لیے ایک توانائی اور مستعدی اپنے اندر پاتا ہے۔ یہ صعوبت اور سہولت راحت اور زحمت کی گردش مسلسل جاری رہتی ہے تاکہ زندگی کی جو میعاد اس کے لیے مقرر ہے وہ اس کی آخری حد پر پہنچ سکے۔

قرآن پاک معجزانہ انداز میں اس گردش اور کشش کی تصویر ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ اللہ کے وجود

اور اس کے علیم و بصیر ہونے کی دلیل بھی ہو جاتی ہے، ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (سورہ انعام ع ۷)

''وہی تو ہے جو رات میں تمہیں وفات دیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اسے جانتا ہے پھر تمہیں اس میں (دن میں) اٹھا کر کھڑا کر دیتا ہے تا کہ جو میعاد مقرر کر دی گئی ہے اس کو انجام کو پہنچا دیا جائے۔ پھر اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے تب وہ بتا دے گا جو تم کرتے رہتے تھے۔''

(۱۰) یہ ایک فرد کی زندگی کی کیفیت اور اس کا اتار چڑھاؤ تھا۔

بعینہٖ یہی مثال جماعت ملت اور قوم کی زندگی اور بقاء زندگی کی ہے۔ جماعت افراد سے بنتی ہے۔ افراد کی فطرت جماعت کا فرد بننے کے بعد بھی وہی رہتی ہے وہ بدل نہیں جاتی۔ اس میں صرف نظم و ضبط، یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تو لا محالہ سنت الٰہیہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔

سنت الٰہیہ جو فرد کی زندگی اور بقاء زندگی کی کش مکش کے متعلق ہے۔ وہی سنت جماعتی اور قومی زندگی کی حیات اور بقاء حیات کی کشمکش کے متعلق بھی ہو گی۔

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (سورہ ملائکہ) ''تم اللہ کے طریقہ میں کبھی تبدیلی نہیں پا سکتے۔''

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سورہ روم ع ۵)

''وہی تراش اللہ کی جس پر تراشا لوگوں کو۔ بدلنا نہیں اللہ کے بنانے کو۔ یہی ہے دین سیدھا لیکن بہت لوگ نہیں سمجھتے۔'' (شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ)

سرگرم جد و جہد، سعی مسلسل، ایثار، قربانی اور متواتر قربانی قومی حیات اور بقاء حیات کے لیے شرط ہے ترقی اگر مطلوب ہے تو میدان جد و جہد میں قدم سب کے آگے بڑھانا ہو گا۔ ایثار اور قربانی کو محبوب ترین مشغلہ بنانا ہو گا۔ جان، مال، سب کچھ قربان کرنا ہو گا اور حیات قومی کے مقصد عظیم کے لیے ہر ایک مقصد کو اور اس کی محبوبیت کے لیے ہر ایک کی محبت کو قربان کر دینا پڑے گا۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (سورہ توبہ ع ۳)

''آپ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے اور وہ تجارت جس کے مندے سے

تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جو تمہیں پسند ہیں، تم کو عزیز ہیں اللہ سے، اس کے رسول سے
اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ
تمہارے سامنے لے آئے (قانون خداوندی ہے) کہ وہ فاسقوں پر کامیابی اور سعادت
کی راہ نہیں کھولتا۔''

ہاں پدر مشفق کی طرح اللہ رب العالمین ارحم الراحمین کی رحمتوں کا تقاضا یہ ہوگا کہ موقع بموقع حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ ایسے انعامات عطا ہوتے رہیں جن سے حوصلہ بلند ہو۔ ایسے الطاف نمودار ہوتے رہیں جو کامرانیوں اور کامیابیوں کی بشارت ہوں۔ مگر جدوجہد آپ کا فرض ہوگا اور جدوجہد بھی ایسی جدوجہد جو لرزہ خیز ہو جس کے تصور سے پتا پانی ہونے لگے۔

(۱۱) اچھا ایک عجیب لطیفہ ہے۔ حق خود محنت کش اور مشقت طلب ہے اس کی فطرت کا آب وگل خود کٹھنائیوں اور صعوبتوں سے تیار ہوا ہے کیونکہ حق کا مطلب ہے اٹل۔ حق کی یہ حقیقت خود چاہتی ہے کہ مٹانے والے اس کو مٹانے کی بھرپور کوشش کریں اور کرتے رہیں اور یہ ان تمام مخالفانہ کوششوں کے باوجود نہ مٹے جب اس کو مٹانے کے لیے تمام کوششیں صرف کردی جائیں گی اور یہ نہیں مٹے گا تب ہی تو ثابت ہوگا کہ یہ اٹل ہے۔

(۱۲) اب آیئے ارشادات خداوندی کا مطالعہ کیجئے۔
سورہ بقرہ کی آیت (۱۲۳) پھر تلاوت کیجئے جس میں کہا گیا تھا:

''تمام لوگ ایک ہی امت تھے۔ پس اللہ نے نبی بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے
والے اور ان انبیاء کے ساتھ کتاب نازل کی یہ کتاب حق کو لیے ہوئے تھی تاکہ ان لوگوں
کے درمیان اس باب میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے۔''

اس آیت کے آخر میں ہے:

''بالآخر اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت دکھادی جس میں لوگ مختلف ہوگئے تھے۔ یعنی حق اور خیر
واضح کردیا۔''

یہ حق کی دعوت تھی جو نبی نے پیش کی اور ایک جماعت نے اس کو قبول کرلیا۔ سابق مثال کو یہاں چسپاں کرتے ہوئے یہ کہیے کہ پدر مشفق نے اولاد کو علم کی فضیلت اور اس کی خوبیاں سمجھادیں۔

پھر کیا ہوا۔ اور موجودہ امت ''اُمت محمدیہ'' کو کیا کرنا چاہیے۔ جواب کے لیے اسی آیت سے متصل دوسری آیت (۱۲۴) ملاحظہ فرمایئے ارشاد ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ تا اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ
قَرِيْبٌ

''کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر ان لوگوں کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں ہر طرح کی تنگی اور سختی انہیں پیش آئی اور وہ جھنجھوڑ دیئے گئے (انہیں ہلا ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور جو لوگ ان کے ہمراہ ایمان لائے تھے۔ بول اٹھے۔ اللہ کی امداد (آخر) کب آئے گی۔ سن رکھو۔ اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے۔ (ترجمہ ماجدی)

(یہاں تک کہ اللہ کا رسول اور جو لوگ ایمان لائے تھے پکار اٹھے اے نصرت الٰہی تیرا وقت کب آئے گا (تب اچانک پردہ غیب چاک ہوا اور خدا کی نصرت یہ کہتی ہوئی نمودار ہوئی) ہاں گھبراؤ نہیں خدا کی نصرت تم سے دور نہیں ہے (ترجمان القرآن)

سورہ یوسف کے آخری رکوع میں اس تنبیہ کو اور بھی زیادہ موثر انداز میں پیش فرمایا گیا ہے ارشاد ہے:

''یعنی طرح طرح کے مصائب۔ تنگیاں اور پریشانیاں یہاں تک بڑھیں کہ انبیاء علیہم السلام جو صبر و ضبط، تحمل و برداشت میں معجزانہ شان رکھتے ہیں وہ بھی مایوس ہو گئے اور خیال کرنے لگے کہ فتح و نصرت کی جو بشارتیں ان کو دی گئی تھیں یا جو ان کا وقت مقرر کیا گیا تھا ان کے سمجھنے میں ان سے غلطی ہوئی ہے (عین اس وقت جب شدت انتظار کی بے چینی مایوسی کی حد تک پہنچنے لگی تھی) ہماری نصرت ان کے پاس پہنچی پس جس کو ہم نے چاہا وہ بچا لیا گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹتا نہیں۔''

مختصر یہ کہ حق کا داعی اور حق کو قبول کرنے والے ان کی کامیابی اور کامرانی کے لیے ضروری ہے کہ جس طرح ایک طالب علم فضائل علم حاصل کرنے کے لیے شب و روز محنت اور کاوش کرتا ہے یہ بھی مصائب اور مشکلات برداشت کریں۔ ایک طالب علم کی کامیابی کے مقابلہ میں ان کی کامیابی بہت بڑی ہوگی۔ طالب علم کی کامیابی ایک فرد کی فلاح و بہبود ہے ان کی کامیابی پوری قوم پوری امت بلکہ نوع انسانی کی کامیابی ہے جیسے کامیابی عظیم الشان ہے اس کے لیے شدائد و مصائب بھی لرزہ خیز اور زہرہ گداز ہوں گے۔ مگر جس طرح پدر مشفق موقع بموقع اپنے بچے کو انعام دیتا رہتا ہے تاکہ اس کا حوصلہ بڑھے اس کی ہمت بلند ہو قدرت خداوندی بھی داعیان حق اور مجاہدین فی سبیل اللہ کو خاص خاص انعامات سے ان شدائد اور مصائب کے زمانہ میں بھی نوازتی رہتی ہے تاکہ ان کی ہمتیں پست نہ ہوں اور یہ دل شکستہ نہ ہوں۔

(۱۳) واقعہ بدر پر نظر ڈالئے:

پیٹ خالی، بدن پر کپڑے پورے نہیں، تعداد کل تین سو تیرہ اور وہ بھی پورے سامان جنگ سے تہی دست، اونٹ اتنے کم کہ چار چار کے لیے ایک اونٹ، گھوڑے لشکر بھر میں دو، آہنی زرہیں اتنے آدمیوں میں کل سات، دوسری طرف قریش کا لشکر۔ تعداد میں مسلمانوں سے سہ چند، ہر ضروری سامان سے آراستہ، ایک ایک بہادر

لوہے میں ڈوبا ہوا، شتر سوار سات سو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس ہیبت ناک منظر پر نظر ڈالتے ہیں تو حضرت حق کی بارگاہ میں سر بسجود ہیں۔ خداوندا! یہ مٹھی بھر تیرے بندے ہیں۔ اگر آج یہ مٹا دیئے گئے تو پھر تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ عین اسی اضطراب اور بے قراری کی حالت میں وحی الٰہی بشارت دے رہی ہے:

اِنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُرْدِفِیْنَ (سورہ انفال ع ۱)

''میں تمہیں ایک ہزار فرشتوں کی کمک پہنچاؤں گا (جن کے دستے) یکے بعد دیگرے آنے والے ہوں گے۔''

یہ فرشتوں کا نزول کیوں ہے۔ کیا یہ جہاد کریں گے۔ اگر فرشتوں سے جہاد (۱۲۷) کرانا تھا تو مسلمانوں پر جہاد کیوں فرض کیا گیا؟

قرآن پاک کی تصریح ملاحظہ فرمایئے:

''اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں کی یہ کمک) بس اس لیے بھیجی کہ تمہیں بشارت ہو اور تا کہ تمہارے دلوں کو اس سے اطمینان ہو جائے (اور واقعہ یہ ہے کہ فرشتوں کی کمک صرف بشارت اور اطمینان ہی کی چیز ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ) نصرت تو صرف اللہ ہی کے پاس سے ہے۔ بیشک اللہ ہی زبردست حکمت والا ہے۔''

(۱۴) اس طویل بحث و مذاکرہ کے بعد احزاب کے واقعہ پر دوبارہ نظر ڈالئے:

وہی زُلْزِلُوْا (جھنجوڑے گئے۔ دہلائے گئے) جو سورہ بقرہ کی آیت مذکورہ میں دوسری امتوں کی مشکلات اور ان قربانیوں کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا تھا۔ وہی زلزلوا احزاب کی ان ہولناک مشکلات کے متعلق بھی ارشاد ہو رہا ہے جس میں مسلمان مبتلا کیے گئے تھے۔

هُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا (سورہ احزاب ع ۲)

''اس موقع پر (احزاب کے وقت) مسلمانوں کا (پورا) امتحان لیا گیا اور وہ جھنجوڑے گئے (دہلائے گئے) بہت سخت جھنجوڑ (دہل)''

اس میں زلزا لا شدیدا کا لفظ زیادہ ہے (یعنی بہت سختی سے جھنجوڑے گئے) یہ امت محمدیہ کی عظمت و وقعت کی دلیل ہے جس طرح ان کا مرتبہ تمام سابقہ امتوں سے بلند ہے ان کا زلزلہ، ان کا ابتلاء و امتحان اور جس دہل میں مبتلا کئے گئے وہ دہل اور جھنجوڑ بھی سب سے سخت ہوگی جب ہی تو یہ حالت تھی:

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (سورہ احزاب ع ۲)

(۱۲۸) ''جب آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے۔''

انتہائی شدت کے موقع پر وسوسوں کا آنا ایک طبعی بات ہے۔ یہ نہ ایمان کے منافی ہے نہ کمال ایمان کے۔

البتہ قابل ملاحظہ یہ مطابقت ہے جو امم سابقہ کے ساتھ پائی جارہی ہے۔ جو آیتیں پہلی امتوں کے متعلق سطور بالا میں گذر چکیں ان میں بھی اس فطری تقاضے کا ذکر تھا کہ وسوسہ آیا کہ کہیں بشارتوں کے سمجھنے میں ہم سے غلطی تو نہیں ہوئی۔ کبھی یہ خوف ہوا کہ اب ہم لوگوں میں جھوٹے بن جائیں گے۔ کم وبیش اس طرح کے وسوسے کمزور مسلمانوں کے دلوں میں احزاب کے موقع پر بھی آرہے ہیں۔ فطری امور میں یکسانیت ہوتی ہے یہی یکسانیت یہاں ہے۔

(۱۵) یہ مصائب وشدائد کا تذکرہ تھا۔ باقی رہی بشارت اور نصرت تو قرآن حکیم میں واقعہ احزاب کے تذکرہ کا آغاز ہی نصرت الٰہی کی اطلاع سے کیا گیا ہے۔ اسی رکوع کی پہلی آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَّجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (سورہ احزاب ع ۲)

''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کے انعام کو جو تم پر ہوا جس وقت کئی کئی لشکر تم پر چڑھ آئے پھر ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی اور ایسے لشکر جو تم کو دکھائی نہیں دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو دیکھ رہا تھا۔''

معجزہ کا مسئلہ:

اس طویل بحث و مذاکرہ کے بعد معجزہ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا رحمت خداوندی نے جس طرح بشارت و اطمینان قلبی کے لیے ملائک کو بھیجا۔ اسی طرح اس کی رحمت نے چٹان توڑنے کے وقت روشنی میں روم و فارس کے محل دکھا کر بہت بڑی بشارت دی۔ پھر کھانے میں برکت پیدا کر کے جہاں کئی روز کے بھوکوں کو شکم سیر کیا ظاہر ہے ان کے قلوب کو تسکین کی راحت اور اطمینان کی دولت بھی عطا فرمائی۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ وہ ارحم الراحمین ہے۔ خود اس کا اعلان ہے:

قَالَ عَذَابِيْ أُصِيبُ بِهٖ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ میں عذاب تو اسی کو دیتا ہوں کہ قانون مکافات و مجازات کے بموجب میری مشیت ہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو سزا دینی چاہیے (لیکن) میری رحمت وہ ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے خود اپنے فضل وکرم سے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے۔ کتب علی نفسه الرحمه (سورہ انعام ع ۲) اس نے لکھ لی ہے اپنے ذمہ مہربانی'' (شاہ عبدالقادر)

یہ رحمت عمومی ہے جس سے نہ صرف انسان بلکہ کائنات کی ہر چیز فیضیاب ہورہی ہے باقی جہاں تک اس امت کا تعلق ہے تو ارشاد ہے:

فَسَاَكْتُبُهَا تا هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سوہ اعراف ع ۲۰)

"میں اس رحمت کو ان کے لیے ضرور ہی لازم کردوں گا جو خوف خدا رکھتے ہیں۔ اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں جو اس رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے یہاں لکھا ہوا پاتے ہیں توریت اور انجیل میں (جس نبی کی شان یہ ہے) کہ وہ ان کو نیک کاموں کا حکم دیتا ہے برائیوں سے روکتا ہے۔ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز قرار دیتا ہے اور گندی چیزیں حرام رکھتا ہے اور ان پر سے بوجھ اور قیدیں (جو اب تک تھیں) اتارے دیتا ہے۔ پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا تھا۔ بس یہی لوگ ہیں پوری فلاح پانے والے۔ (۱۲۹)

فائدہ:

اگر احزاب کے واقعات کو سامنے رکھ کر یہ آیت تلاوت کی جائے تو پھر کیا دنیا میں کوئی بھی منصف مزاج اس میں شک کرسکتا ہے کہ یہ آیت ایثار شیوہ۔ صحابہ مجاہدین کے حق میں نص قاطع ہے کہ یہ حضرات مفلحون ہیں مکمل فلاح پانے والے رضی اللہ عنہم)

جب کہ خاتمہ بحث پر رحمت ربانی کا ذکر آ گیا تو اس موقع پر وہ حدیث بھی یاد رہنی چاہیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جب بندہ اپنے رب کی طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو اس کا رب اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے۔ بندہ اگر ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک باع اور اگر بندہ اپنے رب کی طرف گھٹنیوں چلتا ہے تو رحمت حق دوڑ کر اس کو آغوش میں لے لیتی ہے (۱۳۰)۔ غزوات کے موقع پر یہ بشارتیں اسی حدیث کی تصدیق کر رہی ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشجع الناس تھے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (سورہ احزاب ع ۳)

ترجمہ: ''حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا (تم کو بھلی تھی سیکھنی رسول کی چال (شاہ عبدالقادر) نہ صرف عام مسلمانوں کے لیے (۱۳۱) بلکہ) ہر ایسے پاکباز خدا ترس مومن با اخلاص کے لیے) جو امید لگائے ہوئے ہے اللہ سے، ڈرتا ہے پچھلے دن (روز آخرت) سے اور یاد کرتا ہے اللہ کو کثرت سے۔''

اس آیت کی بنا پر علماء کرام کا فیصلہ ہے کہ سرور کائنات رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی انسان کے لیے اس کے انفرادی، اجتماعی، خانگی، ملی، معاشرتی واخلاقی معاملات وحالات غرض ہر ہر گوشہ میں شمع ہدایت ہے اور اس بنا پر زندگی کے ہر ایک شعبہ میں اور ہر ایک چھوٹے بڑے امر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری اور واجب ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے فقہی مسائل میں استدلال کیا گیا ہے کہ کسی انسان کا جو فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ اور بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب آپ کی چال سے ملتا جلتا ہو وہ جائز مستحسن اور عنداللہ پسندیدہ ہے اور جو فعل اس مقدس نمونہ کے معیار پر صحیح نہ اترتا ہو وہ حسب مراتب مکروہ تنزیہی یا مکروہ تحریمی اور بعض اوقات حرام ہے۔

لیکن یہ قرآن پاک کا اعجاز ہے کہ اس آیت کو ایسے موقع پر ایک ایسی ترتیب سے پیش فرمایا کہ یہ آیت اس بارے میں بھی حجۃ اور برہان بن گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ اولوالعزم۔ سب سے زیادہ دلیر ثبات واستقلال کے کوہ گراں اور سب سے زیادہ باحوصلہ بہادر ہیں۔

غور فرمایئے اس رکوع میں منافقین کی پست ہمتی اور بزدلی کی مذمت ہے کہ یہ لوگ اتنے خوف زدہ اور حواس باختہ ہوئے کہ جب دشمن بھاگ گیا تب بھی وہ سہمے ہوئے ہیں کہ دشمن نہیں ٹلا اور اگر کہیں دشمن پھر آ جائے تو ان کی حالت یہ ہوگی کہ وہ یہی چاہیں گے کہ مدینہ چھوڑ کر بادیہ نشین اعراب کے پاس پہنچ جائیں اور وہیں سے آپ کے (مسلمانوں کے) حالات معلوم کرلیا کریں۔ پھر اس آیت کے بعد عالی حوصلہ مومنین کے بہترین کردار کی طرف اشارہ اور اس کی تحسین ہے کہ وہ ان تمام مصائب اور شدائد اور دشمن کے اس بے پناہ ہجوم سے خوف زدہ نہیں ہوئے۔ بلکہ انہوں نے بڑے حوصلہ سے ان مشکلات کا استقبال کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے نصرت اور کامیابی کا وعدہ کیا ہے تو لازمی ہے کہ سخت سے سخت مشکلات سامنے آئیں دشمنوں کا

بے پناہ ہجوم ہو اور ان کی طرف سے مصائب اور اذیتوں کی بارش برسائی جائے جب ہی تو نصرت الٰہی کا ظہور ہوگا جس کا نتیجہ کامیابی اور کامرانی ہوگا۔ جس کا اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ان دو متضاد جماعتوں اور متضاد حالات کے درمیان اس آیت کے ورود سے ایک طرف منافقین کو عار دلائی جارہی ہے کہ تمہاری جان کی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی جان بھی ہے مگر دیکھو کس طرح وہ اپنی جان سے بے پرواہ مصائب و شدائد کے مقابلہ میں سینہ سپر ہیں اور کس بہادری سے ثبات و استقلال کی اعلیٰ مثال پیش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف باہمت اور باحوصلہ بہادر مسلمانوں کے لیے نمونہ اور اسوہ حسنہ وہی بن سکتا ہے جو سب سے زیادہ بہادر ہو۔ استقلال و استقامت کا درس وہی دے سکتا ہے جو سب سے زیادہ پیکر استقامت اور کوہ استقلال ہو۔ یہی شان تھی رسول اللہ ﷺ کی۔ جب ہی تو اس آیت کے لیے یہ سیاق موزوں ہوا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی بے شمار شہادتیں اور یہ حقیقت کہ کسی بھی غزوہ اور معرکہ میں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کو لغزش نہیں ہوئی۔ بلکہ سخت سے سخت حالات میں بھی آپ کا استقلال سبق آموز رہا۔ حد یہ ہے کہ آپ کیا استقامت کے طفیل میں وہ بھی جم گئے جن کے پیر اکھڑ چکے تھے۔ یہ شہادتیں اور یہ حقیقت اس آیت کی عملی تصدیق ہے۔

الحکمۃ ضآل المومن حیث وجدھا احق بھا

"جو بھی حکمت و دانش کی بات ہے وہ مومن ہی کی ہے جو اس کے پاس سے گم ہوگئی تھی جہاں بھی اس کو ملے وہ اس کو اسی شوق اور جذبہ سے لے لے جیسے اس کی گم شدہ چیز مل گئی ہے۔"

غزوہ احزاب میں خندق کی تجویز اس کی بہترین مثال ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا آبائی وطن فارس تھا۔ وہیں انہوں نے پرورش پائی۔ وہیں انہوں نے ایرانیوں کا یہ طریقہ دیکھا کہ حفاظت کے لیے وہ خندق بھی کھودا کرتے تھے۔ ایرانی کافر تھے عجمی تھے۔ دوسری نسل سے ان کا تعلق تھا۔ ان کی تہذیب جداگانہ تھی لیکن جیسے ہی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے یہ تجویز پیش کی نہ مذہب کا سوال سامنے آیا نہ رنگ و نسل کا نہ زبان کلچر اور تہذیب کا کوئی حجاب حائل ہوا۔ نفس تجویز پر غور کیا گیا۔ وہ کارآمد تجویز تھی۔ فقہی اصطلاح کے لحاظ سے مباح الاصل تھی۔ ترقی کی طرف ایک قدم تھا۔ سید الانبیاء ﷺ نے تجویز کو فوراً منظور فرمالیا اور امت کو سبق دیدیا کہ آگے قدم بڑھاؤ۔ اگر کچھ دوسروں سے بھی لینا پڑے تو اس کی اصل حقیقت پر تو ضرور نظر ڈالو کہ کوئی شرعی قباحت تو نہیں ہے۔ باقی غیر کی غیریت پر ہرگز نظر نہ ڈالو۔ یہ بھی مت سوچو کہ یہ غیر کالا ہے یا گورا، عربی ہے یا عجمی۔

کون انکار کرسکتا ہے کہ عرب کے صحرا نشیں بدو تمدن سے ناآشنا تھے لیکن وہ جب پندرہ بیس سال کے عرصہ میں دنیا پر چھا گئے تو عجیب بات یہ ہے کہ وہ صرف حکمراں ہی نہیں رہے بلکہ اس عظیم الشان تمدن کے بانی اور معمار بھی بن گئے جن کے آثار نہ صرف ایشیا بلکہ سرزمین یورپ کے جگر میں بھی آج تک چمک رہے ہیں۔

عربوں نے اس تہذیب اور تمدن کی زمین کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے تیار کی تھی اور گل کاری کے لیے بہت سی چیزیں ان قوموں سے لیں جن کو انہوں نے شکست دی تھی۔ جن پر وہ حکومت کرتے تھے اور جس روز انہوں نے اخذ و التقاط کا یہ طریقہ چھوڑا وہ ان کے زوال کا پہلا دن تھا۔

موسیو لیبان۔ فرانس کا مشہور انصاف پسند محقق لکھتا ہے:

عربوں نے ابتداء فتوحات ہی سے ان تمام عمارتوں کی بہت قدر کی جو ان سے پہلے سے موجود تھیں اور جس تمدن کو انہوں نے ان مفتوحہ ممالک میں پایا اسے ہمیشہ قائم رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کی۔ شروع میں تو وہ بالکل جاہل تھے لیکن چند روز میں وہ اپنے استادوں پر فوقیت لے گئے۔ فن حرب اور محاصرہ کے وقت آلات جنگ کا استعمال کرنا جو یونانیوں کا مخصوص حصہ تھا اس کو عرب بالکل نہیں جانتے تھے لیکن اس کو بھی انہوں نے بہت جلد سیکھ لیا۔ اور چند ہی روز میں وہ اپنے مخالفین کے ہمسر ہو گئے۔ علوم وفنون (دنیاوی) میں وہ بالکل ابتدائی حالت میں تھے لیکن ان چند مدارس کی بدولت جو انہوں نے قائم کیے وہ چند روز میں متقدمین کی نہ صرف برابر ہو گئے بلکہ ان سے بھی بڑھ گئے۔ فن تعمیر میں ان کی معلومات کچھ نہیں تھیں لیکن انہوں نے ایرانی اور مشرقی معماروں سے کام لیا اور اپنے خیالات اور مذاق کے مطابق ان کے طرز تعمیر میں اس قدر ترمیم کی کہ اس میں ان غیر قوموں کا حصہ بالکل باقی نہیں رہا اور اس نے بطور خود ایک خاص وضع اور صورت اختیار کر لی۔ (تمدن عرب صفحہ ۵۵) یہی مصنف لکھتا ہے۔

عربوں نے فن حرب کفار کی فوجوں کے بھاگے ہوئے سپاہیوں سے سیکھا جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ (تمدن عرب صفحہ ۲)

اس محقق کی اس شہادت میں آپ کچھ مبالغہ اور کسی قدر توہین کے جراثیم تلاش کر سکتے ہیں مگر اس شہادت کی اصلیت اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ اور اگر غور کریں تو دور جانے کی ضرورت نہیں ہم خود اپنے آپ کو اور ہندوستان میں اپنی تاریخ کو دیکھ لیں۔ ہماری معاشرت میں کس قدر ہندوانی رسومات داخل ہیں حتیٰ کہ ہم نے وہ چیزیں بھی لے لیں جو نہ صرف ممنوع ہیں بلکہ اسلامی مزاج کے لیے قطعاً ناقابل برداشت ہیں۔ چھوت چھات کا مرض ہمارے اندر اسی یگانگت کی بنا پر آیا جو ہم نے اونچے طبقہ سے قائم کی تھی۔ منکر اسلام ہونے کے نقطہ نظر سے برہمن، کھتری، دیش اور ایک بھنگی سب برابر ہیں مگر ایک سے مساویانہ سلوک اور دوسرے کی حقارت یہ نہ عربی مزاج ہے نہ اسلامی۔ یہ صرف اس معاشرت کا طفیل ہے جو ہم نے ہندو گھرانوں سے اختلاط کے بعد اختیار کی۔ اس کی ذمہ داری خود ہم پر ہے یا ان مسلمان حکمرانوں پر جنہوں نے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہندوؤں سے اختلاط کو ضروری سمجھا کہ وہ اس ریل میل میں حد سے تجاوز کر گئے۔

بہر حال مسلمان ہوتے ہوئے اس اختلاط کی ہمت اسی وجہ سے ہوئی کہ اسلام نے مساوات، فراخ حوصلگی اور زیردست مفتوح اقوام کی دلداری کی ہدایت کی ہے اور چھوت چھات کو حرام بتایا ہے۔ حد ہو گئی ہر

انسان کا بدن پاک، ہر انسان کا جھوٹا پاک، مفتوح ہو یا مملوک، مسلمان ہو یا غیر مسلم تمام مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ رحمت رب العالمین کا مستحق وہ ہے جو خلق خدا پر رحم کرے۔ جہاں یہ تعلیم ہو وہاں علیحدگی اور چھوت چھات کا کیا امکان؟

جنگ کا ایک دور ختم:

بخاری شریف کی روایت ہے کہ دشمنوں کے بادل چھٹے اور مدینہ کا مطلع صاف ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

الان نغزوهم ولا يغزوننا نحن نسير اليهم

''اب ہم ان سے غزوہ کریں گے وہ ہم سے غزوہ نہیں کر سکتے ہم ان کی طرف چل کر جائیں گے۔''

یہ فراست نبوی تھی جو ہو بہو صادق ہوئی۔ پھر قریش کی ہمت نہیں ہوئی کہ حملہ کر سکیں۔ ہاں اگلے ہی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل و حرکت کا رخ مکہ معظمہ کی طرف پھیر دیا۔ ۵ھ میں اداء عمرہ کے لیے مکہ معظمہ کا قصد مذہبی اور روحانی لحاظ سے کوئی بھی حیثیت رکھتا ہو مگر جنگی تدبر کے لحاظ سے بہت ہی موقع کی بات تھی کہ غنیم کو مہلت نہ دی جائے کہ وہ آگے بڑھنے کی تیاری کر سکے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اس پیشین گوئی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں شمار کیا ہے۔(خصائص کبریٰ)

اور تاریخی نقطہ نظر سے یہ ارشاد ایک دور کے ختم ہونے کی اطلاع ہے۔ یعنی جنگ کا پہلا دور یہ تھا کہ قریش مسلمانوں کو کچل ڈالنے کے لیے بار بار حملہ کر رہے تھے۔ یہ دور آج ختم ہو گیا۔

اب جنگ کا دوسرا دور شروع ہوگا۔ مگر ہم اس کے تذکرہ سے پہلے مناسب سمجھتے ہیں کہ سلسلہ جنگ پر دوبارہ نظر ڈال لیں۔

جنگ کیا ہے۔ کسی قوم کی زندگی میں جنگی تیاری کو کیا اہمیت ہے۔ وحی الٰہی نے کیا رہنمائی فرمائی جب کہ پہلا حکم یہ تھا:

كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ الخ

> ''اپنے ہاتھ روکو۔ دشمن کی مسلسل و پیہم ایذا رسانی کا جواب ہاتھ سے مت دو۔ اس کے مقابلہ میں اپنی توجہ اللہ کی طرف رکھو۔ نماز قائم کرو۔ عبادت گذاری میں اپنے آپ کو پختہ کرلو اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط و مستحکم کرو اور اپنی شکایتیں اس کی بارگاہ میں پیش کرتے رہو۔''

اس ارشاد اور اس پروگرام کے بعد جنگ کی اجازت کب ہوئی۔ سلسلہ جنگ کی غرض و غایت، اس کے

شروع ہونے کی تاریخ، غزوات اسلامی کا پس منظر، تاریخی اور آئینی وجوہات۔ ان سوالات کے مفصل جوابات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے۔

وباللہ التوفیق ومنہ الاستعان وعلیہ التکلان

اطلاع:

نقشہ جنگ اور مشکلات سے جو مضمون شروع ہوا ہے وہ مستزاد ہے اسی طرح غزوات کے سلسلہ میں جو مضامین آگے آرہے ہیں وہ راقم حروف کی طرف سے مستزاد ہوں گے۔ ازالۃ الخفاء سے ماخوذ نہیں ہیں حضرات اہل علم اگر کوئی غلطی دیکھیں تو اصلاح فرما کر احقر کو ممنون فرمائیں۔

مسئلہ جہاد پر نظر ثانی

اللہ کی یاد، خوف خدا، تقویٰ، خدا پرستی اور خدا طلبی کے تصور کے ساتھ ترک دنیا کا تصور بھی کچھ اس طرح آتا ہے کہ آبادی سے الگ تھلگ کسی پہاڑ کی گھاٹی یا کسی دریا کے کنارہ پر یا کسی گھنے جنگل کے دامن میں کٹیا بنالی جائے۔ معمولی لباس بدن پر ہو، جو کی روٹی، ستو، ساگ یا جنگل کے درختوں کے کسی پھل سے پیٹ کا جہنم ٹھنڈا کر لیا جائے اور رات دن خدا کی یاد کی جائے۔ نہ بیوی بچے ہوں، نہ کاروباری دوڑ دھوپ ہو، نہ بازاروں اور کارخانوں کا شور وشغب ہو۔

عوام کے خیالات بھی ایسے ہی ہیں کہ ایسی زندگی کو مقدس اور پاک زندگی قرار دیتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زندگی کی کش مکش اور رات دن کی الجھنوں سے جب انسان پریشان ہوتا ہے تو ایسی ہی یکسو زندگی کی تمنا کرنے لگتا ہے۔

مگر ہم ایسی زندگی کو با مقصد اور کامیاب زندگی قرار دیں۔

سوال ایک جاندار کی زندگی کا نہیں۔ سوال انسان کی زندگی کا ہے۔

انسانی زندگی کا آپ کوئی بھی مقصد قرار دیں یہ بات یقینی ہے کہ یہ یکسو اور کوہ نشین زندگی اس کا مقصد نہیں ہوسکتی۔ ورنہ ہمیں خود اپنی فطرت کے خلاف بغاوت کرنی ہوگی اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ خود انسانی فطرت غلط، بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ انسان تمام مخلوق سے اشرف ہے، اس کو علم عطا ہوا، ترقی کے راستے اس پر کھولے گئے، خزائن ارض کی کنجیاں اس کو دے دی گئیں، عالم مشاہدہ کی ہر چیز پر اس کو اقتدار بخشا گیا۔ یہ سب غلط ہے۔ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس پر فخر جاسکے۔ ہر چیز ہمارے لیے باعث توہین ہے۔

ممکن ہے کوئی برگشتہ فطرت اس تصور معکوس اور اس اندھے عقیدہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ لیکن مسلمان جس کو یہ بتایا گیا ہے کہ انسان صرف جاندار نہیں ہے جو عام حیوانات کی طرح جانداروں کے جنگل میں پھینک دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کائنات ارضی میں اللہ اور خالق کائنات کا خلیفہ ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ انسان ترقی پذیر فطرت کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کی فطرت تخریب پسند ہے اور آبادی کے بجائے ویرانی، شاہراہ تعمیر ترقی پر آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنا اس کی فطرت کا جوہر ہے۔

موجودہ دور میں ہندوستان جیسے پس ماندہ ملکوں میں غذا کی قلت نے جو صورت اختیار کر لی ہے اس نے مردم شماری کے اضافہ کو ایک تشویش انگیز مسئلہ بنا دیا ہے لیکن اس کوہ نشیں یکسو زندگی کی پیروی کرتے ہوئے اگر لوگ تجرد اختیار کر لیں تو مردم شماری میں کمی نہیں بلکہ انسانی نسل ہی کو ختم کر دیں گے۔ اس وقت غذا کا مسئلہ حل تو

ہو جائے گا مگر اس طرح کہ سیکڑوں ایٹم بم جو کام کرتے۔ یکسوزندگی کا ایک فعل یعنی تجرد اس کام کو خاموشی سے انجام دے دیگا۔

اس زندگی کو بامقصد یا کامیاب زندگی کہا جا سکتا ہے؟

اچھا! یہ تجرد کی یکسوزندگی نہ اختیار کیجئے۔ مل جل کر رہنا۔ یعنی مدنیت اور شہریت جو انسانی فطرت ہے آپ اسی فطرت کے تقاضوں کا احترام کیجئے۔ انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہیے۔ مگر خدا کے لیے اپنی کالونی (چھوٹی سی آبادی) الگ بنایئے جہاں صرف اللہ کے نیک بندے رہتے ہوں، سب پاکباز ہوں، سب کے دلوں میں اللہ کی لو لگی ہوئی ہو، سب کے سب صبر وشکر، زہد وتقویٰ کی تصویر یا ان کے سچے پیرو ہوں جو پاکبازی کی تصویر بننا چاہتے ہوں۔

فرض کر لیجئے کسی دامن کوہ میں یا کسی دریا کے کنارے ایسی آبادی قائم ہو گئی۔ اس آبادی کے تمام باشندے معیاری زندگی کے مالک، صداقت اور انصاف کے پیکر، پاک دامن اور راست باز ہیں۔ ان کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کوئی نزاع اتفاقاً ہو جاتا ہے تو ان کی انصاف پروری اور صداقت پسندی اس جھگڑے کو صلح اور آشتی سے بدل دیتی ہے۔ وہ اپنا کاروبار بھی کرتے ہیں مگر اسی راست بازی کے ساتھ، ان کے دستکار اور پیشہ ور بھی ایسے ہی راستباز حق پرست اور طالب مولیٰ ہیں۔ یہ اولیاء اللہ کی بستی ہے بلکہ یہ کہو کہ یہ فرشتوں کی بستی ہے جو ساتویں آسمان سے اتار کر یہاں بسا دی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان کے اندر کوئی بدکار نہیں ہے تو کوئی بدکار باہر سے بھی نہیں آ سکتا۔ ایک دو بدکار باہر سے آ جائیں تو ان کو پکڑ کر باہر نکال سکتے ہیں لیکن اگر انہیں کی نسل میں بدکار ہو جائیں اور ان کی تعداد بڑھتی رہے یا بدکاروں اور غنڈوں کی بڑی جماعت ان پر چڑھ آئے تو صرف خشوع، خضوع، صلوۃ الخوف، گریہ وزاری یا وعظ و پند سے ان کا علاج جا سکے گا۔

ایک ملک کھلے طور پر ناطرفداری کی پالیسی اختیار کرتا ہے کہ وہ کسی سے نہیں لڑے گا اور نہ کسی لڑنے والے کا ساتھ دے گا۔ دنیا جنگجو اور لڑنے والوں میں بٹی ہوئی ہے مگر وہ ہر ایک جنگی گٹھ جوڑ سے علیحدہ ہے ہر ایک کی دوستی کا خواہاں ہے اور ہر ایک سے دوستی کا معاہدہ کیے ہوئے ہے مگر اس کے پڑوس میں ایک توسیع پسند مملکت ہے جو اپنے ملک کی حدود کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنا چاہتی ہے تو اس ملک کی ناطرفدار پالیسی پڑوسی ملک کے اچانک حملہ کا دفاع کر سکے گی؟

(۳) حافظ عماد الدین بن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں آیت کریمہ:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ (سورہ انفال رکوع اول) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

سابق انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں سنت الٰہیہ یہ تھی کہ سرکش قوموں کو جو نبی کے مقابلہ پر بغاوت کرتی رہتی تھیں کسی آسمانی آفت سے تباہ کر دیا جاتا تھا چنانچہ قوم نوح طوفان سے،

عاد، اولیٰ دبور (پچھوا کی سخت آندھی سے) ثمود صیحہ یعنی چنگھاڑ (سخت آواز یا گڑگڑاہٹ جو زلزلے کے وقت ہوتی ہے) سے تباہ کر دی گئی۔ قوم لوط کی آبادی (سدوم اور عمورہ وغیرہ) پر آگ پتھروں کی بارش ہوئی جیسے کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کے وقت ہوتی ہے اوران کی سرزمین کو تہ و بالا کر دیا گیا وغیرہ وغیرہ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی پہلے فرعون اوراس کی فوج کو دریا میں غرق گیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توارت نازل کی گئی تو باغی اور طاغی قوموں کے برباد کرنے کا یہ طریقہ بدل دیا گیا اور حکم یہ ہوا کہ فرماں بردار جماعت نافرمانوں اور مشرکوں کا مقابلہ کرے۔

یہ بات تین ہزار سال سے بھی پہلے کی ہے جب فرعون اوراس کا لشکر غرق گیا تھا۔ یہ قبل از تاریخ کا زمانہ ہے۔ اس وقت تک جس طرح انسان کی دماغی اور ذہنی صلاحیتیں نارسیدہ تھیں تاریخ بھی ابھی سن شعور کو نہیں پہنچی تھی۔ بلکہ اس کے عہد طفولیت نے ابھی قلم لینا بھی نہیں سیکھا تھا۔ خاندانی روایتیں جو سینہ بسینہ چلی آتی تھیں وہی تاریخ ہوا کرتی تھیں۔

برباد ہونے والی قومیں سب ہی ملکوں میں ہوں گی۔ کیونکہ انبیاء سب ہی ملکوں میں آئے۔ ان کی دعوت کو قبول بھی گیا اوراس کے مقابلہ میں سینہ بھی تانا گیا۔ مگر قرآن حکیم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ مثال اور شہادت کے طور پر انہیں قوموں کو پیش کرتا ہے جن کو عرب یا اہل کتاب پہنچانتے تھے اوران کے واقعات ان کے مسلمات میں داخل تھے۔

عاد، ثمود وغیرہ سام ابن نوح علیہ السلام کی نسل [۱۳۳] سے تھے۔ گویا عربوں کے ہم جد [۱۳۴] تھے اس بنا پر عرب ان سے واقف تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے واقعات کی طرح عاد اور ثمود کے واقعات بھی خاندانی روایتوں کے ذریعے پہنچے تھے۔

پھر عاد اور ثمود جو اس زمانہ کی ذی اقتدار اور متمدن قومیں تھیں ان کی حکومتیں بھی عرب کے شمال وجنوب میں تھیں۔ جس طرح جنوبی ومشرقی عرب کے مالک عاد تھے ان کے بالمقابل مغربی وشمالی عرب پر ثمود قابض تھے۔ ان قوموں یا برادریوں سے عرب کا یہاں تک تعلق تھا کہ انہیں کی بنا پر عرب کے دو حصے قرار دیئے گئے۔

(۱) عرب بائدہ (وہ عرب جو تباہ وبرباد کر کے بے نام ونشان کر دیئے گئے)

(۲) عرب باقیہ یعنی عرب عرباء یا عرب عاربہ (جن کی نسلیں چلیں اوراب تک دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں)۔

عاد اور ثمود کو وہ عرب بائدہ میں شمار کرتے تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام بن حاران بن تارح (آذر) اگرچہ عرب نہیں تھے مگر عرب ان کو بھی پہچانتے تھے اوران کے واقعات کا بھی عربوں کو علم تھا۔ اوّل تو اس بنا پر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حقیقی بھتیجے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو تعلق عربوں کو تھا اس کا قدرتی تقاضا تھا کہ وہ ان کے بھتیجے سے بھی واقف ہوں

جو دعوت حق میں ان کے شریک رہے تھے۔

(۳) اس کے علاوہ حضرت لوط نے جس ملک کو اپنا وطن بنالیا تھا وہ شرق اردن یعنی شام کا جنوبی علاقہ تھا (جو دریائے اردن کی وادی میں تھا جہاں اب بحر مردہ بحر مردار یا بحر لوط ہے) اور لوطیوں کے بڑے شہر سدوم اور سمورہ بحر مردہ کے ساحل پر واقع (۱۳۷) تھے یہ علاقہ اگرچہ حجاز عرب سے خارج تھا۔ مگر قریش مکہ چونکہ سفر شام میں برابر اسی راستہ سے آتے جاتے تھے لامحالہ وہاں کے اس مشہور تاریخی واقعہ سے واقفیت رکھتے تھے۔ قرآن حکیم نے عبرت دلاتے ہوئے اس راستہ کا حوالہ دیا ہے۔ (انهما لبامام مبين) (یعنی قوم لوط اور اصحاب ایکہ ایک ایسے راستہ پر رہتے تھے جو ابھی کھلا ہوا راستہ ہے۔ (۱۳۸) (سورہ حجر)

قریش اور ان کے ہم مذہب مشرکین عرب کے علاوہ جو یہودی عرب میں آباد تھے جن سے کتاب اللہ نے خطاب وہ ان تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے واقعات سے اس لیے واقف تھے کہ توریت میں ہر ایک واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔ اگرچہ تحریفات نے ان واقعات کو مسخ کر (۱۳۹) دیا ہے۔

سب سے پہلی قوم جو آسمانی آفت سے برباد کی گئی وہ قوم نوح ہے جو پانی کے طوفان سے برباد کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ سرزمین عراق خصوصا کوہ ارارات کی وادیوں میں جہاں اس طوفان کا مرکز تھا وہاں ایک مہیب طوفان کے نشانات اب تک اہل فن کو ملتے ہیں (۱۴۰)۔

تورات میں نہ صرف یہ کہ اس طوفان کا محل اور مقام بتایا گیا ہے بلکہ اس کشتی (جہاز) کی لمبائی اور چوڑائی بھی بتادی گئی ہے جس پر حضرت نوح علیہ السلام مع جملہ لواحقین کے سوار ہوئے تھے۔

کتاب پیدائش کی چند آیتیں ملاحظہ فرمایئے:

> جب نوح کی عمر چھ سو برس کی ہوئی دوسرے مہینہ کی سترھویں تاریخ کو اسی دن بڑے سمندر کے سب سوت پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑ ں کھل گئیں اور چالیس دن اور چالیس رات زمین پر پانی کی جھڑی لگی رہی۔ (۱۱ تا ۱۳ اب ۸)
>
> اور چالیس دن طوفان کی باڑھ زمین پر رہی اور پانی بڑھ گیا اور کشتی کو اوپر اٹھا دیا۔ سو کشتی زمین پر سے اٹھ گئی اور پانی زمین پر بڑھا اور بہت زیادہ ہوا اور کشتی پانی کے اوپر بہتی رہی اور پانی زمین پر بے نہایت بڑھ گیا اور سب اونچے پہاڑ جو آسمان کے نیچے ہیں چھپ گئے۔ پندرہ ہاتھ پانی ان کے اوپر بڑھا اور وہ سب ڈوب گئے۔ (۱۷ تا ۲۱ ب ۷)

کشتی کی نوعیت:

(خدا نے نوح سے کہا) اور تو اپنے واسطے گوپھر کی لکڑی کی ایک کشتی بنا، اس کشتی میں کوٹھریاں تیار کر اور اس کے باہر اور بھیتر رال لگا اور اس کو ایسی بنا کہ اس کی لمبائی تین سو

ہاتھ اور اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی اونچائی تیس ہاتھ کی ہو اور اس کشتی میں ایک روشن دان بنا۔ اوپر سے لے کر ہاتھ بھر میں اسے تمام کر اور کشتی کے ایک طرف دروازہ بنا اور نیچے کا طبقہ اور دوسرا تیسرا بھی بنا۔ (۱۴-۱۵-۱۶ ب ۶)

خاتمہ طوفان:

پھر خدا نے نوح کو اور سب جانداروں کو اور سب مواشیوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں سوار تھے یاد کیا اور خدا نے زمین پر ایک ہوا چلائی اور پانی ٹھہر گیا اور گہراؤ کے سوتے اور آسمان کی کھڑکیاں بند ہوئیں اور آسمان سے مینہ تھم گیا اور پانی زمین پر سے رفتہ رفتہ گھٹتا جاتا تھا۔ اور ڈیڑھ سو دن کے بعد کم ہوا اور ساتویں مہینہ کی ساتویں تاریخ کو اراراط کے پہاڑوں پر کشتی ٹک گئی (۱۴۱) اور پانی دسویں مہینہ تک گھٹتا جاتا تھا اور دسویں مہینہ کی پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں۔ (۱تا ب ۸)

فائدہ:

تورات کی ان آیتوں کو ملاحظہ فرمایئے اور قرآن پاک کی صرف ایک چھوٹی سی آیت تلاوت کر لیجئے آپ کا وجدان اگر بااحساس ہے تو بے اختیار پکار اٹھے گا کہ بیشک کلام اللہ یہی ہے جس کو قرآن کہا جاتا ہے:

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِىْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِىْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِىِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (سورہ ہود ع ۴)

''اور کہہ دیا گیا۔ زمین اپنا پانی نگل جا آسمان تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا جو کچھ کرنا تھا کر دیا گیا۔ کشتی جودی (۱۴۲) پر ٹھیر گئی اور کہہ دیا گیا۔ پھٹکار ہو ان ظالموں پر۔''

اسی طرح اور تمام تفصیلات کو جو تورات کے تین بابوں میں (۶ تا ۸) میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی رکوع کی ابتدائی آیتوں میں چند جملوں میں اسی قوت اور شوکت کے ساتھ بیان گیا ہے۔ پھر اگر قرآن کا دعویٰ اپنے متعلق یہ ہے کہ وہ توریت کے لیے مُهَيْمِنٌ (چیک کرنے والا۔ اس کے مضامین کو صحیح معیار پر قائم کرنے والا) ہے۔ مُهَيْمِناً علیہ۔ (ع ۶ سورہ مائدہ) تو غلط ہے۔ کلام الملوک ملوک الکلام؟۔

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ جن قوموں کی تباہی اور بربادی کا ذکر قرآن شریف میں گیا ہے وہ قومیں ہیں جن کی بربادی کو عرب اور اہل کتاب تسلیم کرتے تھے اور اسی لیے بالکل صحیح تھا کہ جو قوم سب سے پہلے بلاواسطہ مخاطب ہے اس کے سامنے ان کی تباہی کو بطور حجت اور شہادت کے پیش جائے۔

باقی یہ بات دنیا کی ہر قوم تسلیم کرتی ہے کہ ایسے ہولناک حوادث دنیا میں واقع ہوئے ہیں جن سے پوری قوم برباد کر دی گئی (۱۴۳)۔

یہ واقعات کیوں ہوئے۔ قرآن حکیم نے جن واقعات اور حوادث کا نام لیا ہے ان کی وجہ فسق و فجور، نبی کی

مخالفت اور دعوت حق کے مقابلہ میں کفر وعناد بتائی ہے۔

حافظ عماد الدین بن کثیر رحمہ اللہ جیسے اکابر مفسرین نے اس میں ایک اضافہ یہ کر دیا کہ یہ بربادیاں من جانب اللہ اس لیے ہوئیں۔یعنی قہر خداوندی نے انسانی واسطہ کے بغیر براہ راست ان قوموں کو اس لیے تباہ کہ اس زمانہ میں جہاد وقتال مشروع نہیں ہوا تھا۔جہاد کا طریقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے جاری ہوا۔

جہاد مشروع کیوں نہیں ہوا:

اب یہ بات کہ زمانہ سابق میں جہاد مشروع کیوں نہیں ہوا تھا۔معاند وسرکش قوموں کی بربادی اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ کیوں لے رکھی تھی اور انسانوں کے بجائے فرشتوں سے ان کو برباد کیوں کرایا جاتا تھا۔اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دعوت حق پر لبیک کہنے والوں کی تعداد بہت کم ہوئی تھی اور قلت تعداد کے ساتھ وہ حد درجہ کمزور بھی ہوا کرتے تھے۔چنانچہ نوح علیہ السلام پر اعتراض یہی گیا تھا:

مَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (سورہ ھود ع ۳)

''ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ آپ کے پیرو وہی ہیں جو کھلے طور پر ہم میں رذیل (کمزور بے بس) ہیں۔''

قوم ثمود کے جو لوگ حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے ان کو قرآن حکیم نے الذین استضعفوا (کمزور بنا دیئے گئے تھے) اور ان کے مقابل ارباب اقتدار کو الملأ الذی استکبروا (ارباب اقتدار جو اکڑفوں کرتے تھے) کے الفاظ سے تعبیر ہے اور ان کے دم خم یہ بتائے ہیں۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ تا مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (سورہ اعراف ع ۱۰)

''یہ ارباب اقتدار جو اکڑفوں کرتے تھے ان لوگوں نے ان سے جو اس طبقہ میں سے تھے۔جو کمزور اور بے بس بنا دیئے گئے تھے ان سے کہا واقعی تم لوگوں کو یقین یہ ہے کہ صالح خدا کے فرستادہ ہیں۔ان کمزوروں نے وثوق اور پختگی سے جواب دیا بیشک ہم نہ صرف حضرت صالح علیہ السلام پر بلکہ اس پورے پیغام پر جس کو پہونچانے کے لیے انہیں مبعوث گیا ہے ایمان لا چکے ہیں۔ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ صحیح ہے۔(اس پر ان اکڑفوں والوں نے پلٹ کر جواب دیا۔ہاں ہاں) ہم اسی کا جس پر تم ایمان لائے ہو انکار کرتے ہیں۔پھر ان لوگوں نے (اپنی اسی اکڑ میں) ناقہ کو ہاتھ پاؤں کاٹ کر مار ڈالا۔(صالح جو کچھ کہہ رہے تھے اس سے سرکشی کی اور بہانگ دہل کہا) اے صالح اگر تو خدا کا بھیجا ہوا ہے تو جس عذاب کی دھمکی دے رہا ہے جا اس کو لے آ۔''

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہی لفظ استضعفوا ہے جو قرآن حکیم میں بنی اسرائیل کے متعلق ارشاد

ہوا۔ (سورہ قصص ع) جن کی حیثیت فرعون کے مقابلہ میں یہ تھی کہ فرعون نے بڑے وثوق سے کہہ دیا تھا۔

''ہم عنقریب ایسا کریں گے کہ ان لڑکوں کو ایک ایک (۱۴۵) کر کے قتل کر ڈالیں گے۔
عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔ اور ہمیں ان کے اوپر پوری طرح غلبہ اور قوت حاصل ہے۔
(کہ وہ کھڑے دیکھتے رہیں ہم ان کے لڑکوں کا قتل عام کر دیں اور وہ کچھ نہ کر سکیں)

حضرات مہاجرین کی ہجرت کے بعد مسلمان عورتیں کچھ بچے اور کچھ مجبور مرد مکہ معظمہ میں رہ گئے تھے جو اتنی قدرت نہیں رکھتے تھے کہ مکہ سے نکل ہی آئیں اور کوئی ان کو مدینہ کا راستہ بتا دے ان کے لیے بھی قرآن حکیم میں یہ لفظ استعمال گیا ہے:

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ۔

فرضیت جہاد کی ضروری شرطیں:

آیات الٰہیہ نے ہمیں چند باتوں کا سبق دیا ہے:

(۱) فریقین میں ایک تناسب ضروری ہے۔ مثلاً ایک اور دس یا ایک اور دو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ مسلمانوں کو جہاد و قتال پر آمادہ کریں تو ایک تناسب یہ رکھا گیا کہ تم میں سے مضبوطی سے جم جانے والے (صابر) بیس ہوں گے تو دو سو پر غالب ہو جائیں گے۔ سو ہوں گے تو ایک ہزار پر غالب ہو جائیں گے۔ (سورہ انفال)

اس کے بعد اس میں تخفیف کی گئی اور صرف ایک اور دو کا مقابلہ رکھا گیا کہ اگر صبر و استقامت والے مسلمان سو ہوں گے تو دو سو پر اور ہزار ہوں گے تو دو ہزار پر غالب ہو جائیں گے۔ (سورہ انفال ع ۹)

(۲) اس آیت میں دس گنے یا دو گنے کا لفظ بولا گیا بلکہ تعداد بیان کی گئی ہے کہ بیس ہوں تو دو سو پر اور سو ہوں تو ایک ہزار پر (غالب ہو جائیں گے) یہ طرز بیان ایک لطیف اشارہ ہے کہ فرضیت جہاد کے لیے جماعت ہونی ضروری ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک ایک دو دو آدمی ہی ہوں تو لامحالہ ان کو جہاد کے نام پر قربان کر دیا جائے۔ عاد اور ثمود جیسی اقوام (بائدہ) میں دعوت حق قبول کرنے والوں کی تعداد افراد سے بڑھ کر جماعت تک نہیں پہنچ سکی کہ ان پر جہاد فرض ہوتا۔

(۳) خود اس قوم میں ایک صلاحیت ضروری ہے۔ ایسی صلاحیت کہ وہ دست قدرت کا آلہ کار بن سکے اور مشیت خداوندی کے فیصلہ کو اس کے بندوں میں نافذ کر سکے۔

ایسی نااہل، کج فہم، غیر صالح، شورہ پشت قوم جو قبول حق کی صلاحیت سے محروم ہو جس کے حق میں نبی اور رسول کی تمام سرگرمیاں بے کار رہیں۔ نہ خود اس قوم میں کوئی جنبش اور حرکت پیدا ہوا اور نہ کبھی کوئی ایسی فضا تیار ہو کہ آنے والی نسل سے قبول حق کی توقع کی جا سکے۔ ایسی قوم اس قابل نہیں ہوتی کہ فریضہ جہاد کی ذمہ داری اس

کے سپرد کی جائے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے سیکڑوں سال کی تبلیغ کے بعد حضرت حق کی بارگاہ میں عرض تھا۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکَافِرِیْنَ دَیَّارًا (سورہ نوح ع ۲)

''ان سرکش منکروں کا کوئی ایک آباد گھر بھی زمین پر باقی نہ رہنے دے۔''

اور اس کی وجہ یہ بیان کی تھی۔

اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا (سورہ نوح ع ۲)

''یہ تو کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ اگر ان کو (خداوند) تو نے باقی رکھا تو تیرے دوسرے بندوں کو (جن سے قبول حق کی توقع ہے یا جو دعوت حق قبول کر چکے ہیں۔ یہ اپنے مکرو فریب غلط پروپیگنڈے اور اپنے اثر ورسوخ سے ان کو) بھی گمراہ کر دیں گے۔''

حضرت نوح علیہ السلام کی یہ دعا تھی۔ ایک باغبان کا جذبہ صادق تھا۔ باغبان درخت کی گھن لگی ہوئی بے کار شاخوں کو کاٹ ڈالنا ضروری سمجھتا ہے تا کہ اس کا بیکار بوجھ درخت کی بالیدگی کو نقصان نہ پہنچائے اور اس کا گھن دوسری شاخوں کو اور رفتہ رفتہ پورے درخت کو برباد نہ کر دے۔ ایک مہربان اور حاذق ڈاکٹر سڑے ہوئے عضو کو کاٹنا ضروری سمجھتا ہے تا کہ باقی جسم محفوظ ہو جائے اور یہ انسان ہلاکت سے بچ جائے۔

(۳) لیکن اگر قلت تعداد کے مسئلہ کو لیا جاتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاد مشروع بھی نہ ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جہاد مشروع ہو چکا ہو مگر اس کا حکم اس لیے نہ دیا گیا ہو کہ مسلمانوں کی تعداد اتنی نہیں تھی۔

(۴) ہمارے خیال میں جہاد مشروع نہ ہونے کا سبب یہ بھی تھا کہ منظم جنگ کا طریقہ اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ بیشک عاد اور ثمود کی حکومتیں منظم بھی تھیں اور متمدن بھی۔ لیکن ان کو اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ وہ اپنے یہاں عسکری تنظیم بھی کریں اور فوجی طاقت مہیا کریں۔

کہا جاتا ہے کہ لڑائی کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔ زر، زن، زمین اور ہمیشہ سے ہیں لیکن یہ تینوں چیزیں ایسی نہیں ہیں جن کی لڑائی کے لیے فوجی نظام کی ضرورت ہو۔ غیر متمدن پہاڑی قبائل جو نظام سلطنت سے قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں۔ زر، زمین یا زن کی بنا پر لڑائیاں ان میں بھی ہوتی رہتی ہیں ان کی نوعیت فوجداری کی ہوتی ہے فوجی جنگ نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ فوجوں کے ذریعہ باقاعدہ جنگ کی بدعت اس وقت سے رائج ہوئی جب انسانی ضرورتوں نے اپنے ملک کی سرزمین کو تنگ کر دیا یا اس کو ناکافی بنا دیا۔ مثلاً آبادی اتنی بڑھ گئی کہ رہائش کے لیے ان کو پھیلنے کی ضرورت پڑی۔ اب لامحالہ ان کی نظر دوسرے ملک پر پڑی یا اس ملک کے مصنوعی تمدن کو اونچا کرنے کے لیے۔ یا ترقیات اور عیش پرستی کی ضرورتوں کے لیے جتنی دولت کی ضرورت تھی اس ملک کی جائز اور ناجائز آمدنی اس کو پورا نہیں کر سکی اس وقت جس طرح اقدام کے لیے باقاعدہ فوج کی ضرورت ہوئی دفاع کے لیے بھی فوجی تنظیم کی ضرورت ہوئی۔

(۵) عاد اور ثمود وغیرہ کے جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت خدا کی زمین خالی پڑی تھی۔ انسانی

آبادی کا آغاز تھا۔ جدھر کوئی چلا گیا ہزاروں مربع میل زمین اس کو مل گئی وہ وہیں رہ پڑا۔ وہ کسی دوسرے خطہ یا علاقہ پر نظر ڈالتا خود اس کا محتاج تھا کہ انسان وہاں پہونچیں اور اس خالی رقبہ کو آباد کریں۔

قوم عاد یا قوم ثمود اور اس زمانہ کی ہر ایک قوم کی شکل یہی تھی کہ ان کا مورث اعلیٰ اس خطہ زمین میں پہونچ گیا تھا۔ اس کی اولاد بڑھتی رہی اور اس رقبہ کو آباد کرتی رہی۔

چنانچہ عاد، ثمود، طسم (جدلیس) وغیرہ کے بانی اور مورث اعلیٰ سب حضرت نوح علیہ السلام کی چوتھی یا پانچویں پشت کے افراد (۱۴۷) تھے۔ یہ سرزمین عرب کے مختلف علاقوں میں پہونچے اور وہیں رہ پڑے۔ تین چار پشتوں کے بعد وہاں قابل ذکر آبادی ہوگئی جس سے یہ ایک قوم بن گئی۔ اس کا تمدن بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ اس کے لیے اس رقبہ کی پیداوار کافی تھی۔ معدنیات سونا۔ چاندی وغیرہ کا یا تو علم ہی نہیں تھا اور اگر علم ہو گیا تھا تو ابھی ان کو اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان کی دولت ان کے مویشی تھے۔ اونٹوں کے گلے، گائے بیلوں کے گلے یا بھیڑ بکریوں کے گلے۔ یہی دولت تھی اس دولت کے لیے لڑائیاں ہوتی تھیں مگر وہ اندرون ملک۔ جیسے ہمارے دیہات کے باشندوں میں فوجداری ہو جاتی ہے۔ جس کو فساد کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی اس کو فساد سے ہی تعبیر ہے۔ یہ بات کہ ایک دوسرے پر حملہ کرے، ایک قوم اپنے ملک سے آگے بڑھ کر دوسری قوم پر چڑھائی کرے۔ یہ اقدام جس کے لیے فوجی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت تک اس کی ضرورت (۱۴۸) نہیں ہوئی تھی۔

ہم مقدمہ میں لکھ چکے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات انسانی ارتقاء کے بموجب تدریجی ترقی کرتی رہی ہیں، جیسے جیسے تمدن ترقی کرتا رہا انسانوں کی استعداد اور صلاحیت کا قدم آگے بڑھتا رہا نئے نئے سوالات پیدا ہوتے رہے اسی کے بموجب انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات رہنمائی کرتی رہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ اس وقت نبی کی تعلیم کو نہیں مانا گیا لیکن کچھ دنوں بعد وہی ترقی پذیر اصلاح جو نبی نے پیش کی تھی قوم کا مزاج بن گئی۔

آج ہم یورپ کے لباس، یورپین وضع قطع کو مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ یورپ سے آئی ہوئی تمام چیزیں دو پشت پہلے قطعاً اجنبی تھیں۔ لوگ ان سے نفرت کرتے تھے مگر یہی چیزیں دو نسل بعد ہندوستانیوں کا مزاج بن چکی ہیں (۱۴۹)۔

بہرحال خلاصہ جواب یہ ہے کہ جب منظم جنگ کا طریقہ ہی اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا یعنی جنگ اور جہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا تو لامحالہ اس کا کوئی قانون بھی نہیں تھا اور آسمانی تعلیمات میں بھی اس کے متعلق کوئی رہنمائی نہیں فرمائی گئی۔ اب ایک طرف یہ بات کہ ایمان لانے والوں کی تعداد کم۔ دوسری طرف جنگ اور فوجی نظام سے تمدن کی یہ منزل ناآشنا۔ لہٰذا جنگ و جہاد کے کچھ احکام اگر نازل ہوتے تو وہ قبل از وقت تھے۔ ان سے اصلاح کے بجائے فساد کو شہ مل سکتی تھی۔

سب سے پہلا جہاد:

حضرات مفسرین کے ارشاد کے بموجب اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جہاد مشروع ہوا۔ مگر جہاد کی نوبت آپ کے زمانہ میں نہیں آئی۔ آپ کی وفات سے تقریباً چالیس سال بعد حضرت یوشع علیہ السلام کی زیر قیادت سب سے پہلا مشروع جہاد تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جہاد کیوں نہیں ہوا

''کس قدر عبرت کی بات ہے کہ جب بنو اسرائیل مصر سے نکلے تو اگرچہ اس ملک میں رہتے ہوئے چار سو تیس برس ہو چکے تھے۔ اور بنو اسرائیل کی جو مصر کے باشندے تھے بود و باش چار سو تیس برس تک تھی اور چار سو تیس برس کے آخر یوں ہوا کہ ٹھیک اسی دن خداوند کی فوجیں زمین مصر سے نکل گئیں۔ خروج ب ۱۲-۴۰-۴۱''

توریت میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ سوا چار صدی میں ان کی مردم شماری ۵ لاکھ سے زیادہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ خروج باب ۱۲ کی آیت ۲۶ میں ہے۔

''ان کے مرد سوا لڑکوں کے چھ لاکھ کے قریب تھے۔''

مگر اس تعداد کثیر کے باوجود فرعون کی نظر میں ان کی حیثیت بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہ تھی۔ جس طرح آپ جب چاہتے ہیں بلا تکلف بھیڑوں اور بکریوں کو ذبح کر دیتے ہیں ان کے لاتعداد گلے سامنے کھڑے رہتے ہیں کچھ نہیں کر سکتے۔ یہی حال بنو اسرائیل کا تھا۔ کتاب اللہ نے چند معجزانہ الفاظ میں فرعون کے حوصلہ اور بنی اسرائیل کی پست ہمتی کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ جب فرعون کے ارکان مشورہ [150] (ممبران کابینہ) نے کہا۔ موسیٰ تجھے بھی چھوڑ دیں اور تیرے دیوتاؤں کو بھی۔ تو فرعون نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

سَنُقَتِّلُ اَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِيْ نِسَاءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ (سورہ اعراف ع ۱۵)

''(ان کی حقیقت ہے) ہم ابھی قتل کر دیں گے ان کے لڑکوں کو اور زندہ رہنے دیں گے ان کی عورتوں کو اور ہمیں ان کے اوپر پوری طرح قابو حاصل ہے۔''

خیر! فرعون اور اس کی جماعت کے متعلق پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان پر پندرہ سولہ پشتوں سے حکمران تھی۔ فراعنہ مصر میں یہ سولہواں [151] فرعون تھا جس کے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کا ظہور ہوا۔ قدرتی بات تھی کہ ان کا رعب بنو اسرائیل کے رگ و پے میں رچ گیا ہو لیکن اس کا جواب کہ جب انہیں بنی اسرائیل سے جو اپنی آنکھوں سے فرعون کی غرقابی اور اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت اور کارسازی کا مشاہدہ کر چکے تھے جب انہیں بنو اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

''اس مقدس زمین (شام) میں داخل ہو جاؤ''

اور یہ بھی اطمینان دلا دیا کہ اس سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔ تو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ

آگے بڑھ کر اس ملک میں داخل ہو جائیں اور صرف اس سے خوف کھا گئے کہ یہاں تو بڑے بڑے آدمی رہتے ہیں۔ جو بڑے طاقتور ہیں۔

اور جب ان بارہ آدمیوں میں سے (جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ملک کے حالات کی تحقیق کے لیے بھیجا تھا) دو نے جو باحوصلہ مومن تھے جن کے دل میں خوف خدا تھا یہ اطمینان دلایا کہ صرف تمہارے آگے بڑھنے کی دیر ہے۔

''ان پر چڑھائی کر کے دروازہ تک چلو جیسے ہی تم دروازہ میں قدم رکھو گے اسی وقت تم غالب آجاؤ گے اور اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم صاحب ایمان ہو۔'' (سورہ مائدہ ع ۴)

تو ان پست ہمتوں نے قدرت خداوندی کے تمام مشاہدوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطمینان دہانیوں کے باوجود یہی جواب دیا کہ:

''موسیٰ اگر یہی بات ہے (خدا پر بھروسہ کی) تو تم اور تمہارا خدا چلا جائے ان سے لڑ بھڑ لیں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں یہاں سے نہیں ٹلیں گے۔'' (مائدہ ع ۴)

آخر اس گستاخانہ جواب اور اس پست ہمتی کے بدلہ میں عتاب الٰہی نے ان کو یہ سزا دی کہ یہ ملک ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دیا گیا۔ یہ لوگ زمین پر بھٹکتے پھریں گے۔ (سورہ مائدہ ع ۴)

چنانچہ چالیس سال تک جزیرہ نماء سینا میں ٹھوکریں کھاتے رہے یہاں تک کہ موجودہ نسل کی بڑی تعداد ختم ہوگئی۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام بھی وفات پا گئے۔ نئی نسل اس آزاد فضا میں پیدا ہوئی اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہمت دی کہ حضرت یوشع علیہ السلام کی زیر قیادت انہوں نے ارض مقدس پر حملہ کر کے اس کو فتح اور اس سرزمین میں داخل ہوئے۔

توریت میں ہے:

''سو تم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھاتے رہو گے تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے۔ میں نے جو خداوند ہوں کہا ہے میں اس سارے خبیث گروہ سے جو میری مخالفت پر جمع ہے ایسا ہی کروں گا۔ اس دشت میں وہ برباد ہو جائیں گے اور یہیں ہلاک ہوں گے۔'' (گنتی باب ۱۴ آیت ۳۵)

''بنی اسرائیل چالیس برس تک بیابان میں پھرتے رہے یہاں تک کہ وہ سارے مرد جو مصر سے نکلے تھے ہلاک ہوئے۔ اس لیے کہ وہ خداوند کی آواز کے شنوا نہ ہوئے۔ انہیں سے خداوند نے قسم کھا کر کہا تھا کہ میں تم کو وہ زمین دکھا دوں گا جس کی بابت خداوند نے ان کے باپ دادوں سے قسم کھا کے کہا کہ میں تم کو دوں گا۔ (یشوع باب ۵، آیت ۶-۷)

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اگرچہ جہاد مشروع ہو گیا تھا۔ مگر بنی اسرائیل کی پست ہمتی کے باعث اس کی نوبت نہیں آئی اور مشروعیت جہاد کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارض مقدس پر حملہ کرنے کی ہدایت فرمائی۔ (واللہ اعلم)

جماعت صحابہ کی فضیلت اور سبق آموز کارنامے

رضی اللہ عنہم اجمعین

موضوع کتاب اور سلسلہ کلام کا تقاضا ہے کہ اس موقع پر چند کارنامے حضرات صحابہ کے بھی پیش کر دیئے جائیں۔خروج۔باب ۱۲ آیت ۱۳) کے حوالہ سے آپ نے چند صفحے پہلے یہ پڑھا تھا کہ:

(۱) جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو ان کی تعداد علاوہ لڑکوں کے چھ لاکھ کے قریب تھی۔ بظاہر اس میں مبالغہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ توریت ہی کی روایت کے بموجب یہ چار سو تیس برس بعد مصر سے نکل رہے تھے اور ہر باپ کے اگر تین بیٹے مانے جائیں تو دسویں پشت میں صرف ایک شخص کی نسل کی تعداد ۴۹۔۴۹ اور گیارہویں پشت میں ۱۴۷،۷۷،۱۱ لاکھ ہو سکتی ہے اور یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے آباد ہوئے تھے اور چار سو تیس برس میں گیارہ نہیں بلکہ بائیس نسلیں ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا چھ لاکھ کی تعداد بتقاضاء فطرت و عادت مناسب سے بھی کم ہے۔لیکن توریت کی روایت ہے کہ جب فرعون کو اطلاع پہنچی کہ بنو اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لیے شہر سے نکل گئے ہیں اور فرعون فوج لے کر ان کے تعاقب میں دوڑا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کے سر پر جا پہونچا تو اس چھ لاکھ کے جم غفیر اور انبوہ کثیر کے ہوش گم ہو گئے اور یہاں تک حواس باختہ ہوئے کہ اپنے مربی اور محسن اعظم موسیٰ علیہ السلام کے ادب و احترام کو بالائے طاق رکھ دیا اور گھبرا کر کہنے لگے۔

> مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لیے بیاباں میں لے آیا ہے تو نے ہم سے یہ
> ہم کو مصر سے نکال لایا۔ ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے
> دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کیونکہ ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیاباں
> میں مرنے سے بہتر ہے۔ (خروج باب ۱۴، آیات ۱۱-۱۲)

یہ بنو اسرائیل بھوکے ننگے نہیں تھے ان کے پاس جو کچھ مویشی اور مال و اسباب اپنا تھا۔ وہ سب ساتھ لائے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی کپڑے بھی تھے جو ایک تہوار میں مستعار لیے تھے اور اس کو واپس نہ کر سکے تھے کہ کہیں مصریوں پر اصل حال نہ کھل جائے۔ اس کے باوجود بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی بھول گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو بھی۔

اب آیئے مٹھی بھر (حضرت انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی ہمت ملاحظہ فرمایئے۔ جو اپنی معمولی کھیتی باڑی کو بھی مہاجرین میں تقسیم کر کے انہیں کی طرح بھوکے ننگے ہو گئے تھے۔ ان سے بیعت عقبہ کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ مدینہ میں رہتے ہوئے سرور کائنات محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں گے۔ لیکن جنگ بدر سے پہلے جب ان کو خبر ہوتی ہے کہ مکہ والوں کا مسلح لشکر ابو جہل کی قیادت میں مدینہ کی طرف آ رہا ہے اور سرور

کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کریں اور انہیں انصار سے جنہوں نے صرف مدینہ منورہ میں حفاظت کی ذمہ داری لی تھی مشورہ جاتا ہے تو حضرات انصار کو بیعت عقبہ کی اس شرط کا خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے صرف مدینہ میں حفاظت کی ذمہ داری لی تھی بلکہ بڑے حوصلہ اور ہمت سے والہانہ انداز میں فرماتے ہیں۔

یارسول اللہ! ہم نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی ہے۔ مدینہ میں نہیں جہاں بھی آپ فرمائیں ہم قربان ہونے کے لیے تیار ہیں۔ خدا کی قسم۔ آپ حکم فرمائیں تو ہم سمندروں میں گھوڑے ڈال دیں۔

یہ ہے ہمت اور حوصلہ ان کا جن کی کل تعداد تین سو ستر ہ تھی۔ (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ)

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

(۲) غزوہ احزاب کے بیان میں گذر چکا ہے:

مسلمانوں کی تعداد سے تقریباً آٹھ گنے زیادہ مسلح ہجوم نے جس کو پورے عرب کا تعاون حاصل ہے مدینہ منورہ کو گھیر رکھا ہے پے در پے حملے ہو رہے ہیں مسلمانوں کا تمام کاروبار بند ہے۔ جو کچھ اثاثہ تھا ختم ہو چکا ہے۔ فاقہ پر فاقہ ہے، پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے ہیں، عورتیں، بچے گھروں سے بے گھر، قلعہ میں بند ہیں۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوتا ہے کہ کہیں انصار ہمت نہ ہار جائیں اس لیے آپ نے حملہ آوروں کے ایک بڑے جتھے یعنی قبیلہ غطفان کے سرداروں سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی ان کو دے دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرات انصار کے سربراہ حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ سے استصواب کرتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے ان حضرات نے دربار رسالت میں عرض تھا۔ ان کا ادب اور سلیقہ بھی ملاحظہ فرمائیے اور ہمت وجرأت بھی۔

حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین کے یہ دونوں سردار عرض کرتے ہیں:

یارسول اللہ! اگر اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے تو انکار کی مجال نہیں لیکن اگر ایک رائے ہے تو نہایت ادب سے گذارش ہے کہ کفر کی حالت میں جب ہم اور وہ برابر تھے تب کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ ہم سے خراج یا ٹیکس کا ایک دانہ بھی وصول کر سکے اور اس وقت جب کہ آپ کے طفیل میں اسلام نے ہمارا درجہ بہت بلند کر دیا ہے کیسے ممکن ہے کہ ہم کوئی ایسی شرط منظور کر سکیں۔

حضرات انصار کی یہ اولوالعزمی ملاحظہ فرمائیے۔ پھر بنواسرائیل کی یہ گڑگڑاہٹ دیکھئے۔

موسیٰ۔ یہ وہی بات نہیں ہے جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تا کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیاباں میں مرنے سے بہتر تھا۔ (خروج باب ۱۲- آیت ۱۱-۱۲)

(۳) تین سو تیرہ کی مٹھی بھر جماعت جس کے پاس پورا سامان جنگ تو ہوتا بدن پر پورے کپڑے بھی

نہیں ہیں مسلح دشمن سے جس کی بہادری کی پورے عرب میں دھاک ہے لڑنے کے لیے بدر کے مقام پر پہونچی ہوئی ہے۔ میدان کے بہتر حصہ پر جہاں پانی بھی تھا۔ زمین بھی نرم تھی۔ دشمن قبضہ کر چکا ہے مجاہدین کو اس حصہ میں قیام کرنا پڑتا ہے جہاں پانی کا نام نہیں ہے۔ ریت اتنا ہے کہ چلنا مشکل ہے چلتے ہیں تو پیر دھنسے جاتے ہیں۔ حضرات انصار اور مہاجرین نے اس پریشانی میں ؟ قرآن پاک میں ہے۔

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ "جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے۔"

اس خاموش دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرشتوں کی مدد بھی پہنچی جس سے حوصلے بلند ہوئے۔ ہمتیں بڑھیں اور دفعتہً بے موسم بارش بھی ہوگئی جس کی وجہ سے ریت دب گیا۔ پانی مہیا ہوگیا۔ مسلمان نہا دھو کر مطمئن ہو گئے۔ اب ایک واقعہ بنو اسرائیل کا ملاحظہ فرمائیے۔

جب دریا نیل سے عبور کر کے بیابان "سین" سے گذرتے ہوئے قیدیم پہونچے تو وہاں پینے کو پانی نہ تھا۔

سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پئیں۔ (خروج باب ۱۷ آیت ۲)

سو لوگ موسیٰ پر جھنجلائے کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور ہمارے مواشی کو پیاس سے ہلاک کرے۔ موسیٰ نے خداوند سے فریاد کر کے کہا کہ میں ان لوگوں کا کروں۔ وہ سب تو ابھی مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں۔ (خروج باب ۱۷ آیت ۵۲)

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا اس پتھر پر اپنا عصا مارو۔ حضرت موسیٰ کا عصا مارنا تھا کہ بارہ چشمے پھوٹ پڑے مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بنو اسرائیل کی فطرت تھی۔ انہوں نے انداز اختیار اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا انداز رہا۔ یہی وہ صلاحیت اور سعادت تھی جس نے حضرات صحابہ کو کائنات کی آنکھ کا تارا بنایا۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ

مشروعیت جہاد اور اس کی حکمت

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جہاد بھی احکام شریعت میں داخل گیا۔ اس وقت اگرچہ بنی اسرائیل نے اس کی تعمیل سے پہلو تہی کی مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد دوسرے انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں بنو اسرائیل جہاد کرتے رہے بائبل میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔ مگر قرآن حکیم میں وضاحت کے ساتھ اس جہاد کا تذکرہ ہے جو بنو اسرائیل نے حضرت طالوت (۱۵۲) کی زیر قیادت جالوت کی قوم سے تھا۔ جس میں آخری کامیابی کا سہرا حضرت داؤد علیہ السلام کے سر بندھا۔ پھر انہیں کو ملک عطا (۱۵۳) ہوا اور انہیں کو نبوت سے نوازا گیا۔ قرآن شریف میں اس موقع پر جس طرح مجاہدین کی چند خصوصیات کی طرف اشارہ گیا ہے

جہاد کی حکمت اور مصلحت پر بھی روشنی ڈالی گئی:

''بیشک اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت تھی اور ہے کہ اگر وہ چاہتا تو فطرت انسانی اور طبیعت بشری ایسی بنادیتا کہ اس میں خلاف ونزاع کا مادہ ہی نہ ہوتا وہ فرشتوں کی طرح سراسر خیر ہی ہوتے ان میں شر کا نام ونشان بھی نہ ہوتا۔ اور ان کو معیشت اور زندگی کی کسی ایک حالت پر ہی مجبور ومجبول کردیا جاتا۔ لیکن اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ انسان کو مجبور اور مضطر نہ بنائے اور ہر راہ میں چلنے کی قدرت دیدے۔ پس کتنے ہی ہیں جو ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ کتنے ہی ہیں جو گمراہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ پھر اگر قوموں میں انقلاب کی روح نہ ہوتی اور جو جماعت کسی حالت میں ہے وہ سدا اسی حالت میں چھوڑ دی جاتی۔ تو نتیجہ یہ نکلتا کہ دنیا ظلم وتشدد فتنہ اور فساد سے بھر جاتی اور حق وعدالت کا نام ونشان نہ رہتا۔ بس اللہ کا بڑا ہی فضل ہے کہ جب کوئی ایک گروہ ظلم وفساد میں منہ چھوٹ ہو جاتا ہے تو مزاحمت کے محرکات دوسرے گروہ کو مدافعت کے لیے کھڑا کردیتے ہیں وہ اس کے اقدام کو روکتے ہیں اور اس طرح ایک قوم کا ظلم دوسری قوم کی مقاومت سے دفع ہو جاتا ہے۔''

یہ ہے جہاد کا مقصد اور اس کی حکمت۔ جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر اشارہ فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ

(سورہ بقرہ ع ۳۳)

ترجمہ: ''اگر دفع نہ کرواد ے اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے تو خراب ہو جائے ملک لیکن اللہ فضل رکھتا ہے جہاں کے لوگوں پر (حضرت شاہ عبدالقادر) (اس سے بڑھ کر فضل ہوگا کہ منصف مزاج امن پسندوں کو طاقت بخشتا ہے کہ وہ شرارت پسند ظالموں اور مفسدوں کا راستہ روک دیتے ہیں اور ان کے ظلم وفساد کو بڑھنے نہیں دیتے۔''

پس دفع مظالم نہیں بلکہ توازن قائم رکھنے کے لیے جنگ ناگزیر ہوئی۔ چنانچہ مختلف زمانوں میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر یکے بعد دیگرے مبعوث فرمائے۔ جن لوگوں نے ان کی تعلیم قبول کی انہوں نے اس کے بموجب عبادت خانے اور قربان گاہیں بنائیں۔ مخالف طاقتوں نے ان کو ختم کردینا چاہا اگر ان کے ماننے والوں اور تعظیم کرنے والوں میں جنگی اسپرٹ اور قوت مدافعت نہ ہوتی تو سب عبادت خانے برباد کردیئے جاتے اور بقاء باہم کے سیکڑوں معاہدے اور امن وآشتی کے ہزاروں وظیفے بھی ان کو بربادی سے نہ بچا سکتے۔

سورہ حج کی آیت ذیل میں اسی طرف اشارہ گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنصُرُهُ (سورہ حج ع ۶)

''اگر نہ (۱۵۴) ہوتا ہٹا دینا اللہ کا لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعہ تو منہدم کر دی جاتیں راہبوں کی خانقاہیں، نصاریٰ کے عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے (جو اپنے اپنے زمانہ میں ہدایت کے مرکز رہے اور آخر میں) اللہ کی مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے وہ بھی ویران کر دی جاتیں۔ اور اللہ یقیناً مدد کرے گا اس کی جو مدد کرے گا اس کی۔ (اس کے دین کی)''

مختصر یہ کہ بقاء باہم، امن و آشتی، مذہبی آزادی اور حریت فکر بڑی اچھی چیزیں ہیں۔ انسان اور انسانیت کے بنیادی حقوق ہیں۔ مگر کسی قوم اور ملت کو یہ اسی وقت حاصل ہوتے ہیں اور اسی وقت تک باقی رہتے ہیں جب اس کی قوت دفاع مضبوط ہو۔ مقصد جہاد یہ ہے کہ اگر بنیادی حقوق سلب ہونے لگیں تو قوت کے ذریعے ان کو بحال رکھا جائے اور اگر سلب ہو چکے ہیں تو قوت کے ذریعہ ان کو زندہ جائے۔

دفاع یا اقدام:

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ صرف اسی کے مکلف ہیں کہ اگر آپ کے یہ بنیادی حق سلب ہونے لگیں یا سلب ہو جائیں تو آپ اسی وقت جہاد کریں۔ اگر کسی دوسری قوم کے یہ حقوق سلب کیے جا رہے ہوں یا سلب کر لیے گئے ہوں تو آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور تماشا دیکھتے رہیں۔ کلام ربانی اس دوسرے موقع پر بھی آپ کو للکارتا ہے کہ آپ اٹھیں اور ان کمزوروں کی امداد کر کے اس فتنہ عظیم سے نجات دلائیں۔ ارشاد ربانی کی شوکت ملاحظہ فرمائیے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (الیٰ قولہ تعالیٰ) نَصِيرًا (سورہ نساء ع ۱۰)

''(اے مسلمانو) تمہیں ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے۔ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں کتنی ہی عورتیں ہیں کتنے ہی بچے ہیں (جو ظالموں کے ظلم سے عاجز آ کر) فریاد کر رہے ہیں۔ خدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے نجات دلا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور کسی کو مددگاری کے لیے کھڑا کر دے۔ (سورہ نساء ع ۱۰)

قرآن حکیم کی مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں لفظ (۱۵۵) دفع وارد ہوا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام صرف دفاعی جنگ کی تعلیم دیتا ہے اقدام فرض نہیں کرتا۔ حالانکہ بقدر استطاعت مظلوموں کی امداد فرض قرار دی گئی ہے۔ اور اسی بنا پر سورہ نساء کی اس آیت میں مسلمانوں کو للکارا جا رہا ہے کہ تم ان ظالموں سے جنگ کیوں نہیں کرتے۔

سورہ نساء کی اس آیت کا نزول اگر چہ اس وقت ہوا جب مکہ معظمہ میں کچھ ایسے بے بس اور کمزور مسلمان دشمنان دین کے نرغہ میں تھے۔ لیکن ظاہر ہے مظلومیت صرف اہل مکہ کے لیے مخصوص نہیں۔ نہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی احکام کسی مخصوص رقبہ اور مخصوص علاقہ تک محدود ہیں۔ جہاں بھی بندگان خدا مظلومیت کے فتنہ میں مبتلا ہوں گے اس آیت کا وہ مصداق ہوں گے اور ان کو ضمیر اور رائے کی آزادی دلانے کے لیے مسلمانوں پر اقدامی جہاد فرض ہوگا مگر ظاہر ہے اس اقدام کا مقصد بھی دفاع ہوگا۔ اپنے ملک سے نہیں نوع انسان کے مظلوم گروہ سے۔ اس لیے اگر چہ یہ اقدام ہے مگر قرآن حکیم اس کو دفع ہی قرار دیتا ہے۔ یعنی جس طرح اپنے نفس اپنی جان اپنے اہل وعیال کی طرف سے دفاع فرض ہے۔ جس طرح اپنی ملت اپنے ملک اور اپنے وطن کی طرف سے دفاع فرض ہے اسی طرح حق وصداقت کی طرف سے بھی دفاع فرض ہے حق وصداقت کی راہ میں جو مظلوم و بے بس ہیں ان کی طرف سے بھی جہاد فرض ہے وہ اپنے ملک میں ہوں یا دوسرے ملک میں۔ وہ پورب میں ہوں یا پچھم میں۔ عرب میں ہوں یا عجم میں۔ یورپ میں ہوں یا ایشیا میں۔ اس نجات دہندگی کے لیے کسی قوم پر چڑھائی کرنی پڑے کسی ملک پر اقدام کرنا پڑے سب کچھ کرنا ہوگا اور بحیثیت فرض کے کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کے لیے یہ شرم کی بات ہے؟ دنیا انصاف اور کوئی بین الاقوامی عدالت اس کو ناجائز قرار دے گی اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلایا جا رہا ہے؟ دنیا کچھ بھی کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس کو برداشت نہیں کرتا کہ کہیں بھی انسان کے بنیادی حقوق کسی فرقہ کی چیرہ دستی یا کسی قوم کے جبر وقہر کی نذر ہو جائیں۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (سورہ بقرہ ع ۲۴)

''اور ان لوگوں سے لڑائی جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہی ہو جائے (یعنی دین کے معاملہ میں جس کا تعلق صرف اللہ سے ہے انسان کے ظلم وتشدد کی مداخلت باقی نہ رہے)۔''

سورہ انفال کے پانچویں رکوع میں یہ ہے ویکون الدین کلہ للہ۔ دین کا سارا معاملہ اللہ کے لیے ہی ہو جائے۔

اس آیت کے چند مختصر الفاظ میں جہاد کا مقصد بھی سمجھا دیا گیا ہے اور اس کی انتہا بھی۔ یعنی جہاد اس لیے فرض ہوگا فتنہ باقی نہ رہے اور اس وقت تک فرض رہے گا جب تک یہ آزادی میسر نہ ہو جائے کہ ملک کے کمزور باشندے اپنی صوابدید کے بموجب مذہب اور دین اختیار کر سکیں۔

فتنہ ہے:

سورہ بقرہ اور سورہ انفال کی یہ دونوں آیتیں (قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ الآیة) چونکہ ایسے موقعہ پر آ رہی ہیں کہ سیاق وسباق میں مشرکین مکہ کا تذکرہ ہے اور مشرکین مکہ کا نمایاں فتنہ شرک تھا اس لیے مفسرین نے

عام طور پر فتنہ کی تفسیر شرک کر دی ہے۔ مگر ظاہر ہے شرک فتنہ کی ایک قسم ضرور ہے۔ مگر فتنہ کا انحصار شرک میں نہیں ہے۔ کفار مکہ کا یہ ظلم فتنہ نہیں تھا کہ وہ جبر وقہر سے لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ جس بات کو وہ حق سمجھتے ہیں اسے حق نہ سمجھیں۔

وہ اگر حق کو حق سمجھ کر اس کو قبول کر لیں تو ان کو یہ مہلت بھی نہ دی جائے کہ وہ اپنے وطن عزیز سے نکل کر کسی پناہ گاہ میں پہونچ جائیں جہاں وہ آزادی کے ساتھ احکام حق بجالا سکیں۔ وہ جو قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے۔ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ اور فتنہ قتل سے بھی بہت زیادہ سخت بات ہے وہ صرف کفار مکہ کا شرک تھا۔ راہ خدا سے روکنا، اہل وطن کو پاداش حق میں وطن سے نکال دینا فتنہ نہیں ہے؟

ارض حرم اور مکہ معظمہ پر اس کا قبضہ اور ایسا تسلط کہ جس کو وہ چاہیں داخلہ کی اجازت دیں اور جس کو چاہیں روک دیں باوجود یہ کہ مکہ معظمہ اور کعبہ کا احترام ان سے زیادہ کرتا ہو۔ یہ جابرانہ تسلط فتنہ نہیں ہے؟

پھر صرف دین و مذہب ہی جن چیزوں کا شمار اقتصادیات میں ہوتا ہے مثلاً ربوا اور سود یہ فتنہ نہیں ہے؟

زبان سے ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر سود خوار ہو جائیں۔ اگر احتکار واکتناز (آج کل کی اصطلاح میں چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی) کر کے ضرورت کی چیزوں کو بازار سے ختم یا گراں سے گراں تر کر دیں۔ تو یہ فتنہ نہیں ہے؟

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا جرم تھا جس پر ساری قوم کو تباہ کر دیا گیا۔ تول میں ڈنڈی مارنا اور ناپ میں آنکھ مچولی کر دینا۔ اسی فتنہ کی سزا نہیں دی گئی جو قوم شعیب کو برباد کر دیا گیا؟

سماجی زندگی میں قوم لوط کی خلاف فطرت حرکت کو ایسا قرار دیا گیا کہ نہ صرف لوطیوں کو بلکہ ان شہروں کو بھی اوندھا کر کے نیست و نابود کر دیا گیا جن میں اس فتنہ کا بازار گرم تھا یہ محتکر (ذخیرہ اندوز) جن کو لسان نبوت نے ملعون فرمایا ہے اگر سینہ زوری کریں اور آمادہ جنگ ہو جائیں تو ان کے خلاف جہاد فرض نہیں ہوگا؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ارشاد بخاری شریف میں متعدد ابواب میں متعدد سندوں سے نقل گیا ہے۔ آپ اسی آیت وقاتلوا هم حتی لاتکون فتنة کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فعلنا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان الاسلام قليلا فكان الرجل يفتن فى دينه اما قتلوه اما يعذبوه حتى كثر الاسلام فلم تكن فتنه (بخاری شریف صفحہ ۵۲۵ و۶۴۸ و ۶۷۰)

(ہم اس آیت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عمل کر چکے ہیں جب کہ حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی جو ایمان لے آتا تھا اس کو طرح طرح کے فتنہ میں مبتلا جاتا تھا۔ کسی کو جان سے مار دیتے تھے۔ کسی کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کی کثرت ہو گئی تو فتنہ جاتا رہا۔

اب ایک دوسرا پہلو لیجئے۔

اگر مشرکین کا گروہ ہتھیار ڈال دے تو اس کے برخلاف جہاد اب بھی فرض ہوگا۔ اگر شرک ہی فتنہ تھا تو وہ تو ہتھیار ڈالنے پر بھی موجود ہے حالانکہ کتاب اللہ کی تعلیم یہ ہے۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلاً

(سورہ نساء ع ۱۲)

"پس اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں پھر نہ لڑیں اور تمہاری طرف صلح لا دیں تو اللہ نے نہیں دی تم کو ان پر راہ (شاہ عبدالقادرؒ)"

دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (سورہ انفال ع)

"اگر وہ جھکیں صلح کو تو تو بھی جھک اسی طرف" (شاہ صاحب)

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام اسبق تھا۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ مسلمان ہو جاؤ۔ میں انکار کر دیا کرتا تھا۔ تو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔ لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملہ میں زور زبردستی نہیں) البتہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ اسبق اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تم سے مسلمانوں کے مخصوص معاملات میں بھی مدد لیں۔ (تفسیر ابن کثیر تحت قولہ تعالیٰ لا اکراہ فی الدین)

بہرحال فتنہ ایک عام چیز ہے۔ احادیث میں اس تمام خلفشار کو فتنہ فرمایا گیا ہے جو امت کے طبقات یا افراد میں واقع ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے جس کی پیشین گوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں۔ ایسی احادیث کے مجموعہ کے لیے حضرات محدثین کتاب الفتن کا عنوان اختیار کرتے ہیں۔

کتاب اللہ کی آیتیں ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں۔ فتنہ اور فساد کے الفاظ دو ہیں مگر مفہوم تقریباً ایک ہی ہے۔ جو آیتیں پہلے پیش کی گئی ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ جہاد اس لیے ہے کہ فساد فی الارض ختم ہو۔ یہی مفہوم اس آیت میں بھی پیش کیا گیا ہے کہ جنگ اس لیے ہے کہ فتنہ ختم ہو۔ اس آیت میں یہ اضافہ ہے کہ جنگ کی حد بھی بیان کر دی گئی ہے یعنی جنگ اس وقت تک ہے جب تک فساد ختم نہ ہو۔ جب تک فتنہ باقی رہے۔

مجاہدین کی خصوصیات

جہاد شرعی اور سیاسی جنگ میں فرق

نظم وضبط، ڈسپلن تو ہر ایک فوج کے لیے ضروری ہے اور جب تک فوجیوں میں قوت برداشت اور ہمت و جرأت نہ ہوگی مقاتلہ اور مقابلہ ناممکن ہے۔ ایک بہت بڑی چیز ایثار اور جذبہ فدائیت ہے یہ وہ ٹانک اور وہ جوہری طاقت ہے جو بسا اوقات تھوڑی جماعت کو بہت بڑے لشکر پر ظفر مند اور کامیاب کر دیتی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس کی سیکڑوں مثالیں پیش کرسکتی ہے۔

لیکن جنگ طالوت و جالوت کے اسی بیان میں مجاہدین فی سبیل اللہ اور فدا کاران راہ خدا کی چند خصوصیتوں کی طرف اشارہ گیا ہے۔ یہ خصوصیات جہاد شرعی کو سیاسی جنگ اور مجاہدین برحق کو عام فوجیوں اور لشکریوں سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ حضرت طالوت کے پختہ کار رفقاء جنہوں نے حکم طالوت کی اطاعت کرتے ہوئے نہر کا پانی نہیں پیا تھا۔ اور اس طرح انہوں نے صبر واستقلال، ضبط وتحمل اور اطاعت امیر کا ثبوت دیا تھا۔ ان کی سب سے پہلی خصوصیت جو تمام خصوصیتوں کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور میدان جنگ میں ایک مجاہد حق کو واصل بالحق اور خدا رسیدہ ولی اور قطب بنا دیتی ہے۔ وہ لقاء رب کا یقین واذعان ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ۔ مال ومتاع کے لیے نہیں لڑتا، توسیع مملکت اس کے پیش نظر نہیں ہوتا، وہ نام آوری اور شہرت کو بھی اپنے حق میں زہر ہلاہل سمجھتا ہے۔ وہ اس لیے اپنی جان قربان کرتا ہے کہ کل کو رب العالمین اور اپنے پروردگار کے سامنے اس کو حاضر ہونا ہے جہاں اس کے ہر ایک نیک و بد کا حساب ہوگا اور اسی کے بموجب اس کی آئندہ کی غیر فانی زندگی کا نقشہ جنت کے باغوں میں یا جہنم کی وادیوں میں تیار ہوگا۔

طالوت کے یہی مٹھی بھر، پختہ کار، ایثار شیوہ ساتھی جن کی تعداد اصحاب بدر کی طرح تین سو (۴۵) تیرہ تھی جن کا خصوصی وصف یہ تھا:

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ (سورہ ع ۳۳) ''سمجھتے تھے کہ انہیں (ایک دن) اللہ کے یہاں حاضر ہونا ہے انہیں کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے کہا تھا۔''

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (سورہ بقرہ ع ۳۳)

''کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں اللہ کے حکم سے اور اللہ تعالیٰ کے صبر کرنے والوں (عزم وہمت کے ساتھ اپنے نصب العین پر جم جانے والوں) کے ساتھ ہے۔'' (سورہ بقرہ ع ۳۳)

(۲) اللہ کو مان کر اس کے ساتھی ہونے کا یقین دوسرا وصف ہے جو مجاہدین حق کو فوجی جنگجو سے ممتاز کرتا ہے۔

فَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (سورہ بقرہ ع ۳۳)

''چنانچہ جب وہ (طالوت کے ساتھی) میدان جنگ میں جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلہ پر آئے۔ تو انہوں نے کہا۔ خدایا (تو دیکھ رہا ہے کہ ہم کمزور ہیں اور تھوڑے ہیں اور مقابلہ ان سے ہے جو طاقتو ہیں اور بہت ہیں۔ پس) ہم (صبر و استقلال کی پیاس رکھنے والوں) پر صبر کے جام انڈیل دے اور ہمارے قدم میدان جنگ میں جما دے۔ پھر (اپنے فضل و کرم سے ایسا کر) کہ ہم منکرین حق کے گروہ پر کامیاب ہو جائیں۔''

طالوت کے ساتھیوں نے اپنی اس دعا میں صرف یہی نہیں کہا کہ ہمیں بخش دے بلکہ فتح مندی کی طلب سے پہلے صبر و ثبات کی طلب گاری کی اور کہا۔ ہمیں صبر دے اور ہمارے قدم جما دے۔ کیونکہ خدا کی نصرت انہیں کے حصہ میں آتی ہے جن میں صبر و ثبات کی روح کام کر رہی ہو۔ اور تمام صلاحیتیں اور ہر ایک استعداد و اہلیت مصروف عمل ہو۔ کیونکہ سچی دعا وہی ہے جو استعداد عمل کے ساتھ ہو۔

مختصر یہ کہ مجاہد اپنی نصرت و مدد کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی نصرت کو سمجھتا ہے بہتر سے بہتر ساز و سامان جو اس کے پاس موجود ہونا چاہیے اس کی نظر اس سامان پر یا اپنی حکومت یا حکومت کی عسکری اور فوجی طاقت پر نہیں ہوتی بلکہ اس کی نظر خدا کے فضل و کرم پر ہوتی ہے۔ اسی کی معیت اور رضا مندی پر اس کا اعتماد ہوتا ہے اور ہر وقت وہ اسی کا طالب اور خواستگار رہتا ہے یہ دوسرا وصف ہے جو مجاہد کو فوجی جنگجو سے ممتاز کرتا ہے۔

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (آیت مذکورہ)

''پھر اپنے فضل و کرم سے ایسا کر کہ ہم منکرین حق کے گروہ پر کامیاب ہو جائیں۔''

حق، کلمہ حق، دین حق، مجاہد فی سبیل اللہ کا نصب العین ہوتا ہے۔ وہ لڑنے والوں سے اس لیے لڑ رہا ہے کہ وہ منکرین حق ہیں، وہ حق و صداقت اور دین حق کے مقابلہ پر نبرد آزما ہیں۔ یہ لڑنے والوں سے اس لیے نہیں لڑتا کہ ان کے پاس ملک ہے، وہ حکومت کے مالک ہیں۔ یا یہ کہ ان کے پاس زیادہ دولت ہے یا وہ بڑے پونجی پتی اور سرمایہ دار ہیں۔ بلکہ اس لیے لڑتا ہے کہ وہ کافر ہیں حق کے منکر ہیں۔ وہ اپنی طاقت و قوت حق کو پست اور دین حق کو ذلیل کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔ یہ اس لیے لڑتا ہے کہ دین حق سر بلند ہو۔ ظلم کے قلعے مسمار ہوں اور انصاف کا جھنڈا بلند ہو۔ فتنہ پرور مفسدین کے جتھے ٹوٹیں۔ امن و سکون اور رشد و ھدیٰ کے پرچم لہرائیں۔ کلمۃ اللہ بلند ہو۔

مجاہد دست قدرت کا آلہ کار ہوتا ہے:

اب آپ ان آیتوں پر دوبارہ نظر ڈالیے جن میں جنگ کی مصلحت بیان کی گئی تھی کہ اگر اللہ کچھ لوگوں کو دوسرے لوگوں کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو ملک برباد ہو جاتا۔

ملک کو بربادی سے بچانا منشاء خداوندی ہے۔ یہ مجاہد فی سبیل اللہ اس منشاء کو پورا کر رہا ہے یعنی بقول حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز دست قدرت کا آلہ کار بن رہا ہے (ملاحظہ ہو عہد زریں ص ۱۶۸ تا ص ۱۷۰)

دعوت اسلام کا پس منظر

غزوات وسرایا کے تاریخی اور قانونی اسباب

جنگ اور جہاد کی بحث طویل ہوگئی۔ اب آپ اصل موضوع کی طرف رجوع فرمایئے۔

(۱) مان لیجئے اللہ والوں کی ایک کالونی تمام دنیا سے الگ تھلگ پہاڑوں کے بیچ میں کسی ایسی جگہ قائم ہوئی جہاں دنیاوی ترغیبات کی کوئی چیز نہیں تھی۔

نہ کوئی دریا تھا، نہ کوئی نہر تھی، نہ سبزہ تھا، نہ درختوں کی قطاریں تھیں، نہ وہاں کی ہوائیں ٹھنڈی تھیں نہ وہاں کوئی خوبصورت منظر تھا۔ جھلسے ہوئے کالے کالے پہاڑ تھے، نیچے کنکریلا میدان اور زیادہ تر ریتلا میدان، جو دوپہر کے وقت تنور کی طرح تپتا تھا۔ ہوائیں گرم سموم زہر آلود اور سموم کے جھونکے اتنے سخت کہ ریت کے تودوں کو جہاں سے چاہیں اٹھائیں اور جہاں چاہیں انکا انبار لگا دیں۔ خواہ ان میں کوئی آدمی دب جائے خواہ اونٹ جیسے ڈیل ڈول کا جانور۔

اللہ والوں نے دنیا کی تمام راحت و آسائش تمام زینت ورونق اور اس کی تمام دلچسپیاں دنیا والوں کے لیے چھوڑیں اور سب سے رخصت ہوکر اس بے آب وگیاہ تپتے ہوئے جھلسے میدان میں ڈیرہ ڈال دیا۔ صرف ایک چھوٹا سا چشمہ ان کا سہارا تھا۔ خوراک کے لیے شکاری جانور تھے یا وہ جو اور کھجور جو کئی کئی میل سے ان کو لانے پڑتے تھے۔ یہاں ایک نشان پرانی عبادت گاہ کا تھا۔ یہیں پچھا لٹے سیدھے پتھر رکھ کر دیواریں کھڑی کیں اور یاد خدا میں مصروف ہو گئے۔ صرف خدا واحد کی یاد۔ صرف ایک ذات واحد کی عبادت۔ وہ ذات واحد جس کا کوئی سا جھی نہیں نہ اس کی صفات میں کوئی شریک نہ اس کی ذات میں اس کا کوئی ہمسر۔ وہی ان کا معبود تھا اور صرف اسی ایک معبود کے یہ پرستار تھے۔ متعدد خدا ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھے۔ دیوی اور دیوتاؤں کے تصور سے ان کا ذہن و دماغ پاک تھا۔ خدا جانے دس بیس یا پچاس پشتیں اسی طرح گذریں یہی اللہ والے یا ان کی اولاد یہاں رہتی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ ان کی اولاد جو کاروبار کے سلسلہ میں باہر جانے لگی تھی اس کو باہر کی ہوا لگی۔ اس نے اپنے بزرگوں کے راستہ سے ہٹنا شروع ۔ ان کو باہر کے شرارت پسند لوگوں کا تعاون بھی حاصل ہوا۔ ان کے خیالات اور عقائد میں بھی فرق آ گیا یہاں تک کہ انہوں نے ایک ایسا مذہب بنا ڈالا جو ان بزرگوں کے مذہب کے برعکس تھا جنہوں نے یہ آبادی قائم کی تھی۔ جنہوں نے اس سرزمین کو آباد تھا۔ جنہوں نے یہاں اپنے لیے اور اپنے ہم عقیدہ خدا پرستوں کے لیے ایک عبادت خانہ بنایا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نئے مذہب والوں کا پورا تسلط ہو

گیا بزرگوں کا صرف نام باقی رہ گیا۔ ان کے راستہ پر چلنے والا ایک فرد بھی نہیں رہا۔ انہوں نے اس نئے مذہب کا کچھ ایسا ڈھنگ ڈالا کہ وہ مذہب ان کی آمدنی اور نہ صرف آمدنی بلکہ دولت مندی کا ذریعہ بھی بن گیا۔ اس سے ان کے اقتدار کو چار چاند لگے۔

پھر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص پیدا ہوتا ہے وہ اس شہر اور اس عبادت خانہ کے بانیوں کا صحیح مذہب معلوم کر لیتا ہے۔ وہ اس شہر یا اس آبادی والوں کو ان کے بزرگوں یعنی اس آبادی اور اس عبادت خانہ کے بانیوں کا صحیح طریقہ یاد دلاتا ہے۔

اس شہر کے موجودہ باشندے اور ان کے رہنما ان بزرگوں کو مانتے ہیں۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ اس شہر اور عبادت خانہ کے بانی وہی تھے۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ ان کا مذہب وہ تھا جو یہ مصلح بتا رہا ہے۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ ہمارے بہت سے طریقے غلط ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ اس ہادی اور مصلح کی دعوت قبول نہیں کرتے۔ مصلح زیادہ اصرار کرتا ہے تو وہ اس کے در پے ہو جاتے ہیں۔ اس کو اور اس کے گنے چنے ساتھیوں کو طرح طرح ستاتے ہیں، مارتے ہیں، پیٹتے ہیں، ان کا بائیکاٹ کر دیتے ہیں، ان کی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔ انتہا یہ کہ کچھ ان میں سے وطن چھوڑ کر جان بچانے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر ان کی زیادتیاں پھر بھی بڑھتی ہی رہتی ہیں حتی کہ وہ مصلح کو قتل کر دینے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ مصلح کو اپنی جان کی فکر نہیں ہوتی اس کو اس دعوت کی فکر ہوتی ہے کہ اگر وہ ختم ہو جائے گا تو یہ دعوت ختم ہو جائے گی جس میں سراسر انہیں کا فائدہ ہے جو در پے قتل ہیں، جو اس کے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ مصلح یقین رکھتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ صحیح اور حق ہے اور یہ کہ اس شہر کے باشندوں کا اور اس تمام مخلوق کا جو ان سے وابستہ ہے فائدہ اسی میں ہے جو یہ مصلح کہہ رہا ہے اس کو مانا جائے اور اس پر عمل جائے ورنہ یہ پوری قوم تباہ و برباد ہو جائے گی اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ پھر اس مصلح کو اپنی قوم سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق ہے۔ وہ اپنی جان تباہ کر سکتا ہے مگر اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی قوم تباہ ہو پھر اگر اس کا یقین یہ بھی ہو کہ اس قوم کی تباہی صرف اس کی تباہی نہیں ہوگی بلکہ پورے عالم انسانیت کی تباہی ہوگی اگر وہ مصلح اور جو اس کے ساتھ ہوئے ہیں یہ یقین رکھتے ہیں تو ان کا فرض ہے۔ یہ غلط کار خائن و غاصب جو انہیں بزرگوں کے نام پر جو اس شہر اور اس عبادت خانہ کے بانی تھے اپنا اقتدار جمائے ہوئے ہیں انہیں کے نام پر پورے ملک میں اپنی قیادت و سیادت تسلیم کراتے ہیں۔ انہیں کے نام پر عوام سے دولت سمیٹے ہیں۔ لیکن ان کے تمام طریقے ان بزرگوں کے خلاف ہیں۔ جس مقصد سے یہ عبادت خانہ قائم تھا، جس غرض سے یہ شہر آباد کیا گیا تھا، جس بنیاد پر ان کو سیادت و قیادت کا حق پہونچتا ہے۔ یہ ان سب کو پامال کر رہے ہیں۔ یہ درست ہو گا کہ یہ خائن اور غاصب من مانی کرتے رہیں اور حضرت مصلح اور ان کے مقدس رفقاء خاموش تماشہ دیکھتے رہیں۔ یا ان کا فرض ہوگا کہ اس شہر اور اس خانہ خدا کو ان غاصبوں کے پنجہ سے آزاد کرائیں؟ صرف نصیحت کر

دینے اور سچی باتیں سنا دینے پر ان کا کام ختم ہو جائے گا؟ یا اصلاح اور حق پرستی کے سچے جذبات کا فیصلہ یہ ہوگا کہ اس خانہ خدا کو اس کا اصل مقام دلانے اور آبادکاری شہر کے اصل مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے جان کی بازی لگا دیں اور اس نصب العین کے لیے اپنی تمام صلاحتیں قربان کر دیں۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

کعبہ ہے......آبادی مکہ کا مقصد

سابق نمبروں میں ایک مثال پیش کی گئی تھی وہ ایک خواب تھی۔ اب اس کی تعبیر ملاحظہ فرمایئے۔

خدا کے پاک اور برگزیدہ بندے سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جو عراق، مصر اور شام کے سرسبز اور شاداب علاقوں میں حیات عزیز کی تقریباً نوے یا اس سے بھی زیادہ بہاریں گذار چکے تھے وہ اپنے ننھے منے جگر اور اس کی ماں کو لے کر چلتے ہیں اور ان کو ایک سنسان وادی میں لیجا کر بٹھا دیتے ہیں یہ وادی دنیا کی تمام زیب و زینت سے محروم ہے۔ رونق سے ناآشنا قطعاً غیر آباد۔ اس کا منظر بھیانک، سب طرف جھلسی ہوئی پہاڑیاں، سرسبزی اور شادابی کا نام نہیں، آب وہوا گرم، نہ کوئی چشمہ نہ دریا، نہ آس پاس کوئی کنواں۔ کبھی ایسی بارش ہو کہ یہ پوری وادی جھیل بن جائے اور کبھی کئی کئی سال گذر جائیں اور بارش ایک بوند نہ ٹپکے۔

اس سے بڑھ کر نفس کشی، خلوت نشینی، دنیا سے کنارہ کشی، دنیاوی دلچسپیوں اور دنیاداروں کے دھندوں سے بےتعلقی ہوسکتی ہے اور کون سا ترک اور تیاگ ہے۔ جس کا درجہ اس سے اونچا مانا جائے۔ کھانے پینے کا کوئی مستقل انتظام تو ہوتا سر چھپانے کے لیے جھونپڑی بھی نہیں بنائی گئی۔ صرف ایک درخت ہے جس کے نیچے یہ بیٹھ گئے ہیں یہی رین بسیرا ہے اور یہی راحت کدہ اور آرام گاہ۔ یہ شہر مکہ کی بنیاد کی سب سے پہلی اینٹ ہے۔

مقصد:

اس طرح اس مقام پر آباد کر دینے کا مقصد ہے؟

خود آباد کرنے والے کا اقراری وثیقہ ملاحظہ فرمایئے۔ جس کے الفاظ کتاب اللہ نے اس طرح قلم بند فرمائے ہیں۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ

(سورہ ابراہیم ع ۶)

''اے ہمارے رب۔ میں نے اپنی کچھ اولاد وادی غیر ذی زرع میں ٹھیرا دی ہے۔ تیرے واجب الاحترام بیت کے پاس تا کہ وہ نماز قائم کریں۔''

قربان جایئے قرآن پاک کی معجزانہ بلاغت کے۔ اس مقام کو وادی غیر ذی زرع سے تعبیر ہے۔ وادی پہاڑوں کے بیچ کا وہ میدان جہاں سیلاب کا پانی گذرتا ہے۔ غیر ذی زرع۔ یعنی اس میں نہ کاشت ہوتی ہے نہ

قابل کاشت ہے۔ایسا میدان اسی کی ملک ہوتا ہے جو اس کو آباد کرے حکومتیں آبادیاں برباد کر کے شہر آباد کرتی ہیں۔سیکڑوں ہزاروں کھیت باغ اور باغیچے ایک شہر کی آبادکاری کی نذر ہو جاتے ہیں۔کسی کی قیمت ادا کی جاتی ہے اور کسی پر جابرانہ قبضہ کر لیا جاتا ہے لیکن غیر آباد اور غیر مزروع علاقہ کسی کی ملک بھی نہیں ہوتا اس کے آباد کرنے میں کسی کو شکایت تو ہوتی تعمیر و ترقی کا ہر ایک حامی اس کا شکر گذار ہوتا ہے۔حکومتیں ایسے آبادکاروں کی ممنون ہوا کرتی ہیں ان کو خاص خاص رعایتیں دی جاتی ہیں۔حضرت ابراہیم اور ان کے جانشیں نے (علیہم السلام) اس وادی پر قبضہ تو وہ یقیناً جائز اور صحیح قبضہ تھا۔عند بیتك المحرم

ہاں ایک پڑوس یہاں ضرور تھا مگر وہ پڑوس اسی کا تھا جس کی یہ وادی تھی۔جس نے اپنے تشریعی قانون کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق دیا تھا کہ یہاں گھر بسائیں۔شہر آباد کریں۔

وہی مالک ارض وسماء جو رب العالمین ہے اسی کا یہاں گھر تھا۔جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے ڈالی تھی اس کے پڑوس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کو آباد تا کہ نماز قائم رکھیں یعنی اس خاص ضابطہ اور قاعدہ سے (جو اس وقت نماز کا ہوگا) یاد خدا میں مصروف رہیں لیقیموا الصلوٰۃ

آبادکاری کے لیے متوکلانہ پروپیگنڈہ:

اچھا یہ تو ایک عورت اور اس کا ایک بچہ ہے۔کیا تنہا یہی رہیں گے۔اگر تنہا رہے تو کچھ دنوں بعد ختم ہو جائیں گے۔کیا ان کو ختم کرنے کے لیے ہی یہاں ٹھہرایا گیا ہے اگر مقصد ختم کر دینا ہے تو یہ ایک قاتلانہ اقدام ہے اور اگر ہر شخص ایسا اقدام کرے کہ اپنی بیوی اور ننھے بچے کو ویران جنگل اور لق ودق میدان میں ڈال آیا کرے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ عمل نسل کشی کا ایک سبق ہوگا۔معاذ اللہ۔

لیکن اگر اس عورت اور بچہ کو بڑھانا ہے اور آبادکاری کا جو بیج بویا گیا ہے اس کو بار آور بنانا ہے تو پھر اس کا پروپیگنڈا ہونا چاہیے کہ یہاں آبادی شروع کی گئی ہے لوگ یہاں آئیں مگر پروپیگنڈے کے لیے کس ایجنسی کی خدمات حاصل کی جائیں؟

اچھا جس کا یہاں گھر ہے۔اسی سے کہو:

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ (سورہ ابراہیم ع ۶)

''(اے ہمارے رب) لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے۔''

مگر جو لوگ یہاں آئیں گے ان کی غذا کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا نہ اس وقت یہاں غلہ ہوتا ہے نہ یہ زمین اس قابل ہے کہ یہاں کاشت ہو سکے۔کھجور کے درخت بھی یہاں نہیں ہوتے۔آس پاس کوئی بازار اور منڈی بھی نہیں ہے جہاں سے غلہ آسکے۔

اچھا! جس نے یہاں اپنا بیت بنا رکھا ہے یہ مسئلہ اس کے سامنے رکھنا چاہیے مگر درخواست پیش کرنے سے

پہلے یہ تحقیق کر لینی چاہیے کہ قوت لایموت یعنی ایسی کوئی غذا جس سے ایک تارک دنیا خدا پرست کی زندگی باقی رہ سکے یہاں موجود ہے یا نہیں۔ پھر اسی کی درخواست کرنی چاہیے جس کی ضرورت ہو جس کا یہاں میسر آنا ناممکن ہو۔

ہاں ایک چیز یہاں موجود ہے۔ شکار اور ایک عجیب بات قدرت نے یہاں کی آب و ہوا میں رکھی ہے کہ اگر چہ یہ علاقہ گرم ہے مگر گوشت یہاں خوب ہضم (۱۵۸) ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں کی آب و ہوا کے لیے سب سے بہتر غذا گوشت ہے (۱۵۹)۔

اس غذا کے فراہم کرنے کے لیے تیر اندازی کی مشق ہونی چاہیے۔ اگر یہ بچہ تیر انداز (۱۶۰) ہو گیا تو بھوکا کبھی نہیں رہ سکتا۔ نہ اس کے بچے بھوکے رہ سکتے ہیں۔

البتہ ایک عبادت گذار کی لطیف زندگی کے لیے بدرقہ کی ضرورت ہے۔ اگر کچھ پھل یہاں مل جایا کریں تو بدرقہ میسر آ سکتا ہے۔ لہٰذا یہی درخواست کرنا چاہیے۔

وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (سورہ ابراہیم)

''ان کو کچھ پھلوں کا رزق عطا فرما دے امید ہے کہ وہ (یہاں کے باشندے) تیرے شکر گذار رہیں گے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو یہ شرط لگا دی تھی۔ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (سورہ بقرہ ع ۴) یعنی اہل مکہ میں سے ان کو پھلوں کا رزق عطا فرما جو ان میں سے اللہ اور آخرت پر ایمان رکھے مگر وہ رب البیت جو رب العالمین ہے اس نے یہ شرط تسلیم نہیں کی کیونکہ یہ دنیا اور اس دنیا کی نعمتیں سب کے لیے ہیں۔ یہاں مومن و کافر کا فرق نہیں ہے۔ فرق یہ ہو گا کہ اہل کفر کے لیے یہ نعمتیں اسی دنیا فانی کی چند روزہ زندگی کے لیے ہوں گی۔ پھر ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہو گا اور اہل ایمان کو جس طرح دنیا میں یہ نعمتیں میسر آئیں گی آخرت میں بھی ان کے لیے مخصوص ہوں گی (۱۶۱)

حفاظت:

سکونت، پڑوس اور رزق۔ سب بیکار ہیں۔ اگر حفاظت کا انتظام نہ ہو۔ یہ تمام دنیا سے الگ تھلگ آبادی اگر چہ بعد میں اُم القریٰ ہو گئی۔ لیکن اس وقت تو قطعاً غیر محفوظ تھی۔ اندرون آبادی نہ کوئی پولیس تھی نہ تھانہ تھا، نہ بیرونی حملہ کی مدافعت کا کوئی انتظام تھا ایک ماں اور اس کا ایک بچہ یہی کل کائنات تھی۔

مگر جس بیت کے پڑوس میں اس بچہ اور ماں کو آباد گیا ہے۔ اس کا محافظ کون ہے؟ جو اس بیت کا مالک اور رب ہے۔ اسی سے پڑوسیوں اور رزق کی درخواست کی گئی ہے۔ اسی سے یہ درخواست بھی کرنی چاہیے۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (سورہ بقرہ ع ۱۵) ''اے رب اس کو امن و امان کا شہر بنا دے''

حرم:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی تو آپ نے خانہ کعبہ یا اس کے پڑوس تک امن کو محدود نہیں رکھا۔ بلکہ کئی کئی میل تک اس کی حدود پھیلا دیں کہ یہ سارا علاقہ حرم ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں یہ شہر اور یہ علاقہ کھلا ہوا علاقہ ہے جس پر حملہ نہیں جا سکتا۔ نہ یہاں قتل وخون کیا جا سکتا ہے۔ اس علاقہ میں کوئی شکاری جانور خود سے داخل ہو جائے تو اس کا شکار کرنا حرام اور کوئی پکڑ کرلے جائے تو اس پر لازم ہے کہ جیسے ہی وہ اس حرم میں داخل ہو اس کو چھوڑ دے۔

دو پارٹیاں دو فوجیں اگر کہیں برسرِ پیکار ہیں اگر وہ حرم میں داخل ہوں تو یہاں ہتھیار رکھ دیں۔ جب تک حدودِ حرم میں ہیں وہ جنگ نہیں کرسکتیں۔

مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (سورہ آل عمران ع)

''جو اس کے اندر آیا امن میں آ گیا۔''

شہر مکہ کی آبادی کا مقصد

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا الآیہ (سورہ ابراہیم رکوع ٦)

''(اور یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے دعا مانگی۔ اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا شہر بنا دے اور بچا مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے کہ ہم بتوں کی پوجا کرنے لگیں۔ پروردگار ان بتوں نے بہت سے آدمیوں کو راہ حق سے بھٹکا دیا ہے۔ پس جو کوئی میری راہ چلا وہ میرا ہے اور جس نے میرا کہا نہ مانا۔ اس سے میرا تعلق نہیں۔ بیشک تو غفور رحیم ہے۔

اے ہم سب کے پروردگار۔ میں نے بسائی ہے ایک اولاد ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام ونشان نہیں ہے تیرے ادب والے گھر کے پاس (تیرے واجب الاحترام بیت کے قریب) اور خدایا اس لیے بسائی ہے کہ قائم رکھیں نماز۔ پس تو اپنے فضل وکرم سے ایسا کر کہ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اور روزی دے ان کو میووں سے۔ امید ہے کہ یہ لوگ شکر گذار ہوں گے۔'' (۱۶۲)

کعبہ

اچھا یہ بیت جس کا یہ احترام اور یہ شان ہے۔ یہ ہے۔ یہ کب بنا، کیوں بنا، اس کا مقصد ہے۔ اس کی

خصوصیتیں ہیں۔ اور اس کے متعلق انسانوں کا فرض ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو یہاں آبادی بسا رہے ہیں
انہیں کرنا چاہیے۔ (علیه وعلی نبینا الصلوٰة والسلام)

کب بنا:

اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ (سورہ آل عمران ع ۱۰) ''سب سے پہلا گھر جو بنایا گیا۔''

کیوں بنا:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (سورہ آل عمران ع) سب سے پہلا گھر جو بنایا گیا تمام انسانوں کے لیے
مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (سورہ بقرہ ع ۴)
''مقام رجوع تمام انسانوں کے لیے (جہاں لوگ بار بار آئیں اور جی نہ بھرے) اور مقام امن۔''
مُبَارَکًا وَّھُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ (سورہ آل عمران ع)
''سب کے لیے برکت والا سارے جہانوں کے لیے رہنما۔''

مقصد اور خصوصیتیں:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاھِیْمَ مُصَلًّی وَعَھِدْنَا اِلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّائِفِیْنَ وَالْعَاکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ (سورہ بقرہ ع ۱۵)

''اور جب ٹھہرایا (مقرر کر دیا) ہم نے اس بیت کو مرکز اجتماع۔ تمام انسانوں کے لیے (جہاں عرب عجم، کالے گورے، اُونچ نیچ سب کا اجتماع ہو) اور سب کے لیے پناہ ہو اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لیے) نماز کی جگہ بنالو اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو حکم دیا تھا کہ میرے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے اسے طواف کرنے والوں عبادت کے لیے ٹھہرنے والوں اور رکوع سجود کرنے والوں کے لیے (ہمیشہ) پاک رکھنا۔''

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبَارَکًا وَّھُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ فِیْهِ اٰیَاتٌ بَیِّنَاتٌ مَّقَامُ اِبْرَاھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا (سورہ آل عمران ع ۱۰)

''بلاشبہ پہلا گھر جو انسانوں کے لیے (خدا پرستی کا معبد و مرکز) بنایا گیا۔ وہ یہی (عبادت گاہ) ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام انسانوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ۔ اس میں (دین حق کی) روشن نشانیاں ہیں۔ (از انجملہ) مقام ابراہیم ہے (از انجملہ یہ بات ہے) کہ جو کوئی اس (کے حدود) میں داخل ہوا۔ وہ امن میں آ گیا (از انجملہ) اللہ کی

طرف سے لوگوں کے لیے یہ بات ضروری ہوگئی کہ اگر اس تک پہونچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں۔''

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَاماً لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ

(سورہ مائدہ ع ۱۳)

''اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو یعنی اس خانہ خدا کو جو واجب الاحترام ہے قیاما للناس بنایا ہے۔ انسانوں کے باقی رہنے کا مدار (کسی ایک قوم یا فرقہ یا کسی ایک ملک یا نسل نہیں بلکہ تمام انسانوں کے بقاء کا مدار ہے کہ جب یہ ختم کر دیا جائے گا تو نص حدیث کے بموجب اس کے بعد قیامت آ جائے گی) جس سے لوگوں کا امن اور ان کی جمعیت قائم ہے اور (جس طرح خانہ کعبہ لوگوں کی حفاظت نگہداشت کا ذریعہ ہے کہ جو یہاں پہونچ جاتا ہے محفوظ ہو جاتا ہے اسی طرح اشہر حرم بھی ذریعہ حفاظت ہیں کہ) ان مہینوں میں قتل وقتال لوگ نہیں کرتے تھے ایسے ہی حج کی قربانی کو اور قربانی کے ان جانوروں کو جن کی گردنوں میں علامت کے لیے پٹے ڈال دیتے ہیں (جن کی وجہ سے وہ بھی محفوظ رہتے ہیں اور ان کے قافلے بھی۔ پس کعبہ کی اور کعبہ کی ان تمام رسوم وآداب کی حرمت قائم رکھو۔

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءَنِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ وَمَنْ يُرِدْ فِيْهِ بِالْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (سورہ حج ع ۳)

''وہ صاحب احترام مسجد جس کو بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے عبادت گاہ ٹھہرا دیا ہے۔ خواہ وہیں کا رہنے والا ہو یا باہر سے آنے والا (اس میں سب برابر ہیں) اور جو کوئی بھی اس کے اندر از راہ ظلم حق سے منحرف ہونا چاہے گا (بے دینی کا ارادہ کرے گا) ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔''

مختصر یہ کہ

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے مکہ معظمہ کی بنیاد رکھی۔ یہ شہر اس لیے بسایا گیا تھا کہ خدا واحد کے عبادت گذاروں کا ایک ایسا مرکز قائم ہو جائے جہاں امن وامان رہے اور وحدہ لاشریک لہ کے پرستار وہاں نماز قائم کرسکیں یعنی اطمینان سے خدا واحد کی عبادت کرسکیں۔

کعبہ:

کسی ایک برادری۔ قوم۔ یا کسی ایک نسل کا نہیں بلکہ پوری نوع انسان کے لیے مرکز اجتماع ہے، پناہ گاہ، صاحب برکت ہے، سارے جہانوں کے لیے رہنما ہے، قیاما للناس ہے، دنیا کے کسی بھی حصہ کا کوئی رہنے والا ہو اس مرکز اجتماع اور خدا پرستوں کی اس پناہ گاہ میں اس کا وہی حصہ ہے وہی حق ہے جو خود یہاں کے باشندہ کا حق ہے جو رات دن اس کی خدمت کرتے ہیں اسی کی ڈیوڑھی پر پڑے رہتے ہیں اسی کی دیواروں کے سایہ میں رات دن گذارتے ہیں۔ وہ اور باہر سے آنیوالے یہاں سب برابر ہیں۔

مکہ معظّمہ اور خانہ کعبہ کے متعلق مشرکین عرب کے عقائد و جذبات

مکہ معظمہ اور خانہ کعبہ کے متعلق ہم نے صرف قرآن حکیم کی آیتیں پیش کی ہیں اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک طویل روایت کی روشنی میں (جس کا ماخذ بخاری شریف ہے) ہم نے ان آیتوں کی وضاحت کی ہے۔ مگر یہ صرف قرآن حکیم کے تعلیم فرمودہ عقائد نہیں ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مشرکین عرب کے مسلمات ہیں اور جیسا کہ فرقان حمید کا عام اسلوب ہے کہ وہ مشاہدات سے یا ان حقائق سے استدلال کرتا ہے جو فریق مخاطب کے عقیدہ کے مطابق اور تسلیم شدہ ہوتے ہیں۔ اس نے مکہ معظّمہ یا خانہ کعبہ کے متعلق بھی جو باتیں بیان کی ہیں وہ مشرکین مکہ کے نزدیک تسلیم شدہ تھیں۔ وہ ان کو صرف مانتے ہی نہیں تھے بلکہ تقریروں، تحریروں خطبات اور قصائد و اشعار میں بڑے فخر سے ان کا پروپیگنڈا کرتے تھے۔

مشرکین عرب کے بچہ بچہ کا عقیدہ تھا کہ خانہ کعبہ بیت اللہ ہے شہر مکہ کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جن کی نسبت سے یہ اپنے آپ کو بنو اسمٰعیل کہا کرتے تھے۔ ذبیح اللہ ہیں۔

اصحاب فیل کا واقعہ جو اسی سال پیش آیا تھا جس سال کائنات ارضی سرور کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی سے پرنور ہوئی تھی۔ جس سے قریش کی عظمت کو چار چاند لگے تھے۔ اس موقع پر اصحاب فیل کے مقابلہ میں قریش نے جو تدبیر کی جس کو اپنا آخری چارہ کار سمجھا وہ ان کے عقائد کے متعلق بہت بڑی شہادت ہے اس سے ان کے جذبات کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔

مشہور واقعہ ہے جس کو تمام ہی مؤرخین نے بلا اختلاف نقل ہے کہ جب عبدالمطلب ابرہہ کے پاس پہونچے اور انہوں نے ابرہہ سے اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ جس پر ابرہہ نے بڑے تعجب سے کہا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ تم خانہ کعبہ کے متعلق کوئی سفارش کرو گے تم نے صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ خانہ کعبہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا تو عبدالمطلب نے برجستہ جواب دیا تھا۔ اونٹوں کا مالک میں ہوں۔ اس لیے میں نے ان کا مطالبہ باقی خانہ کعبہ جس کا ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔

خواجہ عبدالمطلب ابرہہ کو یہ جواب دے کر واپس آئے۔ قریش کو ہدایت کی کہ شہر خالی کر کے پہاڑوں پر پہونچ جائیں اور جب خود روانہ ہونے لگے تو کعبہ پر آئے اور حلقہ باب کو پکڑ کر یہ مناجات کی۔

(۱) لاهم ان العبد يمنع رحله فامنع حلالك (۲) لايغلبن صليبهم – ومحالهم غدوا محالك (۳) ان كنت تاركهم وقبلتنا فامر ما بدالك

یہ تین اشعار ابن ہشام نے نقل کیے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ دو اشعار بھی مروی ہیں۔

جروا جمع جموعهم – والفيل كي يسبو عيالك عمدوا حماك بكيدهم جهلا وما رقبوا جلالك

ترجمہ: (۱) ایک غلام اپنے کجاوہ کی حفاظت کرتا ہے۔ پس (خداوند) تو ان کی حفاظت کر جو تیرے بیت کے پڑوسی اور مجاور ہیں۔

(۲) ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی صلیب اور ان کا مکروفریب کل کو تیری تدبیر پر غالب آ جائے۔

(۳) اگر میں ان کو (ابرہہ اور اس کے لشکر کو) چھوڑ رہا ہوں اور یہ جو ہمارا قبلہ ہے اس سے رخصت ہو رہا ہوں (یہ تو میرا فعل ہے میں کمزور ہوں اور کچھ کر بھی نہیں سکتا) اب تجھے اختیار ہے جو تیرا ارادہ ہو اس کے نافذ ہونے کا حکم کر دے۔

(۴) یہ اپنے بے شمار لشکروں کو لے آئے ہیں اور ہاتھیوں کو لائے ہیں تاکہ باشندگان مکہ کو جو تیرے عیال ہیں ان کو قید کرلیں۔

(۵) ان لوگوں نے اپنے مکروفریب اور جہالت سے تیرے حما (محفوظ علاقہ۔حرم) کا قصد ہے انہوں نے تیری عظمت کا پاس ولحاظ نہیں ۔

یہاں اگر اس پورے واقعہ کو نقل کر دیا جائے تو غالبا ہم حضرات قارئین کے انتظار واشتیاق کا مطالبہ پورا کریں گے۔

ابن ہشام نے سیرت ومغازی کے مشہور امام ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل ہے کہ جب عرب کو معلوم ہوا کہ ابرہہ حبشی فوجوں اور ہاتھیوں کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ پر حملہ کرنے اور خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے روانہ ہوا ہے تو پورے عرب نے محسوس کہ اس کا مقابلہ ضروری ہے چنانچہ یمن ہی کے ایک سردار نے جس کا نام ذونفر تھا عربوں کی فوج بنا کر ابرہہ کا مقابلہ ۔مگر وہ ناکام رہا اور گرفتار ہو گیا۔ جب اس کو ابرہہ کے سامنے پیش گیا تو اس نے یہ قول (وچن) دے کر امان مانگی:

عسى ان يكون بقائى معك خير الك من قتلى (سیرۃ ابن ہشام ص۳۰ ج۱)

بہت ممکن ہے میری زندگی کسی موقع پر میری موت کے مقابلہ میں بہتر ثابت ہو۔

اس مقابلہ سے نمٹ کر ابرہہ آگے بڑھا تو جبل خثعم کے دامن میں نفیل بن حبیب خثعمی نے اس کا مقابلہ ۔قبیلہ شہران اور قبیلہ ناہش اور ان کے علاوہ عرب کے بہت سے قبائل اس کے ساتھ تھے مگر یہ قبائل بھی تاب مقابلہ نہ لا سکے۔ان کا سردار نفیل گرفتار ہو گیا اور جب نفیل نے دیکھا کہ وہ موت کے منہ میں پہونچ گیا ہے تو اس نے نہ صرف اپنی وفاداری کی پیشکش کی بلکہ یہ بھی وعدہ کرلیا کہ وہ سرزمین عرب میں راستہ بنانے کی خدمات انجام دے گا اور یہ کہ کوہ خثعم پر آباد دونوں قبیلے شہران اور ناہش جو اس کے دو باز وہیں ابرہہ کے مطیع وفرمانبردار رہیں گے۔

اب ابرہہ اپنی فوجیں لیے طائف پہنچا تو اہل طائف نے اس سے پہلے ہی امن حاصل کرلیا ایک شخص ابو

رغال کو ساتھ کر دیا جو مکہ معظمہ کے راستوں سے واقف تھا۔ ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ ابو رغال نے ابرہہ کو مکہ تو پہونچا دیا مگر ابھی ابرہہ پر عذاب الٰہی نازل نہیں ہوا تھا کہ ابو رغال شکنجہ موت کی گرفت میں آ گیا۔ قریش نے اس کو غدار قرار دیا اور اس کو سنگسار نہیں جا سکا تو اس کی قبر پر سنگباری کی جاتی رہی۔

بہر حال ابرہہ نے مکہ کے قریب ''مغمس'' مقام پر فوجیں اتار دیں اور اسود بن مقصود کو فوج کے ایک دستہ کا کمانڈر بنا کر غارتگری کے لیے تہامہ (مکہ) بھیج دیا۔ اس نے اونٹوں کے اصطبلوں پر حملہ اور تمام اونٹ ہنکا کر لے آیا۔ ان میں دو سو اونٹ خواجہ عبدالمطلب کے بھی تھے جو اس زمانہ میں قریش کے سردار تھے اور جود و سخا میں مشہور تھے۔

اب قریش، کنانہ، ہذیل اور جو قبائل ان کے حلیف و معاہد تھے انہوں نے مقابلہ کا ارادہ ـ مگر ابرہہ اتنی زبردست فوج لے کر وہاں پہونچا تھا کہ ان قبیلوں کو مقابلہ کی ہمت نہیں ہوئی۔

ابرہہ کے متعلق ابن ہشام کی رائے یہ ہے کہ کان رجلا حلیماً وہ متحمل مزاج انسان تھا۔

غالباً یہ اس کی تحمل مزاجی تھی کہ اس نے دفعتہً حملہ نہیں کرایا۔ بلکہ اپنے ایک افسر حناط حمیری کو مکہ معظمہ بھیجا کہ یہ پیغام پہونچا دے کہ ہم اہل مکہ کو تباہ کرنا نہیں چاہتے صرف کعبہ کو منہدم کرنا چاہتے ہیں اگر مکہ کے باشندے رکاوٹ نہ ڈالیں تو وہ محفوظ رہیں گے۔

خواجہ عبدالمطلب نے ابرہہ کا پیغام سن کر جواب دیا:

> ''ہم ابرہہ کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتے۔ نہ ہم میں مقابلہ کی طاقت ہے۔ البتہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے خلیل ابراہیم کا بیت ہے وہ اگر اپنے اور اپنے خلیل کے اس بیت کی حفاظت کرنا چاہے گا وہ حفاظت کر لے گا اور اگر اس کا یہ منشاء نہیں ہے کہ اس کا بیت محفوظ رہے تو ہم میں طاقت نہیں ہے کہ ہم اس کو محفوظ رکھ سکیں۔''

حناط نے کہا۔ اچھا آپ میرے ساتھ چلیے۔ اور خود جا کر ابرہہ سے بات کر لیجئے۔

خواجہ عبدالمطلب حناط کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ مگر آپ نے یہ ضروری سمجھا کہ ابرہہ کے سامنے ایک باعزت نمائندہ کی حیثیت سے پیش ہوں۔

وہی ذونفر جو سب سے پہلے ابرہہ کے مقابلہ پر آیا تھا پھر شکست پا کر گرفتار ہو گیا تھا (جس نے یہ کہہ کر جان بخشی کی درخواست کی تھی کہ شاید کوئی موقعہ آ جائے کہ میری زندگی آپ کے لیے میری موت سے بہتر ثابت ہو) وہ خواجہ عبدالمطلب کا دوست تھا۔ آپ جب ابرہہ کے معسکر (چھاؤنی) میں پہنچے تو آپ نے سب سے پہلے ذونفر سے ملاقات کرنی چاہی اور آپ کسی طرح کامیاب بھی ہو گئے۔ آپ نے ذونفر کے سامنے اپنا مقصد رکھا کہ کوئی ایسی صورت ہو جائے کہ میں ابرہہ کے سامنے باعزت نمائندہ کی حیثیت سے پیش ہوں۔

ذونفر نے معذرت کی کہ وہ خود جیل میں پڑا ہوا ہے وہ مدد کر سکتا ہے۔ البتہ اس نے یہ امید دلائی کہ اس کا

ایک دوست انیس ہے جو ہاتھیوں کا نگراں اور داروغہ فلیخانہ ہے۔ ابرہہ تک اس کی رسائی ہے میں اس کو کہلاتا ہوں کہ وہ ابرہہ سے ملاقات کر کے آپ کے بارے میں گفتگو کرے اس کے دماغ کو ہلکا کرے۔ پھر کسی بہتر تقریب سے آپ کی ملاقات کرادے۔

انیس کے پاس ذونفر کا پیغام پہنچا۔ اس نے پیغام کا احترام اور جو توقع تھی اس کو پورا ۔ انیس ابرہہ کی بارگا میں پہونچا اور جیسا کہ ذونفر نے کہلا کر بھیجا تھا۔ ابرہہ سے کہا عبدالمطلب جن کو حناط مکہ سے لے کر آئے ہیں بہت شریف انسان ہیں۔ قریش کے سردار ہیں۔ اور مکہ کے چشمہ کے مالک ہیں ایسے کریم الطبع اور بافیض ہیں کہ ان کی بے پناہ سخاوت سے صرف وہ انسان ہی فیضیاب نہیں ہوتے جو پہاڑوں کی گھاٹیوں اور دامن کوہ میں رہتے ہیں بلکہ ان وحشی جانوروں تک بھی ان کا فیض پہونچتا ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتے ہیں۔

ابرہہ نے سفارش قبول کی اور ملاقات کی اجازت دیدی۔

خواجہ عبدالمطلب شریف صورت حسین وجمیل باوجاہت اور بارعب سردار تھے جب وہ ابرہہ کے سامنے پہونچے تو وہ ان کی وجاہت سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے گوارا نہ ہوا کہ وہ تخت پر بیٹھا رہے اور خواجہ عبدالمطلب کھڑے رہیں یا نیچے فرش پر بیٹھیں لیکن یہ بھی مناسب نہ سمجھا کہ حبشی سرداروں کی موجودگی میں وہ اپنے برابر خواجہ عبدالمطلب کو تخت پر بٹھائے۔ لہذا وہ خود تخت سے اتر کر نیچے فرش پر بیٹھ گیا اور خواجہ عبدالمطلب کو اپنے برابر بٹھا لیا۔

اب ترجمان کے ذریعہ گفتگو شروع ہوئی۔ ابرہہ نے دریافت ۔ فرمائیے آپ چاہتے ہیں؟ خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا۔ آپ کی فوج میرے دوسو اونٹ لے آئی ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ ان کی واپسی کا حکم فرمادیں۔

ابرہہ حیران ہوا۔ اس نے ترجمان سے کہا ان سے کہیے کہ آپ کے رعب داب اور آپ کی وجاہت سے میں متاثر ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ کوئی بڑا مطالبہ پیش کریں گے مگر آپ کو صرف اپنے دوسو اونٹوں کی فکر ہے تعجب ہے کہ آپ کو اس کعبہ کی فکر نہیں جو آپ کا اور آپ کے آباؤ اجداد کا دین اور دھرم رہا ہے میں اس کو ڈھانے کے لیے آیا ہوں اس کے متعلق آپ نے ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا۔

حضرت عبدالمطلب۔ میں رب الابل ہوں، رب البیت نہیں مجھے اپنے اونٹوں کی فکر ہے باقی بیت کی فکر اس خدا کو ہوگی جس کا وہ بیت ہے۔

ابرہہ۔ اس کو تو مجھے ڈھانا ہے۔ میں ڈھا کر ہی دم لوں گا۔ باقی آپ کے اونٹ ابھی واپس کیئے جاتے ہیں۔

ابن ہشام کی روایت ہے کہ حناط نے خواجہ عبدالمطلب کے علاوہ دو اور سرداروں کو ابرہہ کے پاس بھیجا تھا۔

ایک قبیلہ بنی بکر کے سردار عمر نفاثہ اور دوسرے قبیلہ ہذیل کے سردار خویلد بن ذائلہ ان دونوں نے یہ پیشکش کی تھی کہ مکہ میں جو کچھ دولت ہے اس کا ایک تہائی ابرہہ منظور کر لے اور ہدم کعبہ کے ارادہ سے باز آ جائے لیکن ابرہہ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو خواجہ عبدالمطلب کی یہ ذہانت وفراست تھی کہ انہوں نے اس طرح کی بات ہی نہیں کی جو مسترد ہو اور کعبہ کے معاملہ کو رب کعبہ کے حوالہ کر دیا۔

اس کے بعد عبدالمطلب نے واپس آ کر قریش کو جو ہدایت دی اور خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر کواڑوں کی زنجیر ہاتھ میں سنبھال کر جو اشعار پڑھے وہ پہلے گذر چکے ہیں۔ پھر رب البیت نے اپنے بیت اور بناء خلیل اللہ کی جس طرح حفاظت کی اس کے لیے سورہ فیل کا مطالعہ کافی ہے (۱۶۳)۔

ابرہہ نے ہدم کعبہ کا ارادہ کیوں

ابرہہ کا یہ منصوبہ بجائے خود ایک شہادت عظیم ہے اس بے پناہ عقیدت اور گرویدگی کی جو عرب کو بیت اللہ کے ساتھ تھی، مختصر روداد ملاحظہ فرمائیے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جو حکم ہوا تھا:

اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالاً وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ

(سورہ حج ع ۵)

''لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ وہ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستہ پر پہنچیں گی۔''

یہ ارشاد خداوندی تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ عالم انسانیت اس کی تصدیق کے لیے والہانہ عمل نہ پیش کرتا۔ قرآن حکیم کی اس معجزانہ نکتہ سنجی کے قربان جائیے اذن فی الناس فرمایا اذن فی المسلمین یا اذن فی المومنین نہیں فرمایا۔

دنیا نے دیکھا کہ کئی صدیاں ایسی گذریں لوگ ایمان سے محروم ہو گئے تھے۔ مگر حج کے لیے جو قافلے آنے شروع ہوئے تھے وہ بڑھتے ہی رہے ان میں کمی کسی دور میں بھی نہیں آئی۔

دین ابراہیم مسخ کر دیا گیا خدا پرست اصنام پرست ہو گئے۔ بیت اللہ بیت الاصنام بن گیا۔

مختلف قبائل (۱۶۴) نے حتی کہ خود قریش (۱۶۵) نے بھی اپنے اپنے دیوتا الگ الگ منتخب کر لیے۔ ان کے نام کے الگ الگ بیت بنا لیے، سب جگہ قربانیاں ہونے لگیں نذرانے پیش کیے جانے لگے۔ ہر ایک کے دربان، مجاور، کلید بردار مقرر ہو گئے۔ ہر جگہ یہ خدمات الگ الگ خاندانوں کے نام کر دی گئیں، اس طرح سرزمین عرب میں سینکڑوں خاندان دیوتاؤں کے مہنت اور پجاری بن گئے۔ لیکن بیت اللہ کی مرکزیت وعظمت پھر بھی قائم

رہی۔ یہ سب دیوتا اوران کے مندر بیت اللہ کی شاخیں یا اس کے جلوے اور پرتو تھے۔ حج پھر بھی بیت اللہ ہی کا ہوتا۔ مرکزی عظمت اسی کو حاصل تھی۔ کیونکہ ایک پختہ اور مشترک عقیدہ یہ تھا کہ ابوالاباء اور مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم جو خلیل اللہ تھے ان کا بنایا ہوا بیت اوران کی مسجد (۱۶۶) یہی ہے۔

حج کا زمانہ آتا تو عرب کے گوشہ گوشہ سے ایک ایک قبیلہ کا قافلہ لبیک کہتا ہوا مکہ معظمہ پہنچتا اور حج ادا کرتا تھا۔ یہ مرکزیت جس طرح حجاز کے لیے باعث فخر تھی دوسرے ممالک کے لیے باعث رشک وحسد تھی۔

ارض حجاز کے ایک طرف بنواسرائیل کا موروثی وطن شام اور فلسطین تھا دوسری جانب ستارہ پرست آتش پرست اور مجوس کا مرکز تھا۔ یہ دونوں مرکز بعد میں دو متصادم بلاک بن گئے۔ اس وقت شام وفلسطین شاہنشاہیت روم (بازنطینی ایمپائر) کے زیر سایہ ہو گئے اور عراق وبحرین اور دریاء فرات تک شاہنشاہیت کسریٰ (فارس) کے دامن پھیل گئے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حجاز جس کے لفظی معنی (آڑ ورکاوٹ) ہیں۔ وہ ان دونوں بلاکوں کی شاہنشانہ رقابت اور حرص وآز کے لیے بھی آڑ بن گیا۔ اس لیے وہ ان کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہی نہیں رہا بلکہ ان دونوں بلاکوں کی ملوکانہ مصلحتوں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس درمیانی علاقہ کو محفوظ رکھا جائے اس پر کسی کی حکومت نہ ہو اپنا حاکم خود ہی رہے۔ مگر یمن اگر چہ حجاز کی طرح عربوں کا وطن اور جزیرالعرب کا ایک حصہ ہے وہ اس طرح آزاد نہیں رہا اور یہ بات اگر چہ نئی ہے مگر بظاہر بالکل صحیح ہے کہ جب سے یمن کی تاریخ شروع ہوئی ہے اس کی نظر حجاز پر رقیبانہ اور حاسدانہ رہی ہے۔

بنوجرہم۔ جن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے ازدواجی رشتہ قائم جو آل اسمٰعیل کی ننھیال ہے ایک روایت (۱۶۷) کے مطابق جو بظاہر صحیح ہے ان کا سرچشمہ اور زادبوم یہی یمن تھا۔ اوران کی آمد توسیع مملکت کی علت سے خالی نہیں ہوتی۔

یہ یمن جس کی جغرافیائی نوعیت بھی عجیب (۱۶۸) ہے اور جس کی فطرت بھی عجیب۔ جس کا تمدن بھی اتنا بلند رہا کہ اس کے آثار قدیمہ درس عبرت اور زیارت گاہ شوکت وسطوت بنے رہے۔ جو سیاسی جولانگاہ بھی رہا اور مذہبی آماج گاہ بھی۔ اس کی کہانی بہت لمبی ہے اور بہت رنگین۔

یہی یمن تھا جہاں سبا (۱۶۹) نے کئی سو برس تک اقتدار کے پرچم لہرائے۔ پھر بموجب ارشاد ربانی فَجَعَلْنَا هُمْ اَحَادِيْثَ افسانہ روزگار بن گئے (سورہ سبا ع ۲)

جس طرح اس کے عروج نے دنیا کو حیرت (۱۷۰) زدہ لَقَدْ كَانَ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ (سورہ سبا ع ۲)

(بے شبہ ان کے وطن میں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا نشان (۱۷۱) موجود تھا)

اسی طرح اس کا زوال بھی دیدہ عبرت کے لیے تماشا بن گیا۔ مَزَّقْنَا هُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ

ملکہ سبا۔ جس کا نام بلقیس بتایا جاتا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی جس کی ذہانت نے ایک ہی جست میں اس کو خدارسیدہ بنادیا۔ اس کا پایہ تخت بھی اسی سبا کے علاقہ میں تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں اس ملکہ کی خبر دینے والے نے اس کے مذہب کے متعلق یہ بتایا تھا۔ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (نمل ع ۲) میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ خدا کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں) پھر اس ملکہ کی یہ ذہانت اور فراست تھی کہ جیسے ہی اس کو اپنے مشاہدہ کی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ مجاز (۱۷۲) پرستی سے تائب ہو کر حقیقت پرست بن گئی۔

ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (سورہ نمل ع ۳)

''میں نے اپنے نفس پر ظلم اور میں سلیمان کے ساتھ ہو کر رب العالمین پر ایمان لے آئی۔''

قرآن حکیم (۱۷۳) کا ایک ایک لفظ مرقع صداقت اور آئینہ حقیقت ہے۔ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سورہ سباع ۲) (ہم نے (اہل سبا) کو پوری طرح تتر بتر کر دیا (سورہ سباع ۲) ایک تاریخی حقیقت ہے صرف ارض حجاز یا سرزمین نجد ہی نہیں بلکہ کالے انسانوں کی قابل فخر دنیا۔ حبش (ایبی سینیا) بھی اس کی تصدیق کے لیے تیار ہے کہ یہ پوری قوم پارہ پارہ ہوئی اور منتشر ہو کر داستان پارینہ بن گئی۔ گلدستہ سبا کی پنکھڑیاں جدا ہو کر کدھر گئیں کہاں کہاں جا کر پڑیں ان کی تفصیل کی نہ ضرورت ہے نہ اس وقت اس کا موقع ہے۔ باقی عجیب بات یہ ہے کہ سبا کا پورا ہاتھ نہ سہی تو کچھ انگلیاں ابرہہ کی پشت پر بھی تھیں جب وہ مکہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تاکہ کعبہ کو ڈھادے (معاذ اللہ)

کہتے ہیں کہ تباہی کے بعد سبا کے مختلف قبائل (۱۷۴) حجاز، نجد، بحرین، عمان، یمامہ، مدینہ، عراق اور شام میں پہنچ گئے لیکن اس انتشار سے پہلے زمانہ عروج میں بھی سبا کے کچھ قبیلے شمالی عرب (عراق اور شام وغیرہ) میں تھے اور حبش (ایبی سینیا) جو بحر احمر کے سواحل پر یمن کے سامنے ہے وہاں ان کی نو آبادیاں تھیں۔ ان کے تجارتی مرکز تھے۔ اور وہاں ان کا ایک گورنر بھی رہا کرتا تھا۔ جس کو معافر کہا کرتے تھے۔

حدود یمن میں سبا کا جانشین حمیر (۱۷۵) ہوا۔ ملوک حمیر جو شعراء عرب کے لیے جاہ و جلال اور عظمت و شوکت کی مثال اور ان کے قصائد کے ممدوح رہا کرتے تھے ان کا حلقہ اقتدار اب تک مغربی یمن خصوصاً بحر احمر اور بحر عرب کا ساحلی علاقہ تھا قلعہ ریدان ان کا مرکز تھا۔ اب جیسے ہی اقتدار سبا کا آفتاب ڈھلا سلطنت حمیر کا سایہ وہاں پہونچ گیا اور انہوں نے اس پورے علاقہ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ جہاں سبا کے جھنڈے لہراتے تھے لیکن سبا کے وہ قبائل یا خاندان جو ایبی سینیا (حبش) میں تھے انہوں نے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کا مرکز اکسوم تھا اور جس کے بادشاہ کا لقب نجوس تھا نجوس حبشی زبان میں بادشاہ کو کہتے ہیں۔ یہی نجوس ہے جس کو عرب نجاشی کہتے ہیں۔ حبش کی وجہ تسمیہ بھی یہی بیان کی جاتی ہے کہ یہاں سبائی کا سابق افریقی قوموں سے اختلاط ہو گیا تھا۔ حبش کے معنی ہیں اختلاط و امتزاج۔

سبا کی بربادی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ڈیڑھ صدی پہلے ہوئی تھی۔ یعنی اسلام سے تقریباً

آٹھ سو برس پہلے۔ اس کے بعد سے اکسومی سلطنت اور اس کے شاہی خاندان کا سلسلہ چلا تھا جو تقریباً بارہ سو سال تک باقی رہا۔

حبش اور مصر پڑوسی ہیں۔ مصر پر رومیوں کا قبضہ ہوا تو سلطنت کے ساتھ ان کا مذہب (عیسائیت) بھی یہاں رائج ہو گیا۔ پھر یہی رنگ حبش نے بھی اختیار کر لیا۔ یعنی مذہب اور سیاست دونوں لحاظ سے وہ رومی اور عیسائی بلاک میں داخل ہو گیا۔

پڑوس کا یہ رشتہ ''یمن'' سے بھی تھا۔ عیسائیت کی لہریں اس کے کناروں تک بھی پہنچنے لگیں قبیلہ نجران عیسائی ہو گیا۔ مگر یہاں سیاسی رقابت بھی کارفرما تھی۔ ملوک حمیر اکسومی بادشاہوں سے اس لیے جلتے تھے کہ انہوں نے ماتحت علاقہ کو مستقل حیثیت دیدی۔ اور یمن کے مدمقابل ایک نئی سلطنت بنالی اور اکسومی حبش کو یہ حسد تھا کہ ملوک حمیر سبا کے دارالسلطنت (مارب) اور سبا کے پورے علاقہ پر قبضہ کر بیٹھے ہیں اور دائیں بائیں بڑھتے جا رہے ہیں اس رقابت (۱۷۶) نے بار بار جنگ کی صورت اختیار کی۔ ایک دوسرے پر غالب مغلوب ہوتے رہے۔ یہ رقابت اتنی شدید رہی کہ مذہبی جذبہ بھی اس پر غالب نہ آسکا بلکہ سیاسی رقابت کے لیے وجہ جواز اور ایک نئی علت بن گیا۔ ہاں ردعمل یہ ہوا کہ دائرہ حمیر میں یہودیت کے پنجے جم گئے۔

تنازع للبقاء کہو یا تصادم للفلاح۔ وہ عموماً مفید ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ حمیر کے باحوصلہ بادشاہ اس جذبہ تصادم و تنازع کے نتیجے میں اتنے مضبوط ہو گئے کہ نہ صرف حضر موت بلکہ اس سے آگے عمان کی حدود تک اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا۔ الحارث الرائش (یاشمر یرعش) جو ۲۸۰ء سے ۳۱۵ء) تک حکمراں رہا یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے حضر موت کو حمیری مقبوضات میں داخل کیا۔ اور ملک سبا اور ریدان و حضر موت اپنا لقب اختیار کیا۔ دوسرا خطاب جو ان بادشاہوں کو عربوں نے دیا یا خود انہوں نے اختیار کیا۔ وہ تبع ہے جس کی جمع تبابعہ ہے۔ تبع کو عربی بھی کہا گیا ہے۔ بمعنی متبوع جس کی پیروی کی جائے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ حبشی لفظ ہے بمعنی قادر و جبار و صاحب قوت۔ بہرحال لغت کے لحاظ سے معنی کچھ بھی ہوں لیکن عربوں نے اس کو ایسے منصب کے لیے استعمال کیا جس کے لیے اہل فارس لفظ شاہنشاہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی صرف شاہ ریدان یا شاہ حمیر کو تبع نہیں کہا گیا بلکہ اس کو تبع (۱۷۷) اس وقت کہا گیا جب وہ سبا اور حضر موت کو بھی حدود مملکت میں داخل کر چکا اور ملک سبا اور ریدان و حضر موت ہو گیا۔

کہتے ہیں ایک تبع مکہ معظمہ بھی گیا تھا اس پر اپنا وقار قائم کرنے اور اپنا سکہ جمانے۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود اس کی گردن وقار کعبہ کے سامنے جھک گئی اور بجائے اس کے کہ وہ بیت اللہ کی شان میں کوئی گستاخی کرتا۔ وہ بیت اللہ پر غلاف چڑھا کر واپس ہوا۔ پھر یہی تبع تھا جو واپسی میں یثرب (مدینہ طیبہ) سے یہودی عالموں کو لایا۔ جن کی تبلیغ سے یمن میں یہودیت پھیلی (یہ بعثت سید الانبیاء ﷺ سے تقریباً دو سو برس پہلے کی بات ہے۔) اس وقت یہودیت میں کچھ صلاحیت باقی ہو گی جو یمن کی کواکب پرستی پر غالب آ گئی۔ لیکن بہت جلد اس میں وہ تمام

خصوصیتیں رونما ہو گئیں جو مسخ شدہ یہودیت میں تھیں۔ جس کی بنا پر یہ جماعت المغضوب علیہم ہوئی۔

چھٹی صدی کے ربع اول میں۔ ۵۰۰ء سے ۵۲۵ء تک یمن کا تبع (حمیری شاہنشاہ) ''ذونواس'' رہا۔ یہ بڑی شان وشوکت کا بادشاہ تھا۔ اس کے دور میں اصحاب الاخدود اسی یہودیت کا شکار ہوئے وہ یہود جو اپنی سب سے بڑی سنگدلی اور سب سے بڑے ظلم و کفر پر فخر کرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ (سورہ نساء) (بیشک ہم ہی ہیں جنہوں نے مسیح کو قتل ۔ اسی مسیح کو جس کو عیسیٰ کہا جاتا ہے۔ جو بیٹا تھا مریم کا)۔

ان کے لیے مشکل تھا کہ وہ شاہ یمن نہیں بلکہ تبع یمن کے زیر چتر (نجران)(۱۷۹) کے کمزور عیسائیوں کو گرفتار کریں اور جوان میں سے یہودی بننے کے لیے تیار نہ ہو اس کو دھکتی ہوئی آگ کی خندق میں جھونک کر ختم کر دیں۔

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درحق بہر استقبال مے آید

اصحاب الاخدود کی شہادت رایگاں نہیں گئی دوس بن ثعلبان یمن کے ایک عیسائی امیر نے نجاشی کے یہاں فریاد کی۔ نجاشی نے قیصر روم کے اشارہ سے یمن پر فوج کشی کی۔ یہ ایک روایت ہے دوسری روایت ابن اسحاق اور ابن ہشام کی یہ ہے کہ نجران کے گرفتاران بلا میں دوس بن ثعلبان بھی تھا جو کسی طرح قید سے فرار ہو کر قیصر روم کے پاس پہنچ گیا وہاں مظلوم عیسائیوں کی شہادت کا مرثیہ پڑھا اور امداد کا طالب ہوا۔ قیصر روم نے شاہ حبش کو لکھا کہ وہ یمن پر فوج کشی کرے۔

بحر حال نجاشی محکوم ہو یا خود حملہ آور ہو۔ واقعہ یہ ہوا کہ اس مظلومانہ شہادت نے حبشیوں کی پرانی رقابت میں جدید اشتعال کا اضافہ کر دیا۔ نجاشی کی فوجیں جن کو روم کی بھی حمایت حاصل تھی یمن پر حملہ آور ہوئیں۔ کہتے ہیں پہلی مرتبہ ذونواس نے حیلہ اور تدبیر سے ان کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ لیکن اہل حبش کا انتقامی جذبہ سرد نہیں پڑا انہوں نے جنگ کا ساز و سامان درست کر کے پھر دوبارہ اس زور شور سے حملہ کہ حمیر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ذونواس نے بھاگ کر گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا۔ لیکن ساحل تک سلامت نہ پہونچا۔ اب اہل حبش تنہا یمن کے مالک بن گئے اور حمیر بھی اسی طرح افسانہ روزگار بن گئے۔ جس طرح سبا ایک پرانی کہانی بن چکے تھے۔ فجعلنا هم احادیث

لیکن یہ درس عبرت کبھی فراموش نہ ہونا چاہیے کہ عیسائیت نجران سے پھر بھی نہیں مٹی۔ اس واقعہ سے تقریباً سوا سو برس بعد جب آفتاب اسلام مشرق مدینہ پر نور برسا رہا تھا۔ تو نجران سے دو راہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مناظرہ کے لیے آئے تھے۔ عہد فاروقی میں بھی یہاں عیسائی موجود تھے اور جزیہ ادا کرتے تھے۔

ارباط اور ابرہہ:

کہتے ہیں اس وقت کے نجاشی کا نام ''الیباس'' تھا جس کے حکم سے یمن پر حملہ ہوا اور جس سردار کی زیرِ قیادت یہ مہم کامیاب ہوئی تھی اس کا نام ارباط تھا جو کامیابی کے بعد نجاشی کی طرف سے یمن کا گورنر بھی بنادیا گیا تقریباً بیس برس تک یہ حکومت کرتا رہا۔ اس اثناء میں حبشی فوج نے بغاوت کی۔ ابرہہ ایک حبشی سردار اس باغی جماعت کا سرِعسکر بن گیا۔ لفظ ابرہہ۔ ابراہیم۔ کا حبشی تلفظ ہے اور چونکہ نک کٹا تھا اس لیے اشرم (۱۸۰) کہلاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا لیکن ایک روایت یہ ہے کہ یہ رومی غلام تھا ارباط ۔۵۴۲ء تک یمن کا حکمراں رہا۔ ۵۴۳ء میں ابرہہ نمودار ہوا۔ تقریباً ۲۸ سال اس نے حکومت کی۔ یہاں تک کہ)۵۷۰ء میں واقعہ فیل کے بعد ہلاک ہوا۔

اب ابرہہ کی بغاوت پھر اس کے استقلال کا قصہ ابن ہشام کی زبانی سنئے۔

کہتے ہیں ابرہہ نے میدان جنگ میں ارباط کو قتل پھر خود حکمراں بن گیا۔ شاہ حبش نجاشی کو جب علم ہوا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ ابرہہ کے علاقہ کو پامال کر کے اس کا سر مونڈے گا۔ جب ہوشیار اور چالاک ابرہہ کو بادشاہ کے عہد کا علم ہوا تو اس نے یہ چالاکی کی کہ اپنا سر منڈوایا۔ ایک بوری میں یمن کی مٹی بھروائی پھر اپنے سر کے بال اور یہ بوری بادشاہ کے پاس بھیج دی اور درخواست لکھی کہ۔

ارباط بھی جہاں پناہ کا ایک غلام تھا اور میں بھی غلام ہوں ہم غلاموں کو جس طرح جہاں پناہ کا وفادار رہنا چاہیے ارباط اس میں کوتاہی کرتا تھا اس کی نیت درست نہیں تھی اس پر میری اس سے لڑائی ہوئی۔ فوجوں نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے ملک معظم کے غدار کو قتل کر دیا۔ میں نے شاہنشاہ کی نافرمانی نہیں کی اگر یہ غلطی ہے تو میں مستحق معافی ہوں۔ حضور والا کی قسم میں نے خود پوری کر دی ہے۔ میں نے سر منڈوایا ہے۔ یہ میرے سر کے بال حاضر ہیں اور سرزمین یمن کو پامال کرنے کے لیے حضور والا زحمت نہ فرمائیں خاک یمن حاضر ہے۔ اس کو پامال کیجئے اور قسم پوری فرمالیجئے۔

ابرہہ کی یہ مضحکہ انگیز ظرافت کامیاب (۱۸۱) ہوئی۔ بادشاہ کو پیمان وفا کی ضرورت تھی وہ دستاویزی شکل میں موجود تھا۔ سر کے بال بھی حاضر تھے اور بہانہ قسم کے لیے سرزمین یمن کی خاک بھی موجود تھی بادشاہ نے ابرہہ ہی کو یمن کا حکمراں بنادیا۔

اب ابرہہ نے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو اس کو ایسے عرب بھی نظر آئے جن کا رخ کعبہ کی طرف اور ان کے جذبات بیت خلیل اللہ سے وابستہ تھے۔ ابرہہ نے ان کے جذبات کی تسکین کے لیے ایک عظیم الشان کنیسہ صنعا میں تعمیر کرایا۔ اس کی خوش خبری بادشاہ کو دی کہ حضور والا کے لیے ایک بے مثال کنیسہ تعمیر کرایا ہے۔ اور ان عربوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ خانہ کعبہ کو چھوڑیں اور اسی کنیسہ کا طواف کریں۔ کعبہ جو تقریباً ڈھائی ہزار سال

سے جذبات عرب کا زیارت گاہ بلکہ قربان گاہ تھا اس سے لوگوں کی اقتصادی ضرورتیں بھی وابستہ ہوگئی تھیں۔
ایک برادری یا جماعت ان کی تھی جو لوند کے طرز پر مہینے مقرر کرتے تھے جس کو عربی میں نسی کہتے ہیں اور یہ لوگ نسات کہلاتے تھے۔ انہیں نسا میں سے ایک ناسی جو قبیلہ کنانہ سے تعلق رکھتا تھا اس کنیسہ میں پہنچا۔ رات کو وہاں رہا۔ صبح کو اس کے احاطہ میں پاخانہ پھرا اور کلیسہ کو آگ لگا کر بھاگ آیا۔
یہ تھا ابرہہ کے اس حملہ اور ہدم کعبہ کے اس منصوبہ کا سبب اور محرک جس کی تہ میں یہی عقیدہ کارفرما تھا کہ بیت اللہ۔ بناء ابراہیم خلیل اللہ ہے۔ علیہ وعلی جمیع الانبیاء الصلوٰۃ والسلام۔

واقعہ اصحاب فیل کا اثر

اصحاب فیل کا یہ حادثہ قریش کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ خانہ کعبہ کا جو احترام عربوں کے عقیدہ میں راسخ تھا اصحاب فیل کے اس واقعہ سے جس طرح اس میں اضافہ ہوا گویا انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ بناء خلیل اللہ کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے اور یہ بیت بیت الناس نہیں بلکہ بیت اللہ ہے اسی طرح قریش جو اس بیت کے خادم محافظ اور مجاور تھے ان کے متعلق بھی یہ عقیدہ پختہ ہوگیا کہ یہ لوگ اہل اللہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کا محافظ اور مددگار ہے۔ اس عقیدہ کی مزید پختگی نے دعوت اسلام کے کام کو بہت مشکل بھی کر دیا اور آسان بھی۔ مشکلات تو وہ تھیں جو تقریباً بیس سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ برداشت کرتے رہے اور طرح طرح کی مصیبتیں اور اذیتیں جھیلتے رہے اور آسانی یہ ہوگی کہ جیسے ہی مکہ فتح ہوا پورے عرب کی گردن آستانہ مدینہ پر جھک گئی اور صرف دو سال کے عرصہ میں پورا عرب حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ گویا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ادا ہوگیا کام پورا ہوگیا اور اب ملاء اعلیٰ کی طرف رحلت کا وقت آگیا۔ چنانچہ سورہ نصر کو فاروق اعظم اور ابن عباس رضی اللہ عنہم جیسے ذہین صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اعلامیہ قرار دیا۔ سورہ نصر میں یہی فرمایا گیا ہے کہ جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور لوگ فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہونے لگیں (تو سمجھ لو کہ کام پورا ہوگیا لہٰذا) تسبیح اور استغفار میں (ہمہ تن) مصروف ہوجاؤ۔

مختصر یہ کہ

یمن جو آل قحطان کا آبائی وطن ہے۔ یہاں تقریباً ایک ہزار سال تک سبا کا اقتدار رہا۔ سیل عرم سے سبا کا اقتدار ختم ہوا اور اس کی آبادی منتشر ہوگئی۔
سبا کے زمانہ عروج واقتدار میں حبش سے اس کا تعلق بہت گہرا رہا۔ وہاں سبا کے تجارتی مرکز بھی تھے ایک خاص افسر (گورنر) بھی وہاں رہا کرتا تھا۔ بہت سے اہل سبا نے وہاں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ جب سبا یمن سے منتشر ہوئے تو ان سبائی عربوں نے جو افریقہ میں رہتے تھے افریقی باشندوں کے ساتھ مل کر ابی سینا (حبش) میں ایک مستقل حکومت قائم کر لی جس کا پایہ تخت اکسوم تھا اور اس کے بادشاہ کو نجاشی کہا جاتا تھا۔ یہ اس

وقت سبا کی طرح کواکب پرست اور اصنام پرست تھے مگر جب مصر پر رومیوں کا قبضہ ہوا اور مصر میں عیسائیت پھیلی تو اہل حبش بھی عیسائی ہو گئے۔

یمن میں دوسرے قحطانی عرب جن کا سلسلہ نسب سبا ہی سے جڑتا تھا مگر حمیر کہلاتے تھے اور یمن کے ایک کنارہ پر ان کی حکومت تھی۔ ان کا عروج شروع ہوا۔ جو علاقے سبا سے خالی ہوئے تھے ان سب پر انہوں نے قبضہ کرلیا۔ اس کے علاوہ حضر موت وغیرہ پر بھی قابض ہو گئے۔ اکسومی حبش کو ان کا اقتدار پسند نہیں تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ یمن سے حمیر کو نکال کر خود قبضہ کرلیں۔ چنانچہ آپس میں تصادم شروع ہوا۔ کئی سو برس تک اس کا سلسلہ رہا۔ کبھی یہ کبھی وہ غالب مغلوب ہوتے رہے۔ روم اور یونان جن کے اثرات مصر پر تھے اکسومی حبش کے پشت پناہ تھے۔ اس کے برخلاف اہل حمیر کی نظر فارس اور ایران پر رہتی تھی۔ ان سے ان کا مذہبی اتحاد بھی تھا۔ یہ سب آتش پرست۔ ستارہ پرست یا بت پرست (مشرک) تھے۔ پھر یمن میں یہودیت پھیل گئی۔ حمیری شاہنشاہ تبع یہودی ہونے لگے۔ سیاسی رقابت نے یہودیت میں جذبہ انتقام بھی بھر دیا اس کا نتیجہ تھا کہ اہل نجران خندقوں میں ڈال کر نذر آتش کیے گئے۔ اس بادشاہ کا نام ذونواس تھا جس کے حکم سے اور جس کی موجودگی میں یہ ظلم گیا۔ قدرتی بات تھی کہ حبش اور روم اس پر مشتعل ہوتے چنانچہ اکسومی حبشیوں نے پوری قوت سے حملہ ۔ ایک مرتبہ ذونواس نے اپنی تدبیروں سے حملہ کو ناکام بنا دیا۔ مگر دوسری مرتبہ خود ناکام ہو گیا اور سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔ اب یمن پر حبشیوں کی حکومت ہوگئی۔ یہ حکومت نجاشی کے زیر اقتدار تھی۔ پہلا گورنر ارباط تھا جو فاتح یمن تھا۔ تقریباً بیس سال تک یہ حاکم رہا۔ پھر فوج میں بغاوت ہوئی۔ ان کے سرغنہ نے ارباط کو قتل کر دیا۔ خود فرمانروا بن گیا۔ اس کا نام ابرہہ تھا۔ ناک کٹا تھا اس لیے اس کو اشرم کہتے تھے۔ ۵۷۱ء میں اس نے خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے مکہ پر یلغار کی۔ مگر قدرت کی پوشیدہ تدبیر نے خود اس کو منہدم کر دیا۔

ابرہہ کے بعد

ابرہہ کے بعد اس کا لڑکا یکسوم اور اس کے بعد اس کا بھائی مسروق بن ابرہہ۔ یمن کے بادشاہ ہوئے تقریباً تیس سال ان دونوں کا دور حکومت ہے۔ ۵۹۸ء یا ۶۰۰ء میں یہ حکومت ختم ہوگئی۔ ۵۲۵ء سے لے کر ۵۹۸ء تک ۷۳ سال یا ۷۵ سال حبشیوں کی حکومت رہی۔

اس مدت میں مفتوح اور شکست خوردہ حمیری اپنا اقتدار بحال کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ایک شخص سیف تھا۔ جو سیف بن یزن حمیری کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں یہ ملک روم کے پاس گیا اور حبشی بادشاہوں کے مظالم کی شکایت کی۔ منشا یہ تھا کہ ملک روم ان کو حبش سے نکال دے۔ مگر ملک روم ایسی بات کب سن سکتا تھا۔ وہاں سے مایوس واپس ہوا تو کسریٰ کے یہاں پہنچا۔ کسریٰ نے اپنے ایک سپہ سالار کو جس کا نام دہرز تھا یمن (۱۸۲) بھیجا۔ دہرز بحری راستہ سے یمن پہنچا۔ حبشی بادشاہ کو شکست دی اور یمن کا تخت سیف بن ذی یزن

کے سپرد کر دیا۔ اب بادشاہت پھر حمیر کے پاس آ گئی۔ مگر ادبار نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سیف بن یزن بادشاہ ہوا تو رات دن شراب نوشی اور عیش و عشرت میں مصروف رہنے لگا۔ چند حبشی سردار اس کے مصاحب تھے انہیں مصاحبوں نے غداری کی اور سیف بن ذی یزن کو قتل کر دیا۔ تب کسریٰ نے یمن کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ اور اپنی طرف سے گورنر مقرر کر دیا۔ جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو کسریٰ کی طرف سے یمن کا گورنر باذان تھا۔ جس نے دعوت اسلام قبول کی اور دولت ایمان سے مشرف ہوا۔ (ابوالفداء)

مقام ابراہیم اور مناسک حج کے متعلق عقائد

ایک طویل داستان آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ بظاہر بے محل ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات اور تاریخ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پس منظر کے لیے یہ تفصیل ضروری ہے۔

جب ہم قانون و آئین کی عینک لگا کر غزوات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر ڈالیں گے تو ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ مطالبات اور مقاصد تھے اور وہ فریق ثانی کے عقیدے کے مطابق تھے یا کسی ایسی چیز کا مطالبہ جا رہا تھا جو ان کے دلوں کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی نہیں تھی۔ تطہیر کعبہ جو ایک اہم ترین مطالبہ تھا۔ وہ ایسا مطالبہ تھا جو کعبہ کی عظمت اور اس کی اصل حیثیت کے مخالف تھا اور کوئی نئی بات حامیان کعبہ کے دماغوں میں ٹھونسی جا رہی تھی یا اس مطالبہ کا حاصل یہ تھا کہ قریش عقائد کے تضاد کو چھوڑ دیں اور خانہ کعبہ کو عملاً وہ حیثیت دیں جو خود ان کی تسلیم کردہ روایات کے مطابق ہو۔ سابق تفصیلی بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرات ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک جو پونے تین ہزار سال کے قریب مدت ہے کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا کہ محافظان حرم کا یہ عقیدہ نہ رہا ہو کہ خانہ کعبہ بیت اللہ ہے اور بنا خلیل اللہ ہے۔

آخری دور میں عبدالمطلب نے جس والہانہ انداز میں اس کا اظہار وہ پہلے گذر چکا ہے۔ عبدالمطلب کے جانشین ابوطالب ہوئے جو اپنے آبائی اور پشتینی عقیدہ میں یہاں تک پختہ تھے کہ نزع روح اور جاں کنی کے وقت بھی کمزور نہیں پڑے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت اصرار کہ لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے۔ مگر ابوطالب کی نظر ابوجہل اور ابولہب پر تھی اور انہیں کے عقائد کی حمایت کرتے ہوئے اس نے جان جان آفریں کے حوالہ کی۔ اس کفر و شرک کے باوجود ان کے عقائد خانہ کعبہ، مقام ابراہیم اور مراسم حج کے متعلق ہیں۔ ابوطالب کے ایک طویل قصیدے کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں وہ شاہد بھی ہیں اور ترجمان بھی۔

(۱) اعوذ برب الناس من کل طاعن— علینا بسوء او ملح بباطل

(۲) ومن کل کاشح یسعی لنا بمعیبة— ومن ملحق بالدین مالم نحاول

(۳) وبالبیت حق البیت من بطن مکة— وبالله ان الله لیس بغافل

(۴) وبالحجرا لمسودا ذیمسحونه— اذا اکتنوہ بالضحی والا صائل

(۵) وموطي ابراهيم في الصخر رطبة— على قدميه حافيا غير ناعل

(۶) واشواط بين المرتمن الى الصفا— وما فيهما من صورة و تماثل

(۷) ومن حج بيت الله من كل راكب— ومن كل ذى نذر ومن كل راجل

(۸) وبالمشعر الاقصى اذا عمد واله— الال الى مفضى الشراج ابل

(۹) وتوقافهم فوق الجبال عشية— يقيمون بالا يدى صدور الرواحل

(۱۰) وليلة جمع والمنازل من منى— وهل فوقها من حرمة ومنازل

(۱۱) وجمع اذا ما المقربات اجزنه— سراعا كما يخرجن من وقع وابل

(۱۲) وبالجمرة الكبرى اذا صمد والها— يرمون قذ فاراسها بالجنادل

ابن ہشام کی روایت ہے کہ جب قریش نے حج کے موقع پر یہ طے تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ پروپیگنڈہ کریں گے کہ وہ ساحر ہے اور اپنے کلام سے ایسا جادو کرتا ہے کہ بھائی بھائی سے باپ بیٹے سے اور بیوی خاوند سے جدا ہو جاتی ہے لہٰذا اس کے پاس نہ جاؤ اور اس کی بات نہ سنو اور خواجہ ابوطالب کو خطرہ ہو گیا تھا کہ کہیں عرب کے ہجوم ان پر اور ان کے خاندان پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ تب ابوطالب نے تقریباً سو شعر کا یہ قصیدہ کہا تھا جس میں اپنے خاندان کی عظمت، خانہ کعبہ سے اپنے اور اپنے خاندان کے تعلق کا اظہار ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق غلط پروپیگنڈے کا جواب بھی دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس تقدس کا مشاہدہ قریش اور جس پاک باطنی بلندی اخلاق اور برکت کا تجربہ خود قریش کرتے رہتے تھے اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ پھر یہ بھی کہہ دیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس برتری اور پاکبازی کے باوجود ہم نے ان کا مسلک قبول نہیں ہے۔ ہم اپنے پرانے مذہب پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ اسی قصیدہ کا ایک شعر یہ ہے جو اکثر عربی دانوں کو یاد ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں عام طور سے پڑھا جاتا ہے۔

وابيض يستسقى الغما بوجهه ثمال اليتمي عصمة الارامل

وہ سفید رو جس کے چہرے کا حوالہ دے کر بارش کی دعا مانگی جاتی ہے جو یتیموں کا مربی اور نگراں اور بے کس بیوہ عورتوں کا محافظ ہے۔

ترجمہ اشعار:

۱- میں رب الناس کی پناہ لیتا ہوں۔ ہر ایسے شخص سے جو ہمیں کسی بری بات کا طعنہ دیتا ہے یا کسی باطل اور غلط کام کا اصرار کرتا ہے۔

۲- اور ہر ایسے شخص سے جو ہماری دشمنی دل میں چھپا کر ہم پر عیب لگانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور ہر ایسے شخص سے جو ہمارے دین میں ایسی بات لاحق کر دیتا ہے جس کا ہم

ارادہ نہیں رکھتے جو ہمارے مقاصد میں نہیں ہے۔

۳-اور بیت کی پناہ لیتا ہوں۔ واجب الاحترام سچا بیت جو وسط مکہ میں ہے اور پناہ لیتا ہوں اللہ کی بیشک اللہ غافل نہیں ہے۔

۴-اور حجر اسود کی پناہ لیتا ہوں جس کو یہ لوگ بوسہ دیا کرتے ہیں۔ جب اس سے ہم چمٹے ہیں۔ دو پہر اور شام کے اوقات میں (رات اور دن کے اوقات میں)

۵-اور پناہ لیتا ہوں ابراہیم کے نقش قدم کی جو ایک پتھر میں ہے جو (اب تک تازہ ہے ابھرا ہوا ہے) جیسے آپ دونوں پیروں پر (بوجھ ڈالے ہوئے کھڑے ہوں) برہنہ پا ہوں۔ نعل پوش (جوتے پہنے ہوئے) نہ ہوں۔

۶-اور پناہ لیتا ہوں ان اشواط (پھیروں) کی جو مروتین سے صفا تک لگائے جاتے ہیں اور پناہ لیتا ہوں ان تصویروں اور مورتیوں کی جو یہاں ہیں۔

۷-اور پناہ لیتا ہوں ہر اس سوار اور ہر اس پیادہ کی جو بیت اللہ کا حج کر رہا ہے جو کوئی نذر لے کر آیا ہے۔

۸-اور پناہ لیتا ہوں مشعر اقصی (عرفات) کی جب وہ اس کا قصد کر کے جاتے ہیں۔ جو کوہ الال سے لے کر اس وسیع میدان تک ہے جہاں (پہاڑوں سے) آنے والی نالیاں گرتی ہیں۔

۹-اور وہ جو رات کے وقت پہاڑوں پر قیام کرتے ہیں جب کہ اونٹوں کے سینوں کو اپنے ہاتھوں سے سیدھا کرتے ہیں۔

۱۰-اور اس رات کی جس میں (منی میں) اکٹھا ہوتے ہیں اور ان منزلوں کی جو منی میں بنائی جاتی ہیں اور اس سے زیادہ کوئی احترام ہو سکتا ہے اور ان سے زیادہ باعزت منزلیں ہو سکتی ہیں۔

۱۱-اور مزدلفہ کی جب کہ تیز چلنے والی اونٹنیاں اس کو تیزی سے طے کرتی ہیں (وہ اونٹنیاں ایسی دوڑتی ہیں) جیسے بارش کی بڑی بڑی بوندوں سے (گھبرا کر) نکل رہی ہوں۔

۱۲-اور جمرہ کبریٰ کی جب ٹھیک اس کی طرف اس حالت میں چلتے ہیں کہ اس کے سر کو اوپر کے حصہ کو کنکریاں پھینک کر مارتے رہتے ہیں۔

حرم مکہ:

عبدالمطلب اور ابو طالب سے بہت پہلے کی بات ہے جب بنو بکر اور بنو خزاعہ نے بنو جرہم کو مکہ معظمہ سے

نکال دیا تھا اور ان لوگوں نے یمن میں جا کر پناہ لی تھی تو قبیلہ جرہم کے مشہور شاعر عمرو بن حارث بن مضاض نے یمن پہونچ کر اپنے وطن عزیز کی یاد میں اپنے خاندان کی تاریخی عظمت وجلالت کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک ماتمی قصیدہ کہا تھا۔ اس قصیدہ کے چند اشعار جن میں حرم کا تذکرہ ہے یہ ہیں۔

(۱) فحت دموع العین تبکی لبدة— بھا حرم امن ومنھا المشاعر

(۲) وتبکی لبیت لیس یوذی حمامه— یظل به امنا وفیه العافر

(۳) وفی وحوشی لا ترام انیسة— اذا خرجت منه فلیست تغادر

(ابن ہشام ج ۱ ص ۷۳)

۱- آنکھوں کے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہوگئیں۔ آنکھیں اس شہر کو یاد کر کے رو رہی ہیں جن میں وہ حرم ہے جو سب کو امن دینے والا ہے جس میں بہت سے مقدس تاریخی نشانات ہیں۔

۲- اور آنکھیں اس بیت کے لیے رو رہی ہیں جس کے کبوتروں کو نہیں ستایا جاتا۔ اس میں اگر چڑیاں ہوتی ہیں تو یہ بیت ان کے لیے بھی محافظ رہتا ہے۔

۳- اس میں وحشی جانوروں کو بھی پناہ ملتی ہے ناممکن ہے وہاں کسی ہرن کے شکار کا قصد جائے اور جب وہاں سے نکل جاتی ہے تب بھی اس کے ساتھ دھوکا نہیں جاتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ومسلک

قرآن حکیم میں کسی نبی کے عقائد اور کسی رسول کا مسلک اس شرح وبسط کے ساتھ بیان نہیں گیا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مسلک پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غزوات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مجاہدات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلک ابراہیم علیہ السلام کی قرآنی وضاحت بھی پیش کرنی ضروری ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام خداترسی اور خداپرستی میں مثال عظیم ہیں:

چاند تاروں کی بے ثباتی اور آفتاب کی لاچارگی پر نظر ڈالنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اعلان تھا۔

يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ— إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (سورہ انعام ع ۹)

''اے میری قوم میں ان سب سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کا شریک گردان رہے ہو۔ میں نے سب سے ہٹ کر صرف اس کی طرف اپنا رخ کرلیا۔ جس نے تمام آسمانوں اور زمین

کو پیدا ہے اور میں مشرک نہیں ہوں۔"

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتاً لِّلّٰهِ حَنِيْفاً وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (سورہ نحل ع ۱۱۱)

"بلاشبہ ابراہیم (اپنی شخصیت میں) ایک پوری امت تھا۔ اللہ کا حکم بردار، تمام (بناوٹی) راہوں سے ہٹا ہوا وہ کسی طرح بھی مشرک نہیں تھا۔"

پھر اسی کی دعوت اپنے والد کو دی:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا اِبْرَاهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عَالِمِيْنَ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ الاية (سورہ انبیاء ع ۵)

"اور بیشک اس سے پہلے ہم ابراہیم کو اس کی شان اور اس کے درجہ کے بموجب حسن فہم (اچھی سمجھ بوجھ) عطا کر چکے تھے۔ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا تھا۔ یہ مورتیاں ہیں جن کی پوجا پر تم جم کر بیٹھ گئے ہو۔ (جن پر تم لگے بیٹھے ہو)۔"

(شاہ صاحب رحمہ اللہ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شرک و بت پرستی سے پناہ مانگی:

اِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ الاية

(سورہ ابراہیم ع ۶)

"اور یاد کرو۔ جب ایسا ہوا تھا) کہ ابراہیم نے دعا مانگی تھی۔ اے میرے پروردگار اس شہر کو امن کی جگہ بنا دیجیو اور مجھے اور میری نسل کو اس بات سے دور رکھیو کہ بتوں کی پوجا کرنے لگیں۔"

بت پرستوں سے بیزاری کا اعلان :

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (سورہ ممتحنہ ع ۱)

"بیشک تمہارے لیے ایک اچھی مثال (ایک عمدہ نمونہ) ہے۔ ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی (زندگی) میں جب کہ ان لوگوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا۔ ہم بیزار ہیں تم سے اور ان سب سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ ہم انکار کرتے ہیں تم سے اور ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض کھل پڑا۔ ہمیشہ کے لیے جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔"

اعلان جنگ یعنی عداوت کے اعلان کے بعد بتوں کو توڑا:

تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ۔ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ (سورہ انبیاء ع ۵)

''(اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا) قسم اللہ کی۔ میں علاج کروں گا تمہارے بتوں کا (اور ان کی گت بنا دوں گا) جب تم جا چکو گے پیٹھ پھیر کر۔ چنانچہ (اس نے ایسا ہی کہ) بتوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ صرف ایک بت جو ان میں بڑا سمجھا جاتا تھا۔ (اسے) چھوڑ دیا کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔''

بت شکنی کی پاداش میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا:

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (سورہ انبیاء ع ۵)

''انہوں نے آپس میں کہا۔ اگر تم میں کچھ بھی ہمت ہے تو اس شخص کو آگ میں ڈال کر جلا ڈالو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو۔ (ان کا بول بالا کرو)''

خدا واحد کی پرستش کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے بیت میں ٹھکانا دیا:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (سورہ حج ع ۴)

''اور وہ وقت یاد کرو۔ جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرا یہ گھر ان لوگوں کے لیے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں۔ عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں۔ رکوع اور سجود میں جھکنے والے ہوں۔''

قریش کا اعتراف:

عجیب بات یہ ہے کہ قریش اس کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام موحد تھے۔ مشرک نہیں تھے۔ یہ تمام باتیں جو کتاب اللہ کے حوالہ سے بیان کی گئیں ان کے یہاں مسلم تھیں۔ وحی الٰہی نے اعلان کیا۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (سورہ آل عمران ع ۷)

''ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ عیسائی تھا۔ بلکہ تمام گمراہیوں سے ہٹا ہوا۔ اپنے خدا کا فرمانبردار تھا۔ اور یقیناً وہ مشرک نہیں تھا۔''

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (سورہ آل عمران ع ۱۰)

''آپ کہہ دیجئے۔ اللہ نے سچ بات کہدی (اگر تم میں کچھ بھی سچائی کا لحاظ ہے۔ تو چاہیے کہ) ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو۔ جو ہر طرف سے ہٹ کر صرف اللہ ہی کا ہو رہا تھا۔

اور یقیناً ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔''

تو کتاب اللہ کے ان کھلے اعلانوں کی تردید و تکذیب نہ کسی یہودی نے کی نہ کسی نصرانی نے اور نہ مکہ کے کسی بت پرست مشرک کو ہمت ہوئی کہ اس کے خلاف چیلنج کر سکے۔

یہ تمام باتیں قریش کو تسلیم تھیں۔ وہ مانتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین حنیفیت تھا وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حنیفیت مفقود ہو چکی ہے ہم اس سے ہٹ گئے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی خدا ترس اس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں بھی ہوا کرتا تھا۔ اسی دور میں جو عبدالمطلب اور ابو طالب کا دور تھا چار شخص ایسے تھے جن کی زندگیاں اسی تلاش و جستجو میں صرف ہوئیں۔

ورقہ بن نوفل، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل لیکن عام طور پر وہی عناد تھا، وہی مکابرہ اور مقابلہ تھا جس کی قیامت خیزی نے نہ صرف دلوں کو بلکہ سرزمین حجاز کو پر آشوب رکھا۔

قرآن حکیم سے زیادہ حقیقت کو واشگاف کرنے والا کلام کون سا ہو سکتا ہے۔ ایک تعجب انگیز استفہام ہے۔

اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (سورہ مومنون ع ۵)

'' واقعی یہ بات ہے کہ وہ اپنے رسول کو پہچان نہیں سکے ہیں اسی بنا پر اس کی بات نہیں مانتے اس کے منکر ہو گئے ہیں۔ یا یہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہو گیا ہے۔ نہیں ان میں سے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ اللہ کا رسول ان کے پاس سچائی لے کر آیا ہے مگر ان میں سے اکثر کا یہ حال ہو گیا ہے کہ سچائی کا ماننا انہیں گوارا ہی نہیں ہے وہ حق سے کراہیت کرتے ہیں۔

اسی بنا پر اگر حضرت حق جل مجدہ نے فرمایا:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (سورہ بقرہ ع ۱)

''اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔''

تو منطق اور فلسفہ کو اعتراض کیوں ہے؟ اعتراض تو اس پر ہونا چاہیے کہ یہی عقل کے دیوانے جو اعتراف حق سے کراہیت کرتے ہیں انہیں سے اگر پوچھا جائے:

لِمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

''اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ! زمین اور وہ تمام مخلوقات جو زمین میں ہے کس کی ہے۔''

مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ

''ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے۔''

مَنْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ

وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمام چیزوں کی بادشاہی ہے وہی سب کو پناہ دیتا ہے اور کوئی نہیں جو اس سے اوپر پناہ دینے والا ہو۔

تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ان سب سوالوں کے جواب میں وہ یہی کہیں گے لِلّٰہِ یہ سب کام خدا کے ہیں اور یہ سب چیزیں خدا کی ہیں۔ (سورہ المومنون ع ۵) اس سے بڑھ کر کوئی عناد ہو سکتا ہے؟

مذہب مشرکین مکہ کی صحیح تصویر

اس بارے میں سیدنا شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تحقیق سب سے زیادہ قابل اعتماد ہوگی۔ الفوز الکبیر (۱۸۳) اور حجۃ اللہ البالغہ (۱۸۴) حضرت شاہ صاحب کی مشہور تصنیفات ہیں۔ آپ نے ان دونوں کتابوں میں اپنی تحقیق پیش فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

حنیف ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو ملت ابراہیمی کو اپنا مذہب مانتا ہو اور اس کے مخصوص طریقوں (شعائر) کا پابند ہو، ملت ابراہیمی کے شعائر یہ ہیں۔

حج بیت اللہ، استقبال کعبہ (کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا) غسل جنابت، (۱۸۵) ختنہ وغیرہ خصال فطرت (۱۸۶) تحریم (۱۸۷) اشہر حرم اور تعظیم مسجد (۱۸۸) حرام نسب یا رضاعت (شیر خواری) کی بنا پر جو عورتیں (۱۸۹) حرام قرار دی گئی ہیں ان سے نکاح حرام سمجھنا۔ اونٹوں کے سینہ کے اوپر خنجر مار کر ذبح کرنا جس کو عربی میں نحر کہتے ہیں۔ گائے بیل وغیرہ کا حلقوم اور اس سے متصل رگیں کاٹ کر ذبح کرنا (جھٹکے یا غیر ذبیحہ کو حرام سمجھنا) قربانی خصوصاً حج کے ایام میں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ملت حنیفیہ میں جب تک تحریف نہیں ہوئی تھی وضو اور نماز کا یہی حکم تھا اور روزہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک مانا جاتا تھا۔ اسی طرح یتیموں، مسکینوں کو صدقہ دینا، حق کے معاملہ میں جو ہنگامے برپا ہوں۔ جو حالات پیش ہوں اس میں سینہ سپر ہو کر حق کی امداد کرنا (اعانت برنوائب حق) رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنا۔ یہ تمام باتیں ملت ابراہیمی میں داخل تھیں اور جو ان پر عمل پیرا ہوتے تھے ان کی تعریف کی جاتی تھی۔ مگر عام طور پر مشرکین ان تمام باتوں کو چھوڑ چکے تھے اور قتل، چوری، زنا، سود اور غصب وغیرہ ملت حنیفیہ میں حرام تھے۔ مگر لوگ عام طور پر ان چیزوں کے عادی ہو گئے تھے۔ اگر چہ دل سے ان کو برا جانتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذی علم اور دانش مند عربوں کے خطبات اور ان کے اشعار و قصائد ظاہر کرتے ہیں کہ الٰہیات میں ان کے عقائد یہ تھے:

''زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے، بڑے بڑے واقعات اور حوادث اسی کے حکم سے ہوتے ہیں۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ رسول بھیجے، وہ انسانوں کے اچھے برے کاموں پر ان کو جزا اور سزا بھی دے گا، جو کچھ واقعات ہوتے ہیں وہ پہلے سے اللہ کے علم میں ہیں وہ پہلے ہی ان کو مقدر کر چکا تھا، فرشتے خدا کی مخلوق ہیں ان کو بارگاہ خداوندی میں تقرب حاصل ہے۔ وہ مستحق تعظیم ہیں۔''

لیکن یہ خاص خاص اہل دانش، متین اور سنجیدہ لوگوں کے عقائد ہوتے تھے۔ عوام کے عقائد میں پختگی نہیں

تھی جو باتیں ان کو عقل میں نہیں آتی تھیں ان میں طرح طرح کے شبہے پیدا کر کے وہ انہیں شبہوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے صفات خداوندی میں دوسرے شریک مان لیے تھے۔ اپنے بادشاہوں کی مثال بارگاہ حضرت حق پر چسپاں کر کے مقربین خداوندی کو وہی حیثیت دیتے تھے جو بادشاہوں کے مقربین کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مرنے کے بعد انسان پھر زندہ ہوگا۔ اسی طرح یہ بات بھی ان کے قیاس سے بعید تھی کہ کسی انسان کو اللہ تعالیٰ اپنا رسول بنا کر بھیجے اور اس کو اپنے خطاب و کلام سے نوازے۔ یہ عقائد کی تحریفات تھیں جو عوام میں عام ہوگئی تھیں۔ ان کے علاوہ بہت سی قباحتیں ان کے اعمال و افعال میں پیدا ہوگئی تھیں۔ حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''شرک کا یہی مطلب نہیں ہے کہ خدا کی ذات میں کسی کو شریک مانیں بلکہ شرک یہ بھی ہے کہ ان صفات میں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً اسباب و وسائل کے بغیر محض امر کُن سے کائنات میں تصرف کرنا۔ نیست کو ہست کر دینا یا جس طرح اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے کہ اس کو نہ ظاہری حواس (آنکھ وغیرہ) کی ضرورت ہے نہ منطقی قیاس اور عقلی دلائل کی۔ نہ الہام اور خواب وغیرہ سے اس کا علم حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا علم ان ذرائع و اسباب سے بے نیاز ہے اسی طرح کسی اور کے لیے علم ثابت کرنا۔''

یہ مشرک مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جس بات کا قطعی طور پر حکم فرما دیتا ہے پھر کوئی نہیں ہے کہ اس میں کوئی ترمیم کر سکے۔ وہ وجود کائنات (جوہر) کا خالق خدا ہی کو جانتے تھے۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ کائنات کے عظیم واقعات میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کارفرما ہے مگر انہوں نے خدا کو بادشاہوں سے تشبیہ دے لی تھی کہ جس طرح درباری مقرب بادشاہ کے مزاج میں دخیل ہوتے ہیں پھر روزمرہ کے جو کام ہوتے ہیں وہ یہ مقرب یا ان کے کارپرداز کرتے رہتے ہیں بادشاہ کو ان کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ گماشتوں اور کارندوں کے خوش کر دینے ہی سے بہت سے کام چل جاتے ہیں اور جو کام نسبتاً بڑے ہوتے ہیں وہ وزیروں کے ذریعہ پورے ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی بڑا کوئی کام ہوتا ہے جس میں بادشاہ کو بہ نفس نفیس متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ خداوند عالم اور اس کے مقربین کے متعلق بھی ان کے یہی عقائد تھے اور اسی بنا پر ان کی تعظیم و تکریم کی جاتی تھی ان کے نام کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ ان کے نام کی مورتیاں بنا کر ان کے سامنے سجدے کیے جاتے تھے ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ وہ بھی سمجھتے تھے کہ جس طرح بعض کام بادشاہ کو پسند نہیں ہوتے مگر اپنے مقربین کی خوشنودی کے لیے اس کو پسند کرنے پڑتے ہیں یہی شان ان فرشتوں یا ان بندگان خدا کی بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت سمع و بصر کو بھی اپنے سمع و بصر پر قیاس کرتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ خاتمہ کلام پر فرماتے ہیں:

اگر در تصور حال مشرکین و عقائد و اعمال ایشاں توقف داری احوال محترفان زمان خصوصا

آ نانکہ اطراف درالاسلام سکونت دراند۔ ملاحظہ کن کہ ولایت راچہ خیال کردہ اند باوجود اعتراف بر ولایت اولیاء متقدمین دریں زمانہ وجود اولیاء محال مے انگارند و بقبور آستانہا مے روند۔ وانواع شرک بعمل مے آرند۔ تشبیہ وتحریف چگونہ درایشاں راہ یافتہ است۔ وبحکم حدیث صحیح لتتبعن سنن من کان قبلکم ازیں آفات ہیچ چیز نیست مگر امروز قومے مرتکب آنند ومعتقد مثل آن۔ عافانا الله سبحانه من ذلك

(الفوز الکبیر ص ۴ تا ص ۶)

مکہ معظّمہ میں سیاسی اور مذہبی انقلابات، خانہ خدا، صنم خانہ کس طرح بنا اور کب بنا سرزمین عرب میں بت پرستی کا رواج

ایک مثال جواس بحث کی ابتداء میں دی تھی۔ اس کو سامنے رکھئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور چہیتے برخوردار کو لیجا کر تمام دنیا سے الگ تھلگ وادی غیر ذی ذرع میں آباد کرتے ہیں۔ مقصد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ لیقیموا الصلوۃ تاکہ قائم کریں نماز۔ مؤرخ ابوالفداء کا بیان ہے کہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام نے یہاں سکونت اختیار کی تو وہ قبیلے جو اس کے گردونواح میں آباد تھے وہ بھی یہیں آ کر رہنے لگے۔

ابن ہشام بہت سے قبیلے نہیں بلکہ پہلے آباد ہونے والوں میں بنو جرہم کے علاوہ بنو قطورار (۱۹۰) کو شمار کرتا ہے۔

تولیت کعبہ اور حکومت مکہ:

توریت (۱۹۱) میں ہے:

اسمٰعیل کی حیات کے برس ایک سو سینتیس تھے۔ (پیدائش)

اب ظاہر ہے حضرت اسمٰعیل جب تک زندہ رہے وہ مرجع خلائق رہے۔ وہ خدا کے برگزیدہ رسول اور خانہ کعبہ کے ایک معمار تھے۔ ان کی زندگی میں تولیت کعبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ نابت جو بروایت توریت پہلوٹے تھے متولی قرار دیئے گئے۔

اس عرصہ میں جو سو سال سے زائد ہے مکہ کی نو آبادی نے شہر کی حیثیت اختیار کر لی اور شہری نظم ونسق کا سوال پیدا ہوا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے مؤرخ ابوالفداء کی تحقیق یہ ہے کہ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام مکہ میں تشریف لائے اس وقت بھی مالک حجاز۔ بنو جرہم تھے مکہ کی اس نو آبادی کا سیاسی اقتدار بھی انہیں کے ہاتھ میں رہا۔

اگر چہ عرب مستعربہ کے بیان کے آغاز میں ابوالفداء نے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ حضرت اسمٰعیل کے دوسرے بیٹے جن کا نام قیدار (۱۹۲) تھا ان کو حاکم بنا دیا گیا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایک بھائی خانہ کعبہ کے متولی ہوئے اور دوسرے حاکم۔ لیکن آبادی کی ابتداء ہی میں یہ فرق ہو گیا تھا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تنہا تھے اور بنو جرہم کا ایک پورا خاندان یا قبیلہ تھا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی سوتیلی ماں کے لڑکے بھی اگر یہاں آباد ہوئے تو سب نہیں بلکہ ایک دو آباد ہوئے۔ کیونکہ توریت کی روایت یہ ہے کہ وہ ملک شام سے پورب کی طرف متفرق مقامات پر آباد ہوئے۔

بہر حال قیدار کو اگر مکہ کا حاکم بنا دیا گیا تب بھی یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ اس کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت آل اسمٰعیل علیہ السلام کے سپرد رہی۔ جہاں تک حکومت کا تعلق تھا اس کی باگ ڈور بنو جرہم کے ہاتھ میں رہی اور چونکہ بنو جرہم بنو اسمٰعیل کی ننھیال تھے اس لیے ان بزرگوں نے حکومت کے معاملات میں مزاحمت بھی نہیں کی۔ بلکہ ان کا کام دعوت الی اللہ رہا اور جیسا کہ ابن ہشام (۱۹۳) کا بیان ہے یہ جہاں پہونچتے تھے لوگوں پر غالب ہو جاتے تھے اور ان کو اپنا تابع بنا لیا کرتے تھے۔

اب پہلا انقلاب یہ ہوا کہ آل اسمٰعیل کو تولیت کعبہ سے خارج کر دیا گیا اور بنو جرہم ہی کعبہ کے متولی ہو گئے۔ رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی تھی کہ کعبہ صرف عبادت گاہ نہیں رہا تھا جہاں تارکین دنیا اور عبادت گذار روحانی تقدس حاصل کرنے کے لیے پہنچیں۔ بلکہ ایک مخزن بھی بن گیا تھا جہاں لوگوں کے نذرانے آتے تھے۔ خرچ بھی ہوتے تھے اور جمع بھی کیے جاتے تھے۔ بنو جرہم قابض ہوئے تو انہوں نے آمد و خرچ میں خرد برد شروع کی اور آنے والوں پر بھی پابندیاں لگائیں۔ یعنی یہ کعبہ جو ہر ایک کے لیے آمن تھا۔ اب اس کا امن بنو جرہم کی مرضی پر موقوف ہو گیا۔

ابن ہشام کی تحقیق یہ ہے کہ عربوں کا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ مکہ اپنی حدود میں ظلم و تعدی برداشت نہیں کر سکتا اس کی روایات یہ ہیں کہ جب بھی کسی نے ظلم و تشدد کا رویہ اختیار اس کو نکال باہر کر دیا۔ اسی لیے اس کو ناسہ اور باسہ کہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا نام بکہ بھی ہے اور کہا جاتا ہے:

انها ما سميت ببكه الا انها كانت تبك اعناق الجبابرة اذا احدثوا شيئا (صفحہ ۷۲)

کہ بکہ اس لیے کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی جابر و ظالم یہاں کوئی ایسا طرز اختیار کرتا ہے جو یہاں کی روایات کے خلاف ہو تو یہ بلد الحرام اس کی گردن توڑ دیتا ہے۔

بہر حال جرہم کی دست درازی کے خلاف لوگوں میں ہیجان پیدا ہوا۔ عمرو بن لحی جو ایک چالاک سردار تھا آگے بڑھا اس نے بنو جرہم کو مکہ سے نکال باہر اور خود در و بست کا مالک بن گیا اسی کے اخلاف اور جانشین بنو خزاعہ تھے جو تقریباً تین سو برس تک مکہ پر حکمراں رہے۔ انہیں خارج ہونے والوں میں عمرو بن حارث تھا جس کے ماتمی قصیدہ کے کچھ اشعار پہلے گذر چکے ہیں۔

قریش کا تسلط:

بنوخزاعہ کے اقتدار کو جس نے چیلنج کیا وہ قَصَیُ ہے۔ جس کی چار نسلوں کے بعد فخر موجودات رحمتہ للعالمین۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی) کا ظہور اقدس ہوا۔

قصی بچپن میں باپ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گیا تھا۔ ماں نے بنی عذرہ کے قبیلہ میں اپنا دوسرا نکاح کر لیا۔ بنو عذرہ شمالی عرب کے حدود میں شام کے پاس آباد تھے۔ قصی نے بھی ماں کی آغوش میں یہیں پرورش پائی۔ جوان ہو کر نسل و وطن کی جستجو کی تو حجاز میں سراغ پایا۔ بچپن ہی سے عالی حوصلہ اور بلند نظر تھا۔ مکہ میں دوسرے قبائل نے قریش کو دبا لیا تھا۔ اس نے مکہ آ کر قریش کے منتشر اجزا کو فراہم اور چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد مکہ کی سرزمین میں قریش کی ایک مختصر سی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ موقع تھا کہ قریش نے حجاز کی سرزمین میں سیاسی اہمیت حاصل کی۔

مولانا سید سلیمان صاحب فرماتے ہیں:

''قصی نے مکہ میں جو چھوٹی سی ریاست قائم کی تھی اس کی حیثیت ایک شہری جمہوریت کی تھی۔ یونان کے شہر ایتھنز اور اسپارٹا کے طرز حکومت کا ایک دھندلا سا خاکہ قریش کی سرزمین میں نظر آتا تھا۔ اس شہر کی حکومت میں کل چودہ عہدے تھے جو دس عہدہ داروں پر منقسم تھے۔ دس عہدیدار قریش کے دس قبائل سے منتخب ہوتے تھے۔ ظہور اسلام کے وقت ان عہدوں کی تقسیم حسب ذیل تھی۔

مذہبی:

نمبر شمار	عہدہ خدمات	نام قبیلہ	عہدہ دار
۱-	سقایہ، حاجیوں کے کھانے پینے کا سامان	بنو ہاشم	عباس بن عبد المطلب
۲-	عمارہ، خانہ کعبہ کا انتظام	-	-
۳-	افادہ، حاجیوں کی مالی اعانت کا انتظام	بنو نوبل	حارث بن عامر
۴-	سدانہ، خانہ کعبہ کی دربانی وکلید برداری	بنو عبد الدار	عثمان بن طلحہ
۵-	ایسار، بتوں سے استخارہ کی خدمت	بنو جمح	صفوان بن اُمیہ
۶-	اموال محجرہ، بتوں کے نذرانوں اور جائدادوں کا انتظام	بنو سہم	حارث بن قیس

عدالتی:

۷- ندوہ	عدالت خانہ اور مشورہ گاہ کا انتظام	بنو عبد الدار	عثمان بن طلحہ

۸-مشورہ	امور مہمہ میں مشورہ لینا	بنو اسد	یزید بن زمعہ
۹-اشناق	خون بہا، جرمانہ اور مالی تاوان کا انتظام	بنو تمیم	ابوبکر صدیق
۱۰-حکومت	مقدمات کا فیصلہ	بنو سہم	حارث بن قیس

جنگی:

۱۱-عقاب	نشان قومی کی علم برداری	بنو اُمیہ	ابوسفیان
۱۲-قبہ	فوجی معسکر (کیمپ) کا نظم	بنو مخزوم	خالد بن ولید
۱۳-اعنہ	سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری	-	-
۱۴-سفارہ	سفارت	بنو عدی	عمر بن الخطاب

اس چھوٹی سی شہری حکومت کا ایوان حکومت دار الندوہ کے نام سے موسوم تھا۔ اس کا بانی قصی تھا ہر قسم کے اجتماعی، تجارتی، عدالتی اور سیاسی احکام اور فیصلے قریش اسی عمارت میں بیٹھ کر صادر کرتے تھے یہاں تک کہ شادی، بیاہ، بلوغ کے مراسم، قافلوں کی روانگی و داخلہ وغیرہ جملہ امور یہیں انجام پاتے تھے۔ قریش نے داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کا مجرمانہ فیصلہ بھی اسی ایوان عدالت میں بیٹھ کر صادر کیا تھا۔

یہ اندرونی انقلاب تھے کہ ایک ہی شہر کے دو گروہ آپس میں کبھی غالب کبھی مغلوب ہوتے رہے لیکن پڑوسی ممالک حجاز کے بارے میں ہمیشہ محتاط رہے یا گاہ بگاہ ان کے اقدامات بھی حجاز اور مرکز حجاز (مکہ معظمہ) میں انقلاب برپا کرتے رہے۔ یہ تحقیق طلب سوال ہے۔

حجاز کے ایک جانب وہ ارض مقدسہ ہے جو فرمان قضا وقدر نے بنو اسرائیل کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ جہاں پہلے عمالقہ کا قبضہ رہا پھر بنو اسرائیل کا دار الحکومت بنا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عروج و اقبال کا آفتاب یہیں روشن ہوا۔ اس دور میں آل اسمٰعیل کے خاندان۔ حدود عرب میں پھیلتے رہے۔ پھر جب مشرقی یورپ میں رومی ایمپائر نے بال و پر پھیلائے تو یہ علاقہ اس شہنشاہیت کے زیر سایہ آ گیا۔ ایشیا میں شاہان فارس کا جاہ وجلال بازنطینی شاہنشاہیت (رومی ایمپائر) کا رقیب بنا رہا۔ ان دونوں رقیب طاقتوں نے حجاز کو بفر اسٹیٹ کے انداز پر آزاد بنائے رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ اس لیے ان کی چیرہ دستی سے محفوظ رہا۔ لیکن یمن جس کے عروج اور ترقی کی پوری داستان پہلے بیان کی جا چکی ہے وہ بھی حجاز کے بارے میں محتاط رہا۔ یہ قرین قیاس نہیں ہے۔ جس یمن کی حوصلہ مندی اور بلند آہنگی سمندر پار حبش کو آزاد نہیں رکھ سکی وہ حجاز کو کب نظر انداز کر سکتی تھی۔ ملوکانہ سیاست کا کوئی بھی مزاج شناس اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ دونوں ملکوں میں مذہب کا اختلاف بھی رہا ہو۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ (خداوند مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھ کہ ہم اصنام کی پرستش کریں) یقیناً بار آور ہوئی اور جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ

محدث دہلوی رحمہ اللہ کی تحقیق پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ آل اسمٰعیل یعنی خانہ کعبہ سے وابستہ قبائل عمرو بن لحی کے وجود سے پہلے اصنام پرستی کے عادی نہیں ہوئے۔ اس کے برخلاف یمن میں ستارہ پرستی۔ آفتاب پرستی۔ پھر یہودیت اور عیسائیت پھیلتی رہی اور متصادم ہوتی رہی۔ آل اسمٰعیل علیہ السلام کے علاوہ جرہم۔ جن کی اولاد بن جرہم تھی۔ جن کا ایک خاندان چشمہ زمزم کے قریب آ کر آباد ہوا اور غالباً اسے بھی کسی ایسی وادی غیر ذی زرع کی تلاش تھی۔ جہاں وہ دنیا سے الگ تھلگ عبادت رب اور یاد خدا میں مصروف رہ سکے۔ یہ جرہم اگر قحطان کا لڑکا نہیں تھا، اس کا بھائی تھا یا کسی اور سامی خاندان سے اس کا تعلق تھا تو اہل یمن اور اہل حجاز میں نسلی اختلاف بھی تھا۔ اب ملکی، مذہبی اور نسلی اختلاف کے باوجود خوش حال ترقی پذیر و متمدن یمن قناعت پسند رہا ہو۔ فطرت انسانی اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ بوسیدہ اوراق۔ دبے ہوئے کتبات ذہنی یادداشتوں اور خاندانی روایات کے انبار میں اسے ایسے شواہد ملتے ہیں جو اس کا ثبوت ہیں کہ حجاز کو یمن سے رقابت رہی اور اس کی کوشش رہی کہ حجاز بھی یمن ہی کی زنبیل میں پڑ جائے۔ مثلاً

(۱) بنوخزاعہ کے تسلط سے پہلے ایک دور ایسا گذرا کہ مکہ معظمہ پر عمالقہ کا قبضہ ہو گیا۔ یہ عمالقہ قبیلہ حمیر کی ایک شاخ تھے۔ یہ حمیری قبائل یمن میں تو اقتدار سبا کے سامنے ایک کنارے پر سمٹے رہے لیکن حجاز ان کی یلغار سے محفوظ نہیں رہا۔

(۲) عمالقہ کا یہ تسلط اس وقت ہوا جب بنو جرہم اور آل اسماعیل میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی لیکن پھر ان دونوں قبیلوں کو ہوش آیا اور آپس میں اتحاد کر کے عمالقہ کو نکال دیا۔ اب بنو جرہم کا اقتدار پھر بحال ہو گیا۔

(۳) لیکن پھر ایک طاقت عمرو بن لحی کے زیر قیادت نمودار ہوئی اور اس نے بنو جرہم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ یہی عمرو بن لحی ہے جس کے اخلاف بنوخزاعہ کے نام سے مشہور ہوئے یہ تقریباً تین سو برس تک مکہ کے دروبست کے مالک رہے تا آنکہ قصی نے قریش کی منتشر طاقت کو منظم کر کے بنوخزاعہ کو مکہ سے نکالا۔

(۴) عمرو بن لحی اگر یمنی ہے (جس کی بحث آگے آتی ہے) تو یہ ایک اور انقلاب ہے جو یمن کے پوشیدہ ہاتھ نے مکہ میں برپا کیا۔

(۵) تبع یمن اسعد تبان ابوکرب۔ کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے جس نے مکہ پہنچ کر خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا اور یثرب سے یہودی علماء کو یمن لایا جنہوں نے یمن میں یہودیت کی اشاعت کی۔ اسعد ابوکرب کے اس سفر کا مقصد ملک گیری تھا یا اظہار عقیدت اس پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔

اس طرح کے واقعات تاریخ میں اور بھی مل سکتے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ابرہہ کا یہ اقدام یمنی کشور ستانی کی پہلی کوشش نہیں تھی۔ بلکہ ایک طویل سلسلہ کی آخری کڑی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ارض حجاز یمن کے تابع اور اس کے زیر نگیں ہو اور اہل حجاز کی گردنیں شاہان یمن کے سامنے جھکیں۔

مذہبی انقلاب اور تبدیلی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

رایت عمرو بن عامر الخزاعی یجر قصبه فی النار۔ وکان اوّل من سیب السوائب۔ بخاری شریف باب قصة خزاعه وفی روایة اوردها ابن اسحاق فی السیرة الکبری۔ انه اول من غیر دین اسمعیل فنصب الاوثان وسیب السائبة وبحر البحیره ووصل الوصیلة وحمی الحامی (فتح الباری)

ترجمہ: ''میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی انتڑیاں دوزخ کی آگ میں کھینچ رہا تھا (یعنی اس کی انتڑیاں بکھری ہوئی تھیں اور انہیں کھینچے کھینچے پھر رہا تھا) یہی پہلا شخص ہے جس نے سانڈ چھوڑنے کی رسم ایجاد کی تھی۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہی شخص ہے جس نے بت نصیب کئے۔ سائبہ اور بحیرہ۔ وصیلہ اور حامی کو رواج دیا''(۱۹۴)۔

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یہ عمرو کوئی راہب یا سادھو نہیں تھا بلکہ ایک بادشاہ تھا۔ مؤرخ ابوالفداء نے اس کو عرب کے ان بادشاہوں میں شمار ہے جو حمیر یا کندہ وغیرہ کے مشہور خاندانوں میں سے نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق متفرق خاندانوں سے تھا۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے بیان ہے کہ بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ یہی عمرو بن عامر جس کو عمرو بن لحی (۱۹۵) بھی کہا جاتا ہے ایک مرتبہ اپنی کسی ضرورت سے شام گیا۔ وہاں لوگوں کو بتوں کی پوجا کرتے دیکھا ان سے اس کی حکمت دریافت کی تو بتایا گیا ہم ان سے کبھی بارش۔ کبھی دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی درخواست کرتے ہیں تو وہ ہماری مانگ پوری کر دیتے ہیں۔ اس نے ان سے درخواست کی ایک بت اس کو بھی دیدیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک بت جس کا نام ہبل تھا اس کے حوالہ کر دیا۔ اس نے اس کو لا کر خانہ کعبہ میں نصب اور لوگوں کو حکم کہ وہ اس کی پرستش کریں۔

عرب میں یہ رواج پہلے سے چل گیا تھا کہ جب کہیں وہ جایا کرتے تھے تو حرم شریف سے ایک پتھری اٹھا کر ساتھ رکھ لیا کرتے تھے اور جہاں وہ قیام کرتے تھے اس پتھری یا پتھر کو وہاں رکھ کر خانہ کعبہ کی طرح اس کا طواف کرتے تھے۔ پھر حرم کے پتھر کی شرط بھی نہیں رہی بلکہ جو پتھر پسند آتا تھا اس کی پوجا شروع کر دیتے تھے۔ اس طرح عرب میں بت پرستی کا رواج ہوا۔ پھر جب ہبل نام کا بت لا کر رکھا تو پرانے بتوں کے نام اور ان کی پرستش بھی زندہ ہوگئی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ کے بتوں کے جو نام تھے انہیں ناموں کے بت انہوں نے بنائے اور پوجا شروع کر دی۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہی بت کسی طرح پرانے کھنڈرات میں برآمد ہو گئے تھے۔

ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن نضر نے سواع کی پرستش شروع کی، رھاط میں اس کا مجسمہ کھڑا کر دیا۔ کلب بن دبرہ نے (جو قضاعہ کی ایک شاخ تھی) دو کو دومۃ الجندل میں ظہور بخشا۔ طے کے کچھ قبائل نے یغوث کو زندہ کر کے جرش میں کھڑا کر دیا۔ ارض ہمدان میں یعوق کو حیات نو عطا کی گئی وغیرہ وغیرہ۔

عمرو بن لحی کون تھا:

سرور کائنات رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بخاری نے نقل کیا ہے:

(۱۹۷) عمرو بن لحي بن قمعه بن خندف ابو خزاعه (بخاری شریف باب قصہ خزاعہ ص ۴۹۹)

ترجمہ یہ ہے۔ عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف قبیلہ خزاعہ کا باپ (مورث) ہے۔

ارشاد گرامی نے یہ تو واضح کر دیا کہ قبیلہ خزاعہ کا سلسلہ عمرو بن لحی سے چلا ہے لیکن خود عمرو بن لحی کے متعلق یہ تحقیق باقی رہ گئی کہ اس کا تعلق بنو اسمٰعیل سے تھا یا کسی اور قبیلہ یا خاندان سے۔

مؤرخ ابو الفداء جو ایسے مسائل میں عقدہ کشائی کرتا ہے خاموش ہے۔ اس نے صرف یہ بتایا کہ یہ ایک بادشاہ (حکمراں) تھا۔ جس نے مکہ پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ اس نے اس کا شمار بھی عرب کے ان بادشاہوں میں ہے جو حمیر، کندہ وغیرہ کے مشہور خاندان کے علاوہ متفرق خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے مگر اس کا خاندان نہیں بیان۔

ابن ہشام نے خزاعہ کے سلسلہ نسب پر ماہرین انساب کی رائے ظاہر کرتے ہوئے قمعہ (عمرو کے دادے) کو پسر الیاس بتایا ہے (۱۹۸) چونکہ الیاس۔ نضر بن نزار بن معد بن عدنان کا لڑکا ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ عمرو بن لحی۔ عدنانی ہے یعنی آل اسمٰعیل میں سے ہے۔ مگر اس کے خلاف ابن کلبی کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اہل سبا میں سے ہے۔ اور جو گ سیل عرم کی تباہ کاری سے بچ کر یمن سے نکلے تھے ان میں عمرو بن لحی کا خاندان بھی تھا۔ بنو نازن شام کی طرف گئے اور چشمہ غان پر جا کر آباد ہو گئے۔ یہ غانی کہلانے لگے۔ لیکن عمرو بن لحی کا خاندان شام کی بجائے مکہ آ گیا۔ اور یہیں اس نے سکونت اختیار کر لی۔

وہ کہتے ہیں خاندان عمرو بن لحی کو خزاعہ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ سبا کے باقی قبائل سے کٹ گئے تھے۔ خزع کے معنے ہوتے ہیں قطع کر دینا اور کاٹ دینا الگ کر دینا۔ خزاعہ وہ جو کٹ کر الگ ہو گیا۔ ابن کلبی اپنے استدلال میں حضرت حسان بن ثابت کا ایک شعر بھی پیش کرتے ہیں۔

(۱۹۹) ولما نزلنا بطن مر تخزعت خزاعه منافي جموع کراکر

ابن کلبی جرہمی۔ عمرو بن لحی کا نانا تھا۔ اس نے مرنے کے وقت اس نواسے (عمرو بن لحی) کو متولی بنا دیا۔ پھر جب یہ قابض ہو گیا تو اس نے لڑ جھگڑ کر بنو جرہم کو خارج البلد کر دیا اور خود حکمراں بن گیا۔ (۲۰۰)

لیکن ارشاد نبوی میں (صلی اللہ علیہ وسلم) قمعہ کو ابن خندف فرمایا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قمعہ پسر

خندف ہے (جیسا کہ حدیث میں ہے) یا پسر الیاس ہے (جیسا کہ ابن ہشام نے بیان ہے) اور اگر ارشاد رسول اللہ علیہ وسلم کے بموجب پسر خندف ہے تو خندف کا تعلق کس خاندان اور سلسلہ نسب سے ہے۔

لیکن ایک عجیب لطیفہ ہے خندف مرد نہیں ہے۔ عورت ہے۔ اس کا اصل نام لیلیٰ تھا (بنت حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاعہ) یہ الیاس کی بیوی تھی۔ خندف اس کا نام اس لیے پڑ گیا تھا کہ اس کو دوڑ کر چلنے کی عادت تھی۔ دوڑ کر چلنے کو خندفہ کہتے ہیں۔

بس قمعہ ابن خندف بھی ہے اور ابن الیاس بھی۔ اور ماں کے نام سے شہرت اس بنا پر ہوئی کہ قمعہ ابھی بچہ ہی تھا کہ باپ (الیاس) کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس حادثہ سے خندف حواس باختہ ہو گئی۔ وہ دیوانہ وار پھرتی تھی اور اگر کوئی پوچھتا کہ یہ بچہ کس کا ہے تو الیاس کے بجائے اپنا ہی نام بتا دیا کرتی تھی اسی بنا پر لوگ قمعہ کو ابن خندف کہنے لگے۔ اب قمعہ کی ولدیت کا سوال طے ہوا تھا تو ایک اور بات سامنے آ گئی غور فرمایئے آنحضرت ﷺ کے دو ارشاد جو اوپر نقل کیے گئے ہیں ان میں پہلی روایت میں عمرو بن عامر ہے اور دوسری میں عمرو بن لحی، پھر لحی کو حدیث میں ابن قمعہ فرمایا گیا ہے اور اہل علم نے اس کو ابن حارثہ بھی لکھا ہے۔ حافظ بن حجر فرماتے ہیں۔ وہ حارثہ بن عمرو بن عامر بن مار السماء کا بیٹا ہے۔

اب اول تو ولدیت کا سوال جواب طلب ہے اور اگر صحیح یہی ہے کہ لحی حارثہ کا بیٹا تھا تو پھر یہ سبائی اور یمنی ہوگا کیونکہ حارثہ یمنی تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ علماء سے یہ نقل کی ہے کہ لحی نسب کے لحاظ سے اسماعیلی ہے اور پرورش کے لحاظ سے یمنی۔ کیونکہ لحی ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ اس کے باپ قمعہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ قمعہ کی ماں حارثہ کے یہاں رہا کرتی تھی۔ وہیں قمعہ پیدا ہوا تو حارثہ نے متبنیٰ بنا لیا۔ پس لحی نسباً اسماعیلی ہے اور تبنی کے لحاظ سے یمنی اور حارثہ کے دادے کا نام عامر تھا اس کی طرف نسبت کر کے عمرو کو ابن عامر بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

بہر حال ارشاد رسول اللہ ﷺ کے طفیل میں یہ تو واضح ہو گیا کہ عمرو بن لحی ابو خزاعہ ہے لیکن یہ کہ قبیلہ خزاعہ یمنی الاصل ہے یا حجازی اور اسماعیلی ہے یا سبائی۔ یہ صاف نہیں ہو سکا۔ پھر ولدیت کے مسئلہ میں جو اختلاف نمایاں ہے اس نے اس سوال کو اور الجھا دیا۔

امام بخاری کی علمی ظرافت:

غالباً یہی اختلاف جس میں ایک افسانہ کا رنگ بھی آ گیا ہے امام بخاری کے پیش نظر ہے۔ جس کی بنا پر آپ نے ترجمہ باب (عنوان) قصہ خزاعہ قائم کیا ہے۔ یعنی خزاعہ کی کہانی۔

عمر بن لحی کب تھا:

سیدنا شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ الفوز الکبیر میں فرماتے ہیں:

ابن حارثہ پیش از بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزدیک بسہ صد سال وقوع یافت۔

یہی مدت حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں بھی تحریر فرمائی۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تک آل اسماعیل (علیہ السلام) میں اصنام پرستی کی عمر تقریباً تین سو سال ہوئی تھی۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو تفصیل بیان کی ہے اس کے بموجب عمرو بن لحی سے لے کر آنحضرت ﷺ کی بعثت تک تقریباً پانچ سو سال کا عرصہ ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب عمرو بن لحی کا تسلط مکہ معظمہ پر ہو گیا تو اس کے بعد اس کے اخلاف بنوخزاعہ تین سو برس تک بیت اللہ کے متولی رہے۔ اس قبیلہ کا آخری شخص ابوغبشان تھا۔ اس کا نام محترش بھی تھا۔ (ابن حلیل بن جشیہ ابن سلول۔ ابن عمرو بن لحی) یہ قصی بن کلاب کا ماموں ہوتا تھا۔ ایک ناسمجھ آدمی تھا۔ شراب کا بھی دھنی تھا۔ قصی نے اس کو پرچالیا اور خانہ کعبہ کی تولیت حاصل کر لی۔ کہتے ہیں کچھ اونٹ دیدیئے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ شراب کے ایک مشکیزہ پر معاملہ ہو گیا۔

خانہ کعبہ کی تولیت تو قصی نے اس طرح حاصل کی۔ پھر خزاعہ نے مقابلہ تو یہ آل فہر (قریش) کو مسخر کر چکا تھا۔ انہوں نے طاقت کا جواب طاقت سے دیا یہاں تک کہ خزاعہ کو مکہ سے نکال دیا اور مکہ میں ایک جمہوری قسم کی شہری حکومت قائم کر دی۔''

قصی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک چار پشتیں گذر چکی تھیں۔ یعنی عبد مناف پھر ہاشم پھر عبد المطلب پھر بعثت کے وقت ابوطالب جانشین تھے اور ان کی جانشینی کو بھی ۳۲ سال گذر چکے تھے۔ اس طرح تقریباً پانچ سو سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

خلاصہ اور نتیجہ

سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اس اقدام کو سامنے رکھئے کہ ساری دنیا سے الگ تھلگ ایک ویران وادی میں خانہ خدا کے قریب اپنی ذریت اس لیے آباد کر رہے ہیں تا کہ نماز قائم کریں۔

خدا سے دعا کر رہے ہیں کہ ان کو پھلوں کا رزق عطاء فرما۔ اسی شہر کو امن واماں کا شہر بنا۔

وَاجْنُبْنِىْ وَبَنِىَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ، اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ

مَثَابَةً لِّلنَّاس

مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ

جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ

قِيَامًا لِّلنَّاسِ

''مجھے اور میرے بیٹوں کو اس سے محفوظ رکھ کہ ہم اصنام کی پوجا کریں یہ بیت خدا۔ سب سے پہلا گھر ہے جو بنایا گیا تمام انسانوں کے لیے۔ تمام انسانوں کا مرجع اور سب کے لیے امن واماں کی جگہ۔ سب کے لیے باعث برکت اور ہدایت مسجد حرام پوری نوع انسان کے لیے ہے۔ اس پر تمام انسانوں کے بقاء کا مدار ہے۔

یہاں کے رہنے والے اور باہر سے آنے والے اس میں سب برابر ہیں سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام جنہوں نے کعبہ کی تعمیر کی اور اس شہر کی بنیاد رکھی۔ وہ نہ صرف خدا پرست تھے بلکہ خدا شناسی اور خدا پرستی میں مثال عظیم تھے۔ وہ دنیا کو اسی کی دعوت دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے باپ سے مناظرہ ۔ پھر اس راہ میں بے پناہ مشکلات برداشت کیں۔ وہ دین حنیف کے داعی تھے۔ مشرک نہیں تھے۔ انہوں نے نہ صرف بت پرستی سے بیزاری کا اعلان ۔ بلکہ بت پرستوں سے بھی کہہ دیا کہ میرا ایمان یہ ہے کہ تم سے دشمنی اور بغض ونفرت کا اعلان کروں پھر انہوں نے مورتیوں کو توڑا جس کی پاداش میں ان کو آگ میں جھونکا گیا۔ یہ تمام باتیں مشرکین مانتے تھے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کے صحیح جانشین تھے۔ سو برس سے زائد تک خانہ کعبہ کے متولی رہے اور انہیں اصول پر کار فرما رہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کئے تھے۔ ان کے بعد اگر چہ ان کی اولاد زیادہ عرصہ تک متولی نہیں رہی۔ لیکن خانہ کعبہ پھر بھی مرکز توحید رہا۔ اس کے بعد ان میں کچھ غلط رجحان پیدا ہوتے ہیں۔ ایک اور جماعت قبضہ کر لیتی ہے اس کا لیڈر بت پرستی کو رواج دیتا ہے اور ان روایات سے کھلے طور پر بغاوت کرتا ہے جو کم از کم دو ہزار سال پرانی اور موروثی روایات تھیں۔ پھر یہ شرک پھیلانے والی جماعت۔ اگر چہ مغلوب ہو جاتی ہے اور قریش کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ لیکن قریش دین ابراہیم اور ملت حنیفہ کا دعویٰ کرتے ہوئے عمل وہ کرتے ہیں جو اس شرک پرست جماعت کا عمل تھا۔ جس نے موروثی اور قومی روایات سے بغاوت کی تھی۔ قریش اس بغاوت میں اپنی پیش رو باغی جماعت سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ انتہا یہ کہ کعبہ مسجد حرام اور اس بلد حرام کو جو توحید پرستوں کے لیے دار امن تھا۔ اس کو خدا پرستوں کے لیے دار محن بنا دیتے ہیں جہاں ان کی نہ جان محفوظ، نہ ان کی عزت وآبرو محفوظ، نہ ان کا مال ومتاع محفوظ۔

سوال یہ ہے کہ بیت اللہ کی تولیت اس کی حفاظت اور بلد الحرام (شہر مکہ) کے نظم ونسق کا حق کس کو پہونچتا ہے۔ ان کو جو کعبہ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور اپنی ایجاد کردہ رسومات کو اپنا مذہب اور دھرم سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام افعال اور ہماری تمام رسومات ان مقاصد سے منحرف ہیں جن کے لیے یہ شہر آباد گیا تھا جو خانہ کعبہ کے بنیادی مقاصد تھے یا اس کا حق ان کو پہونچتا ہے جو دین ابراہیم کا احترام کرنے والے ہیں ملت ابراہیم کے پابند ہیں۔ دعوت ابراہیمی کو کامیاب بنانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اس کے لیے

جان و مال کی قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔

قرآن حکیم نے اس نقطہ پر بحث کی ہے اور اس نے اس قانونی اور آئینی فیصلہ کو بار بار دہرایا ہے کہ وراثت ابراہیمی کے وارث وہی ہو سکتے ہیں جو اس کی دعوت کے حامی، اس کی ملت کے پابند اور اس کے دین کے علمبردار و فدا کار ہوں۔

(الف) کتاب اللہ کا واضح فیصلہ ملاحظہ فرمایئے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ

''ابراہیم نہ یہودی تھے۔ نہ نصرانی بلکہ ان تمام غلط راستوں سے ہٹے ہوئے تھے خدا کے فرمانبردار تھے اور ابراہیم مشرک بھی نہیں تھے۔''

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(سورہ آل عمران ۷۳)

''بیشک سب سے زیادہ ابراہیم سے قریب وہ ہیں جنہوں نے (آپ کے زمانے میں) آپ کی پیروی کی تھی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے۔ (مسلمان)

(ب) کتاب اللہ نے اس کی بھی تصدیق کر دی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ماننے والے ملت ابراہیم کے سچے پابند و متبع ہیں اور یہی ہیں جو دعوت ابراہیمی کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (سورہ حج ع ۱۰)

''اس نے تمہیں برگذیدگی کے لیے چن لیا۔ تمہارے لیے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی وہی طریقہ تمہارا ہوا جو تمہارے باپ ابراہیم کا تھا۔ اس نے تمہارا نام مسلم رکھا پچھلے وقتوں میں بھی۔ اور اس (قرآن) میں بھی۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے آفتاب و ماہتاب کی بے ثباتی پر نظر کرنے کے بعد فیصلہ تھا۔

إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ

''میں نے سب سے ہٹ کر اپنا رخ صرف اس ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا اور میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں۔''

اسی ''کلمہ باقیہ'' اور اسی شعار اعظم کی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو رہی ہے۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

قُلْ إِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (سورہ انعام ع ۲۰)

''کہہ دو میری نماز، میری تمام عبادتیں، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے۔
جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔
اور میں فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار ہوں۔''

(ج) ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمائشی داد و دہش یا وہ نظم و نسق جس کے لیے قریش نے مختلف شعبے قائم کر رکھے ہیں، دعوت ابراہیمی کا مقصد نہیں ہے۔ دعوت ابراہیمی کا مقصد ہے دعوت الی اللہ، نماز قائم کرنا، ادائے زکوٰۃ اور جہاد فی سبیل اللہ اور خدائے واحد کے سوا کسی طاقت سے مرعوب نہ ہونا۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِى النَّارِ هُمْ خَالِدُوْنَ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (سورہ توبہ ع ۳)

''مشرکین کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں۔ ایسی حالت میں کہ وہ خود اپنے کفر کا اعتراف کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سارے عمل اکارت گئے اور وہ عذاب آتش میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

فی الحقیقت مسجد کو آباد کرنے والا تو وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا۔ نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ مانا۔'' (کسی سے مرعوب نہ ہوا)

یہ مشرکین مکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاف اور بیت خدا کے متولی نہیں ہو سکتے۔ یہ باغی ہیں۔ مسلک ابراہیم کو پامال کر رہے ہیں، مسجد حرام کو جو قیاما للناس ہے، جس سے ہر فرد بشر فیضیاب ہو سکتا ہے انہوں نے اس پر پہرے بٹھا دیئے ہیں، ہر ایک کو وہاں جانے نہیں دیتے اور جس کو یہ نماز کہتے ہیں وہ نماز نہیں ہے۔ کھیل تماشہ ہے۔ یہ نماز ادا نہیں کرتے بلکہ نماز کی توہین کرتے ہیں۔ یہ لوگ مستحق سزا ہیں۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً (سورہ انفال ع ۴)

''اور بات ہے۔ اللہ انہیں عذاب کیوں نہ دے۔ حالانکہ یہ اس کے متولی نہیں ہیں نہ اس لائق ہیں کہ اس کے متولی بنیں۔ اس کے متولی تو وہی ہو سکتے ہیں جو متقی ہوں۔ خدا سے ڈرتے ہوں۔ اس کے احکام کے پابند ہوں۔ مگر نادانی یہ ہے کہ ان میں اکثر ایسے ہیں جو اس حقیقت سے واقف بھی نہیں (کہ تولیت کی ذمہ داری ہے اور اس کے متولی کون ہونے چاہییں۔ (اور جس کو یہ نماز کہتے ہیں اس کی حقیقت ہے؟) خانہ کعبہ میں ان کی نماز اس کے سوا تھی کہ سیٹیاں بجائیں اور تالیاں پیٹیں۔''

تطہیر کعبہ اور بت شکنی میں فرق

غالباً گزشتہ سال کی بات ہے۔ بمبئی کے ایک دریدہ دہن اور کوتاہ فہم انگریزی اخبار نے ذات قدسی حضرت رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم پر بت شکنی کا الزام لگایا تھا۔

اس نے خانہ کعبہ کو ایک مندر قرار دیا تھا اور یہ کہ محمود غزنوی یا عالمگیر (رحمہما اللہ) نے جو کچھ کیا وہ ان کا پہلا فعل نہیں تھا بلکہ اسلام کے داعی اول کی یہ ایک سنت ہے جس پر ان بادشاہوں نے عمل کیا تھا۔

غزنوی یا اورنگ زیب کے فعل پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے اور بت شکنی کے جواز یا عدم جواز پر کوئی تفصیلی بحث بھی اس وقت نہیں کی جا سکتی۔ محض تشنگی بحث کو دفع کرنے کے لیے آخر میں کچھ اشارات کریں گے (انشاء اللہ) مطمح بحث یہ ہے کہ تطہیر کعبہ اور کسی مندر یا گرجا یا کلیسا کو منہدم کرنے کی حیثیت ایک نہیں ہے۔

مکہ معظمہ کی آبادی، بناء بیت اللہ، کعبہ اور مکہ کی خصوصیات پر آیات کتاب اللہ کی روشنی میں جو تفصیلی بحث کی۔ پھر اس دور کے تاریخی اجزاء پر جو روشنی ڈالی۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تطہیر کعبہ اور بت شکنی میں فرق واضح ہو جائے۔

آفتاب کو کوئی شخص اپنے گھر کی کالی فٹ بال یا اپنے باورچی خانہ کا سیاہ توا کہنے لگے۔ وہ اس سے زیادہ غلط گو یا خطا کار نہیں ہوگا جو خانہ کعبہ کو مندر کہتا ہے۔ کلام اللہ کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ وہ کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کے کسی اصول قانون یا کسی بیان کردہ حکمت کے خلاف ہو۔

جب کلام الٰہی نے جنگ اور دفاع کی حکمت و مصلحت بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں (بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔

تو یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ مکہ کے مشرک اگر اپنے مندر کی حفاظت کے لیے جنگ کرتے تو ان کو خَوَّانٍ کَفُوْرٍ (بہت خیانت کرنے والے بہت بڑے منکر و ناسپاس) فرماتا۔

یہ آیت جس میں جنگ کی اجازت دی گئی اس سے پہلے ارشاد خداوندی یہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ۔ (سورہ حج ع ۵)

''اللہ ان کی حمایت اور ان کی طرف سے مدافعت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو پسند نہیں کرتا جو خائن ناسپاس اور مکر نے والے ہوں۔''

پھر قرآن حکیم نے بیت اللہ (خانہ کعبہ) کی پوری تاریخ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدا پرستی، خدا

شناسی اور آپ کے جذبہ توحید اور اس مقدس جذبہ کے لیے آپ کی بے نظیر و بے مثال قربانی پر روشنی اس لیے ڈالی کہ اس ایڈیٹر جیسے کور باطن بیت خدا کو بیت اصنام نہ کہہ سکیں۔ (معاذ اللہ)

ہم نے ان مشرکین کے جذبات اور خانہ کعبہ سے متعلق ان کے عقائد کی وضاحت اسی لیے کی کہ خانہ کعبہ کا بیت اصنام (مندر) نہ ہونا اور صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے اس کا بیت اللہ ہونا خود ان کے نزدیک تسلیم شدہ تھا جو اس پر قابض تھے۔

اب بھی ''غزنوی اور اورنگ زیب'' اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو ایک پلڑے میں رکھا جا سکتا ہے پھر دنیا کی کوئی قوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ظرف کہاں سے لائے گی کہ آپ نے یہ جائز اور قطعاً برحق اقدام بھی اس وقت جب عرب من حیث القوم۔ مذہب اسلام قبول کر چکے تھے تفصیل ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تڑوایا اور ان کو توڑنے کے لیے کبھی سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ، کبھی حضرت جریر بن عبد اللہ کبھی حضرت خالد بن ولید حضرت مغیرہ بن شعبہ اور کبھی کسی اور صحابی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو مامور فرمایا مگر یہ اسی وقت ہوا جب وہ قبیلہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

طائف کا مخصوص بت منات تھا اہل طائف مسلمان ہو گئے تھے۔ مگر منات کا خوف جو ان کی گھٹی میں پڑا تھا ابھی نہیں نکلا تھا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کو مامور فرمایا کہ وہ جا کر ان کے سامنے اس بت کو توڑیں تا کہ جس توحید کے وہ قائل ہو گئے ہیں۔ وہ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں بھی اتر جائے۔

بیشک ہم اس بھول بھلیاں کے قائل نہیں ہیں جس کو وحدت ادیان سے تعبیر جاتا ہے۔ یہ چیستان کہ خدا کو بھی سجدہ کرو اور بتوں کو بھی۔ خدا کو لامکان، غیر محدود، تغیرات سے بالا، جسمانیت اور مادیت سے پاک بھی مانو اور عقیدہ حلول کو صحیح مان کر خدا کے اوتار بھی تسلیم کرو۔ یہ چیستان انہیں کے لیے قابل تسلیم ہو سکتی ہے جو خدا کو ایک بھی مانیں اور تین بھی۔ جن کا دعوی ہو کہ ایک تین ہے اور تین ایک۔ لیکن کوئی بھی ذی عقل جس کو عقیدہ توحید کی دولت عطا ہوئی ہے۔ اس نا قابل فہم کو قابل فہم اور معقول نہیں کہہ سکتا۔

حق ایک ہی ہوتا ہے۔ حقیقت اور سچائی ایک ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ درست ہے کہ دین ایک ہی ہے۔ تحریفات دین و مذہب نہیں ہیں۔ وہی دین واحد جس کی دعوت حضرت نوح علیہ السلام نے دی تھی۔ اسی کی دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دی۔ لہٰذا یہی دین واحد مستحق حمایت ہے۔ اسی کو بالا اور برتر ہونا چاہیے مگر عقیدہ توحید کی اس پختگی کے باوجود۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ جن کا یہ عقیدہ نہیں ہے ان کی عبادت گاہوں کو برباد کرو یا ان کی خانقاہوں کو مسمار کرو۔

حالت جنگ ہر قوم اور ہر ایک قانون کی نظر میں مستثنیٰ ہوتی ہے۔ اس استثنائی صورت میں جب انسانی جان کی حرمت باقی نہیں رہتی جو نظر انسانیت میں سب سے بڑی چیز ہے تو اس کی کسی خصوصیت یا اس کے کسی

مخصوص جذبہ اور عقیدہ کی حرمت باقی رہ سکتی ہے۔ البتہ جب حالت جنگ نہ ہو تو اسلام جس طرح ہر ایک نفس منفوسہ اور ہر ایک متنفس کے خون ناحق کو حرام اور واجب القصاص قرار دیتا ہے اسی طرح اس کے عبادت خانہ کی حفاظت بھی لازمی گردانتا ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد مسائل فقہیہ میں اصول موضوعہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ

لا اھدم شیئا مما جدته قدیما فی ایدیھم (شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۲۴۹)

''اس موقع پر سیر کبیر کی یہ عبارت کس قدر وجد آفریں ہے جس میں مسلم اور غیر مسلم کو ایک حیثیت میں رکھا گیا ہے۔

علینا دفع الظلم من المستأمنین علی الوجه الذی ندفع به عن المسلمین واھل الذمة

(شرح سیر کبیر ج ۴)

جس صورت میں اور جس طریقہ سے بھی ہم خود مسلمانوں اور اہل ذمہ کی (جو غیر مسلم ہمارے شہری ہیں اور جن کی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر ہے) جس طرح ہم ان کی طرف سے دفاع کریں گے ایسے ہی ان کی طرف سے بھی دفاع کریں گے اور ان کی حفاظت بھی ہم پر لازم ہے جو پاسپورٹ وغیرہ کے ذریعہ اجازت لے کر ہمارے ملک میں داخل ہوتے ہیں۔

دفع ظلم کا جو نمونہ اسلامی قانون پیش کرتا ہے آج اس کے تصور سے بھی ہمارے دماغ نا آشنا ہیں۔ عجیب و غریب مثال ملاحظہ فرمایئے۔ جنگ میں فریقین کے کچھ آدمی گرفتار ہوئے۔ پھر فریقین کے درمیان معاہدہ ہو گیا کہ اگر ایک فریق اپنے قیدیوں کو قتل کر دیتا ہے تو دوسرے فریق کو بھی حق ہو گا کہ وہ اس کے قیدیوں کو قتل کر دے۔

فرض کیجئے غیر مسلم فریق نے ان مسلمانوں کو شہید کر دیا جو اس کے یہاں قید تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے بدلہ میں جو فریق ثانی کے غیر مسلم جو مسلمانوں کے یہاں قید ہیں۔ مسلمانوں کو جائز ہو گا کہ ان کو قتل کر دیں۔

آج کی دنیا میں (جب کہ ردعمل اور ری ایکشن کو خون ناحق کے لیے دلیل جواز بنا لیا جاتا ہے) جواب ایک ہی ہو گا کہ ان سب کو تہ تیغ کر دیا جائے اور ممکن ہے اس کو بھی ہلکی سے ہلکی سزا مانا جائے۔

لیکن سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں یہی صورت پیش آئی۔ پھر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سامنے یہ مسئلہ بطور استفتاء پیش ہوا تو اپنے اپنے دور میں ہر ایک کا فیصلہ یہی تھا کہ:

''مسلمانوں کو جائز نہیں ہے کہ وہ ان غیر مسلموں کو قتل کر دیں جو ان کے یہاں یرغمال ہیں دلیل دی گئی کہ قرآن حکیم نے اصول طے کر دیا ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (کوئی ذمہ دار کسی دوسرے کے جرم کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔)

جن لوگوں نے مسلمان قیدیوں کو قتل کر دیا۔ ان کی ذمہ داری ان غیر مسلم قیدیوں پر نہیں ڈالی جا سکتی جو ہمارے یہاں قید ہیں۔ جو ہماری پناہ میں ہیں۔ باقی یہ بات کہ معاہدہ ہے اور معاہدہ میں یہ شرط طے ہوگئی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر وہ شرط باطل ہے۔ جو ایسی چیز کو جائز قرار دے جو اصول قرآن کے لحاظ سے ناجائز اور حرام ہے۔ (صفحہ ۴۴ ج ۴ شرح سیر کبیر (۲۰۳) ایضاً ج ۳ صفحہ ۳۳۳)

(کاش وہ حکومتیں جو اسلامی کہلاتی ہیں اسلامی قانون پر عمل کریں تو ردعمل جیسے کتنے ہی ظالمانہ فلسفوں کی جڑیں کٹ جائیں)

اب قرآنی اصول اور اسلامی قانون کے بعد عملدرآمد ملاحظہ فرمایئے۔

فرانسیسی مصنف موسیو لیبان کی شہادت ہے:

''عربوں نے اندلس کے باشندوں کے ساتھ وہی سلوک جو انہوں نے شام اور مصر میں تھا۔ ان کا مال۔ ان کے کلیسے۔ ان کے قوانین انہیں دیئے اور خود ان کے ہم قوم حکام کے زیر انصاف رہنے کے حقوق انہیں عطا کیے۔'' (۲۰۴)

حکومت عرب کے زمانہ میں بکثرت کلیسوں کا تعمیر ہونا بھی دلیل اس امر کی ہے کہ وہ اقوام مفتوحہ کے مذاہب کی کس قدر عزت کرتے تھے (۲۰۵)۔''

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کو خلیفہ دوم سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ پر ختم کریں۔

''روم کا ایک بوڑھا عیسائی اسلامی مملکت میں داخل ہوا۔ اس کے پاس ایک گھوڑا تھا جس کو فروخت کرنے کے لیے وہ آیا تھا۔ جب وہ کسٹم کی چوکی سے گذرنے لگا تو کسٹم کے انسپکٹر (عاشر) نے اس سے کہا کہ گھوڑا میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ تمہیں قیمت یہیں مل جائے گی اور کسٹم (عشر) بھی نہیں دینا پڑے گا۔ اس کی قیمت اس عیسائی نے بیس ہزار طلب کی۔ عاشر (کسٹم انسپکٹر) نے اٹھارہ ہزار قیمت لگائی۔ یہ قیمت اس نے منظور نہیں کی۔ اور قاعدہ کے مطابق عشر (ڈیوٹی) ادا کر کے وہ چلا آیا۔ اتفاق سے وہ گھوڑا فروخت نہیں ہوا۔ تو وہ واپس ہونے لگا۔ اب پھر اس سے (کسٹم افسر) نے ڈیوٹی طلب کی۔ اس نے ڈیوٹی نہیں دی اور حضرت خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مسجد میں تھے۔ یہ عیسائی مسجد میں نہیں گیا اور باہر سے ہی کہلا کر بھیج دیا۔ حضرت فاروق نے جواب میں ایک لفظ فرما دیا کُفِیتَ یہ عیسائی بات سمجھا نہیں اور یہ خیال ہوا کہ خلیفہ نے میری درخواست کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ مایوس واپس ہوا۔ لیکن جب چوکی پر پہونچا تو اس کو معلوم ہوا کہ حضرت خلیفہ رضی اللہ عنہ کا حکم پہنچ چکا ہے

کہ اس سے کچھ نہ لیا جائے انصاف اتنا سستا اور اس قدر جلد۔''(۲۰۶)

بیت اللہ اور بناء ابراہیم اور مکہ معظمہ میں حضرت اسمٰعیل (علیہما السلام) کے آباد کرنے کی جو تفصیل ہم نے بیان کی ہے اس کا ماخذ قرآن حکیم ہے اس کی وضاحت حدیث ابن عباس سے کی گئی ہے جس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے متعدد سندوں سے نقل ہے لیکن حاملین تورات کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی یہ برتری پسند نہیں تھیں۔ انہوں نے توریت کی ان آیتوں میں تحریف کر دی جو اس واقعہ سے متعلق ہیں اور تعجب یہ ہے کہ سرسید احمد صاحب جیسے مدعیان علم وبصیرت ان سے متاثر ہو گئے۔ ہم نے جب غزوات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پس منظر میں اس واقعہ کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ تو لامحالہ ضروری تھا کہ سرسید صاحب جیسے خود ساختہ علماء اور مجتہدین کا جواب بھی دیں کچھ اوراق اس جواب کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ خدا کرے یہ سعی مشکور ہو اور آپ بھی پسند فرمائیں۔

توریت کی متضاد آیتیں اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما

شکوک وشبہات اور ازالہ

مکہ ایک وادی غیر ذی زرع، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے لخت جگر حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو وہاں پہنچانا، ایک معجزہ کے طور پر زمزم کا ظہور۔ ان حقائق اور واقعات کے متعلق ہم نے جو کچھ بیان ہے اس کا اصل ماخذ قرآن حکیم ہے۔ پھر سیدنا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک مفصل بیان جس کو کتب احادیث میں نقل گیا ہے۔ ہم نے صحیح بخاری کے حوالہ سے اس کے اقتباسات حصہ ۲ میں اور حصہ اول کے مقدمہ میں پیش کیے ہیں۔ موجودہ بائبل (توریت کی کتاب پیدائش (موسیٰ کی پہلی کتاب) میں بھی ان واقعات کو ذکر گیا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ توریت کی آیتیں خود بھی آپس میں متعارض ہیں۔ چند آیتوں کا مفہوم کچھ ہے۔ پھر چند آیتوں سے اس سے مختلف بات سمجھ میں آتی ہے اور یہ آیتیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بیان اور آیات کتاب اللہ کے ارشادات کے بھی مخالف ہیں۔

ہمیں ضرورت نہیں تھی کہ توریت کی متضاد اور مختلف آیتوں کو زیر بحث لائیں۔ حسبنا کتاب الله و احادیث رسوله صلی الله علیه وسلم۔ لیکن اس کو دعویٰ تحقیق وتفتیش کی بوالعجبی کہنا چاہیے یا اپنی بدنصیبی کہ سرسید احمد صاحب مرحوم بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے جب اپنے مشہور خطبات (خطبات احمدیہ) مرتب فرمائے تو ان کے جدت آفرین اجتہاد واستنباط نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ وہ توریت کی متضاد آیتوں کو بنا سنوار کر قابل اعتماد قرار دیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو نکتہ چینی کے شکنجہ میں کس کر ناقابل اعتبار فرمائیں۔

سرسید صاحب کے ایک دوست ''مولانا عنایت رسول صاحب چریا کوٹی'' نے بڑی کاوش سے عبرانی اور

یونانی زبانیں سیکھیں پھر توریت وانجیل کی وہ عبارتیں جمع کیں جن میں آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی بشارتیں ہیں۔ آپ نے تلاش وجستجو کر کے سرسید صاحب کے لیے مواد فراہم ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے بارے میں آپ سرسید صاحب کے ہمنوا ہیں مگر توریت کی آیتوں سے جو نتیجہ اخذ ہے وہ سرسید صاحب کی تحقیق کے مخالف ہے۔

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے سلسلہ میں تعمیر کعبہ اور بناء بیت اللہ کو جو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ گذشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ لیکن سرسید صاحب اور چریا کوٹی صاحب کی طرح توریت کی آیتوں پر اگر اعتماد جائے تو یہ اہمیت ختم ہو جاتی ہے ورنہ اس کی بنیادیں ضرور ہل جاتی ہیں لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ توریت کی آیتوں کو پیش کرتے ہوئے سرسید صاحب اور چریا کوٹی صاحب کی تحقیقات نقل کریں پھر اس پر تبصرہ کریں وباللہ التوفیق۔

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل ﷺ کے اس واقعہ کے متعلق توریت میں ہے:

> اور سرہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابرہام سے جنی تھی ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔ پھر اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات ابرہام کی نظر میں نہایت بری معلوم ہوئی۔ خدا نے ابرہام سے کہا۔ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بری نہ معلوم ہو۔ ہر ایک بات کے حق میں جو سرہ (سارا) نے تجھے کہی اس کی آواز پر کان رکھ۔ کیونکہ تیری نسل اسحاق سے کہلائے گی اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا۔ اس لیے کہ وہ بھی تیری نسل ہے۔

(پیدائش۔ باب ۲۱ فقرہ ۹ تا ۱۳)

تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی۔ اور اس لڑکے کو بھی اور اسے رخصت ۔ وہ روانہ ہوئی۔ اور بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی اور جب مشک کا پانی چک گیا۔ تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا۔ اور آپ اس کے سامنے ایک پتھر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی۔ کیونکہ اس نے کہا۔ میں اس لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔ سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کے روئی۔ تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا۔ اور اس سے کہا۔ کہ اے ہاجرہ تجھ کو ہوا۔ مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے۔۔ خدا نے سنی۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال۔ کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اس مشک کو پانی سے بھر لیا۔ اور لڑکے کو پلایا۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا۔ اور وہ بڑھا

اور بیابان میں رہا ۔ اور تیر انداز ہو گیا۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہا۔ اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت اس کو بیاہنے کو لی۔ پیدائش۔ باب ۲۱، فقرہ ۱۴ تا ۲۱۔

ان فقروں ۱۴ تا ۲۱ کا ترجمہ۔ مولانا عنایت رسول صاحب چڑیا کوٹی نے یہ ہے۔

علی الصباح کچھ زاد راہ ہاجرہ کو دے کر رخصت ۔ وہ روانہ ہوئے اور بیر سبع کے میدان میں مبہوت ہوئے۔ وہاں پانی ختم ہو گیا۔ تب چھوڑ دیا اس نے بیٹے کو کسی درخت کے نیچے اور ہٹ کے کچھ دور جوان کے سامنے بیٹھے۔ ایک تیر پرتاب کے فاصلہ سے۔ اس خیال سے کہ اس جوان کی موت کا صدمہ نہ دیکھوں اور چلا کے رونے لگی۔ تب خدا اس جوان کی دعا کی طرف متوجہ ہوا۔ اور فرشتہ آسمانی نے ہاجرہ کو پکار کر کہا۔ ہے ہاجرہ مت ڈر خدا نے اس جوان کی دعا قبول کی۔ مطابق اس کے حال کے اٹھ اس جوان کو اٹھا۔ اور اپنا احسان اس کے ساتھ محکم کر۔ کہ اس سے بڑی قوم کے لیے قائم رکھوں گا۔ پھر فرشتہ نے ہاجرہ کی آنکھ کھول دی۔ اور کنواں مل گیا۔ پھر تو ہاجرہ نے مشک بھر لی اور جوان کو پلایا۔ پھر فرشتہ اس کے ساتھ؟ اور وہ جوان معزز ہوا اور عرب میں قیام اور شکار دوست ہوا۔ اس نے فاران کے میدان میں سکونت اختیار کی۔ بشریٰ۔ ص ۵۵ و ص ۵۶

یہ توریت کی آیتوں کے دو ترجمے ہیں۔ پہلا ترجمہ توریت اور انجیل کے علماء کا ہوا ہے جن کو توریت کا مزاج شناس کہنا چاہیے اور دوسرا ترجمہ مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی کا ہے جو محترم سر سید احمد صاحب (بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و مصنف خطبات احمدیہ) کے ہم عصر تھے۔ مولانا عنایت رسول صاحب عربی کے فاضل تھے۔ اس زمانہ میں عیسائی پادریوں کا زور تھا۔ جگہ جگہ مناظرے کرتے پھرتے تھے۔ حکومت برطانیہ کی پشت پناہی ان کو حاصل تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر علی رحمہما اللہ جیسے بزرگوں نے جس پامردی سے ان کا مقابلہ اور نہ صرف ان پادریوں کا بلکہ ان کی پشت پناہ انگریزی حکومت کا بھی جس طرح مقابلہ اور جس قوت سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا وہ تاریخ کی ناقابل انکار حقیقت ہے۔ ہم نے علماء ہند کے شاندار ماضی جلد چہارم میں ان بزرگوں کے حالات درج کیے ہیں۔ بہر حال اس دور میں عیسائیت کی تردید وقت کا ایک نہایت ضروری مطالبہ تھا۔ مولانا عنایت رسول صاحب نے بھی اس تقاضے کو محسوس ۔ آپ نے بڑی جدوجہد اور کاوش سے عبرانی اور یونانی زبانوں پر عبور حاصل ۔ پھر آپ نے ساری عمر بائبل کے مضامین کی تحقیق عیسائیوں کے اعتراضات کی تردید اور تصنیف و تالیف میں صرف کر دی۔

ان کا ایک رسالہ ''النصوص الباهرة في حرية الهاجرة'' ہے کہ جس میں یہودیوں کی تصنیفات کے حوالوں سے ثابت ہے کہ حضرت ہاجرہ باندی نہیں بلکہ شاہی خاندان کی خاتون تھیں۔ سر سید احمد صاحب مرحوم نے خطبات احمدیہ میں یہ پورا رسالہ شامل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ بائبل کی تردید یا تائید میں سر سید احمد صاحب

نے جو کچھ لکھا ہے۔اس کا مواد بظاہر مولانا عنایت رسول صاحب سے ہی حاصل ہے۔مولانا عنایت رسول صاحب کی ایک تصنیف کا نام بشریٰ ہے۔جس میں توریت اور انجیل کی وہ آیتیں جمع کی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارت دی گئی ہے پہلے توریت اور انجیل کی عبرانی یا یونانی عبارتیں جو اصل ہیں وہ عبرانی یا یونانی حروف میں بجنسہٖ نقل کی ہیں پھر ان کا ترجمہ اور تشریح کی ہے۔ہم عبرانی یا یونانی زبان سے واقف نہیں ہیں۔لہٰذا تردید یا تائید نہیں کر سکتے اور یہ مسئلہ موضوع بحث سے بھی خارج ہے۔یہاں تو یہ عرض کرنا ہے کہ مکہ معظمہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ورود اور زمزم وغیرہ کے متعلق فاضل چریا کوٹی نے جو لکھا ہے وہ قابل قبول نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے:

> واضح ہو کہ یہ حدیث مرفوع نہیں ہے۔یہ قول ابن عباس کا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے وقت کا ماجرا نہیں ہے۔کسی سے سن کے کہا ہوگا۔لہٰذا بمقابل آیات تورات موثق نہیں ہو سکتا۔جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کمال سنگدلی پر دلالت کرتا ہے۔انبیاء کی یہ شان نہیں ہے۔علاوہ بریں دو برس کے سن میں وہ مکے کے جنگل میں پہنچائے گئے۔پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں جب آئے جب وہ جوان ہو گئے۔ان کی شادی بھی ہو گئی تھی تو ان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام قربانی کے لیے کب لے گئے۔تو یہ اس امر متعارف کے بھی خلاف ہے۔فتدبر بشریٰ ص ۱۶

مکہ معظمہ کی آبادی اور حضرت ہاجرہ کی سکونت وغیرہ کے متعلق آپ کا ارشاد ہے۔

قصہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے جہاد میں فتح پائی (۲۰۷)۔تو سام ابن نوح جو اس وقت میں امام تھے۔عشر لینے کے لیے ان کے پاس گئے اور انہوں نے دیا۔(اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں) مکہ اس وقت بھی حرم تھا۔حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ کے قصہ سے بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اس وقت یہ مسجد قائم تھی۔حضرت ابراہیم نے رفع نزاع کے واسطے سام بن نوح کے پاس جو اس وقت تک زندہ تھے۔مکہ روانہ تھا مقصود یہ تھا کہ حضرت اسمٰعیل وہاں رہیں اور بعد وفات سام کے وہاں کے امام ہوں کیونکہ ولادت حضرت اسمٰعیل ۲۰۳۴ ہبوطی میں تھی اور وفات سام بن نوح ۲۱۵۸ ہبوطی میں (دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام کی آمد سے ایک سنہ کا آغاز مانا گیا اسے سنہ ہبوطی کہتے ہیں) مقصد یہ ہے کہ ۱۳۷ ہبوطی میں حضرت اسحاق پیدا ہوئے۔ایک روز دونوں بھائیوں میں دربارہ میراث کچھ گفتگو تھی۔حضرت اسمٰعیل نے کہا کہ میں بڑا ہوں۔حضرت سارہ کو یہ مباحثہ ناپسند ہوا اور حضرت ابراہیم سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو نکالو۔میرے بیٹے کے ساتھ میراث نہ پاوے۔غالباً اس وقت حضرت اسحاق کا سن بارہ برس کا ہوگا تو لامحالہ حضرت اسماعیل کی عمر ۲۴ برس کی ہوگی۔کیونکہ ایسے مباحثے تمیز ہی سے ہوتے ہیں۔گو یہ بات حضرت ابراہیم کو ناپسند ہوئی۔پھر بنظر مال اندیشی حضرت ہاجرہ کو اور

حضرت اسمٰعیل کو مکہ روانہ کیا۔ کچھ پانی اور زاد راہ حضرت ہاجرہ کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور کچھ حضرت اسمٰعیل کو دیا۔ لیکن پانی راہ میں ختم ہو گیا۔ مقام صفا و مروہ تک بہزار قباحت پہنچے۔ حضرت اسمٰعیل پر ایسی تشنگی غالب ہوئی کہ قریب الہلاک تھے۔ پھر جب ان کی ماں کو پانی معلوم ہوا۔ تو پیاس کی تکلیف رفع ہوئی اور اسی جگہ سکونت اختیار کی۔ یہ خلاصہ ہے توریت اور اس کی تفاسیر کا۔ (بشریٰ ص ۱۳)

مختصر یہ کہ تعمیر کعبہ، آبادی مکہ، ظہور زمزم وغیرہ کے متعلق جو کچھ علماء اسلام تحریر فرماتے ہیں چرپا کوئی صاحب کی نظر میں وہ سب غلط ہے۔

سر سید احمد صاحب کو احادیث سے خاص پرخاش ہے۔ ان کے خیال میں کسی حدیث کے صحیح ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خود ان کی رائے اور ان کے رجحان کے موافق ہو۔ جس کا نام انہوں نے درایت رکھا ہے۔ انہوں نے بھی چرپا کوئی صاحب کی تقلید کی اور خطبات احمدیہ کے مختلف ابواب و مضامین میں اسی کو دہرا دیا۔

ہمیں اپنی بات کی پچ نہیں ہے لیکن یہ مسئلہ یقیناً تحقیق طلب ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو مانا جائے یا چرپا کوئی صاحب کی تحقیق کو۔

سر سید صاحب کا دعویٰ یہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ان دونوں روایتوں میں اختلاف ہے۔ ایک میں ایک مضمون ہے اور ایک میں نہیں۔ (خطبات احمدیہ ص ٦٦) پھر ان دونوں روایتوں کو آمنے سامنے دو کالموں میں لکھ کر اختلاف نمایاں کیا ہے (ص ٦٧ تا ٦٩) ہم روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس مصنوعی اختلاف پر تو بعد میں کچھ روشنی ڈالیں گے پہلے ہم سر سید صاحب کی ایک عادلانہ یا معاندانہ روش کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ توریت کی آیتوں پر دوبارہ نظر ڈالیے۔ کھلا ہوا اختلاف نظر آئے گا۔ پھر دونوں ترجمے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن حضرت سر سید صاحب کا انصاف یہ ہے کہ توریت انتشار کلام اور اختلاف مضمون کے باوجود کتاب مقدس ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت صحت سند کے باوجود ناقابل تسلیم۔ اب اختلاف نہیں بلکہ اختلافات ملاحظہ فرمائیے۔ اول سر سید صاحب اور چرپا کوئی صاحب کی تحقیقات کی ایک جھلک دیکھئے۔

(۱) چرپا کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ زمزم ایک کنواں تھا اور سر سید صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں خانہ بدوش عرب پانی کے چشمہ کو جو ان کو جنگل میں ملتا تھا جھاڑ وغیرہ ڈال کر مٹی سے چھپا دیتے تھے تاکہ ان کے سوا کسی کو اس کا پتہ نہ ملے۔ اور یہ رسم پانی کے کمیاب ہونے سے ان میں جاری تھی۔ اور اب تک جاری ہے۔ یہ بات نہایت قرین قیاس ہے کہ اسی طرح عربوں نے اس چشمہ کو جو اس مقام پر تھا جہاں اب چاہ زمزم واقع ہے۔ چھپا دیا ہوگا۔ کیونکہ ''بیر'' عربی میں چشمہ آب کے معنی میں بھی آتا ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ٨٦)

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

(حضرت ہاجرہ کو) اسی جستجو میں اتفاقاً کنکروں اور پتھروں کے نیچے پانی کا نشان معلوم ہوا اور ان کے

ہٹانے سے پانی نکل آیا۔(خطبات احمدیہ ص ۳۳۵)

اس کے برخلاف مولانا عنایت رسول صاحب فرماتے ہیں:

بیر سبع (جس کا تذکرہ تورات میں ہے) کون مقام ہے۔ جہاں ہاجرہ پریشان ہوئی تھیں میرے نزدیک وہ مقام صفاء مروہ ہے۔ بیر عبرانی وعربی میں کوئیں اور چاہ کو کہتے ہیں شبع و سبع عبرانی اور عربی میں سات کو چونکہ ہاجرہ۔صفاء مروہ کے بیچ میں سات مرتبہ دوڑی تھیں جس کے بعد زمزم کنواں ملا تو اس میدان کو خدا نے بیر سبع سے بیان کیا۔(بشریٰ ص ۵۶)

پھر چڑیا کوٹی صاحب فرماتے ہیں:

بیر سبع جو شام میں ہے۔ وہاں متعدد کنوئیں ہیں۔(بشریٰ ص ۵۷)

(۲) توریت کی آیتوں کا جو ترجمہ چڑیا کوٹی صاحب نے کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہ اس بیر سبع پر جو شام میں ہے تشریف نہیں لے گئیں اور سر سید صاحب نے ان آیات کا خلاصہ یہ بیان فرمایا ہے:

مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہ بیابان بیر سبع میں پھرتی رہیں۔ مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہیں تھا کیونکہ بیر سبع کے اردگرد ایسی قومیں رہتی تھیں جولڑاکا اور جھگڑالو تھیں اور ذرا سا رحم بھی ان کے دل میں نہ تھا۔اس لیے حضرت ہاجرہ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا۔ جہاں ان کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں اور ایسا مقام بلاشبہ وہ تھا جہاں عرب العاربہ کی قومیں رہتی تھیں۔اس لیے کچھ شک نہیں رہتا کہ حضرت ہاجرہ نے اس نواح میں جانے کا قصد کیا۔(خطبات احمدیہ ص ۸۵)

مختصر یہ کہ سید صاحب فرماتے ہیں کہ زمزم چشمہ تھا۔ چڑیا کوٹی صاحب فرماتے ہیں کنواں تھا۔سید صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت ہاجرہ بیر سبع جو شام میں ہے وہاں تشریف لے گئیں اور وہاں سے اس وادی میں گئیں جہاں زمزم ہے۔ چڑیا کوٹی صاحب فرماتے ہیں۔حضرت ہاجرہ شام والے بیر سبع کے میدان میں نہیں گئیں۔

(۳) جو روایتیں مقامی طور پر مشہور ہوں۔(خاندانی روایتیں) ان کو چڑیا کوٹی صاحب اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اپنے اس دعویٰ کی کہ (بیر سبع سے مراد مقام صفا۔ومروہ ہے) دلیل میں مقامی روایتوں ہی کو پیش کرتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں۔

چونکہ ہاجرہ صفا اور مروہ کے بیچ میں سات مرتبہ دوڑی تھیں جس سے زمزم کنواں ملا تو اس میدان کو خدا نے بیر سبع سے بیان کیا۔اب تک اہل اسلام بین الصفاء والمروہ سات مرتبہ سعی کرتے ہیں۔ یہ رسم برابر قریش میں بطور یادگار جاری ہے۔حضرت اسمٰعیل و ہاجرہ کا حال جو کچھ ان کی اولاد سے ملے وہ موثق ہے۔اس سے جو دوسری قوم سے ملے۔ان بزرگوں کا حال مسلمانوں میں بہت بسط وشرح سے مشہور ہے۔ یہ واقعہ یعنی ہاجرہ کا پریشان ہونا اور غلبہ تشنگی اور نمود زمزم بین الصفاء والمروہ مشہور ہے لہٰذا بیر سبع جو اس آیت

میں مرقوم ہے اس سے مقصود بین الصفاء والمروہ ہے۔ (بشریٰ صفحہ ۵۷)

لیکن اس کے برخلاف سید صاحب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو غیر مستند اسی لیے قرار دیتے ہیں کہ مقامی روایتوں سے زیادہ معتبر ہونے کا درجہ نہیں رکھتی۔

آپ فرماتے ہیں:

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں یہودیوں میں مشہور تھیں انہیں کو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔ بس وہ روایتیں ایک مقامی روایتوں سے زیادہ معتبر ہونے کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔

(خطبات احمدیہ صفحہ ۵۵)

یہ ان دونوں محققین کی تحقیقات کی ایک جھلک تھی اس کے بعد آپ ترجموں پر نظر ڈالیے۔ توریت کے مستند ترجمہ سے (جو بائبل سوسائٹی کی طرف سے پوری ذمہ داری کے ساتھ شائع کیا گیا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ:

حضرت اسمٰعیل کو حضرت ہاجرہ کے گود میں دیا گیا یا ان کے کاندھے پر بٹھا دیا گیا کیونکہ باب ۲۱ کے فقرہ (۱۴) کے الفاظ یہ ہیں۔

تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کندھے پر دھر کر دی اور اس لڑکے کو بھی اور اسے رخصت کیا۔

ممکن ہے۔ ان سطور کے پڑھنے والوں کو خلجان پیدا ہو کہ غریب ہاجرہ کا کاندھا کتنا بڑا تھا کہ اس پر پانی کا مشکیزہ بھی رکھ دیا گیا۔ ناشتہ بھی رکھ دیا گیا اور اس لڑکے کو بھی۔

مگر اس خلجان کا حل سر سید صاحب سے معلوم کرنا چاہیے جن کو اس قسم کے خلجان سے اتنی وحشت ہوتی ہے کہ محض لفظ اختلاف کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مستند روایت کو ساقط کر دیا مگر افسوس یہ ہے کہ سر سید صاحب اس طرح کی جرأت معاذ اللہ صحابہ کرام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشادات کی شان میں ہی کر سکتے ہیں۔ ان کی یہ ہمت نہیں کہ بائبل مقدس کی شان میں کوئی ایسی جرأت کریں۔

''مسٹر فارسٹر'' اور ''بشپ بارکلی'' نے جو تاویل کی ہے۔ سر سید احمد صاحب نے اس پر تو تنقید کر دی مگر بائبل مقدس یا اس کے اس اردو ترجمہ کے متعلق آپ کا قلم جنبش نہیں کر سکا۔ آپ نے فارسی ترجمہ کی پناہ لی اور فرما دیا کہ اس میں ایک لفظ باد دادہ ہے جو اصل عبری توریت میں نہیں ہے (۲۰۸)۔

لیکن اگر یہ لفظ نہ بھی ہو تب بھی یہ خلجان رفع نہیں ہوتا۔ اُردو ترجمہ میں باد دادہ کا ترجمہ کیا گیا۔ یعنی اردو ترجمہ سر سید احمد صاحب کی رائے کے مطابق اصل عبری کا ترجمہ ہے۔ کیونکہ اس میں صرف یہی ہے۔ ''اور اس لڑکے کو بھی'' باد دادہ کا ترجمہ کیا جاتا تو یہاں یہ بھی ہوتا۔ ''اس کو دیا'' یعنی ترجمہ یہ ہوتا اس لڑکے کو بھی اس کو دے دیا۔

یہ تو سر سید صاحب کا کردار ہے۔ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں پوری ذہانت سے

موشگافی فرماتے ہیں اور بال کی کھال نکالتے ہیں۔ اب مولانا عنایت رسول صاحب کی ذہانت وحذاقت ملاحظہ فرمائیے۔ انہوں نے اس پورے جھگڑے ہی کو ختم کر دیا اور فقرہ ۱۴ کا ترجمہ یہ کر دیا:

''علی الصباح کچھ زادراہ ہاجرہ کو دے کر رخصت کیا وہ روانہ ہوئے'' غور فرمائیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بیان پر تنقید کرنے والے بائبل مقدس کے حق میں کس درجہ پردہ پوش اور سیر چشم ہیں۔

آپ نے مشکیزہ۔ کندھا وغیرہ سب حذف کر دیا اور بچہ کو اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اس کا ذکر بھی کر دیں۔ کیونکہ اس کے تذکرہ سے خلجان ہوتا تھا۔

(۲) توریت کے مستند ترجمہ میں ہے:

اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا۔ فارسی ترجمہ ہے۔ پسر را در زیر بوتہ از بوتہا گذاشت۔ مگر چریا کوٹی صاحب نے ترجمہ فرمایا ہے۔ تب چھوڑ دیا اس نے بیٹے کو کسی درخت کے نیچے۔

(۳) مستند ترجمہ میں سب جگہ لڑکے کا لفظ ہے۔

فارسی ترجمہ میں لفظ پسر مگر چریا کوٹی صاحب نے لفظ جوان تحریر فرمایا ہے۔ گویا لڑکے اور جوان میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ جو ترجمہ بھی صحیح مانا جائے ہر ایک ترجمہ سے ماں کی حیثیت اصل یعنی متبوع سرپرست اور نگراں جیسی حیثیت ثابت ہوتی ہے۔

لڑکے کو کاندھے پر بٹھا کر روانہ کیا ہو۔ یا گود میں دے کر یا ماں کی انگلی پکڑا دی ہو۔ یا بقول چریا کوٹی صاحب ماں کو زادراہ دے کر رخصت کیا ہو اور بچہ اس قابل بھی نہ ہو کہ اس کا تذکرہ کیا جائے۔

پھر بچہ کو جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ہو۔ یا کسی درخت کے نیچے چھوڑ دیا ہو۔ یہ سب کچھ اسی وقت ہوگا جب کہ ماں کی حیثیت اصل ومتبوع یعنی سرپرست اور متولی جیسی ہو اور بچہ دودھ پیتا ہو یا تین چار سال کا ہو۔

یہ بات تو سراسر مضحکہ انگیز ہے کہ جوان بچے کو ماں نے جھاڑی کے نیچے ڈال دیا۔ نیز جوان لڑکا درخت کے نیچے چھوڑا نہیں جاتا ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ بالغ اولاد کو فرمائش کی جائے کہ وہاں بیٹھ جاؤ۔ مگر چریا کوٹی صاحب کا ترجمہ یہ ہے۔ تب چھوڑ دیا اس نے بیٹے کو کسی درخت کے نیچے یعنی ماں صاحب عزم وارادہ اور صاحب اختیار ہے اور لڑکا تابع اور یہ جو فرشتہ آسمانی کہہ رہا ہے۔

''اُٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال۔ فقرہ ۱۸ باب ۲۱''

''برخیز و پسر را بردار و بدستت اور ا بگیر'' (ترجمہ فارسی)

اور بقول چریا کوٹی صاحب۔ اُٹھ اس جوان کو اٹھا۔

فرشتہ کی یہ بشارت یا فرمائش اور اس کے لیے حضرت ہاجرہ سے خطاب۔ اسی صورت میں صحیح ہوسکتا ہے جب ماں سرپرست وگارجین ہو۔

مگر جیسا کہ پہلے گذرا:

حضرت مولانا عنایت رسول صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر ۲۴-۲۵ برس ہوگی۔ (بشریٰ صفحہ ۱۳-۱۴-۱۶-۴۲۴)

کس قدر عجیب بات ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ابن یعقوب علیہ السلام بن اسحاق علیہ السلام بن ابراہیم علیہ السلام تو ۲۴-۲۵ سال کی عمر (۲۰۹) میں عزیز مصر کے وزیر خوراک بن کر ایسا بہتر انتظام کر دیں کہ سات سال کے قحط میں کوئی بھوکا تو مرتا۔ دوسرے ملک (کنعان وشام) کے قافلوں کو بھی غلہ بخشتے رہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے پچیرے دادا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پچیس سال کی عمر میں ایسے ننھے منے کہ انگلی پکڑے ہوئے ماں کے پیچھے پیچھے پھریں۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنہ نیکاں برد

یہ محقق چڑیا کوٹی صاحب ہیں انہیں اتنا ہوش نہیں کہ ۲۴-۲۵ سال کے جوان کو اگر نکالنا ہوتا ہے تو خود اس کو نکالا جاتا ہے۔ ماں کے تابع بنا کر نہیں نکالا جاتا۔ اگر فی الواقع اتنی عمر تھی یا مفسرین (۲۱۰) توریت کے بیان کے بموجب ۱۷-۱۸ سال کی عمر تھی۔ تو اخراج کا معاملہ لڑکے کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ سترہ سال کے لڑکے کو نہ ماں کے مونڈھے پر رکھا جاسکتا ہے۔ اور نہ کوئی فہم و دانش اسکو تسلیم کر سکتی ہے کہ ۱۶ سالہ لڑکا برابر میں کھڑا ہے اور پانی کا مشکیزہ اور ناشتہ اور بقول چڑیا کوٹی صاحب زادراہ ماں کے مونڈھے پر لادا جائے۔ اور لادنے والا کون۔ ابراہیم خلیل اللہ جیسا مربی خلائق اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ رسول اور ماں کو لدتے دیکھنے والا کون اسمٰعیل ذبیح اللہ جیسا فرمانبردار لڑکا۔ جو باپ کے ارشاد پر بلا چون وچرا۔ نہایت خوشی سے ذبح ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔

اگر مفسرین تورات انبیاء علیہم السلام کی شان کو نہیں پہچان سکے تو چڑیا کوٹی صاحب اور سرسید صاحب کو تو ناآشنا نہ ہونا چاہیے۔

توریت کی آیتوں میں تضاد

یہی سرسید صاحب جو اختلاف لفظی کی بنا پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بیان کو مسترد کر رہے ہیں۔ خود انہیں کا ارشاد ہے:

> اصل یہ ہے کہ خود توریت مقدس میں حضرت اسمٰعیل کی عمر کی نسبت جب کہ وہ نکالے گئے نہایت اختلاف پایا جاتا ہے بعض درسوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت بچے تھے اور بعض سے پایا جاتا ہے کہ وہ سولہ سترہ برس کے تھے۔ (خطبات احمدیہ ص ۷۱)

پھر فرماتے ہیں:

''پانی کے مشکیزے اور اس کے بیٹے کو ہاجرہ کے کندھے پر رکھ کر اس کو روانہ کر دیا۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ ان کی عمر بہت چھوٹی تھی اور اسی وجہ سے لوگوں نے دودھ پیتا ہوا خیال تھا۔ حالانکہ اسی باب کی چودھویں (۲۱۱) آیت اس کے خلاف ہے (خطبات صفحہ ۱۷)

پھر فرماتے ہیں۔

عیسائی عالموں نے بھی اس بات کو تسلیم ہے کہ اس چودھویں آیت سے بلاشبہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اس زمانہ میں بہت چھوٹی عمر ہونا پایا جاتا ہے جو توریت کی بہت سی آیتوں کے برخلاف ہے اس لیے انہوں نے اس کی نسبت بہت کچھ بحث کی ہے۔

اب انسان حیران ہو جاتا ہے۔ اس کو سید صاحب کی ملاطفت اور انصاف پسندی قرار دے یا اس اقتدار کا کرشمہ سمجھے جو اس زمانہ میں بائبل کے ماننے والوں کو ہندوستان میں حاصل تھا انتہا ہوگئی۔ کھلا ہو تناقض اور تضاد موجود ہے۔ مگر سرسید صاحب کی شان عفوو درگذر ان آیتوں کو مجروح اور نا قابل اعتبار نہیں قرار دیتی۔ بلکہ ان کی توجیہ اس طرح کرتی ہے۔

اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنی پہلی بی بی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بی بی ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کو جو ہوشیار اور بڑے ہو گئے تھے گھر سے نکال دیا اور وہ دونوں بیابان بیرشبع میں چلے گئے۔ چلتے چلتے اور منزلیں طے کرتے ہوئے وہ اس مقام پر پہونچے۔ جہاں اب مکہ ہے۔ پیاس کی شدت سے حضرت اسمٰعیل کی حالت خراب ہوگئی اور مرنے کی نوبت پہونچ گئی۔ حضرت ہاجرہ ان کو ایک درخت کے سایہ میں بٹھا کر پانی کی تلاش کو ادھر ادھر دوڑتی پھریں اور بمشکل پانی ملا تھا اسی جگہ انہوں نے سکونت اختیار کر لی کیونکہ عرب میں لوگ اسی جگہ سکونت اختیار کرتے تھے۔ جہاں پانی دستیاب ہوتا تھا۔ (خطبات احمدیہ ص ۳۷)

اب اس توجیہہ اور تطبیق کے سلسلہ میں بھی ایک عجیب لطیفہ سے سرسید صاحب نے بائبل کی آیتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے یہ توجیہ کی جو اوپر گذری۔ مگر محترم عنایت رسول صاحب نے اگرچہ صاف طور پر نہیں تحریر فرمایا۔ مگر جو کچھ اپنی تحقیق سے تحریر فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ توریت کی آیتیں لغو ہیں۔ قطعاً نا قابل اعتبار ہیں۔

آپ اتنی بات تو مانتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کے آپس میں میراث کی بحث چلی اور چونکہ میراث کی گفتگو بچہ اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ ہوشیار ہو گیا ہو۔ لہٰذا اس گفتگو کے وقت حضرت اسحاق کی عمر دس بارہ سال ہوگی اور چونکہ حضرت اسحاق سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام چودہ سال بڑے تھے تو ان کی عمر اس وقت چوبیس پچیس سال ہوگی۔ مگر اخراج اور نکال دینے کی بابت صحیح نہیں مانتے۔ بلکہ آپ کی تحقیق

یہ ہے۔

حضرت ابراہیم نے رفع نزاع کے واسطے ان کو سام بن نوح کے پاس جو اس وقت تک زندہ تھے مکہ روانہ تھا۔ مقصود یہ تھا کہ حضرت اسمٰعیل وہاں رہیں اور بعد وفات سام کے وہاں کے امام ہوں۔ (بشریٰ ص ۱۳)

چڑیا کوٹی صاحب کے اس ارشاد کے بموجب قرآن کی یہ آیت معاذ اللہ بے معنی ہوگئی۔ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ الاية

''اے رب میں نے اپنی کچھ اولاد اس وادی غیر ذی زرع میں آباد کی ہے''

خدا کی پناہ۔ دماغی انتشار کی بھی حد ہوگئی۔ قرآن پاک کی بات مانیں یا چڑیا کوٹی کی۔

سنگدلی:

چڑیا کوٹی صاحب کے یہ الفاظ اوپر گذر چکے ہیں۔

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان) بمقابل آیات تورات موثق نہیں ہوسکتا جو حضرت ابراہیم کی کمال سنگدلی پر دلالت کرتا ہے۔ انبیاء کی یہ شان نہیں ہے۔ (بشریٰ صفحہ ۱۶)

مگر چڑیا کوٹی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ایک بیوی کے کہنے سے دوسری بیوی کو نکال دینا کون سی رحمدلی ہے اور اخراج بھی اس بے سروسامانی اور لاپرواہی کے ساتھ کے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے پھریں یہاں تک کہ وہی جوان صالح وسعید جو باپ کے کہنے پر ذبح ہونے کے لیے آمادہ ہوگیا تھا۔ وہ پیاس اور تشنگی کے سبب سے لب دم ہوجائے۔

شاید علامہ چڑیا کوٹی یہ جواب دیدیں کہ حضرت ابراہیم نے یہ فعل اللہ تعالیٰ کے حکم سے ۔ کیونکہ تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الہام تھا کہ سارہ کا کہنا مانو۔ نیز اللہ تعالیٰ نے بشارت بھی دیدی تھی کہ اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا۔ (پیدائش باب ۲۱ فقرہ ۱۳)

تو یہی بات تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمائی تھی۔ جب اس میدان میں حضرت ہاجرہ اور ان کے بچے کو چھوڑ کر روانہ ہونے لگے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اسی زیر بحث روایت میں ہے۔

حضرت ہاجرہ نے کہا:

اے ابراہیم آپ ہمیں اس وادی میں جہاں نہ کوئی انیس وہمدرد ہے۔ کوئی چیز ہے۔ چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔

حضرت ہاجرہ یہ سوال کررہی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کوئی جواب نہیں دے رہے۔ پھر حضرت

ہاجرہ نے کہا۔

اللہ امرك بهذا آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس بات کا حکم ہے۔

تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ نعم (جی ہاں)

حضرت ہاجرہ کو معلوم ہوا کہ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہوا ہے تو فرمایا۔

اذن لا یضیعنا ۔ تب اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ محقق چڑیا کوٹی کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام دونوں ذبیح ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

میرے نزدیک یہ ماجرا دونوں کے ساتھ گذرا۔ (بشریٰ صفحہ ۴۳۳)

اس موقع پر اس سوال کا حق ہونا چاہیے کہ باپ کا بیٹے کو ذبح کر دینا۔ یا بیٹے کے ذبح پر آمادہ ہو جانا۔ کون سی رحم لی ہے اور اگر ارشاد الٰہی اور منشاء ربانی کو یہ عظمت حاصل ہے کہ اس کی تعمیل کے لیے سنگدلی بھی رحم لی ہو جاتی ہے اور جو فعل موجب قصاص ہو سکتا ہے وہ اللہ کے حکم پر اگر جائے تو وہ سراسر تسلیم ورضا انقاد اور اطاعت شعاری کا شعار اعظم ہو جاتا ہے۔ تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فعل بھی کہ بیوی اور بچے کو لے جا کر وادی غیر ذی زرع میں بٹھا آئے، سنگدلی نہیں ہوگا۔ بلکہ اس ایثار۔ اس فدائیت اور خلت کا تقاضا ہوگا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مخصوص اور ممتاز حصہ ہے جس کی بناء پر آپ کو خلیل اللہ کا خطاب دیا گیا۔ اسی بناء پر ادب آموزان شریعت وطریقت نے فرمایا ہے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

قربانی کے لیے کب گئے:

چڑیا کوٹی صاحب کا ایک اعتراض یہ بھی ہے:

دو برس کے سن میں تو وے مکے کے جنگل میں پہونچائے گئے پھر حضرت ابراہیم جب آئے جب وے جوان ہو لیے ان کی شادی بھی ہوگئی تھی تو ان کو حضرت ابراہیم قربانی کے لیے کب لے گئے (بشریٰ ص ۱۶)

اس کا جواب یہ ہے۔

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

یہ کس نے کہا کہ اس عرصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام قطعاً آئے ہی نہیں اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر ایسے گئے کہ پھر بیس برس بعد پلٹے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں اگر اس درمیان میں آنے کا تذکرہ

نہیں ہے تو یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس عرصہ میں آئے بھی نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس روایت میں حضرت اسمٰعیل یا حضرت ابراہیم علیہما السلام کی پوری سوانح حیات نہیں بیان فرمائی۔ خاص خاص واقعات کا تذکرہ ہے۔ اب اگر کسی واقعہ کا تذکرہ نہیں تو یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ واقعہ ہوا ہی نہیں ہے۔ یہ چڑیا کوٹی صاحب کا قصورِ فہم اور تنگ نظری ہے۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

بنیادی غلطی اور تفاوت راہ:

جو توریت ہمارے سامنے ہے وہ انہیں یہودیوں کا اندوختہ ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ادب و احترام سے نا آشنا تھے۔ صرف تحریف ہی نہیں بلکہ اپنی تصنیف کو خدا کی طرف (۲۱۲) منسوب کر دینا اور اللہ تعالیٰ پر بہتان (۲۱۳) باندھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جو یہود انبیاء علیہم السلام کے خون ناحق سے ہاتھ رنگتے اور پھر اس جرم عظیم پر فخر کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے زمانے کے کسی بدکردار رئیس پر قیاس اور حضرت اسمٰعیل و ہاجرہ علیہم السلام کے اس واقعہ کو گھریلو جھگڑے کا شاخسانہ قرار دے دیا اور فاضل محترم چڑیا کوٹی اور زعیم قوم سرسید صاحب نے ان کی تقلید کا نام تحقیق رکھ لیا اور اس طرف قطعاً التفات نہ فرمایا کہ قرآن کہہ رہا ہے۔ ایک حدیث ان کے سامنے آئی تو اس کو ناقابل اعتنا قرار دیدیا یہ بنیادی غلطی ہے۔ قرآن حکیم رن مریدی کے تصور سے بھی انبیاء علیہم السلام کے دامن کو پاک رکھتا ہے وہ عصمت انبیاء علیہم السلام کے کارناموں کو حیات جاودانی بخشتا ہے۔

تاریخ انسانی کا ایک نیا موڑ آ رہا تھا ایک ایسی قوم اور ایسی ملت پیدا کرنی تھی جس کا دامن قیامت کی پیشانی سے چھونے والا تھا۔ اس قوم اور اس ملت کی بنیاد ایثار، قربانی، عبدیت اور خلت پر ہونی چاہیے تھی۔ وحی الٰہی اسی ایثار اور خلت کو ثابت کرتی ہے۔ معاذ اللہ تندخو مغلوب الغضب جھگڑالو بیوی کے کہنے سے نہیں بلکہ وحی الٰہی کے اشارہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے زن و فرزند کی یہ قربانی پیش کی تھی جس کو اسرائیلیات نے میراث کا جھگڑا بنا دیا۔ ہمارا ایمان قرآن پر ہے۔ من بندہ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم۔ تفصیل نمبر اول میں گذر چکی ہے۔

روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تعارض

سرسید صاحب نے خطبات احمدیہ کے صفحات ۵۶ تا ۵۸ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایتوں کی ان عبارتوں کو جن کو وہ ایک دوسرے سے متناقض اور متضاد سمجھتے ہیں۔ آمنے سامنے دو کالموں میں تو نقل کر دیا ہے مگر خوبی یہ ہے کہ آپ نے ترجمہ نہیں فرمایا۔ اگر ترجمہ بھی کر دیتے تو شاید سرسید صاحب کی بات نہ بنتی۔ کیونکہ ہر ایک صاحب فہم فیصلہ کر سکتا تھا کہ صرف الفاظ کی تبدیلی سے مقصد نہیں بدلتا۔ مثلاً آپ کے نزدیک ایک تناقض یہ

ہے کہ جب حضرت ہاجرہ کو وہاں بٹھا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام روانہ ہونے لگے تو ایک روایت میں ہے۔

نادته من وراه یا ابراهیم۔ الی من تتر کنا

دوسری روایت میں ہے

فقالت یا ابراهیم این تذهب و تتر کنا

عربی سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ دونوں عبارتوں کا مطلب ایک ہے۔ اب اگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ ایک مفہوم کو ایک عبارت سے ادا کر دیا دوسری مرتبہ دوسری عبارت سے تو اس کو متناقض اور متضاد وہی کہہ سکتا ہے جو کم از کم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں انصاف سے دامن جھاڑ چکا ہو۔

پہلی روایت کا ترجمہ یہ ہے۔

آواز دی ہاجرہ نے پیچھے سے۔ اے ابراہیم ہمیں کس کے حوالہ کر کے جا رہے ہو۔

دوسری روایت کا ترجمہ یہ ہے۔

ہاجرہ نے کہا۔ ابراہیم کہاں جا رہے ہو اور ہمیں چھوڑ رہے ہو۔

غالباً سرسید صاحب کے خیال میں تناقض یہ ہے کہ ایک روایت میں پیچھے سے کا لفظ ہے۔ دوسری میں نہیں۔ مگر ظاہر ہے اس سے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جانے والے کو آواز پیچھے سے ہی دی جائے گی اس کو لفظوں میں بیان جائے یا بنظر اختصار بیان نہ جائے۔ مقصود اور مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا۔

دوسرا تناقض ملاحظہ فرمایئے:

پہلی روایت میں ہے کہ جب حضرت ہاجرہ نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔ ابراہیم کس کے حوالے کر کے جا رہے ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا (الی اللہ) اللہ تعالیٰ کے حوالہ۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ہاجرہ نے کہا۔ ابراہیم کہاں جا رہے ہو اور ہمیں چھوڑ رہے ہو اس وادی میں جہاں نہ کوئی انیس و ہمدرد ہے نہ کوئی چیز ہے۔ حضرت ہاجرہ یہ کہہ رہی تھیں اور حضرت ابراہیم التفات نہیں کر رہے تھے بالاخر۔ ہاجرہ نے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا (نعم) (ہاں) سرسید صاحب کے نزدیک یہ بھی تناقض ہے کہ ایک روایت میں (الی اللہ) ہے اور دوسری میں (نعم) ہے۔

پھر پہلی روایت میں ہے۔ (قالت رضیت باللہ) ہاجرہ نے کہا۔ میں اس پر راضی ہوں۔

(اگر مرضی مولیٰ یہی ہے تو میں راضی ہوں)

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ہاجرہ نے فرمایا:

اذا لا یضیعنا تب اللہ ہمیں برباد نہیں کرے گا۔

پھر ایک روایت میں ہے۔فرجعت پھر وہ واپس ہوگئیں۔
دوسری روایت میں ہے۔ثم رجعت یعنی فا اور ثم کا فرق ہے۔
سرسید صاحب کے نزدیک یہ حرف کا اختلاف بھی تناقض ہے باوجودیکہ مفہوم میں کوئی تفاوت نہیں ہوا۔
مختصر یہ کہ اس قسم کا لفظی اختلاف ہے جس کو سرسید صاحب یہ اہمیت دے رہے ہیں کہ پوری روایت کو ناقابل اعتبار فرماتے ہیں۔

لیکن جس کسی کو بھی اللہ تعالیٰ نے دولت انصاف کا کوئی حصہ عنایت فرمایا ہے وہ یہی فیصلہ کرے گا کہ یہ روایتوں میں تناقض نہیں ہے البتہ سرسید صاحب کو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پرخاش اور (معاذ اللہ) تعصب ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں۔سرسید صاحب نے ایک بات اپنے ذہن میں طے کرلی ہے۔وہ ان کے نزدیک درایت ہے اس کو تسلیم کرانے کے لیے لایعنی موشگافیوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو ساقط کرنا چاہتے ہیں لہٰذا دو کالموں میں متقابل جملے لکھ کر فرضی تناقض کا مظاہرہ فرمارہے ہیں حالانکہ تناقض کچھ بھی نہیں ہے۔ایک بیان کرنے والا ایک بات کو کسی وقت تفصیل سے بیان کرتا ہے۔کسی وقت اختصار کردیتا ہے۔دنیا کو کوئی انصاف پسند بھی اس کو تناقض نہیں قرار دے سکتا۔

بسا اوقات گفتگو کا ایک خاص رخ ہوتا ہے۔اس کی بنا پر ایک جملہ لانا مناسب ہوتا ہے دوسرے موقع پر وہ جملہ مناسب نہیں ہوتا۔ضرورت سے زائد ہوتا ہے۔لہٰذا اس کو زبان پر نہیں لایا جاتا۔استدلال کے موقع پر صرف وہی فقرہ یا جملہ پیش جاتا ہے۔جس سے استدلال مقصود ہوتا ہے اس وقت اگر پورا قصہ پیش جائے تو استدلال ہی خبط اور لایعنی ہوجاتا ہے۔

مثلاً اگر یہ ثابت کرنا ہے کہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ تھا تو آپ سورہ والنازعات کی ایک آیت کا صرف ایک جملہ پیش کردیں گے۔فقال انا ربکم الاعلیٰ

اگر آپ پوری سورت پڑھیں گے تو اپنے استدلال کو خراب کردیں گے اور آپ کا یہ فعل ایک مذاق بن جائے گا قرآن پاک کی مثال ہمارے سامنے ہے۔حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت لوط اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو بار بار دہرایا گیا ہے۔مگر کہیں الفاظ کچھ ہیں کہیں کچھ ہیں۔ایک جگہ ایک انداز ہے دوسری جگہ دوسرا انداز۔کہیں واقعہ کے کسی ایک حصہ کو نمایاں گیا ہے کہیں دوسرے حصہ پر زور دیا گیا ہے۔یہی فصاحت و بلاغت ہے۔اور یہی کمال خطابت ہے کہ وہی انداز اختیار جائے اور وہی بات بیان کی جائے جو موقع اور محل کے لحاظ سے مناسب اور موثر ہو۔

روایت بالمعنیٰ میں الفاظ کی پابندی نہیں ہوتی۔صرف یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ منشاء اور مقصد کو صحیح طور سے پیش کردیا جائے۔قرآن حکیم میں جگہ جگہ اس کی مثالیں موجود ہیں۔

تطبیق:

یہ ایک انتہائی پریشانی کا وقت ہے کہ حضرت ہاجرہ اپنے ننھے بچے کے ساتھ یہاں چھوڑی جا رہی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا مشفق باپ اور مہربان شوہر۔ اپنے بچے اور بیوی کو وادی غیر ذی زرع میں تنہا چھوڑ رہا ہے۔ ایک طرف خداوندی اشارات کا احترام ہے۔ دوسری جانب بیوی اور بچے کی جدائی کا فطری تاثر ہے۔ ایسی صورت میں انسان کی زبان سے بے اختیار جملے نکل جاتے ہیں اور اکثر غیر مربوط بھی ہوتے ہیں۔ یہاں تھوڑی سی توجہ سے بھی کام لیا جائے۔ تو دونوں روایتوں کے جملے ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ اور لفظی اختلاف کا محل بھی معین ہو جاتا ہے۔ دونوں روایتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو مکالمہ کی ترتیب یہ ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کا مکالمہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو یہاں بٹھا کر واپس ہوئے۔ حضرت ہاجرہ کچھ دور تک ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہیں یہاں تک کہ یہ دونوں مقام کدا تک پہنچ گئے جب حضرت ہاجرہ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیم اس طرح واپس ہو رہے ہیں کہ پیچھے کو مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تو انہوں نے پیچھے سے پکار کر کہا۔

اے ابراہیم ہمیں اس وادی میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔ یہاں نہ کوئی مونس و ہمدرد ہے نہ کھانے پینے کی کوئی چیز ہے۔ اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہے ہو؟

حضرت ہاجرہ یہ کہہ رہی تھیں مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش چلے جا رہے تھے۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے تو پھر آخر نہایت درد آمیز انداز میں حضرت ہاجرہ نے کہا۔ ہمیں کس کے حوالے کر رہے ہو۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا۔ الی اللہ۔ اللہ کے۔ اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے اور حضرت ہاجرہ جیسی پریشان حال خاتون کے دل میں یہ سوال لامحالہ پیدا ہونا چاہیے تھا کہ یہ صرف حضرت ابراہیم کا اپنا منصوبہ یا خیال ہے یا فی الواقع اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ جس کی بنا پر حضرت ابراہیم ایسا کر رہے ہیں تو حضرت ہاجرہ نے دریافت کیا۔

کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے۔

حضرت ابراہیم کا جواب یہ تھا نعم ہاں یہ اللہ کا حکم ہے۔ جب حضرت ہاجرہ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ رب العالمین ارحم الراحمین کے اشارہ اور اس کے حکم سے ہے تو ایک خاص تاثر میں کہتی ہیں:

میرے مولا کا یہی حکم ہے تو وہ ہمیں برباد نہیں کرے گا۔ میں اپنے مولیٰ کی مرضی پر راضی ہوں۔ اب ایک طرف توریت کی متناقض اور متضاد آیتوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ اور غور فرمائیے کہ حضرت سرسید صاحب نے ان متناقض آیتوں کو کس طرح نبھانے اور ان کی تحریف اور ان کے بگاڑ کو کس طرح بنانے اور سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مزین اور مرصع روایتوں پر نظر ڈالیے کہ بنی بنائی ترتیب کو سرسید صاحب نے کس طرح بگاڑا ہے۔

ایک وزن دار بات:

سرسید صاحب نے جن جملوں میں تناقض اور تضاد ظاہر کیا ہے۔ تھوڑی سی توجہ سے وہ اسی طرح مرتب ہو سکتے ہیں۔ البتہ ایک فقرہ یقیناً تشریح طلب ہے۔ اس کے متعلق ایک انصاف پسند کو بھی خلجان ہو سکتا ہے اگر وہ احادیث کے طرز سے واقف نہ ہو، تفصیل یہ ہے:

ایک روایت میں صرف یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کو ایک درخت کے نیچے بٹھا دیا۔

دوسرے روایت میں تفصیل ہے:

عند البيت عند دوحة فوق زمزم في اعلى المسجد

یعنی بیت اللہ کے قریب بٹھایا۔ درخت کے نیچے زمزم سے اوپر کی جانب۔ مسجد کی بالائی جانب میں (یا) بالائی حصہ میں۔

یہاں یہ خیال ہوسکتا ہے کہ جیسا مولانا عنایت رسول صاحب چریا کوٹی نے فرمایا ہے۔ مکہ وہاں پہلے سے آباد ہوگا۔ یعنی بیت اللہ ہوگا اور زمزم کا چشمہ۔ یا بقول چریا کوٹی صاحب کنواں بھی ہوگا۔

لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ علماء اسلام نے قرآن حکیم کی آیت۔

انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع

کا مطلب یہی سمجھا ہے اور یہی سمجھایا ہے کہ وہاں وادی تھی اور وہ بھی بنجر اور غیر قابل کاشت خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اسی روایت میں اسی فقرہ کے بعد دوسرا فقرہ یہ ہے۔

ليس بمكة يومئذ احد وليس بها ماء

اس وقت مکہ کی آبادی نہیں تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہاں پانی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا منشا یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل علیہما السلام کے قیام کے مقام کو اس نقشہ کے لحاظ سے سمجھا دیا جائے جو ان کے زمانہ میں بن گیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اس وقت خانہ کعبہ ہے اس کے قریب اس وقت ایک درخت تھا اس کے نیچے بٹھایا۔ مزید تشریح فرماتے ہیں کہ جہاں اب چاہ زمزم ہے۔ اس کے قریب لیکن یہ قریب مسجد کے مقابل بھی ہوسکتا تھا۔ تو اس کو صاف کر دیا کہ چاہ زمزم کے قریب اس جانب جدھر خانہ کعبہ ہے۔ بالفاظ دیگر چاہ زمزم اور خانہ کعبہ کے درمیانی حصہ میں۔ اب یہ بات کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے زمانے کے نقشے کو سامنے رکھ کر تاریخ کے ایک پرانے واقعہ کو سمجھایا یہ بات کبھی بھی قابل اعتراض نہیں سمجھی گئی۔ ہم کسی بات کو سمجھانا چاہتے ہیں تو بلا تکلف ایسا کرتے ہیں بلکہ ہمیں فخر ہوتا ہے کہ تاریخی بات کو ہم بالکم و کاست ٹھیک ٹھیک سمجھ رہے ہیں اور سمجھا رہے ہیں حضرات محدثین اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔

اسی خانہ کعبہ کے متعلق ایک تاریخی مسئلہ ہے جس کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے یا نہیں۔ تشریف لے گئے تو آپ نے وہاں صرف دعا مانگی یا نفلیں پڑھیں۔ پھر اگر نفلیں پڑھیں تو کتنی رکعت اور کہاں پڑھیں؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان یہ ہے کہ آپ نے دو رکعتیں پڑھیں۔ اب یہ کہ کہاں پڑھیں۔ اس کے متعلق خود ان کے بیان میں مختلف الفاظ آئے ہیں۔

یہ الفاظ بخاری شریف میں صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں۔
ایک روایت میں ہے:
جعل عمودا عن يساره وعمودا عن يمينه (بخاری شریف ص ۷۲)
ایک کھمبا اپنے بائیں جانب رکھا اور ایک کھمبا اپنی داہنی جانب۔
ایک روایت میں ہے:
بين الساريتين اللتين على يساره اذا دخلت (۵۷)
دونوں کھمبوں کے درمیان۔
تیسری روایت میں ہے:
بين الساريتين اللتين على يساره اذا دخلت (ص ۵۷)
یعنی جب آپ خانہ کعبہ میں داخل ہوں تو اس درمیانی حصہ
میں آپ نے دو رکعتیں پڑھیں جہاں (اگر آپ کھڑے ہوں اور خانہ کعبہ کا دروازہ پشت کی طرف ہو) تو یہ دونوں کھمبے آپ کی بائیں جانب ہوں۔

محترم سرسید صاحب کو اگر ضرورت پڑ جاتی تو ان کے لیے بہت اچھا موقع تھا کہ ان روایتوں کو آمنے سامنے کالموں میں لکھ کر تعارض اور تناقض ثابت کرتے اور خلاف درایت ہونے کے باعث ان سب پر خط نسخ اور قلم تردید کھینچ دیتے۔ مگر اہل علم کی نظر میں ان روایتوں میں کوئی تعارض یا تناقض نہیں ہے کیونکہ خانہ کعبہ کی ایک وہ عمارت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی جس میں چھت کے نیچے چھ کھمبے تھے پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس کو شہید کرا کر دوبارہ تعمیر کرایا تو اندر کے کھمبوں کو بدل دیا چھ کے بجائے تین کھمبے رکھے۔ پھر حجاج بن یوسف نے اس عمارت میں ردو بدل کیا۔ بس حضرت عبداللہ بن عمر کی پہلی دو روایتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام مبارک کی جگہ اس زمانہ کے نقشہ کے پیش نظر بیان کی گئی اور دوسری روایت اس نقشہ کے پیش نظر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا۔ جب خانہ کعبہ کے اندر چھ کھمبے تھے۔ جن پر چھت قائم تھی۔ چنانچہ اسی روایت میں اس کی تصریح بھی ہے۔

بخاری شریف ہی سے ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:

مدینہ طیبہ میں عرصہ سے بارش نہیں ہوئی، کھیت سوکھ رہے ہیں، مویشی پیاسے ہیں، جمعہ کا دن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لیے ممبر پر تشریف فرما ہیں، ایک صاحب آتے ہیں، خشک سالی کی شکایت اور دعا کی درخواست کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے ہیں، صحابہ کرام نماز سے فارغ ہوتے ہیں تو موسلا دھار بارش میں بھیگتے ہوئے اپنے اپنے مکان پہنچتے ہیں۔ حضرت انس بن رضی اللہ عنہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

ان رجلا دخل المسجد یوم الجمعة من باب کان نحو دار القضاء

(بخاری شریف ص ۱۳۸)

(یہ شخص جس نے دعا کی درخواست کی) اس دروازہ سے مسجد میں آیا تھا جو دارالقضاء کی جانب تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب یہ واقعہ پیش آیا۔ یہاں دروازہ تھا دارالقضاء نہیں تھا۔ جس وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ واقعہ بیان فرمارہے تھے۔ مسجد کا وہ دروازہ نہیں رہا۔ اس کے قریب دارالقضاء ہو گیا ہے۔ حضرت انس اس وقت کے نقشہ سے عہد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ کا مقام اور محل بتارہے ہیں۔

بہرحال اس طرح کی مثالیں بے شمار مل سکتی ہیں اور ہمارے رات دن کے محاورات گفتگو اور تذکروں میں برابر اس کی مثالیں آتی رہتی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کی حیثیت

سرسید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

یہ دونوں روایتیں ابن عباس نے بیان کی ہیں اور یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے کس سے سنیں اور اس لیے ہرگز نہیں ثابت ہوتا کہ درحقیقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا تھا بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں یہودیوں میں مشہور تھیں۔ انہیں کو ابن عباس نے بیان کیا ہے بس وہ روایتیں ایک مقامی روایتوں سے زیادہ معتبر ہونے کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ (خطبات احمدیہ ص ۶۰۱)

سرسید صاحب نے ان روایتوں کو بازاری قصوں کی حیثیت دی ہے کہ کس و ناکس سے سن سنا کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیں اور امام بخاری نے محض اس بنا پر کہ حضرت ابن عباس تک (رضی اللہ عنہما) ان کی سند ان کے اصول کے مطابق قابل وثوق تھی۔ ان روایتوں کے لیے بخاری شریف کے صفحات وقف کر دیئے۔ مضمون اور مفہوم کا خیال نہیں کیا۔ لیکن یہ توہین آمیز تصور نہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی شان کے شایان ہے نہ امام بخاری کی شان کے مناسب۔

جوابات:

(۱) یہ درست ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوری روایت کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مگر اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو چند فقرے نقل کیے ہیں۔ ان سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے اور درحقیقت مسلمانوں کے مذہبی معتقدات کے حق

میں وہی فقرے اس پوری روایت کی جان ہیں (۲۱۴)۔

مثلاً (الف) حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا پانی کی تلاش میں کوہ صفا پر چڑھتیں۔ وہاں سے اتریں نشیبی حصہ کو دوڑ کر طے کیا، پھر مروہ پہاڑی پر چڑھ گئیں۔ وہاں سے بھی کہیں پانی نظر نہیں آیا تو اتریں اور نشیبی حصہ کو دوڑ کر طے کیا پھر صفا پر چڑھ گئیں۔ اس طرح سات مرتبہ کیا۔ اتنا حصہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

قال النبي صلى الله عليه وسلم فلذلك سعي الناس بينهما (بخاری شریف ص ۴۷۵)

''اسی کی یادگار ہے کہ لوگ حج میں سعی بین الصفاء والمروہ کرتے ہیں۔''

یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ یہاں آنحضرت ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ مسلمان سعی بین الصفاء والمروہ کرتے ہیں۔ بلکہ ناس کا لفظ ارشاد فرمایا۔ کیونکہ سعی کا طریقہ اسلام نے ہی نہیں بتایا بلکہ دین ابراہیمی پر اعتقاد رکھنے والے یعنی حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کو اپنا مورث اعلیٰ ماننے والے عرب ہمیشہ سے اس پر عمل کرتے رہے ہیں۔

جس طرح زمانہ قدیم سے حج کا طریقہ رائج تھا اسی طرح سعی بین الصفا والمروہ کا طریقہ بھی رائج تھا۔

(ب) پھر جب چشمہ زمزم کا ظہور ہوا اور حضرت ہاجرہ نے جلدی جلدی کچھ پانی چلو میں لے کر بچے کو پلایا کچھ مشکیزہ میں بھرا پھر ریت ہٹا کر اور زمین کو ہاتھوں سے کھود کر گرداگرد ڈول بنادی کہ پانی بہہ کر ضائع نہ ہو تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

قال النبي ﷺ يرحم الله ام اسماعيل لو تركت زمزم لكانت زمزم عيناً معيناً

''اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحم فرمائے اگر وہ ڈول نہ بناتیں تو زمزم ایک چشمہ رواں ہوتا۔''

(بخاری شریف ص ۴۷۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دو ارشاد صرف اتنے حصہ میں ہیں جتنا حصہ سرسید صاحب نے نقل کیا ہے۔ باقی پوری روایت میں اور بھی ارشادات ہیں۔ جن سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

(۲) ان دونوں باتوں کا تعلق یہود سے کچھ نہیں ہے۔ وہ نہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اپنا مورث مانتے تھے نہ ان کے کارناموں سے یہود کو دلچسپی تھی۔ بلکہ انہوں نے تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو حضرت ہاجرہ کی سوکن کا لڑکا مان کر جہاں تک ہو سکا نظرانداز کیا ہے۔

البتہ عرب مستعربہ خصوصاً مکہ کے باشندے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اپنا مورث مانتے تھے۔ ان کی خدمات پر فخر کیا کرتے تھے اور باوجودیکہ بہت سی مشرکانہ رسوم اور شرکیہ عقائد کی آمیزش کر کے دین ابراہیمی کو مسخ کر دیا تھا۔ تاہم جو روایتیں ان تک آباؤ اجداد سے پہونچی تھیں ان پر ان کو ناز تھا۔ لہٰذا سرسید صاحب اگر یہ

فرماتے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو کچھ مکہ کے لوگوں سے سنا تھا اس کو بیان کر دیا تو کسی حد تک قرین قیاس بھی تھا باقی یہود کے یہاں ان باتوں کا اس طرح مشہور ہونا اور ان سے سن کر بیان کرنا تو قطعاً بے محل اور خلاف قیاس ہے لیکن سرسید صاحب کے لیے غالباً دشواری یہ تھی کہ جو روایتیں آباؤ اجداد سے مشہور چلی آتی ہیں۔ سرسید صاحب کے دوست مولانا عنایت رسول مرحوم ان کو صرف تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ ان کو استدلال میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ جب مولانا عنایت رسول نے یہ دعویٰ کیا کہ تورات میں جو بیر سبع ہے اس سے مراد صفا و مروہ کا مقام ہے۔ تو اس کی دلیل آپ یہ پیش فرماتے ہیں:

"اب تک اہل اسلام بین الصفاء والمروہ سات مرتبہ سعی کرتے ہیں یہ رسم برابر قریش میں بطور یادگار جاری ہے۔ حضرت اسمٰعیل و ہاجرہ کا جو حال ان کی اولاد سے ملے وہ موثق ہے اس سے جو دوسری قوم سے ملے۔ ان بزرگوں کا حال مسلمانوں میں بہت شرح و بسط سے مشہور ہے یہ واقعہ یعنی ہاجرہ کا پریشان ہونا اور غلبہ تشنگی اور نمود زمزم بین الصفاء والمروہ مشہور ہے لہٰذا بیر سبع جو (تورات کی) اس آیت میں مرقوم ہے۔ اس سے مقصود بین الصفاء والمروہ ہے۔" (بشریٰ ص ۴۵)

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت آیات توریت کی تردید کرتی ہے کیونکہ ان دونوں فضلاء (چڑیا کوٹی اور سرسید صاحب) کے ارشادات کے مطابق تورات کی شہادت یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کے بعد پیش آیا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ترکہ یا جانشینی کی بحث چلی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل ابھی شیر خوار تھے کہ ان کو ان کی والدہ کے ساتھ یہاں لاکر چھوڑ دیا گیا۔ اب سرسید صاحب کی یہ انوکھی تحقیق یقیناً تعجب انگیز ہے کہ یہود میں وہ بات مشہور تھی جو توریت کے خلاف تھی۔ سرسید صاحب کو اس عجیب و غریب تحقیق کے لیے ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ مگر سرسید صاحب نے (کم از کم خطبات احمدیہ میں) اپنے لیے ایسا مقام طے کر رکھا ہے جہاں ان کے کسی دعویٰ کے لیے روانی قلم کے علاوہ اور کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔

(۴) اور اگر سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ باتیں یہود سے ہی سنی تھیں تو تحقیق طلب یہ ہے کہ وہ یہود کون تھے۔ بازاری قسم کے آدمی تھے جیسا کہ سرسید صاحب کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے یا یہود کے وہ جید علماء اور حق پرست محقق و مبصرین جن کی تحقیق کا درجہ لامحالہ سرسید صاحب اور مولانا عنایت رسول صاحب کی تحقیق سے کہیں زیادہ ہے یہاں تک کہ کہا جا سکتا ہے:

"چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

ہمارا خیال بلکہ ہمارا یقین یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسا عظیم محقق و مبصر جس کی فراست و بصیرت اور فہم قرآن کے لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ روحی) کی لسان صداقت ترجمان پر

کلمات دعائیہ جاری ہوئے ہوں اور سید الکونین ﷺ کی پیغمبرانہ فراست و مردم شناسی نے جن کی قدر و عظمت یہاں تک بڑھائی ہو کہ سینہ مبارک سے اس کو چمٹا کر دعا فرمائی ہو:

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ

(اے اللہ اس کو دانش عطا فرما۔)

کبھی یہ دعا فرمائی ہو۔

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ

(اے اللہ اس کو قرآن حکیم کا علم عطا فرما۔)

جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تنقیدی نگاہوں میں یہاں تک جچا ہوا ہو کہ سن رسیدہ اکابر صحابہ کی موجودگی میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ ان سے آیات کتاب اللہ کے رموز اور اشارات دریافت فرماتے ہیں۔ اس کی جلالت و عظمت اور اس کا غیر معمولی علمی وقار کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بازاری قسم کی یہود کی باتوں پر التفات فرماتا اور یہ تو قطعاً ناممکن تھا کہ وہ ایسی بازاری روایتوں کو یہ حیثیت دیتا کہ ان کو مستفیضین کے حلقہ میں بیان کرتا۔

اور سعید بن جبیر جیسا محدث و فقیہ، زاہد و متقی اسکو نقل کر کے تلامذہ تک پہنچاتا۔ (معاذ اللہ)

تعجب ہوتا ہے سر سید جیسے درایت و تحقیق کے مدعی کس طرح واقعات سے آنکھ بند کر لیتے ہیں۔ کیا سر سید صاحب اتنی بات نہیں جانتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بچپن ہی تھا۔ جب مدینہ طیبہ سے یہود نکالے جا چکے تھے اور ابھی شروع جوانی تھی کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہود کو خیبر سے بھی جلاوطن کر دیا تھا اور اب پورا جزیرۃ العرب ان کے وجود سے پاک ہو گیا تھا۔

سر سید صاحب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ پر تو اعتراض کر رہے ہیں کہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ روایتیں انہوں نے کس سے سنیں مگر خود یہ نہیں بتایا کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے معمولی قسم کے عام یہودیوں سے یہ باتیں سنی تھیں اور قلم بند کر لی تھیں۔ کیا سید صاحب اس کی تحقیق کر چکے ہیں یا ان کے پاس کوئی قرینہ ہے؟ اگر کوئی قیاس ہے تو دلیل قیاس کیا ہے؟

ہاں قیاس یہ ہے اور یہ قیاس صحیح ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ باتیں ان بزرگوں سے سنیں جو پہلے یہود کے جلیل القدر علماء محققین تھے۔ پھر ان کی صداقت پسندی نے ان کو مجبور کیا کہ وہ دولت اسلام سے مشرف ہوں۔ مثلاً سیدنا حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یا حضرت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت کعب احبار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ مگر بارگاہ فاروقی میں ان کو خاص مقام حاصل تھا اور حلقہ یہود میں ان کے تبحر علمی اور عالمانہ عظمت و وقار کی یہ شان تھی کہ ان کو احبار کا خطاب دے رکھا تھا۔ احبار حبر کی جمع ہے۔ حبر بڑے عالم کو کہتے ہیں۔ احبار جلیل القدر علماء کی جماعت۔ گویا یہ تن تنہا

علماء جلیل القدر کی پوری جماعت کے ہم پلہ مانے جاتے تھے۔

اب آپ ہی فرمایئے۔ ایسے جلیل القدر تسلیم شدہ فاضل و محقق کا بیان مانا جائے گا یا سرسید صاحب اور مولانا عنایت رسول صاحب کی تحقیق و تفتیش قابل تسلیم ہوگی۔

''چہ نسبت خاک را با عالم پاک''

دوسرے بزرگ سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کی عظمت و جلالت کے سامنے خامہ تحقیق و تفتیش جتنی مرتبہ بھی اور جتنا بھی سجدہ ریز ہو بجا اور درست ہے۔

ان کی عالمانہ عظمت اور فاضلانہ وقار کے طارم اعلیٰ تک نظر کی رسائی بھی مشکل ہے۔ اس سے بڑھ کر کون سی عظمت ہوسکتی ہے کہ رب العرش نے اپنے کلام پاک میں ان کو شاہد فرمایا ہے حق و صداقت کی شہادت دینے والا۔ الراسخون فی العلم اور یتلونہ حق تلاوتہ جیسی آیتوں کے مصداق بھی عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔

سرسید یا عنایت رسول صاحب نہیں بلکہ فاتح ایران سیدنا حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ جن کو دنیا ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی بشارت دیدی تھی اور بلا مبالغہ بالکل صحیح بات ہے کہ تیرہویں یا چودہویں صدی کے تمام علماء اور محققین اس گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے جو بدر و حنین جیسے معرکوں میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے نعل مبارک سے اڑی تھی۔ انہیں سیدنا حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی شہادت حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں ملاحظہ فرمایئے:

> ما سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول لاحد یمشی علی الارض انہ من اھل الجنۃ الا لعبد اللہ بن سلام وفیہ نزلت ھذہ الایۃ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ الایۃ (بخاری شریف ص ۵۳۸)

> ''جو لوگ زمین پر چل رہے ہیں میں نے نہیں سنا کہ ان میں سے کسی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ یہ جنتی ہے ان میں صرف عبداللہ بن سلام ایسے ہیں کہ ان کے متعلق میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ یہ جنتی ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں انہیں عبداللہ بن سلام کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی جس میں اہل کتاب کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے۔

شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ تا وَاسْتَکْبَرْتُمْ (سورہ احقاف ۱۶)

ترجمہ: ''تم ہی بتاؤ تمہارا کیا فیصلہ ہوگا۔ اگر یہ قرآن خدا کی جانب سے ہو۔ تم اس کا انکار کررہے ہو اور بنی اسرائیل کا ایک شاہد اس جیسی کتاب پر گواہی دے دے اور ایمان لے آئے اور تم تکبر میں ہی رہو (تو خود سوچو تمہارا انجام کیا ہوگا)۔''

اب پھر عدل وانصاف سے اپیل ہے کہ وہ فیصلے کرے کہ اس شاہد حق کی شہادت اور اس کا بیان معتبر ہوگا یا سر سید صاحب یا مولانا عنایت رسول صاحب کے ہفوات قابل اعتنا ہوں گے۔ معاذ اللہ پھر یہی گذارش ہے۔

''چہ نسبت خاک را با عالم پاک''

اہل جنت کیسے ہوتے ہیں:

حضرت قیس بن عبادرحمہ اللہ جلیل القدر تابعی اور عالم حدیث ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

میں مدینہ منورہ کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صاحب تشریف لائے جن کے چہرے پر خشوع خضوع کا نور جھلک رہا تھا۔ لوگوں نے کہا یہ اہل جنت میں سے ہیں۔ ان صاحب نے دو رکعتیں اختصار کے ساتھ پڑھیں پھر باہر تشریف لے جانے کے لیے نکلے۔ میں ان کے پیچھے چلا۔ میں نے ان سے کہا جب آپ مسجد میں تشریف لائے تھے تو لوگوں نے یہ کہا تھا کہ یہ شخص اہل جنت میں سے ہے۔

میری بات سن کر ان صاحب نے فرمایا۔ یہ بات تو کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ جس چیز کا پوری طرح علم نہ ہو اس کے متعلق اس طرح یقین سے کوئی بات کہہ دے۔

اچھا اب میں آپ کو بتاتا ہوں یہ بات کیسے چلی:

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں میں نے ایک خواب دیکھی۔ وہ خواب میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی۔ میں نے خواب یہ دیکھی تھی۔ ایک بہت بڑا اور بہت شاداب و سرسبز باغ ہے اس کے بیچ میں لوہے کا ایک کھمبا (لاٹ) ہے۔ اس کا نیچے کا حصہ تو زمین میں ہے۔ اور اوپر کا حصہ آسمان میں ہے۔ اوپر کے حصہ میں ایک کڑا (کنڈا) ہے۔ مجھ سے کہا گیا اس (کھمبے) پر چڑھو۔ میں نے کہا۔ مجھ میں تو یہ طاقت نہیں ہے۔ اتنے میں ایک خادم آیا۔ اس نے میرے پیچھے سے کپڑے اٹھا لیے۔ میں چڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ اوپر کے سرے تک پہنچ کر میں نے یہ کڑا پکڑ لیا۔ مجھ سے کہا گیا۔ مضبوط پکڑ لو۔ میں کڑا پکڑے ہوئے تھا کہ آنکھ کھل گئی۔

ان صاحب نے بیان کیا۔ میں نے یہ خواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی تو آپ نے فرمایا یہ وسیع اور سرسبز وشاداب باغ اسلام ہے۔ یہ کھمبا اسلام کا ستون ہے۔ اور یہ کڑا عروہ وثقیٰ ہے۔ (اس کو پکڑ لینے کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کا مضبوط سہارا آپ نے حاصل کر لیا ہے)۔

بس تم اسلام پر قائم رہو گے یہاں تک کہ موت آئے اور یہ شخص (جس کو آپ دیکھ رہے ہیں) عبداللہ بن سلام ہے۔ (بخاری شریف ص ۵۳۸)

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ صادق ومصدوق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب کی تعبیر بیان فرماتے ہیں۔ جس کو وحی خداوندی اور آسمانی فیصلہ کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ آپ کا ہر ایک ارشاد ارادہ خداوندی کی تعبیر

اور منشاء خداوندی کی تفسیر ہوتا ہے۔

خود یہ عبداللہ بن سلام ان صداقت پرست فدا کاروں میں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ صرف ارشاد بلکہ ہر ایک ایما اور اشارہ کو قطعی فیصلہ سمجھتے ہیں جس پر سو جان سے قربان ہونا ان کا ایمان واذعان ہے۔ مگر جو بات خود ان کی شان میں ہے اس کی اہمیت کس طرح کم کر رہے ہیں گویا ان کو ناگوار ہے کہ ان کے متعلق اس طرح کا چرچا کیوں ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ مومن با اخلاص جس طرح ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق سمجھتے ہیں اسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے بے نیاز ہونے کا بھی یقین ہے جو اپنے بندوں کے حق میں جب چاہے جو چاہے فیصلہ کر سکتا ہے اور زمین و آسمان بلکہ پوری کائنات میں کسی کی مجال نہیں کہ اس کے فیصلہ کے سامنے دم مار سکے۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ

در ہر پیر زن مے زد پیمبر — کہ اے زن ورد عایم یاد آور
یقین میدان کہ شیران شکاری — دریں رہ خواستند از مور یاری

مکہ معظّمہ میں اصول کار

تیرہ برس گذر گئے۔ مکہ معظمہ میں دعوت الی اللہ اور تبلیغ کا کام ان اصول پر کیا جار ہا ہے۔

① اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ

(سورہ نحل ع ۱۶)

''اے پیغمبر! اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت کی باتیں بیان کرو اور اچھے طریقے پر پند ونصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث ونزاع کرو تو وہ بھی ایسے طریقہ پر کہ موقع اور محل کے لحاظ سے وہی سب سے بہتر طریقہ ہو۔'' (سورہ نحل ع ۱۶)

② خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِیْنَ (سورہ اعراف ع ۲۴)

''نرمی اور درگذر سے کام لو، نیکی کا حکم دو اور ان نادانوں سے کنارہ کرو (ان کی باتوں کی طرف دھیان نہ دو)'' (سورہ اعراف ع ۲۴)

③ رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْ اٰیَاتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ

''اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں بے کار حجت کرتے ہیں۔ (بے ہودہ بکتے ہیں) تو ان سے کنارہ کرلو یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں غور وخوض کرنے لگیں۔'' (سورہ انعام ع ۸)

④ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورہ انعام ع ۱۳)

''اور جو خدا کے سوا اور دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو۔'' (سورہ انعام ع ۱۳)

⑤ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (حم سجدہ رکوع ۴)

''برائی کا جواب ایسی خصلت (ایسے برتاؤ) سے دو کہ وہی سب سے بہتر برتاؤ ہو (جس کے نتیجہ میں یہ بات ہو سکے) کہ وہ شخص کہ تمہارے اور اس کے درمیان عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے جیسے کوئی پکا دوست۔''

یعنی برائی کا جواب دیتے وقت پیش نظر یہ ہو کہ برائی ختم ہو دشمن دوست بنیں۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر کسی مخالف نے جو برائی کی ہے اس کا کوئی بہترین جواب سوچو اور اس پر عمل کرو۔

⑥ قُلْ یَا اَیُّهَا الْکَافِرُوْنَ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ وَلَا اَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُّمْ وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (سورہ کافرون، پ ۳۰)

''(اے پیغمبر) کہہ دیجئے۔ اے منکرو! میں ان کی پرستش نہیں کرتا جن کو تم پوجتے ہو اور نہ

تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں (میں پھر یہی کہتا ہوں) میں ان کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں جن کی تم نے پوجا کی اور نہ تم اس کی پوجا کرنے والے ہو جن کی میں پرستش کرتا ہوں (جب صورت حال یہ ہے تو) تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔'' (پارہ ۳۰ سورہ کافرون)

مکہ معظمہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں یہی ہدایتیں بار بار دہرائی گئی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ تو یہاں بھی اسی مضمون کی آیتیں بار بار نازل ہوئیں مثلاً سورہ آل عمران میں ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذًى كَثِيْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (ع ۱۵)

''ایسا ضرور ہوتا ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ۔ یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین سے تمہیں دکھ پہونچانے والی باتیں بہت کچھ سنی پڑیں اگر صبر و ضبط سے کام لیتے رہے اور تقوا کا شیوہ اختیار کرتے رہے (خلاف احتیاط کام سے بچتے رہے) تو یہ ہوں گے وہ کام جن کو (بڑی ہمت و حوصلہ اور) عزیمت کے کام کہا جاتا ہے۔''

یہود کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ۔ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (سورہ بقرہ ع ۱۳)

''اہل کتاب میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا دیں اور اگر چہ ان پر سچائی ظاہر ہو چکی ہے لیکن پھر بھی اس حسد کی وجہ سے جس کی جلن ان کے دلوں میں ہے پسند نہیں کرتے کہ تم راہ حق میں ثابت قدم رہو۔ پس چاہیے کہ (ان سے لڑنے جھگڑنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو اور) عفو و درگزر سے کام لو۔ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو جائے بلاشبہ وہ ہر بات پر قادر ہے اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ یاد رکھو جو کچھ بھی تم اپنے لیے نیکی کی پونجی پہلے سے اکٹھی کر لو گے اللہ کے پاس اس کے نتیجے موجود پاؤ گے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

مدینہ طیبہ کے معمول کا بیان کرتے ہوئے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کرام (مدینہ منورہ میں مشرکین اور اہل کتاب سے درگذر کیا کرتے تھے اور ان کی طرف سے جو اذیتیں پہونچتی تھیں ان پر صبر کیا کرتے تھے۔ کیونکہ (۲۱۵) وحی الٰہی کی ہدایت یہی تھی۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہاں کے باشندے ملے جلے تھے۔ بت پرست مشرک اور یہودی بھی تھے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو اذیتیں پہونچایا کرتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام کو اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ صبر کرو۔ چنانچہ یہ آیتیں (جو اوپر ذکر کی گئی ہیں) اسی سلسلہ میں نازل ہوئی تھیں۔ (۲۱۶)

قریش کا طرز عمل اور قومی کونسل کا فیصلہ

جس شخص کا احترام یہاں تک تھا کہ نام لینے کے بجائے اس کو الصادق اور الامین کہا کرتے تھے انتہا یہ کہ اسی خطاب نے نام کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نام اتنا مشہور نہیں تھا جتنی شہرت ان خطابوں نے پالی تھی۔ جب اس نے کہا اے لوگو غیر اللہ کی پوجا چھوڑو، خدا واحد کی عبادت کیا کرو، حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) کا نام لیتے ہو ان کی ملت پر فخر کرتے ہو تو اس پر عمل بھی کرو۔ تو کون نہیں جانتا کہ قریش کا بچہ بچہ اس صادق اور امین کا اور ان سب کا دشمن ہو گیا جنہوں نے آپ کو مانا۔

مارنا، پیٹنا، بدن پر غلاظت ڈالوا دینا، رسی باندھ کر شریر لڑکوں سے گلیوں کوچوں میں کھچوانا، کسی کو تپتے ہوئے ریت پر اور کسی کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا کر سینہ پر بھاری پتھر رکھ دینا، تقریر کے وقت ہڑبونگ کرنا، انفرادی بائیکاٹ، جماعتی مقاطعہ، غرض جو ایذا اور تکلیف و تذلیل ان کے تصور میں آ سکتی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے پوری سنگدلی اور بے دردی کے ساتھ وہ عمل میں لائی گئی۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان تمام سختیوں اور رکاوٹوں کے باوجود صداء حق کے اثرات بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ نور مقدس کی کرنیں تین سو میل کے فاصلہ پر مدینہ منورہ کو روشن کرنے لگیں۔

اسلام اور دعوت حق کی اس سخت جانی نے صنادید قریش کو حواس باختہ کر دیا۔ تاریک مستقبل کی بھیانک تصویر ان کے سامنے آنے لگی اور اب انہوں نے آخری فیصلہ کی تیاری شروع کر دی۔

دار الندوہ کا اجتماع اور موضوع بحث (ایجنڈا):

قومی کونسل یا پنچایتی عدالت جو قصی نے قائم کی تھی کہ مختلف خاندانوں اور قبیلوں کے سربرآوردہ نمائندوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ جس کا فیصلہ پوری قوم کا فیصلہ مانا جاتا تھا۔ اسی پنچایت یا کونسل کا خصوصی اجلاس دار الندوہ میں کیا گیا۔ موضوع بحث یہی تھا کہ دین حنیف کے اس داعی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سدباب کس طرح کیا جائے اور اس دعوت حق کو کس طرح ختم کیا جائے۔

بیجا نہ ہوگا اگر ہم اس موقع پر یہ بھی تسلیم کر لیں کہ انداز وحی میں جو تہدید آمیز گرمی آ چلی تھی اس نے بھی قریش کو حواس باختہ اور مشتعل کر دیا تھا اور وہ بھی اس وقت موضوع بحث تھی سورہ قمر میں آیت نازل ہوئی تھی:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (ع ۳۹)

”کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایسی جماعت ہیں کہ ہم غالب رہیں گے (یہ فریب نفس ہے) عنقریب شکست کھائے گی (ان کی) جماعت اور بھاگیں گے پیٹھ پھیر کر[۲۱۷]۔

سورہ سجدہ میں فرمایا گیا ہے۔"

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (ع۲ سورہ سجدہ ۲۱)

"ہم ان کو چکھائیں گے۔قریب کا (دنیا میں آنے والا) عذاب۔ بڑے عذاب سے پہلے (جو مرنے کے بعد آئے گا)"

پھر اسی سورت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ إِنَّهُمْ مُنْتَظِرُونَ (۲۹)

"اور کہتے ہیں کب ہوگی یہ فتح۔ اگر تم سچے ہو۔ آپ فرما دیجئے فتح کے دن کافروں کو ان کا ایمان لانا نفع نہیں دے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ لہٰذا آپ ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے اور انتظار کیجئے وہ بھی (اپنے خیال کے بموجب اپنی کامیابی کا) انتظار کر رہے ہیں۔"

یہ گرمی کیوں آئی:

واقعہ یہ ہے کہ قریش کے ساتھ معاملہ دعوت اور تبلیغ کی حد تک محدود نہیں تھا بلکہ ایک دوسرا معاملہ بھی تھا کہ وہ غاصب، خائن اور قابض بالجبر بھی تھے۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں صرف انذار و تبشیر اور صرف دعوت و ارشاد نہیں تھا بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جانشین کی حیثیت سے تطہیر کعبہ بھی آپ کے فرائض میں داخل تھا۔ یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کو حکم ہوا تھا۔ طَهِّرَا بَيْتِيَ بیت خدا کو پاک رکھو اس کی ذمہ داری اس وقت آپ پر آرہی تھی۔

کاش قریش صدائے حق پر کان دھرتے جو تیرہ برس سے برابر گونج رہی تھی۔ قرآن شریف آپ کے سامنے ہے۔ قرآن حکیم کا زیادہ حصہ وہ ہے جو مکہ معظمہ میں نازل ہوا۔ مکی سورتوں کا مطالعہ کیجئے۔ عاد، ثمود، قوم لوط، اصحاب مدین، قوم تبع، قوم فرعون کے عبرت انگیز واقعات اور حوادث کو معجزانہ انداز میں بار بار دہرایا گیا ہے کس طرح ان قوموں نے عناد اور سرکشی سے کام لیا اور کس طرح اس کے عبرت خیز اور لرزہ انگیز نتائج ان کو برداشت کرنے پڑے۔ تیرہ سال تک وحی الٰہی کی ہماہمی اسی انذار اور تنبیہ میں مصروف رہی۔ نہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ جو بھی آپ سے وابستہ تھے کلام اللہ کی انہیں رقت انگیز اور سبق آموز سورتوں کو پورے سوز و گداز اور ہمدردی کے بے چین و مضطرب جذبات کے ساتھ ان کو سناتے رہے اور بار بار دہراتے رہے۔ کاش یہ برگشتہ نصیب راہ راست پر آجائیں۔ غفلت کی پٹیاں آنکھوں سے کھول لیں۔ عناد اور سرکشی سے دماغ ہلکا کریں لیکن

یہ تمام ہمدردانہ اور مخلصانہ کوششیں رائیگاں ہوتی رہیں۔

کیا اب بھی یہی ضروری تھا کہ عدم تشدد اور ہندی الفاظ میں اہنسا کو نصب العین قرار دیا جاتا۔

جہاں تک تبلیغ وارشاد کا تعلق ہے۔ **لا اکراہ فی الدین** نے یہی طے کر دیا ہے کہ یہاں تشدد اور جبر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایمان ویقین دل کی تبدیلی کا نام ہے جو افہام وتفہیم یا اخلاقی اور روحانی اثر سے تو ہو سکتی ہے جبر واکراہ ظلم وتشدد سے نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر غاصب ناجائز قبضہ کیے ہوئے ہے۔ ظالم کسی کا حق پامال کر رہا ہے۔ خود غرض معاند اور خائن اپنے ناجائز مفاد کی خاطر سینہ زوری کر رہا ہے۔ انصاف کی بات قطعاً نہیں سنتا بلکہ حق گو کو سانس لینے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ تو کیا اب بھی عدم تشدد اور اہنسا نصب العین بن سکتا ہے؟ اگر نصب العین بنا لیا گیا تو یہ کوئی مقدس نصب العین ہوگا یا ظلم وعناد اور جبر وقہر کی در پردہ اعانت ہوگا؟

مختصر یہ کہ معاملہ اگر دعوت وارشاد تک محدود ہوتا تو ممکن تھا کہ آخر تک وہی پروگرام رہتا جو مکہ معظمہ میں اب تک رہا تھا یعنی ہاتھ روکو، خدا سے رابطہ مضبوط کرو، نمازیں پابندی سے پڑھتے رہو كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ لیکن تطہیر کعبہ کا فرض جس کے دوسرے معنی یہ تھے کہ تغلب، چیرہ دستی، خیانت، بدعہدی اور غداری کا خاتمہ کیا جائے، پامال شدہ حقوق زندہ ہوں، عدل وانصاف کا بول بالا ہو۔ اس کا تقاضا تھا کہ پروگرام میں کچھ تبدیلی کی جائے۔ اسی تبدیلی کے اشارات ان آیتوں میں تھے جو پہلے پیش کی گئیں۔ رؤسا قریش اہل زبان تھے اور اشارات کو بخوبی سمجھتے تھے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دوسرا سبب تھا جو دارالندوہ کے اس اجتماع کا محرک ہوا۔

دارالندوہ میں قومی کونسل نے جو فیصلہ کیا وہ ہر ایک کو معلوم ہے۔ فیصلہ کو فوراً ہی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی، نوجوانوں کا ایک دستہ مقرر کر دیا گیا کہ دنیا کی تاریخ میں ایک اولوالعزم رسول کے قتل ناحق کا اضافہ کر دے۔ مگر منظور خدا کچھ اور تھا اور ان کی تدبیریں ناکام رہیں۔ تدبیر خداوندی کامیاب ہوئی۔ قریش نے دفعۃً دیکھا کہ جس کی موت کا منصوبہ تھا وہ زندگی کے نئے میدان میں قدم بڑھا رہا ہے۔

مَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ

ہجرت کے بعد

قریش کی طرف سے یثرب میں مخالف محاذ، پورے عرب میں اشتعال انگیزی

قومی کونسل کے فیصلہ کی ناکامی پوری قوم کی ناکامی تھی۔ مگر اس سے قریش کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ جھونجل اور بڑھ گئی۔ قریش اپنے آپ کو پورے عرب کا سربراہ سمجھتے تھے۔ اسی زعم میں انہوں نے مدینہ طیبہ کے مشرکوں کے نام خط (۲۲۰) لکھا۔

''تم نے ہمارے آدمی کو اپنے یہاں پناہ دی ہے۔ اس سے جنگ کرو یا اس کو اپنے یہاں سے نکال دو۔ ورنہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم پہنچیں گے۔ تمہارے جوانوں کو موت کے گھاٹ اتاریں گے۔ عورتوں کی عزت خراب کریں گے۔''

یہ خط بے نتیجہ رہا۔ کیونکہ اس میں جنگ کی ہدایت کی گئی تھی۔ مگر جن کو جنگ کی ہدایت کی تھی ان کے خاندان بٹ چکے تھے۔ ایک ہی گھر میں اگر باپ مشرک تھا تو لڑکا مسلمان ہو چکا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے مشرکوں کو یہی سمجھایا کہ تمہاری تلواروں کے مقابلہ میں خود تمہارے لخت جگر ہوں گے۔ البتہ ایک ایسا محاذ قائم کرنے میں قریش کامیاب ہو گئے جس کو آج کل کی زبان میں پانچواں کالم (ففتھ کالم) کہا جاتا ہے۔ اس کا مواد موجود تھا۔ قریش نے اس سے کام لیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مشرکین مدینہ کے دو قبیلے اوس اور خزرج جو سالہا سال سے آپس میں نبرد آزما تھے اور اسی خانہ جنگی میں اپنے تمام بڑے بڑے آدمیوں کو ختم کر چکے تھے آپس کی جنگ سے چور ہو کر کچھ عرصہ پہلے انہوں نے اتحاد کا راستہ اختیار کیا تھا اور طے کیا تھا کہ کسی ایک رئیس کو اپنا بادشاہ بنا کر امن کی زندگی گذاریں گے وہ شخص جس کی بادشاہت پر دونوں قبیلے متفق ہو گئے تھے عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا۔ بادشاہ کے لیے تاج بھی بنوایا گیا تھا اور جشن تاج پوشی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ دعوت حق کی بھنک ان کے کانوں تک پہونچی۔ یہ ایک اطمینان بخش لہر تھی۔ پرامن زندگی کی بشارت، اخوت انسانی کی روح رواں، لڑائیوں سے تھکے ماندے دل جو بادشاہت کو اتحاد کی شیرازہ بندی سمجھ رہے تھے اس روح اخوت سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ حقیقی اتحاد کا راستہ بادشاہت نہیں ہے بلکہ اس کی شاہراہ نصرت حق ہے۔ چنانچہ جشن تاجپوشی کے بجائے وہ استقبال مہاجرین کی تیاریاں کرنے لگے۔

دنیا اس احساس صحیح کی کتنی ہی تحسین وتعریف کرے مگر عبداللہ بن ابی ابن سلول کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ بقول حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ یہ صدمہ اس کے حلق کا پھندا بن گیا جس کی گھٹن وہ ہر (۲۲۱) وقت محسوس کرتا تھا اور تمام عمر محسوس کرتا رہا۔

مدینہ کا یہ ناکام رئیس عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی۔ قریش کی سازش کے لیے بہترین مہرہ تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا خط انہیں کے نام تھا۔

دہشت انگیزی اور منافرت:

یہ پانچواں کالم اور مار آستین جس کو قریش دودھ پلایا کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باقاعدہ جنگ تو نہیں کر سکا۔ لیکن وہ اس کے لیے ہمیشہ تیار رہا کہ دارالندوہ کا فیصلہ جو مکہ میں نافذ نہیں ہو سکا تھا اس کو مدینہ میں جامہ عمل پہنا دیا جائے۔ چنانچہ ایک مدت ایسی گذری کہ رحمت عالم ﷺ کی ذات اقدس کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ یہاں تک کہ راتیں جاگ کر گذارنی پڑتی تھیں۔ چنانچہ حضرت یحییٰ بن سعید کا بیان ہے:

کان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم اول ما قدم المدینۃ یسھر من اللیل (۲۲۲)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اول اول مدینہ آئے تو جاگ کر رات گذارا کرتے تھے۔''

دہشت انگیزی کے ساتھ دوسرا کام نفرت پھیلانا تھا۔ بخاری شریف کے حوالہ سے صرف ایک روایت پیش کی جاتی ہے۔ اس سے اس پارٹی کے عمل کا بھی اندازہ ہوگا اور قریش کی ریشہ دوانی اور اس کی کامیابی کا بھی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی کچھ طبیعت خراب ہوگئی وہ اپنے قبیلہ بنو حارث بن الخزروج میں مقیم تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ سواری پر بٹھا لیا۔ ایک جگہ کچھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے یہودی بھی اور عبداللہ بن ابی اور اس کے کچھ ساتھی بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مجمع کے قریب پہونچے تو آپ کی سواری کی کچھ گرد لوگوں پر پڑ گئی۔ عبداللہ بن ابی نے فوراً چہرہ پر کپڑا ڈال کر حقارت سے کہا۔ ہم پر دھول مت اڑاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توقف فرمایا۔ سواری سے اترے بات چیت شروع کی کچھ نصیحتیں کیں، کچھ آیتیں سنائیں، دفعۃً عبداللہ بن ابی کا پارہ چڑھ گیا۔ کتاب اللہ کی فصیح و بلیغ مرصع آیتیں جو صاحب ذوق عربوں کے لیے وجد آفریں ہوا کرتی تھیں اور جب رسول خدا (فداہ روحی صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان صداقت ترجمان سے پڑھی جاتی تھیں تو ان کی کیفیت عجیب ہوا کرتی تھی۔ قریش مکہ اس کیفیت کو ختم کرنے کے لیے شور شغب شروع کر دیا کرتے تھے۔ اس وقت عبداللہ بن ابی نے بھی اسی طرح کی حرکت کی۔ یعنی اس نے ترخ کر کہا۔ میاں یہ باتیں کتنی ہی اچھی سہی مگر ہمارے مجمع میں آ کر آپ ہمیں تکلیف نہ دیا کریں۔ اپنے گھر جاؤ۔ جو تمہارے پاس وہاں پہونچے اس کو سناؤ۔

اس مجمع میں مسلمان بھی تھے۔ مگر عبداللہ بن ابی نے خود ہی سب کا وکیل بن کر تلخ کلامی شروع کر دی۔ مومن صادق حضرت عبداللہ بن رواحہ جو اسی مجمع میں تھے ان کو عبداللہ بن ابی کی یہ گستاخی برداشت نہ ہو سکی۔ انہوں نے فرمایا۔ یا رسول اللہ آپ اللہ کا کلام ضرور سنائیں۔ آپ ہمارے مجمع میں تشریف بھی لائیں اور ہمیں اللہ کی باتیں بھی بتائیں۔ ہمیں تکلیف نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ کلام پیارا لگتا ہے۔ عبداللہ بن ابی بھی خاموش نہیں ہوا بلکہ اور گرم ہو گیا اس کے حمایتیوں نے بولنا شروع کیا۔ بات بڑھنے لگی۔ قریب تھا کہ ہاتھا پائی کی نوبت آ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بیچ میں پڑے فریقین کو ٹھنڈا کیا اور معاملہ کو رفع دفع کیا (۲۲۳)۔

پورے عرب میں اشتعال پھیلانا:

خانہ کعبہ کی مجاورت اور حرم اطہر کی تولیت کے سبب سے قریش کا جو اثر و رسوخ پورے عرب میں تھا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ تقریباً نصف صدی پہلے اصحاب فیل کے واقعہ نے اس اثر میں تقدیس آمیز احترام کا اور اضافہ کر دیا تھا۔ بقول ابن اسحاق (۲۲۴) وہ مذہبی اور روحانی پیشوا (امام الناس) بھی تھے اور سیاسی رہبر و رہنما (ہادی وقادۃ العرب) بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی عداوت و مخالفت میں قریش نے اپنے اثر و رسوخ اور اپنی مقبولیت سے پورا فائدہ اٹھایا اور پورے عرب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف مشتعل کر دیا۔ چنانچہ ایک طرف خود مدینہ طیبہ میں یہ حالت ہوگئی کہ مسلمانوں کو ہر وقت مسلح رہنا پڑتا تھا۔ رات کو سوتے بھی تھے تو ہتھیار لگا کر سوتے تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لما قدم رسول الله صلی الله علیه وسلم واصحابه المدینة و اوتهم الانصار رمتهم العرب عن قوس واحدة کانوا لا یبیتون الا بالسلاح ولا یصبحون الا فیه

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء مدینہ میں آئے اور انصار نے ان کے قیام کا انتظام کیا تو سارے عرب نے ان کو نشانہ بنالیا۔ حالت یہ تھی کہ رات کو سوتے تو ہتھیار لگا کر اور صبح کو اٹھتے تو ہتھیار بند۔''

دوسری طرف پورے عرب کی حالت یہ تھی کہ وفد عبدالقیس بحرین سے حاضر خدمت ہوا تو اس نے شکایت کی:

یارسول الله انا لا نستطیع ان ناتیك الا فی الشهر الحرام بیننا وبینك هذا الحی من کفار مضر (بخاری شریف ص ۱۰ ج ۱) باب اداء الخمس من الایمان)

''یارسول اللہ ہم صرف شہر حرام میں (جب کہ عرب کے دستور اور عقیدے کے مطابق کسی پر حملہ نہیں کیا جا سکتا) آپ تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان (بحرین اور مدینہ کے درمیان) مضر کا قبیلہ پڑتا ہے جو کفر پر قائم ہے۔''

یہ وفد ۶ھ میں آیا۔ جس سال حدیبیہ کی صلح ہوئی تھی اور قسطلانی شارح بخاری کا خیال ہے کہ ۸ھ ہجری میں آیا تھا۔ یعنی صلح حدیبیہ کے بعد بھی عرب کے مختلف علاقوں میں حامیان قریش کی طرف سے رکاوٹیں قائم رہی تھی۔

شبخون:

ہجرت کا پہلا سال ختم ہو کر دوسرا سال شروع ہو رہا تھا کہ قریش کے ایک سردار کرز بن جابر نہری نے اچانک مدینہ طیبہ کی چراگاہ پر حملہ کیا (۲۲۶) اور مویشی لوٹ کر لے گیا۔ اس کا تعاقب کیا گیا مگر وہ بچ کر نکلنے میں

کامیاب ہوگیا۔ یہ قریش کی طرف سے دہشت انگیزی کی تقویت تھی اور اپنی قوت کا مظاہرہ تھا کہ تین سو میل کے فاصلہ پر بھی وہ کامیاب حملہ کر سکتے ہیں اور فتح پا سکتے ہیں۔

قرآنی اصطلاح:

پورے عرب میں اشتعال اور مدینہ میں دہشت پھیلانا، منافرت اور عداوت بڑھانا، چراگاہ پر حملہ، ڈکیتی قرآن حکیم ان باتوں کو **فساد فی الارض** قرار دیتا ہے۔

صد عن سبیل اللہ:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل روایت امام بخاری نے کتاب المغازی کے شروع میں نقل کی ہے کہ:

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ جو قبیلہ اوس کے رئیس اعظم تھے عمرہ کے لیے مکہ معظمہ گئے۔ حضرت سعد بن معاذ اور امیہ بن خلف کا پرانا یارانہ تھا۔ امیہ جب مدینہ آتے تھے تو حضرت سعد کے یہاں قیام کرتے تھے اور حضرت سعد جب مکہ جاتے تھے تو اُمیہ کے یہاں ٹھیرا کرتے تھے۔ اسی تعلق کی بنا پر وہ اس مرتبہ بھی امیہ بن خلف کے مہمان ہوئے اور ایک روز ان کے ساتھ دوپہر کے وقت طواف کے لیے گئے کہ اس وقت بھیڑ کم ہوتی تھی۔ اتفاق سے ابوجہل سے ملاقات ہوگئی۔ ابوجہل نے اُمیہ سے دریافت کیا یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ امیہ نے جواب دیا سعد ہیں۔ ابوجہل نے کہا میں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم مکہ میں آ کر امن سے طواف کرو۔ تم لوگوں نے صابیوں کو (جو ہمارے دین سے منحرف ہو گئے ہیں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کرام کو) اپنے یہاں پناہ دی ہے اور یہ بھی دعویٰ ہے کہ تم ان کی مدد کرو گے۔ خدا کی قسم اگر تم اس وقت امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو اپنے گھر صحیح سالم نہیں پہنچ سکتے تھے۔ حضرت سعد نے کہا خدا کی قسم اگر تم نے ہمیں مکہ آنے سے روکا تو ہم وہ کریں گے جو تمہارے حق میں اس سے بہت زیادہ سخت بات ہوگی ہم تمہارا مدینہ کا راستہ روک دیں گے۔ (یعنی شام کی تجارت کا راستہ (بخاری شریف۔ باب ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من یقتل ببدر)

ابوجہل کی یہ دھمکی وہ ہے جس کو قرآن حکیم نے صد عن سبیل اللہ کہا ہے یعنی عبادت سے روک دینا اور حرم شریف کے داخلہ میں رکاوٹ ڈالنا فساد فی الارض کی طرح یہ بھی ایک مستقل جرم ہے۔ قریش جس کے مجرم تھے۔

اس صحیح السند روایت کا مفاد یہ بھی ہے کہ ابوجہل کی اس دھمکی سے پہلے مسلمانوں نے قریش کے تجارتی قافلوں کے راستہ میں رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ اگر مسلمانوں کی طرف سے کوئی بھی مزاحمت اس وقت تک پیش آتی ہوتی تو اول تو حضرت سعد مکہ جانے کا ارادہ ہی نہ کرتے اور اگر وہ غلطی کر بھی لیتے تو ناممکن تھا ابوجہل اس برہمی میں اس کا تذکرہ نہ کرتا۔

فریقین کے اعمال کا جائزہ، فرد جرم

هَذَانِ خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ

''یہ دونوں فریق ہیں جو اپنے رب کے بارے میں ایک دوسرے کے مخالف باتیں کہتے ہیں۔''

اب آیئے۔تذکرہ غزوات سے پہلے دونوں فریق کے اعمال کا جائزہ لے لیں۔

فرد جرم:

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے رفقاء کا جرم کیا تھا، وحی کے الفاظ میں آپ کے جرم کی حقیقت یہ ہے:

وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

(سورہ بروج)

''ان کی طرف سے قابل اعتراض بات صرف یہی تھی کہ وہ ایمان لے آئے تھے اس اللہ پر جو غالب قدرت والا ہے ہر لحاظ سے اس کا مستحق ہے کہ اس کی حمد کی جائے وہ اللہ کہ آسمانوں اور زمین کی مملکت صرف اسی کے لیے ہے۔''

قریش کا فرد جرم:

(آیات کتاب اللہ اور تاریخی شہادتوں کی روشنی میں تفصیلی بحث عہد زریں ۳ میں گذر چکی ہے)

(۱) تغلب: سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بسائے ہوئے شہر اور ان کے تعمیر کردہ بیت اللہ پر ناجائز قبضہ۔

(۲) خیانت: بیت اللہ، مسجد حرام اور حرم مکہ کو ایسے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جو ان کے تصریح کردہ مقصد اور منشاء کے خلاف ہے۔

(۳) بغاوت: مرکز توحید میں شرک کا جھنڈا گاڑنا جو شہر اقامت صلوٰۃ کے لیے آباد کیا گیا تھا اس کو شرک کا مرکز اور بت پرستی کی نمائش گاہ بنالینا۔

(۴) غدر اور دھوکا: دعویٰ ملت ابراہیمی کا اور عمل اس کے برخلاف۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔

(۵) مذہب کے بارے میں جبر وتشدد، آزادی رائے پر بندش، ضمیر کا خون۔

خداواحد کے پرستاروں پر لرزہ خیز مظالم، جبر وتشدد، قہر وغضب، جو مکہ معظمہ میں تیرہ برس تک ہوتا رہا۔

(۶) معزز شہریوں کا بائیکاٹ: ایک قومی معاہدہ کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ہمنوا آل ہاشم سے کلیۃ مقاطعہ کیا گیا ان کو شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور ہو کر رہنا پڑا۔ کھانے پینے اور جملہ ضروریات زندگی کے لیے ناقابل بیان مصیبتیں اور پریشانیاں برداشت کرنی پڑیں۔

(۷) اہل وطن کا ان کے وطن سے اخراج: ایک جماعت کو یہاں تک مجبور کیا گیا کہ ان کو وطن سے نکل کر حبشہ جانا پڑا۔ پھر دوسری جماعت کو مدینہ میں آ کر پناہ لینی پڑی۔

(۸) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ: دارالندوہ کا قومی فیصلہ۔

(۹) اقدام قتل: فیصلہ قتل کے بعد ایک جماعت کو مامور کیا گیا کہ وہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں گھس کر ان کو شہید کر ڈالیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچ کر نکل آئے تو اعلان کیا گیا کہ جو شخص محمد (رسول اللہ) کا سر لائے گا اس کو سو اونٹ انعام کے دیئے جائیں گے۔

تلك عشر كاملة قریش کے یہ جرائم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت تک تھے۔

ہجرت کے بعد

معاہدہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقاء باہم کے اصول پر جملہ اہل مدینہ سے ایک معاہدہ کیا جس میں مدینہ کے بت پرست، مدینہ کے یہودی اور مسلمان۔ اپنے مذہبی اختلافات کے باوجود برابر کے شریک تھے۔ حفاظت جان و مال اور امن و امان کے سلسلہ میں ان سب کے حقوق یکساں قرار دیئے گئے تھے۔ ابن ہشام نے یہ پورا عہد نامہ نقل کیا ہے۔ جس میں ہر فریق کے قبائل کے نام لے گئے ہیں اور یہ عہد کیا گیا ہے۔

(الف) ان يثرب حرام جو فها لاهل هذه الصحيفة

(جوف یثرب (وہ تمام علاقہ جو حدود مدینہ کے اندر ہے) اس عہد نامہ کے جملہ فریقوں کے لیے واجب الاحترام ہوگا (اس میں کشت و خون یا بدامنی نہیں ہوگی)

(ب) ان النصر للمظلوم

جو مظلوم ہوگا اس کی مدد کرنی ہوگی

(ج) ان الجار كالنفس خير مضار ولا اثم

پڑوسی اور جو لوگ پناہ لینے والے ہیں ان کے وہی حقوق ہوں گے جو خود اپنی ذات کے حقوق ہیں نہ کسی کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا نہ کسی کے خلاف مجرمانہ حرکت کی جائے گی۔

(د) وان بينهم النصر على من دهم يثرب

جو یثرب پر چڑھ آئے اس کے مقابلہ کے لیے آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنی ہو گی۔

(ہ) وان المومنين بعضهم مولى بعض وانه من تبعنا من يهود فان له النصر والاسوة

غیر مظلومین ولامتناصرین علیھم۔

مسلمان ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہیں گے اور جو یہودی ہمارے زیر اثر ہوں گے ان کی مدد کی جائے گی ان کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ ہوگا ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا نہ ان کا ساتھ دیا جائے گا جو ان کے خلاف انتقامی کارروائی کریں گے۔

(و) ایک دفعہ یہ بھی ہے۔وان یھود بنی عوف امة مع المومنین (بنوعوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک امت (ایک قوم) رہیں گے۔

پھر قبائل یہود کے نام علیحدہ علیحدہ شمار کیے گئے ہیں اور کہا گیا ہے لھم مثل ما لیھود بنی عوف جو عہد یہود بنوعوف سے ہے اسی جیسا ان سے بھی ہے۔یعنی جس طرح کے حقوق اور جو حیثیت یہود بنی عوف کی ہے وہی ان کی بھی ہوگی۔

(ز) پھر ایک عام دفعہ یہ ہے۔وان بطان [۲۲۷] الیھود کا نفسھم۔یہود کے اہل وعیال اور ان کے خواص کی حیثیت بھی یہود جیسی ہوگی۔پر حیثیت کی تفسیر کی گئی ہے۔للیھود دینھم وللمسلمین دینھم۔یہود اپنے مذہب میں آزاد رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب میں۔

وان بینھم النصح والنصیحة والبر دون الاثم وانه لم یاثم امرء بحلیفه

ان کے باہمی تعلقات خیر خواہی خیر سگالی نیکی اور بھلائی کے ہوں گے۔جرم اور گناہ کے نہ ہوں گے۔

(ح) ایک اہم دفعہ جس پر خاص زور دیا گیا ہے یہ ہے۔

ان بینھم النصر علی من حارب اھل ھذہ الصحیفه

''شرکاء معاہدہ میں سے کسی شریک سے جو کوئی جنگ کرے گا تو سب کا باہمی فرض ہوگا کہ اس کی (شریک معاہدہ کی) امداد کریں۔''

اس معاہدہ میں یہود کی طرح مشرکین کے نام بار بار نہیں لیے گئے کیونکہ ان کے قبیلے علیحدہ علیحدہ نہیں تھے وہ بنونجار، بنوساعدہ، اوس اور خزرج جو انصار کے قبائل تھے انہیں میں سے کچھ مسلمان ہو گئے تھے کچھ مشرک تھے ہر ایک قبیلہ نے بحیثیت قبیلہ اس میں شرکت کی تھی۔چنانچہ ہر ایک قبیلہ کے نام کے ساتھ یہ بھی ہے۔

(ط) علی ربعھم یتعاقلون معاقلھم الاولی و کل طائفه تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المومنین۔

جو ان کے طریقے پر چلے آرہے ہیں وہ بدستور ان پر قائم رہیں گے۔ان کے آپس میں خون بہا اور دیت ادا کرنے کا طریقہ جو پہلے سے چلا آرہا ہے وہی بدستور رہے گا۔ہر جماعت اپنے قیدی کے چھڑانے کا فدیہ عرف کے بموجب خود ادا کرے گی اس میں

مسلمان اور غیر مسلمان سب برابر ہوں گے ہر ایک کو انصاف ملے گا۔ مسلمان ہونے کی بنا پر کسی کو محروم نہیں کیا جائے گا (۲۲۹)۔

جب کہ بحیثیت قبیلہ معاہدہ میں شرکت تھی تو فرقہ مشرکین کی صراحت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی البتہ ایک دفعہ ایسی تھی جہاں تصریح ضروری سمجھی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

(ی) انه لا یجیر مشرك مالا لقریش ولا نفسا ولا یحول دونه علی مومن

کوئی مشرک نہ قریش کے مال کی حفاظت اپنے ذمہ لے گا اور نہ کسی قریشی کو جان کی پناہ دے گا اور نہ مسلمانوں کے اور قریش کے درمیان حائل ہوگا۔

(سیرۃ ابن ہشام ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۳۰۱ تا ۳۰۴ مطبوعہ مطبع محمد علی صبیح میدان ازہر شریف (مصر)

یہ معاہدہ ان سے ہوا تھا جو مدینہ میں رہتے تھے۔ خلاصہ یہ تھا کہ سب مل کر ایک امت (قوم) کی طرح رہیں گے۔ کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ باہر سے کوئی حملہ کرے گا تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ مظلوم کی سب مدد کریں گے۔ ہر ایک فرقہ کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ یہود جو مدینہ کے قریب قلعوں اور گڑھیوں میں رہتے تھے وہ اس معاہدہ میں شریک تھے۔ اس معاہدہ کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے گرد ونواح کے قبائل سے اسی طرح کے معاہدہ کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ آپ اسی سال ودان تشریف لے گئے جو مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے درمیان ایک مقام تھا۔ قبیلہ بنی حمزہ بنی بکر جو یہاں آباد تھا اس سے اسی مضمون کا معاہدہ ہوا۔ ربیع الاول ۵ھ میں آپ جبل رضوی کے اطراف میں تشریف لے گئے اور ''کوہ بواط''(۲۳۰) کے باشندوں کو شریک معاہدہ کیا۔ پھر جمادی الاخریٰ میں ''ذی العشیرہ'' تشریف لے گئے۔ یہ مقام ینبوع اور مدینہ کے درمیان ہے۔ یہاں بنو مدلج سے معاہدہ کیا (۲۳۱)۔

جرائم قریش

حفاظت امن، مذہبی آزادی، صلح وآشتی اور بقاء باہم کی جو کوشش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے اس کے برعکس قریش نے جو کوششیں کیں ان کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ جس کے واضح عنوانات یہ ہیں۔

(۱) اہل مدینہ سے مطالبہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں یا مدینہ سے نکال دیں۔

(۲) مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک محاذ قائم کرنا۔

(۳) مدینہ میں دہشت پھیلانا۔

(۴) مدینہ پہنچ کر شبخون مارنا۔

(۵) مدنیہ کے راستے بند کردینا (وفد عبدالقیس کی شکایت)

(۶) پورے عرب میں مسلمانوں کے خلاف دہشت پھیلانا۔فساد فی الارض (ملک میں تباہی مچانا)
(۷) حج اور عمرہ سے روکنا۔(صدعن سبیل اللہ)

اذن جہاد اور اس کی وجوہات

عجیب بات یہ ہے کہ وہ آیت جس میں جہاد کی اجازت دی گئی ہے سورہ حج میں ہے اور اس آیت سے پہلے تقریباً ڈھائی رکوع میں حج اور خانہ کعبہ کے پاک رکھنے کا حکم دیا گیا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کے لیے نوع انسان کو دعوت دی۔لوگ حج کے لیے آتے ہیں۔قربانی کے جانور ساتھ لاتے ہیں۔قربانی کا مقصد تقویٰ ہونا چاہیے۔مسجد حرام میں جملہ نوع انسان کا حق یکساں ہے۔یہاں مقامی اور بیرونی کی کوئی تفریق نہیں ہے۔یہاں ظلم و جور برداشت نہیں کیا جاسکتا۔جو تغلب اور چیرہ دستی کرے گا وہ سخت سزا کا مستحق ہوگا۔جو خیانت کرنے والے اور ناسپاس ہیں۔اللہ ان کو پسند نہیں کرتا۔ان تمام تصریحات کے بعد ارشاد ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرٌ (سورہ حج ع۶)

''اجازت دے دی گئی ان کو جن سے جنگ کی جارہی ہے اس بنا پر کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔''

کیا یہ آیت اس موقع پر بے محل ہے؟ آپ غزوات و سرایا کا پس منظر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔جس کی تفصیل کے لیے اس کتاب کے تقریباً سو صفحات رنگے گئے ہیں۔اس پس منظر پر دوبارہ نظر فرمائیے۔آپ کا فیصلہ یہی ہو گا۔اس آیت کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب مقام یہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس دستوری کتاب اور جس کانسٹی ٹیوشن کا اعلان یہ ہو۔لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ۔ (مذہب کے بارے میں کوئی جبر نہیں)
جو مذہب کے بارے میں جبر و اکراہ کے رجحان کو بھی ناپسند کرتا ہو اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۲۳۴) (سورہ یونس ع۱۱) کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے کہ وہ مسلمان ہو جائیں)
جس کی ہدایت حامل کتاب رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ہو۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ (سورہ یونس ع۱۱)

''اے پیغمبر! کہہ دیجئے۔اے لوگو تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی تمہارے پاس آ گئی پس جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کی گمراہی اس کے آگے آئے گی میں تم پر نگراں و مختار نہیں ہوں'' (سورہ یونس ع۱۱)

وہ دستور اساسی اور وہ فرمان ربانی کبھی یہ فیصلہ نہیں کرسکتا تھا کہ قریش کے خلاف اس لیے اعلان جنگ کر

دو کہ وہ مشرک ہیں۔ کافر ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول نہیں کرتے۔ اس کی نظر میں کچھ اور اسباب اور وجوہات ہوں گے جن کی بنا پر جنگ کی اجازت دی جائے گی۔ چنانچہ کچھ وجوہات اس آیت کے تتمہ میں بیان کیے گئے ہیں اور کچھ وجوہات اور اسباب تمہید میں بیان کیے گئے ہیں پھر عجیب بات یہ ہے کہ سلسلہ کلام میں فلسفہ جہاد پر بھی روشنی ڈالی گئی تو اختلاف عقائد کو نہ وجہ جہاد بتایا گیا نہ مقصد جہاد قرار دیا گیا۔ بلکہ جہاد کا مقصد تحفظ قرار دیا گیا اور بتایا یہ گیا کہ اگر جہاد نہ ہوتا تو کلیسے، گرجے، خانقاہیں اور مسجدیں سب ہی برباد ہوگئی ہوتیں۔ جو (۲۳۵) اپنے اپنے زمانہ میں ہدایت وارشاد کے مرکز رہے ہیں۔

وجوہات واسباب:

اس آیت کے دوسرے حصہ (تتمہ) میں فرمایا گیا کہ جن کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے:

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (سورہ حج ع۶)

''یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ان کا کوئی جرم نہ تھا اگر تھا تو صرف یہ کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔''

سلسلہ کلام (سیاق) پر اگر زیادہ غور سے کام لیا جائے تو سورت کے شروع ہی سے تمہید کا آغاز ہو جاتا ہے مگر ہم صرف ان آیات کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جن کا تعلق بیت اللہ حج بیت اللہ اور بناء خلیل اللہ سے ہے جس نے اس پس منظر کی تصدیق ہوتی ہے جو تفصیل کے ساتھ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو حصہ سوم)

ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ تا اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ (ع۶)

ترجمہ: ''جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور جو اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ نیز مسجد حرام (۲۳۶) سے (لوگوں کو روکتے ہیں) جسے ہم نے بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے (عبادت گاہ) ٹھیرایا ہے خواہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے ہوں (تو انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم انہیں اور) ہر اس آدمی کو جو اس میں از راہ ظلم حق سے منحرف ہونا چاہے گا۔ عذاب دردناک کا مزہ چکھائیں گے۔

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ (۲۳۷) مقرر کر دی (اور حکم دیا کہ) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ گردان۔ اور میرا یہ گھر ان لوگوں کے لیے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں، جو عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں، رکوع اور سجدہ میں جھکنے والے ہوں اور (حکم دیا تھا) کہ لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے لوگ تیرے

پاس دنیا کی تمام دور دراز راہوں سے آیا کریں گے۔ پا پیادہ اور سوار ہو کر دبلی دبلی اونٹنیوں پر (جو مشقت سفر سے) تھکی ہوئی ہوں گی۔ وہ اس لیے آئیں گے کہ اپنے فائدہ پانے کی جگہ میں حاضر ہو جائیں۔ اور ہم نے جو پالتو چار پائے ان کے لیے مہیا کر دیئے ہیں ان کی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں۔ پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیر کو بھی کھلاؤ۔ پھر قربانی کے بعد وہ اپنا میل کچیل دور کر دیں (یعنی احرام سے فارغ ہو جائیں) نیز اپنی نذریں پوری کریں اور اس خانہ قدیم (خانہ کعبہ) کا طواف کریں۔''

یہ سن چکے (اب اور سنو) اور جو کوئی اللہ کی ٹھیرائی ہوئی حرمتوں کی عظمت مانے تو اس کے لیے اس کے پروردگار کے حضور بڑی ہی بہتری ہے۔ اور (یہ بات بھی یاد رکھو کہ) ان جانوروں کو چھوڑ کر جن کا قرآن میں حکم سنا دیا گیا ہے تمام چار پائے تمہارے لیے حلال کیے گئے ہیں۔ پس چاہیے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچتے رہو اور بچتے رہو جھوٹی بات سے۔ صرف اللہ ہی کی طرف کے ہو کر رہو۔ اس کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہ کرو۔ جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اس کا حال ایسا سمجھو[۲۳۸] جیسے بلندی سے اچانک نیچے گر پڑا اور جو چیز اس طرح گرے گی اسے یا تو کوئی اچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی دور دراز گوشہ میں لے جا کر پھینک دے گا۔

(حقیقت حال) یہ ہے۔ پس (یاد رکھو) جس کسی نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی تو اس نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے۔

ان (چار پایوں) میں ایک مقررہ وقت تک تمہارے لیے (طرح طرح کے) فائدے ہیں پھر اس خانہ قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے۔

اور (دیکھو) ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے تھے۔ پس (یاد رکھو) تمہارا معبود وہی ایک معبود یگانہ ہے (اور جب اس کے سوا کوئی نہیں تو چاہیے کہ) اسی کے آگے فرماں برداری کا سر جھکا دو اور تم ہمہ تن اسی کے ہو کر رہو۔

اور (اے پیغمبر) عاجزی اور نیازمندی کرنے والے بندوں کو (کامرانی اور سعادت کی) خوشخبری سنا دو۔ ان (نیازمندان حق کو) جن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز اٹھتے ہیں۔ جو ہر طرح کی مصیبتوں میں صبر کرنے والے ہیں جو نماز کے پڑھنے اور اس کی درستگی میں کوشاں رہتے ہیں۔ جو اس رزق میں سے جو اللہ نے دے رکھا ہے۔

خرچ کرتے رہتے ہیں۔

اور (دیکھو قربانی کے یہ) اونٹ (جنھیں دور دور سے حج کے موقع پر لایا جاتا ہے تو) ہم نے اسے ان چیزوں میں سے ٹھیرا دیا ہے[۲۳۹] جو تمہارے لیے اللہ کی (عبادت کی) نشانیوں میں سے ہیں۔ اس میں تمہارے لیے بہتری کی بات ہے۔ پس چاہیے کہ ان پر کھڑے کر کے (ذبح کرنے کے وقت) اللہ کا نام لیا کرو۔ پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں[۲۴۰] (یعنی ذبح ہو چکیں) تو ان کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تا کہ (احسان الٰہی کے) شکر گذار رہو۔ (یاد رکھو) اللہ تک ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچتا ہے نہ خون اس کے حضور جو کچھ پہنچتا ہے وہ صرف تمہارا تقویٰ (تمہارے دل کی نیکی) ہے۔ ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو اور شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں راہ ہدایت کی توفیق بخشی اور اخلاص والوں (نیک کرداروں) کو خوش خبری سنا دو۔

جو لوگ ایمان لائے ہیں یقیناً اللہ (ظالموں کے ظلم و تشدد کی) ان کی طرف سے مدافعت کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ خیانت کرنے والوں کو جو ناسپاس (ناشکرے ہیں) کبھی پسند نہیں کرتا۔

جن مومنوں کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انہیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر سراسر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے (سورہ حج از ع ۳ تا ۶)

خط کشیدہ جملوں پر نظر فرمایئے غزوات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجوہات اور ان کا پس منظر آپ کے سامنے آ جائے گا۔

راہ خدا میں سب سے پہلا تیر

ایک صحابی کا اجتہاد اور بالائے عرش سے اس کی تصویب

میں سب سے پہلا عرب ہوں جس نے راہ خدا میں سب سے پہلے تیر پھینکا اور ہم ایسی حالت میں غزوہ کیا کرتے تھے کہ ہماری خوراک ببول کے پتے ہوتے تھے یا کیکر کی ککرولیاں اور بکری کی مینگنیوں کی طرح بالکل خشک فضلہ ہوا کرتا تھا[۲۴۱]۔

یہ سیدنا سعد بن ابی وقاص زہری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں ایک احتساب[۲۴۲] کے جواب میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک بیان دیا تھا جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں۔ حضرت خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ نے اس کی تصدیق کی تھی۔

تفصیل واقعہ:

یاد کیجیے جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کے لیے مکہ گئے تھے تو ابوجہل نے کس زور سے کہا تھا۔ (تم نے صابیوں (بے دینوں) کو اپنے یہاں پناہ دی ہے۔ میں نہیں دیکھ سکتا کہ تم لوگ مکہ میں آ کر طواف کرو۔ اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو یہاں سے زندہ نہیں جا سکتے تھے[۲۴۳]۔

ابوجہل نے جب اہل مدینہ پر کعبہ کا دروازہ بند کر دیا تو اہل مدینہ کو لامحالہ ایسی کارروائی کرنی تھی جس سے قریش کا نشہ ہلکا ہو۔ حضرت سعد نے وہیں ابوجہل کے منہ پر کہہ دیا تھا کہ تم مکہ کا راستہ بند کرتے ہو تو ہم تمہاری تجارت کا راستہ بند کر دیں گے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جو کہا تھا اہل مدینہ نے اس کو کیا۔

اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر اس غرض سے ہوتے تھے کہ بقاء باہم کے اصول پر جو معاہدہ مدینہ والوں سے ہوا تھا اس کے دائرہ کو وسیع کریں۔ چنانچہ پہلے گذر چکا ہے۔ ودان اور بواط وغیرہ کے سفر میں آپ نے وہاں کے قبائل سے معاہدے کیے اور مصالحت کے دائرے کو وسیع کیا۔ مگر ابوجہل کی اس بندش کے بعد توجہ عالی اس طرح بھی منعطف ہوئی اور سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں تجارتی قافلوں کے تعاقب کے لیے بھیجی جانے لگیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلامی جرنیل ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان ۱ھ میں جھنڈا عنایت کیا اور تیس رضا کار (مجاہد) ان کے ساتھ کیے کہ وہ قریش کے تجارتی قافلہ کا تعاقب کریں۔ قافلہ کا سردار ابوجہل تھا۔ غالباً ابوجہل کو اس خطرہ کا احساس پہلے سے تھا اس لیے وہ اپنے ساتھ بڑی تعداد لے کر چلا تھا۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ اس کے ساتھ تین سو آدمی تھے وہ جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا۔ تین سو کے مقابلہ میں تیس کی کیا حقیقت تھی مگر ان سرمستان توحید کا یہ ولولہ تھا کہ قلت تعداد کے باوجود مقابلہ کے

لیے صف آرا ہو گئے۔ مجدی بن عمر وجہنی اس علاقہ کا شیخ تھا جہاں یہ معرکہ ہونے والا تھا۔ وہ اتفاق سے دونوں فریق کا حلیف تھا اس لیے وہ بیچ میں پڑ گیا اور جنگ ملتوی کرادی (۲۴۴)۔

زیادہ چھان بین کی جائے تو ایک یا دو دستوں کا اور پتہ چلے گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارتی قافلہ کے تعاقب کے لیے بھیجے۔

اب دوسرے سال کا ربیع الاول آیا۔ یعنی ہجرت کا پہلا سال ختم ہوا تو اسی مہینہ میں کرز بن جابر فہری کا واقعہ پیش آ گیا جس کا ذکر پہلے گذر چکا۔ وہ مکہ سے سیدھا مدینہ پہونچا۔ چراگاہ پر حملہ کیا اور وہاں سے اونٹ ہنکا کر لے گیا۔ اس کا تعاقب بھی کیا گیا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بچ کر نکل گیا۔

اسی ربیع الاول کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ابواء تک گئے جو ودان سے چھ یا آٹھ (۲۴۵) میل کے فاصلہ پر ہے اور جہاں آپ کی والدہ کا مزار ہے۔ ابواء کا صدر مقام فرع تھا جو ایک وسیع قصبہ تھا جو مدینہ سے تقریباً اسی میل کے فاصلہ پر تھا۔ ان کے اطراف میں قبیلہ بنو حمزہ آباد تھا۔ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز قیام کر کے بنو حمزہ سے معاہدہ کیا جس کا سردار مجدی بن عمرو (۲۴۶) ضمری تھا (۲۴۷)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہیں تشریف فرما تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجارتی قافلہ کا علم ہوا۔ آپ نے ساٹھ مہاجرین کا ایک دستہ اس کے تعاقب کے لیے بھیجا۔ عبیدہ بن حارث اس دستہ کے امیر تھے۔ اس دستہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اس دستہ کی کچھ مڈبھیڑ تجارتی قافلہ سے ہوئی۔ دونوں طرف سے تیراندازی ہوئی (۲۴۸) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اسی موقع کی یہ بات فرما رہے ہیں کہ وہ سب سے پہلے عرب ہیں جس نے راہ خدا میں تیر پھینکا۔

جہاد فی سبیل اللہ میں ایک مسلمان کے ہاتھ سے سب سے پہلا قتل

تقریباً دو ماہ بعد جمادی الاخری ۲ھ میں (واقعہ بدر سے دو ماہ پہلے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ مجاہدین کا ایک دستہ اپنے پھوپی زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ کیا اس قافلہ میں آٹھ مہاجر تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص بھی اس دستہ میں شامل تھے۔ ان بارہ آدمیوں کے پاس صرف ایک اُونٹ تھا اس پر نمبروار سوار ہو جایا کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر سریہ حضرت عبداللہ کو ایک بند تحریر دی اور فرمایا بسم اللہ کہو اور روانہ ہو جاؤ اور جب دو دن سفر کر چکو تب اس کو کھول کر پڑھنا اپنے ساتھیوں کو بھی سنا دینا۔ پھر اس تحریر میں جو ہدایت دی گئی ہے اس پر عمل کرنا اور جو ساتھی آگے نہ جانا چاہے اس پر جبر نہ کرنا۔

دو دن سفر کر چکنے کے بعد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نامہ گرامی کھولا تو اس میں تحریر تھا (۲۴۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم — اما بعد فسر علی برکۃ اللہ بمن تبعک من اصحابک تتنزل

بطن نخلة فترصد بها عير قريش لعلك تاتينا منه بخبر

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ تعالیٰ کی برکت آپ کو نصیب ہو۔ آپ اور آپ کے جو ساتھی آپ کے ساتھ چلیں ان کو ساتھ لے کر آپ روانہ ہوں یہاں تک کہ آپ بطن نخلہ پہنچ کر قیام کریں وہاں قریش کے قافلہ کو جو غلہ لے جارہا ہوگا اس کی تاک رکھیں توقع ہے کہ اس کی کوئی خبر لے کر آپ ہمارے پاس آئیں گے۔''

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے تحریر پڑھتے ہی کہا۔ سمعا وطاعة (جو حکم ہے اس کی پوری پوری تعمیل ہوگی) پھر اپنے ساتھیوں کو سنایا اور فرمایا۔ جو شہادت چاہتا ہے میرے ساتھ چلے اور جو اس کے لیے تیار نہ ہو واپس ہو جائے کسی پر جبر نہیں ہے اور مجھے ہدایت بھی یہی ہے کہ میں کسی کو مجبور نہ کروں۔ لیکن بارہ نفوس میں سے کوئی ایک بھی واپس ہونے کو تیار نہیں ہوا۔ اب حضرت عبداللہ اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے بڑھے لیکن جب حجاز کے بالائی علاقہ میں فرع کے اوپر ایک معدن کے قریب اس جگہ پہنچے جس کو نجران کہا جاتا تھا۔ وہاں اتفاق سے اونٹ گم ہو گیا۔ یہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہما کا اونٹ تھا۔ یہ دونوں اونٹ کی تلاش میں پیچھے رہ گئے۔ باقی حضرات چلتے رہے اور بطن نخلہ پہنچ گئے اور حسب ہدایت یہاں قیام کر کے قریش کے قافلہ کا انتظار کرنے لگے۔ ان حضرات کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا قریش کا ایک قافلہ جو کشمش اور کچی کھال وغیرہ تجارتی مال لیے ہوئے تھا سامنے آ گیا عمرو بن (۲۵۱) حضرمی، حکیم بن کیسان، عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی اور نوفل بن عبداللہ مخزومی اس قافلہ کے ممتاز ارکان تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سر بمہر تحریر عنایت فرمائی تھی اس میں خبر لانے اور حالات معلوم کرنے کی ہدایت تھی۔ حملہ کے متعلق کوئی ہدایت نہیں تھی۔ البتہ جس اہتمام سے اس دستہ کو بھیجا گیا اور جس اہمیت اور راز داری کے ساتھ امیر دستہ حضرت عبداللہ بن جحش کو یہ تحریر دی گئی اس سے قیاس بہت کچھ کیا جا سکتا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی تیر اندازی کا واقعہ اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ ان کے تیر مارنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تھا اور اگرچہ ابھی تک حکم قتال نہیں ہوا تھا۔ مگر اذن قتال کی آیت۔ (اذن للذين يقاتلون) یقیناً اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ امیر دستہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ان سب باتوں سے یہی سمجھا کہ موقع ملے تو ان کو اقدام کی اجازت ہے۔ چنانچہ اس قافلہ پر تیر اندازی کی گئی۔ اتفاق کی بات ایک مجاہد (واقد بن عبداللہ سہمی) کا تیر عمر حضرمی کے لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا جس سے قافلہ کے پیر اکھڑ گئے۔ مجاہدین فوراً آگے بڑھے اور انہوں گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور حکم بن کیسان گرفتار ہوئے اور باقی بھاگ گئے۔ یہ مجاہد دستہ۔ قافلہ کا تمام سامان اور ان دونوں قیدیوں کو لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ اب صرف یہ بات نہیں تھی کہ اسلام کی تقریباً پندرہ سالہ تاریخ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے غیر مسلم کا قتل پہلا واقعہ تھا بلکہ یہ بھی پہلا موقع تھا کہ اس طرح گرفتار شدہ قیدی اور ضبط شدہ مال سامنے آیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توقع کے خلاف تھا۔ چنانچہ دفعۃً

زبان مبارک سے یہی صادر ہوا۔ ما امرتکم بقتال (یہ کیا؟) میں نے تو تمہیں لڑنے کو نہیں کہا تھا۔
حضرمی کے قتل کے نتائج کیا ہوں گے۔ ایک دوراندیش کے لیے یہ مسئلہ بھی غور طلب تھا۔ مگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جن کا ہر فیصلہ قانون ہوتا ہے۔ آپ کے لیے غور طلب یہ تھا کہ ضبط شدہ مال کا کیا کیا جائے اور قیدیوں کو کیا حکم دیا جائے۔

چنانچہ اسی روایت کا ایک جز یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے جب یہ ضبط کردہ مال بارگاہ رسالت میں پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں فرمایا۔ حتی کہ کچھ عرصہ بعد جب جنگ بدر کی غنیمت کے متعلق احکام نازل ہوئے تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو بھی انہیں احکام کے بموجب تقسیم فرمایا۔

فدیہ ادا کر کے قیدیوں کو چھڑا لینے کا طریقہ عرب میں پہلے سے رائج تھا۔ اسی رواج کے مطابق قریش نے فدیہ دے کر اپنے قیدیوں کو رہا کرانا چاہا۔ مگر چونکہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ بن غزوان جو اونٹ کی تلاش میں اس دستہ سے بچھڑ گئے تھے ابھی واپس نہ ہوئے تھے اور خطرہ تھا کہ شاید قریش کے شکنجہ میں پھنس گئے ہوں۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی واپسی سے پہلے ان قیدیوں کے بارے میں گفتگو مناسب نہیں سمجھی۔ جب یہ دونوں مجاہد بخیریت واپس آ گئے تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ منظور فرما کر ان دونوں کو رہا کر دیا۔ چالیس اوقیہ یعنی چار سو اسی درہم ہر ایک اسیر کا فدیہ لیا گیا۔ عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ تو رہا ہو کر مکہ چلا گیا۔ پھر حالت کفر ہی میں اس کا انتقال ہوا۔ مگر حضرت حکیم بن کیسان کچھ ایسے گرفتار ہوئے تھے کہ پھر رہائی پسند ہی نہیں کی۔ پہلے سیاسی اسیر تھے پھر کاکل رسالت کے خودساختہ اسیر ہو کر مدینہ ہی میں رہنے لگے۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

بہت جلد آپ کا شمار ان صحابہ میں ہونے لگا جو تعلیم و تبلیغ کے لیے باہر بھیجے جاتے تھے۔ آپ کی سعادت نے اور آگے قدم بڑھایا۔ ابو عامر بن مالک کی تحریک پر جو حضرات قراء نجد کے علاقہ میں تعلیم و تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تھے آپ بھی ان میں منتخب کیے گئے۔ ان داعیان حق نے چند منزلیں طے کی تھیں کہ بیر معونہ کے قریب سب کو شہید کر دیا گیا۔ سب کے ساتھ آپ نے بھی جام شہادت نوش فرمایا اور ابدی سعادت سے ہم کنار ہو گئے۔ [۲۵۲] (رضی اللہ عنہم اجمعین)

موفقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (سورہ عنکبوت ع ۷)

''جولوگ ہماری راہ میں محنت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھا دیں گے اور بے
شک اللہ تعالیٰ اچھے کردار والوں کے ساتھ ہے۔''

اس کی بہترین مثال (کہ راہ خدا میں محنت کرنے والوں کو اللہ کی طرف سے رہنمائی اور ہدایت میسر آتی ہے) وہ عمل یا وہ مشورے جو صحابہ کرام نے موقع بموقع پیش کیے اور وحی خداوندی نے ان کی تصدیق فرمائی۔ ان کو موافقات صحابہ (۲۵۳) کہا جاتا ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی سیرت مبارکہ میں اس کی مثالیں تقریباً بیس ہیں۔ مثلاً حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ازواج مطہرات پردہ میں رہا کریں۔ ابھی یہ مشورہ زیرِ غور تھا کہ آیت حجاب نازل ہوگئی۔

اسی طرح کی مثال حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام بھی ہے۔ قریش کے قافلہ پر حملہ کا حکم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا تھا۔ یہ خود حضرت عبداللہ بن جحش کا ایک فیصلہ تھا۔ آپ کے خیال میں وقت آ گیا تھا کہ قریش کی دراز دستی پر ایک ضرب لگائی جائے۔

ایک عجیب اتفاق یہ بھی ہوا کہ یہ ماہ جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ تھی۔ اگلے روز رجب کا مہینہ شروع ہونے والا تھا جو عرب کے آئین اور دستور کے بموجب ایسا مہینہ تھا جس میں جنگ و جدال کو حرام سمجھتے تھے ان حضرات نے اس امن پسندانہ دستور کی خلاف ورزی نہیں کی۔ خود حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے دربار رسالت میں یہ بیان دیا تھا۔

انا قتلنا ابن الحضرمی ثم امسینا فنظرنا الی هلال رجب فلاندری فی رجب اصبناه ام فی الجمادی (معالم التنزیل ص ۹۳)

''ہم ابن حضرمی کو قتل کر چکے پھر جب شام ہوئی تو ہم نے رجب کا چاند دیکھا۔ اب نہیں معلوم کہ ہم نے اس کو رجب میں قتل کیا یا جمادی الاخریٰ میں۔''

بلاشبہ ان حضرات نے اپنے علم اور اپنی دانست کے بموجب ماہ رجب کا پورا احترام کیا۔ ان کو یہی معلوم تھا کہ یہ جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ ہے ابھی رجب کا چاند نہیں ہوا۔ مگر قریش جو بہانہ کی تلاش میں رہتے تھے ان کو پروپیگنڈے کا اچھا موقع مل گیا۔ وہ مسلمانوں کو صابی کہا کرتے تھے۔ (بے دین) اب تک بے دینی یہ تھی کہ ان کے دیوتاؤں کے سامنے مسلمانوں کی گردنیں خم نہیں ہوتی تھیں۔ اب اس میں اشہر حرم کی بے حرمتی کا بھی اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو یہی طعنہ دیا گیا:

یا معشر الصباة استحللتم الشهر الحرام وقاتلتم فیه

بے دین لوگو! تم نے شہر حرام کی توہین کی اس مقدس مہینہ میں تم نے جنگ کی۔

اب حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے رفقاء مجاہدین (رضی اللہ عنہم) کے نازک احساسات کے لیے بہت سخت ابتلاء اور آزمائش کا وقت تھا۔

دشمنانِ اسلام کا اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے رفقاء کرام رضی اللہ عنہم کو شدید احساس اس بات کا تھا کہ اس وقت ان کے ایک اقدام کی وجہ سے مخالفین کو یہ موقع ملا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کے احساسات اس سے بھی زیادہ نازک تھے۔ وہ محبوب و مقدس رہنما اور رہبر جس کے لیے انہوں نے سب کچھ قربان کر رکھا تھا۔ ان کا کوئی فعل اس محبوب آقا کے لیے بارِ خاطر ہو یا ان کے عمل سے طبع مبارک غبار آلود ہو۔ ایک صحابی کے لیے اس سے زیادہ صدمہ اور ندامت کی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن جحش کا یہ جرأت مندانہ اقدام اس محبوب آقا کی پسندیدگی بھی نہیں حاصل کر سکا تھا۔ اب اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان مجاہدین کو کس قدر تشویش ندامت اور روحانی کوفت ہوگی۔

حضرت جندب بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان کے الفاظ یہ ہیں:

فعظم ذلك على اصحاب السريه وظنوا انهم قد هلكوا وسقط في ايديهم وعنفهم اخوانهم المسلمون فيما صنعوا (۲۵۵،۲۵۴)

''اصحاب سریہ کو اس کا سخت احساس ہوا۔ وہ سمجھنے لگے کہ ہم برباد ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مسلمانوں نے بھی ان کے اس فعل پر ملامت کی۔''

مگر ان نادم اور شرمساروں کی خوش نصیبی پر جتنا رشک کیا جائے کم ہے۔ ان کی شرمساری نہ صرف ان کے لیے بلکہ تمام ہی مسلمانوں کے لیے مشکل کشا بن گئی۔ خاص اس معاملہ کے متعلق چند آیتیں نازل ہوئیں جن میں ہمیشہ کے لیے ماہ حرام اور ماہ حرام کے احکام بیان فرما دیئے گئے۔ قریش اشہر حرام کی حرمت کا واسطہ دے کر پروپیگنڈہ کر رہے تھے۔ وحی الٰہی نے اشہر حرام کی حرمت کو ایک حد تک تسلیم کرتے ہوئے یہ رہنمائی فرمائی کہ لکیر کا فقیر بنے رہنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ سب سے اہم اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ فتنہ ختم ہو۔ اگر فتنہ کو ختم کرنے کے لیے اشہر حرام کی حرمت کو بھی قربان کرنا پڑے تو یہ قربانی درست اور صحیح ہوگی۔ وحی الٰہی نے یہ بھی واضح کر دیا کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو پہل نہیں کہا جا سکتا۔ جنگ کی پہل عبداللہ بن جحش نے نہیں کی۔ بلکہ پہل ان کی طرف سے ہو چکی ہے جن کی یہ مسلسل کوشش سالہا سال سے چلی آ رہی ہے اور آئندہ بھی یہ کوشش رہے گی کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کر دیں۔ وحی ربانی کے الفاظ یہ ہیں:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَّصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ (سورہ بقرہ ع ۲۷)

''آپ سے لوگ پوچھتے ہیں جو مہینہ حرمت کا مہینہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں لڑائی لڑنا کیسا

ہے؟ آپ کہہ دیجیے اس میں لڑائی لڑنا بڑی برائی کی بات ہے (مگر یہ بھی سمجھ لو) اللہ کے راستے سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام کی راہ بند کر دینا (وہاں نہ جانے دینا) نیز حرم (مکہ) کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برائی ہے اور فتنہ (اہل مکہ جس کے علمبردار ہیں) قتل سے بڑھ کر ہے (واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال محض پروپیگنڈہ ہے ورنہ اصل یہ ہے کہ ان کو تمہارا ایمان و اسلام برداشت نہیں چنانچہ) یہ لوگ تم سے برابر لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر بن پڑے تو تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں اور (دیکھو) تم میں سے جو شخص اپنے دین سے برگشتہ ہو جائے گا اور (اسی حالت پر) برگشتگی میں دنیا سے جائے گا۔ تو (یاد رکھو) اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی گروہ ہے۔ ہمیشہ عذاب میں رہنے والا۔''

رحمت خداوندی کی بشارت:

مذکورہ بالا آیتوں میں چند ضابطے بیان فرما دیئے گئے۔ مگر سوال باقی رہا کہ یہ مجاہدین سرفروش کفن بردوش جو دین حق کی حمایت ہادی برحق کی اطاعت، اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے رحم و کرم کی دولت حاصل کرنے کے شوق میں جان کی بازی لگا چکے ہیں اور یہی لگن تھی جس نے ان کو ایک سر بند مکتوب لیے ہوئے بلا سر و سامان اپنے گھروں سے نکالا اور تقریباً تین سو میل کے فاصلہ پر پہنچایا جہاں انہوں نے یہ سرفروشانہ کھیل کھیلا۔ ان کے اس اقدام کے متعلق وحی الٰہی کا فیصلہ کیا ہے۔ کیا انہیں (۲۵۶) حق ہے کہ وہ رضاء الٰہی کے متوقع اور رحمت خداوندی کے امیدوار رہیں تو بعد کی آیت نے اس کی وضاحت فرما دی۔ یعنی رحمت الٰہی کی بشارت دیدی۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورہ بقرہ ع ۲۷)

''بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے وطن سے بے وطن ہونے کی مصیبتیں برداشت کیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ تو بلاشبہ یہی وہ لوگ ہیں (جو بجا طور پر) اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمتوں سے نوازنے والا ہے۔''(۲۵۷)

تفصیلات غزوۂ بدر آیات کتاب اللہ کی روشنی میں

رمضان شریف ۱ھ۔ فروی ۶۲۳ھ

مرکز سے روانگی:

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ

(سورہ انفال ع ۱)

''(یہ ایسے ہی ہے جیسے) تیرے پروردگار نے باہر نکالا تجھ کو تیرے گھر سے سچی حقیقت ساتھ لیے ہوئے اور یہ واقعہ ہے کہ مومنوں کا ایک گروہ اس بات سے ناخوش تھا۔''

یہ کتاب اللہ کی آیتیں ہیں۔ کتاب اللہ کا مطمح نظر سب سے پہلے قلب مومن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر کا ذکر آیا تو سب سے پہلے اہل ایمان کی قلبی کیفیت پر روشنی ڈالی کہ:

یہ کوئی جنگجو انقلابی یا پیشہ ور فوجی نہیں تھے نہ ان کو اقتدار کی ہوس اور نمائش کا شوق تھا کہ فوجی مظاہرہ سے ان کو خوشی ہوتی اور وہ لڑائی بھڑائی اور کشت وخون کو پسند کرتے۔ یہ نہایت امن پسند صلح جو صاحب ایمان تھے اور مومن کی وہ خصوصیات جو پہلی آیت میں بیان کی گئی ہیں ان میں مکمل طور پر پائی جاتی تھیں۔ وہ خصوصیات یہ ہیں۔

> ''جب[(۲۵۹)] اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کی ایمانی قوت میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ دے رکھا ہے۔ اس میں سے (حسب ہدایت خداوندی) خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اسی امن پسندی اور صلح جوئی کا یہ اثر تھا کہ ایک گروہ کو یہ سفر ایسا ناگوار تھا جیسے کسی کو زبردستی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہو اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔''

قریش کی روانگی:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا (الی قولہ) وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ (سورہ انفال ع ۶)

دوسری جانب کفار قریش کی حالت تھی۔ جس کے تذکرہ سے پہلے ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمادی گئی:

لاتکونوا (تم ایسے مت ہو جانا) (قریش کی حالت یہ تھی) (یہ) اپنے گھروں سے نکلے اتراتے ہوئے۔ لوگوں کی نظر میں نمائش کرتے ہوئے اس حال میں کہ اللہ کے راستہ سے روک رہے تھے (اور جو کچھ بھی یہ لوگ

کرتے ہیں اللہ تعالیٰ (اپنے علم وقدرت سے) اس پر چھایا ہوا ہے اور جب ایسا ہوا کہ شیطان نے ان کے عمل ان کی نگاہوں میں خوشنما کر کے دکھادئے تھے اور کہا تھا آج ان لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں۔

محرکات اور اسباب:

ابوجہل اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی سخت کلامی کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے کہ حضرت سعد بن معاذ عمرہ کے لیے مکہ معظمہ گئے اور حسب دستور سابق اپنے دوست امیہ بن خلف کے یہاں قیام کیا پھر جب عمرہ کر رہے تھے تو ابوجہل کی نظران پر پڑ گئی تو بڑی ناگواری اور ترشی سے کہا تھا کہ:

''تم امیہ کی پناہ میں نہ ہوتے تو یہاں سے زندہ نہیں جا سکتے تھے۔ تم لوگوں نے بے دینوں (مسلمانوں) کو اپنے یہاں ٹھہرالیا ہے''

اس کے جواب میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بھی اتنی ہی ترشی سے کہا تھا کہ:

''تم حرم مکہ کے دروازے ہم پر بند کرتے ہو تو ہم تمہاری شام کی تجارت بند کر دیں گے۔'' (بخاری شریف کتاب المغازی)

تطہیر کعبہ کا بنیادی سوال پہلے سے وارث خلیل اللہ (حبیب خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے تھا۔ زعیم وقائد قریش ابوجہل کی اس دھمکی کے بعد ایک نیا سوال انصار مدینہ کے سامنے آ گیا کہ وہ جب تک قریش کے کسی سردار کی پناہ میں نہ ہوں حرم کعبہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ورنہ وہ زندہ واپس نہیں جاسکیں گے۔

عربی یا قریشی ہونے کے رشتہ سے مسلمانوں کا جو تعلق خانہ کعبہ اور حرم شریف کے ساتھ تھا اسلام نے اس کو کم نہیں کیا تھا بلکہ اور پختہ کر دیا تھا اور تقریباً انہیں ایام میں کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے دستہ کا واقعہ پیش آیا تھا (کہ ان کے ایک رفیق واقد بن عبداللہ سہمی کے تیر سے عمرو بن حضرمی مارا گیا تھا) تقریباً یہی دن تھے جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تھا۔ یعنی وحی خداوندی نے حتمی اور آخری طور پر طے کر دیا تھا کہ مسلمانوں کا قبلہ کعبہ ہو گا۔ عرش معلیٰ کے اس جدید فرمان نے مسلمانوں کا رشتہ خانہ کعبہ کے ساتھ اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔

تہذیب وتمدن اور قانون ودستور کی دعویدار موجودہ دنیا میں کسی مطالبہ کے تسلیم کرنے کا پرامن اور معتدل ذریعہ اقتصادی ناکہ بندی ہے۔ صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے اس ذریعہ کو استعمال کیا۔ چنانچہ تجارتی قافلوں کے تعاقب میں جو دستے روانہ ہونے شروع ہوئے تو ان کا منشاء (۲۶۰) صرف یہ تھا کہ قریش متاثر ہوں اور مکہ میں داخلہ بے خطر ہو سکے جیسا کہ ہمیشہ ہمیشہ سے دستور رہا ہے۔

لیکن قریش! جنہوں نے اہل مدینہ کو پہلے ہی یہ حکم دیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کرو ورنہ اس کو اپنے یہاں سے نکال دو۔ وہ مسلمانوں کی یہ شوخ چشمی اور یہ جسارت کب برداشت کر سکتے تھے۔

اور جب اہل مدینہ نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی تھی تو اسی تحریر کی بنا پر قریش پر یہ لازم ہوتا تھا کہ مدینہ پہنچ کر جوانوں کو قتل کریں اور عورتوں کو باندیاں بنائیں۔ یعنی وقار کا سوال بھی پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کرتے تو سرزمین عرب میں قریش کی تسلیم شدہ عظمت وقیادت خطرہ میں پڑ گئی تھی۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچتے ہی اپنی پیغمبرانہ شان کے ساتھ جو سیاسی تدبیر اختیار کی تھی کہ ایسے اصول پر (جن کو آج کل کی زبان میں بقاء باہم کے اصول کہا جا سکتا ہے) معاہدات کا جال پھیلا کر ظاہر بینوں کے لیے مادی اسباب میں بھی ایک طاقت بنا لی تھی۔ اس نے قریش کو مجبور کر دیا تھا کہ اگر وہ مدینہ کا رخ کریں تو پہلے اپنی تیاری مکمل کر لیں۔

تیاری کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس تاجر قوم نے چندہ کرنے کے بجائے تجارت کے ذریعہ فراہمی سرمایہ کا منصوبہ بنایا۔

تجارت کے نام پر قریش کے ایک ایک فرد سے حتیٰ کہ عورتوں سے بھی جو تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں۔ رقم (۲۶۱) لی گئی۔ ادھر یہ جذبہ تھا کہ تھوڑی سے تھوڑی رقم بھی جس کے پاس تھی وہ اس نے دے (۲۶۲) دی۔ مجموعی رقم پچاس ہزار دینار (۲۶۳) بیان کی گئی ہے۔

ہر ایک قافلہ کا نمائندہ قافلہ میں شریک ہوا۔ اس طرح صرف سربراہوں (۲۶۴) کی تعداد چالیس اور ایک روایت کے بموجب (۲۶۵) ستر تھی۔

ابوسفیان کو قافلہ کا امیر ورئیس بنایا گیا۔ اس تیاری کے ساتھ یہ قومی قافلہ روانہ ہوا، اسکیم کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ جب تک باقاعدہ جنگ کی تیاری ہو مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی جائے اور ان کو اطمینان کا موقع نہ دیا جائے۔ کرز بن جابر فہری کا چراگاہ مدینہ پر شبخون مارنا اسی کی تمہید تھا جو تقریباً اسی زمانہ میں ہوا تھا جب یہ قافلہ مکہ سے روانہ ہو رہا تھا۔

قافلہ کی یہ روانگی اس کی یہ شان وشوکت اور اس کا مقصد کوئی سربستہ راز نہیں تھا۔ اس کی خبریں مدینہ میں پہنچ رہی تھیں اور قدرتی طور پر خوف وہراس پھیلا رہی تھیں۔ مگر کیا کوئی تدبر اجازت دے سکتا تھا کہ اس قافلہ کو اپنے منصوبہ میں کامیاب ہونے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے اور کوئی رکاوٹ اس کے راستہ میں نہ ڈالی جائے۔

ممکن ہے امن اور عدم تشدد کے نمائشی دعوے دار اس قافلہ کی کامیابی کو پسند کریں۔ مگر کوئی باہمت قوم گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی تباہی اور بربادی کا انتظام کیا جائے اور وہ دم بخود تماشہ دیکھتی رہے خصوصاً ایسی صورت میں کہ ان قبائل کی ذمہ داری بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو جو بقاء باہمی کے معاہدات میں آپ کے شریک ہو چکے تھے۔

باشندگان مدینہ کی کافی تعداد ابھی مسلمان ہوئی تھی۔ مگر جب انہوں نے قریش کی ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا تو قریش کی نظر میں وہ بھی مجرم تھی۔ قریش اگر مدینہ پر حملہ کرتے تو حملہ کا نشانہ وہ بھی ہوتے کیونکہ قریش نے ان

کو لکھا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہیں نکالو گے تو ہم مدینہ پہنچ کر تمہارے جوانوں کو موت کے گھاٹ اتاریں گے وغیرہ وغیرہ۔

مختصر یہ کہ سوال صرف مسلمانوں کا نہیں تھا بلکہ تمام اہل مدینہ اور ان سب کا تھا جو معاہدات میں شریک ہوئے تھے۔ کیا کسی بھی باہمت و باحوصلہ قائد کے لیے جائز ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے حلیف اور معاہد شہریوں کی حفاظت کا انتظام نہ کرے اور حفظ ماتقدم کے لیے قربانی پیش کرنے کی ضرورت ہو تو وہ امن اور آشتی کے نام پر جاں فشانی سے پہلوتہی کرے۔

بزدلانہ مکروفریب، دھوکا اور دغابازی کسی وقت بھی درست نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور ارشاد اَلْحَرْبُ خَدْعَۃٌ کا ترجمہ ہم یہ نہیں کرتے کہ جنگ مکر اور دھوکہ کا نام ہے البتہ جنگی تدبیر، مقابلہ کی چالیں، لڑائی کے پینترے یقیناً وہ قابل قدر خوبیاں ہیں جو بہادر جرنیل کے کمالات میں شمار کی جاتی ہیں اور یہی اَلْحَرْبُ خَدْعَۃٌ کا مقصود ہیں۔ وہ چیلنج جو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ میں ابو جہل کو دے آئے تھے کہ ہم تمہاری تجارت کا راستہ بند کر دیں گے۔ اس چیلنج کو کامیاب کرنے کا سب سے اہم اور سب سے زیادہ نازک وقت (۲۶۶) یہ تھا۔

لہٰذا نہایت بروقت، برمحل اور بجا طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قصد فرمایا کہ اس قافلہ کا راستہ روکا جائے (۲۶۷) غالباً اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خواب بھی دیکھا تھا۔ جس کی تعبیر یہ ظاہر ہوئی کہ دو ٹولیوں (جماعتوں) میں سے ایک پر آپ کو کامیابی حاصل ہوئی جس کا اشارہ قرآن پاک (۲۶۸) میں بھی ہے۔

تجسس:

تجارتی قافلہ کی روانگی شام سے کب ہوئی اور کس طرف سے گذر رہا ہے اس کا صحیح علم نہیں تھا۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ قافلہ راستہ بدل دے اور مدینہ کے قریب سے گذرنے کے بجائے اس شاہراہ سے گذرے جو ساحل سمندر کو چھوتی ہوئی ینبع کے قریب سے (۲۶۹) بدر کی جانب مڑتی ہے۔ بدر وہ مقام (جنکشن) تھا جہاں سے مدینہ منورہ کو بھی راستہ جاتا تھا اور مکہ معظمہ کو بھی لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طرف آدمی روانہ کر دیئے۔

حضرت بسبس بن عمرو جہنی کو بدر کی جانب اس راستہ پر بھیجا جو مدینہ سے مکہ معظمہ کو جاتا تھا۔ (۲۷۰) اسی طرف ان کا قبیلہ (جھینہ) آباد تھا۔ اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہما کو شام کی جانب روانہ کیا۔

یہ دونوں صاحب شام (۲۷۱) کی طرف یعنی مدینہ منورہ سے شمال کی جانب روانہ ہوئے اور جب اس طرف پتہ نہیں چلا تو اس راستہ کی طرف مڑ گئے جو ساحل سمندر سے گذرتا تھا۔

ابن سعد کی روایت (۲۷۲) یہ ہے کہ جب یہ دونوں حضرات تجبار پہنچے جو حوراء (۲۷۳) کے علاقہ میں ہے تو

قافلہ کی آمد آمد تھی۔

کشد جہنی اس علاقہ کا شیخ اور رئیس تھا۔ قبیلہ جھینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف تھا۔ یہ حضرات کشد جہنی کے یہاں جا کر مقیم ہوئے، کشد کو ان کے متعلق خطرہ محسوس ہوا تو اس نے ان کو محفوظ مقام پر پہونچا دیا اور جب قافلہ گذر گیا تو ان کو تنہا رخصت کر دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ذوالمروہ (۲۷۴) تک ان کو پہنچانے کے لیے خود آیا۔ (۲۷۵)

ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ حضرات دس دن تک حوراء میں مقیم رہے۔ (۲۷۶) حوراء ینبع سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر تھا۔ (۲۷۷)

روانگی:

دس دن گذر (۲۷۸) گئے۔ یہ حضرات مدینہ طیبہ واپس نہیں پہنچ سکے۔ (۲۷۹) البتہ بسبس بن عمرو جن کو دوسرے راستہ پر بھیجا تھا وہ واپس آ گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت بسبس واپس پہنچے تو تخلیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی مافی البیت احد غیری و غیر النبی صلے اللہ علیہ وسلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے سوا بیت میں کوئی نہیں تھا۔ (۲۸۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ہی (۲۸۱) اعلان فرما دیا کہ ہمیں بطور دوش روانہ ہونا ہے۔ لہٰذا جن کی سواریاں یہاں موجود ہوں وہ ہمارے ساتھ چلیں۔

انصار مدینہ دولت مند نہیں تھے۔ مگر اتنے مفلس اور تہی دست بھی نہیں تھے کہ سواری کے پورے اونٹ بھی ان کے پاس نہ ہوں۔ مگر وہ اپنے مویشی مدینہ سے باہر چراگاہوں میں رکھتے تھے جو آٹھ میل (۲۸۲) تک پھیلی ہوئی تھیں ان حضرات نے اتنی مہلت چاہی کہ وہ اپنے اونٹ لے آئیں مگر اس کی اجازت نہیں ملی۔ (۲۸۳)

بلاشبہ صحابہ کرام کو پوری امت میں سب سے زیادہ قوی ایمان عطا ہوا تھا اور وہ فراست عطا ہوئی تھی جس سے ایک مومن نور خدا کی عینک سے مستقبل کو دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن یہ ذکاوت و فراست یقیناً فراست نبوی کے ہم پلہ نہیں تھی۔ چنانچہ یہ دفعتاً روانگی کچھ حضرات کو ناگوار ہوئی اور قافلہ کی جوش ان و شوکت ان کے کانوں میں پڑ رہی تھی وہ اس سے خائف بھی تھے۔ اسی ذہنیت کا نقشہ قرآن حکیم میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقاً مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكَارِهُوْنَ

''جیسے تیرے پروردگار نے باہر نکالا تجھ کو تیرے گھر سے سچی حقیقت اور صحیح بنیاد پر حالانکہ اہل ایمان کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کر رہا تھا۔ (اس سے ناخوش تھا)''

سمت:

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے تخلیہ کی گفتگو کا تذکرہ نہیں کیا۔ غالباً یہ سن بھی نہیں سکے تھے لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی طرف کوچ نہیں فرمایا (۲۸۴) بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانب کا قصد فرمایا جہاں سے یہ تجارتی قافلہ اب گذرنے والا تھا (۲۸۵)۔ یہ بدر کے قریب کا راستہ تھا جو ساحل سمندر تک پہنچتا ہے۔ یعنی اس راستہ سے ملتا ہے جو ابوسفیان نے اب اختیار کیا تھا جو ینبع سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر حوراء کے مقام سے گذرتا تھا۔ جہاں حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید پہنچے تھے مگر واپس نہ ہو سکے تھے۔ دوسرے صفحہ پر ایک خاکہ دیا گیا ہے اس سے راستوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

جائزہ اور ضروری انتظامات:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ مدینہ سے باہر آ کر کچھ قیام فرمایا کرتے تھے۔ وہاں آپ رفقاء کا جائزہ لیتے، ضروری انتظامات فرماتے، اس کے بعد آگے بڑھتے تھے۔ اس مرتبہ بیر ابی عتبہ پر جو مدینہ سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا (۲۸۶)۔ منزل ابھی معین نہیں تھی کہ کہاں پہنچنا ہوگا۔ نتیجہ سفر کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ البتہ یہ ظاہر تھا کہ اب تک جتنے سفر ہوئے ان سب میں اس سفر کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ (۲۸۷)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ اونٹوں کو پانی پلا دیا جائے۔ پکھالوں میں پانی بھر لیا جائے اور حضرت قیس بن صعصعہ رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ کنوئیں پر کھڑے ہو جائیں اور رفقاء سفر کو شمار کرتے رہیں۔ حضرت قیس نے تمام رفقاء سفر کو شمار کر کے بارگاہ رسالت میں رپورٹ پیش کی کل تعداد تین (۲۸۸) سو تیرہ ہے۔ پھر سواریاں شمار کرائی گئیں تو ان تین سو تیرہ کے پاس کل ستر اونٹ تھے۔ گھوڑے کل دو۔ ایک حضرت مقداد بن اسود کے پاس اور دوسرا حضرت زبیر بن العوام کے پاس۔ ابن سعد کی ایک روایت یہ ہے کہ ایک گھوڑا اور بھی تھا۔ یہ حضرت مرثد بن مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کا گھوڑا تھا۔

اگر اس موقع پر معلوم ہو جاتا کہ ابوسفیان کا قافلہ نکل چکا ہے اور قریش ایک لشکر لے کر مکہ سے روانہ ہو گئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ بدر تک تقریباً اسی میل کی مسافت طے کی جاتی بلکہ اس موقع پر پہلا سوال یہ ہوتا کہ غنیم کا مقابلہ مدینہ میں رہ کر کریں یا مدنیہ سے باہر نکل کر مورچہ بنائیں۔ اس کے علاوہ حضرات انصار کے جذبات (۲۸۹) فدائیت کب گوارا کرتے کہ صرف ایک تہائی کے قریب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جائیں اور باقی مدینہ میں آرام کرتے رہیں۔ حضرات انصار نے اس سفر میں بھی موقع بموقع افسوس کیا اور بعد میں بھی افسوس کرتے رہے کہ اگر اس وقت جنگ کا خیال ہوتا تو حضرات انصار کی بڑی تعداد شرف ہمرکابی سے محروم نہ رہ جاتی۔

ابن سعد کی تحقیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ وسلم ۱۲ رمضان شنبہ کے روز مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے اور جمعہ کے روز غزوہ بدر کا یہ واقعہ پیش آیا۔ یعنی چار یا پانچ روز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مسافت طے کی۔ جو عموماً آٹھ (۲۹۰) دس روز میں طے کی جاتی تھی۔ یہ تیز رفتاری، جستجو اور تعاقب کی صورت میں تو قرین قیاس ہے لیکن حملہ آور دشمن کے مقابلہ کے لیے پوری بے سروسامانی اور فاقہ کشی کے ساتھ دوڑ کر جانا اور پے در پے منزلیں طے کرنا کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے۔

بیشک ہندوستان کے ایک جلیل القدر مصنف اور محقق کا اصرار یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قریش ایک جمعیت عظیم لے کر مدینہ آ رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے دفاع کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے اور مدینہ ہی میں آپ کو معلوم ہو گیا کہ مقابلہ کاروان تجارت سے نہیں ہے بلکہ قریش سے ہے۔ لیکن انہیں مصنف کا یہ ارشاد اور اعتراف بھی ہے کہ ان کی یہ رائے (۲۹۱) عام مؤرخین اور ارباب سیر (اور جملہ مفسرین) کے خلاف ہے۔ لہٰذا ہمیں افسوس ہے کہ ہم وطن عزیز کے اس مایہ ناز جلیل القدر مصنف کی تقلید سے قاصر ہیں۔ ہمارا خیال یہی ہے کہ صحیح وہی ہے جو عام مؤرخین اور ارباب سیر کی تحقیق ہے۔

لڑکوں کو واپسی کی ہدایت:

ابن سعد کی روایت ہے کہ کچھ نوخیز اور نوعمر بھی ساتھ ہو لیے تھے۔ بیر ابی عتبہ پر رفقاء کا جائزہ لیا گیا تو ان کو ہدایت ہوئی کہ یہ مدینہ واپس ہو جائیں۔ ان نارسیدہ مجاہدین کے نام یہ ہیں۔

عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید، رافع بن خدیج، براء بن عازب، اسید بن حضیر، زید بن ارقم، زید بن ثابت عمیر بن ابی وقاص۔ ان سب کو حکم ہوا کہ واپس جائیں لیکن حضرت عمیر بن ابی وقاص نے یہ حکم سنا تو رو پڑے۔ سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ناز برداری فرمائی لیکن یہ ایک کشتہ ناز کی ناز برداری تھی۔ چنانچہ قربان گاہ بدر میں آپ نے جام شہادت نوش فرمایا اور صرف سولہ سال کی عمر میں طرہ امتیاز حاصل کر لیا جس کا نام ابدی کامیابی ہے۔

عَلَم:

اسلامی فوج یا دستہ کا کوئی خاص رنگ اور کوئی خاص نوعیت تو آخر تک متعین نہیں ہوئی۔ لیکن یہ طریقہ شروع سے رہا کہ جب بھی کوئی دستہ بھیجا گیا یا آپ خود کسی مہم میں تشریف لے گئے تو کوئی جھنڈا ضرور رکھا گیا۔ اس موقع پر بھی آپ نے سنت جاری فرمائی۔ دو سیاہ جھنڈے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رہتے تھے۔ ایک علم بردار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوتے تھے آپ کے پاس جو جھنڈا تھا اس کا نام عقاب تجویز ہوا۔ (۲۹۲) دوسرے علم بردار کوئی انصاری ہوتے تھے۔ ایک جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عطا ہوا تھا اس کا رنگ سفید تھا

اور ایک جھنڈا مستقل طور پر حضرات انصار کے لیے تجویز فرمایا تھا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اس کے علم بردار ہوتے تھے۔ (ابن اسحاق و بدایہ ونہایہ ص ۲۶۰ ج ۳)

سفر کی منزلیں اور ارشادات:

رفقاء سفر تین سو تیرہ تھے اور سواری کے اونٹ صرف ستر۔ رفقاء کے گروپ بنا دیئے گئے اور ایک ایک گروپ کو ایک ایک اونٹ دے دیا گیا سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی خوش نصیبی تھی کہ وہ فخر موجودات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمیل (۲۹۳) بنے۔ ان جاں نثاروں نے جن میں سے ایک سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ بھی تھے۔ درخواست منظور کی کہ حضرت اقدس سوار رہیں اور ہم جاں نثار خدام ساتھ چلیں گے۔ مگر یہ درخواست منظور نہیں ہوئی اور ارشاد ہوا:

ما انتم اقوى منى على المشي وما انا اغنى عن الاجر منكما (مسند احمد وطبقات ابن سعد)

نہ آپ میں مجھ سے زیادہ پیدل چلنے کی طاقت ہے اور نہ میں تم سے زیادہ ثواب سے بے نیاز ہوں (یعنی اجر و ثواب کی ضرورت جیسی آپ کو ہے مجھے بھی ہے)

رفقاء کی شکستہ حالی پر نظر پڑی تو زبان مبارک پر یہ دعا جاری ہوئی:

اللهم انهم حفاة فاحملهم وعراة فاكسهم وجياع فاشبعهم (ابن سعد غزوہ بدر)

''الہ العالمین یہ برہنہ پا ہیں ان کو سواری عطا فرما، یہ برہنہ بدن ہیں ان کو لباس عطا فرما، یہ تہی شکم ہیں ان کو سیر فرما۔''

ابن سعد نے وہ منزلیں بھی شمار کرائی ہیں جہاں جہاں اس تقدس ماب لشکر کا قیام ہوا۔ روحاء مدینہ طیبہ سے چھتیس (۲۹۴) میل کے فاصلہ پر ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں قیام فرمایا۔ پھر منصرف، ذات اجذال، معلات پر قیام ہوا۔ آخری منزل اثیل تھی جو بدر سے دو میل اس طرف تھی۔ مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت عبداللہ بن ام مکتوم کو امام بنا دیا تھا لیکن اب جب یہ طے ہو گیا کہ سفر طویل ہوگا اور کئی دن اس سفر میں لگ جائیں گے تو حضرت ابولبابہ کو نگراں اور حاکم بنایا اور ہدایت فرمائی کہ مدینہ واپس جائیں (۲۹۵)۔ عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی قبا وغیرہ) پر عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا (۲۹۶)

منجھلی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منسوب تھیں وہ سخت بیمار تھیں اسی لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس وقت ساتھ نہیں چل سکے تھے (۲۹۷)۔ یہاں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر ہدایت بھیجی کہ وہ مدینہ ہی میں قیام کریں اور اہلیہ کی تیمارداری کرتے رہیں۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ان کی مدد کے لیے مامور فرمایا۔ (۲۹۸) بسبس بن عمرو اور عدی بن ابی الرغباء جن کو پہلے بھیجا گیا تھا یہاں سے دو

بارہ (۲۹۹) بھیجا گیا کہ ابوسفیان کے قافلہ کا پتہ لگائیں۔

ابن سعد کی روایت ہے کہ:

انتهيا الى ماء بدر فعلما الخبر ورجعا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

''یہ دونوں صاحب بدر کے چشمہ پر پہنچے۔ وہاں ان کو ابوسفیان کی خبر معلوم ہوئی وہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس ہوئے۔''

لیکن ابن اسحاق (۳۰۱) نے اس خبر کی تفصیل بھی بیان کی ہے کہ:

یہ دونوں صاحب بدر پہنچ کر ایک ٹیلہ کے قریب ٹھیر گئے۔ پھر چشمہ پر گئے۔ مجدی بن عمرو جہنی یہاں کا نگراں اور شیخ تھا۔ وہ بھی چشمہ پر موجود تھا۔ وہاں دو باندیاں بھی پانی بھرنے آئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک مقروض تھی دوسری قرض خواہ جس کا قرض تھا وہ دوسری کو پکڑے ہوئے اس سے اپنے قرض کا مطالبہ کر رہی تھی۔ مقروض باندی نے اس کو اطمینان دلایا کہ کل پرسوں کو یہاں قریش کا تجارتی کاروان پہونچے گا۔ میں مزدوری کر کے کچھ جمع کرلوں گی۔ مجدی بن عمرو نے اسی شرط پر ان کا جھگڑا طے کرادیا۔

یہ باندیاں جھگڑ رہی تھیں اور حضرت بسبس اور حضرت عدی معلومات فراہم کر رہے تھے جھگڑا ختم ہوا تو ان دونوں بزرگوں نے بھی اونٹوں کو پانی پلایا اور مرکز رسالت کی طرف واپس ہو گئے۔ ان کی رپورٹ سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان ابھی بدر سے نہیں گذرا ہے لیکن اسی اثناء میں یہ خبریں بھی آنے لگیں کہ قریش لشکر جرار لے کر آ رہے ہیں۔ ایک نہایت نازک اور سنجیدہ صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک غیر مسلح جماعت جو قافلہ کو مرعوب کرنے کے لیے نکلی تھی ایک مسلح فوج کا خطرہ عظیم اس کے سامنے تھا۔ ایک قدرتی بات تھی کہ سرور کائنات ﷺ کو سخت تشویش ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ کوئی رائے قائم فرمائیں آپ نے مناسب سمجھا کہ رفقاء سفر سے تذکرہ فرما کر ان کا عندیہ معلوم فرمالیں۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہماری اس جماعت نے سفر شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اگلے یا دوسرے روز (۳۰۲) فرمایا۔

ہماری روانگی کا علم اہل مکہ کو ہو گیا ہے اگر وہ جنگ کے لیے آجائیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

حضرات صحابہ اس وقت تک جنگ کے لیے تیار نہیں تھے۔ کچھ حضرات نے یہی معذرت کی کہ ہمارے سامنے قافلہ کا معاملہ تھا۔ ہم جنگ کے لیے تیار ہو کر نہیں آئے۔

مالنا طاقة بقتال العدو ولكنا اردنا العير

لیکن یہ چند حضرات کی بات تھی۔ ایک دوسرا جذبہ بھی اس مقدس جماعت کے دلوں میں موجزن تھا جس کا ظہور حضرت مقداد بن الاسود کی زبان سے ہوا جو اس موقع پر پہنچ گئے تھے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت مقداد بن الاسود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا تو

عرض کیا:

لانقول کما قال قوم موسٰی۔ اذهب انت وربك فقاتلا۔ ولکن نقاتل عن یمینك وعن شمالك وبین یدیك وخلفك۔

''ہم وہ بات نہیں کہیں گے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہی تھی کہ آپ اور آپ کے خدا چلے جائیں اور جنگ کر لیں ہم تو آپ کی داہنے جانب بھی لڑیں گے بائیں جانب بھی۔ آپ کے آگے بھی اور آپ کے پیچھے بھی۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں۔ وہ ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے سرور کائنات کا روئے انور چمک اٹھا۔ دوسری جانب خود اپنے جذبہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

شهدت من المقداد بن الاسود مَشْهَدا لان اکون صاحبه احب الی مما عدل به (بخاری شریف ص ۵۶۴)

''میں نے حضرت مقداد کی ایک ایسی ہمت مردانہ کا مشاہدہ کیا کہ اگر مجھے یہ نصیب ہوتی تو یہ ایک ایسی خوش نصیبی ہوتی جو مجھے ہر ایک دولت سے زیادہ محبوب ہوتی۔''

لیکن صرف ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کی یہ تمنا نہیں ہوئی۔ بلکہ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ پوری جماعت انصار کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فتمنینا معشر الانصار ان لو قلنا کما قال المقداد احب الینا من ان یکون لنا مال عظیم۔

''ہماری یعنی جماعت انصار کی یہ تمنا ہوئی کہ حضرت مقداد نے جو بیان دیا ہے کاش وہ ہمارا بیان ہوتا تو اس سے بہت محبوب تھا کہ ہمیں کوئی بہت بڑی دولت مل جاتی۔''

یہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تاریک پہلو کی طرف توجہ دلا کر رفقاء کرام کا جائزہ لیا۔ پھر آپ روانہ ہوئے۔ چند منزلوں کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ جن کو طے کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے قریب پہنچے۔ رفقاء کرام کے لیے ایک مقام تجویز فرما دیا کہ وہ وہاں ٹھہریں اور خود آگے بڑھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ منشا یہ تھا کہ قریش کے متعلق جو خبر سنی گئی تھی اس کی تحقیق فرمائیں۔ چنانچہ ایک بوڑھا عرب سامنے آیا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تمہیں محمد اور محمد کے ساتھیوں کا یا قریش کا کچھ پتہ ہے؟

بوڑھے نے جواب دیا مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ سے فلاں روز اور قریش مکہ سے فلاں دن روانہ ہو چکے ہیں اور اگر یہ خبر صحیح ہے تو آج محمد کو اسی جگہ پہنچ جانا چاہیے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قریش کو اس مقام پر۔ بڑے میاں کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ دونوں فریق ان مقامات پر پہنچ چکے تھے جو بڑے میاں نے

اپنے اندازے سے بتائے تھے۔ (۳۰۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس گفتگو کے بعد فرودگاہ میں واپس تشریف لائے اور اب ایک پارٹی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ کی کہ بدر کی طرف جا کر حالات معلوم کرے۔ اس پارٹی کے خاص ارکان یہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔

یہ حضرات بدر کے قریب پہنچے تو ان کو دو غلام ملے۔ پارٹی کے ارکان نے ان کو پہچان لیا۔ ایک کا نام اسلم تھا جو بنی الحجاج کا غلام تھا اور دوسرے کا نام عریض ابو یسار تھا جو بنی عاص بن سعید کا غلام تھا۔ یہ غلام اونٹ لے کر پانی بھرنے آئے تھے۔ اس پارٹی نے ان کو گرفتار کر لیا اور فرودگاہ کی طرف لے کر چلے (۳۰۵) مگر ان میں سے ایک تو کسی طرح نکل کر بھاگ گیا (۳۰۶) ایک کو لے کر (۳۰۷) یہ فرودگاہ پہنچے۔ اس سے دریافت کیا کہ قافلہ کا پتہ بتاؤ۔ اس نے کہا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں ہے البتہ قریش کے سردار ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور اُمیہ وغیرہ کا علم ہے۔ یہ لوگ یہاں قریب ہی ٹھیرے ہوئے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پارٹی کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ غلام ابوسفیان کے تجارتی کارواں کے ساتھ آئے ہیں۔ یہ غلام اصل بات نہیں بتاتا اور ہمیں دھوکہ دے کر مرعوب کر رہا ہے۔ پارٹی کے افراد نے ڈانٹ ڈپٹ شروع کی مگر یہ غلام یہی کہتا رہا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں ہاں قریش کے سردار یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ ریت کی اس پہاڑی کے پیچھے (۳۰۸) جو سامنے نظر آ رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نوافل کی نیت باندھ رکھی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ کی آواز سمع مبارک تک پہنچی تو نماز کو مختصر کیا اور سلام پھیر کر فرمایا۔ یہ غلام سچ بات کہتا ہے تو اسے پیٹتے ہو اور جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔ میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ قریش یہاں پہنچ گئے ہیں اور یہ غلام صحیح اطلاع دے رہا ہے۔ (۳۰۹)

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلام کی طرف مخاطب ہوئے اور ان کی تعداد دریافت کی۔ غلام نے کہا مجھے تعداد معلوم نہیں ہے البتہ اتنا جانتا ہوں کہ بہت زیادہ ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا روزانہ کتنے اونٹ ذبح کیے جاتے ہیں۔ غلام نے کہا ایک روز دس ایک روز نو۔ ارشاد ہوا نو سو اور ہزار کے درمیان کی تعداد ہو گی۔ چنانچہ کل تعداد ۹۵۰ تھی۔

پھر آپ نے سرداران قریش کے نام دریافت کیے تو اس نے مکہ کے تمام ہی بڑے لوگوں کے نام بتا دیئے۔ عتبہ بن ربیعہ۔ شیبہ بن ربیعہ۔ ابوالبختری بن ہشام۔ حکیم بن حزام۔ نوفل بن خویلد۔ حارث بن عامر بن نوفل۔ طعیمہ بن عدی بن نوفل۔ ابوجہل۔ غرض قریش کے تمام بڑے لوگوں کے نام شمار کرا دیئے۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے رفقاء سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ مکہ نے اپنے تمام جگر پارے تمہارے سامنے ڈال دیئے ہیں۔ (۳۱۰)

اجتماع، مشاورت اور حضرات انصار کے جذبات فدائیت:

یہ موقع تھا کہ تردد ختم ہو کر یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ قریش کی فوج پہنچ گئی ہے۔ اب دو ہی راستے تھے۔ پسپائی یا مقابلہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری فیصلہ کے لیے حضرات رفقاء کو دعوت دی، نہایت خاص اور نہایت اہم اجتماع ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صورت حال پیش فرمائی۔ اس مشاورتی اجتماع میں سب ہی حضرات شریک تھے البتہ غالب اکثریت حضرات انصار کی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے جواب میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جذبات فدائیت کا اظہار فرمایا۔ حضرت مقداد[۱۱] بن اسود رضی اللہ عنہ نے وہی تقریر یہاں بھی دہرائی جو پہلے فرما چکے تھے:

> ''یا رسول اللہ! ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑ لیں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں ہم وہ جاں نثار ہیں کہ دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے سب طرف سے آپ کی حمایت میں جانیں قربان کریں گے اور اگر آپ (سمندر پار) برک الغماد (حبشہ افریقہ کا ایک شہر) تک جائیں تو ہم اسی سرفروشی کے ساتھ آپ کے ساتھ رہیں گے۔''

مسلم کی روایت ہے کہ ان تقریروں سے آپ کا چہرہ مبارک چمک اٹھا۔ مگر ابھی کچھ انتظار باقی تھا۔

حضرات انصار نے اگرچہ بیعت عقبہ میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے سب کچھ قربان کر دیں گے مگر انہوں نے اس عہد پر جمود ایک دفعہ بھی نہیں کیا۔ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ احتیاط فرمائی کہ کسی دستہ میں کسی انصاری کو اپنی طرف[۳۱۲] سے نہیں بھیجا۔ مگر جن غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے تو جاں نثاران انصار کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ لکیر کے فقیر بنے رہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جائیں بلکہ جس کو موقع ملا وہ ساتھ ہو لیا۔[۳۱۳] اور اس وقت بھی دو تہائی سے زیادہ تعداد حضرات انصار ہی کی تھی۔

حضرت انصار کے عمل کو دیکھتے ہوئے اگرچہ ضرورت نہیں تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس احتیاط کے عادی تھے اس کا تقاضا یہی تھا کہ اس موقع پر حضرات انصار کی طرف سے بھی کوئی بات کہی جائے۔ اسی کا انتظار باقی تھا۔

حضرات مہاجرین کی تقریروں کے بعد بھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رائے طلب کی اور فرمایا اَشِیْرُوْا عَلَیَّ اَیُّھَا النَّاسُ تو حضرات انصار کو احساس ہوا کہ شاید حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جواب کے منتظر ہیں۔ چنانچہ رئیس اور نمائندہ انصار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ[۳۱۴] کھڑے ہوئے اور عرض کیا:

یارسول اللہ کیا ہم سے دریافت فرماتے ہیں: ''ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ آپ کی صداقت پر ایمان لا چکے ہیں۔ ہماری شہادت یہ ہے کہ جو کچھ آپ پیش فرمارہے ہیں وہ حق ہے۔ ہم اطاعت شعاری اور وفاداری کا عہدو پیمان کر چکے ہیں۔ یارسول اللہ۔ اللہ کا جو حکم ہے آپ اس پر عمل شروع کیجئے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق وصداقت کا پیغامبر بنا کر بھیجا ہے۔ آپ کا ارشاد چاہیے۔ ہم سمندر میں کودنے کو تیار ہیں۔ ہمارا ایک آدمی بھی پیچھے نہیں رہ سکتا۔ ہمیں کوئی ناگواری نہیں۔ اگر کل کو جنگ ہوتی ہے تو ہم بڑے حوصلہ سے مقابلہ کے لیے تیار ہیں۔ آپ دیکھیں گے ہم کس طرح جم کر لڑتے ہیں اور دعویٰ شجاعت کی تصدیق کس طرح اپنے عمل سے پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے ہمارے کارنامے آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوں گے۔ آپ خدا کا نام لیجئے اور آگے قدم بڑھایئے۔''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا:

''یارسول اللہ! آپ کو غالباً یہ احساس ہے کہ آپ ایک ارادہ سے چلے تھے اور دوسرا معاملہ آپ کے سامنے آ گیا۔ آپ قطعاً اس کا خیال نہ فرمائیں۔ یارسول اللہ! ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ جس سے چاہیں جوڑیں جس سے چاہیں توڑیں۔ جس سے چاہیں اعلان جنگ کریں اور جس سے چاہیں مصالحت کریں۔ ہم بہرحال آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمارا مال آپ کا ہے۔ جو چاہیں لیں جو چاہیں ہمیں دیں اور خدا کی قسم جو آپ منظور فرما لیں گے وہ ہمیں زیادہ محبوب ہوگا اس سے جو ہمارے پاس رہ جائے گا۔''(۳۱۵)

حضرات مہاجرین اور انصار کے جذبات فدائیت اور ان پرخلوص بیانات نے وہ کیفیت پیدا کی کہ جبین نبوت نور مسرت سے چمک اٹھا اور کچھ پیغمبرانہ اسرار بھی بے نقاب ہو گئے، ارشاد ہوا:

''مجھے بشارت دی گئی ہے کہ دو جماعتوں میں سے ایک پر یقیناً کامیابی حاصل ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جماعت یہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قریش کے یہ بڑے سردار جو بڑھ چڑھ کر آ رہے ہیں۔ یہیں ڈھیر ہوں گے اور میں بتا رہا ہوں کہ فلاں شخص کی لاش وہاں ہوگی اور فلاں کی لاش وہاں۔''(۳۱۶)

عزائم اور حوصلوں کی یہی بلندی تھی جس نے اقلیت کو اکثریت کے ہم پلہ کر دیا تھا۔ چنانچہ عالم رویاء میں ان کی تعداد تھوڑی معلوم ہوئی۔ ارشاد ربانی ہے:

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔

''(اے پیغمبر) یہ وہ دن تھا۔ جب تجھے خواب میں ان کی تعداد تھوڑی کر کے دکھائی اور اگر انہیں بہت کر کے دکھاتا تو (مسلمانو) تم ضرور ہمت ہار جاتے اور (عظیم الشان) کام (جو درپیش تھا اس) میں جھگڑنے لگتے (ہمیت کی کمزوری چھپانے کے لیے بحثیں شروع کر دیتے) لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں (اس صورت حال سے) بچا لیا۔ یقین کرو جو کچھ انسان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے وہ اسے خوب جانتا ہے۔''

اب یہ فیصلہ اہل نظر کے سپرد ہے کہ ان مجاہدین اولوالعزم کی تائید اور تقویت مقصود تھی کہ خواب میں مخالفین کی تعداد تھوڑی دکھائی گئی یا ارادہ خداوندی کا یہ پرتو تھا کہ مجاہدین کے حوصلے اتنے بلند ہوئے کہ عالم رؤیا کو بھی انہوں نے متاثر کر دیا۔ یعنی مخالفین اگرچہ تعداد میں زیادہ تھے۔ مگر چونکہ مجاہدین کے حوصلوں کے مقابلہ میں ان کے حوصلے کم تھے اس لیے وہ تعداد میں کم دکھائے گئے دلوں کی بات کو خدا ہی جانتا ہے۔

یہ ایک طرف کے حالات تھے۔ مذکورہ آیتوں میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب اس سے پہلے کہ دوسری طرف یعنی ابوسفیان کے کاروان تجارت اور قریش کی روانگی کے حالات ذکر کیے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے کچھ رموز واضح کر دیئے جائیں۔ وباللہ التوفیق۔

راز و نیاز کی باتیں......نزدیکاں رابیش بود حیرانی

ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے جن پر ان کی شفقت زیادہ ہوتی ہے، جن کو وہ اپنا سمجھتے ہیں ان پر ان کی نگاہ بھی کڑی رہتی ہے اور کوئی غلطی دیکھتے ہیں تو تنبیہ کا انداز بھی سخت ہوتا ہے۔

ایک اصلاح پسند، دانش مند، سنجیدہ، مزاج باپ جو اپنی اولاد کو تہذیب و شرافت کا نمونہ دیکھنا چاہتا ہے وہ اپنے جگر پاروں کے ساتھ تکلف نہیں برتتا۔ ان کی معمولی غلطی پر بھی تنبیہ کرتا ہے تنبیہ کا لہجہ درشت اور الفاظ عموماً سخت ہوتے ہیں اور اولاد کی یہ سعادت مندی سمجھی جاتی ہے کہ باپ کی سختی کو تقاضاء شفقت سمجھے اور ناراضی کے بجائے حسن ادب اور نیاز مندانہ تسلیم و رضا سے اس کا استقبال کرے۔ غالبًا یہ پرتو ہے اس سنت الٰہیہ کا جس کی جھلک آیات کتاب اللہ میں نظر آتی ہے۔

خدا کی مخلوق میں انبیاء علیہم السلام سے زیادہ واجب الاحترام کون ہوسکتا ہے جن کے تقدس کا قرآن حکیم ثنا خواں اور جن کی عصمت کا علم بردار ہے جن کے احترام کو ہر ایک صاحب ایمان کے ایمان کا جزو لازم اور جن کی معمولی توہین کو بھی کوکفر قرار دیتا ہے۔ یہ خدا کے اپنے ہیں۔ مگر ان اپنوں کے متعلق اسلوب کلام اللہ کیا ہے؟

حضرت آدم علیہ السلام کی معصومیت ظاہر کرتے ہوئے ارشاد خداوندی ہے:

نَسِیَ اٰدَمُ وَلَمْ نَجِدْلَہٗ عَزْمًا (سورہ طٰہٰ ع ۵) ''آدم بھول گئے، ہم نے ان کا ارادہ (اور عزم) نہیں پایا)''

لیکن جب تنبیہ کا موقعہ ہے تو وحی الٰہی کی شدت ملاحظہ ہو۔ کتنے روکھے اور ہیبت انگیز انداز میں ارشاد ہے۔

عَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی (طٰہٰ ع ۷) ''نافرمانی کرد آدم پروردگار خود را پس گم گرد در راہ را'' (حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ)

حضرت یونس علیہ السلام جس کی حفاظت اور ناز پروری کے لیے قدرت نے معجزے ظاہر کیے۔ کہیں مچھلی کو مامور فرمایا اور کہیں شجر میں یقطین کا معجزہ ظاہر کیا لیکن جب وہ قوم کے رویہ سے بددل ہو کر اپنے علاقہ دعوت و تبلیغ سے باہر نکل کر تختہ جہاز پر سوار ہوگئے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی غیر معروف مقام پر پہنچ جائیں۔ ان کے اس عاجلانہ اقدام پر تنبیہ کی گئی تو غور فرمایئے وحی الٰہی کے عتاب آمیز الفاظ یہ ہیں:

فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ

''سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے۔'' (شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ)

حضرت حق جل مجدہ کے متعلق اس طرح کا تصور ایک نبی سے بعید از قیاس ہے۔ مگر بات وہی ہے کہ اپنے کو تنبیہ کی جارہی ہے تو اس طرح کے سخت الفاظ استعمال کئے جارہے ہیں۔ یہ راز و نیاز کا معاملہ ہے اللہ اور اللہ کے نبی کے درمیان۔

''کار پاکاں را قیاس از خود مگیر''

انبیاء علیہم السلام کو فرائض دعوت کی انجام دہی میں بے پناہ مشکلات پیش آتی ہیں۔ جب مخالفین کے ظلم و ستم کے طوفان اٹھتے ہیں تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ داعیان حق کے دل ٹوٹنے لگتے ہیں اور جب غیبی مدد اور نصرت خداوندی کے کچھ آثار نظر آتے تو فطری اور قدرتی بات ہے کہ یہ خیال گذرنے لگتا ہے کہ شاید منشاء الٰہی کے سمجھنے میں ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ کبھی جھونجل میں اس سے آگے بھی وسوسے آنے لگتے ہیں۔ یہ فطرت بشری کا تقاضا ہوتا ہے اختیاری نہیں ہوتا بلکہ اضطراری ہوتا ہے۔ اسی لیے عنداللہ مواخذہ سے بری ہوتا ہے۔ (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا) مگر یہ فطری بات اس فولادی عزم کے لیے موزوں نہیں ہوتی جو انبیاء علیہم السلام کو عطا کیا جاتا ہے تو اس غیر موزونیت کے اظہار کے لیے وحی الٰہی کے الفاظ ملاحظہ کیجئے۔ کتنے سخت ہیں:

حَتّٰى إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا وَجَاءَهُمْ نَصْرُنَا (سورہ یوسف ع ۱۲)

''یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو مدد ہماری۔'' (شاہ عبدالقادر صاحب)

انبیاء علیہم السلام کا یہ خیال یقیناً نہیں ہوتا کہ نصرت الٰہی کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ غلط تھا۔ صرف وسوسہ ہوتا ہے جو اس شدید پریشانی کے وقت دل میں گذرتا ہے جس کو وحی الٰہی نے دوسرے موقع پر زُلْزِلُوْا سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی یہ وسوسہ اس وقت آتا ہے جب ان کو مصائب اور مشکلات کے طوفانوں میں جھنجوڑا جاتا ہے مگر یہ وسوسہ بھی پیغمبرانہ اولوالعزمی کے لیے نازیبا ہے۔ ایسا ہی نازیبا جیسا ایک عام مسلمان کے لیے معاذ اللہ تکذیب نازیبا ہے۔ اسی غیر موزونیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ارشاد ہوا ہے:

ظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا

''وہ سمجھنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا۔''

ناز و انداز کا یہی مقام ہے جس کے لیے کہا جاتا ہے۔ ''نزدیکاں رابیش بود حیرانی'' اُردو والے کہا کرتے ہیں: ''جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔''

انبیاء علیہم السلام کے بعد حضرات صحابہ کی جماعت ہے جس کو ہم بجا طور پر کائنات کی آنکھ کا تارا کہتے ہیں۔ اور قرآن پاک میں جنھیں اولیاء اللہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ سو سے زیادہ آیتوں میں ان کی تحسین و ستائش ہے جن میں سے کچھ آیتیں پہلے حصوں میں گذر چکی ہیں باقی آئندہ حصوں میں آئیں گی (انشاء اللہ) ان کے متعلق بھی کلام ربانی کا یہی اسلوب ہے (۳۱۷)۔

معمولی غلطی جس کو عام مسلمانوں کے لحاظ سے گناہ صغیرہ کہنا بھی مشکل ہوتا ہے اگر جماعت صحابہ سے صادر ہو جاتی ہے تو وحی الٰہی اس کی گرفت کرتی ہے اور ''تکلف برطرف'' نہایت سخت الفاظ میں اس پر تنبیہ کرتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہی آیت ہے جو غزوۂ بدر کے سلسلہ میں نازل ہوئی:

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُوْنَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ

''(یہ صحابہ) جھگڑتے ہیں آپ سے درست بات میں اس کے بعد کہ حق واضح ہو چکا۔
گویا ان کو ہانکا جا رہا ہے موت کی طرف اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاروان تجارت کا راستہ روکنے کے لیے دفعتہ سفر کا ارادہ فرمایا اور اعلان کردیا کہ جو ساتھ چل سکتے ہوں چلیں۔ وہ انصار جاں نثار جو معمولی اشارہ پر سمندر میں گھوڑے ڈالنے کے لیے تیار تھے ان میں سے کون تھا جو شرف رفاقت کا آرزومند نہ ہوتا لیکن بہت سے ایسے تھے کہ دفعتہ روانگی ان کے لیے مشکل تھی۔ کھیتی باڑی کے کام بھی تھے جو خود اپنی طرف سے بھی کرتے تھے اور ان مہاجرین کی طرف سے بھی جن سے رشتہ اخوت قائم کیا گیا تھا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ سفر کا سب سے ضروری ذریعہ یعنی اونٹ اور گھوڑے مدینہ میں نہیں تھے چراگاہوں میں تھے جو دو تین میل سے لے کر آٹھ میل تک کے فاصلہ پر تھیں اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ ان کو لے آئیں۔ ایک لازمی بات تھی کہ یہ فوری روانگی ان کو ناگوار ہوئی۔ اس بات سے تکدر بھی ہوسکتا تھا کہ ان کے عذر کو نظرانداز فرمایا گیا۔ جو صحابہ کرام ساتھ چلے وہ بھی اس عجلت میں کہ بہت سوں کے کپڑے بھی پورے نہیں تھے، اسلحہ اگر ان کے پاس نہیں تھے تو دوسروں سے مستعار لے کر پورے کر سکتے تھے مگر اس کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ پھر کوئی فرشتہ نہیں آیا۔ وحی نہیں نازل ہوئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے تھی جس پر یہ سب کارروائی ہو رہی تھی۔ رائے بھی شدت کے ساتھ نہیں تھی کہ ہر شخص پر روانگی لازم کی جا رہی ہو۔ بلکہ اختیار دیا گیا تھا خواب کے متعلق بھی یقین نہیں کہ وہ اسی وقت نظر آیا تھا یا اس کے بعد۔

اسی طرح جب ایک دو روز کے بعد آگے چل کر معلوم ہوا کہ ممکن ہے قریش سے مقابلہ ہو جائے تو فطری اور قدرتی بات تھی کہ کچھ حضرات کی زبان سے نکل گیا کہ جنگ کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ ہم جنگ کے ارادہ سے آئے بھی نہیں تھے۔

یہ واقعات کا ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک تحریک فرما رہے ہیں اور ان سے فرما رہے ہیں جن کے ایمان کی شان یہ ہے کہ عرش معلیٰ سے نازل ہونے والے کلام پاک میں ان کو مومن فرمایا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر عظمت کیا ہوسکتی ہے کہ وحی الٰہی کسی کو مومن کہے۔

اور اس سے پہلی آیت (۳۱۸) پر نظر ڈالئے تو حقیقت یہ ہے کہ انہیں کو کہا گیا ہے:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ''یہی اور یہی ہیں سچے اور پکے مومن''

پہلی آیت (۳۱۹) میں جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں جن کے حاملین کو بشارت دی گئی ہے۔ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا اس کے مصداق قطعاً اور یقیناً یہی حضرات ہیں۔ اور اگر معاذ اللہ یہ حضرات ان اوصاف کے حامل نہیں ہیں تو پھر پوری اُمت محمدیہ میں کوئی جماعت، کوئی گروپ، کوئی ٹولی یا پارٹی ایسی نہیں ہے جو ان اوصاف کی حامل اور هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کی مصداق ہوسکے۔

ان حضرات کے ایمان و اذعان کا یہی بلند ترین درجہ وحی الٰہی کے پیش نظر ہے۔ یعنی اپنوں کا معاملہ ہے

بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ چہیتوں کا معاملہ ہے۔ وہ چہیتے جن کے دلوں میں وہ سوز و گداز اور وہ حرارت ہے کہ جیسے ہی اللہ کا نام لیا جاتا ہے دل لرزنے لگتے ہیں۔ رقت طاری ہو جاتی ہے۔ جذبات محبت بھڑکنے لگتے ہیں۔ اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو شمع ایمان کا نور پھوٹنے لگتا ہے۔ جن کا شیوہ اور خصوصی شعار توکل علی اللہ ہے۔

ایک طرف یہ ایمان و اذعان، یہ توکل اور اعتماد۔ دوسری طرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اعلان پر دل تنگی اور بے سروسامانی کا عذر غیر موزوں اور متضاد باتیں ہیں۔ اسی لیے جب وہ آیتیں نازل ہوئیں جن میں اس سفر پر تبصرہ ہے یا بعنوانِ دیگر جن میں روداد سفر کی طرف اشارے کیے گئے ہیں ان آیتوں میں صحابہ کی اس کوتاہی پر تنبیہ کی گئی۔ تنبیہ میں کوئی تکلف نہیں برتا گیا بلکہ نہایت کھلے الفاظ اور روکھے انداز میں تنبیہ فرمائی گئی۔ اور اگر چہ یہ عذر چند نے کیا تھا مگر تنبیہ پوری جماعت کو کی گئی۔ ارشاد ہوا:

كَمَا أَخْرَجَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ (سورہ انفال ع ۱)

''جیسے نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے درست کام پر اور ایک جماعت ایمان والوں کی راضی نہ تھی۔ تجھ سے جھگڑتے تھے درست بات میں واضح ہو چکنے کے بعد گویا ان کو ہانکتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے۔'' (شاہ عبدالقادر)

عرش معلیٰ سے نازل ہونے والے کلام ربانی میں جو ملوک الکلام ہے اگر ذکر آئے گا تو کسی ایسی ہی بات کا آئے گا جو حد درجہ عجیب و غریب ہو، جو کھلے طور پر کرشمہ قدرت ہو یا جو کسی غیر معمولی اہمیت اور عظمت کی حامل ہو۔

ایک کمزور جماعت اپنے مرکز سے تیاری کر کے چلے اور کامیاب ہو جائے۔ یہ بھی کرشمہ قدرت اور فضل خداوندی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ کھلا ہوا کرشمہ یہ ہے کہ جنگ کی تیاری کے بغیر بے سروسامان چلے اور ایسی کامیابی حاصل کرے کہ پوری قوم کی قسمت کو پلٹ کر رکھ دے۔

فضل ربانی نے اس موقع پر بھی کرشمہ دکھایا اور یہی عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ وحی الٰہی ناطق ہو رہی ہے۔

كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ الآية

مفہوم آیت یہ ہے کہ آپ کی یہ دفعتہً روانگی (جو بظاہر ایک عاجلانہ حرکت تھی۔ جس سے ان کو ناگواری تھی۔ جو اسلام کے خیر خواہ پختہ کار مومن ہیں۔ جن کے ایمان و اذعان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہ عند اللہ عاجلانہ حرکت نہیں تھی بلکہ منجانب اللہ تھی۔ بالکل برحق تھی۔

تعجب ہے ارباب ایمان نے بحث کیوں کی جب کہ اس کی دعوت وہ دے رہا تھا جو خدا کا رسول ہے۔ جس کے متعلق طے ہے کہ اس کا فرمان فرمان خدا ہوتا ہے اور بحث بھی کچھ ایسے انداز کی جو خوف زدہ کا انداز ہوتا ہے:

يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ

''تم سے بحث کر رہے ہیں حق بات میں اس کے بعد کہ حق واضح ہو چکا ہے (کہ ارشاد

رسول خدا ہوتا ہے) بحث بھی ایسے انداز سے کر رہے ہیں گویا ان کو موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے اور وہ کھلی آنکھوں موت کو دیکھ رہے ہیں۔''

فلسفہ فتح وشکست:

اس سے زیادہ عجیب بات کیا ہو سکتی ہے کہ معرکہ احد کے لیے پوری تیاری کے ساتھ چلے اور شکست کھائی اور بدر کے لیے کوئی بھی تیاری نہیں تھی۔ پہلے سے جنگ کا خیال بھی نہیں تھا۔ ایک بھیڑ تھی جو قافلہ کا راستہ روکنے چلی تھی۔ لیکن اس نے اپنے سے تین گنی چار گنی مسلح طاقت کا مقابلہ کیا اور ایسی کامیاب ہوئی کہ پورے عرب کے سامنے نہیں بلکہ پوری دنیا کے سامنے کھلے طور سے ثابت کر دیا کہ زندہ یہی ہے اور زندگی کا حق اسی کو ہے۔

وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (سورہ انفال ع ۵)

''اگر تم نے آپس میں لڑائی کی بات ٹھہرائی ہوتی تو ضرور میعاد جنگ سے گریز کرتے۔ (ان کی تعداد اور شان وشوکت ایسی تھی کہ مقابلہ کی ہمت نہ پڑتی لیکن اللہ تعالیٰ نے خلاف توقع یہ مقابلہ کرا دیا) تا کہ خدا کو جو کرنا تھا اسے کر کے دکھا دے نیز اس لیے کہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ ایک کھلی ہوئی شہادت کے ساتھ زندہ رہے اور بیشک اللہ تعالیٰ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔''

اسی طرح عجیب وغریب بات یہ تھی کہ صحابہ کرام کی یہ بے سروسامان جماعت آخر تک اسی خیال میں رہی کہ کاروان تجارت کی غیر مسلح طاقت کا راستہ روکنا ہے اس سے کچھ فائدہ ہی ہو سکتا ہے نقصان کا خطرہ برائے نام ہے۔

اس کاروان تجارت کا چرچا آج سے نہیں بلکہ تقریباً تین ماہ سے ہو رہا تھا۔ جیسے ہی وہ شام سے روانہ ہوا اس کا کھوج لگانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف آدمی بھیجے گئے، اس کا سراغ لگا، اس کا تعاقب بھی کیا گیا۔ لیکن یہ کرشمہ قدرت کس قدر حیرت انگیز ہے کہ وہ قافلہ ہاتھ نہیں آیا اور اس کے بجائے ذات الشوکۃ (مسلح طاقت) اپنے سے کئی گنی زیادہ۔ سامنے آ گئی۔ کیونکہ منشاء خداوندی یہ نہیں تھا کہ کچھ دولت مسلمانوں کے پلے پڑ جائے بلکہ منشاء خداوندی یہ تھا کہ کلمۃ اللہ سربلند ہو۔ حق کے پرچم لہرائیں اور علم باطل سرنگوں ہو۔

تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (سورہ انفال)

''اور تم چاہتے تھے جس میں کانٹا نہ لگے وہ ملے تم کو اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کرے سچ کو اپنے کلاموں سے اور کاٹے پیچھا کافروں کا۔ تا سچا کرے سچ کو اور جھوٹا کرے جھوٹ کو۔ اگرچہ نہ راضی ہوں گنہگار۔'' (حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ)

ابوسفیان کی ہوشیاری اور چالاکی، اہل مکہ کی تیاری اور روانگی

لشکر قریش کا ٹھاٹ، ابوجہل کا جنگ کے لیے اصرار اور ضد

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ تا وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (سورہ انفال ع ۶)

''اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کی نظر میں نمائش کرتے ہوئے نکلے اور جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور یاد رکھو جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ (اپنے علم وقدرت سے) اس پر چھایا ہوا ہے۔ اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ شیطان نے ان کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوش نما کر کے دکھا دیئے تھے اور کہا تھا کہ آج ان لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غالب آ سکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں۔ مگر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں واپس ہوا اور کہنے لگا مجھے تم سے سروکار نہیں۔ مجھے وہ بات دکھائی دے رہی ہے جو تم نہیں دیکھتے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔'' (سورہ انفال ع ۵)

ابوسفیان جو بعد میں اسلام سے مشرف ہوئے اور اب بجا طور پر اس کے مستحق ہیں کہ ان کے اسم مبارک کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھا جائے۔ جس طرح ایک ہوشیار تاجر تھے۔ ایک حاضر جواب لیڈر اور صاحب حوصلہ جرنیل بھی تھے۔ قریش نے جنگ کا ایک منصوبہ طے کیا تھا۔ اس کا ایک حصہ یہ تجارتی سفر تھا۔ ابوسفیان خوب سمجھتے تھے کہ جس قوم کا سرمایہ ان کے پاس ہے اس کی ہمدردیاں بھی ان کے ساتھ ہیں اور وہ ان کے جذبات سے کام لے سکتے ہیں۔ ابوسفیان نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور جس جنگ کا منصوبہ بنایا گیا تھا اس کے لیے پورے قریش کو دفعتہ میدان جنگ میں کھڑا کر دیا۔ ابوسفیان کی یہ ہوشیاری تھی کہ جیسے ہی اس کو خطرہ محسوس ہوا اس نے راستہ بدل کر قافلہ کو محفوظ بھی کر لیا اور مکہ میں یہ قیامت بھی برپا کر دی کہ قافلہ خطرہ میں ہے جلد دوڑو۔

عربی محاورات میں ایک لفظ ہے۔ النذیر العریان (آگاہ کرنے والا برہنہ بدن) ابوسفیان نے اس محاورہ کو عملی جامہ پہنایا۔ ایک شخص ضمضم بن عمرو غفاری کو سونے کے بیس مثقال دیئے جن کا وزن ساڑھے سات تولہ ہوتا ہے اور اس کو یہ پٹی پڑھائی کہ وہ فوراً مکہ پہنچ کر اپنے اونٹ کی ناک کاٹ دے۔ کپڑے پھاڑ کر برہنہ ہو جائے اور اونٹ پر الٹا بیٹھ کر (کہ منہ دم کی طرف ہو) پورے مکہ میں شور مچاتا ہوا گھوم جائے کہ محمد نے (صلی اللہ علیہ وسلم) ابوسفیان کے قافلے پر حملہ کر دیا ہے۔ ضمضم نے پوری ہوشیاری اور چالاکی سے اس پر عمل کیا۔

جب اس طرح خبر پھیلا دی گئی تو اب اہل مکہ کے جذبات کو کون روک سکتا تھا۔ جذبات کی ایک گھٹا اٹھی اور

آندھی کے بادل کی طرح پورے مکہ پر چھا گئی۔ اب دارالندوہ کے اجتماع کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ہر شخص دارالندوہ بنا ہوا تھا۔ ابوجہل ان کا امام تھا جو ابوسفیان سے بھی زیادہ چابک دست اور چالاک تھا اس نے فوراً تیاری کا حکم صادر کر دیا۔ چنانچہ دو تین دن کے وقفہ میں قریش کی ایک مسلح فوج تیار ہوگئی۔

ارباب سیرت (۳۲۰) نے اس موقع پر حضرت عاتکہ (۳۲۱) کے ایک خواب کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ عاتکہ بن عبدالمطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی تھیں اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بہن۔ ان دونوں بہن بھائیوں کے دلوں میں ایمان تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے تھے۔ مگر باقاعدہ مسلمان نہیں ہوئے تھے اسی وجہ سے مکہ میں ٹھہرے ہوئے تھے مگر قریش کی نظر میں معتوب تھے۔

ابوسفیان کا قاصد ضمضم جس روز مکہ معظمہ پہنچا۔ اس سے تین دن پہلے حضرت عاتکہ نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔ جس سے گھبرا کر ان کی آنکھ کھل گئی۔ خواب ایسا تھا کہ ہر ایک سے بیان بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ دماغ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے انہوں نے اپنے بھائی (حضرت عباس) سے خواب بیان کر دی۔ مگر یہ بھی تاکید کر دی کہ کسی سے نہ کہیں۔ لوگ ہمارے ویسے ہی مخالف ہیں یہ خواب سن کر اور دشمن ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کوئی گزند پہنچا دیں۔

خواب میں دیکھا تھا کہ ایک شتر سوار چلا آ رہا ہے۔ جب وہ مکہ کے میدان میں پہنچا تو ٹھیر گیا اور زور زور سے چیخ کر کہنے لگا۔

الا انفروا یا ال غدر لمصارعکم فی ثلاث

''اے آل (۳۲۲) غدر اپنے قتل گاہوں کی جانب تین دن کے اندر اندر کوچ کر جاؤ۔''

میں نے دیکھا کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر وہ مسجد حرام کی طرف چلا۔ مجمع بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ مسجد حرام میں پہنچ کر خانہ کعبہ کی پشت پر اس نے اونٹ کو کھڑا کر دیا۔ اور اسی طرح یہاں بھی اس نے بلند آواز سے پکارا۔ الا انفروا یاال غدر لمصارعکم فی ثلاث۔ پھر جبل ابی قیس کی چوٹی پر چڑھا اور وہاں بھی اسی طرح آواز لگائی۔ پھر اس نے پہاڑ کی چوٹی سے ایک بڑا پتھر نیچے دھکیل دیا۔ جب یہ پتھر زمین کے قریب پہنچا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس پتھر کے ٹکڑے مکہ کے مکانات میں پھیل گئے۔ مکہ کا کوئی مکان بھی ایسا نہیں رہا جس میں اس پتھر کا کوئی ریزہ نہ پہنچا ہو۔

یہ خواب سن کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے فرمایا میں تو کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کروں گا۔ مگر عاتکہ تم بھی کسی سے نہ کہنا۔ بہن بھائی نے یہ طے کر لیا۔ مگر پھر حضرت عباس جب باہر آئے تو انہوں نے اپنے دوست ولید بن عتبہ سے یہ خواب کہہ ڈالی۔ اگرچہ ان کو بھی تاکید کر دی کہ وہ کسی سے نہ کہیں۔ مگر انہوں نے اپنے بیٹے کو سنا دی۔ پھر رفتہ رفتہ پورے مکہ میں یہ پھیل گئی۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگلے روز میں مسجد حرام میں طواف کعبہ کے لیے گیا۔ ابوجہل

وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ میاں عباس جب طواف سے فارغ ہو جاؤ تو میرے پاس آنا۔ حضرت عباس طواف سے فارغ ہو کر ابوجہل کے پاس پہونچے تو اس نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

جناب آپ کی نبیہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے کہا۔ نبیہ کون۔ کہا یہی عاتکہ۔ میں نے انجان بن کر پوچھا عاتکہ کیا کہہ رہی ہیں۔ اس نے اس کا جواب تو کچھ دیا نہیں۔ کہنے لگا اے بنی عبدالمطلب۔ تمہارے مردوں نے تو نبوت کا دعویٰ کیا ہی تھا۔ اب عورتیں بھی نبی بننے لگیں اور دیکھو خواب میں تین دن کی مدت بتائی گئی ہے اگر تین دن کے اندر کوئی بات پیش نہ آئی تو ہم ایک تحریر لکھ دیں گے کہ تمہارا گھرانا پورے عرب میں سب سے زیادہ دروغ باف ہے۔ انکم اکذب اهل بیت فی العرب۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس وقت کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔ بجز اس کے کہ میں انکار ہی کرتا رہا کہ غلط ہے ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا اور دل میں خیال کرتا رہا کہ کاش عاتکہ نے یہ خواب نہ دیکھا ہوتا۔ اب میں گھر پہنچا تو ایک نئی مصیبت سامنے آئی۔ خاندان عبدالمطلب کی عورتیں میرے پاس آنی شروع ہوئیں۔ غصہ میں بھری ہوئیں جو بھی آتی یہی کہتی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تمہاری غیرت کہاں جاتی رہی۔ یہ ابوجہل خبیث مردوں کو تو سنایا ہی کرتا تھا اب اس نے عورتوں پر بھی زبان درازی شروع کر دی۔ افسوس۔ تم کان دبائے سنتے رہے اور تم سے کچھ نہ بن پڑا۔

اب میں سخت الجھن میں تھا، کوفت بھی تھی اور غصہ بھی۔ آخر میں نے طے کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو اب اگر ابوجہل نے ایسی بات کہی تو میں دوبدو جواب دوں گا۔ یہی میں نے خاندان کی عورتوں کو اطمینان دلایا۔

اگلا دن ہوا یعنی جس دن خواب دیکھا اس سے تیسرا دن۔ تو حرم شریف میں یہ طے کر کے گیا کہ ابوجہل نے آج کچھ کہا تو میں خوب خبر لوں گا۔ کم از کم عورتوں میں تو یہ رسوائی نہیں رہے گی۔ جیسے ہی میں حرم میں داخل ہوا ابوجہل نظر پڑا۔ میں اس کی طرف چلا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ ابوجہل نے کچھ نہ کہا تو میں خود چھیڑ کر کوئی ایسی بات کروں گا کہ وہ کل والے الفاظ پھر دہرائے تو میں اس کو بتاؤں گا اور ایسا ضرور ہو جاتا کیونکہ وہ ایک تیز مزاج آدمی تھا۔ ہلکا پھلکا تھا مگر چہرے سے تیزی ٹپکتی تھی۔ زبان بھی اتنی ہی تیز تھی اور نظر بھی اتنی ہی تیز۔ مگر عجیب بات ہوئی ابوجہل میری طرف مخاطب ہونے کے بجائے تیزی سے دوڑتا ہوا مسجد حرام کے دروازے کی طرف گیا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں اس ملعون کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ کل کا بدلہ میں آج لوں گا اس لیے دوڑا جا رہا ہے۔ مگر بات یہ نہیں تھی۔ ضمضم بن عمرو غفاری جو ابوسفیان کا فرستادہ تھا، وہ چیخ رہا تھا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں تو پڑی نہیں لیکن ابوجہل نے سن لی تھی۔ اس لیے وہ دروازہ کی طرف دوڑ کر گیا تھا۔ ضمضم مذکور وادی میں کھڑا چیخ رہا تھا، اونٹ کی ناک کاٹ ڈالی تھی، کجاوہ الٹا رکھا تھا، اپنا گریبان چاک کیے ہوئے تھا اور چیخ رہا تھا۔

یا معشر قریش اللطیمة اللطیمه— اموالکم مع ابی سفیان قد عرض[۳۲۳] لها محمد فی اصحابه لا اری ان تدر کوها الغوث— الغوث[۳۲۴]

اس کے بعد خواب کا قصہ رل گیا۔ اور نیا ہنگامہ سامنے آ گیا۔ ایک جوش اور غصہ تھا اور ہر ایک کی زبان پر تھا

کہ کیا محمد نے (صلی اللہ علیہ وسلم) ابوسفیان کے قافلہ کو بھی حضرمی کا قافلہ سمجھ لیا ہے۔ اس مرتبہ ہم مزہ چکھا دیں گے۔ (۳۲۵)

ایک شیطان کا ظہور:

قریش نے تیاری شروع کی تو انہیں خیال آیا کہ بنو بکر (۳۲۶) سے ہمارا جھگڑا چل رہا ہے۔ ایسا نہ ہو۔ ہمارے پیچھے وہ حملہ کر دیں۔ یہ اسی فکر میں تھے کہ ایک شخص نمودار ہوا۔ وہ سراقہ ابن مالک ابن جعشم مدلجی کے اتنا مشابہ تھا کہ لوگ اس کو سراقہ ہی سمجھے۔ سراقہ قبیلہ بنی کنانہ کا شیخ اور سردار تھا۔ اس نے اطمینان دلایا کہ میں ذمہ دار ہوں۔ اس نازک وقت میں بنو کنانہ ہرگز حملہ نہیں کریں گے۔ مفسرین کا خیال ہے کہ یہی شیطان تھا جس کی طرف قرآن (۳۲۷) حکیم میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ابولہب اور امیہ بن خلف:

سرداران قریش میں سے صرف ابولہب تھا جو اس جنگ میں شریک نہیں ہوا۔ مگر ایک شخص عاصی بن ہشام کو اپنے بدلہ میں بھیج دیا۔ عاصی بن ہشام دیوالیہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی لوگوں کے چار ہزار درہم اس کے ذمہ باقی تھے۔ یہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے پریشان تھا۔ ابولہب نے چار ہزار درہم عاصی کو دیئے اور اپنے بدلہ فوج میں بھرتی کرا دیا۔

اُمیہ بن خلف کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جب مکہ گئے تھے تو اسی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ ابوجہل نے جب حضرت سعد کو ڈانٹنا شروع کیا تھا تو اسی امیہ کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ اگر تم امیہ کے یہاں نہ ہوتے تو یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ اس موقع پر حضرت سعد کی زبان سے یہ بھی نکل گیا تھا کہ میں نے لسان نبوت سے تمہارے متعلق یہ سنا ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہو گے۔

قریش کے ان سرداروں کو مخالفت اور عناد کے باوجود اس کا یقین تھا کہ محمد کی بات غلط نہیں ہوتی (صلی اللہ علیہ وسلم) چنانچہ اس وقت وہ سہا ہوا تھا۔ جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ امیہ کا ارادہ نہیں تھا مگر عقبہ بن معیط نے اس کو ایسا طعنہ دیا کہ اپنی لاج رکھنے کے لیے اس کو چار و نا چار جانا پڑا۔

یہ ایک لحیم شحیم بھاری بدن کا سن رسیدہ آدمی تھا۔ احاطہ حرم میں اپنے دوستوں کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ عقبہ دھونی دینے کی چلچی (انگیٹھی) اور بخور (دھونی دینے کی خوشبو۔ نکھ یا لوبان) لے کر اس کے پاس پہنچا کہ اگر اس قومی جنگ میں شرکت نہیں کرتے ہو تو عورتوں کی طرح کپڑوں میں خوشبو بساتے رہو اور سنگار کرتے رہو۔

بھرے مجمع میں عقبہ نے اس طرح گفتگو کی اور یہ طعنہ دیا تو امیہ کی رگ غیرت بھی پھڑکنے لگی۔ وہ گھر پہنچا اور بیوی سے کہا۔ میں جا رہا ہوں۔ بیوی نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیشین گوئی یاد دلا کر روکا۔ مگر امیہ نے کہا

اس وقت تو مجھے جانا ہی ہے۔ البتہ کوشش کروں گا کہ راستہ سے واپس آ جاؤں۔ (۳۲۸)

بہر حال تین دن میں تیاری مکمل ہوئی اور نو سو پچاس جنگجو بہادروں کی فوج اس شان سے روانہ ہوئی کہ سب طرف جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ سو شہسوار گھوڑوں پر آراستہ تھے، باجے بج رہے تھے، گانے گائے جا رہے تھے، رؤسا قریش شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ آگے آگے تھے۔ ناچ اور گانے کی چوکڑیاں ساتھ تھیں جو جذبات میں طوفان (۳۲۹) برپا کر رہی تھیں۔

مکمل اسلحہ کے ساتھ سامان رسد بھی بڑی افراط کے ساتھ بھیجا گیا۔ رؤسا داد شجاعت دے رہے تھے۔ ایک ایک رئیس کی طرف سے پورے لشکر کی دعوتیں ہو رہی تھیں۔ جیسے ہی مکہ سے نکلے تو ابوجہل نے دعوت کی اور دس اونٹ ذبح کرائے۔ (۳۳۰) عسفان پہنچے تو امیہ بن خلف نے نو اونٹ ذبح کرائے تیسرے دن مقام قدید پر سہیل بن عمرو نے دس اونٹ ذبح کرا کر دعوت کی۔ پھر جحفہ پہنچے تو عتبہ بن ربیعہ نے دس اونٹ ذبح کرائے۔ اگلے روز ابواء مقام پر پڑاؤ ہوا تو فرزندان حجاج۔ بنیہ اور منیہ کی طرف سے دس اونٹ ذبح کرائے گئے۔ سخاوت کی اس نمائش میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی حصہ لیا اور دس اونٹ انہوں نے بھی ذبح کرائے۔ جب چشمہ بدر کے قریب پہنچے تو ابوالبختری نے دس اونٹ ذبح کرائے۔

اب یہاں اس قصہ کو چھوڑ کر ابوسفیان کی خبر لینی چاہیے کہ اس کے قافلہ پر کیا گذری اور وہ کس طرح مکہ پہنچا۔

ابوسفیان کا راستہ:

ارباب سیرت اور مؤرخین کا بیان یہ ہے کہ ابوسفیان نے مدینہ کا راستہ چھوڑ کر وہ راستہ اختیار کیا جو ساحل سمندر کو چھوتا ہوا ینبع کے قریب سے گذرتا ہے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخبر حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما جب علاقہ حوارء میں ''کشد'' کے یہاں پہنچے تو قافلہ یہاں سے گذر رہا تھا۔ وہ یہاں سے بدر کی طرف مڑا جہاں مشہور فرودگاہ تھا اور یہاں سے سب طرف کو راستے جاتے تھے۔ ایک سڑک مکہ کی طرف جاتی تھی۔ جس سے آمدورفت رہتی تھی ابوسفیان کو بدر پہونچ کر اسی شاہراہ سے چلنا چاہیے تھا۔ قریش کی فوج اسی شاہراہ سے آئی تھی۔ لیکن ابوسفیان نے یہ ہوشیاری کی کہ قافلہ کو لے کر بدر نہیں پہونچا بلکہ پہلے تنہا بدر پہنچا اور وہاں کے شیخ مجدی بن عمرو سے حالات معلوم کیے۔

پہلے گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ بسبس بن عمرو اور عدی بن ابی الزغباء قافلہ کا پتہ لگانے کے لیے بدر پہنچے تھے۔ انہوں نے مجدی بن عمرو سے گفتگو نہیں کی۔ بلکہ باندیوں کی لڑائی سے ہی مطلب نکال لیا تھا۔ پھر اونٹ کو پانی پلا کر اور مشکیزہ میں پانی بھر کر واپس چلے آئے تھے۔ ابوسفیان نے بدر پہنچ کر مجدی بن عمرو سے دریافت کیا کہ مدینہ کے لوگ یہاں آئے تھے۔ آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہے؟

مجدی نے کہا۔ مدینہ کا کوئی آدمی اس طرف نہیں آیا۔ جو لوگ اس طرف سے گذرے ان کو میں پہچانتا ہوں۔ البتہ دو آدمی ایسے آئے تھے جن کو میں نہیں پہچان سکا۔ انہوں نے یہاں پہنچ کر ٹیلہ کے قریب اونٹ

بٹھایا۔ پھراس طرف آئے۔ پانی بھرااور واپس ہو گئے۔ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ کون تھے۔

ابوسفیان اس بیان سے چونکا۔ وہ وہاں گیا جہاں ان نامعلوم مسافروں نے اونٹ بٹھائے تھے۔ وہاں کچھ مینگنیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک مینگنی اٹھا کر اس کو توڑا۔ اس میں سے گٹھلی نکلی۔ اس نے گٹھلی دیکھی اور گھبرا کر بولا۔ **ھذہ و اللہ علائف یثرب**۔ واللہ یہ یثرب کے راتب کی مینگنی ہے۔ پھر فوراً واپس ہو کر قافلہ میں پہونچا۔ اور اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ کو ہو لیا اور جب آگے چل کر پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ مسلمانوں کی زد سے بچ گیا ہے تو ابوجہل کو پیغام بھیجا۔ قافلہ محفوظ ہے۔ آپ بھی جنگ کا ارادہ ترک کردیں اور واپس ہو جائیں۔

جب بدر میں فریقین کا مقابلہ ہوا تو ابوسفیان کا قافلہ نشیبی حصہ میں سمندر کے کنارے کنارے مکہ جا رہا تھا۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ (سورہ انفال) تفسیر آگے آ رہی ہے انشاء اللہ

بطر وریاء، اکڑ اور نمائش (ٹھاٹ)

ابوسفیان نے ضمضم بن عمر غفاری کو بھیج کر جس طرح اشتعال پھیلایا تھا اس کے بعد اس کا یہ پیغام کہ جنگ کا ارادہ ترک کردیں اور واپس ہو جائیں ممکن ہے نمائشی ہو۔ مگر امن پسند سرداروں نے اس سے اثر لیا۔ چنانچہ قبیلہ بنی زہرہ اور بنی عدی کے شیوخ نے ابوجہل سے اصرار کیا کہ اب واپس جانا چاہیے۔ مگر ابوجہل چاہتا تھا کہ اس وقت کے جوش وخروش سے اتنا فائدہ اٹھالے کہ پورے عرب میں قریش کی دھاک بیٹھ جائے۔ چنانچہ ابوجہل نے سرداران بنی زہرہ و بنی عدی کے اصرار کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ سفر پر اصرار کیا اور مصلحت یہ بیان کی۔

> عرب کے کانوں تک ہماری شان وشوکت۔ ہمارے سفر ہمارے اتحاد اور ہماری یکجہتی کی خبریں پہونچیں گی اس سے وہ متاثر ہوں گے۔ ہمیشہ ہم سے ہیبت کھاتے رہیں گے اور مرعوب رہیں گے (۳۳۱) اور پروگرام یہ تجویز کیا کہ:
> بدر پہنچیں گے جو صرف فرودگاہ ہی نہیں ہے بلکہ عرب کا مشہور مقام ہے جہاں (۳۳۲) میلہ لگا کرتا ہے وہاں سہ روزہ (۳۳۳) جشن منائیں گے۔ اونٹ ذبح کیے جائیں گے۔ کھانے کھلائے جائیں گے شراب کے دور چلیں گے۔ ناچ گانے ہوں گے۔ (۳۳۴)

بہر حال اس مصلحت اور پروگرام سے قبیلہ بنی زہرہ اور بنی عدی (۳۳۵) کے سرداروں نے اتفاق نہیں کیا وہ واپس چلے گئے اور ان کے ساتھ ان کے آدمی بھی واپس چلے گئے۔ ابن اسحاق نے اس سفر میں بھی ایک خواب کا تذکرہ کیا ہے۔

یہ خواب جہم بن الصلت نے دیکھا تھا جو عبد مناف کی اولاد میں سے تھے۔ یعنی ہاشم کے ہم جد تھے۔ بعد میں اسلام سے مشرف ہوئے۔ جہم بن الصلت کچھ جاگ رہے تھے کچھ سو رہے تھے کہ اچانک چونک کر اٹھے

اور گھبرا کر ساتھیوں سے کہنے لگے۔ وہ سوار کہاں گیا۔ برابر والوں نے کہا۔ یہاں کوئی سوار نہیں آیا۔ کہنے لگے میں ابھی دیکھ رہا تھا ایک اسپ سوار ہے۔ ایک اونٹ اس کے ساتھ ہے۔ وہ قریش کے سرداروں کے نام بتا رہا ہے اور خبر دے رہا ہے کہ یہ قتل کر دیئے گئے۔ پھر اس شخص نے اونٹ کے سینہ میں خنجر مار کر لشکر میں چھوڑ دیا۔ خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے اور لشکر کے خیموں میں پہنچ رہے تھے ایک بھی خیمہ خون کے چھینٹے سے پاک نہیں رہا۔

ابوجہل نے خواب سنا تو مذاق بنانا شروع کر دیا کہ اولاد مطلب میں ایک اور نبی ہو گئے۔

بہرحال لشکر بدر کے قریب پہنچا اور اس نے وادی کے ایک کنارہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں کسی قدر نشیب تھا۔ پانی کی یہاں قلت نہیں تھی اور اگر جنگ پیش آتی تو اس کے لیے بھی یہ سب سے موزوں مقام تھا۔

ممکن تھا جشن کا کوئی پروگرام بنتا مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں پہنچ گئے ہیں تو بجائے جشن کے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

ابوجہل کا جنگ کے لیے اصرار اور ضد:

قبیلہ جمح کا ایک شخص عمیر بن وہب تھا۔ قریش نے اس کو بھیجا کہ وہ مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگائے۔ عمیر مسلمانوں کے کیمپ کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا گذرا اور تعداد کا اندازہ لگا لیا۔ پھر آس پاس گھوڑا دوڑا کر دیکھا کہ شاید کسی دوسرے مقام پر مسلمانوں نے کمین گاہ بنا رکھا ہو۔ مگر پورا میدان صاف تھا۔ عمیر واپس آیا۔ اس نے رپورٹ دی کہ تعداد زیادہ نہیں ہے۔ کم و بیش تین سو آدمی ہیں۔ ان کی حفاظت کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہ بھی خطرہ نہیں ہے کہ کہیں سے کمک پہنچ جائے گی۔ سامان بھی پورا نہیں ہے۔ صرف تلواریں لیے ہوئے ہیں۔ مگر صاحبو! کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے مصائب کے لشکر (۳۳۶) ان کے ساتھ ہیں۔ یثرب کی اونٹنیاں جن سے پانی کھینچوایا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی پکھال نہیں بلکہ موت کے انبار لادے ہوئے ہیں۔ یہ مسلمان خاموش ہیں مگر ان کی صورتوں سے وحشت برستی ہے۔ معلوم ہوتا ہے سب کچھ چھوڑ کر یہاں صرف قربان ہونے کے لیے آئے ہیں، بال بچوں میں واپس جانے کا تصور بھی ان کو نہیں ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ ان میں کوئی ایک بھی مارے بغیر نہیں مرے گا۔

صاحبو! غور کرو اگر وہ ایک ایک کو مار کر ہی مرے تو سوچو۔ پھر تمہاری زندگی کیا ہو گی تم میں ہی کے کتنے عزیز ختم ہو چکے ہوں گے۔

حکیم بن حزام (۳۳۷) قریش کے سنجیدہ مزاج سردار تھے۔ وہ اس تقریر سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے خود بھی غور کیا کہ تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے ہم روانہ ہوئے تھے وہ مقصد پورا ہو گیا۔ ابوجہل نے یہاں پہنچ کر جشن کا ارادہ کیا تھا۔ اس کا امکان نہیں رہا۔ اب جنگ کا بہانہ اگر ہے تو صرف حضرمی کا خون ہے عرب کے دستور کے مطابق یہ ہو سکتا ہے کہ خون بہا دلوا دیا جائے اور جنگ کا قصہ ختم کیا جائے۔

حکیم بن حزام نے کچھ اور ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا۔ سب نے اس کی تائید کی۔ پھر وہ عتبہ بن ربیعہ کے پاس آئے۔ عتبہ قریش کا سب سے بڑا سردار سب سے بڑا رئیس اور سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھا۔ اس وقت فوج کا سپہ سالار وہی تھا۔ طبیعت (۳۳۸) کے لحاظ سے سنجیدہ اور امن پسند تھا۔ عمرو بن حضرمی کا حلیف تھا۔ عرب کے قاعدہ کے مطابق اگر کوئی حلیف اپنے پاس سے یا قاتل سے وصول کر کے خون بہا ادا کر دیتا تھا تو قصاص کا مطالبہ ختم ہو جاتا تھا۔

حکیم بن حزام نے عتبہ کے سامنے تجویز رکھی کہ عتبہ بحیثیت حلیف حضرمی کا خون بہا منظور کر لیں اور رقم اپنے پاس سے ادا کر دیں۔ اس میں ان کی نیک نامی ہوگی اور قوم قریش مصیبت سے بچ جائے گی۔

عتبہ بن ربیعہ نے بڑی خوشی سے یہ تجویز منظور کر لی اور وعدہ کر لیا کہ صرف خون بہا نہیں بلکہ عمرو بن حضرمی (مقتول) کا جو مالی نقصان ہوا تھا اس کی تلافی بھی کر دوں گا۔ لیکن ہیرو ابوجہل تھا، زمام قیادت اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا متفق ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا عتبہ نے حکیم بن حزام ہی کے سپرد کیا کہ وہ ابوجہل سے بات چیت کریں۔ اس وقت جو اجتماع وہاں ہو گیا تھا اس سے خطاب کرتے ہوئے عتبہ نے کہا:

عزیزو! مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ تم محمد اور اس کے ساتھیوں کو نیست و نابود کر دو گے صرف یہی کر سکو گے کہ کچھ لوگوں کو مار ڈالو لیکن غور کرو۔ وہ مرنے والے کون ہوں گے اگر وہ تمہارے ہی بھائی بند ہوئے تو ان کے رشتہ داروں کا سلوک تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ جس کے بھائی یا بیٹے کو تم مارو گے اس کے عزیز جو تمہارے ہی ساتھیوں میں سے ہوں گے۔ تم سے ہمیشہ نفرت کیا کریں گے جب بھی تمہاری ملاقات ہوا کرے گی یہ احساس ان کے ذہن میں تازہ ہو جایا کرے گا کہ یہ میرے فلاں عزیز کا قاتل ہے۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ جنگ ملتوی کر دو۔ حاضرین نے اس سے اتفاق کیا۔ اب حکیم بن حزام ابوجہل کے پاس پہنچے۔ ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر درست کر رہا تھا۔ عتبہ کا پیغام سنا تو غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ اور بڑے طنز سے کہا۔ عتبہ کی ہمت ختم ہو گئی ہے اس کے حوصلہ نے جواب دیدیا ہے۔ اس کے پیٹ میں اس لیے مروڑ ہو رہا ہے کہ اس کا بیٹا (۳۳۹) مسلمان ہو چکا ہے۔ وہ محمد کے ساتھ ہے کہیں وہ مارا نہ جائے۔

پھر عمرو بن حضرمی کے بھائی عامر کو بلایا اور اس سے کہا۔ تمہارے بھائی کا حلیف عتبہ تمہارے بھائی کے خون کا قصہ ختم کرنا چاہتا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو خون کا بدلہ خون تمہارے سامنے ہے۔ مگر یہ موقع نکلا جا رہا ہے۔ اگر بھائی کا قصاص چاہتے ہو تو اٹھو اور اپنا مطالبہ لوگوں کے سامنے رکھو۔ چنانچہ عرب کے دستور کے مطابق عامر نے کپڑے پھاڑ ڈالے اور گرد اڑا کر دہائی دینے لگا۔ واعمراہ۔ واعمراہ (۳۴۰) اب کیا تھا۔ ساکن سمندر میں پھر طوفان آ گیا۔ عتبہ کو خبر پہونچی کہ ابوجہل نے یہ جواب دیا۔ تو ابوجہل کو گالی دے کر کہا۔ کل کو اگر جنگ ہوئی تو ابوجہل دیکھ لے گا کہ لڑائی سے کون جی چراتا ہے اور پیٹ میں مروڑ کس کے اٹھ رہا ہے۔ پھر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ سر پر رکھنے کے لیے خود منگایا مگر سر بڑا تھا خود چھوٹے تھے تو چادر ہی سر پر کس لی۔

قیام اور ترتیب میدان جنگ:

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ

''یہ وہ دن تھا کہ تم ادھر قریب کے ناکے پر تھے۔ ادھر دشمن دور کے ناکے پر اور قافلہ تم سے نچلے حصہ میں تھا۔ (سمندر کے کنارے جارہا تھا)''

العدوۃ الدنیا وادی کے بیچ میں ریت کا ٹیلا ہے۔ قریش نے مکہ سے آ کر اس کے ایک جانب پڑاؤ ڈالا۔ یہ کنارہ مکہ کی طرف تھا۔ اس کو دور کا ناکا (العدوۃ القصوی) فرمایا گیا ہے۔ دوسرا کنارہ وہ تھا جہاں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قدسی صفات رفقاء کے ساتھ نزول فرمایا۔ مدینہ سے جاتے ہوئے یہ پہلے پڑتا تھا اس کو العدوۃ الدنیا قریب کا ناکا فرمایا گیا۔ یہ بدر کے اس طرف سب سے پہلا چشمہ تھا۔

حضرت خباب بن مندر بن جموح رضی اللہ عنہ نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ حضرت اقدس نے یہ جگہ کسی ربانی اشارہ سے منتخب فرمائی ہے یا جنگ کی مصلحت سے۔ ارشاد ہوا اتفاقی بات ہے وحی نہیں ہے۔ حضرت خباب نے عرض کیا کہ مجھے یہاں کے چشموں اور کنوؤں کا پورا علم ہے جہاں قریش کی فوج ہے اس کے قریب ایک چشمہ ہے۔ ہم آگے بڑھ کر اس چشمہ پر قبضہ کر لیں۔ وہاں ایک ایسا کنواں ہے جس کا پانی بہت شیریں ہے اور اتنا گہرا ہے کہ کبھی ٹوٹتا نہیں۔ ہم اس کے قریب حوض بنا کر اس میں پانی بھر لیں گے تا کہ سہولت رہے اور آس پاس کے کنوؤں کو بند کر دیں گے۔

کسی جماعت کو پانی سے محروم کر دینا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو گوارا نہیں تھا۔ مگر مصلحت جنگ کی بنا پر آپ نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی تجویز منظور فرمائی۔ (۳۴۱)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک فرشتہ نازل ہوا اور اس نے بھی حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی تجویز کی تائید کی کہ ارشاد ربانی یہی ہے۔ (۳۴۲)

چشموں پر قبضہ کر لینے سے تشنہ لبی کا خطرہ تو نہ رہا۔ لیکن پانی اتنا وافر نہ تھا کہ غسل وغیرہ کی ضرورتیں پوری ہو سکتیں۔ میدان کا ریت اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ چلتے ہوئے پاؤں دھنستے تھے۔ دشمن سوار تھے اس کا کچھ نہ بگڑتا۔ مسلمان پیدل تھے ان کے پاؤں نہیں جم رہے تھے۔ کئی دن کے متواتر سفر سے خستگی چھائی ہوئی تھی۔ قدرتی طور پر ایک ذہنی کوفت بھی تھی کہ قافلہ نکل چکا اور ایک سخت معرکہ سامنے ہے۔ ممکن تھا خلجان اور بڑھتا اور ہمتوں میں کوئی پستی نمودار ہو جاتی۔ لیکن جب ارادہ خداوندی یہ تھا کہ اس دن کو یوم الفرقان قرار دے، حق کو ثابت (۳۴۳) اور مستحکم کر دے اور دشمنان حق کا پیچھا کاٹ دے تو پھر فضل الٰہی اس طرح نمودار ہوا کہ بادل اٹھے اور زور کی بارش برس گئی۔ موسم نہایت خوشگوار ہو گیا، ریت جم کر سخت ہو گیا، پاؤں دھنس جانے کا خطرہ جاتا رہا، صحابہ نے چھوٹے چھوٹے حوض بنا کر پانی جمع کر لیا، اطمینان سے نہائے دھوئے۔ صاف ستھرے ہو گئے۔ کوئی نہ

تھا جو چست و چاق نہ ہو گیا ہو۔ پھر نیند ایسی آئی کہ رات بھر آنکھ نہ کھلی۔ تمام تھکان اور کسل جاتا رہا۔ ہر شخص تازہ دم ہو گیا۔ یہ انعام خداوندی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی فضل و کرم کا اظہار فرمایا ہے:

اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ یُنَزِّلُ عَلَیْکُمْ الخ (سورہ انفال، ع ۲)

''جب ایسا ہوا تھا کہ اس نے (اللہ تعالیٰ نے) چھا جانے والی غنودگی تم پر طاری کر دی تھی کہ اس کی طرف سے یہ تمہارے لیے تسکین و بے خوفی کا سامان تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ تمہیں پاک و صاف ہونے کا موقع دے اور تم سے شیطان (کے وسوسوں اور ذہنی کوفت) کی ناپاکی دور کر دے۔ نیز تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھ جائے اور (ریتلے میدان میں تمہارے) قدم جما دے۔''

یہ نیند یا غنودگی جس کا خاص طور سے کلام الٰہی میں تذکرہ ہے۔ غیر معمولی انعام تھا۔ معلوم ہے جس کے دل میں خوف اور خطرہ ہو وہ آرام سے سو نہیں سکتا۔ پس اس نیند کا طاری ہو جانا بے خوفی کا القاء تھا اَمَنَةً مِّنْهُ یہ بے خوفی اور اطمینان من جانب اللہ تھا۔ (۳۴۴)

قرآن حکیم میں النعاس کا لفظ ہے۔ جس کے معنی غنودگی ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ اگرچہ آرام سے سوئے مگر چوکنا سوئے کہ دشمن نقصان نہ پہنچا سکے۔

ایک چشم بیدار:

حضرت علی رضی اللہ عنہ (۳۴۵) فرماتے ہیں: بارش سے ایسا سکون ہوا کہ سب کو نیند آ گئی۔ ہم میں سے جو بھی تھا محو خواب تھا۔ مگر ایک ذات تھی سردار قافلہ کی ذات جو بیدار تھی۔ (وہی سب کی محافظ بھی تھی) سرتاج دو جہاں ﷺ ایک درخت کے نیچے رات بھر یاد خدا میں مصروف رہے۔ چشم پرنم۔ دل پرسوز۔ گریہ طاری۔ زبان پر یا حی یا قیوم کا ورد۔ اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ (۳۴۶) تو آپ نے نماز صبح کے بعد تقریر فرمائی۔ لوگوں کو جہاد پر آمادہ کیا۔ (۳۴۷) (صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم)

بارش کا اثر دوسری جانب:

قریش نے نشیبی حصہ پر قبضہ کیا تھا۔ وہاں ریت نہیں تھا۔ لیکن پانی کا بہاؤ اسی طرف تھا۔ بارش ہونے سے وہاں کیچڑ اور دلدل ہو گیا جس کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔

تیاری:

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات ہی میں ہمیں تیار کر دیا تھا۔ (۳۴۸) کہ کون لوگ کہاں رہیں گے۔ حوصلہ افزائی کے لیے آپ نے تین پارٹیوں کے جھنڈے

علیحدہ علیحدہ تین حضرات کو دیدیئے۔ مہاجرین کا علَم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا۔ خزرج کے علمبردار حضرت ب بن منذر اور اوس کے حضرت سعد بن معاذ مقرر ہوئے۔ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

عریش نبوی کی حفاظت اسی دستہ نے اپنے ذمہ لی جس کے علمبردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ ایک عام ہدایت صادر فرمائی کہ جب تک دشمن قریب نہ آ جائے تیر نہ چلاؤ۔ (۳۴۹) جنگ کے موقع پر آپس کی پہچان کے لیے الفاظ مقرر کر دیئے جاتے تھے ان کو ''شعار'' کہا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کا شعار یا بنی عبدالرحمٰن مقرر فرمایا خزرج کا یا بنی عبداللہ، اوس کا یا بنی عبیداللہ اور عام صحابہ کا احد احد اور گھوڑے کا نام خیل اللہ تجویز فرمایا۔ (۳۵۰) اونٹوں کے گلوں میں گھونگرو اور ٹالیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کو کٹوا دیا۔ (۳۵۱) رمضان کا مہینہ تھا مگر آپ نے حکم دیدیا تھا کہ افطار کرتے رہیں۔ (۳۵۲)

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے نماز صبح کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی۔ پھر صف بندی کا حکم دے دیا صفوف کی نگرانی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ دست مبارک میں ایک تیر تھا اس کے اشارہ سے صفیں درست فرما رہے تھے کہ کوئی شخص تل بھر آگے اور پیچھے نہ رہنے پائے۔ لڑائی میں شور وغل عام بات ہے لیکن منع فرما دیا تھا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے۔

ایک زندہ دل کی ظرافت اور جذبہ شہادت:

سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ کچھ آگے نکلے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تیر جس سے آپ اشارہ فرما رہے تھے ان کے پیٹ پر لگ گیا۔ فوراً دہائی دی۔ یارسول اللہ۔ آپ عدل وانصاف کے مرکز ہیں۔ آپ اگر زیادتی کا بدلہ نہ دیں تو انصاف کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ آپ کا تیر میرے لگ گیا ہے۔ میں اس کا بدلہ لوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدلہ لینے کی اجازت دی تو سواد نے کہا کہ میرا پیٹ ننگا تھا۔ آپ بھی کرتہ ہٹایئے۔ تب انتقام صحیح ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ہی پیراہن مبارک ہٹایا۔ حضرت سواد نے شکم مبارک پر لب رکھ دیئے اور عرض کیا۔ یارسول اللہ ہم یہاں قربان ہونے کے لیے حاضر ہیں۔ میری تمنا ہوئی کہ اس آخری وقت میں اس جسم حقیر کی چمڑی جسد اطہر کی جلد پاک سے چھو جائے۔ یہ تمنا تھی۔ معاف فرمایئے محبت گستاخ (۳۵۳) ہو جاتی ہے۔ سرور کائنات رحمتہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دعا دی۔

''صدق ووفا'' ہمیں خدا کی مدد درکار ہے:

مسلح دشمن کی تعداد تین گنی ہے۔ اپنی تعداد کم اور سامان اس سے بھی کم۔ ایسے موقع پر ایک دو آدمی کا اضافہ بھی بشارت عظیم تھا۔ لیکن اخلاقی قدریں اس وقت بھی واجب الاحترام تھیں۔ چنانچہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اور ان کے والد ابو حسین رضی اللہ عنہ کہیں سے آ رہے تھے۔ دشمنوں نے راستہ میں روک لیا کہ محمد کی مدد کو جا رہے ہو (صلی اللہ علیہ وسلم) انہوں نے جان چھڑانے کے لیے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ ہم مدینہ جا رہے

ہیں۔ جنگ میں شرکت کے لیے نہیں جارہے۔ انہوں نے اس کا وعدہ لیا تو انہوں نے وعدہ بھی کرلیا کہ ہم جنگ میں شریک نہ ہوں گے۔ پھر ان صاحبان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال عرض کی اور جہاد میں شرکت کی درخواست کی۔ ارشاد ہوا ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے۔ ہمیں صرف خدا کی مدد درکار ہے۔ (۳۵۴)

ہمیں کسی مشرک کی مدد درکار نہیں:

ایک نامی گرامی بہادر جس کی زور آوری کی شہرت تھی حاضر خدمت ہوا کہ مسلمانوں کی مدد کروں گا۔ صحابہ کرام کو مسرت ہوئی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا آپ اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں۔ اس نے انکار کیا۔ ارشاد ہوا ہمیں کسی مشرک کی مدد کی ضرورت نہیں۔ یہ گفتگو ''حرالویرہ'' مقام پر ہوئی تھی۔ وہ واپس چلا گیا۔ پھر دوبارہ دوسرے مقام (الشجرۃ) پر آیا اور یہی عرض کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب وہی تھا۔ ''بیداء'' مقام پر تیسری مرتبہ حاضر خدمت ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اب بھی یہی سوال کیا۔ تـؤمـن باللہ ورسولہ۔ (کیا اللہ اور رسول کو مانتے ہو) اس مرتبہ خوش بختی اور سعادت نے اس کی رہنمائی کی اور جواب دیا کہ مانتا ہوں۔ تب ارشاد ہوا۔ انطلق۔ ساتھ چل سکتے ہو۔ (۳۵۵)

عریش نبوی:

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے تجویز پیش کی کہ ایک کنارے پر سائبان ڈال دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں قیام فرمائیں۔ یہ تجویز منظور ہوئی۔ ایک ٹیلے پر جہاں سے پورا میدان سامنے تھا۔ (۳۵۶) ایک سائبان بنا دیا گیا۔ پھر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ انصار کی جماعت کے ساتھ پہرے پر کھڑے ہو گئے۔

حضرت سعد کا خیال تو یہ بھی تھا کہ اگر جنگ کا رخ ہمارے خلاف ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حفاظت کے ساتھ مدینہ طیبہ پہنچا دیا جائے۔ کیونکہ ایک بڑی تعداد بندگان خاص کی رہ گئی ہے جو ہر طرح کی خدمت انجام دے گی اور اس وقت یہ لوگ صرف اس لیے نہیں آسکے کہ ان کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ جنگ پیش آجائے گی۔ بہر حال حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا یہ مخلصانہ جذبہ قابل قدر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جذبہ کی قدر کی۔ اس طرح گویا وہ اپنے اس عہد کی ذمہ داری پوری کرنا چاہتے تھے جو بیعت عقبہ میں کی تھی۔ لیکن وہ بہادر آقا جس نے احد میں روئے مبارک پر سب کچھ برداشت کیا۔ مگر رُخ نہیں پلٹا اور غزوہ حنین میں جب ساتھیوں سے بچھڑ گیا تو انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب کا نعرہ لگاتا ہوا میدان میں کود پڑا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا یہ جذبہ اگرچہ مستحق شکریہ تھا مگر اس آقا نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی افتاد طبع کے خلاف تھا۔ چنانچہ غزوہ بدر میں بھی جب گھمسان کی لڑائی ہونے لگی تو وہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام عریش میں نہیں بلکہ میدان میں تھے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے۔)

ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض عام اور دشمن کی شرارت:

پانی پر اگر چہ قبضہ کرلیا گیا تھا۔ مگر ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض عام تھا اس لیے دشمنوں کو بھی پانی پینے کی اجازت تھی (۳۵۷) مگر دشمنوں کا منشا یہ تھا کہ پانی برباد کیا جائے۔ چنانچہ تیر برسانے شروع کر دیئے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت مہجع کے تیر لگا۔ (۳۵۸) وہ شہید ہو گئے۔ یہ اس معرکہ میں سب سے پہلے شہید تھے۔ حارثہ بن سراقہ (۳۵۹) پانی پینے جا رہے تھے ایک تیر ان کے لگا وہ بھی شہید ہو گئے۔

دشمن کی شرارت اور آگے بڑھی۔ اسود بن الاسد مخزومی جو ایک نہایت بدطینت اور بدخلق آدمی تھا۔ قسم کھا کر آیا کہ اس حوض کو تباہ کردوں گا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس کو روکنے کے لیے آگے بڑھے تو اسود مقابلہ پر آ گیا۔ حضرت حمزہ نے تلوار کا جواب تلوار سے دیا۔ اسود کی ٹانگ پر تلوار لگی لیکن وہ پھر بھی حوض کی طرف بڑھا تو حضرت حمزہ نے دوسری ضرب سے اس کا کام تمام کردیا۔ یہ مشرکین کا سب سے پہلا قتل تھا۔ (۳۶۰)

قریش کی طرف سے حق پرستی کی نمائش:

قبیلہ غفار کے ایک رئیس (خفاف بن ایماء بن رمضہ یا ایماء ابن رمضہ) نے اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ اُونٹ ابوجہل کے پاس بھیجے اور یہ پیغام بھیجا کہ اگر اور مدد کی ضرورت ہو تو ہم اسلحہ بھی فراہم کر سکتے ہیں اور آدمی بھی۔ ابوجہل نے اس رئیس کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے حق دوستی ادا کر دیا۔ باقی مزید کمک کے متعلق یہ جواب ہے کہ اگر معاملہ صرف انسانوں سے مقابلہ کا ہے تو ہماری طاقت بہت کافی ہے ہمیں کسی مدد کی ضرورت نہیں لیکن اگر معاملہ خدا سے مقابلہ کا ہے جیسا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں تو خدا کے مقابلہ پر ہماری ہر ایک طاقت بیکار ہے۔

مبارزہ:

هٰذَانِ خَصْمَانِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ

''یہ دو مقابل فریق ہیں۔ جو جھگڑتے ہیں اپنے رب میں۔'' (۳۶۱)

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اسود قتل ہوا تو عتبہ بن ربیعہ میدان میں آیا۔ عتبہ قریش کا رئیس اعظم (۳۶۲) فوج کا قائد اور آن بان کا آدمی تھا۔ ابوجہل کے طعنہ سے سخت برہم تھا اسی لیے سب سے پہلے وہی آیا اور اس شان سے آیا کہ سینہ پر شترمرغ کے پر سج رہے تھے جو بڑے لوگوں کی امتیازی خصوصیت ہوا کرتے تھے۔ عتبہ کے ایک جانب اس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ تھا، دوسری جانب اس کا بیٹا ولید۔ عرب کے دستور جنگ کے مطابق میدان میں نکل کر انہوں نے نعرہ لگایا هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ۔ کس کی ہمت ہے جو مقابلہ پر آئے۔؟ تین بہادر انصاری فوراً مقابلہ کو نکلے۔ عوف بن حارث۔ معاذ بن حارث اور عبداللہ بن رواحہ (رضی اللہ عنہم)

عتبہ نے ان صاحبان کا نام اور حسب نسب پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ انصاری ہیں تو اس نے کہا۔

''بلاشبہ تمہارے لیے ان دو گروہوں میں بڑی نشانی تھی جو ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے۔ ایک گروہ لڑ رہا تھا راہ خدا میں اور دوسرا منکرین حق کا گروہ تھا۔ وہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان سے دو چند ہیں۔ (۳۶۵) اور اللہ تعالیٰ جس کسی کو چاہتا ہے اپنی نصرت سے مدد پہنچاتا ہے۔ بیشک اس میں بڑی ہی عبرت ہے ان کے لیے جو چشم بینا رکھتے ہیں۔''

وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا (انفال ع ۵)

''اور جب تم دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے اور اللہ نے ایسا کیا تھا کہ دشمن تمہاری نظر میں تھوڑے دکھائی دیئے (کیونکہ تمہارے دلوں میں ایمان و استقامت کی روح پیدا ہوگئی تھی) اور ان کی نظروں میں تم تھوڑی دکھائی دیئے (کیونکہ تعداد میں وہی زیادہ تھے) اور یہ اس لیے کیا تھا تاکہ جو بات ہونے والی تھی اسے کر دکھائے اور سارے کاموں کا دارومدار اللہ کی ذات پر ہے۔''

پہلے ہی مرحلہ میں قریش کا مایہ ناز رئیس عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی اور بیٹے کے ساتھ موت کے گھاٹ اتر گیا۔ (۳۶۶) یہ قریش کے لیے بہت سخت دھکا تھا۔ ان کے پاؤں اس دھکے سے اکھڑ سکتے تھے۔ مگر ابوجہل فوراً میدان میں نکلا اور پکار کر کہا۔ یہ لوگ (عتبہ وغیرہ) جلد بازی میں اپنی جانیں کھو بیٹھے تم گھبراؤ نہیں۔ آگے بڑھو۔ دشمن کی حقیقت کیا ہے۔ مٹھی بھر آدمی ہیں۔ انہیں پکڑ و اور ان کو ان کے کرتوتوں کی سزا دو۔ یہ بھی کوئی بات نہ ہوگی کہ ان کو تلوار کے گھاٹ اُتار دو۔ انہیں زندہ پکڑو اور پہاڑوں میں دھکیل دو۔ جہاں یہ زندگی بھر لاچار زندگی کی سزا بھگتتے رہیں۔ بھوکے پیاسے رہیں اور سسک سسک کر جان دیں۔ میں لات وعزیٰ کی قسم دیتا ہوں۔ انہیں بتادو کہ لات وعزیٰ کو چھوڑ کر کس طرح ذلیل وخوار اور تباہ وبرباد ہوئے۔ قسم ہے لات وعزیٰ کی میں انہیں ابھی ان کی کرتوتوں کا مزا چکھاتا ہوں۔ (۳۶۷)

وہ یہ تقریر کر رہا تھا اور بڑے زور میں یہ رجز پڑھ رہا تھا:

ما تنقم الحرب الشموس منی بازل عامین حدیث سنی لمثل هذا ولدتنی امی

''دہشت انگیز لڑائیوں کو میری یہ بات ناگوار نہیں ہے کہ میں پختہ کار اور تجربہ کار نوجوان ہوں اسی جیسے معرکہ کے لیے ہی میری ماں نے مجھ کو جنا ہے۔''

کبھی مذہب پرستوں کو متاثر کرنے کے لیے کہتا تھا اللهم اولانا بالحق فانصره۔ خداوندا! ہم میں سے جو حق کا زیادہ مستحق ہو اس کی مدد فرما۔ (۳۶۹)

ابوجہل کی گرج کامیاب رہی۔ قریش کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ وہ اسی حوصلہ کے ساتھ میدان میں

ہمیں آپ لوگوں سے غرض نہیں۔ ہمارے مقابلے پر ہمارے جوڑ کے ہمارے برادر آنے چاہییں پھر اس نے پکار کر کہا:

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے جوڑ کے بہادروں کو ہمارے مقابلہ پر بھیجو۔

عتبہ کا یہ مطالبہ سمع مبارک تک پہونچا تو ارشاد ہوا۔ عبیدہ بن حارث، حمزہ اور علی (رضی اللہ عنہم) میدان میں آئیں۔ یہ حضرات سپاہیانہ انداز میں آگے بڑھے۔ ہتھیار لگائے ہوئے، سر چھپائے ہوئے، چہرے نظر نہیں آتے تھے۔

عتبہ نے پوچھا: کون؟

ہر ایک نے اپنا نام خود بتایا اب عتبہ نے کہا۔ ہمارا جوڑ یہ ہے۔

عتبہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے۔ ولید حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ پر آیا۔ اور دونوں مارے گئے۔ عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہ کو زخمی کیا۔ حضرت علی نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت عبیدہ (رضی اللہ عنہ) کو کندھے پر اٹھا کر آقا دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ حارث بن عبدالمطلب کے بیٹے صحابہ کرام میں سب سے زیادہ سن رسیدہ (۳۶۳) سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا سر زانوئے مبارک پر رکھ لیا۔ شہید عشق نے ناز برداری دیکھی تو عرض کرنے لگے۔ یارسول اللہ اگر آج ابو طالب زندہ ہوتے تو تسلیم کر لیتے کہ ان کے اس شعر کا مصداق میں ہوں۔

ونسلمه حتی نصرع دونه– ونذهل عن ابناء نا والحلائل

''ہم (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) دشمن کے حوالے اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ ان کے گرد ہماری لاشیں پڑی ہوئی ہوں۔ بچے اور عورتیں سب فراموش ہوں۔''

اس کے بعد بڑے مزے سے یہ شہید وفا دنیا سے رخصت ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اَشْهَدُ اَنَّكَ شَهِيْدٌ ''میں شاہد ہوں کہ آپ شہید ہیں۔''(۳۶۴) زہے قسمت

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے
کہ بوقت جان سپردن بسرش رسیدہ باشی

عظیم الشان تاریخ کا عجیب وغریب عبرت آموز سبق:

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا– فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاءُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ۔
(آل عمران ع ۲)

ڈٹے ہوئے تھے۔ اپنے مقابل مسلمانوں پر جو فی الواقع کم تھے حقارت کی نظر ڈال رہے تھے۔ مسلمانوں کے حوصلے ان کی پہلی کامیابی سے اگرچہ بلند ہوئے مگر وہ فی الواقع تھوڑے تھے اور یہ جذبات کا عجیب وغریب طوفان تھا جو دونوں طرف امنڈ رہا تھا۔ لیکن ایک خاص کیفیت نے مسلمانوں کو غیر مسلموں سے ممتاز کر دیا تھا نظر حقیقت پسند میں وہی کیفیت قابل قدر ہے اور وہی نشان صداقت ہے۔ اللہ کی کتاب نے اس کیفیت کی نشان دہی ان الفاظ میں کی ہے۔

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ (سورہ انفال ع ۱)

''وہ وقت یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے۔''

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ضج الصحابة بصنوف الدعاء الى رب الارض والسماء سامع الدعاء و كاشف البلاء (۳۷۰)

''صحابہ کرام۔ اپنے اپنے انداز میں اس کی بارگاہ میں گڑگڑا رہے تھے جو رب ارض وسما ہے جو دعائیں سنتا اور مصیبت دور کرتا ہے۔''

محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ احکم الحاکمین میں سجدہ ریزی اور گریہ وزاری:

لیکن ان کے سردار اور آقا۔ سرتاج دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سب سے نرالی تھی۔ وہی آقا جو کامیابی کی صرف بشارت ہی نہیں دے چکا تھا بلکہ یہ بھی بتا چکا تھا کہ کس کی نعش کہاں پڑی ہوگی اس کی حالت اس وقت یہ تھی کہ اپنے عریش میں قبلہ رو سربسجود تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ (۳۷۱) فرماتے ہیں: میں کئی بار عریش میں گیا۔ میں نے ہر مرتبہ یہی دیکھا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سربسجود ہیں یا حی یا قیوم زبان مبارک پر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۳۷۲) فرماتے ہیں: میں نے اس عاجزی اور زاری کے ساتھ کبھی کسی کو دعا کرتے نہیں دیکھا۔ جس طرح آپ دعا کر رہے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۳۷۳) فرماتے ہیں: جیسے ہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ منظر آیا کہ ایک طرف آپ کے مٹھی بھر ساتھی ہیں۔ کمزور بے بس، تہی دست وتہی شکم، برہنہ بدن، برہنہ پا۔ دوسری طرف دشمن ہے کہ تعداد میں سہ چند۔ ہر طرح کا سامان ان کے پاس موجود۔ ہر طرح کی لت اس کو حاصل ہے۔ ان میں ہر ایک نفر چنیدہ بہادر ہے۔ ایسا مسلح گویا فولاد میں غرق۔ جیسے ہی میدان جنگ کا یہ منظر سامنے آیا۔ سردار دو عالم مصروف دعا ہو گئے۔ کبھی آپ سجدہ کرتے۔ کبھی ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتے۔ محویت کا یہ عالم تھا کہ چادر شانہ مبارک سے ڈھل جاتی تھی اور آپ کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ کبھی آپ فرماتے۔ خداوندا یہ مٹھی بھر جماعت اگر آج ختم

ہوگئی تو کرہ زمین سے تیری عبادت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ پھر قیامت تک تیرا سچا پرستار کوئی نہیں ہوگا۔

دیر ہوگئی تضرع اور زاری کی یہی کیفیت طاری رہی۔ تو وہی رفیق خاص جو غار ثور میں ثانی اثنین تھے اور اس عریش میں سایہ کی طرح ساتھ تھے (۳۷۴) ۔ آگے بڑھے اور عرض کیا، یارسول اللہ! دعا بہت ہو چکی۔ اپنے خدا سے آپ کافی التجا کر چکے۔ آپ کی دعا یقیناً قبول ہوگی۔ اب آپ باہر تشریف لے چلئے ادھر خود محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے قبولیت دعا کے آثار مشاہدہ فرمائے۔ یہ بھی روایت (۳۷۵) ہے کہ اس حالت میں کچھ غنودگی طاری ہوگئی۔ اس میں خاص بشارت ہوئی۔ اب سید الانبیاء کی ہمت بے پناہ تھی۔ یقین ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کا رابطہ اپنے رب سے مضبوط ہے اور رب اکبر کی نصرت ان کے شامل حال ہے۔ چنانچہ آپ میدان کی طرف بڑھے۔ ذرہ (۳۷۶) جسم مبارک پر ڈھلک رہی تھی۔ زبان پر وہی آیت تھی۔ جو چند سال پہلے مکہ معظمہ میں نازل ہو چکی تھی جب کہ نہ میدان جنگ کا تصور تھا نہ دشمن کی ہزیمت کا۔ مگر ارشاد یہ ہوا تھا۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ''عنقریب اس گروہ کی شکست ہوگی اور یہ پشت پھیر کر بھاگیں گے۔''

یہ آیت پڑھتے ہوئے آپ دشمنوں میں گھس گئے۔ آقا کے ساتھ ساتھ ان کے جانباز رفقاء بھی ٹوٹ پڑے۔ گھمسان کا رن پڑنے لگا۔ (۳۷۷)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ ہمیشہ اس سے احتیاط برتی کہ آپ کی تلوار کسی کے خون سے تر ہو۔ آپ فرمایا (۳۷۸) کرتے تھے کہ خدا کا غضب سب سے زیادہ اس پر ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ سے مارا جائے۔ آپ اپنے ہاتھ سے کسی کو بدبخت بنانا پسند نہیں فرماتے تھے۔ لیکن صحابہ کرام نے ہمیشہ ہمیشہ یہ بھی دیکھا کہ خاص گھمسان کے وقت آپ دشمن کے نرغہ میں ایک چٹان کی طرح جمے ہوئے اپنے جان نثاروں کے پناہ گاہ بنے رہتے (۳۷۹) تھے۔

اس غزوہ کے متعلق بھی سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمن سے بہت قریب ہم سب کی پناہ بنے ہوئے تھے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے برابر تھے دشمن نرغہ کرتا تو ہم آپ کی آڑ لیتے تھے۔ (۳۸۰)

مقابلہ پوری شدت سے شروع ہوا۔ بہادر داد شجاعت دینے کے لیے آگے بڑھے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد صحابہ کرام نے ایک عجیب بات دیکھی جس کی ان کو ہمیشہ حیرت رہی۔ وہی دشمن جن کو اپنی قوت پر ناز تھا۔ دفعۃً وہ اپنی طاقت کھو چکے تھے۔ وہ گردنیں جو غرور سے اکڑی ہوئی تھیں مولی گاجر کی طرح کٹ رہی تھیں۔ وہ فیل تن جو کئی کئی کے قابو میں نہیں آتے۔ ایک کمزور صحابی اس کی مشکیں کس رہا تھا اور وہ فیلتن دم بخود تھا۔

مقابلہ کے بعد جب بادل چھٹا تو ستر دشمن زمین پر ڈھیر تھے۔ ستر گرفتار۔ باقی فرار اور مسلمان صرف ۱۴) شہید۔ مختصر یہ کہ وہ دعا تھی اور یہ قبولیت دعا اب کلام اللہ کی چند آیتوں میں روداد جنگ مطالعہ کیجئے۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ (انفال ع ۱)

وَاِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلَائِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ (انفال ع ۲)

''جب ایسا ہوا تھا۔ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے (کہ ہماری مدد کر) اس نے تمہاری فریاد سن لی تھی (اور بتا دیا تھا) کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا۔

یہ وہ وقت تھا کہ تیرے رب نے فرشتوں پر وحی کی تھی میں تمہارے ساتھ ہوں پس مومنوں کو جمائے رکھو۔

(ابھی ابھی) ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں ہیبت ڈال دوں گا۔

(سو مسلمانو) ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ ان کے ہاتھ پاؤں کی ایک ایک انگلی پر ضرب لگاؤ (تمہیں پوری طرح قابو حاصل ہوگا)

یہ اس بنا پر کہ ان کافروں نے اللہ اور اس کے رسول کی سخت سے سخت مخالفت کی۔

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو (یاد رکھو) اللہ کی سزا سخت ہوتی ہے۔

(حق کے دشمنو) یہ ہے سزا تمہاری۔ اس کو چکھو۔ اور (سمجھ لو) کہ منکرین حق کو آتش دوزخ کا عذاب بھی ملنے والا ہے۔''

عجیب وغریب معاملات:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (سورہ انفال)

''تم نے ان کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا۔''

کیا آپ کو حیرت نہیں ہوئی۔ جو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن پہلے بتا چکا تھا کہ ابوجہل یہاں مردہ پڑا ہوگا۔ اور عتبہ کی لاش وہاں ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

آج جب میدان جنگ گرم ہونے والا ہے۔ وہ ایک جھونپڑی میں زمین پر پیشانی رکھے ہوئے کس طرح گڑگڑا رہا ہے۔

بلاشبہ مقام حیرت ہے۔ مگر یہ معاملہ ہے ان کا جو حقیقت شناس ہیں، جو خدا شناس ہیں، جو صحیح معرفت رکھتے ہیں، جو خدا کو پہچانتے ہیں، اس کی عظمت کو پہچانتے ہیں، اس کی بے نیازی کو جانتے ہیں، بلاشبہ وہ صادق الوعد ہے۔ مگر وہ قادر ذوالجلال بھی ہے۔ وہ فعال لما یرید ہے۔

بلاشبہ وہ کریم کارساز ہے، وہ غفار دستار ہے مگر وہ چاہے تو معمولی غلطی پر بڑے سے بڑے مقرب کی سخت

سے سخت گرفت کرسکتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے سامنے دم مار سکے۔ لَا یُسْئَلَ عَمَّا یَفْعَلُ۔

''وہ جو کچھ کرے اس سے باز پرس نہیں کی جاسکتی۔ کوئی نہیں جو اس سے جواب طلب کر سکے۔

اچھا اب آپ خود اپنے ایمان کے اہم جزو پر غور فرمائیے:

کلمہ شہادت ہمارے ایمان کا مدار ہے۔ محمد رسول اللہ بلاشبہ حبیب خدا ہیں، محبوب رب العالمین ہیں، سید الانبیاء ہیں، فخر موجودات ہیں، صاحب لولاک ہیں۔ لیکن کلمہ شہادت میں ان اوصاف وکمالات میں سے کسی کا ذکر نہیں ہے۔ ذکر ہے تو صرف عبد کا اور پوری کائنات میں، انبیاء مرسلین کی پوری تاریخ میں، معراج کی سب سے بڑی فضیلت اس نزہت فرماءعرش بریں کو عطا ہوئی اور قرآن حکیم میں اس کا ذکر کیا گیا تو وہاں بھی آپ کے تذکرہ کے لیے لفظ عبد ہی استعمال فرمایا جارہا ہے۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ

حقیقت یہ ہے کہ خالق ذوالجلال کے مقابلہ میں مخلوق کی سب سے اعلیٰ صفت عبدیت ہے یعنی خود اپنی حقیقت کی معرفت۔ وہ مخلوق جو ایک امر کن کی مرہون منت ہے خالق کے مقابلہ میں کیا اس کی بھی کوئی حقیقت ہے؟ کیا اس کی بھی مجال ہے کہ وہ اپنی کوئی حقیقت سمجھے اور اس کو نظر میں لائے۔ مخلوق کا سب سے اعلیٰ کمال یہ ہے کہ وہ اپنی اسی حقیقت کو پہچانے کہ وہ بے حقیقت ہے۔ عبد کامل وہ ہے جس کی نظر سے اپنی یہ حقیقت بے حقیقت کبھی بھی اوجھل نہ ہو۔ محض سخن سازی اور عبارت آرائی یا واعظانہ فلسفہ سنجی کی حد تک نہیں بلکہ اس طرح کہ یہ اس کا اذعان ویقین ہو اور وہ اس اذعان ویقین سے ایسا ہی متاثر ہو جیسے برف کی ٹھنڈک یا آگ کی تپش سے ہمارا جسم متاثر ہوتا ہے یا دل کی بڑھی ہوئی دھڑکن سے بدن کا ایک ایک جوڑ لرزنے لگتا ہے۔

اب جب آپ اس عریش مقدس میں سرور کائنات ﷺ کی سجدہ ریزی اور تضرع وزاری پر نظر ڈالیں تو اس پر بھی نظر ڈالیں کہ سید المرسلین کا وہ کمال نقطہ عروج پر ہے جس کا نام عبدیت کاملہ ہے جس نے اس کو سید المرسلین بنایا۔ امام الانبیاء بنایا۔ صاحب معراج بنایا۔ جس نے چند سال پہلے عرش بریں پر رب العالمین سے وہ مناجات کی تھی جس کا ظہور قیامت تک کروڑوں اربوں بندگان حق پرست کی نمازوں کی شکل میں ہوتا رہے گا۔

اس عبد کامل کی کمال عبدیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ معبود حقیقی نے تمام معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فرشتوں کو مامور فرمایا کہ مسلمانوں کے حوصلے بلند کریں۔ ثبات واستقلال کے انجکشن سے ان کے دلوں کو مضبوط کریں۔ دوسری طرف کافروں کے دلوں سے حوصلے سلب کیے، انہیں مرعوب کیا۔

اپنے نبی کو اشارہ فرمایا کہ گولہ بارود کا کام مٹی کے ریزوں سے لیں۔ ایک مٹھی اٹھا کر دشمنوں کی طرف پھینک دیں۔ ہر ایک کی آنکھ گرد آلود ہو جائے گی۔ اشک آور گیس کا کام مشت خاک سے لیا جائے گا۔

چنانچہ محبوب رب العالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کنکریوں کی ایک مٹھی لی اور دشمن کی طرف پھینک دی زبان مبارک سے صادر ہوا شاھت الوجوہ اب لشکر قریش کے ہر فرد کی آنکھ خاک آلود تھی اور دل ہیبت زدہ۔ مقابلہ پھر بھی ہوا، تلواریں پھر بھی چلیں۔ مگر اس کی نوعیت ایسی تھی کہ جو کمزور تھے وہ طاقتور تھے اور طاقتور گویا

مجروح تھے۔ اقلیت کا اقدام دلیرانہ تھا اور اکثریت کا جواب حرکت مذبوحانہ۔ ابوجہل نے جن کو کہا تھا کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو گرفتار کرلیں وہ خود پابند سلاسل تھے۔

ذیل کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اسی احسان عظیم کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (سورہ انفال ع ۲)

''پھر کیا تم نے جنگ میں انہیں قتل کیا (نہیں) خدا نے انہیں قتل کیا (محض اس کی تائید سے ایسا ہوا) (اے پیغمبر) تم نے جب (میدان جنگ میں مٹھی بھر خاک) پھینکی تو حقیقت یہ ہے کہ وہ تم نے نہیں پھینکی تھی خدا نے پھینکی تھی۔ اور یہ اس لیے ہوا تھا تاکہ ایمان والوں کو ایک آزمائش میں ڈال کر ان پر احسان عظیم فرمائے بیشک اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔''

وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا:

''(تاکہ اس (۳۸۲) کے ذریعہ ایمان والوں کو بہتر آزمائش میں ڈال کر آزمالے)''

جس طرح حق پرستوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کا یہ انعام تاریخ عالم کا عجیب واقعہ ہے ایسے ہی حق پرستوں کا ایثار بھی فدائیت اور فنافی الحق کی تاریخ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز کارنامہ ہے اس سے زیادہ ایثار کیا ہوسکتا ہے کہ خود اپنے عزیز وقریب اپنے جگر کے ٹکڑے سامنے ہیں اور تلواریں ان کے مقابلہ کے لیے اٹھ رہی ہیں۔

حضرت ابوبکر کے لخت جگر عبدالرحمٰن نے میدان میں نکل کر آواز دی ھل من مبازر (میرے مقابلہ کے لیے کون آتا ہے) تو سیدنا ابوبکر تلوار سونت کر مقابلہ کے لیے تیار ہوگئے۔ (۳۸۳)

عتبہ میدان میں آیا تو ان کے فرزند ابوحذیفہ (۳۸۴) اس کے مقابلے کو نکلنے (۳۸۵) لگے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تلوار ماموں کے خون (۳۸۶) سے ر تھی۔

حضرت ابوعبیدہ بن جراح کے والد نے بیٹے پر حملہ کیا۔ بیٹے نے مدافعت کی تو بیٹے کی تلوار سے باپ مقتول تھا۔ (۳۸۷)

حضرت عوف بن حارث رضی اللہ عنہ نے مسئلہ پوچھا۔ یارسول اللہ۔ اللہ تعالیٰ کس بات سے خوش ہوتا ہے ارشاد ہوا۔ غمسہ یدہ فی العدو حاسرا (یعنی کپڑے اتار کر دشمن سے گھ جاؤ۔ یہ ہے رب ذوالجلال کی خوشنودی کا ذریعہ) حضرت عوف کے بدن پر زرہ تھی۔ یہ سنا تو اس کو بھی گوارا نہیں کیا کپڑوں کے ساتھ زرہ بھی اتار دی۔ پھر تلوار لے کر دشمنوں کے جتھے میں گھس گئے اور جان قربان کر دی۔ (۳۸۸)

مشرکین کا ہجوم ہوا تو لسان مبارک سے یہ جملے صادر ہوئے:

قُومُوا الی جنة عرضها السموات والارض (او کما قال صلّی اللّٰہ علیه وسلّم)

''لوگو جنت کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ (جواتنی وسیع ہے کہ) آسمان وزمین اس کا عرض ہیں۔''

ایک انصار جانباز عمیر بن حمام کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے تو کہنے لگے بخ بخ۔ خوب خوب۔ پھر عرض کیا۔ اگر میں جان دیدوں تو کیا یہ جنت نصیب ہوگی؟ ارشاد ہوا ضرور! حضرت عمیر نے جھولے سے کچھ کھجور نکالے کہ پیٹ میں سہارا لے کر حملہ کریں گے لیکن دفعتہً خیال آیا کہ ان کے چبانے اور نگلنے میں تو دیر لگ جائے گی۔ داخل جنت ہونے میں دیر کیوں کی جائے چھوارے پھینکے۔ تلوار سنبھالی اور دشمنوں کی صف میں گھس گئے۔ تابڑتوڑ حملہ کرتے ہوئے خود اپنی جان بھی دیدی۔ یعنی خاتمہ جنگ سے پہلے ہی اپنی مراد میں کامیاب ہو گئے۔ چھوارے پھینک کر تلوار سنبھالی تو لوگوں نے سنا ان کی زبان پر یہ رجز تھا۔

رکضا الی الله بغیر زاد الا التقی وعمل المعاد والصبر فی اللّٰہ علی الجهاد وکل زاد عرضة النفاد غیر التقی والبر والرشاد رضی الله عنه

کوئی توشہ نہیں ہے۔ خدا کی طرف دوڑ رہا ہوں ہاں توشہ ہے۔ خوف خدا۔ اور وہ کام جو آخرت کے لیے کیے گئے اور راہ خدا میں جہاد کرتے ہوئے صبر و استقلال۔ جو بھی توشہ ہے ختم ہونے کے لیے ہے۔ باقی رہنے والا توشہ یہ ہے۔ تقویٰ، نیکی اور ہدایت (ابن جریر۔ سیرۃ حلبیہ ص ۱۸۵)

ایک جانباز مہاجر معبد بن وہب تھے رضی اللہ عنہ۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں تلواریں لے رکھی تھیں اور دو طرفہ حملہ کر رہے تھے۔ یہ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہ کے بہنوئی تھے۔

نصرت خداوندی اور امدادِ غیبی کی صورتیں اور مشاہدہ آثار

① تعلیمات قرآنی کا مرکزی نقطہ ہے۔سعی کامل اور اعتماد علی اللہ۔

سعی کامل۔یعنی اپنی تمام صلاحیتوں کو لگا دینا اور مصروف عمل کر دینا جہاد کہلاتا ہے۔انسان کا فرض یہی ہے۔لیکن سعی کامل کے لیے کامیابی ضروری نہیں۔کامیاب کرنا خدا کا کام ہے۔یہ ایک حقیقت ہے صرف اعتقاد نہیں۔ایک منکر خدا سے انکار کر سکتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ جس طرح وہ سعی اور جدوجہد پر قادر ہے اسی طرح کامیابی اس کے قابو کی چیز نہیں ہے۔ایک ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر سب کچھ کرنے کے باوجود بسا اوقات ناکام رہتا ہے اور مریض کو موت کے پنجہ سے نہیں چھڑا سکتا۔ایک مومن کا فرض ہے کہ اس حقیقت کو اپنے اذعان و یقین کا محور بنا لے۔یعنی اپنی آخری اور انتہائی کوشش کے باوجود۔نظر اپنی کوشش پر نہ رکھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر رکھے۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ

② بلاشبہ۔اللہ تعالیٰ صرف امر کن سے ناکام کو کامیاب اور کامیاب کو ناکام بنا سکتا ہے وہ ایک معمولی اشارے سے قوموں کی قسمتیں پلٹ سکتا ہے۔مگر اس عالم اسباب میں وہ ایسا نہیں کرتا۔بلکہ وہ قوموں کو آزماتا ہے۔صلاحیتوں کا موازنہ کرتا ہے اور عمل اور صلاحیت کے معیار پر نتائج سے بہرہ ور کرتا ہے۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ

''تا کہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہنے والا ہے وہ اس طرح رہے کہ اس کے پاس زندگی کی دلیل اور اپنے باقی رہنے کی حجت موجود ہو۔''

③ عمل اور صلاحیت کے معیار پر جو قوم صحیح ثابت ہوتی ہے اس کو کامیابی بخشتا ہے مگر یہ بھی امر کن سے نہیں بلکہ یہ کامیابی بھی ذرائع اور اسباب کے راستے ہی سے عطا کرتا ہے۔

④ کلام الٰہی مختلف عنوانوں سے یہ بھی واضح کرتا ہے کہ عالم صرف ایک نہیں بلکہ بہت سے عالم ہیں اور ذرائع اور اسباب صرف وہی نہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔جن کو ہم روزمرہ کی زندگی میں ذرائع اور اسباب مانتے ہیں بلکہ ذرائع اور اسباب کچھ اور بھی ہیں۔اگر ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے تو ہمارے لیے درست نہیں ہے کہ ہم ان کے وجود کا صرف اس لیے انکار کر دیں کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔

ملیریا کے جراثیم اگر ہمیں نظر نہیں آتے اور اگر اطباء اور حکماء قدیم ان سے ناواقف تھے تو یہ کسی طرح درست نہیں ہے کہ ہم اس جہل اور ناواقفیت کو ہمیشہ کے لیے علم قرار دیں اور جراثیم جیسی حقیقت کے تسلیم کرنے میں پس و پیش کریں۔

⑤ حق اور باطل، خیر اور شر نتائج ہوتے ہیں ان نتائج کے لیے جس طرح ظاہری اسباب ہیں اور جس

طرح ظاہری اسباب کے لشکر ہیں۔ اسی طرح باطنی اسباب کے بھی لشکر اور ان کے بھی جنود مجندہ ہیں۔

⑥ یہ غزوہ بدر جو یوم الفرقان تھا۔ اس میں جس طرح حق اور باطل کے ظاہری علم بردار ٹکرائے اسی طرح ان کے باطنی اسباب وذرائع اور ان کے حاملین وعوامل میں بھی تصادم ہوا۔

⑦ وہ پوشیدہ طاقتیں جو باطل کی مددگار ہوا کرتی ہیں جن کی قیادت شیطان کرتا ہے۔ اپنے ہمنواؤں کی امداد کے لیے میدان میں آئیں۔ مکہ میں جب قافلہ لوٹنے کی افواہ پھیلی اور قریش نے جنگ کی تیاری کی تو اس شیطان نے اپنے ہمنواؤں اور ہم جنسوں کو اطمینان دلایا تھا۔

لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ (سورہ انفال ع ٦)

''آج ان لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں۔''

لیکن ان کا حشر یہ ہوا کہ:

فَلَمَّا تَرَاۗءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكُمْ اِنِّىْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ (انفال ع ٦)

''جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو (شیطان) اُلٹے پاؤں واپس ہوا اور کہنے لگا مجھے تم سے سروکار نہیں مجھے وہ بات دکھائی دے رہی ہے جو تم نہیں دیکھتے۔''(۳۸۹)

⑧ لیکن ان کے مقابلہ میں خیر اور حق کی طاقتیں نہ صرف اپنے کاموں میں مشغول رہیں بلکہ وہ سب کچھ کرتی رہیں جو ایک حق پرست جماعت اپنی کامیابی کے لیے کرسکتی ہے۔ نصوص قرآنی میں ان کی تصریحات یہ ہیں۔

(الف) جب اہل حق نے اپنے رب سے مدد کی دہائی دی اور ان کی دعا قبول ہوئی تو ایک ہزار ملائک یکے بعد دیگرے ان کی مدد کے لیے بھیجے گئے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کی اطلاع دی گئی۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ (سورہ انفال ع)

''یہ صرف اس لیے کہ مسلمانوں کو بشارت ہو، ان کے دل مطمئن ہوں۔''

(ب) جماعت ملائک کو بتادیا گیا کہ:

اِنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

''میں (رب العالمین) تمہارے ساتھ ہوں تمہارا کام یہ ہے کہ اہل ایمان کو جمائے رکھو۔''

یعنی مقابلہ پر جمنا اور ثابت قدم رہنا مسلمانوں کا فرض تھا ان ملائک کے سپرد یہ ہوا کہ وہ باطنی طور پر ایسا تصرف کرتے رہیں۔ (آج کل کی اصطلاح میں روحانی طور پر ایسا انجکشن لگاتے رہیں کہ ان کے دل مضبوط رہیں اور ان کے قدموں میں جنبش نہ آئے۔

(ج) علماء کی ایک ایسی جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم بھی فرشتوں ہی کو دیا گیا تھا۔

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (سورہ انفال ع ۲)

''ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ اور ہاتھ پاؤں کی ایک ایک انگلی پر۔''

مندرجہ ذیل روایتیں اس کی تائید کرتی ہیں:

سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

بدر کے دن کچھ ایسا تھا کہ ہم حملہ کے لیے تلوار اٹھاتے تھے اور اس سے پہلے کہ تلوار مشرک کی گردن تک پہنچے اس کا سر جسم سے الگ ہو کر گر پڑتا تھا۔ (۳۹۰)

ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر میں میں ایک مشرک کا تعاقب کر رہا تھا ابھی میری تلوار اس تک نہیں پہنچی تھی کہ اس کی گردن جسم سے الگ جا پڑی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے سوا کسی اور نے اس کو قتل کیا ہے۔ (۳۹۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے غزوہ بدر کے ایک مجاہد نے بیان کیا کہ:

ایک مشرک آگے تھا میں اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا کہ مجھے ایسی آواز آئی کہ کسی نے زور سے کوڑا مارا ہے۔ ساتھ ہی یہ آواز بھی کانوں میں پڑی اَقْدِمْ خَیْزُوْمُ خیزوم آگے بڑھ۔ اب دیکھا تو یہ مشرک چت پڑا ہوا تھا اور اس کی ناک بیٹھ گئی تھی۔ چہرہ پھٹ گیا تھا جیسے کوڑا لگا ہو اور رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔ (۳۹۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قبیلہ غفار کے ایک شخص نے بیان کیا کہ:

غزوہ بدر کے روز میں اور میرا ایک چچا زاد بھائی اپنے گھر سے آئے اور ایک پہاڑ پر بیٹھ گئے تھے۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جس فریق کو شکست ہوگی جب وہ بھاگیں گے تو ہم ان کا سامان لوٹیں گے۔ ہم وہاں بیٹھے تھے کہ بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ جب وہ پہاڑ کے قریب ہوا تو ہم نے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنی۔ ساتھ ہی ایک گھوڑے سوار کی کرخت آواز سنی اَقْدِمْ خَیْزُوْمُ آواز ایسی ہیبت ناک تھی کہ فوراً میرے بھائی کا دل بیٹھ گیا اور وہیں مر گیا۔ میں بھی موت کے کنارے پہونچ گیا تھا۔ پھر کسی طرح زندہ رہ گیا۔ (۳۹۳)

حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں:

غزوہ بدر کے مقتولین میں ایسے بھی تھے جن کی گردنوں اور بدن کے جوڑوں پر ایسے نشان تھے جیسے آگ سے جل گئے ہوں۔ جن کو مجاہدین نے قتل کیا تھا۔ (۳۹۴) ان میں یہ بات نہیں تھی، یہ مجاہدین اور ملائک کے مقتولین کے درمیان ایک امتیازی نشان تھا۔

حضرت ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

غزوہ بدر کے بعد تین آدمیوں کے سر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لاکر رکھے اور عرض کیا یا رسول اللہ ان دو کو میں نے قتل کیا ہے اس تیسرے شخص کو ایک دراز قامت سفید رنگ کے انسان نے قتل کیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ انسان نہیں تھا۔ فرشتہ تھا۔ (۳۹۵)

حضرت عباس ڈیل ڈول کے آدمی تھے ایک لاغر جسم پستہ قد انصاری ابوالیسر کعب بن عمر نے پکڑ کر ان کی مشکیں کس دیں۔ اس پر سب کو تعجب ہوتا تھا۔ بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ابوالیسر کو عباس مٹھی میں بند کر سکتے تھے۔ (۳۹۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالیسر سے دریافت کیا تم نے عباس کو کیسے گرفتار کر لیا۔ ابوالیسر نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ایک شخص نے میری مدد کی ہے وہ ایک اجنبی تھا نہ میں نے پہلے کبھی اس کو دیکھا تھا نہ بعد میں وہ نظر پڑا۔ فرمایا۔ فرشتہ نے تمہاری مدد کی (۳۹۷) خود حضرت عباس فرمایا کرتے تھے کہ مجھے جس نے گرفتار کیا وہ ایک کشادہ پیشانی حسین وجمیل آدمی تھا۔ (۳۹۸)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ غزوہ بدر کی خصوصیت ہے کہ فرشتوں نے بھی قتال میں حصہ لیا۔ بدر کے علاوہ دیگر غزوات میں فرشتے اس طرح مدد کرتے رہے کہ ان کی آمد سے مجاہدین کے حوصلے بلند ہوئے، ان کی ہمتیں بڑھیں۔ (۳۹۹)

۸ فرشتوں کو حکم ہوا کہ مسلمانوں کو جمائے رکھیں۔ ان کے حوصلے بڑھائیں اور حضرت حق جل مجدہ نے خود اپنے متعلق ارشاد فرمایا:

سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ

''میں ڈال دوں گا کافروں کے دلوں میں دہشت''

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں۔ کافروں کے دل قابل نہیں فرشتوں کے الہام کے سو رعب ڈالنا اپنی طرف لیا۔ (موضح القرآن)

نظر آنے میں فرق:

گھبراہٹ میں انسان کو کچھ کا کچھ نظر آتا ہے اور جب انسان مطمئن ہوتا ہے اور اس کا حوصلہ بلند ہوتا ہے تو اپنی تھوڑی تعداد زیادہ اور دشمن کی بڑی بھیڑ قلیل اور حقیر نظر آتی ہے۔ غزوہ بدر میں عجیب ترتیب کے ساتھ نظروں میں فرق ہوتا رہا۔ یہ بھی نصرت خداوندی کا جلوہ تھا۔ کلام اللہ نے معجزانہ انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

سب سے پہلا مرحلہ خواب کا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غنیم کی تعداد تھوڑی اور کم دکھائی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ مجاہدین کے حوصلے بلند ہوں اور وہ اپنی تھوڑی اور بے سروسامان تعداد کے ساتھ وہ کارنامہ انجام دیدیں جو حق و باطل میں نشان امتیاز ثابت ہو اور اس بات کی کھلی ہوئی دلیل اور برہان قاطع ہو کہ زندہ رہنے کا حق اسی قلت کو ہے جو کثرت پر غالب آ رہی ہے۔

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (سورہ انفال ع ۵)

''اے نبی یہ وہ وقت تھا کہ اللہ تعالیٰ دکھا رہا تھا ان کو آپ کے خواب میں تھوڑا (۴۰۰) اور اگر آپ کو بہت (زیادہ) دکھاتا تو تم (مسلمان) ضرور ہمت ہار دیتے۔ (یہ سب سے پہلا موقع تھا ایک امن پسند سنجیدہ جماعت اس موقع پر یقیناً پس وپیش کرتی) اور اس موقع پر جھگڑنے لگتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس صورت حال سے بچا لیا۔ یقین کرو جو کچھ انسانوں کے سینوں میں چھپا ہوا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح واقف رہتا ہے۔''

دوسرا مرحلہ خاص میدان جنگ تھا۔ مقابلہ کے آغاز تک فریق ثانی کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ مسلمان تھوڑے تھے اور ان کو تھوڑے ہی نظر آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ابوجہل نے اعلان کیا یہ صرف اکلۃ جزور ہیں (تقریباً سو ہیں) (۴۰۲) مارنے اور قتل کرنے کے بجائے انہیں گرفتار کرلو اور پہاڑوں میں منتشر کر دو۔ جہاں ان پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے اور لات وعزیٰ کے احترام سے سرتابی اور سرکشی کا مزہ چکھ لیں۔

لیکن دفعتہً اس موقع پر مسلمانوں کے حوصلے یہاں تک بڑھتے ہیں کہ غنیم جو تعداد میں تین گنا تھا خود اپنی تعداد سے بھی کم۔ یعنی (تین سو تیرہ کا تہائی یا چوتھائی) نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے برابر کے ساتھی سے کہا کہ شاید یہ سب کافر ستر ہوں گے۔ (تفسیر روح المعانی)

کتاب اللہ کی مندرجہ ذیل آیتیں انہیں حالتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

إِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (سورہ انفال ع ۵)

''اور جب تم کو دکھائی وہ فوج وقت ملاقات کے (مقابلہ کے آغاز میں) تمہاری آنکھوں میں تھوڑی اور تم کو تھوڑا دکھایا ان کی آنکھوں میں تاکہ کر ڈالے اللہ ایک کام جو (طے) ہو چکا تھا۔''

دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے:

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ

(سورہ آل عمران ع ۲)

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے ٹھیٹ الفاظ میں اس کا ترجمہ یہ ہے:

''ابھی ہو چکا ہے۔ تم کو نمونہ دو فوجوں میں جو بھڑی تھیں۔ ایک فوج ہے کہ جو لڑتی ہے اللہ کی راہ میں اور دوسری منکر ہے یہ (مسلمان) ان کو دیکھتے ہیں اپنے دو برابر (۴۰۳) (اپنے سے دو چند) (۴۰۴) صریح آنکھوں اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جس کو چاہے۔ اسی میں

خبر دار ہو جائیں وہ جن کو آنکھ ہے۔''

آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کافر دیکھتے تھے مسلمانوں کو اپنے سے دو چند۔ یعنی تین سو تیرہ مسلمان تقریباً دو ہزار نظر آ رہے تھے۔ یہ اس وقت ہوا جب کچھ مقابلہ ہو چکا۔ دشمنان خدا پر مجاہدین حق کا رعب چھا گیا۔

غزوہ بدر سے بھاگ کر جب قریش مکہ پہنچے تو ایک شخص نے ابولہب سے روائیداد جنگ بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ بہت سے گورے چٹے آدمی ابلق گھوڑوں پر سوار تھے جو زمین سے لے کر آسمان تک فضا پر چھائے ہوئے تھے (۴۰۵)۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ کامیاب واپسی پر جب مجاہدین بدر کا استقبال کرتے ہوئے لوگ مبارک باد دے رہے تھے تو ایک مجاہد (حضرت سلمہ بن سلامہ) نے فرمایا۔ مبارک باد کی کیا بات ہے۔ واللہ جو ہمارے مقابلہ پر تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھی عورتیں ہیں یا پابستہ اونٹنیاں ہیں جن کو ہم بلا تکلف ذبح کر رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب سنا تو مسکرا کر فرمایا یہ ملا اعلیٰ کی نصرت کی برکت تھی۔ (۴۰۶)

قتل ابوجہل:

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جنگ بدر کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے (۴۰۷) کہ میدان جنگ میں میں نے نظر ڈالی تو دو نوعمر میرے دائیں بائیں تھے۔ یہ دونوں نوخیز اور ناتجربہ کار تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ بڑے آدمی میرے دائیں بائیں ہوتے تو مجھے ان سے تقویت ہوتی۔ اب یہ چھوکرے ہیں مجھے ان کا بھی خطرہ ہے اور ان کی وجہ سے خود اپنا بھی خطرہ ہے کہ اگر دشمن نے دھاوا کر دیا تو ان کو بچاؤں گا یا اپنا بچاؤ کروں گا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک لڑکے نے چپکے سے پوچھا۔ چچا جان ابوجہل کون سا ہے۔ میں نے کہا برادر زادے تم ابوجہل کا پوچھ کر کیا کرو گے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ میں نے سنا ہے کہ ابوجہل ہمارے حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سخت دشمن ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گالیاں بکتا ہے۔ ہمیشہ آپ کے درپے رہتا ہے اس لیے میں نے طے کر رکھا ہے کہ جیسے ہی ابوجہل سامنے پڑے گا میں اس پر وار کروں گا۔ پھر یا وہ نہیں رہے گا یا میں نہیں رہوں گا۔ دوسرے لڑکے نے بھی اسی طرح یہی سوال کیا۔ میں نے اس کو بھی یہی جواب دیا۔ اس نے بھی ان ہی الفاظ میں اپنے عہد کا ذکر کیا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ابوجہل سامنے آ گیا۔ میں نے ان دونوں کو اشارہ کیا کہ جس کی تمہیں تلاش ہے وہ یہ ہے۔

میرا اشارہ کرنا تھا کہ یہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل کو جا کر گھیر لیا۔ (۴۰۸) یہ دونو جوان معاذ اور معوذ تھے۔ ماں کا نام عفراء تھا۔ باپ کا نام حارث۔ مگر ماں کے نام سے مشہور تھے ان کو ابناء عفراء کہا جاتا تھا تیسرے بھائی کا نام عوف تھا۔ (۴۰۹) وہ بھی اس مہم میں شریک ہو گیا۔

معاذ بن عفراء نے تلوار کی ضرب سے ابوجہل کو گھائل کر دیا۔ لیکن ابوجہل بھی ایک بہادر عرب تھا اس نے

پلٹ کر حملہ کیا تو معوذ اور عوف دونوں صہباء شہادت سے سرشار تھے۔ (۴۱۰) ایک چوتھے انصاری بہادر معاذ بن عمرو بن جموح نے تڑپ کر ابو جہل پر حملہ کیا تو وہ زمین پر ڈھیر تھا۔

ابو جہل کا بیٹا عکرمہ بھی وہاں پہونچ گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے قاتل معاذ بن عمرو کے مونڈھے پر تلوار ماری جس سے ان کا بازو کٹ گیا۔ صرف ایک تسمہ باقی رہ گیا۔ حضرت معاذ عکرمہ کی طرف جھپٹے تو عکرمہ پینترا بدل کر نکل گیا۔

جانباز معاذ میدان سے پھر بھی نہیں ہٹے۔ لٹکے ہوئے بازو کو کمر کے پیچھے ڈال لیا اور لڑنا شروع کر دیا اور جب تکلیف اور الجھن زیادہ ہوئی تو ہاتھ پیر کے نیچے دبا کر تسمہ الگ کر دیا۔ اب یہ سخت جان مجاہد ہلکا تھا۔ ایک ہی ہاتھ سے لڑتا رہا۔ پھر خدا نے ان کو صحت بخشی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک زندہ رہے۔ (۴۱۱)

جنگ کا بادل چھٹنے لگا تو آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو جہل کو دیکھو کیا ہوا۔ اب یہ دونوں بہادر (معاذ بن عفراء اور معاذ بن عمرو) جو ایک ہی نام کے تھے۔ دربار رسالت میں حاضر ہوئے۔ ہر ایک کا دعویٰ یہ تھا کہ ابو جہل کو میں نے قتل کیا ہے۔ آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) دونوں کی تلواریں منگا کر دیکھیں۔ ابھی خون ان پر جما ہوا تھا اور پھر دونوں کی دلداری کے لیے فرمایا۔ تم دونوں نے ہی قتل کیا ہے لیکن سلب (۴۱۲) معاذ بن عمرو بن جموح کے لیے نامزد فرمایا۔ (۴۱۳) کیونکہ جان لیوا (کاری) زخم انہیں کی تلوار کا تھا۔

ابو جہل کی موت:

ابو جہل سخت مجروح ہو گیا تھا مگر ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک جھاڑ (۴۱۴) کے نیچے پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے کچھ سراغ لگا تو میں ابو جہل کے سر پر پہونچ گیا اور اس کی داڑھی پکڑ کر میں نے کہا۔

تو۔ دشمن خدا۔ ابو جہل۔

ابو جہل نے اسی ترنگ میں جواب دیا۔ کیا اس مرد بہادر (ابو جہل) سے بھی کوئی بڑا ہے جس کو تم نے قتل کیا ہو۔ (۴۱۵)

پھر کہا۔ افسوس یہ ہے مجھے کسانوں نے مار ڈالا۔ کاش میرا قاتل کوئی اور ہوتا۔ (۴۱۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ابو جہل بہت سخت سست کہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ لات بھی ماری تھی۔ اس وقت وہ باتیں یاد آ گئیں۔ آپ نے ابو جہل کی گردن پر پاؤں رکھ دیا ابو جہل نے چونک کر کہا۔ او ذلیل بکری چرانے والے دیکھ کہاں پاؤں رکھ رہا ہے۔ (۴۱۷)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے اس کا سر تن سے جدا کرنا چاہا۔ مگر آپ کی تلوار خراب تھی ابو جہل کی تلوار بہت عمدہ تھی۔ آپ نے ابو جہل کی تلوار ہی سے اس کا سر قلم کیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ خود ابو جہل

نے اشارہ کیا تھا کہ اس کھٹل تلوار سے نہیں میری تیز تلوار سے اپنا کام پورا کرو۔ (۴۱۸)

ابوجہل کا سرتن سے جدا ہوا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کو اٹھا کر لائے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔ الحمدلله الذی اعز الاسلام واهله۔

سلسلہ غزوات میں یہ اسلام کی سب سے پہلی عظیم الشان فتح تھی کہ فرعون هذه الامة قتل ہوا۔ لیکن اس فتح عظیم کے لیے حضرت عفراء (رضی اللہ عنہا) بھی مستحق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنے دولخت جگر قربان کر دیئے (معاذ اور عوف رضی اللہ عنہما)

بیہقی کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ ان دونوں کے جنازوں پر تشریف لے گئے اور فرمایا۔

رحم الله ابنی عفراء فهما شرکاء فی قتل فرعون هذه الامة

''اللہ تعالیٰ عفراء کے دونوں بیٹوں کو نوازے۔ انہوں نے اس شخص کے قتل میں حصہ لیا جو اس امت کا فرعون اور پیشوایان کفر کا سرغنہ تھا۔''

حضرت عفراء کی غیر معمولی سعادت:

مگر حضرت عفراء رضی اللہ عنہا کے صحیفہ سعادت میں آب زر سے لکھی جانے والی ایک خصوصیت اور بھی ہے اور ممکن ہے اسلام کی پوری تاریخ اس کی نظیر نہ پیش کر سکے۔ وہ یہ کہ حضرت عفراء رضی اللہ عنہا کے سات لڑکے تھے۔ یہ ساتوں فرزندان توحید معرکہ بدر میں حاضر تھے۔ ایاس، عاقل، خالد اور عامر۔ بکیر بن یالیل کی صلب سے تھے اور تین فرزند، معاذ، معوذ اور عوف دوسرے شوہر حارث کی صلب سے تھے۔ یہ سب میدان جنگ میں حاضر تھے۔ غالباً حضرت عفراء رضی اللہ عنہا کے اسی اخلاص کی برکت ہے کہ اس معرکہ کے وقت بھی زبانوں پر یہی تھا اور بعد میں احادیث اور سیرت کی کتابوں میں بھی یہی مشہور ہے کہ ابوجہل کو ابناء عفراء نے قتل کیا حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ زخم کاری حضرت معاذ بن عمرو بن جموح کی تلوار سے لگا تھا جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت کے قاعدہ کے مطابق سلب عطا فرمایا اور سرتن سے جدا کرنے والے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔

فرعونیت میں درجات اور فرق مراتب:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کا دل پھر بھی کمزور تھا کہ جب ڈوبنے لگا تو بے اختیار کہہ دیا تھا۔ امنت بما امنت به بنو اسرائیل وانا من المسلیمن مگر کمال فرعونیت یہ ہے کہ فرعون هذه الامة یعنی ابوجہل اس وقت بھی نہیں پسیجا۔ بدن زخمی ہے۔ جان نکل رہی ہے۔ گردن کٹنے والی ہے۔ فرشتہ موت سر پر ہے لیکن اپنی عظمت کا زعم باطل اور اونچ نیچ کا فرق جو فطرت کا داغ بن چکا ہے اب بھی ابھر رہا ہے اور اب بھی صدمہ ہے تو اس بات کا کہ کسانوں نے اسے مار ڈالا۔

درجات:

فرعونیت کے ان درجات سے ان مصائب اور تکالیف کا اندازہ ہوسکتا ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کو برداشت کرنے پڑے۔ فرعون ھذہ الامت کی فرعونیت بڑھی ہوئی تھی تو لامحالہ اس کی ایذا بھی زیادہ ہوگی۔ کما قال صلی اللہ علیہ وسلم اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالا مثل۔

قتل امیہ بن خلف:

یہ وہی امیہ ہے جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر وحشیانہ مظالم کی مشق کیا کرتا تھا۔ پھر جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مکہ تشریف لے گئے اور ان سے معلوم ہوا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کی پیش گوئی کی ہے تو اب جنگ میں آنے کے لیے تیار نہیں تھا اور جب ابوجہل کے اصرار سے تیار ہوا اور بیوی نے محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی تنبیہ یاد دلائی تو اس نے کہا تھا میں آگے تک نہیں جاؤں گا۔ چند منزل چل کر واپس آ جاؤں گا لیکن کارپردازان قضاء وقدر اس کو کشاں کشاں بدر لے آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اس کے ہم وطن اور پرانے دوست تھے۔ جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اس وقت اس سے ایک کاروباری معاہدہ ہوا تھا کہ مدینہ میں اُمیہ کے مال کی حفاظت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کیا کریں گے اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا جو مال مکہ میں رہ گیا تھا اس کی حفاظت کا ذمہ دار امیہ ہوگا۔

یہ معاہدہ جان کی پناہ کے لیے نہیں تھا مال کی حفاظت کے لیے تھا مگر مسلمان کا معاہدہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے اور اس کی پناہ کا دامن زیادہ سے زیادہ وسیع ہوسکتا ہے چنانچہ اسی معاہدہ کی بنا پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ اس کی جان بچ جائے چنانچہ جب مسلمان مصروف تھے تو یہ اس کو اور اس کے بیٹے کو نظر بچا کر ایک پہاڑی پر لے گئے۔ اتفاق سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا۔ فوراً انصار کو خبر کر دی وہ اس کے پیچھے دوڑے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اُمیہ کے لڑکے کو آگے کر دیا۔ لوگوں نے اسے قتل کر دیا لیکن اُمیہ کو چھوڑ دینا اس پر بھی گوارا نہ کیا۔ اُمیہ بھاری آدمی تھا دوڑ نہیں سکتا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ جب یہ لوگ قریب پہنچ گئے تو میں نے امیہ سے کہا تم بیٹھ جاؤ۔ اُمیہ بیٹھ گئے اور میں اس کے اوپر اوندھا پڑ گیا کہ اس کی جان بچ جائے۔ مگر لوگوں نے نیچ میں سے تلواریں پہنچانی شروع کر دیں آخر کار اس کو قتل کر دیا۔ اس کو بچانے میں ایک زخم حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی ٹانگ پر بھی آ گیا۔

عبیدہ (۴۲۲) (ابن سعید بن العاص) بڑی ہمت کر کے میدان میں نکلا اور پکارا۔ میں ہوں ابوذات الکرش۔ کون ہے جو مقابلہ پر آئے۔ یہ سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا تھا صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

سیّدنا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور پہلا ہی وار اس طرح کیا کہ برچھی ابوذات الکرش کی آنکھ میں گڑ گئی۔ ابوذات الکرش فوراً ٹھنڈا ہو گیا۔ مگر برچھی بڑی مشکل سے نکل سکی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ فرمایا

کرتے تھے کہ میں نے لاش پر پاؤں اڑا کر پورا زور صرف کیا تب برچھی نکلی۔ مگر دونوں سرے خم ہو گئے تھے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ابوذات الکرش سے فارغ ہوئے تو ہجوم میں گھس گئے۔ لڑتے لڑتے تلوار گر (۴۲۳) گئی اور خود بھی زخموں سے چور چور ہو گئے۔ دو زخم بہت گہرے تھے۔ شانہ پر جو زخم تھا وہ اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہو جانے پر بھی اس میں انگلی چلی جاتی تھی۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے (حضرت عروہ رضی اللہ عنہ) بچپن میں ان زخموں سے کھیلا کرتے تھے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے جسم مبارک پر ایسا ہی گہرا زخم اور تھا جو غزوہ یرموک میں لگا تھا جس طرح یہ تین زخم تاریخی نشان تھے۔ آپ کی یہ برچھی اور یہ تلوار بھی یادگار بن گئی۔ برچھی کو خود حضرت رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے مانگ لیا۔ پھر چاروں خلفاء میں منتقل ہوتی رہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادوں کے پاس تھی۔ ان سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے خلف اکبر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے لے لی۔ ان کی شہادت کے وقت تک یہ برچھی انہیں کے یہاں ہی رہی۔

یہ تلوار جو غزوہ بدر میں لڑتے لڑتے گر گئی تھی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے پاس رہی اور جب وہ شہید کر دیئے گئے اور حملہ آور فوج نے ان کا سامان ضبط کیا تو خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے کہا تم وہ تلوار پہچان لو گے۔ حضرت عروہ نے فرمایا۔ ضرور۔ عبدالملک نے دریافت کیا اس کی شناخت کیا ہے۔ حضرت عروہ نے جواب دیا۔ وہ دندانے جو غزوہ بدر میں اس میں پڑ گئے تھے۔ اس جواب میں اس عظیم الشان تاریخ کا حوالہ تھا جس نے عبدالملک کو بھی متاثر کر دیا۔ چنانچہ فوراً عربی کا یہ مصرعہ عبدالملک نے پڑھا۔ بھن فلول من قراع الکتائب پھر یہ تلوار حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو دے دی۔ (۴۲۴)

اعتراف خدمات اور پاس وفا:

ابوالبختری بن ہشام مکہ کے ان سرداروں میں سے تھا جو کبھی کبھی مسلمانوں کے لیے آڑ بن جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بنو ہاشم سے بائیکاٹ کا جو ایک معاہدہ لکھا گیا تھا جس کی بنا پر بنو ہاشم تین سال تک شعب ابی طالب میں محصور رہے اور تہی دستی اور کسمپرسی کی مصیبتیں برداشت کرتے رہے اس معاہدہ کو ختم کرنے کی جن لوگوں نے کوشش کی ان میں بھی مطعم بن عدی کے بعد ابوالبختری کا حصہ نمایاں تھا۔ اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم اگرچہ اب تک اسلام کا اعلان نہیں کر سکے تھے۔ مگر خواجہ ابوطالب کے بعد مکہ میں آپ ہی کی ذات تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پشت پناہ بنی رہی۔ یہاں تک کہ بیعت عقبہ کے وقت جب انصار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ تشریف لے چلنے کی درخواست کی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

''اے اہل خزرج واوس اگر تم مرتے دم تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دے سکو تو لے جاؤ

ورنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شہر اور اپنے خاندان میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں ہم ان کے لیے ہمیشہ ہمیشہ سپر رہے ہیں اور اب بھی نہیں تھکے ہیں۔''

ان حضرات کی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ کے وقت اعلان فرما دیا تھا کہ:

ابوالبختری اور عباس کو قتل نہ کیا جائے۔ان کے علاوہ خاندان ہاشم کے لوگوں کو بھی گرفتار کرلیا جائے قتل نہ کیا جائے کیونکہ مجھے معلوم ہے یہ لوگ مجبوراً آئے ہیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان پر عمل کیا گیا۔ چنانچہ حضرت عباس قتل نہیں کئے گئے بلکہ گرفتار کر لیے گئے۔ اسی طرح ابوالبختری جب حضرت مجذر انصاری رضی اللہ عنہ کے سامنے پڑا تو آپ نے بتا دیا کہ ہمارے مولا اور آقا کا حکم یہ ہے کہ آپ کو گرفتار کرلیا جائے قتل نہ کیا جائے۔ابوالبختری نے کہا۔ میرے ساتھ جبادہ بن ملیحہ بھی ہے جو مکہ سے ہمارے ساتھ ہی اونٹ پر آیا ہے۔حضرت مجذر رضی اللہ عنہ نے معذرت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف آپ کے متعلق ہدایت فرمائی ہے ہم آپ کے ساتھی کو معاف نہیں کرسکتے۔ یہ یقینی (۴۲۵) بات ہے کہ یہ معاملہ اگر دربار رحمت میں پیش ہوتا تو ابوالبختری کے ساتھ اس کے ساتھی کو بھی گرفتار ہی کیا جاتا۔لیکن ابوالبختری نے جیسے ہی حضرت مجذر رضی اللہ عنہ کا جواب سنا اس کا مزاج بگڑ گیا۔اس نے کہا یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ مکہ کی عورتیں یہ بات کہیں کہ ابوالبختری نے اپنی جان کی خاطر اپنے ساتھی کو چھوڑ دیا۔ پھر برجستہ ایک رجز پڑھتا ہوا حضرت مجذر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ پر آ گیا۔رجز یہ تھا:

لن یسلم ابن حرۃ زمیلہ حتی یموت او یری سبیلہ

شریف زادہ اپنے ساتھی کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ یہاں تک کہ جان دیدے یا اپنا راستہ دیکھ لے اب حضرت مجذر رضی اللہ عنہ کے لیے بھی مقابلہ کے سوا چارہ کار نہیں تھا۔حضرت مجذر نے کاٹ کرتے ہوئے ابوالبختری پر حملہ کیا اور اس کو ختم کر دیا۔

اب حضرت مجذر رضی اللہ عنہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو شرمندہ تھے۔قسم کھا کر کہا کہ یا رسول اللہ میں نے بہت کوشش کی کہ گرفتاری کے لیے تیار ہو جائیں مگر انہوں نے حملہ کر دیا تو میں مجبور تھا۔ (۴۲٦)

معرکہ کے بعد:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ معرکہ میں کامیابی کے بعد آپ تین روز تک وہیں قیام فرماتے تھے۔اس میں رفقاء کرام کو آرام بھی مل جاتا تھا اور اس علاقہ میں حسب ضرورت نظم ونسق کی صورتیں بھی قائم کر دی جاتی تھیں۔شہداء کے دفن کرنے کا کام بھی بہت اہم ہوتا تھا جو اس قیام میں انجام پذیر ہوتا تھا۔

مردوں کے دفن کرنے میں صرف مسلمانوں کی تخصیص نہیں تھی بلکہ سنن بیہقی کی روایت ہے۔

كان من سنته صلى الله عليه وسلم فى مغازيه اذا مر بجيفة انسان امر بدفنه لايسال عنه مومنا كان او كافرا (السيرة الحلبيه ص ۱۹۹ ج ۲)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ غزوات کے سلسلہ میں یہ تھا کہ کسی بھی انسان کی نعش پر آپ کا گذر ہوتا تھا تو آپ اس کے دفن کرنے کا حکم دیتے تھے۔ یہ نہیں دریافت کرتے تھے کہ یہ مومن تھا یا کافر''۔(۴۲۷)

اگر ہر ایک کے لیے قبر کھودنا مشکل ہوتا تھا تو ایک ایک قبر میں کئی کئی دفن کر دیئے جاتے تھے اس سنت پر غزوۂ بدر میں بھی عمل ہوا مسلمان شہداء صرف ۱۴ تھے مگر مشرکین کی تعداد ستر تھی ان کے لیے علیحدہ علیحدہ قبریں کھودنی مشکل تھیں۔ لہٰذا کئی کئی کو ایک ایک جگہ دفن کیا گیا۔ وہاں قبیلہ بنی (۴۲۸) نار کے کسی شخص کا کھودا ہوا کنواں بھی تھا۔ (۴۲۹) جو اب خراب پڑا تھا۔ اس کنوئیں کو قبر کے کام میں لایا گیا۔ کچھ نعشیں وہاں ڈالدی گئیں جن کی تعداد ۱۳ تھی۔ ابوجہل وغیرہ روساء قریش کی لاشیں اسی کنوئیں میں ڈالی گئیں۔ (۴۳۰) دن گرم تھا۔ دھوپ سے رنگ بدل گیا تھا۔ (۴۳۱) اسی حالت میں ان کو کنوئیں میں ڈالا گیا۔ لیکن اُمیہ بن خلف کی لاش پھول کر ذرہ میں ایسی پھنس گئی تھی کہ ذرہ اتارنی چاہی تو گوشت بھی ساتھ ساتھ اترنے لگا۔ اس لیے اس کو وہیں چھوڑا اور مٹی سے چھپا کر اس پر پتھر رکھ دیئے گئے۔ جب عتبہ بن ربیعہ کی لاش اٹھا رہے تھے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ان کے فرزند حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر پڑی کہ رنج اور صدمہ چہرہ پر چھایا ہوا ہے۔ رنگ فق ہو گیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دلداری کے لیے کچھ فرمایا تو ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدمہ اس کا نہیں کہ وہ مارے گئے۔ صدمہ اس کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فکر و دانش اور اصابت رائے ان کو عطا فرمائی تھی مجھے توقع تھی کہ وہ رہنما ثابت ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان کو مسلمان ہونے کی توفیق بخش دے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے اس احساس کی تحسین فرمائی اور ان کو دعا دی۔

کفرانِ نعمت:

ارشاد ربانی ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (سورہ ابراہیم ع ۵)

''کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جنہیں اللہ نے نعمت عطا فرمائی تھی مگر انہوں نے کفرانِ نعمت سے اسے بدل ڈالا اور اپنے گروہ کو ہلاکت کے گھر میں جا اتارا۔''

سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے۔ روساء قریش اس آیت کا مصداق ہیں (۳۲۲)

اللہ تعالیٰ کا یہ انعام کیا کم تھا کہ حرم کعبہ کی تولیت ان کو ملی ہوئی تھی جس کی وجہ سے پورے عرب کی قیادت ان کو حاصل تھی اور بڑے بڑے سرکش قبیلہ کی گردن بھی ان کی تعظیم کے لیے خم رہتی تھی دولت و ثروت اور کاروبار

کے لحاظ سے بھی پورے عرب میں یہ سب سے برتر تھے اپنے اسی زعم میں مدینہ کے لوگوں کو کسان اور چرواہا کہا کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان اور اس غیر معمولی انعام کا جواب صنادید قریش نے کیا دیا۔ تمرد، سرکشی، حق کے مقابلہ میں سخت ترین عناد۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم کو ہلاکت کے اس حسرت ناک مقام پر پہنچا دیا کہ غزوہ بدر میں قتل کیے گئے۔ گرفتار کیے گئے۔ جو بچے وہ بری طرح جان بچا کر بھاگے۔

حسرت و مسرت کے ملے جلے جذبات:

جنگ بدر میں بلاشبہ بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ فتح مبین حاصل ہوئی۔ یہ فتح کا دن یوم فرقان تھا۔ جس نے ثابت کر دیا کہ ''حق'' زندہ ہے اور زندہ رہنے کا حق اہل حق ہی کو ہے۔ لیکن یہ دوسرے کون تھے جن کے لیے بربادی، رسوائی اور ہلاکت مقدر ہوئی۔ کیا وہ قطعاً اجنبی تھے یا ان سے خون کا رشتہ بھی تھا اور وہ اپنے قبیلہ اور برادری کے باعزت بھی تھے جن سے زندگی کی کش مکش میں تقویت بھی حاصل ہو سکتی تھی۔

ملوکیت پسند کہا کرتے تھے کہ سلطنت اور بادشاہت عقیم ہوتی ہے خون کے رشتے یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ صرف وہی رشتے باقی رہ جاتے ہیں جو ملوکیت اور بادشاہت کے لیے ہوں چنانچہ باپ کے مقابلہ میں بیٹا بغاوت کرتا ہے اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے باغی بیٹے کو تلوار کے گھاٹ اتارا جاتا ہے اور وفادار جرنیل کو جشن فتح کا ہیرو بنا دیا جاتا ہے لیکن کیا باپ کو بیٹے کی ناکام و نامراد موت کا صدمہ نہیں ہوتا؟

بیشک اسلام یا حق پرستی بھی تمام رشتوں کو ختم کر دیتی ہے اور صرف وہی رشتہ باقی رہ جاتا ہے جو حق کے لیے ہو۔ وحی الٰہی اعلان کر رہی ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ الاية (سورہ مجادلہ ع ۳)

لیکن اگر دشمنان خدا کی ہلاکت کا صدمہ نہ ہو تو کیا ان کی ناکام و نامراد موت کا افسوس بھی نہیں ہوگا اور اس کی حسرت بھی نہ ہوگی کہ کاش یہ اس گلشن کے باغبان ہوتے جس کو برباد کرنے کے جرم میں ان کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ کاش یہ آج اس طرح مبتلا (۴۳۴) عذاب نہ ہوتے۔

نص قرآن کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ امت کا ایک ایک فرد نبی کا لاڈلا بیٹا ہوتا ہے اور جب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم رحمتہ للعالمین ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری نوع انسان کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا تو لامحالہ نوع انسان کے ایک ایک فرد پر آپ کی شفقت وہی ہوگی جو حقیقی باپ کو بیٹے پر ہوتی ہے۔

یہ ابوجہل جو ''فرعون هذه الامته'' ہو کر مرا وہی ابوجہل بن ہشام ہے جس کے لیے بار بار دست دعاء دراز ہوا تھا اور کارپردازان قضاء و قدر نے اپنے کانوں سے سنا تھا کہ ارشاد ہو رہا ہے خداوندا۔ ابوجہل بن ہشام یا

عمر بن الخطاب کے ذریعہ سے اسلام کو تقویت پہنچا۔ آج یہ لوگ ذلت کی موت مارے جارہے ہیں اور ان کی لاشیں کنویں میں دھکیلی جارہی ہیں تو رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جذبات شفقت پر کیا گذر رہی ہوگی۔ ظاہر ہے اس کا اندازہ وہ جج ہی کرسکتا ہے جس نے اپنے بیٹے کے خلاف سزائے موت کا فیصلہ صادر کیا ہو۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت غصہ بھی ہے اور صدمہ بھی حق پرستوں کی فتح مبین کی مسرت بھی ہے اور ان کی ناکام موت پر حسرت بھی۔ اس تمہید کے مطالعہ کے بعد آپ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سنئے:

''معرکہ بدر کو دو دن ہو چکے تھے تیسرے دن کوچ کا حکم ہوا۔ سواریاں تیار کی گئیں۔ سفر کے لیے قدم اٹھنے والے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جارہے ہیں کچھ خدام بھی ساتھ ہو لیے خیال یہ تھا کہ آپ کسی ضرورت سے جارہے ہیں۔ دفعتہً آپ اس کنویں کے کنارے جا کر کھڑے ہو گئے جہاں صنادید قریش کے لاشے ڈالے گئے تھے۔ وہاں آپ نے ان سب کو نام بنام پکارا۔ ان کے آباء کے نام بھی لے رہے تھے۔ فلاں بن فلاں۔ فلاں بن فلاں۔ پھر آپ نے فرمایا۔ (۴۳۶)

ایسرکم انکم اطعتم اللہ ورسولہ فانا قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فھل وجدتم ما وعد ربکم حقا

تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے تو کیا تمہیں (آج) مسرت نہ ہوتی۔

''ہم سے جو ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا۔ اس کو سچ پایا۔ کیا تم نے بھی دیکھ لیا کہ خدا نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ سچ ہے۔'' (۴۳۷)

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم اپنے نبی کی برادری اور خاندان کے بہت برے آدمی ثابت ہوئے تم نے تکذیب کی لوگوں نے تصدیق کی۔ تم نے نکالا۔ لوگوں نے پناہ دی۔ تم نے لڑائی لڑی لوگوں نے میری مدد کی۔'' (۴۳۸)

مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ میں فتح وشکست کی خبریں

آنحضرت صلی اللہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کو مامور فرمایا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر کامیابی کی اطلاع دیدیں۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کی بالائی بستیوں میں گشت کر کے اطلاع دینے کی ہدایت فرمائی اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو نشیبی بستیوں میں اطلاع دینے کے لیے مامور فرمایا۔ ایک ناقہ جس کو عضباء کہا جاتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اس پر سوار ہوا کرتے تھے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اسی اونٹنی پر روانہ کیا۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ جو حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے مدینہ منورہ ہی میں رہے تھے بیان فرماتے ہیں کہ ہم لختِ جگرِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو سپردِ خاک کر کے فارغ ہوئے تھے کہ فتح کی خبر پہنچی۔ (۴۴۰)

منافقین کا شاخسانہ:

اسلام کے بدخواہ جو مسلمانوں کی شکست کا یقین کئے ہوئے تھے انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ (عضباء) پر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آ رہے ہیں تو انہیں یقین ہو گیا کہ نصیب دشمناں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ مسلمان تتر بتر ہو گئے۔ اس لیے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ عضباء پر سوار ہو کر بھاگ آئے۔ انہوں نے اپنی اس من گھڑت کو پھیلانا شروع کر دیا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے کان میں پہلے یہی افواہ پڑی۔ صاحبزادی محترمہ کی وفات سے دل شکستہ پہلے سے تھے اس خبر نے اور پریشان کر دیا لیکن جب عیدگاہ کے میدان میں پہنچے تو دیکھا کہ ان کے والد ماجد حضرت زید رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے ہیں۔ لوگ ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور وہ خبر دے رہے ہیں رؤسا قریش عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، زمعہ بن اسود، ابوالبختری، اُمیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ مارے گئے اور سہیل بن عمرو وغیرہ گرفتار ہو گئے تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو یقین نہیں آیا اپنے والد صاحب کو علیحدہ لے جا کر دریافت کیا کہ کیا واقعی یہ خبر صحیح ہے جو آپ دے رہے ہیں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر فرمایا۔ بیٹا جو کچھ کہہ رہا ہوں صحیح ہے۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب خبر کی تصدیق ہو گئی تو میں نے اس منافق سے کہا کہ تم نے یہ غلط افواہ کیوں پھیلائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے تو میں اس کی شکایت کروں گا تو اس نے جواب دے دیا کہ میں نے ایسا ہی سنا تھا۔ (۴۴۱)

مکہ معظمہ میں شکست کی خبر اور اس کا ردِعمل:

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ جو (مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے لقب سے مشہور ہیں ان کا بیان ابن اسحاق نے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

میں اس زمانہ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا غلام تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ ہی میں رہتے تھے انہوں نے اس وقت تک ہجرت نہیں کی تھی مگر یہ گھرانا دعوت اسلام سے پوری طرح متاثر تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ اُم الفضل تو وہ خاتون تھیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سب سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئی تھیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ دل سے مسلمان تھے اگرچہ اب تک اس کا اعلان نہیں کیا تھا۔ ہمارے ان جذبات و احساسات کو قریش جانتے تھے اور اس لیے وقتاً فوقتاً ہمیں پریشان بھی کرتے رہتے تھے۔ غزوہ بدر کے موقع پر قریش مکہ سے روانہ ہوئے تو حضرت عباس کو بھی جانا پڑا تھا اور اپنی

پوزیشن اور حیثیت کو بالا رکھنے کے لیے دوسرے رؤسا کی طرح یہ بھی خرچ کے لیے کافی رقوم لے کر گئے تھے۔ جب بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی تو قدرتی بات تھی کہ ہم نے اپنے اندر قوت محسوس کی اور ہمارے حوصلے بڑھے۔

ابولہب شرارت پسندوں کا امام لشکر قریش کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ اس نے اپنا ایک بدل بھیج کر جان بچالی تھی۔

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک کمزور انسان تھا۔ میں بھی لشکر قریش میں شریک نہیں ہوا۔ میں تیر بنایا کرتا تھا۔ زمزم کے قریب ایک حجرہ تھا میں وہیں بیٹھ کر اپنا کام کیا کرتا تھا۔ جس روز یہ خبر پہونچی اس دن ایسا ہوا کہ میں حجرہ میں بیٹھا ہوا تیر تراش رہا تھا کہ ابولہب بھی آ گیا اور حجرہ کے تھم کے قریب اس طرح بیٹھ گیا کہ اس کی کمر میری کمر سے چھو رہی تھی۔ دفعتہً مغیرہ بن حارث بن عبدالمطلب (جن کو ابوسفیان بن حارث بھی کہا جاتا تھا) مقام بدر سے واپس پہونچا۔ لوگ اس کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ مگر مغیرہ بن حارث ابھی کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ ابولہب نے اس کو دیکھ لیا فوراً اپنے پاس بلا لیا اور غزوہ بدر کے حالات اس سے دریافت کرنے لگا۔ مغیرہ بن حارث کا جواب یہ تھا۔

> عجیب ماجرا دیکھنے میں آیا۔ ہماری فوج گویا بے جان بھیڑ تھی۔ تھوڑے سے مسلمان ہم پر حاوی تھے۔ ہم نے گویا اپنے مونڈھے اور اپنی گردنیں ان کے حوالے کر دی تھیں کہ جس طرح چاہیں وہ قتل کر ڈالیں اور جس طرح چاہیں گرفتار کر لیں اور ہماری مشکیں کس دیں۔ میں اپنے آدمیوں کا قصور بھی نہیں بتا سکتا۔ خدا کی قسم عجیب بات یہ تھی کہ بیشمار مرد سفید رو ابلق گھوڑوں پر سوار آسمان تک چھائے ہوئے تھے ان کے سامنے نہ کوئی چیز ٹھیر سکتی تھی اور نہ کوئی ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مغیرہ کی زبان سے جیسے ہی یہ الفاظ نکلے۔ میں بول پڑا۔ تلك والله الملائكة خدا کی قسم یہ فرشتے تھے۔ میرے اس لفظ سے ابولہب جھنجلا گیا۔ اس نے طمانچہ کھینچ کر میرے منہ پر مارا۔ میں کمزور تھا پھر بھی میں اس کو چمٹ گیا۔ مگر اس نے مجھے ڈھا لیا اور میرے سینہ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اور میری کوکھوں مین مکے مارنے لگا۔ اُم الفضل نے دیکھا کہ اس طرح وہ مجھے مار ڈالے گا تو وہ کھڑی ہوئیں ایک کھونٹا ان کے ہاتھ میں آ گیا انہوں نے اس زور سے ابولہب کے سر پر مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اسی جلال میں انہوں نے کہا۔ اس کا مالک (عباس) یہاں موجود نہیں ہے تو تو نے اسے کمزور سمجھ لیا ہے۔ اس کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ جب ابولہب کے سر پر چوٹ پڑی تب اس نے مجھے چھوڑا۔ مگر پھر وہ کوئی سات دن ہی زندہ رہا۔ پھر اسے چیچک ہوگئی اور اسی میں مر گیا۔ (۴۴۲)

ابتدائی خبر پر یہ ہنگامہ ہوا۔ رفتہ رفتہ تحقیق ہوگئی تو گھر گھر ماتم تھا۔ حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہ کے خواب کی

تعبیر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھی کہ قریش کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں اس جنگ کا چھینٹا نہ پہنچا ہو۔

عرب میں نوحہ اور ماتم کا عام دستور تھا اور جتنا بڑا آدمی مرتا تھا ایسا ہی اس کا ماتم بھی دھوم دھام سے ہوتا تھا اور عموماً سال بھر تک ماتم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مگر اس موقع پر قریش نے غیرت کی وجہ سے منادی کرادی تھی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔ اس لڑائی میں اسود بن مطلب کے تین (۴۴۳) لڑکے مارے گئے تھے اس کا دل امنڈتا رہتا تھا مگر قومی غیرت کے خیال سے رو نہیں سکتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز کسی طرف سے رونے کی آواز آ گئی۔ اسود سمجھا کہ رونے کی اجازت مل گئی ہے۔ غلام سے کہا جا کر دیکھو کون روتا ہے۔ کیا رونے کی اجازت ہو گئی ہے۔ غلام نے آ کر جواب دیا کہ ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے وہ اس پر رو رہی ہے۔ اسود کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکلے۔

اتبکی ان یضل لھا بعیر ویمنعھا من النوم السھود فلا تبکی علی بکر ولکن بدر
تقاصرت الجدود علی بدر سراۃ بنی ھصیص ومخزوم ورھط ابی الولید وبکی ان
بکیت علی عقیل وبکی حارثا اسد الاسود وبکیھم ولا تسمی جمیعا وما لا بی حکیمۃ
من ندید الاقد ساد بعدھم رحال ولولا یوم بدر لم یسودو (۴۴۴)

کیا اونٹ کے گم ہونے پر رو رہی ہے اور اس غم میں بیدار رہتی ہے رات کو نیند نہیں آتی جوان لڑکے جو مارے گئے ان پر نہیں رو رہی۔ بات یہ ہے کہ بدر پر ہمتیں پست ہو گئیں، قسمتیں ہار گئی، رونا ہو تو بدر پر رو۔ بنی ہصیص کے سرداروں پر گریہ کرو بنی مخزوم پر اور ابو الولید کے لوگوں پر ماتم کر اور رونا ہو تو عقیل پر نوحہ کرو خوب رو اور حارث پر نوحہ کرو جو شیروں کا شیر تھا اور ان سب کو اور کسی کو بھی فراموش نہ کرو اور ابی حکیمہ پر ماتم کرو جن کی کوئی ٹکر کا نہیں تھا۔ ہاں دیکھو۔ بدر کے بعد وہ لوگ سردار بن گئے کہ اگر بدر کا واقعہ نہ ہوتا تو کبھی بھی ان کو سرداری نصیب نہ ہوتی۔

اصلاحات وہدایات

انفال، اساریٰ، فدیہ

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ تا رِزْقٌ کَرِیْمٌ (سورہ انفال ع ۱)

''اے پیغمبر! آپ سے لوگ پوچھتے ہیں انفال (مال غنیمت) کے بارے میں (کیا ہونا چاہیے) آپ کہہ دیجئے مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا ہے پس اگر تم صاحب ایمان ہو تو تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ سے تقویٰ کرو اور اپنے آپس کے معاملات ٹھیک رکھو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں سرگرم رہو (اور یہ بات ذہن نشین کرلو کہ) صاحب ایمان وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان ویقین کو زیادہ کردیں اور وہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دے رکھا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں حقیقی مومن۔ ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں مرتبے ہیں اور بخشائش اور بڑی خوبی اور عزت کی روزی ہے۔'' (سورہ انفال ع ۱)

تشریحات:

(۱) انفال نفل کی جمع ہے۔ نفل زائد چیز کو کہتے ہیں۔ فرض اور واجب کے علاوہ جو نماز پڑھی جاتی ہے وہ زائد نماز ہے اس کو نفل کہتے ہیں۔ فرض زکوٰۃ اور واجب صدقہ کے علاوہ جو خیرات دی جائے وہ صدقہ نافلہ کہلاتا ہے کیونکہ وہ فرض سے زائد ہوتا ہے اور نفل انعام کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی استحقاق سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) جنگ اور جہاد کے موقع پر جو مال ضبط ہو کر تقسیم کیا جائے وہ بھی نفل کہلاتا ہے۔ مال غنیمت کو بھی نفل کہتے ہیں کیونکہ وہ جہاد کا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ ایک زائد شے ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے انعام ہوتا ہے۔

(۳) قرآن پاک کی یہ سورت جس میں غزوہ بدر کا تذکرہ ہے اس کا نام سورہ انفال رکھا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ غزوہ بدر کے کسی واقعہ سے نہیں بلکہ انفال (مال غنیمت) کے احکام سے اس سورت کا آغاز ہوا۔ کیونکہ مال غنیمت اور انفال اس امت کی خصوصیت ہے۔ آپ عہد زریں کے نمبر ۳ میں بڑی تفصیل سے ملاحظہ فرما چکے ہوں گے کہ جہاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور نبوت میں شروع ہوا لیکن دشمن کے کیمپ سے جو مال ہاتھ لگتا تھا اس کو آگ لگا کر جلا دیا جاتا تھا۔ مجاہدین کو لینے کا حق نہیں ہوتا تھا۔ یہ اجازت صرف امت محمدیہ علیہ صاحبہا

الصلوٰۃ والسلام کو عطا ہوئی کہ وہ اس کو اپنے کام میں لائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لم تحل الغنائم لسود الروس غیرنا۔ ''ہمارے علاوہ کسی کے لیے مال غنیمت حلال نہیں کیا گیا۔''(۴۴۵)

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں مخصوص طور پر عنایت فرمائی گئی ہیں۔ مجھ سے پہلے کسی نبی کو یہ خصوصیتیں عطا نہیں ہوئیں۔

(الف) رعب کی نصرت مجھے عطا ہوئی۔ دشمن ایک ماہ کی مسافت پر ہوتا ہے کہ اس کے دل میں میرا رعب ڈال دیا (۴۴۶) جاتا ہے۔

(ب) میرے لیے تمام روئے زمین مسجد (سجدہ گاہ) اور طہور بنا دی گئی۔ ایک مسلمان جہاں وقت ہو جائے نماز پڑھ سکتا ہے۔ مسجد کی قید نہیں ہے۔ جس پاک مٹی سے چاہے تیمم کر سکتا ہے۔

(ج) میرے لیے مال غنیمت حلال کیا گیا۔ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کیا گیا تھا۔

(د) اور مجھے شفاعت (عام) عطا کی گئی۔

(ہ) مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کے لیے معبوث ہوا کرتے تھے مجھے پوری نوع انسان کے لیے معبوث کیا گیا۔(۴۴۷)

یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر غزوہ بدر کے تذکرہ میں سب سے پہلے انفال یعنی مال غنیمت کی حیثیت اور اس کے احکام پر روشنی ڈالی گئی اور اس سورت کا نام بدر کے بجائے انفال رکھا گیا۔

(۴) بعض جنگجو قبائل میں اب بھی رواج ہے کہ لڑائیوں میں جو کچھ ہاتھ لگتا ہے اس کا ایک حصہ اپنے چودھری یا مکھیا کو دیتے ہیں۔ عربی قبائل شیخ قبیلہ کو چوتھائی حصہ دیا کرتے تھے جس کو ''مرباع'' کہا کرتے تھے اور باقی جس کے ہاتھ لگتا تھا اس کا ہوتا تھا۔ موجودہ مدعیان تہذیب کی فوجیں مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو خوب لوٹتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فوجیوں کے گروپ بن جاتے ہیں جو مفتوحہ علاقہ میں برابر وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جو کچھ لوٹتے ہیں وہ آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔

سورہ انفال میں مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا تو سب سے پہلے نظریہ کی اصلاح فرمائی گئی کہ مال غنیمت کا ایک حبہ بھی کسی فرد کا ملک نہیں ہے۔ غنیمت کے مال کا ایک بال بھی کسی نے چھپا کر رکھا تو اس کا تمام جہاد اکارت ہے وہ عذاب دوزخ کا مستحق ہے۔ ایک ایک حبہ اور ایک ایک پیسہ ہی نہیں بلکہ ایک ایک دھاگا بھی جس کے ہاتھ لگتا ہے وہ امانت ہے اس کا فرض ہے کہ اپنے امیر کے سامنے پیش کرے۔ یہ جو کچھ بھی ہے اللہ کا ہے۔ اللہ کے (نائب) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔

قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ۔ ''آپ کہہ دیجیے کہ تمام مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔''

(۶) اس آیت کے شان نزول میں بیان کیا گیا ہے کہ غزوہ بدر میں اکثر نوجوان جنہوں نے دشمنوں کو قتل

کیا تھا انہوں نے ان کا مال بھی لے لیا۔ وہ صحابہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے تاکہ دشمن ایذا نہ پہنچا سکیں انہیں کچھ نہیں ملا۔ اس پر بحث ہوئی اور مطالبہ ہوا کہ مال سب کو تقسیم ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اب یہ صحابہ کرام کے ایمان کامل کی شان تھی کہ جیسے ہی یہ آیتیں نازل ہوئیں سب کی گردنیں ہی نہیں بلکہ دل جھک گئے اور جس مال پر بحث کر رہے تھے اس کا ایک ایک حبہ لا کر پیش کر دیا۔ نہ کوئی تلخی تھی نہ ناگواری بلکہ خوشی تھی کہ وہ احکام ربانی کی تعمیل کر رہے ہیں۔

(۷) پہلے گذر چکا ہے کہ جہاد کی حقیقت فنا ہے۔ یعنی اپنا سب کچھ قربان کر کے دست قدرت کا آلہ کار بن جانا۔ اپنی ہر ایک غرض اور منفعت کے جذبہ کو ختم کر کے سراسر رضاء خدا کے تابع ہو جانا۔ ایسا ایثار شیوہ، بے غرض جانباز اگر رائی کا ایک دانہ بھی اپنی کسی غرض سے چھپاتا ہے تو وہ اپنی مجاہدانہ حیثیت کو ختم کر رہا ہے اور دعویٰ ایثار و قربانی کی تردید خود کر رہا ہے۔ ایک شخص جس کا نام کرکرہ تھا مارا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے افسوس کیا کہ یہ عذاب نار میں مبتلا ہو گیا۔ لوگوں نے اس کے سامان کا جائزہ لیا تو اس میں ایک عبا ہاتھ لگا جو اس نے چھپا لیا تھا۔ (۴۴۸)

(۷) یہ احتیاط صرف اسی شکل میں پیدا ہو سکتی ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو لہٰذا اس اعلان کے بعد کہ مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ سب سے پہلا حکم مندرجہ بالا آیات میں یہ ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ اللہ سے ڈرو۔

(۸) مال اور دولت بقول سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم (حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ) شیریں اور سرسبز و شاداب چیز ہے۔ مگر اس سرسبز پودے میں فساد ذات البین کے کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب مال غنیمت کا انعام خداوندی میسر ہو تو سب سے مقدم یہ ہے کہ آپس کے معاملات میں خرابی نہ آنے دو۔ آپس کے معاملات کو ٹھیک رکھو اور اصلاح ذات البین کی کوشش کرتے رہو۔ چنانچہ آیات بالا میں دوسرا حکم ہے:

وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ''اور اپنے آپس کے معاملات ٹھیک رکھو۔''

(۹) مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد جو مسلمانوں کا امیر اور سربراہ ہوگا وہ ان پر خرچ کرے گا جن کا تعلق اللہ اور اس کے رسول سے ہے اور اس طرح خرچ کرے گا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بتا دیا ہے۔ بیشک یہ مجاہدین بھی اللہ اور اس کے رسول سے تعلق رکھتے ہیں اور میدان جہاد میں اس تعلق کا ثبوت بھی پیش کر چکے ہیں۔ لہٰذا تین حصے ان کے ہوں گے۔ جو مساوی طور پر شرکاء جہاد کو تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ دو حصے ملی اور جماعتی ضرورتوں کے لیے ہوں گے۔ ان میں سے ذوی القربیٰ، یتامیٰ اور مساکین اور ابن السبیل کی امداد حسب ضرورت اور حسب صوابدید کی جائے گی۔ رسول یا امام کی ملک صرف وہ منتخب چیز ہوتی تھی جس کو صفی کہا جاتا تھا۔

اسلام کے مشہور جرنیل، فاتح ایران و عراق سیدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں

کہ میدان بدر میں میں نے سعید بن العاص کو قتل کیا اور اس کی نہایت عمدہ تلوار جس کا نام اس نے ذو الکتیعہ رکھ رکھا تھا میں نے لے لی۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یہ تلوار مجھے عنایت فرما دیجئے۔ آپ نے منع فرما دیا اور ارشاد ہوا کہ یہ تلوار نہ میری ہے نہ تمہاری۔ اس کو وہیں رکھ دو جہاں اور سامان رکھا ہوا ہے۔ مجھے افسوس ہوا اور میں نے دل میں خیال کیا کہ نہ معلوم یہ تلوار کس کو مل جائے گی جو کام اس تلوار سے میں لے سکتا ہوں ہر ایک کا نہ اتنا حوصلہ ہے نہ ہر ایک کو اتنی مہارت ہے کہ میری طرح اس تلوار سے کام لے سکے اور کوئی کارنامہ انجام دے سکے مگر ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل ضروری تھی۔ میں نے اس تلوار کو انبار میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر میں مجھے پھر خیال آیا۔ میں پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ یہ نہایت عمدہ تلوار ہے جو کارنامے اس تلوار کے ذریعہ میں انجام دے سکتا ہوں دوسرا شخص انجام نہیں دے سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی جواب دیا اور سختی سے فرمایا کہ تلوار وہیں رکھ دو۔ اب مجھے اور زیادہ افسوس ہوا۔ میرے بھائی عمیر رضی اللہ عنہ اسی روز اسی جنگ میں شہید ہوئے تھے۔ ان کی شہادت کا بھی قلق تھا۔ ساتھ میں اس محرومی کا صدمہ۔ میں کبیدہ خاطر واپس ہو رہا تھا کہ مجھے بلایا گیا اور سورہ انفال کی یہ آیتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت فرمائیں۔ کہ یہ ارشاد ربانی ابھی نازل ہوا ہے۔ اس ارشاد خداوندی سے پہلے یہ تلوار میری نہیں تھی۔ مجھے دے دینے کا بھی حق نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ امانت کو اپنی جگہ رکھ دو اب وحی الٰہی نے مجھے اس کا اختیار دے دیا ہے۔ لہٰذا اب یہ تلوار میں تمہیں دیتا ہوں۔ (۴۴۹)

(۹) وحی الٰہی نے اگرچہ امم سابقہ کے لیے مال غنیمت حلال نہیں کیا تھا۔ مگر متحارب اقوام اور جنگجو قبائل نے خود اپنے طور پر اس کو جائز تسلیم کر لیا اور اس میں ''مرباع'' (چوتھ) وغیرہ کے حصے بھی قائم کر دیئے تھے۔ ایٹمی دور کی تباہ کاری نے اگرچہ لوٹ کے امکانات ختم کر دیئے ہیں۔ لیکن پھر بھی جہاں موقع ملتا ہے فوجی گروپ کوتاہی نہیں کرتے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اپنے ہی ملک کے لوگوں کو لوٹتے ہیں اور ان کی عزت برباد کرتے ہیں۔

اسلام نے جب مال غنیمت کو جائز قرار دیا تو اس کے ضابطے بھی مقرر کر دیئے۔ پرامن شہریوں کو لوٹنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ متحارب فوجوں اور جماعتوں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادیں ضبط کی جائیں گی تو ان کی تقسیم کے ضابطے مقرر کر دیئے ہیں۔ ان ضابطوں کی خلاف ورزی نہ کسی سپاہی کے لیے جائز ہے نہ کسی کمانڈر اور جرنیل کے لیے۔ سورہ انفال کے پانچویں رکوع اور سورہ حشر وغیرہ میں کچھ اصول بیان کیے گئے ہیں۔ مگر ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ جب جماعت صحابہ کے نظام حکومت کو پیش کیا جائے گا اس وقت اس کی تفصیلات بھی پیش کی جائیں گی۔ (انشاء اللہ)

(۱۰) جہاد وہی ہے جس کا محرک جذبہ ایمانی ہو۔ مگر جذبہ ایمانی کی بنیادی شرط خوف خدا ہے بات بات پر مشتعل ہو جانا جذبہ ایمانی نہیں ہے۔ بلکہ جذبہ ایمان یہ ہے۔

اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا

''کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کے ایمان اور یقین کو اور زیادہ کردیں۔''

پھر یہ کیفیت وقتی اور عارضی نہیں ہوتی بلکہ طبیعت ثانیہ اور ملکہ راسخہ ہوتی ہے جو ان کی زندگی کو اسی رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی سرگرمیاں اس میں مصروف رہتی ہیں کہ اقامت صلوٰۃ کریں یعنی ایسی فضا پیدا کریں کہ نماز اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ اس طرح ادا کی جائے کہ نماز کی تاثیر جماعتی اور انفرادی زندگی میں نمایاں ہو۔ اللہ کی عبادت کے بعد ان کی سرگرمی کا دوسرا محور اعانت حق اور خدمت خلق ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ خدا کے دیئے ہوئے رزق میں سے راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور فقر و فاقہ یا تنگ دستی کا کوئی وسوسہ ان کے حوصلہ کو پست نہیں کرتا کیونکہ وہ خدا پر توکل اور اس کی شان کارسازی پر پورا اعتماد رکھتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا

(۱۱) سورہ انفال کی مذکورہ بالا آیتوں میں جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ تصور نہیں بلکہ تصویر ہیں۔ یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ ان آیتوں میں کچھ تصورات پیش کیے گئے ہیں جن کے بموجب ایک جماعت تیار کی جائے گی اور ایک عرصہ کے بعد یہ تصورات بروئے کار آئیں گے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مجاہدین بدر وہ مومنین صادقین تھے جو ان اوصاف اور خصوصیات کے حامل تھے۔ ان کی پاک زندگی ان کمالات کا آئینہ تھی اور اس بنا پر وحی الٰہی کی یہ شہادت ان کے بارے میں بالکل صحیح اور بجا تھی:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔

''کہ یہی ہیں حقیقی مومن ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں مرتبے ہیں اور بخشائش اور بڑی خوبی اور عزت کی روزی۔''

اسیران بدر اور فدیہ:

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (سورہ انفال ع ۹)

''تم دنیا کی متاع چاہتے ہو۔ اور اللہ چاہتا ہے (تمہیں) آخرت کا اجر دے اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔''

بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کی اجازت دی گئی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پہلے اس جذبہ کی پوری حوصلہ شکنی کی گئی۔ پھر اس طرح اجازت دی گئی جیسے کسی غیر پسندیدہ بات کی۔ اس سے زیادہ حوصلہ شکنی کیا ہوسکتی تھی کہ جو لوگ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کے صحیح مصداق تھے ان سے فرمایا جارہا ہے۔ ''تم متاع دنیا چاہتے ہو'' واقعہ یہ ہے کہ اسیران جنگ بدر کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا

کہ ان کا کیا کیا جائے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان سے فدیہ لیا جائے کیونکہ یہ اپنے ہی خاندان اور قبیلے کے لوگ ہیں بہت ممکن ہے آگے چل کر دولت اسلام سے مشرف ہو جائیں۔ اس طرح ان کے ساتھ حسن سلوک بھی ہوگا جو ان کو متاثر کرے گا اور فدیہ کی رقم مسلمانوں کے کام آئے گی۔

فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس کے برعکس مشورہ یہ دیا کہ یہ لوگ ائمہ کفر ہیں ان کی تمام کوششیں اسلام کے برخلاف رہی ہیں ان کو ختم ہی کر دینا چاہیے تاکہ کفر کا زور ٹوٹے اور جن مسلمانوں سے ان کی قرابت ہے وہی ان کو ختم کر دیں اور میں اس کے لیے تیار ہوں کہ جو میرے عزیز ہیں وہ میرے حوالے کیے جائیں میں ان کو ختم کر دوں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ توحید پرستوں کے دل جس طرح شرک سے بیزار ہیں ان کے دلوں میں شرک پرستوں کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو میدان جنگ میں عریش کے محافظ تھے وہ اس وقت یہ چاہتے تھے کہ گرفتار کسی کو نہ کیا جائے بلکہ یہیں قتل کر دیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے تجویز پیش کی کہ کسی وادی میں آگ بھڑکا کر ان سب کو نذر آتش کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویزیں سنیں پھر حجرہ شریفہ میں تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر میں تشریف لائے اور مختصر سی تقریر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی دل کو اتنا نرم کر دیتا ہے کہ دودھ سے بھی زیادہ رقیق ہو جاتا ہے اور کسی کے دل کو پتھر سے بھی زیادہ سخت کر دیتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جذبات کی مذمت نہیں فرمائی۔ ہر ایک کے جذبہ کی تحسین کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر صدیق کی مثال ایسی ہے جیسے فرشتوں میں حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں کہ وہ خدا کی رحمت ہی بن کر نازل ہوتے ہیں اور انبیاء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ایسی ہے جیسی حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا:

مَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (سورہ ابراہیم ع ۶)

''جو میرے پیچھے چلا وہ میرا ہے اور جس نے میری بات نہیں مانی وہ تیرے حوالہ ہے تو چاہے تو بخش دے کیونکہ تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ

''اگر تو ان کو (جنہوں نے مجھے ابن اللہ مانا) عذاب دے تو (بیشک تجھے اس کا اختیار ہے) وہ تیرے بندے ہیں (تو مالک و آقا ہے) اور اگر تو ان کو بخش دے تو (یہ بھی بعید نہیں ہے) کیونکہ تو غالب ہے اور صاحب حکمت ہے (ان کو عذاب دینا سراسر عدل ہے اور معاف کر دینا فضل و انعام ہے)''

پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ تمہاری مثال فرشتوں میں ایسی ہے جیسے جبرئیل علیہ السلام جو قوموں پر خدا کا عذاب نازل کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام میں تمہاری مثال ایسی ہے جیسے نوح علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی۔

حضرت نوح علیہ السلام نے کہا تھا:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا۔

''اے رب مت باقی رکھ زمین پر کسی بسنے والے کو'' (سورہ نوح)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی:

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ۔

''اے رب مٹا دے ان کے مال اور سخت کر دے ان کے دل اور یہ ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ دیکھ لیں عذاب دردناک۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رفقاء کرام کے جذبات کی نہ صرف تحسین فرمائی بلکہ اس تمثیل پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے کہ جلیل القدر ملائکہ اور عظیم المرتبت انبیاء علیہم السلام سے ان کو تشبیہ دی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ان تجویزوں کو نافذ کریں تو میں کسی کی مخالفت نہیں کروں گا لیکن پھر آپ نے فیصلہ یہی صادر فرمایا کہ فدیہ لیا جائے۔

مقدار فدیہ:

فدیہ حسب حیثیت لیا گیا۔ قریش کو پہلے شرم آئی کہ وہ فدیہ پیش کر کے اپنے عزیزوں کو رہائی دلائیں۔ ایک خیال یہ تھا کہ فدیہ ہرگز نہ دیا جائے اس سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھیں گے لیکن بنو سلیم کے ایک رئیس اور سوداگر مطلب ابن ابی وداعہ سہمی کا باپ بھی اسیر تھا۔ اس نے قریش کی اس مصلحت بینی کی پرواہ نہیں کی اور رات کے وقت مکہ معظمہ سے پوشیدہ نکل کر مدینہ پہنچا اور چار ہزار درہم فدیہ دے کر اپنے باپ (حارث ابو وداعہ) کو چھڑا کر لے گیا۔ (۴۵۰)

اس کے بعد اور لوگ بھی دوڑے اور فدیہ دے کر اپنے عزیزوں کو چھڑانے لگے۔ کم سے کم ایک ہزار فدیہ لیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ چار ہزار۔ جو نادار کچھ بھی ادا نہیں کر سکتے تھے ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے ان سے طے کر دیا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں اور رہا ہو جائیں۔ (۴۵۱)

گرفتاران جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس بھی تھے۔ جن کو حضرت ابوالیسر انصاری نے گرفتار کیا تھا۔ کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ اس کی کن فن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ صرف عم محترم ہی نہیں تھے بلکہ دل سے مسلمان تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے بہت بڑے معاون تھے۔ اس خبر سے آپ کو تشویش ہوئی۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اشارہ فرمایا کہ اس کی روک تھام کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے پاس پہنچے جو قتل کا ارادہ کیے ہوئے تھے اول ان لوگوں نے کچھ تامل کیا اور جب معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گوشہ خاطر یہی ہے تو سب نے سر تسلیم خم کر دیا (۴۵۲) پھر حضرات انصار کی ایک جماعت کا یہ اصرار ہوا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کچھ نہ لیا جائے۔ یہ ہمارے بھانجے ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی۔ (۴۵۳) اور چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ دولت مند تھے تو ان سے بھی چار ہزار درہم وصول کیے گئے جو اس حیثیت کے دوسرے قیدیوں سے وصول کیے گئے تھے۔ (۴۵۴)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برادر حقیقی عقیل بن ابی طالب بھی اسیر تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے معذرت کی کہ میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے اور میں نے قریش کی فوج پر بھی کافی رقم خرچ کی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ رقم تو ہے جو آپ روانگی کے وقت اپنی زوجہ (ام الفضل) کو دے آئے تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئے گی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد سنا تو پھڑک اٹھے کہ واقعی آپ سچے ہیں یہ رقم میں نے ضرور دی تھی مگر میرے اور ام الفضل کے علاوہ اور کسی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ (۴۵۵)

ابوسفیان کا ایک لڑکا عمرو بن سفیان بھی گرفتار تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو گرفتار کیا تھا۔

ابوسفیان نے اس کا فدیہ نہیں بھیجا۔ اس سے کہا گیا تو جواب دیا کہ دو نقصان ایک ساتھ قابل برداشت نہیں ہیں۔ میرا ایک لڑکا حنظلہ مارا گیا۔ دوسرا کا فدیہ ادا کروں۔ یہ نہیں ہوسکتا مسلمان جو چاہیں کریں۔

اتفاق سے قبیلہ بنو عمرو بن عوف کا ایک شخص سعد بن نعمان عمرہ کی غرض سے مکہ پہنچ گیا یہ شخص مشرک تھا مگر چونکہ قبیلہ بنو عمرو بن عوف مسلمانوں کا حلیف تھا تو اس کی اعانت اور حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر تھی چنانچہ ابوسفیان نے سعد بن نعمان کو پکڑ لیا اور کہلا بھیجا کہ مسلمان میرے بیٹے عمرو کو رہا کر دیں تو میں سعد کو رہا کر دوں گا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کے بیٹے کو بھجوا دیا اور سعد کو رہائی دلوا دی۔ (۴۵۶)

شوق شہادت اور ہمدردی نوع انسان:

صحیح السند روایت (۴۵۷) ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا تو عالم قضا وقدر کے اس مخفی راز کی طرف بھی اشارہ فرما دیا تھا کہ اگر ان قیدیوں کو قتل نہیں کیا جاتا اور فدیہ منظور کر لیا جاتا ہے تو آئندہ جنگ میں اتنے ہی مسلمان شہید کیے جائیں گے لیکن شہادت فی سبیل اللہ اور ہمدردی نوع انسان کا یہ جذبہ بے پناہ بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا کہ خدائے قدوس کے ان برگزیدہ بندوں نے شہادت منظور کی اور ان اسیروں کا قتل منظور نہیں کیا۔

ابوالعاص:

اسیران جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک داماد "ابوالعاص (۴۵۸) بن الربیع" بھی تھے۔ اگرچہ صاحب حیثیت تاجر تھے۔ قریش کے اونچے خاندان سے تعلق تھا۔ مگر اس موقع پر ان کے پاس فدیہ کی رقم نہیں تھی۔ ان کی اہلیہ محترمہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا) مکہ میں تھیں انہوں نے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے جو فدیہ بھیجا اس میں وہ ہار بھی تھا جو ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شادی کے وقت ان کو دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس ہار پر پڑی تو ایک جان نثار باوفا خاتون کی یاد تازہ ہوگئی۔ جس نے اپنا سب کچھ اسلام پر قربان کر دیا تھا۔

واقعات کی رفتار نے عجیب رقت انگیز صورت پیدا کردی تھی۔ وہ حق پرست وصداقت پسند خاتون رضی اللہ عنہا جو غار حرا میں آپ کو ناشتہ پہنچایا کرتی تھیں۔ جس نے نزول وحی کے وقت آپ کی ڈھارس بندھائی، آپ کی دلداری کی، سب سے پہلے آپ کی تصدیق کی۔ پھر اپنی تمام دولت دعوت حق کی تائید وحمایت میں صرف کردی۔ آج اسلام کی سب سے پہلی فتح کے موقع پر اسی باوفا خاتون کا ہار ایک قیدی کے فدیہ میں پیش ہو رہا ہے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اس کا اثر ہوا۔

مسلمانوں کا یہ امیر مطاع جس کے معمولی اشارہ پر مسلمان جانیں چھڑکنے کو اپنی سعادت اور کامیابی سمجھتے تھے۔ جس کی احسان شناسی کا یہ عالم تھا کہ مطعم بن عدی کے چند احسانوں کی بنا پر اس نے اسی جنگ کے خاتمہ پر میدان بدر میں فرمایا تھا کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان اسیران جنگ کے لیے سفارش کرتا تو میں سب کو چھوڑ دیتا۔ یہ احسان شناس رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس موقعہ پر بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفاداری اور خدمات کی بنا پر خود اپنی رائے سے یہ ہار واپس کرسکتا تھا اور ابوالعاص کو بلا فدیہ رہائی بخش سکتا تھا۔ مگر اس معاملہ کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خاص سے تھا۔ آپ کی بیٹی اور داماد کا معاملہ تھا۔ آپ نے بذات خود کوئی فیصلہ نہیں فرمایا۔ بلکہ ضابطہ اور قاعدہ کی پابندی اور آج کل کی اصطلاح میں جمہوری تقاضے کی مراعات ضروری سمجھی۔ آپ نے معاملہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ جیسے ہی مسلمانوں کو اس رقت انگیز صورت حال کا احساس ہوا سب نے درخواست کی کہ ماں کی یادگار بیٹی کو واپس کردی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کے فیصلہ کے بموجب ابوالعاص بلا فدیہ رہا کر دیئے گئے۔ (۴۵۹)

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی واپسی:

اب تک مسلم اور مشرک کا باہمی نکاح حرام نہیں ہوا تھا اور اسی بنا پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا ابوالعاص کے یہاں تھیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب یہی سمجھا کہ صاحبزادی حضرت زینب مدینہ آجائیں۔ چنانچہ آپ نے ابوالعاص سے فرمایا اور انہوں نے وعدہ کرلیا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بھیج دیں

گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر سے تقریباً ایک ماہ بعد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا کہ وہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو لے آئیں اور ایک انصاری جان نثار کو ساتھ کر دیا۔ یہ حضرات مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ مکہ کے قریب ایک (۴۶۰) جگہ آپ نے بتا دی تھی کہ وہاں پوشیدہ طور پر ٹھیر جائیں اور جب زینب رضی اللہ عنہا وہاں پہنچیں تو ان کو ساتھ لے کر مدینہ چلے آئیں۔

ابوالعاص نے وعدہ پورا کیا۔ اپنے بھائی کنانہ بن ربیع کے سپرد کیا وہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اس مقام پر پہنچا آئیں جہاں یہ دونوں صاحب تھے۔

عرب کی معزز خواتین پردہ کے ساتھ ہودج (ہودہ) میں سفر کیا کرتی تھیں جو اونٹ پر کسا جاتا تھا۔ کنانہ بن ربیع نے بھی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ہودج میں سوار کیا۔ تیر اور ترکش ساتھ لیا۔ دوسرے اونٹ پر خود سوار ہوا اور دوپہر کے وقت مکہ سے روانہ ہو گیا لیکن ابھی ذی طوی ہی پہنچے تھے کہ قریش کے کچھ لوگ پہنچ گئے اور ہودج کو گھیر لیا۔ ہبار بن اسود نے آگے بڑھ کر حضرت زینب رضی اللہ عنہ کے اونٹ کے نیزہ مارا۔ جس سے اونٹ تڑپا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا زمین پر گر گئیں۔ حضرت زینب حاملہ تھیں۔ اس صدمہ سے حمل بھی ساقط ہو گیا۔

کنانہ نے یہ ہنگامہ دیکھا تو فوراً ترکش سنبھالا اور تیر اندازی شروع کر دی۔ مگر ہبار بچ کر نکل گیا ابوسفیان جو کچھ آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے اشارہ سے کنانہ کو روکا کہ تیر اندازی بند کریں وہ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ کنانہ رک گئے تو ابوسفیان نے پاس آ کر کہا ہم یہ نہیں چاہتے کہ زینب رضی اللہ عنہا کو اس کے باپ سے چھڑا دیں۔ مگر تمہاری یہ حرکت قابل برداشت نہیں ہے۔ رات کی تاریکی میں نکال کر لے جاتے اور ہمیں خبر نہ ہوتی تو ہمارے لیے عذر کا موقع تھا لیکن دن دہاڑے تم لیجا رہے ہو تو لوگ یہی کہیں گے کہ قریش اتنے مرعوب ہو چکے ہیں کہ کھلم کھلا ان کے سامنے عورتیں نکال لی جاتی ہیں اور وہ دم نہیں مار سکتے۔ یہ ہماری بھی بدنامی ہے اور تمہاری بھی۔ اب میرا مشورہ یہ ہے کہ تم زینب رضی اللہ عنہا کو واپس لے چلو۔ پھر جیسا موقع ہو کام کرنا۔

کنانہ نے موقع اور مصلحت کو سمجھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اس وقت واپس لے آئے پھر چند روز بعد موقع پا کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بطن یاجج پہونچا دیا۔ جہاں حضرت زید بن حارثہ اور ان کے رفیق منتظر تھے وہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو لے کر مدینہ آ گئے۔ (۴۶۱)

حضرت ابوالعاص دائرہ اسلام میں:

ابوالعاص صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑے تاجر تھے۔ چند سال کے بعد بڑے سر و سامان سے شام کی تجارت کو نکلے۔ واپسی میں مسلمانوں کے ایک دستہ سے مقابلہ ہو گیا۔ ابوالعاص نے بھاگ کر جان بچائی سارے سامان اور مال تجارت پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ابوالعاص بہت پریشان تھے کہ مکہ میں جا کر کیا منہ دکھائیں گے لیکن ایک تدبیر ان کی سمجھ میں آئی جو کامیاب رہی۔ آپ رات کی اندھیری میں مدینہ میں داخل ہو کر حضرت زینب

رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ گئے اور ان کے ذریعہ امان کی درخواست کی۔ اسلامی اصول جنگ کے بموجب ہر مسلمان امان اور پناہ دے سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے خود ہی ان کو امان (پناہ) دے دی اور نماز صبح کے وقت جیسے ہی جماعت شروع ہوئی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے صفتہ النساء سے (جہاں عورتیں نماز پڑھا کرتی تھیں وہیں سے) اعلان کر دیا مسلمانو! میں نے ابو العاص بن ربیع کو پناہ دیدی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو جماعت کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

''میرے کانوں میں جو آواز پڑی ہے وہ آپ صاحبان نے بھی سنی ہوگی۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں اس سے پہلے میرے علم میں کوئی بات نہیں آئی۔ اب جب کہ ایک مسلمان خاتون (زینب) امن دے چکی ہے تو اس کو تسلیم کرنا ہر مسلمان پر لازم ہو گیا۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف لے گئے اور ان کو ہدایت فرمائی کہ ابو العاص رضی اللہ عنہ کی خاطر مدارات پوری طرح کریں لیکن خلوت سے اجتناب کریں۔

ابو العاص رضی اللہ عنہ کو جان کی پناہ مل گئی تھی لیکن مال کی پریشانی اب بھی باقی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا۔ مناسب سمجھو تو ابو العاص رضی اللہ عنہ کا مال و اسباب بھی واپس کر دو۔ سب طرف سے تسلیم کی گردنیں جھک گئیں اور جو کچھ چھینا گیا تھا ایک ایک دھاگا تک واپس کر دیا گیا۔ ابو العاص ایک بہادر شریف زادے تھے۔ میدان بدر میں تلواروں کی جھنکار نے ان پر یہ اثر نہیں کیا جیسا اس اخلاقی کرشمہ نے ان کا دل موہ لیا۔

ابو العاص رضی اللہ عنہ مکہ واپس آئے، تمام شرکاء کو حساب سمجھایا، جس جس کی امانت ان کے پاس تھی پوری احتیاط سے واپس کی۔ یہ بھی دریافت کر لیا کہ کچھ اور تو باقی نہیں ہے۔ جب سب نے تصدیق کر دی کہ آپ کے ذمہ اب کچھ نہیں رہا۔ تب آپ رضی اللہ عنہ نے اعلان فرما دیا۔

اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ

اہل مکہ سے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں صرف اس لیے آیا تھا کہ ہر ایک کی چکتائی کر دوں تاکہ کل کو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ابو العاص ہمارا روپیہ مار کر مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لے آئے۔''

اسیرانِ جنگ کے ساتھ سلوک:

عرب کے اس دور معصوم میں جیل خانہ نہیں تھا۔ لوگ قیدی کو تسمہ سے باندھ دیا کرتے تھے۔ اسی لیے اس کو اسیر کہتے تھے یعنی تسمہ والا۔ کیونکہ اسر تسمہ کو کہا جاتا ہے۔ جو گرفتار کرتا تھا وہی اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

خورد ونوش کا انتظام بھی وہی کیا کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ (۴۶۲) اس ہدایت پر یہاں تک عمل کیا گیا کہ صحابہ کرام ان قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجوریں کھا کر رہ جاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابوعزیز بن عمیر بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں جن انصار کے یہاں قید تھا جب وہ کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے تھے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے تھے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیدیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ ہی کو واپس کر دیتے تھے۔ (۴۶۳)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو قید کی حالت میں مسجد میں رکھا گیا۔ تسمہ سخت کسا ہوا تھا۔ تکلیف سے کراہ نکلنے لگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کراہ کی آواز سنی تو نیند جاتی رہی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی بے چینی کا احساس خدام کو ہوا اور جب معلوم ہوا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بے چینی کی وجہ سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہیں تو تسمہ ڈھیلا کر دیا اور جب حضرت عباس کا تسمہ ڈھیلا کیا گیا تو تمام اسیروں کے تسمے اسی طرح ڈھیلے کر دیئے گئے۔ (۴۶۴)

اسیرانِ جنگ کے پاس کپڑے نہیں تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑے دلوائے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قد لانبا تھا۔ کسی کا کرتہ ان کے بدن پر ٹھیک نہ آیا۔ عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) ان کا ہم قد تھا، اس نے اپنا کرتہ منگا کر دیا۔ صحیح بخاری (۴۶۵) میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے کفن کے لیے جو اپنا کرتہ عنایت فرمایا وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔

ابوعزہ عمرو الجمعی مشہور شاعر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اشعار اور قصیدے کہا کرتا تھا وہ بھی گرفتار ہوا اور جب فدیہ کا مطالبہ کیا گیا تو معذرت پیش کر دی کہ تہی دست ہوں۔ پانچ لڑکیوں کا خرچ میرے ذمہ ہے مجھے تو آپ بلا فدیہ ہی رہا کر دیجیے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست منظور فرمائی اور اس کو رہا کر دیا۔ اس نے مکہ جا کر آپ کی تعریف میں اشعار کہے۔ مگر پھر بدبختی سوار ہوئی جنگ احد کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز اشعار کہے اس بدعہدی کا بدلہ بھی ہاتھ در ہاتھ مل گیا۔ جنگ احد میں گرفتار ہوا پھر بصد ناکامی قتل ہوا۔ (۴۶۶)

سہیل بن عمرو۔ مکہ کا مشہور خطیب اور شاعر تھا۔ اس کا نیچے کا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی تقریر دھواں دھار کیا کرتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زہر اگلا کرتا تھا۔ جنگ بدر میں گرفتار ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ اس کے آگے کے دو دانت توڑ دیئے جائیں تاکہ تقریر نہ کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں مثلہ کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں ''نبی'' ہوں مگر مثلہ ایسا فعل ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے انتقام میں خود میرا مثلہ نہ کر دے۔ (معاذ اللہ)

مکرز بن حفص نے اس کی رہائی کی کوشش کی مگر زر فدیہ پاس نہیں تھا تو مکرز نے خود اپنی ضمانت پیش کر دی

کہ میرے پاؤں میں تسمہ ڈال دیا جائے اور سہیل کو مہلت دی جائے کہ وہ رقم فدیہ فراہم کر کے لے آئے۔ رحمت دوجہاں (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں یہ ضمانت منظور ہوئی اور سہیل کو رہا کر دیا گیا کہ وہ زرفدیہ فراہم کر لے۔ (۴۶۷)

اسیران جنگ کی دلداری اور دعوت الی اللہ کا معجزانہ انداز:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ تا عَلِيمٌ حَكِيمٌ (سورہ انفال ع ۱۰)

(۱) اے نبی! لڑائی کے قیدیوں میں سے جو لوگ تمہارے قبضہ میں ہیں ان سے کہہ دو اگر اللہ نے تمہارے دلوں میں کچھ نیکی پائی تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے کہیں بہتر چیز تمہیں عطا فرمائے گا اور تمہیں بخش دے گا۔ وہ بڑا بخشنے والا رحمت والا ہے۔

(۲) اور اگر ان لوگوں نے چاہا کہ تمہیں دغا دیں (تو کوئی وجہ نہیں کہ اس اندیشے سے تم اپنا طرز عمل بدل ڈالو کیونکہ) یہ اس سے پہلے خود اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں (لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے) تمہیں ان پر قدرت دیدی اور (یاد رکھو) اللہ سب کچھ جانتا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

یہ سورہ انفال کے دسویں رکوع کی آیتیں ہیں۔ ان سے پہلے نویں رکوع کے آخر میں وہ آیتیں ہیں جن میں مسلمانوں کو ان قیدیوں سے فدیہ لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر پہلے گذر چکا ہے کہ اجازت کا انداز بہت زیادہ حوصلہ شکن ہے۔ انتہا یہ کہ جن لوگوں کو کہا گیا تھا۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا یہی ہیں سچے اور حقیقی مومن فدیہ کے سلسلہ میں ان کو کہو دیا گیا تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا "تم متاع دنیا چاہتے ہو" ایک طرف مسلمانوں کے حق میں یہ حوصلہ شکن انداز بیان ہے۔ دوسری طرف ان اسیران جنگ کو اطمینان دلایا جارہا ہے کہ:

(الف) تمہارے دلوں میں کچھ بھی نیکی ہوئی تو اطمینان رکھو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے کہیں بہتر تم کو دے دیا جائے گا۔

(ب) اگر تم نے نیکی پر عمل کیا تو اللہ کی مغفرت کا دامن وسیع ہے۔ اس کی رحمت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں تمہارے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے اور تمہیں رحمت کے سایہ میں لے لیا جائے گا۔

فضیلت

یہ آیت ان صحابہ کرام کے حق میں مغفرت اور رحمت کی دستاویز ہے جو اس وقت قید ہوئے تھے۔ پھر اسلام سے مشرف ہوئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ انہیں بزرگوں میں ہیں جو ہر طرح اس آیت کے مصداق ثابت ہوئے۔ آپ اسلام سے بھی مشرف ہوئے اور جتنا مال ان سے فدیہ میں لیا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ ان کو عطا

کیا گیا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ بحرین سے طے شدہ رقم آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحن مسجد میں اس کو بکھیر دو۔ اس وقت تک اس سے زیادہ دولت کبھی نہیں آئی تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تقسیم کرنا شروع کیا۔ اس وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی آ گئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ مجھے بھی عنایت فرمائیے۔ میں نے جنگ بدر کے موقع پر اپنا بھی فدیہ ادا کیا تھا اور برادر زادہ عقیل کا بھی فدیہ ادا کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اٹھا لو۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا کپڑا پھیلایا اور اتنے درہم بھر لیے کہ جب اٹھانے لگے تو ان سے اٹھے نہیں۔ حضرت عباس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کسی سے کہہ دیجئے کہ یہ اٹھا کر میرے ساتھ لے چلیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی کو بھیجا نہیں جائے گا آپ خود جتنے درہم لے جا سکیں لے جائیں۔ حضرت عباس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ اٹھوا دیجئے۔ فرمایا یہ بھی نہیں ہوگا۔ آپ خود اٹھائیے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کچھ درہم کم کر دیئے تب بھی اتنا وزن باقی رہ گیا کہ بہت ہی مشکل سے مونڈھے پر اٹھا کر لے جا سکے۔

بہرحال اس آیت میں جو دعوت دی گئی تھی۔ جس نے اسے قبول کیا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے وہ وعدہ بھی پورا فرمایا کہ جو رقم ان سے وصول کی گئی تھی اس سے بہت زیادہ ان کو عطا کر دی گئی۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں تو یہ بشارت اس طرح بھی پوری ہوئی کہ انہیں کے اخلاف تھے جو خلفاء عباسیہ کے نام سے تقریباً چار صدی تک اسلامی ممالک پر حکومت کرتے رہے۔

آیت کا دوسرا حصہ عفو و درگذر کے معاملہ میں انتہائی سیر چشمی کی دعوت دے رہا ہے۔ ارشاد یہ ہے کہ:

> ''اس طرح کا کوئی خدشہ کہ آج ان کو چھوڑا گیا تو کل کو پھر مقابلہ پر آ جائیں گے رکاوٹ نہ بننا چاہیے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ امن پسندی، صلح، مصالحت اور اعلیٰ اخلاق کے جوہر پیش کریں۔ اگر مخالفین نے اس کی قدر نہیں کی اور پھر خیانت اور بغاوت پر آمادہ ہوئے تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے آج تمہیں ان پر قابو عطا فرمایا ہے وہ آئندہ بھی تمہیں قدرت بخشے گا اور تمہیں ان پر غلبہ عنایت فرمائے گا۔'' (واللہ اعلم بالصواب)

خصوصی مجرم اور ان کو سزائیں:

اس وقت کوئی فوجی عدالت قائم نہیں تھی۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اقوال و افعال ایسی نظیریں قائم کر رہے تھے جو فوجی عدالتوں کے لیے ضابطہ بن سکیں۔

کفر، شرک، مسلمانوں کو ایذا پہنچانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی۔ یہ ایسے جرائم تھے جو ان سب پر ثابت تھے جو قریش کی فوج میں آئے تھے۔ مگر ان جرائم کی بنا پر کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ معرکہ میں جو لوگ مارے گئے ان کے علاوہ جو ہاتھ لگے وہ گرفتار کر لیے گئے اور جو بھاگ گئے ان کا تعاقب بھی نہیں کیا گیا۔ صرف

عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث یہ دو مجرم تھے جو گرفتاری کے بعد قتل کیے گئے کیونکہ ان کے جرم خاص نوعیت کے تھے۔

عقبہ بن ابی معیط:

کا یہ جرم بھی خاص نوعیت رکھتا تھا کہ جب حرم کعبہ میں محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم سر بسجود تھے تو اس نے اونٹ کی بھاری اوجھ سر مبارک پر رکھ دی تھی۔ ایک مرتبہ آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ کا دم گھٹنے لگا اور آپ گھٹنوں کے بل گر گئے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن ان جرموں کے علاوہ ایک اور جرم تھا جس کی بنا پر اس کے قتل کا حکم صادر کیا گیا۔ اس نے اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر بدستور بدترین معاند اور دشمن اسلام بن گیا۔

ابتداء میں یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ کی دعوت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معذرت کر دی۔ اس نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا۔ مسلمان ہو جاؤ تو کھانا کھا لوں گا۔ اس نے فوراً کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا تناول فرمالیا۔

ابی بن خلف عقبہ کا یار غار تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ عقبہ نے کلمہ پڑھ لیا ہے تو وہ اس پر بہت ناراض ہوا۔ عقبہ نے اس کو خوش کرنا چاہا تو اس نے یہ شرط لگائی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گردن پر پاؤں رکھو اور اس کے منہ پر تھوکو۔ عقبہ نے یہ شرط پوری کی اور ایمان سے دامن جھاڑ کر کفر اختیار کیا[۴۶۸] (معاذ اللہ)

نضر بن حارث:

کا جرم اپنی نوعیت میں اس سے بھی سخت تھا۔

حضرت حق جل مجدہ نے اپنے رسول اپنے کلام (فرقان حمید) کی صداقت کے لیے خود قرآن حمید کو پیش کیا ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات میں یہ چیلنج شروع سے آج تک گرج رہا ہے کہ اگر تم کو اس کے کلام الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت بنا کر لے آؤ اور اگر سرزمین عرب کے فصحاء اور بلغاء اس پر قادر نہ ہوں تو خدا کے سوا جتنی طاقتیں وہ فراہم کر سکتے ہیں سب کو فراہم کر لیں اور اس جیسی ایک سورت بنا کر پیش کر دیں[۴۶۹]

قریش کے مایہ ناز خطیب اور شعراء اس چیلنج کو برابر سنتے رہے لیکن کسی ایک سورت کی مثال وہ نہیں پیش کر سکے۔ البتہ انہوں نے ہر طرح شورش برپا کر کے اس صداء حق کو بند کرنا چاہا۔ یہ ایک عام جرم تھا۔ لیکن نضر بن حارث نے عجیب شرارت کی۔ اس نے یہ سیدھی راہ تو اختیار نہیں کی کہ وہ کوئی سورت بنا کر چیلنج کا جواب دیتا۔ اس نے آیات کلام اللہ کو بگاڑ کر لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ کلام اللہ یہ ہے:

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا   فَالْعَاصِفَاتِ عَصْفًا

اس نے دو جملے اپنی طرف سے ملا لیے۔ والطاحنات طحنا والعاجنات عجنا (۴۷۰) اور پروپیگنڈہ شروع کیا کہ کلام اللہ یہ ہے۔

اب ایک طرف قریش کی یہ منظم کوشش کہ کلام اللہ شریف عربوں کے کانوں تک پہنچنے نہ پائے دوسری طرف یہ شرارت کہ ایک جعلی کلام پیش کر کے بتایا جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس کو معجزانہ کلام کہتے ہیں وہ یہ ہے جس میں والطاحنات طحنا والعاجنات عجنا جیسے جملے ہیں۔ جن کو ہر ایک عربی بولنے والا بنا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح دعوت حق کا تمام نظام درہم برہم ہو جاتا تھا اور طالبان حق کے سامنے چیلنج اصلی شکل میں پیش نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ شرارت آمیز ''جعل'' نضر بن حارث کا خاص جرم تھا جس کی سزا اس کو قتل کی صورت میں دی گئی۔

کسی حکومت کے دستور اساسی کو مسخ کر کے پیش کیا جائے تا کہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہوں تو کیا یہ جرم گردن زدنی نہیں ہوگا؟

تقاضاء بشریت:

حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ وہ راسخ الایمان جاں نثار تھے کہ جب ان کے باپ عتبہ بن ربیعہ سب سے پہلے میدان میں نکل کر آئے اور اعلان کیا کہ کس کی ہمت ہے جو میرے مقابلہ پر آئے تو یہ جاں نثار باپ کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منع نہ فرماتے تو ممکن تھا باپ کا سر یہی قلم کرتے۔

پھر جس قدر یہ راسخ الایمان تھے۔ ایسا ہی ان کا امتحان بھی سخت ہوا کہ پہلے ہی نمبر پر ان کے باپ (رئیس قریش عتبہ بن ربیعہ) حقیقی بھائی ولید بن عتبہ اور چچا شیبہ بن ربیعہ مارے گئے۔

لیکن جب عام مقابلہ شروع ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایت فرمادی کہ عباس وغیرہ ہاشمی افراد کو قتل نہ کیا جائے (۴۷۱) کیونکہ ان کو زبردستی جنگ میں گھسیٹا گیا ہے تو ابوحذیفہ کا پیمانہ صبر چھلک گیا اور ان کی زبان سے نکل گیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہمارے باپ بھائی سب مارے جائیں اور بنو ہاشم کی جانیں محفوظ رکھی جائیں۔ میرے سامنے کوئی آ گیا تو میں ضرور قتل کروں گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع مبارک تک یہ جملہ پہونچا تو آپ کو ملال ہوا۔ آپ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اس کی شکایت کی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شمشیر برہنہ تھے۔ فوراً عرض کیا۔ یہ تو منافق ہے یارسول اللہ۔ اجازت دیجئے اس کی گردن اڑا دوں مگر یہ اضطراری جملے جو فوری تاثر کی بنا پر سرزد ہوئے تھے اس قابل کب تھے کہ ان کی وجہ سے گردن اڑا دی جاتی۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کو احساس ہوا کہ بنو ہاشم کے متعلق یہ ہدایت اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں بلکہ اس بنا پر ہے کہ وہ مسلمانوں کے حامی مانے جاتے ہیں۔ قریش ان کو مکہ معظمہ میں اس بنا پر پریشان کرتے رہتے ہیں اور اس وقت ان سے زبردستی رقومات بھی اینٹھی گئی ہیں اور ان کو زبردستی جنگ میں اس لیے گھسیٹا گیا ہے کہ ان کے مکہ میں

رہنے سے قریش کو خطرہ تھا۔ تو ابو حذیفہ خود نادم ہوئے پھر آپ جب بھی اس کا تذکرہ کرتے ندامت کے ساتھ ہی تذکرہ کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس کی تلافی صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ میں راہ حق میں جان دے دوں۔ چنانچہ آپ کی تمنا پوری ہوئی اور جنگ یمامہ میں آپ نے درجہ شہادت حاصل کیا۔ (۴۷۲)

اسی طرح کا واقعہ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ جب اسیران بدر مدینہ میں لائے گئے ان میں ان کے عزیز سہیل بن عمر بھی تھے ان پر نگاہ پڑی تو بے ساختہ بول اٹھیں کہ تم نے عورتوں کی طرح مشکیں کسوالیں یہ نہ ہوسکا کہ لڑ کر مر جاتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریب ہی تشریف فرما تھے۔ آپ نے حضرت سودہ کے جملے سنے تو فرمایا: سودہ رسول اللہ کے مقابلہ پر اشتعال پھیلا رہی ہو۔

حضرت سودہ دم بخود ہو گئیں فوراً معذرت کی۔ یارسول اللہ یہ جملے بے اختیار زبان سے نکل گئے۔ (۴۷۳)

نجاشی کی مسرت اور اظہار مسرت کا عجیب طرز:

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات جو مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے وہ ابھی حبش ہی میں تھے کہ یہاں بدر کا یہ معرکہ پیش آ گیا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک روز نجاشی نے ہمیں اپنے یہاں طلب کیا۔ ہم محل میں پہنچے تو دیکھا کہ نجاشی پرانے کپڑے پہنے ہوئے مٹی پر بیٹھا ہے۔ ہمیں حیرت ہوئی اور تشویش بھی ہوئی کہ ماجرا کیا ہے لیکن نجاشی کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے اور اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہم سے کہا کہ میں نے آپ صاحبان کو ایک بشارت دینے کے بلایا ہے۔

نجاشی نے کہا ہمارے خفیہ آدمی جو حجاز میں رہتے ہیں۔ انہوں نے سرکاری طور پر اطلاع دی ہے کہ اہل اسلام کی قریش سے جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی قریش کو شکست ہوئی اور قریش کے فلاں فلاں سردار مارے گئے اور فلاں فلاں گرفتار ہوئے۔

نجاشی نے کہا۔ میدان بدر میرا دیکھا ہوا ہے۔ یہاں اراک کے درخت بہت ہیں۔ جب میں قبیلہ بنی ضمرہ کے ایک سردار کا غلام تھا تو اس کے اونٹ وادی بدر میں چرایا کرتا تھا۔

ہم نے اس خبر پر خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر نجاشی سے دریافت کیا کہ آپ نے یہ صورت کیا بنا رکھی ہے کہ مٹی پر بیٹھے ہوئے ہیں میلے کچیلے کپڑے ہیں کوئی فرش بھی نہیں ہے۔

نجاشی نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو وحی نازل ہوا کرتی تھی اس میں یہ تھا کہ اللہ کے بندوں کا یہ فرض ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا کوئی انعام میسر آئے تو وہ انتہائی تواضع اور عاجزی ظاہر کریں یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام واحسان ہے کہ اس نے نبی برحق کو فتح عطا فرمائی۔ اس لیے میں نے اظہار شکر کے لیے یہ صورت اختیار کی ہے۔ (۴۷۴)

خدا خود میر سامانست ارباب توکل را:

احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھنے والے اہل علم عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ سے بخوبی واقف ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی تھی کہ میری امت میں سے ستر ہزار ایسے ہوں گے جو بلا حساب وکتاب جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے تو فوراً حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ اٹھے تھے اور عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں شامل فرمادے۔ آپ نے دعا فرمائی تھی۔ اللھم اجعلہ منھم ''اے اللہ عکاشہ کو ان میں شامل کردے۔''

پھر ایک صاحب اور اٹھے اور یہی درخواست کی کہ میرے لیے بھی دعا فرمایئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: سبق بھا عکاشہ ''یہ درجہ تو تم سے پہلے عکاشہ حاصل کر چکے۔''

ان ستر ہزار کی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی تھی کہ یہ ارباب توکل ہوں گے۔ (۴۷۵)

(جن کی نظر اسباب پر قطعاً نہیں ہوگی۔ ان کا پورا اعتماد حضرت حق جل مجدہ کی کارسازی پر ہوگا۔)

انہیں حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ یہ ہے کہ جنگ بدر کے موقعہ پر لڑتے لڑتے ان کی تلوار ٹوٹ گئی، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سرور کائنات صلی اللہ علی وسلم نے لکڑی کا ایک ڈنڈا دے دیا اور فرمایا۔ قاتل بھذا یا عکاشہ۔ ''عکاشہ اس سے لڑو۔''

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور حضرت عکاشہ کے توکل کا کرشمہ تھا کہ وہ لکڑی کا ڈنڈا آبدار تلوار بن گیا۔ حضرت عکاشہ نے اس کا نام عین رکھا اور معرکہ بدر میں اس سے کام لیا۔ پھر یہ معجزہ والی تلوار حضرت عکاشہ کے پاس رہی۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں طلیحہ اسدی سے جنگ ہوئی۔ اس میں حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ (۴۷۶)

سازش قتل اور بطریق معجزہ اس کی ناکامی:

عمیر بن وہب جمحی اسلام کا موذی دشمن تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان جب مکہ میں تھے تو ان کو بہت پریشان کیا کرتا تھا۔ طرح طرح سے ایذا پہنچایا کرتا تھا۔ معرکہ بدر میں اس کا بیٹا وہب بھی گرفتار ہوگیا۔ ایک روز یہ عمیر اور صفوان بن اُمیہ ایک جگہ بیٹھے ہوئے معرکہ بدر کی باتیں کر رہے تھے۔ ان دو کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ صفوان نے کہا۔ خدا کی قسم اب جینے کا مزہ نہیں۔ عمیر نے کہا سچ کہتے ہو۔ اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں مدینہ پہنچتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر آتا۔ میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے۔ صفوان نے کہا تم قرض اور بچوں کی فکر نہ کرو۔ ان کا میں ذمہ دار ہوں۔ عمیر نے کہا اچھا میں جاتا ہوں۔ مگر آپ اس کا تذکرہ کسی سے بھی نہ کریں۔ صفوان نے وعدہ کیا۔

عمیر نے گھر آ کر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچ گیا۔ جیسے ہی اس نے مسجد کے دروازہ کے سامنے اونٹنی

بٹھائی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۴۷۷) کی نظر اس پر پڑ گئی۔ یہ تلوار لگائے ہوئے تھا۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کچھ کھٹکے۔ انہوں نے تلوار پر قبضہ کیا اور تلوار کے پرتلہ کو جو اس کی گردن میں تھا کھینچتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمیر بن وہب کو اس طرح کھینچتے ہوئے لا رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمران کو چھوڑ دو۔ پھر عمیر سے فرمایا میرے قریب آؤ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر کو اپنے پاس بٹھا کر فرمایا۔ کس لیے آئے ہو۔ عمیر نے جواب دیا میرا لڑکا قید ہے اسے چھڑانے آیا ہوں۔ کچھ نظر کرم ہو جائے۔ فرمایا یہ تلوار کیوں حمائل ہے۔ عمیر نے جواب دیا تلوار لے آیا ہوں۔ مگر یہ کس کام کی تلوار ہے۔ بدر میں اس نے کیا کام کیا؟

فرمایا بات مت بناؤ، سچ بات کہو، کیا تم نے اور صفوان نے مکہ میں میرے قتل کی سازش نہیں کی اور کیا تم صفوان سے عہد معاہدہ کر کے نہیں آئے۔

عمیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔ بے اختیار ہو کر بولا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بیشک تم پیغمبر ہو۔ بخدا میرے اور صفوان کے علاوہ اس معاملہ کی اور کسی کو خبر نہیں تھی۔ اب مجھے یقین آیا۔ آپ جو فرماتے ہیں۔ صحیح ہے۔ میں اگر چہ برے ارادہ سے آیا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اب میں آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین سے فرمایا: اپنے بھائی عمیر کو اپنے پاس رکھو۔ انہیں دین کی باتیں بتاؤ۔ قرآن شریف یاد کراؤ اور اس کے بیٹے کو رہا کر دو۔

اب عمیر حلقہ بگوش اسلام تھے۔ قریش جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی خبر کے منتظر تھے۔ دفعتہً انہیں معلوم ہوا کہ عمیر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

عمیر مسلمان ہو کر بہادرانہ مکہ میں آئے۔ جہاں کا ہر ذرہ اس وقت مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا ان کو اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی اسی شدت سے اب وہ دشمنان اسلام کے دشمن ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا اور ایک مجمع کثیر کو اس کی روشنی سے منور کر دیا۔ (۴۷۸)

اقدامات غزوہ بدر کی دوسری ترتیب و توجیہ

اور اس پر تبصرہ

یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کا اصرار ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ قریش کی روانگی کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ (۴۷۹) ہی میں ہو گئی تھی۔ اسی وقت آپ نے اجتماع کیا، تبادلہ

خیالات اسی وقت ہوا۔ پھر جو طاقت مہیا تھی اس کی تیاری کے ساتھ آپ کی روانگی مدینہ منورہ سے ہوئی۔ کاروان تجارت پر حملہ پیش نظر نہیں تھا بلکہ قریش کے حملہ کا دفاع مقصود تھا۔

آپ نے سیرت النبی میں غزوہ بدر کے سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد غزوہ بدر پر دوبارہ نظر کا ایک عنوان قائم کیا ہے اور غزوہ بدر کے مقصد پر طویل بحث کی ہے۔

اس فقیر بے نوا، قلیل البضاعت اور تہی مایہ کی یہ ہمت نہیں کہ حضرت علامہ کی محققانہ بحث کے مقابلہ پر قلم اٹھائے مگر حسن اتفاق یہ ہے کہ خود علامہ موصوف کے ارشاد کے بموجب جملہ مؤرخین اور ارباب سیرت کی حمایت اس فقیر بے مایہ کو حاصل ہے اور ان کی تحقیقات کی طاقت اس کی پشت پر ہے۔

گدایاں را ازیں معنے خبر نیست
کہ سلطان جہاں با ماست امروز

علامہ تحریر فرماتے ہیں:

اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مؤرخین اور ارباب سیر (۴۸۰) میرے حریف ہیں۔ بہت جلد نظر آ جائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے۔ (سیرۃ النبی ص ۳۱۷ طبع سوم)

علامہ کا ارشاد بجا ہے۔ بیشک حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے۔ مگر سوال یہی ہے کہ حق کیا ہے؟ حضرت علامہ کے محققانہ دلائل میں سب سے زیادہ مضبوط دلیل جس کو بنیادی دلیل کہا جا سکتا ہے یہی آیتیں ہیں جن کی تفسیر و تشریح ان صفحات میں کی گئی ہے۔ جو پہلے گذرے ہیں۔

حضرت علامہ ان آیات کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے ''قرآن'' جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے۔

كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ الاية

حضرت علامہ پہلے آیت کی ترکیب نحوی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے یہ موقع عین وہ موقع تھا۔ جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آگے بڑھے۔

مختصر یہ کہ حضرت علامہ کے ارشاد کے بموجب یہ بالکل بجا ہے کہ قرآن حکیم کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے لیکن قرآن حکیم میں صرف یہ ہے:

إِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ ۰

اس کے معنی خود حضرت علامہ نے چند صفحہ پہلے یہ تحریر فرمائے ہیں:

حالانکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس (۴۸۱) سے ناخوش تھا۔ص ۳۱۲

پھر اس موقع پر یہ آیت پیش کی ہے تو ترجمہ یہ فرمایا ہے۔ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا مطلب یہ ہے کہ جی چرانے کا مفہوم آیت کے ترجمہ میں نہیں ہے۔ وہ حضرت علامہ کی طرف سے مستزاد ہے۔ نیز لڑائی سے بھی قرآن میں نہیں ہے۔

حضرت علامہ نے ترجمہ تو یہ فرمایا۔ اس سے ناخوش تھا اور استدلال کے موقع پر اس کا مطلب یہ لیا۔ جو لڑائی سے جی چراتا تھا۔

اب مؤدبانہ گذارش ہے کہ ہم سب کو قرآن پاک کے سامنے گردن جھکا دینی چاہیے یا حضرت علامہ کے بیان کردہ مطلب کے سامنے جو خود بقول علامہ تمام مؤرخین اور ارباب سیرت کے خلاف ہے۔

آپ حضرت علامہ کے بیان کردہ مطلب کو نہیں بلکہ پیش کردہ ترجمہ کو سامنے رکھئے اور ارباب سیرت و مؤرخین کے بیانات ملاحظہ فرمایئے جن کا خلاصہ ہم نے پیش کیا ہے کہ ناگواری اس عاجلانہ اقدام سے تھی جنگ سے نہیں۔ کیونکہ جنگ کا ابھی کوئی تذکرہ نہیں تھا۔

ترکیب نحوی کے لحاظ سے بھی گفتگو کی جائے تو غور طلب یہ ہوگا کہ ناخوشی کا تعلق کس بات سے مانا جائے۔ قرآن حکیم میں صرف کــارهــون کا لفظ ہے۔ جس کے معنی علامہ کے الفاظ میں یہ ہیں کہ ناخوش تھے پسند نہیں کرتے تھے''اس سے'' کا لفظ بھی علامہ نے بڑھا دیا۔ ترجمہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کراہیت کر رہی تھی اور بقول علامہ۔ ناخوش تھی۔

سوال یہ ہے کہ کراہیت کس چیز سے کر رہی تھی اور بقول علامہ۔ ناخوش تھی۔

سوال یہ ہے کہ کراہیت کس چیز سے کر رہی تھی؟ قرآن پاک میں اس کی وضاحت نہیں ہے۔ اس آیت میں جنگ یا قتال کا نہ کوئی لفظ ہے نہ کوئی ضمیر یا اشارہ ہے جس سے جنگ اور لڑائی مراد لی جائے کہ لڑائی سے کراہیت کر رہی تھی یا بقول علامہ جی چرا رہی تھی۔ البتہ ابتداء آیت میں خروج کا تذکرہ ہے۔ لہٰذا ترکیب نحوی کے اعتبار سے متبادر یہ ہے لکارھون عن الخروج یعنی نکلنے سے ناخوش تھے۔ جنگ کا لفظ حضرت علامہ نے خود بڑھایا۔ اس کی ذمہ داری حضرت علامہ پر ہے قرآن اس کی شہادت نہیں دیتا۔

آپ نے غور فرمایا: حضرت علامہ کے استدلال کا مدار اس پر ہے کہ آیت کو ایک خاص معنی پہنائے جائیں جن کا اشارہ الفاظ میں نہیں ہے اور اگر الفاظ کا سادہ مفہوم لیا جائے تو وہ حقیقت سامنے آتی ہے جو عام مؤرخین اور ارباب سیرت نے بیان کی۔ جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

اسی آیت کے سلسلہ میں حضرت علامہ تحریر فرماتے ہیں:

(۴) اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر و انصار ساتھ ہیں۔ ان میں فاتح خیبر اور

حضرت امیر حمزہ سید الشہداء رضی اللہ عنہما بھی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے۔ باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن میں بتصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے بہت سے صحابہ کا دل بیٹھا جاتا ہے اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لیے جاتا ہے۔

وَاِنَّ فَرِیْقًا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکَارِھُوْنَ یُجَادِلُوْنَکَ فِی الْحَقِّ بَعْدَ مَاتَبَیَّنَ کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ

''مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے جھگڑا کرتی تھی گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں۔''

''اگر صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف یہ اضطراب یہ پہلوتہی کس بنا پر تھی۔ اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر) قافلہ قریش پر حملہ کرنے کے لیے تھوڑے آدمی بھیج دیئے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا۔ اس دفعہ اس قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں۔'' (سیرۃ النبی ص ۳۲۱)

حضرت علامہ اپنے اس سلسلہ ارشاد کو اس جملہ پر ختم کرتے ہیں:

''یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیۃ عظیم لے کر مدینہ پر آرہے ہیں'' ص ۳۲۲

ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ میں قریش مکہ کی روانگی کی خبر نہیں آئی تھی۔ جنگ اور جہاد کا نقشہ سامنے نہیں تھا۔ نہ ان جاں نثاران حق کو راہ خدا میں جان دینے اور سر کٹانے سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ معاملہ تجارتی قافلہ کا تھا اور ناگواری اس کی تھی کہ بے سروسامانی میں اتنی عجلت کے ساتھ روانگی کی فرمائش ہے۔

وحی الٰہی کے لہجہ میں سختی اس بنا پر ہے کہ ظہور حق کے بعد یہ بحث اور بقول علامہ یہ جھگڑا کیوں ہے۔ حق کا مطلب اور مفہوم حضرت علامہ نے واضح نہیں فرمایا۔ حضرات مفسرین نے حق کا مفہوم امر رسول فرمایا ہے اور تفسیر یہ کی ہے۔

بعد ماتبین لھم انك لا تفعل الا ما امرك الله بھا (ابن کثیر)

''اس کے بعد کہ کھلے طور پر ان کو واضح ہو چکا ہے کہ آپ (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) وہی فعل کرتے ہیں جس کا حکم اللہ تعالیٰ آپ کو دیتا ہے (لہٰذا یہ روانگی اگرچہ عاجلانہ ہے مگر حکم الٰہی یہی ہوگا لہٰذا اس کی تعمیل کرنی چاہیے)''

حضرت علامہ نے دوسرے رخ پر نظر نہیں ڈالی۔ اگر واقعی مدینہ طیبہ میں قریش کی فوج کا علم ہو گیا تھا اور یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ اس کے مقابلہ کے لیے تشریف لے جارہے ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ محبوب رب العالمین اور آقاء دو جہان کے ساتھ چلنے والے صرف تین سو تیرہ کیوں تھے کیا اس وقت مہاجر

صرف ۷۶ اور بقول علامہ صرف ۶۰ تھے۔ (۴۸۲)

کیا انصار کی تعداد صرف ڈھائی سو تھی۔ کیا انصار یعنی اوس اور خزرج کچھ عرصہ پہلے تک ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما رہے تھے۔ بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ کیا وہ اسلحہ کے بغیر ہوتے تھے یا وہ اسلحہ کہیں ختم ہو گئے تھے کہ اس وقت اسلحہ بھی پورے ساتھ نہیں تھے۔

وہ حضرات انصار جو ایک سال بعد جنگ احد کے موقع پر مچل گئے تھے کہ ہمیں بدر کے موقع پر شرکت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اب جب کہ غنیم آ رہا ہے شہر میں محصور ہو کر لڑنا پست ہمتی ہے۔ ہم باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کریں گے اور اپنی حسرت پوری کریں گے۔ (۴۸۳)

اگر قریش کی آمد کی اطلاع مدینہ میں ہوگئی تھی اور یہ مشورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں فرمایا تھا تو یہ بہادر اس وقت کہاں چلے گئے تھے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیوں نہیں تشریف لے گئے اور جنگ احد کے موقع پر ان کا یہ کہنا کس طرح درست ہوا کہ ہمیں بدر کے موقع پر اطلاع نہیں ہوئی۔ ہم شرکت سے محروم رہ گئے۔ ہم اس وقت اپنی حسرت نکالیں گے۔

یہ حضرت مولانا کا کمال ہے کہ جن کو مؤرخین اور ارباب سیرت پراگندہ اور خستہ حال تسلیم کرتے ہیں قرآن حکیم نے بھی جنہیں اذلہ (۴۸۴) فرمایا ہے۔ (کمزور) حضرت علامہ اپنے استدلال کو مضبوط کرنے کے لیے ان کو تین سو چیدہ منتخب فوج سے تعبیر کر رہے ہیں۔

حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی بارہا قافلہ قریش پر حملہ کرنے کے لیے تھوڑے آدمی بھیجے گئے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہونچا تھا اس دفعہ اس قافلہ کا اتنا ڈر کیوں ہے؟

مگر حضرت علامہ کا یہ ارشاد خود ان کی تحقیق کے خلاف ہے۔ حضرت علامہ نے سلسلہ غزوات کے زیر عنوان ثابت کیا ہے کہ کسی تجارتی قافلہ پر حملہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے کوئی سفر ہی نہیں کیا۔ آپ کے سفر معاہدہ صلح کے مقصد سے ہوتے رہے۔ (۴۸۵)

جہاں تک سرایا کا تعلق ہے جن میں آنحضرت ﷺ تشریف نہیں لے گئے تو خود مولانا کو اعتراف ہے کہ ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا۔ (۴۸۵)

علاوہ ازیں اس حقیقت کو حضرت علامہ کیوں نظر انداز فرماتے ہیں کہ اس شان وشوکت کا کوئی تجارتی قافلہ اس سے پہلے نہیں گذرا جس کے پاس پچاس ہزار اشرفیوں کا سامان ہو۔ جو ایک ہزار اونٹوں پر لدا ہوا ہو۔ ظاہر ہے ایسے قافلہ کے آڑے آنا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔

كَاَنَّهُمْ يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ

علامہ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے:

گویا وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں ص ۳۱۲۔

ان آیات میں صرف یہ الفاظ ہیں جن سے جنگ کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے اور اس نظریہ کی تصدیق کی جا سکتی ہے کہ یہ سفر حملہ قریش کے دفاع کے لیے تھا اور غالباً انہیں الفاظ کی بنا پر مولانا نے ''لکارھون'' کا مفہوم یہ قرار دیا تھا کہ ''لڑائی سے جی چراتے ہیں''

مگر ہمارا خیال اس کے برعکس یہ ہے کہ مدینہ سے روانگی کے وقت جنگ کا نقشہ سامنے نہیں تھا صرف تجارتی قافلہ پر حملہ پیش نظر تھا۔ فوج قریش کی مدافعت ذہنوں میں نہیں تھی اور ان الفاظ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ روانگی کے وقت باضابطہ جنگ کا تصور نہیں تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ کلام ربانی کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ طفل تسلی سے کام لے اور غلط اطمینان دلائے۔

جب میدان جنگ سامنے ہوتا ہے تو ظاہر ہے سپاہیوں کو موت کے منہ میں دھکیلا جاتا ہے اس وقت اگر لوگوں کے ذہنوں میں موت کا تصور ہو تو وہ نا قابل ملامت ہے نہ اس پر تنبیہ کرنا درست ہے۔ ملامت یا تنبیہ اسی وقت درست ہے جب موت کا خطرہ نہ ہو یا ہو تو معمولی ہو اور لوگ دہشت زدہ ہوں۔

پس یہ الفاظ اس کا قطعی ثبوت نہیں ہیں کہ مدینہ منورہ سے روانگی فوج قریش کے دفاع کے لیے تھی۔ بلکہ قطعی ثبوت اس کا ہے کہ فوج قریش کا خوف نہیں تھا۔ صرف کاروان تجارت کی شان وشوکت کی خبروں سے متاثر تھے اور بے سروسامان اچانک روانگی پسند نہیں کر رہے تھے۔

کلام الٰہی سے زیادہ حقیقت نواز کون سا کلام ہو سکتا ہے۔ کلام الٰہی میں وہ آیتیں موجود ہیں جن کا تعلق جنگ یا خطرات جنگ سے ہے۔ ان آیتوں میں خطرہ موت پر ملامت نہیں کی گئی۔ نہ غلط تسلی دلائی گئی ہے۔ بلکہ کہیں دنیا کی بے ثباتی بیان کی گئی ہے اور کہیں قتل فی سبیل اللہ کے فضائل بیان کر کے راہ خدا میں مرنے اور قربان ہونے کا شوق دلایا گیا ہے۔

یہ اطمینان نہیں دلایا گیا کہ موت نہیں آئے گی۔ تمہارا دہشت زدہ ہونا اور سہمنا بے موقع ہے بلکہ زور اس پر دیا گیا ہے کہ موت فی سبیل اللہ موت نہیں ہے۔ حیات ہے۔

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ع ۱۸

''جو لوگ راہ خدا میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو یہ نہ کہو کہ وہ مردہ ہیں نہیں وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔''

سورہ نساء رکوع ۱۱ کی پہلی آیت ملاحظہ فرمایئے اس میں دنیا کی بے ثباتی اور موت کو یقینی بات ظاہر کر کے جہاد فی سبیل اللہ پر آمادہ کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ الاية

ترجمہ: ''کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا۔ جن سے کہا گیا تھا کہ ہاتھ روکو اور نماز قائم کرو اور

زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر جب (ایسا ہوا) کہ ان پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں کا ایک گروہ انسانوں سے ایسا ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈرنا (چاہیے) بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہتے ہیں خدایا تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا۔ کیوں نہ ہمیں تھوڑے دنوں کی مہلت دی۔ آپ فرما دیجئے دنیا کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے ان کے لیے جو (اپنے دل میں خوف خدا رکھتے ہیں) صاحب تقویٰ ہیں۔ وہاں رائی برابر بھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ تم کہیں بھی ہو موت تمہارا ٹھکانا پاکر رہے گی۔ خواہ تم کتنے ہی مضبوط اور اونچے قلعوں میں محفوظ ہو کر بیٹھو۔''

سورہ توبہ میں جہاد کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے تو ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ الایۃ ۶

''مسلمانو! کیا ہو گیا ہے۔ جب تم سے کہا جاتا ہے راہ خدا میں کوچ کرو تو ڈھے جاتے ہو (بوجھل بن جاتے ہو) زمین پر۔ کیا آخرت چھوڑ کر دنیاوی زندگی پر ریجھ گئے ہو (یاد رکھو) دنیاوی زندگی کا سرمایہ آخرت میں بہت ہی قلیل و حقیر ہے۔''

قرآن حکیم میں اس مضمون کی اور بھی آیتیں ہیں۔ آپ غور فرمایئے! جہاں جہاد اور جنگ کا تذکرہ ہے وہاں طفل تسلی سے کام نہیں لیا گیا کہ چلو موت نہیں آئے گی ایسے کیوں سہمے جا رہے ہو۔ بلکہ وہاں خطرہ موت کو ایک حقیقت قرار دے کر موت فی سبیل کو سعادت عظمیٰ اور حیات ابدی قرار دے دیا گیا ہے یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کی آمد کو قطعی اور یقینی امر قرار دے کر تمنا حیات سے بے نیاز کیا گیا ہے۔

کتاب اللہ کا یہ اسلوب پیش نظر ہو تو واضح ہو جاتا ہے کہ مدینہ سے روانگی کے وقت باضابطہ جنگ کا تصور نہیں تھا۔ اسی لیے تنبیہ کی جا رہی ہے کہ صرف ایک تجارتی قافلہ کی یہ دہشت کیوں ہے کہ معلوم ہوتا ہے موت کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہو۔ اگر اس وقت جنگ کا تصور ہوتا تو اس دہشت پر ملامت نہ کی جاتی بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت بیان کی جاتی یا دنیا کی بے ثباتی کا یقین دلایا جاتا۔ (واللہ اعلم)

اس میں کیا شک ہے کہ حضرت علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ انشا پردازی کے امام ہیں۔ نظم اور نثر دونوں ہی میں آپ کو اعلیٰ کمال حاصل ہے۔ مگر ظریفانہ نکتہ یہ ہے کہ ایک مضمون کو آپ نے صرف انشا پردازی سے دلیل قرار دیا ہے۔ ادبیانہ نکتہ سنجی اگر نظر انداز کر دی جائے تو وہ دلیل دلیل ہی نہیں رہتی ارشاد ہے۔

(۳) سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا نے بیان کیا ہے۔ ایک قافلہ تجارت۔ دوسرا صاحب شوکت یعنی کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے آ رہے تھے۔ آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان تجارت پر حملہ کیا جائے۔ خدا نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا۔

تُوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ (سورہ انفال رکوع۱)

''تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آ جائے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔''

حضرت علامہ فرماتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ ہیں۔ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا۔ میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔ سیرۃ النبی ص ۳۲۱

اس پوری دلیل میں انشا پردازی کے علاوہ اور کیا ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہ اجتماع مدینہ منورہ میں ہوا اور مدینہ میں فوج قریش کی خبر آ گئی تھی۔

آیت میں ایک رجحان کی نشان دہی ضرور ہے مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کب تھا اور کب تک رہا۔ آیت میں کوئی ایسا لفظ بھی نہیں ہے جس سے ناراضی ظاہر ہو۔ آیت میں یہ تو ظاہر کیا گیا ہے کہ جو کچھ واقع ہوا اس میں ایک خاص مصلحت تھی جو سامنے آ گئی لیکن اس آیت میں یا اس کے سیاق وسباق میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ یہ رجحان مستحق ناراضی تھا اور اللہ اس رجحان سے ناراض ہے اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس سے توبہ کریں یا یہ کہ رجحان اگرچہ غلط تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف فرما دیا۔

تعجب ہے مولانا نے اس موقع پر پوری آیت نہیں پیش کی۔ آیت کا پہلا حصہ مولانا نے حذف کر دیا۔ آیت کا پہلا جملہ یہ ہے۔ وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ مولانا نے چند صفحہ پہلے اس پوری آیت کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ ہم مولانا کا ترجمہ لفظ بہ لفظ پیش کرتے ہیں اور آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ کیا کسی بھی حصہ سے ناراضی ظاہر ہوتی ہے مولانا کا ترجمہ یہ ہے۔

اور جب خدا تم سے قریش کے قافلہ اور قریش کی فوج میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے لیے ہے۔ تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو مل جائے (یعنی قافلہ) اور خدا یہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنے حکم سے ثابت کر دے اور باطل کو مٹا دے۔ سیرۃ النبی ص ۳۱۲

غور فرمایئے کیا کسی لفظ میں ناراضی کا کوئی شائبہ بھی ہے۔

کلام الٰہی فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ کم محنت اور زیادہ منفعت ایک فطری جذبہ ہے۔ یہ باعث ناراضی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کچھ منزلیں اس تصور میں طے کی ہوں کہ تجارتی قافلہ ہاتھ لگے تو نہ وہ فطرت کے خلاف ہے نہ عصمت کے۔ بلکہ جب وعدہ الٰہی میں یہ گنجائش موجود ہو تو اھون البلیتین کا اختیار کرنا ہی تقاضاء فطرت اور تعلیم نبوت ہے۔ یہ باعث ناراضی قطعاً نہیں ہوسکتا۔ (۴۸۷)

حضرت علامہ اسی آیت کے تحت ایک دوسری دلیل پیش کرتے ہیں۔ارشاد ہے:

آیت مذکورہ میں یہ تصریح موجود ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے۔ایک کاروان تجارت۔ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی۔ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیات قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت صحیح سالم بچ کر نکل گیا تھا۔اس وقت یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے۔اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہوسکتا ہو اور یہ صرف وہ وقت ہوسکتا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آ گئی تھیں کہ ادھر ابوسفیان کاروان تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ معظمہ سے نکل چکے ہیں۔(سیرت النبی ص ۳۲۰ ج اطبع سوم)

حضرت علامہ کا استدلال سنجیدہ ہے۔مگر ہمیں شکایت یہ ہے کہ مولانا نے تصریح کا دعویٰ کر دیا۔حالانکہ تصریح کہیں بھی نہیں۔دوسری شکایت یہ ہے کہ مولانا نے اسلوب کلام اللہ کا لحاظ نہیں فرمایا۔اس آیت کا ترجمہ ابھی چند سطر پہلے گذر چکا ہے۔اس پر نظر ڈالئے۔وعدہ کی صراحت ضرور ہے۔مگر نہ اس کا وقت بیان کیا گیا ہے نہ موقع۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت صحیح سالم بچ کر نکل گیا تھا۔اس وقت یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے۔

لیکن گذارش یہ ہے کہ اگر مدینہ ہی میں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ قریش کی فوج آرہی ہے اور یہ طے ہوگیا تھا کہ قریش کے حملہ کو روکنے کے لیے سفر کرنا ہے تو وعدہ کب ہوا تھا اور حضرات صحابہ سے کاروان تجارت یعنی گروہ بے خرخشہ کی طلب اور چاہ کب صادر ہوئی۔جس کا تذکرہ آیت میں صراحت کے ساتھ ہے۔حضرت علامہ کی یہ دلیل باوزن ضرور ہے مگر قطعی نہیں۔اس کے مقابلہ پر حضرات مؤرخین، ارباب سیرت اور حضرات مفسرین جو تفصیل بیان فرماتے وہ باوزن بھی ہے اور اسلوب کلام اللہ کے مطابق بھی۔

حضرت علامہ خود بھی پوری طرح سمجھتے ہیں کہ قرآن حکیم کوئی روزنامچہ نہیں ہے۔نہ واقعات نگاری اس کا مطمح نظر ہوتا ہے۔وہ کتاب الہدیٰ ہے۔واقعات اپنی ترتیب کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ہو چکنے کے بعد کبھی کچھ وقفہ کے بعد اور کبھی فوراً ہی ان پر کلام ربانی تبصرہ کرتا ہے۔تبصرہ میں واقعات کی ترتیب ملحوظ نہیں ہوتی۔منشاء تبصرہ اصلاح ہوتا ہے۔بیشک تبصرہ میں کبھی ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسانی کمزوری کی نشان دہی کی جاتی ہے اور منشاء الٰہی کے فوائد اور مصالح بیان کیے جاتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ ان آیتوں کا نزول بر وقت نہیں ہوا۔ بلکہ واقعات ہو چکنے کے بعد ان کا نزول ہوا۔ ان میں ترتیب ملحوظ نہیں ہے۔ چنانچہ تقسیم غنیمت کا معاملہ جو جنگ بدر ختم ہونے کے بعد پیش آیا۔ اس پر سب سے پہلے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ایک صورت وہ ہے جو حضرت علامہ پیش فرما رہے ہیں جس میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وعدہ کب ہوا تھا اور گروہ بلاخرخشہ کی طلب کب صادر ہوئی۔

دوسری تفصیل وہ ہے جو حضرات مفسرین مؤرخین اور ارباب سیرت نے بیان فرمائی ہے کہ وعدہ کسی الہامی صورت سے مدینہ طیبہ میں ہوا۔ کم محنت اور زیادہ منفعت فطرت انسانی ہے۔ اھون البلیتین کو اختیار کرنا عنداللہ محمود ہے۔ چنانچہ کاروان تجارت کی تلاش جاری رہی اور جب بدر پر پہنچ کر اس سے مایوسی ہوئی تو جنگ کی تیاری کی گئی۔ اس پوری سرگذشت پر آیات کلام اللہ میں تبصرہ فرمایا گیا ہے اور آپ غور فرمائیں حکمۃ بالغہ کا مظاہرہ اسی صورت میں ہوتا ہے کہ جس چیز کی دوڑ دھوپ تھی وہ ہاتھ نہیں لگی اور ہاتھ وہ لگی جس سے بچنا چاہتے تھے۔ اس تبصرہ میں اسی حکمۃ بالغہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

کار ساز ما بفکر کار ما
فکر ما درکار ما آزار ما

حضرت علامہ نے ایک اور آیت سے بھی استدلال کیا ہے۔ نیز حضرات مؤرخین اور ارباب سیرت کی بھی کچھ روایتیں پیش کی ہیں۔ مگر ہمارا مقصود مناظرہ نہیں ہے۔ حضرت علامہ کی شان تو بہت بلند ہے۔ ہم کسی معمولی شخص سے بھی مناظرہ کرنا نہیں چاہتے۔ اس کے علاوہ چند دلیلوں کے جوابات گذشتہ تحریر میں موقع بموقع ضمنی طور پر آ گئے ہیں۔

کچھ دلیلیں (۴۸۸) ایسی ہیں کہ ہر ایک صاحب فہم ان کا جواب خود سمجھ سکتا ہے۔ بلکہ بعض دلیلیں (۴۸۹) تو ایسی کمزور ہیں کہ سیرۃ النبی میں درج نہ ہوتیں تو ہمیں یہ باور کرنا بھی مشکل ہوتا کہ حضرت علامہ جیسا مبصر یہ دلیل پیش کر سکتا ہے۔ بہر حال حضرت علامہ نے بنیادی طور پر قرآن پاک کی آیات کو پیش فرمایا تھا اور یہ ارشاد فرمایا تھا کہ: ''قرآن جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے'' ہم نے یہ چند صفحات اس لیے سیاہ کیے کہ ہمیں قرآن کے سامنے گردن جھکا دینی چاہیے یا حضرت علامہ کے اختراعات کے سامنے۔ ان صفحات کے مطالعہ کے بعد آپ آسانی سے فیصلہ کر سکیں گے۔

اسماءاصحاب البدر رضوان اللہ علیہم اجمعین

شہداءاور مجاہدین غزوۂ بدر کے اسماء گرامی:

علماء حدیث کا عقیدہ ہے کہ حضرات اصحاب بدر کے اسماء گرامی باعث برکت ہیں۔ جب مجاہدین غزوہ بدر کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اور جو دعا مانگی جاتی ہے وہ قبول ہوتی ہے۔ حضرت امام دوانی فرماتے ہیں کہ اس کا تجربہ بارہا ہو چکا ہے۔ (۴۹۰)

حضرات شہداء رضوان اللہ علیہم اجمعین:

(۱) شہداء بدر میں سب سے پہلے اس کم سن مجاہد کا نام زبان قلم پر آتا ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیر ابی عتبہ سے واپس بھیج رہے تھے لیکن وہ مچل گئے تھے۔ یہ حضرت عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہیں فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم بچے ہو، مکان واپس چلے جاؤ۔ تو یہ رونے لگے تھے۔ بالآخر ان کی گریہ زاری کام آئی۔ ان کو ساتھ چلنے کی اجازت ملی اور انہوں نے اس غزوہ مبارک میں جام شہادت نوش کر کے ابدی کامیابی حاصل کی۔ (۴۹۱)

(۲) انہیں کے ہم نام عمیر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ جب انہوں نے غزوہ کے وقت لسان رسالت سے (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) یہ سنا:

''جنت میں داخل ہونے کے لیے اٹھو جس کا عرض زمین اور آسمان کے برابر ہے'' تو ان سے اتنا صبر بھی نہ ہو سکا کہ جو کھجوریں ہاتھ میں تھیں ان کو کھالیں۔ وہ فوراً دشمن کے ہجوم میں گھسے اور فرمان رسالت کی تصدیق کے لیے جان قربان کر دی۔ (۴۹۲)

(۳) حضرت مہجع رضی اللہ عنہ کا نام نامی۔ یہاں تیسرے نمبر پر آ رہا ہے۔ مگر شہداء معرکہ بدر میں سب سے پہلے شہید یہی ہیں۔ یہ تیر کے زخم سے شہید ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ (۴۹۳)

(۴) حارث بن سراقہ رضی اللہ عنہ۔ حوض پر پانی پی رہے تھے تیر آ کر لگا شہید ہو گئے۔ ان کی والدہ کو تشویش تھی کہ جب معرکہ میں نہیں مارے گئے تو درجہ شہادت میسر آیا یا نہیں۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے بتایئے حارثہ کو جنت نصیب ہوئی ہے تو میرے لیے صبر کا موقع ہے اور اگر خدانخواستہ ایسا نہیں ہے تو پھر آپ دیکھ لیں گے میں کیا کرتی ہوں (یعنی دل کھول کر ماتم کروں گی جو اس وقت تک ممنوع نہیں ہوا تھا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشفقانہ بے تکلفی سے ارشاد فرمایا: کیا بے وقوف ہوگئی ہو کیا جنت صرف ایک ہے جنتیں بہت سی ہیں۔ وہ جنت الفردوس میں ہے۔

(۵) شہداء بدر میں خاندان اور عمر کے لحاظ سے سب سے ممتاز شخصیت عبیدہ بن حارث بن مطلب رضی اللہ عنہ کی تھی۔ عمر میں سب سے بڑے تھے۔ سب سے پہلے مقابلہ اور مبارزہ میں عتبہ کے حملہ سے مجروح ہوئے۔ پھر اس حالت میں صہباء شہادت نوش فرمایا کہ ان کا سر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو مبارک پر تھا۔ [۴۹۴]

(۶) و (۷) حضرت عفراء رضی اللہ عنہا کے دو صاحبزادے معوذ اور عوف جو ابوجہل کی تلوار سے شہید ہوئے (رضی اللہ عنہم) (۸) حضرت عاقل بن ابی البکیر (۹) حضرت صفوان بن بیضاء (۱۰) حضرت سعد بن خثیمہ (۱۱) حضرت مبشر بن عبدالمنذر (۱۲) حضرت رافع بن معلے (۱۳) حضرت یزید بن الحارث بن فسحم (۱۴) حضرت ذوالشمالین بن عبد عمر الخزاعی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ [۴۹۵]

مندرجہ ذیل حضرات مہاجر تھے۔ باقی حضرات انصار کرام رضی اللہ عنہم اجمعین۔

(۱) عبیدہ بن حارث (۲) عمیر بن ابی وقاص (۳) ذوالشمالین بن عبد عمرو خزاعی (۴) صفوان بن بیضاء (۵) عاقل بن بکیر لیثی (۶) مہجع۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مجاہدین بدر:

سرفہرست یہ اسم گرامی درخشاں ہے:

سید الانبیاء و فخر المرسلین محمد بن عبداللہ الہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم [۴۹۶] اس کے بعد حروف ہجا کی ترتیب کے بموجب [۴۹۷] اسماء گرامی [۴۹۸] یہ ہیں۔

(الف)

(۲) سید القراء حضرت ابی بن کعب النجاری رضی اللہ عنہ
(۳) حضرت ارقم بن ابی الارقم مہاجر رضی اللہ عنہ [۴۹۹]
(۴) حضرت اسعد بن یزید بن الفاکہ رضی اللہ عنہ
(۴) حضرت اسود بن زید بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ
(۵) حضرت اسیر بن عمرو الانصاری رضی اللہ عنہ
(۶) حضرت انس بن قتادہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ
(۷) حضرت انس بن معاذ بن انس بن قیس رضی اللہ عنہ
(۸) حضرت انسہ الحبشی مولیٰ رسول اللہ (مہاجر) رضی اللہ عنہ
(۹) حضرت اوس بن ثابت المنذر النجاری رضی اللہ عنہ
(۱۰) حضرت اوس بن حضرمی بن عبداللہ رضی اللہ عنہ
(۱۱) حضرت اوس بن الصامت الخزرجی رضی اللہ عنہ

(ب)

حضرت بحیر بن ابی بحیر رضی اللہ عنہ
حضرت بحاث بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ
حضرت بسبس بن عمرو رضی اللہ عنہ
کاروانِ تجارت کی خبر لانے کے لیے بھیجے گئے تھے
حضرت بشیر بن البراء رضی اللہ عنہ
(سنہ ۷ھ میں خیبر میں مسموم گوشت کی وجہ سے وفات پائی)
حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ
حضرت بشیر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ
مقام روحا سے مدینہ طیبہ کا انتظام سنبھالنے کے لیے واپس کر دیے گئے تھے مگر شریک بدر کی حیثیت دی گئی اور غنیمت میں ان کا حصہ لگایا گیا۔

⑫ حضرت ایاس بن البکیر بن عبد یالیل رضی اللہ عنہ

(ت)

حضرت تمیم بن یعار بن قیس رضی اللہ عنہ
حضرت تمیم مولیٰ خراش بن الصمہ رضی اللہ عنہ
حضرت تمیم مولیٰ بنی غنم بن السلم رضی اللہ عنہ

(ج)

حضرت جابر بن خالد رضی اللہ عنہ
حضرت جابر بن عبداللہ بن رماب رضی اللہ عنہ
حضرت جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حرام السلمی رضی اللہ عنہ
(ذکرہ البخاری فی مسندہ عن سعید بن منصور)
حضرت جبار بن صخر السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت جبر بن عتیک الانصاری رضی اللہ عنہ
حضرت جبیر بن ایاس الخزرجی رضی اللہ عنہ

(ح)

حضرت حارث بن انس بن رافع رضی اللہ عنہ
حضرت حارث بن اوس بن معاذ رضی اللہ عنہ
حضرت حارث بن حاطب بن عمرو رضی اللہ عنہ
کسی خدمت کے لیے مامور فرمائے گئے جس کی وجہ سے جنگ میں شریک نہیں ہوئے مگر شریک کی حیثیت دی گئی چنانچہ مال غنیمت میں حصہ دیا گیا
حضرت حارث بن خزیمہ بن عدی رضی اللہ عنہ
حضرت حارث بن الصمۃ (۵۰۰) الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت حارث بن عرفجۃ الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت حارث بن قیس بن خلدہ رضی اللہ عنہ
حضرت حارث بن النعمان بن اُمیہ انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت حارثہ بن سراقہ النجاری رضی اللہ عنہ
(شہید ہوئے)

(ث)

حضرت ثابت بن اقرم بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ
حضرت ثابت بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ
حضرت ثابت بن خالد بن النعمان رضی اللہ عنہ
حضرت ثابت بن خنساء بن عمرو رضی اللہ عنہ
حضرت ثابت بن عمرو بن زید رضی اللہ عنہ
حضرت ثابت بن ہزال الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت ثعلبہ بن حاطب رضی اللہ عنہ
حضرت ثعلبہ بن عمرو بن عبید رضی اللہ عنہ
حضرت ثعلبہ بن عمرو بن محسن الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت ثعلبہ بن عمۃ بن عدی رضی اللہ عنہ
حضرت ثقف بن عمرو رضی اللہ عنہ

(خ)

حضرت خالد بن البکیر رضی اللہ عنہ
حضرت خالد بن زید ابوایوب رضی اللہ عنہ
حضرت خالد بن قیس بن سالک رضی اللہ عنہ
حضرت خارجہ بن الحمیر رضی اللہ عنہ
حضرت خارجہ بن زید الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)
حضرت خباب مولیٰ عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)
حضرت خراش بن الصمۃ السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت خبیب بن اساف بن عتبہ الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت خویم بن فاتک رضی اللہ عنہ
حضرت خلیفہ بن عدی الخزرجی رضی اللہ عنہ

حضرت حارثہ بن النعمان بن رافع انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت حاطب بن ابی بلتعۃ اللخمی رضی اللہ عنہ
حضرت حاطب بن عمرو بن عبد رضی اللہ عنہ
حضرت خباب بن المنذر الخزرجی رضی اللہ عنہ
خزرج کے علمبردار تھے اور محل نزول کے متعلق بہترین
مشورہ دیا تھا جس کی تصدیق غیبی اشارات نے بھی کی
حضرت حبیب بن اسود مولیٰ بنی حرام رضی اللہ عنہ
حضرت حبیب بن اسلم مولیٰ آل جشم رضی اللہ عنہ
(فی رای ابن ابی حاتم)
حضرت حریث بن زید بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ
حضرت حصین بن الحارث بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ
سیّد الشہداء حضرت حمزہ بن عبد المطلب بن ہاشم رضی اللہ عنہ
عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(ر)

حضرت رافع بن الحارث الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت رافع بن عنجدہ رضی اللہ عنہ
حضرت رافع بن المعلی بن لوذان خزرجی شہید رضی اللہ عنہ
حضرت ربعی بن رافع بن حارث رضی اللہ عنہ
مہاجرین اوّلین میں سے تھے
حضرت ربیع بن ایاس الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت ربیعہ بن اکثم رضی اللہ عنہ
حضرت رخیلہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ
حضرت رفاعہ بن رافع الزرقی رضی اللہ عنہ
حضرت رفاعہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ
حضرت رفاعہ بن عمرو بن زید الخزرجی رضی اللہ عنہ

(س)

حضرت سالم بن عمیر الاوسی رضی اللہ عنہ

حضرت خلید بن قیس رضی اللہ عنہ
حضرت خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ
شہید۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے داماد تھے
(یعنی اُم المومنین حضرت حفصہؓ کے سابق شوہر)
حضرت خراش بن جبیر الانصاری رضی اللہ عنہ
حضرت خولیٰ بن ابی خولیٰ العجلی رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین میں سے تھے)
حضرت خلاد بن رافع رضی اللہ عنہ
حضرت خلاد بن سوید الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت خلاد بن عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ

(ذ)

حضرت ذکوان عبد قیس الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت ذوالشمالین بن عبد بن عمرو رضی اللہ عنہ
شہید۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالشمالین کا
خطاب پسند نہیں فرمایا آپ ذوالیدین فرمایا کرتے تھے

(ز)

سیّدنا حضرت زبیر بن العوام بن خویلد رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں)
حضرت زیاد بن عمرو رضی اللہ عنہ
(فیہ اختلاف الرواۃ)
حضرت زیاد بن لبید الزرقی رضی اللہ عنہ
حضرت زیاد بن المزین بن القیس الخزرجی
حضرت زیاد بن اسلم رضی اللہ عنہ
حضرت زید بن حارثہ بن شرجیل رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)
حضرت زید بن الخطاب بن نفیل رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)

حضرت سالم بن غنم بن عوف الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت سالم بن معقل مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ
حضرت سائب بن عثمان بن مظعون الجمحی رضی اللہ عنہ
حضرت سبیع بن قیس بن عائذ الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت سبرۃ بن فاتک رضی اللہ عنہ
حضرت سراقہ بن عمرو النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت سراقہ بن کعب النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت سعد بن خولیہ مولی بن عامر بن لوی رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)
حضرت سعد بن حیثمہ الاوسی (شہیدؓ)
حضرت سعد بن الربیع الخزرجی (شہیدؓ)
حضرت سعد بن زید بن مالک الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت سعد بن سہل بن عبد الاشہل النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت سعد بن عبید الانصاری رضی اللہ عنہ
حضرت سعد بن عثمان بن خلدۃ الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت سعد بن معاذ الاوسی رضی اللہ عنہ
(قبیلہ اوس کے علمبردار)
حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں)
حضرت سعد بن مالک ابوسہلؓ (۵۰۱)
حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل العدویؓ
(مہاجر) حضرت فاروق اعظم کے چچازاد بھائیؓ
حضرت سفیان بن بشر الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت سلمۃ بن اسلم الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت سلمۃ بن ثابت بن وقش رضی اللہ عنہ
حضرت سلمہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ
حضرت سلیم بن حارث النجاری رضی اللہ عنہ

برادرِ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ
حضرت زید بن سہل بن الاسود البخاری (ابوطلحہؓ)

(ش)

حضرت شجاع بن وہب بن ربیعہ الاسدی رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)
حضرت شماس بن عثمان المخزومی (مہاجر) رضی اللہ عنہ
حضرت شقران مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مہاجر)
یہ اسیرانِ بدر کے نگراں تھے ان کو مال غنیمت میں باضابطہ حصہ نہیں دیا گیا تھا مگر فدیہ لینے والے حضرات میں سے ہر ایک نے ان کو جو انعام دیا وہ اتنا ہو گیا کہ غنیمت کا ایک حصہ اس سے کم تھا

(ص)

حضرت صہیب بن سنان الرومی رضی اللہ عنہ
(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)
حضرت صفوان بن وہب بن ربیعہ الفہریؓ (شہید)
حضرت صخر بن اُمیہ بن خنساء السلمی رضی اللہ عنہ

(ض)

حضرت ضحاک بن حارثہ بن زید السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت ضحاک بن عبد عمرو النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت ضمرۃ بن عمرو الجہنی (فیہ اختلاف) رضی اللہ عنہ

(ط)

حضرت طلحہ بن عبید اللہ التیمی رضی اللہ عنہ
مہاجرین اوّلین اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ غزوہ بدر کے زمانہ میں یہ شام گئے ہوئے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شریک کی حیثیت دی اور غنیمت میں ان کا حصہ لگایا۔

حضرت سلیم عمرو السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت سلیم بن قیس بن فہد الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت سلیم بن ملحان النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت سماک بن اوس بن خرشہ (ابودجانہؓ)
حضرت سماک بن سعد الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت سہل بن حنیف الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت سہل بن عتیک النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت سہل بن قیس السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت سہل بن رافع النجاری رضی اللہ عنہ
(مسجد شریف کے لیے زمین انہیں سے لی گئی تھی)
حضرت سہل بن وہب الفہری رضی اللہ عنہ
حضرت سنان بن ابی سنان بن محصن رضی اللہ عنہ
حضرت سنان بن صیفی السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت سواد بن زریق بن زید انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت سواد بن غزیہ بن اہیب البلوی رضی اللہ عنہ
حضرت سویبط بن سعد بن حرملہ العبدری رضی اللہ عنہ
حضرت سوید بن مخشی ابومخشی الطائی رضی اللہ عنہ

حضرت طفیل بن الحارث (مہاجر) رضی اللہ عنہ
حضرت طفیل بن مالک بن خنساء السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت طفیل بن النعمان بن خنساء السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت طلیب بن عمیر رضی اللہ عنہ
(صرف واقدی نے اصحاب بدر میں شمار کیا ہے)

(ظ)

حضرت ظہیر بن رافع الاوسی رضی اللہ عنہ
(صرف بخاری نے اپنی تاریخ میں ان کو بدریوں میں شمار کیا ہے)

(ع)

حضرت عاصم بن ثابت بن ابی الاقلح انصاریؓ
حضرت عاصم بن عدی بن الجد بن عجلانؓ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی مقام روحاء سے مدینہ کے انتظامات کے لیے بھیج دیا تھا۔ مگر شریک بدر کی حیثیت دی اور مالِ غنیمت میں ان کا حصہ لگایا۔
حضرت عاصم بن قیس بن ثابت الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت عاقل بن البکیر رضی اللہ عنہ
حضرت عامر بن اُمیہ بن زید بن حسحاس النجاریؓ
حضرت عامر بن الحارث الفہری رضی اللہ عنہ
حضرت عامر بن ربیعۃ بن مالک العنزی (مہاجر)
حضرت عامر بن مسلمۃ بن عامر رضی اللہ عنہ
حضرت عامر بن عبداللہ (ابوعبیدۃ بن الجراح) رضی اللہ عنہ (عشرہ مبشرہ میں سے ہیں)
حضرت عامر بن فہیرہ مولیٰ ابی بکر (مہاجر) رضی اللہ عنہ
حضرت عامر بن مخلد النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت عایذ بن ماعض بن قیس الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت عباد بن بشر بن وقش الاوسی رضی اللہ عنہ

حضرت عمرو بن قیس بن مالک رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن عامر بن الحارث الفہری رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن معبد بن الازعر الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن معاذ الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت عمیر بن الحارث (فیہ اختلاف) رضی اللہ عنہ
حضرت عمیر بن حرام بن الجموح السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت عمیر بن الحمام بن الجموح السلمیؓ (شہید)
حضرت عمیر بن عامر بن مالک رضی اللہ عنہ
حضرت عمیر بن عوف مولیٰ سہل بن عمرو رضی اللہ عنہ

حضرت عمیر بن مالک بن اہیب رضی اللہ عنہ
مہاجر۔ شہید (حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھائی
مالک کی کنیت ابووقاص تھی)

حضرت عنترہ مولیٰ بن سلیم (رضی اللہ عنہ)
حضرت عوف بن الحارث (شہید) رضی اللہ عنہ
جو ابوجہل کے حملے سے شہید ہوئے
حضرت عویم بن ساعدۃ الانصاری رضی اللہ عنہ
حضرت عیاض بن غنم الفہری رضی اللہ عنہ

(غ)

حضرت غنم بن اوس الخزرجی (مختلف فیہ)

(ف)

حضرت فاکہ بن بشر بن الفاکہ الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت فروۃ بن عمرو بن دوفہ الخزرجی رضی اللہ عنہ

(ق)

حضرت قتادہ بن النعمان رضی اللہ عنہ
حضرت قدامۃ بن مظعون الجمی (مہاجر) رضی اللہ عنہ
حضرت قطبۃ بن عامر بن حدیدۃ السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت قیس بن السکن النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت قیس بن ابی صعصعۃ رضی اللہ عنہ
حضرت قیس بن محصن بن خالد الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت قیس بن مخلد بن ثعلبہ النجاری رضی اللہ عنہ

(ک)

حضرت کعب بن حمان رضی اللہ عنہ

حضرت عباد بن قیس بن عامر الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت عباد بن قیس بن عبشہ الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت عباد بن الخشخاش القضاعی
حضرت عبادۃ بن صامت الخزرجی
حضرت عبادۃ بن قیس بن کعب بن قیس رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن اُمیہ بن عرفطۃ رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن ثعلبہ خزمہ رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن جحش (مہاجر) رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن جبیر بن النعمان الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن الجد بن قیس السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن حق بن اوس الساعدی رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن الحمیر رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن الربیع رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن رواحہ الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ
جن کو خواب میں اذان وتکبیر کی تلقین ہوئی تھی۔
حضرت عبداللہ بن سراقہ العدویؓ (مختلف فیہ)
حضرت عبداللہ بن سلمۃ رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن سہل بن رافع رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ
مشرکین کے لشکر میں اپنے والد کے ساتھ آئے تھے مگر
جنگ کے وقت مسلمانوں میں آکر شریک ہوگئے
حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ
حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ

حضرت کعب بن زید بن قیس النجاری رضی اللہ عنہ

حضرت کعب بن عمرو ابوالیسر السلمی رضی اللہ عنہ

حضرت کلفہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ

حضرت کناز بن حصین بن یربوع

(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)

(م)

حضرت مالک بن الدخشم رضی اللہ عنہ

حضرت مالک بن ابی خولی الجعفی رضی اللہ عنہ

حضرت مالک بن ربیعۃ ابواسید الساعدی (مہاجر)

حضرت مالک بن عمر (مہاجر) رضی اللہ عنہ

حضرت مالک بن قدامۃ الاوسی رضی اللہ عنہ

حضرت مالک بن مسعود الخزرجی رضی اللہ عنہ

حضرت مالک بن ثابت بن نمیلہ المزنی رضی اللہ عنہ

حضرت مبشر بن عبدالمنذر (شہید) رضی اللہ عنہ

حضرت المجذر بن زیاد البلوی رضی اللہ عنہ

حضرت محرز بن عامر النجاری رضی اللہ عنہ

حضرت محرز بن نضلہ الاسدی (مہاجر) رضی اللہ عنہ

حضرت محمد بن مسلمۃ رضی اللہ عنہ

حضرت مدلج بن عمرو رضی اللہ عنہ

حضرت مرثد بن ابی مرثد الغنوی رضی اللہ عنہ

حضرت مسطح بن اثاثہ بن عباد رضی اللہ عنہ

(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)

حضرت مسعود بن اوس الانصاری رضی اللہ عنہ

حضرت مسعود خلدۃ الخزرجی رضی اللہ عنہ

حضرت مسعود بن ربیعۃ القاری (مہاجر) رضی اللہ عنہ

حضرت مسعود بن سعد بن عامر رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول الخزرجی رضی اللہ عنہ (راس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول کے لڑکے)

حضرت عبداللہ بن الاسد رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عبد مناف رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عیس رضی اللہ عنہ

حضرت امیر المومنین سیّدنا حضرت عبداللہ بن عثمان بن عامر ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عرفطۃ بن عدی الخزرجی رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عمر بن حرام رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عمیر بن عدی الخزرجی رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن قیس بن خالد النجاری رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن قیس بن صخر بن حرام السلمیؓ

حضرت عبداللہ بن کعب بن عمر رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ مخرمتہ بن عبدالعزیٰ رضی اللہ عنہ

مہاجرین اوّلین میں سے ہیں

حضرت عبداللہ بن مسعود الھذلی رضی اللہ عنہ

مہاجرین اوّلین میں سے ہیں

حضرت عبداللہ بن مظعون الجمحی رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن النعمان رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن انیسہ رضی اللہ عنہ

حضرت عبدالرحمٰن بن جبر رضی اللہ عنہ

حضرت عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بن عبد عوف رضی اللہ عنہ

عشرہ مبشرہ اور مہاجرین اوّلین میں سے ہیں

حضرت عبس بن عامر بن عدی السلمی رضی اللہ عنہ

حضرت عبید بن التیہان رضی اللہ عنہ

حضرت مسعود بن سعد بن قیس الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت مصعب بن عمیر العبدری (مہاجر) رضی اللہ عنہ (علم بردار مہاجرین)
حضرت معاذ بن الحارث النجاریؓ (ابن عفراء)
حضرت معاذ بن عمرو بن الجموح الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت معاذ بن ماعض الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت معبد بن عبادۃ
حضرت معبد بن قیس بن صخر السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت معتب بن عبید قضاعی رضی اللہ عنہ
حضرت معتب بن عوف الخزاعی (مہاجر) رضی اللہ عنہ
حضرت معتب بن قشیر الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت معقل بن المنذر السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت معمر بن الحارث الجمحی (مہاجر) رضی اللہ عنہ
حضرت معن بن عدی الاوسی رضی اللہ عنہ
حضرت معوذ بن الحارث الجمحی رضی اللہ عنہ
حضرت معوذ بن عمرو بن الجموح السلمی رضی اللہ عنہ
حضرت مقداد بن عمر البہرانیؓ (مقداد بن الاسود) مہاجر جن کی بہادرانہ تقریر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چمکنے لگا تھا۔
حضرت ملیل بن دبرۃ الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت منذر بن عمرو بن خنیس الساعدی رضی اللہ عنہ
حضرت منذر بن قدامتہ بن عرفجتہ الخزرجی
حضرت منذر بن محمد بن عقبۃ الانصاری رضی اللہ عنہ
حضرت مہجع مولی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما غزوہ بدر کے سب سے پہلے شہید (یمنی الاصل تھے)

(ن)

حضرت عبید بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ
حضرت عبید بن زید رضی اللہ عنہ
حضرت عبید بن ابی عبید رضی اللہ عنہ
حضرت عبید بن الحارث بن المطلب رضی اللہ عنہ (مہاجر و شہید بدر)
حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ
حضرت عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ
حضرت عتبہ بن عبداللہ
حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ مہاجرن اوّلین میں سے ہیں
امیر المومنین سیّدنا حضرت عثمان بن عفان بن ابی العاصؓ (مہاجرین اوّلین اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں)
حضرت عثمان بن مظعون الجمحی رضی اللہ عنہ مہاجرین اوّلین میں سے ہیں
حضرت عدی بن ابی الزغباء الجہنی رضی اللہ عنہ
حضرت بسبس بن عدی کے ساتھ بھیجا تھا کہ کاروان تجارت کی خبر لائیں
حضرت عصمۃ بن الحصین رضی اللہ عنہ
حضرت عصمۃ حلیف بنی الحارث بن سوار رضی اللہ عنہ
حضرت عطیۃ بن نویرہ رضی اللہ عنہ
حضرت عقبۃ بن عامر رضی اللہ عنہ
حضرت عقبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ
حضرت عقبہ بن عمر رضی اللہ عنہ
حضرت عقبہ بن وہب بن ربیعۃ الاسدی رضی اللہ عنہ
حضرت عقبہ بن وہب بن کلدۃ رضی اللہ عنہ
حضرت عکاشہ بن محصن الغنمی رضی اللہ عنہ

حضرت نضر بن الحارث رضی اللہ عنہ
حضرت نعمان بن عبد عمرو النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت نعمان بن عمرو بن رفاعۃ النجاری رضی اللہ عنہ
حضرت نعمان بن عصر بن الحارث رضی اللہ عنہ
حضرت نعمان بن مالک بن ثعلبۃ الخزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت نعمان بن یسار مولی لبنی عبید رضی اللہ عنہ
حضرت نوفل بن عبید اللہ بن نھلہ الخزرجی رضی اللہ عنہ

(ہ)

حضرت ہانی بن نیار ابو بردۃ البلوی رضی اللہ عنہ
حضرت ہلال بن اُمیہ الواقفی (مختلف فیہ) رضی اللہ عنہ
حضرت ہلال بن المعلی الخزرجی رضی اللہ عنہ

(و)

حضرت واقد بن عبد اللہ التمیمی رضی اللہ عنہ
حضرت ودیعۃ بن عمرو بن جراد الجہنی رضی اللہ عنہ
حضرت ورقہ بن ایاس خزرجی رضی اللہ عنہ
حضرت وہب بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ

(ی)

حضرت یزید بن الاخنس بن خباب رضی اللہ عنہ
یہ، ان کے فرزند اور ان کے والد تینوں غزوہ بدر میں حاضر تھے
حضرت یزید بن الحارث رضی اللہ عنہ
حضرت یزید بن عامر بن حدیدۃ رضی اللہ عنہ
حضرت یزید بن المنذر بن سرح السلمیؓ (شہید)

مہاجرین اولین میں سے ہیں۔ ان کو بشارت دی گئی کہ قیامت کے روز یہ ان متوکلین میں شامل ہوں گے جو بلا حساب وکتاب جنت میں داخل کردیے جائیں گے۔

امیر المومنین سیّدنا حضرت علی بن ابی طالب بن عبد المطلب الہاشمی (عشرہ مبشرہ اور مہاجرین اوّلین میں سے ہیں) کرم اللہ وجہہ
حضرت عمار بن یاسر العنسی المذحجی (رضی اللہ عنہ)
(مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)
حضرت عمارۃ بن حزم رضی اللہ عنہ
امیر المومنین سیّدنا حضرت عمر بن الخطاب (الفاروق اعظم)
(عشرہ مبشرہ اور مہاجرین اوّلین میں سے ہیں)
حضرت عمر بن عمرو بن ایاس (یمنی) رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن الحارث رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن سراقہ (مہاجر) رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن ابی سرح الفہری (مہاجر)
حضرت عمرو بن طلق بن زید رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن الجموح بن حرام الانصاری رضی اللہ عنہ
حضرت عمرو بن قیس بن زید رضی اللہ عنہ

باب الکنی

ان بزرگوں کے اصل نام صحیح معلوم نہیں۔ان کی کنیت ہی مشہور ومعروض ہے۔

حضرت ابوالاعور بن الحارث بن ظالم النجاری رضی اللہ عنہ

حضرت ابوحذیفہ بن عتبۃ بن ربیعۃ (مہاجر) رضی اللہ عنہ

حضرت ابوخزیمہ بن اوس بن اصرم البخاری رضی اللہ عنہ

حضرت ابوسنان بن محصن بن حرثان رضی اللہ عنہ

حضرت ابوالصیاح النعمان رضی اللہ عنہ

حضرت ابوعرفجہ حلیف بنی جحجی رضی اللہ عنہ

حضرت ابولبابۃ بشیر بن عبدالمنذ ر (تقدم) رضی اللہ عنہ

حضرت ابومسعود البدری عقبہ بن عمروؓ (تقدم)

حضرت ابوحبۃ بن عمرو بن ثابت رضی اللہ عنہ

حضرت ابوالحمراء مولیٰ الحارث بن رفاعۃ رضی اللہ عنہ

حضرت ابوسبرہ مولی ابی رھم بن عبدالعزیٰ رضی اللہ عنہ

حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں۔غزوۂ بدر میں اپنے لڑکے سنان کے ساتھ حاضر تھے۔

حضرت ابوکبشہ مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔مہاجر

حضرت ابومرثد الغنوی کناز بن حصین (تقدم) رضی اللہ عنہ

حضرت ابوملیل بن الازعر بن زید الاوسی رضی اللہ عنہ (تقدم)

(ان چار حضرات کے اسماء گرامی پہلے بھی گزر چکے ہیں)

دوسرا محاذ

یہود یثرب وخیبر

روحانی اقتدار اور انقلاب:

تاریخ ایک ہی اقتدار سے واقف ہے اور اسی کے انقلاب کے قصے بیان کرتی ہے۔ دنیاوی یا مادی اقتدار، دولت وثروت، فوجی طاقت، وسائل وذرائع کی فراوانی، مملکت وحدود مملکت، تاریخ کے دلچسپ پہلو ہیں۔ انہیں میں ردوبدل کا نام انقلاب ہے۔ تاریخ اسی انقلاب کے افسانے سناتی رہتی ہے۔ تاریخ گویا جانتی ہی نہیں کہ کائنات انسانیت میں ایک اور اقتدار بھی ہے۔ اس کے بھی اسباب اور وسائل وذرائع ہوتے ہیں۔ یہاں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں بھی انقلاب آتے رہتے ہیں۔ یہ روحانی اقتدار ہے۔ کتاب اللہ کے پیش نظر اکثر یہی انقلاب رہتا ہے۔ وہ بہت سی آیتوں بلکہ اکثر سورتوں میں اسی انقلاب سے بحث کرتی ہے۔ اس کی نظر میں اقتدار یہی ایک اقتدار ہے جس کو روحانی اقتدار کہا جارہا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی اقتدار کے علمبردار ہوا کرتے تھے۔ نوح علیہ السلام کے بعد یہ اقتدار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کیا گیا۔ (۵۰۲) پھر آل ابراہیم میں سے بنواسرائیل کو۔ پوری بائبل (توریت) اس اقتدار کے قصوں اور افسانوں سے بھری پڑی ہے۔ قرآن حکیم نے بھی بلیغانہ اور معجزانہ انداز میں اس اقتدار کے کچھ واقعات بیان فرمائے ہیں۔

یوں تو ہر قوم اور ملت میں نبی آتے رہے۔ خود خالق کائنات ارحم الرحمین کا ارشاد ہے:

لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ (سورہ رعد رکوع ۱) ''ہر قوم کے لیے ہوا ہے راہ بتانے والا۔''

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (سورہ فاطر رکوع ۳) ''اور کوئی فرقہ نہیں جس میں نہیں ہو چکا کوئی نذیر''۔ (۵۰۳)

لیکن یہ بات کہ پوری قوم یا نسل بحیثیت نسل اس اقتدار کی مالک ہو۔ ہدایت وارشاد اور دعوت الی اللہ کا فریضہ اس کے سپرد ہو۔ قرآن حکیم میں جن قوموں کا تذکرہ آیا ہے ان میں صرف بنی اسرائیل ہی وہ قوم تھی جس کو من حیث القوم یہ اقتدار عطا ہوا تھا۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ نہیں بار بار ارشاد ہوا ہے:

يَا بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (سورہ بقرہ ع ۶ و ع ۱۵) وغیرھا)

> ''اے بنی اسرائیل جو نعمت میں نے تم کو بخش رکھی تھی (ہر قوم اور ہر ملت تمہارے روحانی اقتدار کے سامنے سر جھکائے ہوئے تھی) اللہ کے اس انعام عظیم کو یاد کرو۔''

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْجَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوْكًا وَّآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِنَ الْعَالَمِيْنَ (سورہ مائدہ ع)

''یاد کرو اللہ کے انعام کو جس سے تمہیں سرفراز کیا۔ اس نے تم میں نبی پیدا کیے تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ عطا فرمایا جو دنیا جہاں میں (اب تک) کسی کو نہیں دیا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزندان نامور اسماعیل اور اسحاق (علیہما السلام) ہیں حضرت اسحاق کے جانشین اور خلف اکبر یعقوب علیہ السلام ہیں جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ انہیں اسرائیل کی اولاد (بنو اسرائیل) جو کئی ہزار سال تک ایوان دعوت وارشاد میں مسند آرا رہی۔ ہزاروں انبیاء ان میں پیدا ہوئے۔ ان میں حضرت ایوب جیسے صابر وقانع بھی تھے۔ حضرت یوسف جیسے منتظم حضرت موسیٰ جیسے انقلاب انگیز حضرت داؤد جیسے بہادر اور حضرت سلیمان جیسے تاج پوش بھی تھے (صلوات اللہ علیہم اجمعین)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ان الله لا يمل حتى تملوا

(اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں اکتاتا۔ یہاں تک کہ تم ہی عمل کرنے سے نہ اکتا جاؤ۔)

فضل خداوندی کی یہ کرم فرمائیاں بنو اسرائیل پر برابر جاری رہیں یہاں تک کہ وہ خود ہی ان نوازشوں کی قدر کرنے سے یہاں تک اکتا گئے کہ خود اپنے ہاتھوں خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں کو جو انہیں میں کے ہوتے تھے قتل کرنے لگے۔

حد ہوگئی۔ بڑے فخر سے دعویٰ کیا کرتے تھے:

اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ (سورہ نساء ع ۲۲)

''بیشک (۵۰۴) ہم نے قتل کیا ہے مسیح کو وہی مسیح جو ابن مریم تھے۔ جو اللہ کے رسول تھے۔''

کیا یہی قوم آئندہ بھی روحانی اقتدار کی مالک رہے۔ دعوت وارشاد کا نظام اسی کے سپرد رہے یا اس میں تبدیلی ہو۔ یہ ایک قدرتی سوال تھا۔

لطف یہ ہے کہ اپنی ان تمام شرمناک حرکتوں اور نفرت انگیز کرتوتوں کے باوجود یہی سمجھتے تھے کہ یہ اقتدار ہمارے ہی حوالہ رہے گا اور آنے والے نبی ہم میں سے مبعوث ہوں گے اور ہمیں صرف اسی نبی کی اتباع کرنی چاہیے جو ہم میں سے ہو۔

مگر کیا قدرت خداوندی کا دامن تنگ ہے۔ کیا ہماری طرح اس کو بھی قحط الرجال کی شکایت رہتی ہے (معاذ اللہ) وہاں تنگی دامن کی شکایت نہیں ہے۔ نوشتگان قضا وقدر کا کھلا اعلان ہے:

کوئی قوم اگر روگردانی کرتی ہے تو وہ دریائے فیض کا رخ کسی دوسری قوم کی طرف موڑ دیتا ہے اور اس منہ موڑنے والی جماعت نے جس طرف اپنا رخ کیا ہے وہ اسی رخ پر اس کو چلاتا رہتا ہے یہاں تک اس کو جہنم میں

دھکیل دیتا ہے جو اس کی آخری منزل ہوتی ہے۔"

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (سورہ نساء ع ۱۷)

"جس پر ہدایت کی راہ کھل جائے اس کے بعد بھی وہ اللہ کے رسول سے مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے تو ہم اسی طرف لیجائیں گے جس طرف وہ خود مڑ گیا ہے اور داخل کر دیں گے اس کو جہنم میں اور یہ بہت ہی بری جگہ ہے جو اس کی آخری منزل اور مرجع ہوگی۔"

اسباب انقلاب:

ایشیا چودھویں صدی عیسوی کے آخر تک تمام دنیا پر چھایا ہوا تھا وہ دنیا کا کمزور بازو کس طرح بنا اور کس طرح یورپ نے ایشیا کے مقابلہ میں اقتدار اور غلبہ حاصل کیا اور اس کے اسباب اور وجوہات کیا تھے۔ یہ ایک مؤرخ کے لیے بہت دلچسپ اور تحقیق طلب موضوع ہے۔ اس طرح روحانیات کے مفکر کے لیے نہایت دلچسپ اور تحقیق طلب موضوع یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے کہ روحانی اقتدار جو ہزاروں سال سے بنو اسرائیل کی میراث بنا ہوا تھا وہ ان سے چھین کر بنو اسماعیل کے حوالہ کیا گیا۔ جن کے ہادی اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

بیشک حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے فرزند ارجمند اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر دعا کی تھی۔ (۵۰۵)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (سورہ بقرہ ع ۱۵)

"اے ہمارے رب ان میں (مکہ کے رہنے والوں میں) مبعوث فرما ایک رسول جو انہیں میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے۔ کتاب اور حکمت (دانش) کی تعلیم دے اور روحانی تربیت سے ان کے دلوں کو مانجھ دے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یقیناً قبول ہوئی۔ محمد رسول اللہ (فداہ روحی) صلی اللہ علیہ وسلم آل اسماعیل میں خاتم الانبیاء بن کر مبعوث ہوئے اور مسند ارشاد و ہدایت آپ کی اُمت کے (۵۰۶) حوالہ ہوا۔ لیکن یہ دنیا عالم اسباب ہے، یہاں دعا کی قبولیت بھی سبب کا نتیجہ بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ پس یہ سوال اپنی جگہ رہا کہ وہ کیا اسباب ہیں کہ بنو اسرائیل اس نبی آخر الزماں کی بعثت سے محروم رہے اور یہ سعادت بنو اسماعیل کے حصہ میں آئی اور ان کو نصیب ہوئی۔

کلام الٰہی میں اس سوال کو نہایت اہمیت دی گئی ہے اور یقیناً وہ آیتیں سو سے زیادہ ہیں جن میں اس سوال

کے جواب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسے انداز سے محرومی بنی اسرائیل کے اسباب بیان کیے گئے ہیں جو بنی اسرائیل کے بارے میں تاریخی حقائق ہیں اور نوع انسان کے لیے درس عبرت۔

دوسری طرف وہ اوصاف اور وہ اخلاق وخصائل بیان کیے گئے ہیں جو کسی قوم کی ترقی کا زینہ ہوا کرتے ہیں اور چونکہ امت محمدیہ علی صاحبھا الصلوۃ والسلام (خصوصاً جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم) ان اوصاف کی حامل ہوئی۔ لہٰذا اس کی ترقی اور کامرانی کے وجوہات اور اسباب بھی سامنے آجاتے ہیں۔

یہود مدینہ اگر عقل ودانش سے کام لیتے تو وہ کلام پاک کے دونوں سبق سامنے رکھ کر فلاح اور کامیابی کی راہ اختیار کر سکتے تھے۔ مگر وہ روحانی امراض جو قوم یہود کے لیے کینسر بن چکے تھے قوم یہود ان سے نجات نہ پاسکی۔ ان امراض میں سب سے زیادہ بنیادی اور سب سے زیادہ سخت مرض تھا اتباع ھویٰ یعنی اپنی من مانی باتوں پر چلنا اور انہیں کو مذہب مان لینا اور خدا کو چھوڑ کر انہیں کو معبود کی حیثیت دے دینا۔

دنیا شاید اس بغاوت اور کور باطنی کی مثال نہ پیش کر سکے کہ یہودی اپنی ہی قوم کے نبی معصوم عیسیٰ علیہ السلام (جن کی عصمت اور صداقت کے آثار ان کی پیدائش کے وقت سے ان کے سامنے تھے) ان کو قتل کرنے کی کوشش میں اپنی تمام سرگرمیاں صرف کر دیتے ہیں اور پھر اس تصور کی بنا پر کہ ان کی سرگرمیاں کامیاب ہوئی ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل کر دیئے گئے ہیں۔ بڑے فخر سے کہتے ہیں:

اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ

جرأت اور جسارت کی بھی حد ہوگئی کہ اظہار جرم کے وقت صرف ایک نام نہیں بلکہ (مسیح وعیسیٰ) دونوں نام لیتے ہیں۔ کنیت بیان کرتے ہیں (ابن مریم) خطاب اور منصب (رسول اللہ) سب کچھ ظاہر کرتے ہیں تاکہ سننے والا ان کی سینہ زوری اور ہیکڑی سے پوری طرح مرعوب اور متاثر ہو جائے۔

کور باطنی کی یہ بحرانی کیفیت اسی وجہ سے پیدا ہوئی کہ انہوں نے تورات کو نہیں بلکہ اپنے اختراعات کو مذہب سمجھ لیا تھا اور ان کی گردنیں خالق کائنات کی عظمت کے سامنے نہیں بلکہ اپنے مزعومات باطلہ کے سامنے خم رہتی تھیں۔ (۵۰۷)

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (الایۃ) (سورہ جاثیہ ع ۳)

ترجمہ: ''تمہاری کیا رائے ہے ایسے شخص کے متعلق جس نے اپنا معبود بنا لیا اپنے نفس کی خواہش (دل کی چاہ) کو اور باوجود یہ کہ وہ علم رکھتا تھا مگر اللہ نے گمراہی اس کے لیے مقرر کر دی (کیونکہ وہ علم کے باوجود ایسا جاہل اور عقل پرست بن گیا گویا) اس کے کان اور دل پر مہر لگ گئی ہے اور آنکھوں کی بینائی پر پردہ پڑ گیا ہے۔'' (۵۰۸)

قرآن حکیم میں اس بنیادی مرض کی تشریح کرتے ہوئے ان خصلتوں کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے جو ان کے اندر

جڑ پکڑ گئی تھیں۔ مثلاً وہ متمردانہ اور باغیانہ نظریات اور نہایت غلط عقیدوں پر یہاں تک پختہ تھے اور ایسے مطمئن تھے کہ ان کے دماغ اس تصور سے بھی خالی تھے کہ ان میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے۔ وہ خود کہا کرتے تھے:

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (سورہ بقرہ ع ۱۱) "ہمارے دلوں پر غلاف ہے۔" یعنی کوئی سوراخ ایسا نہیں ہے جس کے راستہ سے دعوت اسلام ان کے دلوں کی پینیدی تک پہنچ سکے۔

وہ ناقابل تغیر عقائد ونظریات اور ناقابل تبدیل خصلتیں کیا تھیں جن کی پختگی پر ان کو ناز تھا۔ کتاب اللہ کے مطالعہ سے ان کا بھی انکشاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) بہت بڑی گمراہی یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا کرتے تھے مثلاً دست قدرت کا اطلاق کرتے تو یہ بھی سمجھتے تھے کہ (معاذ اللہ) ہمارے ہاتھ کی طرح دست قدرت میں بھی انگلیاں ہیں۔ وہ اپنا ہاتھ سامنے کر کے بتایا کرتے تھے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس انگلی پر آسمان رکھے گا، اس پر سمندر اس پر پہاڑ اس پر تمام درخت پھر ان کو ٹکرا دے[۵۰۹] گا۔ (معاذ اللہ) سبت (شنبہ کے دن) یہودی تعطیل کیا کرتے تھے اور عقیدہ یہ تھا کہ اللہ میاں نے بھی اس دن آرام کیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے اتوار کے دن سے زمین و آسمان کی پیدائش شروع کی۔ جمعہ کے روز یہ سلسلہ ختم ہوا تو اللہ میاں کو (معاذ اللہ) تھکان ہو گیا۔ شنبہ کے روز اس نے آرام کیا۔[۵۱۰] لہٰذا ہمیں بھی اس روز آرام کرنا چاہیے۔

سبت کو یہودی مقدس مانتے تھے۔ یہ دن ہر ہفتہ آتا تھا تو ہر ہفتہ اس شرمناک عقیدہ کی تجدید ہو جاتی تھی۔ اور اس طرح کے تصورات پختہ ہو جاتے تھے۔

(۲) یہود کے کچھ فرقوں نے باپ بیٹے کا رشتہ بھی خدا سے قائم کر دیا تھا۔ وہ حضرت عزیز (علیہ السلام) کو اللہ میاں کا بیٹا مانتے تھے۔

(۳) فرشتوں کو خود مختار مانتے تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنا دشمن سمجھا کرتے تھے کہ اس نے یہود پر بار بار تباہی ڈالی ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کا علم بھی کچھ اپنے ہی جیسا مانتے تھے جن حقائق کو اور توریت کی جن آیتوں کو چھپا لیتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ علم خدا کے احاطہ سے بھی وہ خارج ہو گئی ہیں۔ اگر کوئی یہودی کسی مسلمان کو توریت کی کوئی بات بتا دیتا تھا تو وہ اس پر خفا ہوا کرتے تھے کہ قیامت کے روز یہ مسلمان اللہ میاں کو بتا دے گا تو ہمارے لیے عذر کرنے کا موقع نہیں رہے گا کہ ہمیں خبر نہ تھی۔[۵۱۱]

(۵) تنگ نظری اور گروہ پرستی کی انتہا تھی کہ اللہ میاں کی وسیع جنت کو صرف[۵۱۲] اپنی ٹولی کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔

اخلاق واعمال:

ان عقائد ونظریات کے ساتھ اخلاق واعمال کی حالت یہ تھی کہ حرص، طمع، خودغرضی، نفع اندوزی، بخل اور سود جیسی خصلتیں جو آج بھی دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ اس جماعت کے اندر پائی جاتی ہیں، جن کی وجہ سے یہودی ان خبیث خصلتوں کی تصویر ومثال اور لفظ یہودیت ان کے ہم معنی اور مرادف مانا جاتا ہے۔ یہ خصلتیں پورے شباب کے ساتھ ان بدبختوں کے اندر بھی موجود تھیں جو آفتاب ہدایت کے سامنے بیٹھ کر بھی نور آفتاب کو نہ دیکھ سکے اور ان کی نگاہیں چکاچوندرہیں۔

ان خبیث خصلتوں نے یہ عقیدہ پختہ کر دیا تھا کہ غیر یہودی کا مال جس طرح بھی ہاتھ لگ جائے وہ ان کے لیے حلال وطیب ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَأْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ تاوَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (سورہ آل عمران رکوع ۸)

''(مطلب) ان اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے کہ اگر ایک دینار کے لیے بھی ان پر بھروسہ کرلو تو کبھی وہ تمہیں واپس نہ دیں جب تک (تقاضے کے لیے) ہمیشہ ان کے سر پر کھڑے نہ رہو۔ ان لوگوں میں یہ بدمعاملگی اس لیے پیدا ہوگئی کہ وہ کہتے ہیں امیوں سے معاملہ کرتے ہوئے ہم کچھ کرلیں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ فی الحقیقت (وہ ایسا کہہ کر) اللہ پر تہمت باندھتے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ حقیقت حال کیا ہے'' (آل عمران ع ۸)

طماعی اور حرص کی انتہا یہ تھی کہ دوچار روپے کے زیور کے لیے معصوم بچوں کا سر کچل دیتے تھے۔ [۵۱۳] اور چونکہ تنہا یہی صاحب دولت تھے۔ اس لیے نہایت بے رحمی سے سود کی بڑی شرحیں مقرر کرتے تھے اور قرضہ کی کفالت میں لوگوں کے بال بچے یہاں تک کہ مستورات کو رہن رکھواتے تھے۔ [۵۱۴]

سود کے علاوہ رشوت کا مرض صرف عوام میں نہیں بلکہ خواص حتیٰ کہ ان کے زاہد وعابد علماء میں جن کو وہ احبار کہا کرتے تھے یہاں تک رائج تھا کہ جب وہ چاہتے توریت کی آیت [۵۱۵] چھپا لیتے تھے۔ کبھی معنی بدل [۵۱۶] دیتے تھے۔ کبھی کسی اور طرح تاویل کرلیا کرتے تھے۔ کبھی خود اپنی طرف سے کوئی بدعت رائج کر کے اس کو اللہ کا حکم کہتے اور اس پر رقمیں وصول کیا کرتے تھے۔ [۵۱۷]

تلبیس الحق بالباطل یعنی غلط بات کو صحیح قرار دینا اور صحیح کو غلط کا جامہ پہنا دینا، صداقت پر پردہ ڈال دینا، ضمیر کے خلاف پوری دلیری سے شہادت دینا، پھر اسی پر اصرار کرتے رہنا۔ وہ عیوب اور امراض تھے جو یہودیت کی سرشت اور ان کی فطرت بن گئے تھے۔ ان امراض نے صرف اسی قوم یا جماعت کو گمراہ نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نوع انسان کے بہت بڑے طبقہ کو نجات اور فلاح وکامیابی سے محروم کر دیا۔ دوسری طرف

داعیان حق کے کام کو زیادہ سے زیادہ دشوار اور پر خطر بنا دیا۔

عہد زریں کے پہلے حصہ (۵۱۸) میں وہ بشارتیں نقل کی گئی ہیں جو انبیاء سابق علیہم السلام اور ارباب باطن نے نبی آخر الزماں، خاتم الانبیاء فداہ روحی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دی تھیں۔ اگر ان بشارتوں میں تحریف نہ کی جاتی تو نوع انسان کا وہ طبقہ جو آسمانی صحیفوں کو اپنا دین وایمان سمجھتا تھا اور جو نبی آخر الزماں کی آمد کا منتظر تھا۔ جب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا تھا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (سورہ اعراف)

وہ اس دعوت کا انکار نہ کرتا بلکہ کھلے دل سے اس کا استقبال کرتا اور عیسائیوں کے حق پرست راہبوں اور قسیس کی طرح اس کا کردار بھی یہ ہوتا۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ (سورہ مائدہ ع ۱۱)

''اور جب یہ (پادری اور راہب جن میں گھمنڈ اور خود پرستی نہیں ہے) وہ کلام سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں جوش گریہ سے بہنے لگتی ہیں کیونکہ انہوں نے سچائی کو پہچان لیا ہے وہ (بے اختیار) بول اٹھتے ہیں۔ خدایا ہم ایمان لائے۔ پس ہمیں بھی ان میں لکھ لے جو سچائی کی شہادت دینے والے (حق کو مان لینے والے) ہیں اور وہ کہتے ہیں ہمیں کیا ہو گیا ہے (یہ کیسے ممکن ہے) کہ ہم اللہ پر اور اس کلام پر جو سچائی کے ساتھ ہمارے پاس آیا، ایمان نہ لائیں اور اس بات کی طمع کرتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک کردار اور صالح لوگوں میں داخل کر دے (یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ہم ایمان سے محروم رہیں اور صالح اور نیک کردار لوگوں میں ہمارا شمار ہونے لگے۔ ایمان سے محرومی (کفر) اور صلاح اور نیک کرداری ساتھ ساتھ جمع نہیں ہو سکتے)''

لیکن اس مغضوب علیہم قوم نے ان بشارتوں میں تحریف کر کے نہ صرف اس آفتاب جیسی حقیقت کو مشتبہ کر دیا بلکہ اس کے خلاف طرح طرح کے بہتان (۵۲۱) تراش کر نادان عقیدت مندوں کے جذبات کو یہاں تک برا فروختہ کر دیا کہ دعوت و تبلیغ کا میدان داعی حق کے لیے آتش کدہ بن کر رہ گیا۔

یہ حقیقت کس قدر عجیب ہے کہ اوس وخزرج منزل پر جا پہنچے اور جن کے اشاروں سے ان جاہل ومشرک قبیلوں نے راستہ کے نشانات معلوم کیے تھے وہ خود راہ یابی سے محروم رہ گئے۔

مدینہ کے یہودی آنے والے نبی کی پیشین گوئی کیا کرتے تھے۔ اس کے اوصاف اور علامتیں بتایا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اس کی آمد سے ہماری قوت بڑھے گی۔ ہمیں عروج حاصل ہوگا۔ اوس وخزرج کے

جنگجو قبائل جو تقریباً سوا صدی پوری آپس کی لڑائی (۵۲۲) میں گزار چکے تھے نہ نبوت سے واقف تھے نہ وحی اور نہ فرشتہ وحی سے۔ یہود کی بتائی ہوئی باتیں کانوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ اپنے مشرکانہ دستور کے مطابق حج کے لیے مکہ گئے۔ وہاں ایک داعی حق کی آواز سنی، اس پر کان لگائے، قریب پہنچے، باتیں کیں، باتوں میں سچائی معلوم ہوئی، یہود کی بتائی ہوئی باتوں سے مطابقت پائی، طلب صادق کا جذبہ ابھرا، توفیق خداوندی نے دستگیری کی شک وشبہ کے تمام پردے چاک ہو گئے، ایمان واذعان کی روشنی نمودار ہوئی اور السابقون الاولون میں داخل ہو گئے۔

نومیدم مباش کہ رندان بادہ خوار
ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

لیکن اس کے برخلاف خود ان پیشین گوئی کرنے والوں کا کردار کیا رہا، ملاحظہ فرمایئے:

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَقَدْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِينَ (سورہ بقرہ ع ۱۱)

''اور جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی ہدایت کے لیے ایک کتاب تصدیق کرتی تھی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے تو باوجود یکہ وہ (توارت کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے منتظر تھے اور) کافروں کے مقابلہ میں اس کا نام لے کر فتح ونصرت کی دعائیں مانگتے تھے لیکن جب وہی جانی بوجھی بات سامنے آ گئی تو صاف انکار کرنے لگے۔ پس اللہ کی لعنت ہے ان کافروں پر۔''

اس طرح ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ کیا تھی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام اور اس کی رحمت کو صرف اپنی ہی بدکار ٹولی میں بند کر کے رکھنا چاہتے تھے اور بس:

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا أَنْ يُنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (سورہ بقرہ ع ۱۱)

''(افسوس ان کی بدبختی اور شقاوت پر) کیا ہی بری قیمت ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا چکایا۔ انہوں نے اللہ کی نازل کی ہوئی سچائی سے صرف اس ضد پر انکار کیا کہ (اللہ میاں کیوں کرتا ہے کہ) وہ اپنے بندوں میں جس کسی پر چاہتا ہے اپنا فضل نازل کر دیتا ہے۔ (ان ہی کی ٹولی میں بند کر کے اور تالا ڈال کر کیوں نہیں رکھتا)''

اس ہٹ دھرمی، عناد، بدکرداری اور کور باطنی کے باوجود لطف یہ ہے کہ عقیدہ یہ تھا کہ:

☆ ہم فرزندان خدا اور اس کے محبوب (۵۲۳) ہیں۔

☆ جنت میں صرف یہودی جائیں گے جو یہودی نہ ہو وہ جنت میں ہرگز داخل نہ ہو سکے گا۔ ہمیں آتش

دوزخ ہرگز نہیں چھوسکتی۔ اگر ہم دوزخ میں داخل کیے گئے تو صرف گنتی کے چند دنوں کے لیے۔

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَعْدُوْدَۃً (سورہ بقرہ ع ۹)

یہود کے ساتھ غیر معمولی مراعات:

یہ چند خصلتیں جو اوپر بیان کی گئیں (اور اس جیسی بہت سی خصلتیں) جو اس جماعت کی قومی خصلتیں تھیں اس بات کا یقین کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہ گروہ ایک ایسا پھوڑا تھا کہ ڈاکٹر کا پہلا کام یہ تھا کہ سب سے پہلے اس کا آپریشن کر دیتا تاکہ جسم انسانیت اس کے متعدی اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ لیکن اتفاق سے ڈاکٹر وہ تھا جس کو خالق کائنات نے روف رحیم اور رحمۃ للعالمین فرمایا ہے۔ جب اس نے مدینہ طیبہ میں نزول اجلال فرمایا تو تاریخ شاہد ہے کہ اس نے اس گروہ کو وہ رعایتیں عطا فرمائیں جو آج کی دنیا میں بھی جو تہذیب اور شائستگی کی دعویدار ہے، بہت ہی مشکل ہے کہ کسی با اختیار و با اقتدار کی طرف سے کسی جماعت کو نصیب ہو سکیں۔ یہودیوں کے تین مشہور قبیلے مدینہ کے قریب دو دو تین تین میل کے فاصلہ پر آباد تھے۔ (۱) بنو قینقاع (۲) بنو نضیر اور (۳) بنو قریظہ

ہر ایک قبیلہ کی آبادی گویا ایک قلعہ تھی اس میں ان کے محل اور تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ باہر ان کے باغات تھے۔

اس حصہ (۵) کی ابتدا میں وہ معاہدہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے جملہ قبائل سے کیا تھا۔ جس کی رو سے ہر قبیلہ کا جو نظام پہلے سے تھا وہ بدستور قائم رکھا گیا تھا۔ باہمی معاملات و مقدمات طے کرنے کے لیے ان کی پنچائتیں یا جو بھی نظام تھا وہ بدستور قائم رکھا گیا۔ معاملات طے کرنے کے اصول بھی بدستور قائم رکھے گئے تھے۔ تعلیم گاہیں، عبادت گاہیں بدستور قائم رکھی گئیں۔ خود ان کی رضامندی سے یہ حق تسلیم کیا گیا کہ اپنے معاملات کی آخری اپیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر سکیں گے۔

ان عمومی رعایتوں کے علاوہ چند رعایتیں خاص اس گروہ کے ساتھ مخصوص تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ گروہ اگر ان کی کچھ بھی قدر کرتا تو نہ صرف یہ قبائل اور مسلمان بلکہ اسلام اور یہودیت دنیا میں شیر و شکر ہو کر نمودار ہوتے۔ (مراعات کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں)

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین اگرچہ ملت ابراہیم کا احیاء تھا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت مدون اور مرتب کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے طریقے جو بطور رسم و رواج مکہ میں رائج تھے وہ کفر و شرک کی آمیزش سے اتنے مشتبہ ہو چکے تھے کہ اصل حقیقت کا پتہ چلانا مشکل تھا۔ اس کے مقابلہ میں یہود کے پاس توریت تھی، ان کا دین ایک مرتب دین تھا۔ پس جن مسائل کی تشریح وحی الٰہی سے نہیں ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم ان مسائل میں اہل کتاب کی موافقت (۵۲۵) پسند فرماتے تھے۔

(۲) باہمی گفتگو اور بحث و مباحثہ میں یہ گوارا نہیں تھا کہ اہل کتاب کے پیشواؤں کی توہین ہو۔ ایک مرتبہ ایک یہودی نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۵۲۶) سے بحث شروع کر دی اور دوران بحث میں ایسے جملے استعمال کیے جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہوتی تھی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا۔ آپ نے یہودی کے طمانچہ مار دیا۔ یہودی نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو تنبیہ فرمائی بلکہ یہ بھی تاکید فرما دی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان تو بہت بلند ہے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ حضرت یونس کے مقابلہ میں (جن کو یہودی معمولی درجہ کا نبی سمجھتے ہیں) مجھے بڑھانے کی بات کرے۔ (۵۲۷)

(صلی اللہ تعالیٰ علی جمیع الانبیاء والمرسلین)

(۳) جو معاملہ خود ان کی پنچایت میں طے نہیں ہوتا تھا اور اس کا مرافعہ (اپیل) بارگاہ رسالت (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) میں پیش ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش یہ ہوتی کہ اس بارے میں توریت کا صحیح حکم معلوم ہو جائے تو اس کے بموجب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ صادر فرمائیں۔

(۴) تہذیب و ثقافت کی باتوں میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے ساتھ اتفاق (۵۲۸) فرماتے اور ان کی مذہبی توقیر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ بالوں میں مانگ نکالا کرتے تھے۔ یہودی مانگ نہیں نکالتے تھے سیدھے بال رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں اسی کو پسند (۵۲۹) فرمایا۔

(۵) صوم عاشورہ۔۱۰ محرم الحرام کے روزہ کا رواج مکہ معظمہ میں بھی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو دیکھا یہودی بھی روزہ رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے اس روز کی وجہ دریافت فرمائی۔ علماء یہود نے بتایا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی کی یادگار ہے۔ اس روز فرعون غرق ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فتح بخشی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس روزہ کا حکم دے دیا اور فرمایا: **انا اولی بموسٰی منھم** یعنی (۵۳۰) اہل کتاب کی بہ نسبت مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تعلق ہے۔

(۶) سلسلہ معاشرت میں طعام ذبیحہ اور نکاح کے مسائل کو بھی لے لیجئے۔

کتاب اللہ میں ارشاد ہے:

طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ (سورہ مائدہ ع ۱)

(الف) اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارے یہاں کا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔

(ب) اور تمہارے لیے مسلمان خواتین اور وہ خواتین جو اس گروہ کی ہیں جن کو تم سے

پہلے کتاب دی گئی۔ (یعنی جو عورتیں اہل کتاب ہیں) حلال ہیں (ان سے باضابطہ نکاح کر سکتے ہو)''

ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نماز بھی اسی طرف پڑھا کرتے تھے جس طرف یہود کا قبلہ تھا۔ حالانکہ بنو اسماعیل کا قبلہ خانہ کعبہ تھا اور جو لوگ اس وقت تک دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ بھی عموماً بنو اسماعیل ہی تھے۔

مختصر یہ کہ صرف تہذیب وثقافت، سماجی اور معاشرتی تعلقات میں نہیں بلکہ عبادات میں بھی اشتراک کا پہلو ہی نمایاں تھا۔

وحی الٰہی نے یہود و نصاریٰ کو جس انداز میں دعوت اسلام پیش کرنے کی تلقین کی ہے اس میں بھی اشتراک کے پہلو ہی کو مقدم رکھا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (سورہ آل عمران ع ۷)

''اے رسول! کہہ دو۔ اے اہل کتاب (یہود و نصاری) ایسی بات (اصول) کی طرف آ ؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر مسلم ہے۔ (یعنی یہ کہ) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے کہ گویا اس نے خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا رب (پروردگار) بنا لیا ہے۔''

ان کو یہ بھی بشارت دی دی جاتی تھی کہ اگر وہ اسلام سے مشرف ہوتے ہیں تو ان کو دوگنا اجر و ثواب ملے گا۔ یعنی اب تک جس کتاب پر ایمان لائے ہوئے تھے وہ ضائع نہیں ہوگا۔ یہ پژمردہ درخت بھی شاداب ہو جائے گا اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا ثواب مستزاد ہوگا۔

منجانب اللہ مسلمانوں کی زبان بندی:

عملی اور مثبت شفقت اور رواداری کے ساتھ نہایت ہی عجیب بات یہ ہے کہ ایسی تمام چیزوں سے مسلمانوں کی زبان بند کر دی گئی تھی جس سے یہود اور مشرکین کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔

مشرکین کے حق میں جو ہدایت دی گئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

لَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (سورہ انعام ع ۱۳)(الف)

''اے مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو۔''

جہاں تک اہل کتاب کا تعلق ہے تو خود اہل کتاب کے دعوے کے بموجب عقیدہ توحیدہ میں اشتراک تھا توحید کے بعد دوسرا مسئلہ انبیاء علیہم السلام کے احترام کا تھا۔جن کے متعلق اہل کتاب کے عقائد نازک ہونے چاہییں۔تو ہر ایک صاحب نبوت کے متعلق قرآن پاک اور وحی الٰہی کی مستقل اور مسلسل تعلیم یہ ہے:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (سورہ بقرہ ع ۴۰)

''اللہ کا رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر ایک مسلمان اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے تمام رسولوں اور نبیوں پر۔کسی رسول یا نبی کے بارے میں یہ تفریق گوارا نہیں کرسکتا کہ بعض کو مانے اور بعض کو نہ مانے۔''

جو اس طرح کی تفریق کرے وہ مسلمان نہیں بلکہ پکا کافر ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کر دیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور اس کے درمیان ایک راستہ اختیار کرتے ہیں یہ لوگ کافر ہیں پکے۔''

(سورہ نساء ع ۲۱)

اس پر مستزاد یہ کہ مسلمانوں کو تاکید تھی کہ مشرک و اہل کتاب جو کچھ بھی کہیں ان کے جملوں اور فقروں سے تمہیں خواہ کتنی ہی تکلیف ہو مگر تمہارا فرض ہے کہ تم ضبط و تحمل سے کام لو اور صبر کرو (سورہ آل عمران ع ۲۰۱)

یہ تھا فیاضانہ اور رحیمانہ سلوک غیر معمولی شفقت اور ملاطفت اور یہ تھی بے نظیر رواداری جس کی کوئی مثال موجودہ دور میں (جو اپنی روشن خیالی اور تہذیب پر نازاں ہے جب کہ جمہوریت مساوات اور بقاء باہم کے نعروں سے فضائے سیاست پر شور ہے) دنیا کے کسی گوشہ میں ہزار جستجو کے بعد بھی نہیں مل سکتی اور ان تمام ناز برداریوں کے جواب میں مطالبہ صرف یہ تھا کہ مکہ کے وہ مشرک جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے وطن عزیز مکہ معظمہ سے نکلنے پر مجبور کیا ہے جو مسلمانوں کی بیخ کنی کے درپے ہیں (جن سے یہود کا نہ کوئی مذہبی رشتہ ہے نہ وطنی اور نسلی) وہ اگر حملہ آور ہوں تو معاہدے کے دوسرے شرکاء کی طرح یہود کا بھی فرض ہوگا کہ مسلمانوں کی مدد کریں۔حملہ آوروں کو کسی قسم کی کوئی مدد نہ دیں۔ (۵۳۲)

یہود کا طرز عمل:

رحیمانہ، فیاضانہ، مشفقانہ سلوک غیر معمولی رواداری اور ناز برداری کا جواب یہودیوں نے کیا دیا اور کس طرح دیا۔ذیل کی چند مثالیں اس کا جواب پیش کریں گی۔

بالمواجہ گستاخی:

عرب میں انعم صباحا جیسے پر تکلف جملے رائج تھے۔ اسلام نے ان کے مقابلہ میں السلام علیکم کا نہایت سادہ اور معنی خیز طریقہ رائج کیا۔ یہود جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو بظاہر اسی تعلیم پر عمل کرتے۔ مگر چھچھورپن یہ کرتے کہ السلام علیکم کے بجائے السام علیکم کہتے۔ السلام علیکم کے معنی ہیں آپ پر سلامتی ہو اور سام موت کو کہتے ہیں السام علیک۔ تجھے موت آئے۔ السلام علیکم دعا سلامتی ہے اور السام علیک دعا موت۔

مجلس مبارک میں گستاخانہ حرکتیں، فقرے بازی:

کوئی مقرر تقریر کر رہا ہے۔ آپ یہ فرمائیں مکرر ارشاد یا بار بار فرمائیں۔ اس طرف بھی توجہ کیجئے۔ اس طرح کے فقرے طنز اور مضحکہ سمجھے جاتے ہیں۔ غیر سنجیدہ مجلسوں میں اوچھے آدمی ایسے جملے بول کر مقرر کا مذاق بنایا کرتے ہیں۔ یہودی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں حاضر ہوتے تو صرف یہ نہیں کہ بار بار بول کر سلسلہ کلام کو منقطع کرنے کی کوشش کرتے اور اس مداخلت سے ایک طرح کا انتشار پیدا کیا کرتے تھے بلکہ جدت اور فن کاری یہ تھی کہ سیدھے سادے لفظ انظرنا کے بجائے راعنا کہتے تھے اور کبھی کبھی عین کے زیر کو کھینچ کر راعینا(۵۳۳) کر دیتے تھے اور اپنے اس تمسخر پر نیچے نیچے ہنستے بھی رہتے تھے۔

اُنْظُرْنَا یعنی ''ہماری طرف توجہ فرمائیے۔''

رَاعِنَا کے معنی بھی یہی ہیں جب کہ اس کو دو لفظوں کا مرکب سمجھا جائے یعنی راعِ اور نا لیکن اگر یہ ایک لفظ راعــن سمجھا جائے تو اس کے معنی ہیں او احمق او بے وقوف اور اسی بنا پر یہود کے محاورہ میں یہ لفظ گالی سمجھا جاتا تھا اور کبھی کھینچ کر راعینا کر دیتے تھے جس کے معنی ہیں ہمارا چرواہا۔

مسلمانوں نے ابتدا میں یہود کے اس تمسخر کو نہیں سمجھا۔ انہوں نے بھی یہ لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مگر وحی الٰہی ناموس انبیاء علیہم السلام کی پاسبان ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی نے اس موقع پر یہود سے تو تعرض نہیں کیا۔ البتہ مسلمانوں کو ہدایت فرمائی:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوْا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا (سورہ بقرہ ع ۱۳)

''اے مسلمانو! رسول خدا کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو تو راعنا مت کہو۔ (سیدھا لفظ) انظرنا کہو۔ (ہماری طرف التفات کیجئے) (اور حق تو یہ ہے کہ پوری توجہ سے) سنو (کہ فرمائش التفات کی ضرورت ہی پیش نہ آئے)'' (سورہ بقرہ ع ۱۳)

اس طرح مجلس مبارک میں اور بھی غیر سنجیدہ باتیں کی جاتی تھیں جو بسا اوقات شر انگیز بھی ہوتی تھیں۔ مگر کلام اللہ شریف نے مسلمانوں کو جو ہدایت فرمائی وہ بلا شبہ ایک درس عبرت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس

گستاخ اور آبرو باختہ جماعت کے ساتھ کس درجہ رعایت کی جاتی تھی اور کہاں تک اس کی ناشائستہ حرکتوں پر مسلمانوں کو چشم پوشی کی تاکید تھی۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ تا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (سورہ بقرہ ع ۱۳)

''اہل کتاب میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا دیں اور اگر چہ ان پر سچائی ظاہر ہو چکی ہے۔ مگر پھر بھی اس حسد کی وجہ سے جس کی جلن ان کے اندر ہے وہ پسند نہیں کرتے کہ تم راہ حق پر ثابت قدم رہو۔ پس چاہیے کہ (ان سے لڑنے جھگڑنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو اور) عفو و درگذر سے کام لو۔ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ہو جائے (اور وہ بتا دے کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پرست تھا) بلاشبہ وہ ہر بات پر قادر ہے اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔ اور (یاد رکھو) جو کچھ بھی تم اپنے لیے نیکی کی پونجی پہلے سے اکٹھی کر لو گے اللہ کے پاس اس کو موجود پاؤ گے (کوئی اچھا کام برباد نہیں ہوگا) تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش:

مجلس مبارک کے علاوہ مسلمانوں کے کسی مجمع میں شرکت کرتے تو کوشش کرتے تھے کہ ان کی پرانی دشمنی کی بجھی ہوئی چنگاریاں پھر کسی طرح بھڑک اٹھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اسلام کے طفیل میں جو محبت، موانست، یکجہتی اور باہمی اتحاد پیدا ہو گیا ہے وہ ختم ہو۔ ایک مثال ملاحظہ فرمایئے:

ایک موقع پر اوس اور خزرج کے حضرات کا اجتماع تھا۔ دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی وہاں موجود تھے۔ یہودیوں کا ایک سردار شماس بن قیس وہاں سے گذرا۔ ان دونوں قبیلوں کے لوگوں کا یہ دوستانہ اجتماع اس کو شاق گذرا۔ اس نے کچھ آدمیوں کو بھیج دیا کہ جنگ بعاث کا ذکر چھیڑ دیں جو ان قبیلوں کے درمیان بہت سخت ہوئی اور عرصہ تک چلتی رہی تھی اور قبیلہ ''اوس'' کا پلہ اس میں بھاری رہا تھا۔ چنانچہ شماس کے آدمیوں نے اس مجلس میں پہنچ کر اس لڑائی کا ذکر اس طرح چھیڑا کہ دونوں قبیلوں کے آدمی مشتعل ہو گئے اور اشتعال یہاں تک بڑھا کہ دونوں فریق جنگ کے لیے تیار ہو گئے سرور کائنات محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی تو آپ فوراً تشریف لے گئے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا۔ اور فرمایا ''میں زندہ موجود ہوں اور تم میری موجودگی میں لڑنے لگے۔''

حضرات انصار کے مبارک قلوب میں جو عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوزش پنہاں تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند عبرت آموز کلموں نے اس کو شمع سوزاں بنا دیا۔ غصہ اور جہالت کی تاریکی فوراً فنا ہو گئی۔ محبت کی رقت اور دل گیری پیدا ہوئی۔ اب ہر دو فریق کی زبانوں پر توبہ و استغفار کے جملے تھے۔ آنکھوں سے آنسو

جاری تھے اور گلے مل کر اس تلخی کو مٹا رہے تھے۔ (۵۳۵) ایسے ہی موقعوں کے لیے وحی الٰہی نے نصیحت فرمائی:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ تا فَقَدْ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (سورہ آل عمران ع ۹)

''اے مسلمانو! اہل کتاب میں ایک فریق (۵۳۶) ایسا ہے کہ اگر تم اس فریق کی بات مانتے رہو تو وہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا کر دے گا اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کی راہ اختیار کرو۔ جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ کی آیتیں تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور اس کا رسول تم میں موجود ہے (اور یاد رکھو) جو مضبوطی کے ساتھ اللہ کا ہو رہا تو بلاشبہ اس پر سیدھی راہ کھل گئی۔''

صحیح فیصلہ کرنے میں رکاوٹ ڈالنا اور ''کتمان حق'' کی شرمناک مثال:

یہود کے یہاں دولت کی کثرت تھی تو اس کا لازمی خاصہ یعنی زنا کا بھی بکثرت رواج ہو گیا تھا۔ زنا کی سزا توریت میں سنگساری مقرر کی گئی تھی لیکن امراء کو سزا دینے کے لیے بے لوث جرأت کی ضرورت تھی۔ یہود کے ''احبار و رہبان'' اس جرأت کو طماعی کے عوض فروخت کر چکے تھے۔ چنانچہ پہلے تو یہ رہا کہ کوئی غریب زنا کرتا تو اس پر توریت کا حکم نافذ کیا جاتا تھا اور امیر کے لیے کوئی حیلہ کر دیا جاتا جس سے وہ اس سزا سے چھوٹ جاتا تھا۔ اس پر اعتراض کیے گئے تو پھر علماء یہود نے اس سزا کو (توریت کی تصریح کے خلاف) بدل دیا صرف درہ مارنے کی سزا باقی رکھی۔ منہ کالا کر دیا جاتا تھا اور درے مار دیئے جاتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود میں زنا کا ایک مقدمہ چلا۔ ایک بڑے دولت مند پر الزام تھا۔ اس نے حسب معمول دولت خرچ کر کے سنگساری سے نجات حاصل کر لی۔ مگر فریق ثانی کا اصرار ہوا کہ توریت کا فیصلہ نافذ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مرافعہ (اپیل) دائر کر دیا۔ دوسری طرف سے بحث کے لیے خیبر کے بہت بڑے یہودی عالم ابن صوریا کو لایا گیا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ زنا کے متعلق توریت کا حکم کیا ہے۔ ابن صوریا نے جواب دیا کہ توریت کا حکم یہ ہے کہ کالا منہ کر کے تشہیر کریں اور درے لگائیں۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو توریت کے بہت بڑے عالم تھے مگر خدا ترس تھے اور اب اسلام سے مشرف ہو چکے تھے وہ بھی مجلس میں حاضر تھے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ ابن صوریا غلط کہتا ہے توریت میں صراحت موجود ہے کہ زانی کو سنگسار کیا جائے۔ ابن صوریا حجت کرنے لگا تو توریت منگوائی گئی۔ ابن صوریا کی شرمناک حرکت یہ تھی کہ حکم زنا کی آیت پر اس نے ہاتھ رکھ لیا اور آگے پیچھے کی آیتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاتھ ہٹاؤ اور یہ آیت پڑھو۔ آیت میں سنگساری کا حکم صاف تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت کے فیصلہ ہی کو نافذ فرمایا۔ مگر علماء یہود برہم ہو گئے اور ان کے ساتھ یہود کا

بدطینت طبقہ بھی برافروختہ ہوگیا۔ کتاب اللہ کی مندرجہ ذیل آیتوں میں یہود کی اسی بدطینتی اور کج طبعی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْباً مِنَ الْکِتَابِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتَابِ اللّٰہِ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِنْھُمْ وَھُمْ مُعْرِضُوْنَ (آل عمران ع ۳)

''(اے رسول) کیا آپ نے ان کی حالت نہیں دیکھی جنہیں کہ اب اللہ کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے (یعنی علماء یہود جورات دن تورات کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور بظاہر اس کو کتاب مقدس سمجھتے ہیں) انہیں خدا کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے کہ (یہ کتاب) ان کے درمیان فیصلہ کرے (اور جو اس کا واضح حکم ہے وہ نافذ کیا جائے لیکن عقیدہ تقدس کے بلند بانگ دعوی کے باوجود ہوتا یہ ہے) کہ ان کا یہ گروہ اس سے ہٹ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے (صرف فیصلہ سے نہیں بلکہ اصل کتاب اللہ سے) وہ منہ موڑے ہوئے ہیں۔''

اسی قسم کا ایک واقعہ قصاص کے سلسلہ میں بھی پیش آیا۔ یہود مدینہ کے دو قبیلے بنونضیر اور بنوقریظہ اگرچہ دونوں کا مذہب ایک تھا۔ ایک ہی نسل اور ایک ہی وطن سے ان کا تعلق تھا۔ مگر بنونضیر اپنے آپ کو بنوقریظہ سے بالا سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا کوئی آدمی بنوقریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون بہا صرف پچاس وسق (تقریباً دوسو ساٹھ من) کھجور دیا کرتے تھے اور کبھی بنوقریظہ کے کسی آدمی سے یہ جرأت ہو جاتی تھی کہ وہ بنونضیر کے کسی آدمی کو قتل کردے تو خون کا بدلہ خون لیا کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دور مسعود و مبارک میں ان قبیلوں میں قتل کا واقعہ پیش آ گیا انہوں نے سابق طریقہ کو رائج کرنا چاہا۔ مگر دوسرا فریق راضی نہ ہوا۔ علماء یہود نے یہ جھگڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کرنا چاہا۔ مگر اس وقت بھی ان کی خواہش یہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ ان کے دستور کے مطابق کریں ایسا نہ ہو کہ معاملہ زنا کی طرح یہاں بھی توریت کا حکم نافذ فرمادیں، جس میں تصریح ہے کہ جان کے بدلہ جان۔

اپنے اطمینان کے لیے علماء یہود نے درپردہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے معلوم کرنی چاہی کہ اگر فیصلہ ان کی خواہش کے مطابق ہوتو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اپیل دائر کریں۔

ابھی یہ معاملہ دربار رسالت میں پیش نہیں ہوا تھا کہ وحی الٰہی نے ان کے فریب کا پردہ چاک کرتے ہوئے ہدایت فرمادی۔

اگر آپ کے یہاں مقدمہ آئے اور آپ فیصلہ کرنا چاہیں تو آپ فیصلہ انصاف کے بموجب کریں۔ یہود کے خیالات وخواہشات کا لحاظ قطعاً نہ ہو ارشاد خداوندی تلاوت کیجئے:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ تا قوله تعالى فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ (سورہ مائدع ۶، ۷)

''یہ (علماء یہود) توریت کے کلموں کو باوجود یکہ ان کا صحیح محل ثابت ہو چکا ہے صحیح محل سے پھیر دیتے ہیں (اوران کا مطلب کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں) یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ (جو کچھ ہم نے تورات کا حکم بتا دیا ہے) اگر یہی حکم دیا جائے تو قبول کر لینا اور اگر یہ حکم نہ دیا جائے تو اس سے اجتناب کرنا۔ (نظر انداز کر دینا)''

اس کے بعد ارشاد ہے:

یہ لوگ جھوٹ کو کان لگا کر سنتے ہیں (غلط فتووٴں کے نذرانوں اور غلط فیصلوں کی رشوت کا مال حرام بے دھڑک کھاتے ہیں (اس کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے) (اے رسول) یہ لوگ اگر تمہارے پاس آئیں (اور اپنے قضیے تمہارے سامنے پیش کریں) تو (تمہیں اختیار ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کش ہو جاوٴ یہ تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر کنارہ کش نہ ہو اور فیصلہ کرو تو انصاف کے بموجب فیصلہ کرو (اور ان کی شرارتوں کی کچھ پرواہ نہ کرو) بلاشبہ انصاف کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے اور یہ لوگ کس طرح آپ کو منصف بناتے ہیں جب کہ ان کے پاس تورات موجود ہے۔ اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ تورات کے حکم سے روگردانی کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ ایمان سے محروم ہیں (نہ آپ پر ایمان ہے نہ اپنی کتاب تورات پر ان کا ایمان ہے۔)

اس کے بعد ارشاد ہے:

ہم نے یہودیوں کے لیے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم۔ پھر جو کوئی بدلہ لینا معاف کر دے تو یہ اس کے لیے (گناہوں کا) کفارہ ہوگا اور جو لوگ خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق حکم نہیں دیں گے تو ایسے ہی لوگ ہیں (صحیح معنی میں) ظالم۔

دوسروں کو حق پوشی (کتمان حق) کی تاکید اور اظہار حق پر ناراضگی و برہمی:

تورات کی جو باتیں یہودیوں کو معلوم تھیں اور اب ان کے علماء نے ان پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب اس طرح کی باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں اپنے علم اور وحی کے بموجب ارشاد فرماتے تو یہودی اس کی تصدیق کرتے اور یہ بھی کہہ بیٹھتے تھے کہ تورات میں بھی یہی ہے لیکن یہ اضطراری تصدیق احبار یہود کو ناگوار گذرتی تھی وہ اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے کسی ماننے والے کی زبان سے کوئی بات ایسی نکل

جائے جس سے کسی وقت مسلمان حجت پکڑ سکیں خواہ وہ بات کتنی ہی حق اور سچ ہو۔

پھر ان احبار اور علماء یہود کی کور باطنی اور کج فہمی کی انتہا یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ جہل اور حقائق کی پردہ پوشی عند اللہ بھی کامیاب ہوگی اور ہم جس چیز کو چھپالیں گے اللہ کے یہاں بھی ہم کہہ سکیں گے کہ ہمیں اس کا علم نہیں تھا۔

کتاب اللہ نے ان کی کج فہمی، کور باطنی اور ان کی پوشیدہ سرگرمیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا (تا) وَمَا یُعْلِنُوْنَ (سورہ بقرہ ع ۹)

''ان کا حال یہ ہے کہ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں (اور ان کی ایمان افروز باتیں سنتے ہیں تو بول اٹھتے ہیں) ہم بھی ایمان لائے ہیں (اور تصدیق کرتے ہیں کہ یہ باتیں ہماری کتابوں میں بھی ہیں) لیکن جب اکیلے میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جو کچھ خدا نے (تورات کا) علم دیا ہے وہ ان لوگوں پر کیوں ظاہر کرتے ہو۔ کیا اس لیے کہ وہ تمہارے برخلاف تمہارے پروردگار کے حضور اس سے دلیل پکڑیں۔ کیا (اتنی موٹی سی بات بھی) تم نہیں سمجھتے (اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں افسوس ان کے دعوائے ایمان و حق پرستی پر) کیا یہ علماء یہود نہیں جانتے کہ (معاملہ انسان سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے اور) اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی بات چھپی نہیں وہ جو کچھ چھپا رکھتے ہیں اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں وہ بھی اس کے سامنے ہے۔''

مشرکین کو اسلام سے روکنے کے لیے غلط بیانی:

اپنے حلقہ کے لوگوں کو جس طرح صحیح بات کے تسلیم کرنے سے روکتے تھے اس کی چند مثالیں (قرآن حکیم کے حوالہ سے) پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ مگر یہ عمل اپنے گروہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا حلقہ مشرکین میں اہل شرک کے مذاق کے مطابق اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے تھے مثلاً اسلام کے مقابلہ میں ان کے مذہب کی تعریف کرتے اور کہتے:

هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا (سورہ نساء ع ۹)

''مسلمانوں سے تو کہیں زیادہ یہی لوگ سیدھے راستے پر ہیں۔''

اسلام کے وقار اور اعتماد کو ختم کرنے کے لیے ایک راستہ یہ نکالا تھا کہ کچھ لوگ مسلمان ہوتے چند روز مسلمان رہتے۔ پھر (معاذ اللہ) مرتد ہو جاتے اور اسلام کی قباحتیں بیان کرنے لگتے قرآن حکیم نے اس تلبیس اور غلط کاری کو بھی بیان کر دیا ہے تاکہ آنے والے مسلمانوں کو بھی دشمنوں کے کید و مکر کا اندازہ رہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (سورہ آل عمران ع ۸)

''اور اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا مسلمانوں پر جو کچھ نازل ہوتا ہے تو اس پر صبح کو ایمان لے آؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ۔ شاید وہ (مسلمان) بھی اس طرح بد دل ہو جائیں اور پھر جائیں (اور اسلام کی عظمت اور اس کا وقار لوگوں کی نظر میں کم ہو)''

حق پرست علماء یہود

یہود کی قباحتوں اور اسلام دشمن حرکتوں کو بیان کرنے کے ساتھ حقیقت پسندی یہ تھی اور سچائی کا تقاضا یہ تھا کہ یہ بھی ظاہر کر دیا جاتا کہ ایک جماعت اگرچہ مختصر ہی تھی مگر وہ بھی تھی جس نے دین کو دنیا پر ترجیح دی تھی اس جماعت نے جیسے ہی سید العالمین کی ذات وصفات قدسیہ میں صداقت کی جھلک نمایاں پائی تھی وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئی تھی۔

قرآن حکیم جو حقائق کا مرقع ہے۔ اس کا اسلوب یہی ہے اس نے صرف اس مختصر ارشاد پر ہی قناعت نہیں کی کہ:

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ

بلکہ جہاں یہود کی قباحتوں اور ان کی بداعمالیوں کا ذکر کیا ہے اس حق پرست وانصاف پسند جماعت کے اعلیٰ کردار کو بھی بڑی شان سے نمایاں کیا ہے۔

سورہ نساء کے بائیسویں رکوع میں یہود کی اس جماعت کا تذکرہ نہایت سخت الفاظ میں کیا گیا ہے جو قتل انبیاء جیسے بدترین جرائم کی مرتکب ہوئی اور رشوت اور سود وغیرہ کی وہ عادی مجرم تھی۔ اسی کے ساتھ ایک مستثنیٰ جماعت کے متعلق یہ عظیم الشان تحسین بھی اسی رکوع میں موجود ہے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ تا اَجْرًا عَظِيْمًا

ترجمہ: لیکن ان میں سے جو لوگ علم میں پکے ہیں تو وہ اور مسلمان (ان گمراہیوں سے) الگ ہیں۔ یہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی ہے اور ان تمام کتابوں پر بھی جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں۔ یہ لوگ نماز قائم کرنے والے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں انہیں ہم عنقریب ان کا اجر عطا فرمائیں گے۔ ایسا اجر جو بہت ہی بڑا اجر ہوگا۔

سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں بلند ترین معجزانہ انداز میں دانشمند اہل ایمان کی خصوصیات اور ان کے عظیم الشان اجر وثواب کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ آخر میں صاحب ایمان اہل کتاب کی تحسین اور حوصلہ افزائی

بھی ان کلمات طیبات میں فرمائی گئی ہے:

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ تا اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ

''اور یقیناً اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ان پر نازل ہو چکا ہے سب پر ان کا ایمان ہے۔ ان کے دل اللہ کے آگے جھکے رہتے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے کہ دنیا کی حقیر دولت کے بدلے خدا کی آیتیں فروخت کر ڈالیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے پروردگار کے حضور ان کا اجر ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔''

سورہ آل عمران کے آٹھویں رکوع میں ان متعصبین کا ذکر ہے جو غیر یہودی کے مال کو جس طرح ان کو مل جائے حلال اور جائز سمجھتے تھے۔ اگر ایک روپیہ بھی کسی غیر یہودی کا ہوتا تو اس کو شدید تقاضوں کے بغیر ادا نہیں کرتے تھے۔ اس آیت کے شروع میں ان اہل کتاب کی تعریف فرمائی گئی ہے جو ادائیگی میں دیانت دار ہیں۔ بڑی سے بڑی رقم بھی وہ دیانت داری سے ادا کر دیتے ہیں۔ ارشاد ہے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ اِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ

''کچھ ایسے دیانت دار بھی ہیں کہ اگر چاندی سونے کا پورا ڈھیر بھی ان کے پاس چھوڑ دو تو وہ خیانت نہ کریں اور پورا پورا ادا کر دیں۔''

مختصر یہ کہ جب بھی یہود کی برائی کی جائے قرآن پاک کی تعلیم یہ ہے کہ جو یہودی قابل تعریف تھے ان کی تعریف بھی کی جائے اور جماعت یہود پر جو الزامات ہیں ان سے انہیں مستثنیٰ سمجھا جائے۔

یہود کی طرف سے عہد شکنی اور جنگ کے لیے تیاری

یہودیوں کی یہ تمام گستاخیاں، تمرد اور سرکشی اور غیر معمولی رعایتوں کے جواب میں غیر معمولی دیدہ دلیری سینہ زوری اور ایذا رسانی دعوت اسلام کی راہ میں مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔ مگر حق وصداقت کے راستہ میں ایسی مشکلات لازمی ہیں۔ داعی حق کا فرض ہے کہ ضبط وتحمل سے ان کو برداشت کرے۔ اگر مشکلات نہ ہوں تو دعوت و تبلیغ کے فضائل ہی ختم ہو جائیں اور جوہر صبر واستقامت کی ساری چمک دمک ماند پڑ جائے۔ اس طرح کی ایذا رسانیوں کے متعلق وحی الٰہی کی واضح ہدایت اس وقت بھی یہ تھی اور اب بھی یہی ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ (تا) مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (سورہ آل عمران ع ۱۹)

''یہ یقینی اور ضروری بات ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ اور یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے تمہیں دکھ پہونچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں اگر تم نے صبر (ضبط وتحمل اور برداشت) سے کام لیا اور تقویٰ اور پرہیزگاری کی

راہ چلتے رہے تو بیشک یہ ایسا کام ہوگا کہ ایسے کاموں کو بڑی ہمت کے کام کہا جاتا ہے۔''
چنانچہ یہود کی طرف سے یہ تمام تکلیف دہ، دل شکن اور روح فرسا حرکتیں ہوتی رہیں مگر نہ ان کو عہد شکنی قرار دیا گیا اور نہ ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کی گئی لیکن غزوہ بدر کے بعد اس تمرد اور ایذاء میں بغاوت اور عہد شکنی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ بغاوت اور عہد شکنی کے جواب میں خاموشی اور چشم پوشی نہ صرف سیاسی جرم ہے بلکہ اخلاقی نقطہ نگاہ سے بھی جرم عظیم ہے۔ کیونکہ اس سے معاہدہ کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔ مجرم کو جرم کرنے کی چھوٹ دے دینا خود جرم ہے۔ عہد شکنی ایک فساد ہے اور فساد جہاں بھی پیدا ہو اس کو روکنا فرض ہے۔ البتہ تقاضاء عدل و انصاف یہ ہے کہ سزا صرف مفسد کو دی جائے۔ اگر مذہب، وطن یا نسل کے نام پر غیر مفسدوں کو بھی سزا کے شکنجہ میں کس لیا جائے تو اس کو وحشت و بربریت کہا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ یہود کے ایک قبیلہ بنو قینقاع کی طرف سے کھلی ہوئی عہد شکنی ہوئی تو داروگیر اور سزا بھی اسی کی حدود تک محدود رکھی گئی۔ یہود کے دیگر قبائل اسی طرح محفوظ اور مامون رہے جیسے اب تک تھے۔ اب تفصیل ملاحظہ فرمایئے:
(۱) قریش کی پالیسی یہ تھی کہ ایسی صورت پیدا کی جائے کہ خود مدینہ کے باشندے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیں یا اپنے یہاں سے نکال دیں۔ چنانچہ بہت تفصیل سے گذر چکا ہے کہ جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں سکونت پذیر ہوئے تو قریش نے عبداللہ بن ابی بن سلول کے نام خط لکھا تھا جس میں مشرکین مدینہ (اوس اور خزرج) سے مطالبہ کیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نکال دو یا قتل کر دو ورنہ ہم مدینہ پہنچ کر تمہارے جوانوں کو قتل کر دیں گے اور عورتوں کو باندیاں بنا لیں گے۔ (وغیرہ وغیرہ)
لیکن چونکہ ان دونوں قبیلوں کے سنجیدہ افراد خصوصاً نوجوانوں کی بڑی تعداد دائرہ اسلام میں داخل ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جاں نثار و جاں باز خادم بن چکی تھی، تو عبداللہ بن ابی اور اس کے ہم نوا سرداروں کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ قریش کی فرمائش پوری کریں۔ کیونکہ فرمائش کی تکمیل جنگ کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی اور اگر جنگ ہوتی تو مقابلہ میں خود ان کے عزیز و اقارب اور خود ان کے جگر پارے آتے۔
غزوہ بدر کے بعد قریش نے اپنے اس منصوبہ کو دوبارہ زندہ کیا اور اب یہود کے سرداروں کو یہ تہدید آمیز خط بھیجا۔

انکم اهل الاسلحة والحصون وانکم لتقاتلن صاحبنا او لنفعلن کذ او کذا ولا یحول بیننا وبین خدم نساء کم شئی من الخلائل

''آپ لوگ اسلحہ اور قلعوں کے مالک ہیں ضروری ہے کہ آپ لوگ ہمارے حریف (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کریں ورنہ ہم تمہارے ساتھ جو کچھ کر سکیں گے کریں گے (انتہا یہ کہ تمہاری عورتوں کو ذلیل کریں گے) اور کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جو ہمارے اور تمہاری عورتوں کے پیروں کے زیور (پازیبوں) میں حائل ہو سکے۔ (یعنی ان کی ٹانگیں

کھینچیں گے اور آبروریزی کریں گے۔،،(۵۴۰)

یہودی اور ان کی ٹیڑھی گردن والے رئیس اور ان کے ہٹ دھرم علماء اور گستاخ نوجوان جو بارگاہ رسالت کی مہذب مجلسوں میں شوخیوں سے باز نہ آتے تھے۔ اگر ان میں کچھ غیرت ہوتی تو وہ اس توہین آمیز دھمکی کا جواب دینے کے لیے ان مسلمانوں اور ان کے ہادی اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے رابطہ مضبوط کرتے جو ہر طرح ان کی دلداری اور رعایت میں مصروف تھے اور ان کے اعزاز میں کمی نہیں کر رہے تھے اور اگر انہوں نے چشم عبرت پر سیاہ پٹی نہ کس لی ہوتی تو قریش کو جواب دینے کے لیے خود قریش کا حشر سامنے تھا جو غزوہ بدر میں بھگت چکے تھے۔ وحی رحمانی نے اشارہ بھی کر دیا تھا:

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا (آل عمران ۶ ۳)

مگر یہ دولت کے پجاری جن کے نزدیک سب سے بڑی عزت بھرپور تجوری تھی۔ وہ اپنی خودداری اور غیرت کا دیوالیہ پہلے ہی نکال چکے تھے۔ غالبًا یہی سبب تھا کہ قریش نے ان کو اس ڈھنگ سے خطاب کیا اور اگرچہ ان کے پاس دولت کے انبار تھے، جگہ جگہ تجارتی کوٹھیاں بھی تھیں۔ مگر جہاں تک حجاز عرب کی سیاست کا تعلق تھا وہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کے مصداق تھے۔ وہ اسی پر آپے سے باہر ہو گئے کہ قریش مکہ نے ان کو خطاب سے نوازا۔ گویا یثرب کی سیاست کا نیا نقشہ یہود کے سامنے آ گیا کہ قریش کی مدد سے مسلمانوں کو ختم کریں اور اس علاقہ کے تنہا حکمران (۵۴۳) بن جائیں۔

(۲) بدقسمتی یہ تھی کہ ان سرمایہ داروں کو اپنی بہادری کا بھی زعم تھا۔ چنانچہ غزوہ بدر کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار قینقاع میں یہود کی ایک کانفرنس کی اور بہت ہی خیر خواہانہ انداز میں ان کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے بڑی تلخی سے جواب دیا تھا۔

> محمد (فداہ روحی) اس سے دھوکہ نہ کھاؤ کہ قریش کو شکست دے دی ہے۔ قریش کو جنگ کا تجربہ نہیں تھا ہم سے مقابلہ ہوا تو ہم بتا دیں گے کہ جنگ کسے کہتے ہیں جنگجو کیسے ہوتے ہیں۔ (۵۴۴)

(۳) جبکہ خود یہود کا جذبہ یہ تھا تو قریش کا یہ خط ان کی نظر میں گویا ایک تائید غیبی تھا۔ انہوں نے خط کے تلخ لہجہ کو بھی شیر مادر سمجھا اور لبیک کہنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ امام المغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت (۵۴۵) یہ ہے:

فدسوا الی قریش وحضوهم علی قتال رسول الله صلی الله علیه وسلم ودلوهم علی العورة

> ''انہوں نے قریش کے ساتھ ساز باز شروع کر دی ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور پوشیدہ راز ان کو بتائے۔''

(۴) آمادہ کرنے کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو ارباب تاریخ اور اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ غزوہ بدر کے بعد کعب بن الاشرف مکہ معظمہ پہنچا۔ مقتولین بدر کی تعزیت کی، ان کے غم میں مرثیے لکھے، وہ مکہ کے لوگوں کو جمع کر کے یہ مرثیے پڑھتا تھا، خود بھی روتا تھا ان کو بھی رلاتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ ستر (۵۴۷) نمائندے بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں قریش اور یہود میں یکجہتی پیدا کرنے کے لیے اپنے آدمیوں کو یہ سمجھاتا۔

هٰٓؤُلَاۤءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا (سورہ نساء)

''مسلمانوں کی بہ نسبت ان (مشرکین مکہ) کا راستہ زیادہ سیدھا ہے اور یہ لوگ زیادہ ہدایت یافتہ اور راہ راست پر ہیں۔''

اور اگر چہ اپنے عقیدہ کے لحاظ سے احترام کعبہ کا قائل نہیں تھا۔ مگر قریش کے دلوں کو موہنے کے لیے ان کے ساتھ کھڑے ہو کر کعبہ شریف کا پردہ تھاما اور عہد کیا کہ (۵۴۸) بدر کا انتقام لیں گے۔

(۵) ان برخود غلط آبرو باختہ یہود کو اکسانے اور در پردہ ان کی امداد کے لیے مدینہ کے وہ مار آستین بھی پر تولے ہوئے تھے جن کے دل نفاق کے زہر میں ڈوبے ہوئے تھے۔

(۶) یہود اور منافقین کی ساز باز سے خاص مدینہ میں یہ حالت ہوگئی کہ جان دو عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جان کا خطرہ رہنے لگا۔ صحابہ کرام خاص خیال رکھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تنہا تشریف نہ لے جائیں اور رات کے وقت تو یہ بھی مناسب نہ سمجھتے تھے کہ اپنے خاص حلقہ سے باہر قدم رنجہ فرمائیں۔

ایک جاں نثار (۵۴۹) حضرت طلحہ بن براء رضی اللہ عنہ کی وفات ہونے لگی تو آپ نے وصیت کر دی کہ اگر میری روح رات کو قبض ہو تو خود ہی نماز (۵۵۰) پڑھ کر دفن کر (۵۵۱) دینا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ آپ تشریف لائیں اور نصیب دشمناں یہود کی طرف سے کوئی حادثہ آپ پر گذر جائے۔

یہ حرکتیں ایسی تھیں جن کی بناء پر تمام معاہدے منسوخ کیے جا سکتے تھے لیکن سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اقوال و اعمال۔ قانون قدرت کے مظہر ہوتے تھے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَوۡ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلۡمِهِمۡ (تا) وَلَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ (سورہ نحل ع ۷)

''اگر ایسا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے ظلم پر (فوراً) پکڑ لیا کرتا (اور ہاتھ در ہاتھ ان سے مواخذہ کیا کرتا) تو ممکن نہیں تھا کہ سطح زمین پر حرکت کرنے والی کوئی ایک ہستی بھی باقی رہ جاتی لیکن وہ انہیں ایک خاص ٹھہرائے ہوئے وقت تک ڈھیل دیتا ہے۔ جب وہ مقرر وقت آ پہنچا تو نہ ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں۔''

بنوقینقاع کی عہد شکنی اور بغاوت

پہلے گزر چکا ہے کہ غزوہ بدر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار قینقاع کے اجتماع میں جب یہود کو دعوت دی تھی کہ ''اسلام کی مشترک اور مساوات پسند برادری میں داخل ہو جاؤ'' تو یہود نے نہایت بے باکی اور بے ادبی سے جواب دیا تھا کہ ''جنگ بدر کی کامیابی سے آپ دھوکا نہ کھائیں۔ ہم سے اگر مقابلہ ہوا تو ہم بتائیں گے کہ جنگ کسے کہتے ہیں اور جنگجو کیسے ہوتے ہیں'' اب یہود کی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ یہ مقابلہ جلد ہو اور مسلمانوں کو اتنی مہلت نہ دی جائے کہ وہ زیادہ مضبوط ہو سکیں۔ چنانچہ غزوہ بدر کے بعد ابھی ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ بقول ابن سعد ماہ شوال (۵۵۲) کے نصف پر (تقریباً ۱۵ شوال) انہوں نے علم بغاوت بلند کیا اور عہدنامے کے پرخچے اُڑا دیے۔

فلما كانت وقعة بدر اظهروا البغي والحسد ونبذوا العهد والمرة (طبقات ابن سعد ص ۱۹ ج ۳)

''جب بدر کا واقعہ ہو چکا تو ان لوگوں نے بغاوت اور حسد کا اظہار کیا اور عہد و پیمان کو پھینک مارا''

واقعہ کی ابتداء ایک انصاری خاتون کی سربازار بے حرمتی سے ہوئی۔ یہ خاتون دودھ فروش تھی۔ بازار قینقاع میں دودھ فروخت کرنے گئی تھی۔ وہ ایک سنار کی دکان پر بیٹھی ہوئی تھی کہ چند یہودیوں نے اس سے منہ کھولنے کی فرمائش کی اور اس پر اصرار کیا۔ اس عورت نے بے حجاب ہونے سے انکار کیا تو سنار نے پیچھے سے اس کے کپڑے کچھ اس طرح اُلجھا دیے کہ جب وہ کھڑی ہوئی تو برہنہ ہوگئی۔ عورت اس شرمناک حرکت پر چیخ اُٹھی۔ قریب ہی کوئی مسلمان تھا۔ وہ عورت کی چیخ و پکار سن کر موقع پر پہنچ گیا۔ اسے غیرت (۵۵۴) آئی اس نے یہودی سنار کو زدوکوب کیا اتفاق سے وہ مر گیا۔ یہودی جو پہلے سے بھرے بیٹھے تھے جمع ہوئے اور انہوں نے اس مسلمان کو شہید کر دیا۔

مسلمان کا فعل اضطراری تھا۔ اگر شورش اور ہنگامہ برپا کرنا مقصود نہ ہوتا تو یہود ''مقتول سنار'' کی دیت کا مطالبہ (۵۵۵) کر سکتے تھے لیکن انہوں نے قانون ہاتھ میں لیا اور بلوہ کی صورت پیدا کر کے مسلمان کو قتل کر دیا۔ معاملہ آگے بڑھا تو خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے گئے۔ گفتگو فرمائی تو جواب نہایت تلخ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھانے کی کوشش فرمائی۔ یہ حقیقت بھی سامنے رکھی کہ آپ جان بوجھ کر میری مخالفت کر رہے ہیں۔ خود آپ کی کتابوں سے میری نبوت اور رسالت ثابت ہے لیکن آپ لوگوں کی ضد ہے کہ حق بات نہ مانی جائے۔ یہود نے نہایت توہین کے ساتھ وہی جواب دہرا دیا جو پہلے اجتماع کے موقع پر کہہ چکے تھے۔

يا محمد! انك ترى ان قومك لا يغرنك انك لقيت قوما لاعلم لهم بالحرب فاصبت منهم فرصة انا والله لئن حاربنا لتعلمن انا نحن الناس (سیرۃ ابن ہشام ص ۵۶ ج ۲)

محمد (فداہ روحی)! تم سمجھ لو۔ تم اپنی قوم سے فریب میں مبتلا نہ ہو جانا تم نے ایسی قوم کو شکست دی ہے جو جنگ سے واقف نہیں ہے۔ ان کی ناواقفیت سے ایک موقع تمہیں مل گیا۔ یاد رکھو! ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں ہم تم سے جنگ کریں گے تو اس وقت یہ حقیقت ضرور تمہارے سامنے آئے گی کہ بے شک آدمی ہم (قینقاع والے) ہی ہیں۔

یہود بنی قینقاع نے اس جواب پر بھی کفایت نہیں کی بلکہ بقول ابن سعد جنگ شروع کر دی اور اپنی حفاظت کے لیے قلعہ بند ہو گئے۔

جب اعلانِ جنگ یا آغازِ جنگ کے بعد قلعہ میں محفوظ ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی اقدام (۵۵۶) ضروری ہو گیا۔ آپ نے مدینہ کے انتظامات حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر عمری (رضی اللہ عنہ) کے سپرد کیے اور خود مسلمانوں کی جمعیت لے کر بنوقینقاع پہنچے اور ان کے قلعہ کا (۵۵۷) محاصرہ کر لیا۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو علم بردار بنایا۔ پندرہ روز تک محاصرہ رہا اور بروایت ابن سعد یکم ذی القعدہ کو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنوقینقاع نے ہتھیار ڈال دیے۔

نصرت بالرعب:

بن قینقاع کو اپنی بہادری پر اگر ناز تھا تو بے جا نہیں تھا وہ واقعی بہادر تھے۔ چنانچہ ابن سعد وغیرہ مؤرخین نے اعتراف کیا ہے کانوا اشجع یھود (یہود میں سب سے زیادہ بہادر تھے) مگر عجیب بات یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محاصرہ کیا تو ایک دفعہ بھی ہمت نہ ہوئی کہ مسلمانوں پر حملہ کریں اور حصار سے باہر قدم رکھیں۔ غزوہ بدر میں اگرچہ قریش کے ستر آدمی مارے گئے تھے مگر انہوں نے چودہ مسلمانوں کو بھی شہید کر دیا تھا۔ مگر قریش کو ناتجربہ کار اور جنگ سے ناواقف کہنے والے بنوقینقاع کسی ایک مسلمان کی نکسیر بھی نہیں پھوڑ سکے۔ اپنے گھروں میں ڈرے سہمے بیٹھے رہے۔ آخرکار یکم ذی قعدہ ۲ھ کو اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دیا۔

یہود بنوقینقاع کے اس طرح مفلوج اور عاجز ہو جانے کا سبب یہ ہے کہ جس نبی برحق کو اللہ تعالیٰ نے رحمت عالم بنایا تھا اس کو وقار اور حق پرستی کی وہ شوکت و حشمت بھی عطا فرمائی تھی جو مخالف کو مرعوب اور ہیبت زدہ کر دیتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا اظہار فرمایا ہے کہ نصرت بالرعب مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ نصرت عطا فرمائی ہے کہ دشمن مرعوب اور ہیبت زدہ ہو جاتا ہے۔

فیصلہ:

غداروں کی سزا قتل ہو سکتی تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ قتل کی سزا دی نہ قید و بند یا غلام بنانے کی بلکہ فیصلہ یہ فرمایا کہ وہ مدینہ چھوڑ دیں اور کسی اور جگہ چلے جائیں۔ چنانچہ وہ اذرعات (۵۵۸) چلے گئے جو شام

کے علاقہ میں ہے۔ یہ سات سو آدمی تھے جن میں تین سو زرہ پوش تھے۔ (۵۵۹) چونکہ ان کے یہاں زیورات کا کام ہوتا تھا تو ان کے باغات یا کھیت نہیں تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کو کوئی جائیداد نہیں ملی۔ البتہ قلعہ میں بہت سا اسلحہ محفوظ تھا وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ کچھ زیور بنانے کے اوزار (آلات الصیاغہ) ہاتھ آئے اسی طرح کا کچھ اور سامان تھا وہ ضبط کیا گیا اور غنیمت کے اصول کے بموجب مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اسلحہ اپنے لیے منتخب فرمائے۔ ابن سعد نے ان کی مندرجہ ذیل تفصیل دی ہے۔

کمانیں ۳، جن میں سے ایک کا نام کتوم تھا جو اگلے سال جنگ اُحد میں ٹوٹ گئی۔ دوسری کا نام روحاء تیسری کا نام بیضاء۔

ذرہیں ۲، ایک کا نام صغدیہ، دوسری کا نام فضہ۔
تلواریں ۳ قلعی، بتار، تیسری کا نام معلوم نہیں۔
نیزے ۳۔

سریہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور قتل کعب بن اشرف

سلسلہ واقعات کا تقاضا ہے کہ سریہ (۵۶۰) محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ بھی اسی موقع پر کر دیا جائے۔ اگر چہ سرایا کی پوری تفصیل کسی اور موقع پر کی جائے گی۔ (انشاءاللہ)

حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں یہ سریہ کعب بن اشرف پر حملہ آور ہوا تھا اور رات کو قلعہ میں پہنچ کر اس کو قتل کیا تھا۔

کعب مذہباً یہودی تھا لیکن رشتہ اور قرابت کے لحاظ سے اس کا تعلق عرب سے بھی تھا اور یہود سے بھی۔ اس کا باپ ''اشرف'' نسلاً عرب تھا اور اس کی ماں ''عقیلہ'' عرب کے مشہور سیٹھ یا راجہ ابوالحقیق کی بیٹی تھی۔

اشرف کا خاندانی تعلق ''بنی نبہان'' سے تھا جو قبیلہ ''طے'' کی ایک شاخ ہے۔ جس طرح قبیلہ طے کے کچھ آدمی عیسائی (۵۶۱) ہو گئے تھے اشرف نے مذہب ''یہود'' اختیار کر لیا تھا۔ پھر اس نے وہاں ایک قتل کر دیا اور جب اپنی جان کا خطرہ ہوا تو بھاگ کر یثرب آ گیا تھا۔ یہاں آ کر یہود بنی نضیر اور بنو قریظہ کا حلیف بن گیا اور سودی کاروبار شروع کر دیا۔ پھر رفتہ رفتہ اتنی دولت اور شہرت حاصل کر لی کہ خیبر کے سردار ابوالحقیق کی لڑکی سے نکاح کر لیا جس کے بطن سے کعب پیدا ہوا۔ (۵۶۲)

اشرف نے اپنی اولاد کی شادیاں یہود کے علاوہ عرب قبائل میں بھی کیں۔ (۵۶۳) اس طرح اس کے تعلقات عرب اور یہود دونوں میں وسیع ہو گئے۔

کعب بن اشرف جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے مالدار باپ کا بیٹا تھا۔ شاعر تھا۔ قیادت اور لیڈری کا شوق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے تعلقات اور زیادہ وسیع کیے۔ سودی کاروبار سے دولت بڑھائی، نام پیدا کرنے اور اثر

جمانے کے لیئے مدرسوں کی امدادیں جاری کیں اور یہودی علماء کے وظائف مقرر کیے، سونے پر سہاگہ شاعری کے ذوق نے اس کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔

لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ پہلے دن سے اسلام کا دشمن تھا۔ مدینہ میں اسلام کی ترقی اس کے لیے ایک خار تھا جس کی خلش سے ہر وقت بے تاب رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت سے وہ علماء یہود بھی متاثر ہوئے جو کعب کے وظیفہ خوار تھے لیکن جب یہ علماء اپنے وظائف لینے آئے تو کعب بن اشرف نے ان کو برگشتہ کر دیا اور جب تک ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر آمادہ نہیں کر لیا ان کی تنخواہیں جاری (۵۶۴) نہیں کیں۔

اسلام کے خلاف یہود کی حرکتیں جن کا تذکرہ آیات کتاب اللہ کے حوالہ سے پہلے گزر چکا ہے ان کی ڈور اسی کے ہاتھ میں رہتی تھی یہی کہا کرتا تھا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ (۵۶۵) (سورہ آل عمران) یعنی ان اُمیوں کا مال جس طرح چاہو ہضم کر لو۔ کوئی گناہ نہیں ہے۔

وہ ڈرامہ اسی کے اشارے پر کھیلا جاتا تھا کہ کچھ یہودی مسلمان ہوگئے اور چند روز کے بعد معاذ اللہ منحرف ہو کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ (۵۶۶)

غزوہ بدر میں مسلمانوں کی فتح اس کے لیے سانحہ عظیم تھی جیسے ہی اس کو مسلمانوں کی فتح اور سردارانِ قریش کے قتل کی خبر پہنچی بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:

لبطن الارض خیر من ظھرھا (۵۶۷) "پشت زمین کے اُوپر رہنے سے زمین میں گڑ جانا بہتر ہے۔"

پھر اسی بوکھلاہٹ میں وہ مکہ پہنچا، کم وبیش ستر آدمیوں کو اپنے ساتھ لے گیا، وہاں پہنچ کر مقتولین بدر کی تعزیت کی، ان کے مرثیے کہے، لوگوں کو جمع کر کے ان مرثیوں کو سناتا تھا، خود روتا تھا، دوسروں کو رلاتا اور مشتعل کرتا تھا۔ (۵۶۸) یہود اور مشرکین مکہ کے گٹھ جوڑ کے لیے ان کے مذہب کی تعریف کرتا تھا۔ ان کو اطمینان دلاتا تھا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تم راہ راست پر ہو۔ (۵۶۹) ان کے ساتھ خانہ کعبہ میں پہنچتا اور مکہ مکرمہ کے پردے تھام کر عہد کرتا کہ بدر کا انتقام لیں (۵۷۰) گے۔ انتہا یہ کہ تاریخ وسیرت کے دو امام موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق ان کی شہادت یہ ہے:

لم یخرج من مکة حتی اجمع امرھم علی قتال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم

مکہ سے نہیں نکلا جب تک ان کو اس بات پر متفق نہیں کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کریں گے۔

پھر ان دونوں اماموں کی متفقہ روایت ہے کہ:

قدم المدینة یعلن بالعداوة ویحرض الناس علی الحرب

مدینہ واپس پہنچا تو کھلم کھلا عداوت کا اظہار کرتا تھا اور لوگوں کو جنگ پر آمادہ کرتا تھا۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ کھانا پکوا کر دعوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدعو کیا اور اس کا انتظام کر دیا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو ان کو شہید کر دیا جائے۔ (۵۷۳)

اسی عداوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا۔ ان اشعار میں مسلمانوں کی محترم خواتین کی ناموس پر حملے کرتا تھا۔ اس زمانہ میں پریس نہیں تھا البتہ شعراء پریس کی طاقت رکھتے تھے۔ شعر کا ذوق عرب میں عام تھا۔ کوئی شاعر کسی کی ہجو یا مدح میں شعر کہتا تو وہ بچہ بچہ کی زبان پر ہو جاتا تھا۔ ہمارے زمانہ کے پوسٹر اور پمفلٹ وہ کام نہیں کرتے جو اس زمانہ میں شعراء کے اشعار اثر پیدا کر دیا کرتے تھے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ یہود، مشرکین مکہ اور منافقین یثرب کے گٹھ جوڑ سے مدینہ کی فضا اتنی خطرناک ہو گئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان عزیز و مقدس کے متعلق ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔

فیصلہ:

اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خود کعب بھی کسی معاہدہ میں شریک تھا۔ البتہ اس لحاظ سے شریک ضرور تھا کہ یہ بنو نضیر کا حلیف تھا پس اس کی ذمہ داری بنو نضیر پر آتی تھی کہ وہ اس کو ان حرکتوں سے روکیں، لیکن روکنے کے بجائے وہ اس کے شریک رہے۔ پھر ابو جہل کا جو خط آیا وہ بھی اسی قبیلہ کے سرداروں کے نام تھا۔ (۵۷۴) یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے موقع تھا کہ وہ پورے قبیلہ کے معاہدہ کو منسوخ کر دیتے اور بنو قینقاع کی طرح بنو نضیر کو بھی مدینہ بدر کر دیتے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت عامہ نے ابھی اس کی اجازت نہیں دی۔ آپ نے صرف ان کے حلیف اور رئیس کعب بن اشرف کے خاتمہ کا فیصلہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من لی لکعب بن اشرف فانه قد اذی الله ورسوله

''کعب بن اشرف کی ذمہ داری کون لیتا ہے وہ اللہ اور رسول کی ایذاء (۵۷۵) حد کو پہنچا چکا ہے۔''(۵۷۶)

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ایسے موذی کو ختم کرنے کے لیے میں تیار ہوں۔ (۵۷۷)

ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت ذمہ داری لے لی۔ مگر پھر حالت یہ ہوئی کہ کھانا پینا بند ہو گیا۔ تین دن اس طرح گزر گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے طلب فرما کر فاقہ کا سبب معلوم کیا۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا مجھے فکر ہے کہ میں یہ خدمت کس طرح انجام دے سکوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا تمہارا کام کوشش کرنا ہے۔ (۵۷۸) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اپنے قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے بھی مشورہ کر لو۔ (۵۸۰)

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیے میں اس سے ذو معنی بات کہہ سکوں۔ فرمایا: اجازت ہے۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے قبیلہ (اوس) کے چند اور دوستوں کو ساتھ لیا جو

کعب بن اشرف سے تعارف اور تعلق رکھتے تھے۔ان کے نام یہ ہیں:

(۱) سلکان بن سلامہ بن وقش۔ان کی کنیت ابونائلہ تھی۔انہوں نے اسی دایہ کا دودھ پیا تھا جو کعب بن اشرف کی دایہ رہی تھی (۲) عباد بن بشر بن وقش (۳) حارث بن اوس بن معاذ (۴) ابوعبس بن جبر (۵۸۱)

کعب بن اشرف کا محل ایک قلعہ تھا۔اس کے باقاعدہ دربان اور چوکیدار مقرر تھے۔وہاں پہنچنا مشکل تھا اور ہتھیار لے جانا تو ممکن ہی نہیں تھا۔اب پہلا کام یہ تھا کہ اسلحہ اندر لے جانے کی صورت پیدا کریں۔یہ طے ہوا کہ کعب بن اشرف کے پاس پہنچ کر قرض کی بات چیت کریں کہ وہ اسلحہ رہن رکھ لے اور قرض دے دے۔

گفتگو:

یہ حضرات پہنچے،گفتگو کی۔بات چیت سنئے اور اس یہودی مہاجن کی ذہنیت کا اندازہ کیجیے۔اسی سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان مہاجنوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے اتنی عداوت کیوں تھی۔

محمد بن مسلمہ اور ان کے رفقاء: یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے صدقہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ہمیں تھکا دیا (۵۸۲) ہے ہم آپ کے پاس قرض کے لیے آئے ہیں۔

کعب بن اشرف: اُکتا گئے؟ خدا کی قسم اور اُکتاؤ گے۔

محمد بن مسلمہ: ہم ان کے پیچھے لگ لیے ہیں۔اب جب تک نتیجہ (۵۸۳) سامنے نہ آئے چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔آپ ہمیں ایک دو وسق (۵۸۴) قرض دے دیجیے۔

کعب بن اشرف: اچھا قرض دے دوں گا۔کوئی چیز رہن رکھ دو۔

محمد بن مسلمہ: کیا چیز۔

کعب بن اشرف: اپنی عورتیں رکھ دو۔

محمد بن مسلمہ: عورتیں! آپ عرب کے سب سے زیادہ جمیل وحسین انسان ہیں۔ہماری عورتیں آپ کو دیکھیں گی تو لٹو ہو جائیں گی پھر ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔کبھی قابو میں نہیں آئیں گی۔

کعب بن اشرف: اچھا لڑکے رہن رکھ دو۔

محمد بن مسلمہ: سیٹھ جی ہماری عزت وآبرو کا خیال کرو۔اپنے لڑکوں کو رہن رکھ دیں گے تو ہمیشہ کے لیے ہماری ناک بھی کٹ جائے گی اور ان لڑکوں کی بھی۔جہاں کوئی بات ہوا کرے گی لوگ لڑکوں کو طعنہ دیا کریں گے۔تم وہی ہو جو وسق کے بدلے میں گروی پڑے رہے تھے۔یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہوگی۔مہربانی فرما کر ایسا کیجیے،ہم اپنے ہتھیار لاتے ہیں وہ گروی رکھ لیجیے۔آپ کو خود اندازہ ہے آج کل ہتھیار کی کیسی ضرورت ہے۔

کعب بن اشرف: اچھا ہتھیار لے آؤ۔کب لاؤ گے؟

محمد بن مسلمہ: آج ہی رات کو لے آئیں گے۔

بہر حال یہ طے ہو گیا کہ رات کو ہتھیار لائیں گے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ حضرات رات کو ہتھیار لے کر پہنچے۔ کعب بن اشرف اندر زنانخانہ میں تھا اس کو آواز دی۔ اس نے نئی شادی کی تھی اس کی بیوی کا نام تو معلوم نہیں ہو سکا۔ مگر خود کعب بن اشرف کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ بہت نازک اور نفاست پسند تھی۔ ہر وقت عطر میں بسی رہتی تھی۔

کعب بن اشرف آواز سن کر باہر آنے لگا تو بیوی نے منع کیا کہ اس وقت باہر نہ جاؤ۔ آپ جیسے نامی گرامی آدمی کے لیے ہزار خطرے رہتے ہیں۔ کعب بن اشرف نے جواب دیا محمد بن مسلمہ اور ابونائلہ ہیں دونوں میرے رشتہ دار (۵۸۵) ہیں۔ بیوی نے پھر کہا کہ مجھے تو یہ آواز ایسی معلوم ہوتی ہے کہ اس سے خون ٹپک (۵۸۶) رہا ہے۔

کعب بن اشرف: نہیں کوئی پرواہ کی بات نہیں ہے اور اگر خطرہ بھی ہو تو بہادر خطرہ سے نہیں ڈرا کرتے۔ بہادر کو رات کے وقت بھی جنگ کے لیے بلایا جائے تو وہ فوراً لبیک کہتا ہے۔ اچھا میں ہتھیار لگائے لیتا ہوں۔ کعب بن اشرف مسلح ہو کر باہر آیا۔ (۵۸۷)

(واقعہ یہ ہے کہ بیوی کو خبر نہیں تھی کہ رہن اور گروی رکھنے کا سودا طے ہو چکا ہے۔ کعب بن اشرف کو یقین تھا کہ گاہک آئے ہیں۔ کعب سودے کے لالچ میں باہر آ رہا تھا۔ بیوی کو اصل بات نہیں بتائی۔ اکڑ کی باتیں کرتا رہا۔ مگر بیوی کی باتوں سے کچھ شبہ بھی ہو گیا تو ہتھیار لگا لیے)

بہر حال کعب بن اشرف باہر آیا۔ چاندنی رات تھی۔ عطر سے مہک رہا تھا۔ سر پر نہایت خوشبودار تیل لگا رکھا تھا۔ عام طور پر مشک استعمال کیا کرتا تھا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا: کعب آپ تو خوشبو سے مہک رہے ہیں۔ کعب بن اشرف نے جواب دیا کیوں نہیں۔ میری بیوی عرب کی عورتوں میں سب سے زیادہ نفاست پسند ہے۔ ہر وقت مشک اور عنبر میں بسی رہتی ہے۔

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ: آپ نے سر پر تیل کیسا لگا رکھا ہے۔ یہ تو بہت ہی خوشبودار ہے۔ طبیعت چاہتی ہے آپ کے بال سونگھوں۔

کعب بن اشرف: ضرور سونگھئے اس نے سر آگے کر دیا۔

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس کے بال سونگھے۔ خوشبو کی تعریف کی۔ پھر کہا جی نہیں بھرا۔ ایک دفعہ اور اجازت دیجیے۔ انہوں نے اس کو اس طرح باتوں میں لگایا۔ ساتھیوں نے حملہ کر دیا۔ یہ ذرہ پہنے ہوئے تھا۔ حملہ مشکل سے کامیاب ہوا۔ اس میں خود ایک ساتھی کے بھی چوٹ آئی (۵۸۸) بہر حال اس کا کام تمام کر دیا گیا۔

یہ صاحبان فوراً واپس پہنچے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نوافل میں مشغول تھے۔ سلام پھیرا تو ان حضرات نے سلام عرض کر کے واقعہ سنایا (۵۸۹) ایک روایت ہے کہ جب یہ لوگ رات کے وقت اس مہم پر جانے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پہنچانے کے لیے بقیع غرقد تک تشریف لے گئے تھے۔ (۵۹۰)

مسئلہ کی نوعیت:

حضرات علماء کرام نے اس قتل پر بحث کی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں جب فتنوں کا آغاز ہوا تو یہ قتل بھی زیر بحث آیا۔ اعتراض یہ تھا کہ معاہد کا قتل کرنا درست نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معترض کو سخت تنبیہ فرمائی۔ (۵۹۱)

واقعہ یہ ہے کہ ان تمام حرکتوں کے بعد جو کعب نے کیں اس کو معاہد کہنا حق پسندی نہیں ہے بلکہ عناد ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کعب بن اشرف کسی معاہدہ میں شریک ہی نہیں ہوا تھا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے جس کو ابوداؤد (۵۹۲) میں نقل کیا گیا ہے یہی ثابت ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس کو ''اہل الحرب'' (غیر معاہد) قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم (۵۹۳)

بنو نضیر کو احساسِ جرم اور تجدید معاہدہ:

واقعہ یہ ہے کہ کعب بن اشرف نے جو حرکتیں کیں ان سے نہ صرف یہ کہ تنہا اس نے معاہدہ کو پامال کیا اور اس کے پرخچے اُڑائے بلکہ اس کی ذمہ داری بنو نضیر پر بھی عائد ہوتی تھی کیونکہ یہ ان کا حلیف تھا۔ اگر کعب بن اشرف کسی معاہدہ میں شریک نہیں ہوا تھا تب بھی حلیف ہونے کی بنا پر بنو نضیر کا فرض تھا کہ کعب کو غدارانہ حرکتوں سے روکتے لیکن اس کے برخلاف بنو نضیر کے سردار کعب بن اشرف کی امداد اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ کعب بن اشرف مکہ گیا تو یہ اس کے ساتھ تھے۔ کعب نے سردارانِ قریش کے ساتھ خانہ کعبہ کے پردے تھام کر عہد کیا تو برابر میں یہ سردارانِ بنو نضیر بھی کھڑے ہوئے تھے۔ کعب نے سردارانِ قریش کے جزوی اختلافات ختم کرا کر ان کو مسلمانوں پر حملہ کے لیے آمادہ کیا تو بنو نضیر کے نمائندے بھی ہمت افزائی کے لیے موجود تھے۔

مدینہ میں واپس آ کر کعب بن اشرف نے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مشتعل کرنا شروع کیا تو یہ اس کے ہم نوا بلکہ مکبر الصوت بنے ہوئے تھے۔

اب یہ صورت پیش آئی کہ چند جاں بازوں نے قلعہ میں گھس کر اس کو قتل کر دیا تو بنو نضیر کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ وہ پریشان ہوئے اور اپنے ضمیر کے جرم عظیم کا ان کو احساس ہوا۔ چنانچہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''کعب بن اشرف کو جب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے قتل کر دیا تو یہود اور مشرک (منافق) گھبرا گئے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہمارا آدمی رات قتل کر دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حرکتوں سے آگاہ کیا جو کعب نے کی تھیں۔ پھر فرمایا کہ آپ لوگ کچھ شرطیں طے کر لیں جن کی پابندی کرتے رہیں اور نبھا سکیں۔ چنانچہ ایک عہد نامہ لکھا گیا جس کے فریق یہ تین تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، یہود بنی نضیر، مسلمان (۵۹۴)

لیکن اس معاہدہ کی عمر بھی زیادہ نہیں ہوئی۔ بنو نضیر نے خود رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی

کوشش کی جس پر یہ معاہدہ ختم کر دیا گیا۔ تفصیل غزوہ بنی نضیر کے سلسلہ میں آئے گی۔ انشاء اللہ

جلد اوّل ختم ہوئی، الحمدللہ، غزوہ اُحد اور اس کے بعد کے غزوات و سرایا کا تذکرہ جلد ثانی میں ملاحظہ فرمائیے۔ (وباللہ التوفیق وبہ نستعین)

محتاج دعاء حقیر فقیر

(مولانا) محمد میاںؒ

۱۸ شعبان ۱۳۸۵ھ/۱۳ دسمبر ۱۹۶۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزوہ اُحد

اہل مکہ کی طرف سے تحریک اور تیاری:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَسَیُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ (سورہ انفال ع ۴)

''جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی وہ اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکیں تو یہ لوگ آئندہ بھی (اسی طرح) خرچ کریں گے (لیکن) پھر وقت آئے گا کہ یہ مال خرچ کرنا ان کے لیے سراسر پچھتاوا ہوگا اور پھر (بالآخر) مغلوب ہوں گے۔''

یہ سورہ انفال کے چوتھے رکوع کی آیتیں ہیں۔ اس سورت میں زیادہ تر غزوہ بدر کے گذشتہ واقعات پر تبصرہ کیا گیا ہے لیکن ان آیات میں آئندہ کے متعلق پیشین گوئی ہے کہ جس طرح یہ کفار قریش اب تک اپنی دولت اس پر خرچ کرتے رہے ہیں کہ جس طرح بھی ہو لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکیں۔ عنقریب ایسا ہوگا کہ یہ اپنے اموال اور اپنی دولت کو پھر اسی کام کے لیے خرچ کریں گے۔ (مگر اس کا نتیجہ آخر میں حسرت اور افسوس ہوگا) چونکہ اس دولت کا بدر کے اقدامات سے خاص تعلق تھا اس لیے سلسلہ بدر میں اس کے خرچ کا بھی خاص طور پر تذکرہ فرمایا کیونکہ ایک یہی منصوبہ تھا جس کے تحت یہ دولت فراہم کی جارہی تھی اور اسی منصوبہ کی کڑی بدر کا یہ معرکہ بھی تھا۔

پہلے گذر چکا ہے کہ منصوبہ یہ تھا کہ مدینہ منورہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اس حملہ کے لیے رقم کی ضرورت تھی تو اس تاجر قوم نے مشترک تجارت کے ذریعہ یہ رقم فراہم کرنی چاہی تھی۔ چنانچہ ابوسفیان کی زیر نگرانی تجارتی قافلہ شام بھیجا گیا۔ جس کی واپسی کے وقت بدر کا معرکہ پیش آگیا اور بجائے اس کے کہ مسلمان تباہ ہوں خود قریش کے سردار تباہ و برباد ہوئے اور مسلمانوں نے ثابت کر دیا کہ زندہ رہنے کا حق ان ہی کو ہے۔

لیهلك من هلك عن بینة ویحیی من حیی عن بینة

غزوۂ بدر میں شکست کھا کر جب قریش مکہ واپس پہنچے تو وہی وقت تھا کہ ابوسفیان کا کاروان تجارت بھی مکہ پہنچا تھا۔ تجارت کا یہ مال ابھی کھولا بھی نہیں گیا تھا بلکہ دارالندوہ (کارپوریشن یا میونسپلٹی ہال) میں محفوظ کر دیا گیا تھا (۵۹۵)۔ پہلے گذر چکا ہے کہ ایک ہزار اونٹوں پر یہ سامان لدا ہوا تھا اور مشترک سرمایہ پچاس ہزار دینار تھا۔ یہ

پورا مال سو فیصدی نفع کے ساتھ اٹھا دیا گیا۔ (۵۹۶)

حصہ داران کی اصل رقم واپس کر دی گئی اور نفع کے پچاس ہزار دینار جنگ کے لیے محفوظ کر دیئے گئے۔ (۵۹۷)

سب سے پہلا کام پروپیگنڈہ تھا۔ چنانچہ دو آدمی مقرر کیے گئے کہ قبائل میں دورہ کر کے اشعار اور تقریروں سے لوگوں کے جذبات جنگ کے لیے ابھاریں۔ ان میں ایک وہی ابوعزہ اچھا شاعر تھا جو غزوۂ بدر میں گرفتار ہو گیا تھا اور جب اس نے اپنے افلاس و تہی دستی اور پانچ لڑکیوں کے خرچ کا رونا رویا تو اس کو بلا فدیہ اس وعدہ پر رہا کر دیا گیا تھا کہ آئندہ اسلام کے خلاف کسی کی مدد نہیں کرے گا۔ (۵۹۸) اس وقت جب صفوان بن امیہ نے اس کو یہ خدمت سپرد کی تو اس نے عذر کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اسلام کے خلاف مدد نہ کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ صفوان نے جواب دیا کہ ہم آپ سے حملہ کرانا نہیں چاہتے صرف آپ کی زبان کی مدد چاہتے ہیں۔ آپ اپنی زبان سے ہماری مدد کیجیے۔ صفوان اس کے مصارف کا متکفل ہوا اور یہ بھی وعدہ کر لیا کہ اگر وہ کہیں مارا بھی جائے گا تب بھی اس کی لڑکیوں کا وہ ذمہ دار ہوگا اور اپنی اولاد کی طرح ان کو رکھے گا۔ دوسرا شخص مسافع بن عبد مناف تھا جس کو یہ خدمت سپرد کی گئی۔

رؤساء قریش:

اب رؤساء قریش یہ تھے۔ عبداللہ بن ابی ربیعہ۔ عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور ابوسفیان۔ ابو سفیان کو سربراہ اور قائد قوم تسلیم کیا گیا۔

ابوسفیان کا عہد اور غزوۂ سویق:

ابوسفیان کو زمام قیادت سپرد کی گئی تو اس منصب کا سب سے بڑا فرض غزوۂ بدر کا انتقام تھا۔ ابوسفیان نے عہد کیا کہ جب تک مقتولان بدر کا انتقام نہ لے گا نہ غسل جنابت کرے گا نہ سر میں تیل ڈالے گا۔ چنانچہ دو سو سترسواروں کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف کوچ کیا۔ یہود کے متعلق ابوسفیان کا خیال یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں وہ بنی نضیر کی آبادی میں پہنچا۔ پہلے حیی بن اخطب کے یہاں جا کر دستک دی مگر اس نے دروازہ ہی نہ کھولا تو مایوس ہو کر سلام بن مشکم کے یہاں آیا وہ یہود بنی نضیر کا سردار تھا اور تجارتی خزانہ اسی کے زیر اہتمام رہتا تھا۔ اس نے بڑے جوش سے استقبال کیا۔ پرتکلف کھانے کھلائے۔ شراب پلوائی۔ مدینہ کے مخفی راز بتائے۔ آخر شب میں ابوسفیان عریض پر حملہ آور ہوا جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے ایک انصار کو جن کا نام سعد بن عمرو تھا شہید کیا (رضی اللہ عنہ) چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیئے۔ ان باتوں سے اس کے نزدیک قسم پوری ہوگئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے تعاقب کیا۔ مگر ابوسفیان یہ بہادری دکھا کر اتنی تیزی سے بھاگا کہ ہاتھ نہ آیا۔ اس کے پاس رسد کے لیے ستو کے بورے تھے گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا

جو مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ اسی لیے یہ واقعہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہے کیونکہ سویق عربی میں ستو کو کہتے ہیں۔

ابن سعد کی تحقیق کے بموجب یہ حملہ ہجرت سے ۲۲ ماہ بعد اتوار کے روز ۴ ذی الحجہ کو ہوا تھا۔ اس تعاقب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچ دن صرف ہوئے۔ (۵۹۹)

غزوۂ احد کے لیے قریش کی روانگی:

غزوۂ سویق کے نو ماہ اور ہجرت سے اکتیس ماہ بعد جب بتیسواں مہینہ شروع ہوا یعنی شوال ۳ ھ کے آغاز (۶۰۱) میں قریش کا لشکر جرار پوری تیاری کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ قریش کے علاوہ حلیف قبائل کے جنگجو (۶۰۲) بہادر بھی اس میں شریک تھے۔ مجموعی تعداد تین ہزار (۶۰۳) سے زیادہ تھی۔ جس کی تفصیل یہ تھی:

شتر سوار تین ہزار۔ گھوڑے سوار دو سو۔ زرہ پوش سات سو۔ تیر انداز ایک سو۔ (۶۰۴)

یہ تیاری اور روانگی پوری راز داری کے ساتھ ہوئی۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو قریش کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے آپ کو بھی اس لشکر کا علم مکہ کے ایک خط کے ذریعہ اس وقت ہوا جب ایک شب پہلے یہ لشکر مدینہ سے چند میل ذوالحلیفہ کے قریب پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ یہ لشکر بدھ کے روز کسی وقت ذوالحلیفہ پہنچ چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قاصد جمعرات کے روز اول وقت پہنچا۔ (۶۰۵)

خواتین قریش:

جنگ کے لیے تیار کرنے میں عورتیں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ پندرہ سرداروں (۶۰۶) کی عورتوں نے طے کیا تھا کہ اپنے شوہروں کے ساتھ وہ بھی میدان جنگ میں جائیں گی۔ ان میں پیش پیش ابوسفیان کی بیوی ہند (۶۰۷) تھیں جن کے باپ عتبہ بن ربیعہ اور چچا اور بھائی جنگ بدر میں کام آئے تھے۔ ان کے علاوہ عکرمہ پسر ابوجہل کی بیوی ام حکیم، حضرت خالد کی بہن فاطمہ، رئیس طائف مسعود ثقفی کی بیٹی برزہ، عمرو بن العاص کی اہلیہ ریطہ، حضرت مصعب بن عمیر کی والدہ خناس کے نام بھی شمار کرائے گئے ہیں۔ (۶۰۸) ان ہودج نشین خواتین ظعن کا بیج بھی لشکر کا ایک جزو تھا۔ (۶۰۹)

مدینہ طیبہ میں اطلاع:

حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابھی تک مکہ میں مقیم تھے، انہوں نے تمام حالات لکھ کر ایک قاصد کو دیئے اور طے کر دیا کہ تین (۶۱۰) دن کے اندر مدینہ پہنچ کر یہ خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں تشریف فرما تھے۔ یہ قاصد وہیں باریاب ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفافہ کی مہر توڑی اور حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے ان کو خط دیا۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے خط پڑھ کر سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کر دی کہ ابھی اس کی کسی کو خبر نہ ہو۔ البتہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راز سے آگاہ کر دیا۔ (۶۱۱)

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس قریش کے حالات معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ ۵ شوال پنج شنبہ کے روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو خبر رساں انس اور مونس خبر لانے کے لیے بھیجے انہوں نے آ کر اطلاع دی کہ لشکر قریش مدینہ کے قریب آ گیا ہے اور مدینہ کی چراگاہ عریض کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خباب بن منذر (رضی اللہ عنہ) کو بھیجا کہ فوج کی تعداد معلوم کریں انہوں نے آ کر رپورٹ دی کہ تین ہزار کا لشکر ہے۔ مدینہ میں صحابہ کرام نے فوراً ہی حفاظت کے انتظامات کر لیے۔ حضرت سعد بن معاذ، حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت اسید بن حضیر اور چند صحابہ مسجد میں حاضر ہو گئے اور شب بھر باب رسالت پر پہرہ دیتے رہے۔ (۶۱۲) رضی اللہ عنہم۔

اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَيْنَهُمْ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ، رازدارانہ اظہارِ خیال، کثرت رائے پر فیصلہ

اپنی ذاتی رائے کے خلاف فیصلہ پر سرگرمی سے عمل کی نادر مثال

حیلہ بہانہ کی ایک بدترین صورت:

۶ شوال جمعہ کے روز صحابہ کرام کے ایک عام اجتماع میں اس مسئلہ پر غور ہوا کہ فوج قریش کا مقابلہ مدینہ میں کیا جائے یا باہر نکل کر۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دے کر بلایا تھا یا خود پہنچ گیا تھا لیکن یہ بات قطعی ہے کہ وہ اس اجتماع میں شریک تھا۔ اپنی جماعت کی نمائندگی کر رہا تھا اور اتفاق سے اس کی رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید میں تھی۔

مدینہ طیبہ کے دو طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ مدینہ کے ناکوں پر دیواریں چن کر پورے مدینہ کو محفوظ قلعہ بنایا جا سکتا تھا۔ عورتیں اور بچے قریب کی پہاڑیوں پر پہنچا دیئے جاتے۔ اگر موقع ہوتا تو وہ وہاں سے دشمن پر سنگ باری بھی کر سکتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تجویز پیش فرمائی کہ شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کریں۔ دشمن چند روز حملہ کرے گا پھر خود پریشان ہو کر چلا جائے گا۔ انصار اور مہاجرین کے اکثر اکابر نے اس تجویز کو پسند کیا۔ (۶۱۳) عبداللہ بن ابی بن سلول نے بھی اسی کی تائید کی اور یہ بھی بتایا کہ مدینہ کی روایات یہ ہیں کہ جب اہل مدینہ نے شہر میں رہ کر کسی دشمن کا مقابلہ کیا ہے وہ کامیاب رہے ہیں اور دشمن کو ہمت نہیں ہوئی کہ شہر میں گھس سکے اور جب کبھی وہ باہر نکلے انہوں نے نقصان اٹھایا (۶۱۴) لیکن بڑی تعداد ان مومنین با اخلاص کی تھی جن کو حسرت تھی کہ وہ جنگ بدر میں شریک نہیں ہو سکے اور اس فضیلت سے محروم رہے۔ ان کا احساس یہ تھا کہ اگر ہم مدینہ ہی میں رہے تو دشمن سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اگرچہ بدر میں شریک رہے تھے مگر اس وقت ان کا جذبہ بھی یہی تھا (۶۱۵) اور وہ اسی رائے کے حامی تھے۔

عبداللہ بن ابی بن سلول نے جو مدینہ کی روایات پیش کی تھیں اس کے جواب میں ان حضرات کا خیال یہ تھا کہ اس طرح ''شہر بند'' ہو جائے گا۔ نہ دشمن پر اچھا اثر پڑے گا نہ عرب کے قبائل پر کیونکہ یہ سمجھا جائے گا کہ مسلمانوں میں مقابلہ کی ہمت نہیں ہے اور بدر کی فتح بھی ایک اتفاقی بات تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غزوۂ بدر کی فتح سے جو ہیبت مسلمانوں کی قائم ہوئی ہے وہ ختم ہو جائے گی بہرحال آزادی کے ساتھ طرفین نے دلائل پیش کیے پھر اتفاق سے یہی رائے غالب (۶۱۶) رہی۔

یہ گفتگو نماز جمعہ سے پہلے ہوئی اور طے ہو گیا کہ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے گا۔ نماز جمعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی اور مسلمانوں کے جذبات جہاد کو تازہ کیا ان کو تیاری کا حکم دیا اور یہ بشارت دے دی کہ مسلمانوں نے صبر و استقلال سے کام لیا تو وہ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ اب مسلمانوں میں شوق جہاد کے ساتھ کامیابی کی اُمنگ بھی تھی۔ (۶۱۷)

اسی روز قبیلہ بنونجار کے ایک انصار حضرت مالک بن عمرو رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ نماز جمعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جنازہ کی نماز بھی پڑھائی۔ (۶۱۸)

سید الانبیاء (صلوات اللہ علیہم اجمعین) فوجی لباس میں:

نماز جمعہ اور تقریر کے بعد (۶۱۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راحت کدہ میں تشریف لے گئے۔ صدیق اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، وہاں ان دونوں نے عمامہ شریف بندھوایا۔ پوشاک زیب تن کرائی۔ اب سید الانبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) باہر تشریف لائے تو دوہری (۶۲۰) زرہیں زیب تن تھیں۔ پشت مبارک چمڑہ کے پٹکے سے کسی ہوئی تھی۔ گردن کے ایک طرف تلوار کا تلہ تھا دوسری جانب کمان۔ پشت پر ترکش اور دست مبارک میں نیزہ۔ (۶۲۱) سر پر اس وقت عمامہ تھا لیکن میدان جنگ میں جب آپ صفیں درست فرما رہے تھے تو خود بھی سر مبارک پر تھا اس کے ساتھ مغفر (۶۲۲) بھی تھا۔ (۶۲۳)

اس وقفہ میں اہل عوالی۔ (قبا وغیرہ کے باشندے) بھی آ گئے تھے اور بیچ میں راستہ چھوڑ کر حجرہ مبارکہ اور منبر کے درمیان دورویہ صفیں لگا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ (۶۲۴)

اظہارِ معذرت:

حضرت سعد بن معاذ اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہما جیسے بزرگوں کو اس کا احساس تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف اصرار کیا گیا ہے اور مدینہ سے باہر جنگ کا فیصلہ آپ کی منشاء کے خلاف ہوا ہے۔ چنانچہ جب آپ اندر تشریف لے گئے تو ان اکابر نے لوگوں کو توجہ دلائی کہ جس رسول برحق پر آسمان سے وحی نازل ہوتی رہتی ہے آپ نے اس کی منشاء کے خلاف ایک بات پر اصرار کیا جو مناسب نہیں تھا۔ اب بہتر یہ ہے کہ آپ حضرات یہ فیصلہ واپس لے لیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دے دیں کہ جو رائے عالی ہو اس پر عمل فرمائیں۔ یہ احساس ان اصرار کرنے والوں کو بھی ہوا چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو ندامت ظاہر کرتے ہوئے معذرت کی کہ ہمارا اصرار بے محل تھا۔ حضرت والا کو اختیار ہے کہ منشاء عالی کے مطابق عمل فرمائیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی معذرت سنی تو فرمایا:

”نبی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ جب وہ زرہ پہن چکا ہو تو جنگ کے فیصلہ سے پہلے اتار

دے۔ (۶۲۵) اب جو فیصلہ ہو چکا ہے اس پر عمل کرو۔ خدا کا نام لے کر چلو۔ جو میں ہدایتیں دیتا رہوں ان پر عمل کرو۔ جب تک تم صبر و استقامت سے کام لیتے رہو گے اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہے گی۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین جھنڈے منگوائے۔ قبیلہ اوس کا جھنڈا حضرت اسید بن حضیر۔ قبیلہ خزرج کا جھنڈا حباب بن منذر کو اور مہاجرین کا جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہم کو عنایت فرمایا اور ایک روایت ہے کہ خزرج کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو عطا ہوا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ کے انتظامات سپرد فرمائے اور اپنے گھوڑے پر جس کا نام سکب تھا سوار ہو کر کوچ کا حکم دے دیا۔ دونوں سعد (یعنی سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ رئیس خزرج اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ رئیس اوس) آگے آگے روانہ ہوئے۔ اس وقت کل تعداد ایک ہزار تھی۔ جس میں سو زرہ پوش تھے۔ (۶۲۶)

ایک خواب اور اس کی تعبیر:

اسی شب (شب جمعہ میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب بھی دیکھا تھا جس کو صبح کے اجتماع میں بیان فرمایا کہ آپ ایک مضبوط زرہ زیب تن کیے ہوئے ہیں ہاتھ میں ذوالفقار تلوار ہے جس کی دھار جھڑ گئی ہے۔ ایک گائے ذبح کی جا رہی ہے اس کے پیچھے ایک مینڈھا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی تعبیر دریافت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مضبوط زرہ مدینہ ہے اور تلوار کی دھار جھڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے کوئی گزند پہنچے گا۔ گائے ذبح کی جا رہی ہے یعنی کچھ مسلمان شہید ہوں گے اور اس کے پیچھے مینڈھا ہے یہ لشکر دشمن کا کوئی سرغنہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ ختم کر دے گا۔ (۶۲۷)

چند سبق:

سیرت مقدسہ کا ہر ایک واقعہ بلکہ ہر ایک پہلو اور ہر ایک جزو مسلمانوں کے لیے سبق ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو سنت کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنتیں آیات کتاب اللہ کی تفسیر اور تشریح ہوا کرتی ہیں۔ مشورہ کے اسی واقعہ میں سنت مقدسہ نے چند باتوں کی تعلیم دی ہے جو جماعتی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۱) پہلی تعلیم یہ ہے کہ جماعت کا جو فیصلہ ہو وہی اپنا فیصلہ ہونا چاہیے اگرچہ اپنی ذاتی رائے اس کے مخالف ہو۔

(۲) اس جماعتی فیصلہ کے لیے بھی وہی جذبہ اور وہی سرگرمی ہونی چاہیے جو اپنے ذاتی فیصلہ کے متعلق ہو۔ ارشاد خداوندی امرھم شوری بینھم کی تفسیر سنت مبارکہ نے یہی پیش کی۔

(۳) اکابر کی واجب الاحترام شخصیتوں کے مقابلہ میں بھی فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا۔

(۴) جمہوریت اور مساوات کے بلند بانگ مدعیوں کے لیے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ مشورہ اور رائے شماری کے وقت سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت بھی (۶۲۸) وہی ہے جو عام رائے دہندہ کی ہے باوجودیکہ اس ذات مقدس کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود میں جتنے غزوے ہوئے ان میں کسی میں مسلمانوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچا تھا جتنا غزوۂ احد میں پہنچا۔ اس جنگ میں ستر مسلمان شہید ہوئے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سخت مجروح ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی طور پر بہت انس تھا۔ تقریباً ہم عمر تھے بچپن سے ساتھ رہا تھا۔ دودھ شریک بھائی بھی تھے (۶۲۹)۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی اس پیارے بھتیجے سے اتنی محبت تھی کہ ان کی توہین یا تکلیف برداشت نہیں ہوتی تھی اور حقیقت یہ ہے یہی حمیت (۶۳۰) ان کے اسلام کا سبب بنی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی وقت ان حضرات کو سرزنش کر سکتے تھے جنہوں نے آپ کی رائے کے خلاف باہر نکل کر جنگ کرنے پر اصرار کیا تھا۔ مگر احادیث مقدسہ کا پورا ذخیرہ سامنے ہے۔ کسی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کوئی سرزنش کی ہو یا کبھی حرف شکایت زبان مبارک پر آیا ہو۔

(۶) میدان جنگ کا جو نقشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرمایا تھا۔ اس میں جن کو درہ کی حفاظت کے لیے مامور فرمایا تھا۔ انہوں نے اگرچہ ایک غلط فہمی کی بنا پر غلطی کی تھی جس کو خطاء اجتہادی کہا جا سکتا ہے جو معاف ہونی چاہیے۔ مگر کتاب اللہ نے ان پر سخت تنقید کی ہے اور اس ہزیمت کا ذمہ دار انہیں کو ٹھہرایا ہے۔ مگر کتاب اللہ میں کوئی حرف بھی اس تجویز کے متعلق وارد نہیں ہوا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور منشاء کے مخالف تھی اور جس پر ان حضرات نے اصرار کیا تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آئندہ کے متعلق بھی ہدایت یہ فرمائی گئی: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ''معاملات دین وملت میں ان سے مشورہ کا سلسلہ جاری رکھئے۔''

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیغمبرانہ دیانت بھی سبق آموز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجتماع میں خواب کا تذکرہ تو فرمایا مگر اس سے متاثر کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ حالانکہ مؤرخ ابن سعد کی تحقیق کے بموجب اس خواب کی بنا پر ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ رائے ہوئی تھی کہ مدینہ منورہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے کہ خواب کا منشاء تشریع نہیں ہے اس کی بنا پر کوئی حکم نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے متاثر فرمانے کی کوشش کی نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے اثر لیا۔ اس کے برخلاف رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا عمل ہے کہ وہ اپنی پارٹی کو لے کر میدان جنگ سے واپس ہو گیا اور بہانہ یہی کیا کہ ہماری رائے نہیں مانی گئی۔ نو جوانوں کی رائے پر عمل کیا گیا۔

رات کو قیام اور پہرہ کا انتظام:

ابن سعد کی تحقیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر کے بعد مدینہ سے روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور چل کر ایک میدان میں قیام فرمایا جہاں دو ٹیلے تھے جن کو شیخین کہا جاتا تھا۔ مغرب کا وقت ہوا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور امام الانبیاء علیہم السلام نے نماز پڑھائی۔ رات کو یہیں قیام رہا۔ پھر عشاء کی اذان ہوئی اور نماز کے بعد آرام کیا گیا۔

لشکر کی حفاظت کے لیے پچاس مجاہدین کا دستہ مقرر فرما دیا گیا جو رات بھر گشت کرتا رہا۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اس دستہ کے افسر تھے (۶۳۱)۔ راستہ میں یہودیوں کی ایک بڑی جماعت ملی۔ یہ یہودی عبداللہ بن ابی کے حلیف تھے اور اس جنگ میں مدد کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشکش منظور نہیں فرمائی کہ ہم اہل شرک کے مقابلہ میں اہل شرک سے مدد نہیں لینا چاہتے۔ (۶۳۲)

اس موقع پر اسلامی لشکر کا بھی جائزہ لیا گیا جو کم عمر تھے۔ ان کو واپس کر دیا گیا۔ ان میں زید بن ثابت، براء بن عازب، ابوسعید خدری، اسامہ بن زید، زید بن ارقم و اسید بن حضیر۔ عبداللہ بن عمر (۶۳۳) اور عرابہ بن اوس رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ لیکن جاں نثاری کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے جب رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو واپس جاؤ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے اور جب ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ لے لیے گئے تو سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ ایک نوجوان جو ان کے ہم عمر تھے انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافع کو لڑائی میں ڈھا لیتا ہوں۔ اس لیے اگر ان کو اجازت ملتی ہے تو مجھے بھی ملنی چاہیے۔ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا۔ اس بناء پر ان کو اجازت مل گئی۔ (۶۳۴)

نماز صبح اور روانگی:

جیسے ہی نماز صبح سے فراغت ہوئی، ارشاد ہوا: ہمیں قریب کے راستہ سے پہنچنا ہے مگر راستہ ایسا ہو کہ فوج قریش سے بچتا ہوا نکل جائے۔ حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مربع بن قیظی کے باغ سے گذرتا ہوا راستہ جاتا ہے یہ قریب بھی ہے اور فوج قریش سے بچا ہوا بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ راستہ منظور فرمایا۔ مگر جب باغ میں پہنچے تو مالک باغ مربع بن قیظی مزاحمت کرنے لگا۔ یہ بظاہر مسلمان تھا مگر دل سے منافق اور آنکھوں سے اندھا تھا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمات بھی بکے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے اس کو سزا دینی چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھوڑو۔ یہ کور چشم بھی ہے اور کور باطن بھی۔ تب بھی ایک صاحب سعد بن زبدہ اشہلی کی کمان اس کے سر پر پڑ گئی۔ جس سے سر میں زخم آ گیا۔ (۶۳۵)

لو نعلم قتالا لاتبعنا کم

اگر ہم جانتے کہ فی الواقع لڑائی ہوگی تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے

عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کی پارٹی کی واپسی:

اکثریت کا فیصلہ جس کے متعلق سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یا اکابر صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی زبان پر کبھی شکایت کا ایک حرف بھی نہیں آیا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول کے لیے بہانہ بن گیا۔

یہ تین سو آدمیوں کی پارٹی لے کر مدینہ منورہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا تھا رات کو مسلمانوں کے ساتھ قیام کیا اور صبح کو اُحد کے قریب مقام شوط (۶۳۶) تک ساتھ ساتھ پہنچ گیا لیکن بحث کا سلسلہ بند نہیں کیا بالآخر یہ کہہ کر واپس ہوگیا کہ جب ہماری بات نہیں مانی اور ہمارے بجائے نوجوانوں کی باتیں مانیں تو ہم اپنی جانیں کیوں کھپائیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد ماجد حضرت عبداللہ بن عمرو بن حزام رضی اللہ عنہ (جو قبیلہ بنی سلمہ کے ممتاز انصار اور عبداللہ بن ابی کے ہم قبیلہ (خزرجی) تھے جو اسی غزوہ میں شہید بھی ہوئے) عبداللہ بن ابی کے پیچھے چلے اور اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس نازک وقت میں مسلمانوں کی مدد چھوڑنا کسی طرح درست نہیں ہے تو ان کو یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ:

''ہمیں معلوم ہے۔ لڑائی بھڑائی کچھ نہ ہوگی۔ خواہ مخواہ کی باتیں ہیں اگر واقعی جنگ ہوتی تو ہم کبھی ساتھ نہ چھوڑتے''

جس طرح واقعات نے رئیس المنافقین کے اس بہانہ کی تردید کی، کتاب اللہ نے صرف تردید ہی نہیں کی بلکہ اس کے دل کے چور کا بھی پتہ دے دیا۔

عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے کہا تھا:

لَوْ نَعْلَمُ قِتَالاً لاَّ تَّبَعْنَاكُمْ

''اگر ہم جانتے کہ واقعی لڑائی ہوگی تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔''

کتاب اللہ نے جواب دیا:

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ (سورہ آل عمران ع ۱۷)

''جس وقت انہوں نے یہ بات کہی وہ کفر سے زیادہ نزدیک تھے بمقابلہ ایمان کے۔ (یہ

ایمان کی بات نہیں تھی بلکہ کفر کی بات تھی) یہ لوگ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور جو کچھ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔''

بنو حارثہ اور بنو سلمہ کا تذبذب:

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(آل عمران ع ۱۳)

''جب تم میں سے (منافقوں کے علاوہ باقی مسلمانوں میں سے) دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں (اور واپس لوٹ چلیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کا مددگار ہے اور جو صاحب ایمان ہیں ان کو چاہیے کہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھیں۔''

عین معرکہ کے وقت جب کہ دشمن کی کئی گنی خونخوار فوج سامنے ہے۔ تقریباً ایک تہائی لوگوں کا الگ ہو جانا اور میدان چھوڑ کر چلا جانا معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے پورے لشکر کے پاؤں اکھڑ سکتے تھے اور کچھ بعید نہیں کہ عبداللہ بن ابی کی یہ حرکت دشمن کے اشارہ سے اسی غرض سے ہو۔ مگر حضرات صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا جذبہ صادق وہ نشہ نہیں تھا جسے ترشی اُتار دے۔

عبداللہ بن ابی کی اس غداری نے مایوسی کے بجائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبات ایثار کو زیادہ برانگیختہ اور پہلے سے زیادہ پختہ کر دیا۔ صرف دو ٹکڑیوں میں کچھ تذبذب پیدا ہوا۔ ایک ٹکڑی بنو سلمہ کی تھی جس کا تعلق اسی قبیلہ خزرج سے تھا جو عبداللہ بن ابی بن سلول کا قبیلہ تھا۔ دوسری ٹکڑی بنو حارثہ کی تھی جس کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ (۶۳۷)

لیکن یہ زلزلہ کا ایک جھٹکا تھا جس نے ان دونوں ٹولیوں کی سرزمین کو متحرک کیا۔ مگر یہ ایسا خفیف اور معمولی تھا کہ اگر قرآن حکیم اس کا پردہ فاش نہ کرتا تو اس کا پتہ چلنا بھی مشکل تھا۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وحی الٰہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کسی کمزوری پر پردہ نہیں ڈالتی۔ بلکہ ان کی گرفت دوسروں سے زیادہ کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اللہ والے ہیں اور وہ اللہ والوں کو زیادہ سے زیادہ پاک اور صاف رکھنا چاہتی ہے:

وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

سورۂ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت میں اسی کمزوری کی طرف اشارہ ہے جو ان دو ٹولیوں سے پائی گئی تھی۔ ساتھ ساتھ ان کو تسکین بھی دے دی گئی اللّٰه ولیهما اللہ ان دونوں کا ولی اور مددگار ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے یہ آیت ہمارے بارے ہی میں نازل ہوئی جس میں ہماری کمزوری ظاہر کی گئی ہے مگر

اللہ تعالیٰ نے اپنی ولایت اور مدد کا اظہار فرما کر ایک ایسی قابل فخر سند عطا فرما دی کہ اب ہمارے لیے یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل نہ ہوئی ہوتی۔ (۶۳۹) (کیونکہ وہ کمزوری اتنی باعث شرم نہیں جتنی یہ سند قابل مسرت ہے۔)

اے ترا باہر دلے رازے دگر
ہر گدا را بر درت نازے دگر

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ:

عبداللہ بن ابی کی ٹولی واپس چلی گئی تو حضرات انصار نے عرض کیا کہ کچھ یہودی ہمارے حلیف ہیں ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم ان سے امداد کی اپیل کریں۔ ارشاد ہوا ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔ (۶۴۰)

مشرکین کا محاذ:

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچ گئے تھے اور ذوالحلیفہ (۶۴۱) میں پڑاؤ ڈالا تھا جو مدینہ سے تقریباً چھ میل ہے۔ فوج کی تعداد تین ہزار سے زیادہ تھی جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ معزز خاندان کی پندرہ خواتین کا بھی ذکر آچکا ہے جو ترانوں اور ہیجان انگیز فقروں سے بہادروں کے حوصلے بڑھا رہی تھیں۔

مدینہ کا ایک مقبول عام شخص عبد عمرو بن صیفی جو ابو عامر کی کنیت سے مشہور تھا اور اس کے زہد اور پارسائی کی وجہ سے اہل مدینہ اس کی عزت کیا کرتے تھے لیکن جیسے ہی مدینہ میں اسلام کا نور چمکا اس کے نمائشی زہد نے عناد و مخالفت کی شکل اختیار کر لی یہاں تک کہ مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا اور گھوم پھر کر اسلام کے خلاف ایک پارٹی بنانے لگا۔ یہ بھی اپنی پارٹی سمیت قریش کے ساتھ تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس کے ساتھ قبیلہ اوس کے بھی پچاس آدمی تھے۔ (۶۴۲)

صف بندی:

شنبہ کی صبح کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے انہوں نے میدان احد میں صفیں قائم کیں۔ میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا۔ میسرہ عکرمہ (۶۴۳) کو دیا جو ابو جہل کے فرزند اور جانشین تھے۔ سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا۔ تیر اندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا۔ علم برداری ایک خاص اعزاز تھا۔ اگرچہ نہایت خطرناک اور ایثار طلب تھا۔ جھنڈا ہی فتح و شکست کا نشان ہوتا تھا جیسے ہی جھنڈا سرنگوں ہوتا تھا فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے تھے۔ قریش میں یہ اعزاز بنو عبدالدار کے لیے مخصوص تھا۔ بدر میں بھی اسی خاندان کے بہادر علم بردار رہے تھے۔ اس وقت ابوسفیان نے ان کو علم سپرد کرنے کا ارادہ کیا تو ضروری سمجھا کہ ان سے عہد بھی لے لے چنانچہ جب علم حوالے کرنے کا وقت آیا تھا تو اس نے کہا:

بدر میں جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اس وقت اگر آپ کے بہادر تیار ہیں کہ اس جھنڈے کی عظمت برقرار رکھنے کے لیے اپنی جانوں کی پروا نہ کریں تو بے شک علم برداری آپ صاحبان کا حق ہے اس حق کو حاصل کیجئے اور اگر یہ ہمت نہ ہو تو ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اپنی جانوں کی قیمت پر اس کی عزت برقرار رکھیں اور اس فرض کو انجام دیں۔

آل عبدالدار نے ابوسفیان کی طنز آمیز تقریر سنی تو بھڑک اٹھے اور غصہ اور جوش کے لہجہ میں جواب دیا: یہ کیسے ممکن ہے ہم اپنا خاندانی اعزاز آپ کے حوالے کر دیں۔ ہم موت سے جان چرانے والے نہیں ہیں۔ جھنڈا ہمارے حوالے کیجئے اور میدان جنگ میں دیکھ لیجئے ہم کیا کرتے ہیں۔ (۶۴۴)

ابوسفیان یہی کہلوانا چاہتا تھا اس نے جھنڈا ابنِ عبدالدار کے نمائندہ طلحہ بن (۶۴۵) ابی طلحہ کے حوالہ کر دیا۔ قریش کے مشیر کار ابو عامر نے میدان کے اس حصہ میں جہاں مسلمان پہنچ سکتے تھے گڑھے کھدوا کر ہلکے پٹاؤ سے ان کو چھپا دیا تھا کہ اس پر پیر پڑے تو پٹاؤ نیچے بیٹھ جائے اور چلنے والا گڑھے میں گر جائے۔ (۶۴۶)

لشکر اسلام کی صف بندی اور مورچے:

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (آل عمران ع ۱۳)

''اے نبی وہ وقت یاد کرو جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے کہ بٹھا رہے تھے مسلمانوں کو لڑائی کے ٹھکانوں (مورچوں) پر اور اللہ سنتا جانتا ہے۔''

رات جہاں قیام رہا تھا۔ نماز صبح کے بعد (۶۴۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے روانہ ہوئے حضرت ابوخثیمہ حارثی کی رہنمائی میں دشمن کی فوج سے بچتے ہوئے قریب کے راستے سے کوہ احد کے دامن میں پہنچ گئے۔

دشمن کو تین راتیں اس علاقہ میں گذر گئی تھیں۔ اب وہ جنگ کے لیے تیار تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی میدان میں پہنچتے ہی تیاری شروع کر دی۔ مگر طاقت کا توازن غزوۂ بدر کی نسبت سے بھی کم تھا۔

غزوۂ بدر میں تین سو تیرہ کا مقابلہ نو سو پچاس سے تھا۔ یعنی ایک اور تین کی نسبت تھی لیکن اس وقت سات سو کا مقابلہ تقریباً بتیس سو سے تھا۔ یعنی ایک اور تقریباً پانچ کا مقابلہ تھا۔ دشمن کی فوج میں تین ہزار اونٹ اور دو سو گھوڑے تھے۔ مگر مسلمانوں کا یہ سفر پا پیادہ ہوا تھا اونٹ ایک بھی نہیں تھا۔ گھوڑا صرف ایک تھا یا زیادہ سے زیادہ دو۔ (۶۴۸)

دشمن کی فوج میں سات سو زرہ پوش تھے اور ایک سو تیر انداز۔ اسلامی فوج میں صرف سو زرہ پوش تھے اور پچاس تیر انداز۔

اس تھوڑی تعداد اور قلیل سامان کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کا نقشہ ایسا قائم کیا تھا کہ کامیابی یقینی تھی۔ فوج کے دائیں بائیں میمنہ اور میسرہ مقرر فرمایا اور کوہ احد سے حصار کا کام لیا۔ یعنی پہاڑ کو پشت

کی طرف رکھا۔ صرف ایک گھاٹی سے غنیم کے گھس آنے کا خطرہ تھا۔ وہاں پچاس تیر اندازوں کا دستہ مقرر فرما دیا۔ حضرت عبداللہ بن جبیر (رضی اللہ عنہ) کو اس دستہ کا امیر اور افسر مقرر فرمایا اور بہت سخت ہدایت فرمائی کہ میدان میں مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں اگر وہ دیکھ لیں کہ ہماری لاشیں تڑپ رہی ہیں جانور ان کو نوچ رہے ہیں تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ اس طرح صرف پچاس تیر اندازوں کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کو محفوظ فرما دیا۔ جس کے لیے تقریباً ایک تہائی فوج درکار ہوا کرتی ہے۔ صرف ایک جانب یعنی سامنے کی جانب باقی تھی جس کے لیے حضرات مجاہدین کی موجودہ تعداد کافی تھی۔

علم برداری ایک خاص اعزاز ہے۔ قریش میں یہ اعزاز بنی عبدالدار کے لیے مخصوص تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا لحاظ فرمایا۔ آپ نے مہاجرین کا علم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا تھا لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ ابوسفیان نے روایات قریش کا لحاظ کرتے ہوئے جھنڈا بنی عبدالدار کے سپرد کیا تو آپ نے بھی اسی خاندان کے ایک ممتاز مہاجر و مجاہد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو طلب فرما کر علم ان کے حوالے کر دیا اور فرمایا۔ نحن احق بالوفاء منھم [۶۴۹] "ان کے مقابلہ میں ہم پر زیادہ حق ہے کہ ہم وفا کریں" (خاندانوں کے روایتی احترامات کو باقی رکھیں) [۶۵۰]

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے بڑی قوت اور شدت سے دشمن کا مقابلہ کیا اور جب آپ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا۔ [۶۵۱]

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ زرہ پوش رسالے کے افسر مقرر ہوئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو ان کی کمان سپرد ہوئی جو زرہ پوش نہ تھے۔

ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پا پیادہ گھوم کر صفیں قائم فرمائیں۔ [۶۵۲]
جسد اطہر پر دو زرہیں تھیں سر مبارک پر مغفر اور اس کے اوپر خود تھا۔ شانہ اقدس پر ایک طرف تلوار کا پرتلا تھا دوسری جانب کمان پشت پر ترکش اور دست بیضاء میں نیزہ۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

وعدہ نصرت اور نصرت جنگ کا ابتدائی دور

(۱) اذ تقول للمومنين الن يكفيكم ان يمدكم ربكم بثلاثة الاف من الملائكة منزلين (سورہ آل عمران ع ۱۳)

(۲) ولقد صدقكم الله وعده اذ تحسونهم باذنه (سورہ آل عمران ع ۱۶)

''(اے پیغمبر وہ وقت یاد کرو) جب تم ایمان والوں سے کہہ رہے تھے کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ (دشمن کے تین ہزار کے مقابلہ میں) تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے۔''

''(اور دیکھو) یہ واقعہ ہے۔ اللہ نے اپنا وعدہ نصرت سچا کر دکھایا۔ جب کہ تم اس کے حکم سے دشمنوں کو بے دریغ تہ تیغ کر رہے تھے۔''

دونوں طرف صفیں آراستہ ہو گئیں تو خاتونان قریش نے پہل کی۔ دف پر اشعار پڑھتی ہوئی آگے بڑھیں۔ جن میں کشتگان بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے۔ ہندہ (ابوسفیان کی بیوی اور رئیس قریش عتبہ بن ربیعہ کی لڑکی) آگے آگے تھی اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں۔ اشعار یہ تھے۔ (۶۵۳)

نحن بنات طارق نمشي على النمارق ان تقبلوا نعانق ان تدبروا نفارق فراق غير وامق۔

ہم آسمان کے تارے کی بیٹیاں ہیں (ہمارے خاندان سب سے اعلیٰ ہیں) ہم قالینوں پر چلا کرتی ہیں (ہمارے محلوں میں قالینوں کے فرش ہوتے ہیں) اگر تم آگے بڑھو گے ہم تمہیں گلے لگائیں گی۔ اگر تم پیٹھ دکھاؤ گے تو تم سے فراق ہوگا۔ ایسا فراق جس میں محبت کا نام ونشان نہ ہوگا۔

بنوعبدالدار جو علم بردار تھے۔ ان کو خطاب کرتے ہوئے یہ رجز پڑھتی تھیں:

ويها بني عبدالدار ويها حماة الادبار ضربا بكل تبار

''شاباش بنوعبدالدار شاباش بہادرو! جو اپنی پیٹھ بچاتے ہیں (سینہ پر زخم کھاتے ہیں) جو تیز تلواروں سے بھرپور ضرب لگاتے ہیں۔''

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو اپنے نمائشی زہد اور پارسائی کی وجہ سے مدینہ میں اسلام سے پہلے مقبول تھا۔ پھر مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا۔ چونکہ اس کو خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اس نے میدان میں آ کر پکارا مجھے پہنچانتے ہو، میں ابو عامر ہوں۔ انصار نے جواب دیا۔ او بدکار۔ نمائشی زاہد ہم تجھے پہچانتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی تجھے مرحبا کہنے کو تیار نہیں ہے۔ ابو عامر نے خلاف توقع یہ جواب سنا تو کہنے لگا۔ میرے بعد قوم

کا مزاج بگڑ گیا۔ پھر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مسلمانوں پر سنگ باری شروع کر دی۔ مسلمانوں نے ڈھیلے کا جواب پتھر سے دیا اور تھوڑی ہی دیر میں ان کا منہ پھیر دیا۔ (۶۵۴)

اب باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ قریش کا علمبردار طلحہ میدان میں آیا اور پکار کر کہا۔ کوئی ہے جو میرے ہاتھ سے جنت میں پہنچ جائے یا اپنے ہاتھ سے مجھے دوزخ میں پہنچا دے۔ (۶۵۵)

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور سر پر ایسی تلوار ماری کہ عمامہ کو چیرتی ہوئی گردن تک پہنچ گئی۔ ظفریابی کی مسرت نے زبان مبارک پر کلمہ تکبیر جاری کر دیا۔ مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے خواب میں جو کبش الکتیبہ دیکھا تھا وہ یہی ہے جو پہلے ہی ذبح کر دیا گیا ہے۔ (۶۵۶)

طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے علم ہاتھ میں لیا اور یہ رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا۔

ان علی اهل اللواء حقا ان تخضب الصعدة او تندقا

علم بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون میں رنگتا رہے یہاں تک کہ نیزہ ٹوٹ جائے

خواتین قریش اس کی پشت پر اشعار پڑھ کر جوش دلا رہی تھیں۔

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ فوراً آگے بڑھے اور شانہ پر ایسی تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی۔ پیٹ چاک ہو گیا۔ تمام انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ ساتھ ہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلا **انا ابن ساقی الحجیج**۔ میں ہوں ساقی (۶۵۷) حجاج کا بیٹا۔ (۶۵۸)

عثمان کے بعد طلحہ اور عثمان کے تیسرے بھائی ابوسعد بن ابی طلحہ نے جھنڈا ہاتھ میں لیا تو سیدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس کو تیر کا نشانہ بنالیا۔ تیر ابوسعد کے چہرہ اور گردن میں اس طرح پیوست ہوا کہ ابوسعد کی زبان آگے نکل آئی۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دیا لیکن بنوعبدالدار نے پھر بھی جھنڈا نہیں گرنے دیا۔ ابوسعد کے بعد علم بردار اول طلحہ کے بیٹے مسافع بن طلحہ نے علم کو بلند کیا۔ لیکن ابھی پوری طرح سنبھالنے بھی نہیں پایا تھا کہ حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے تیر مار کر اس کو ہلاک کر دیا۔

مسافع کے بعد اس کے بھائی کلاب بن طلحہ نے جھنڈا سنبھالا۔ جس کو حضرت زبیر ابن عوام رضی اللہ عنہ کی ایک تلوار نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر طلحہ کے تیسرے بیٹے جلاس بن طلحہ نے جھنڈا ہاتھ میں لیا لیکن ساتھ ہی حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی تلوار نے اس کو موت کا گھونٹ پلا دیا۔

خاص طلحہ کے گھر کے چھ آدمی یکے بعد دیگرے جھنڈے پر قربان ہو چکے تو قریش کی لاج رکھنے کے لیے ارطاۃ بن شرجیل (۶۵۹) نے جھنڈا اٹھایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً ہی ارطاۃ پر حملہ کر کے اس کو ختم کر دیا۔

ارطاۃ کے بعد ابوطلحہ کے غلام صواب نے جھنڈا بلند کیا مگر وہ فوراً تہ تیغ کر دیا گیا اور جھنڈا متاع بے مایہ بن کر زمین پر گر گیا۔ (۶۶۰)

عام جنگ:

علم بردار یکے بعد دیگرے قتل کیے جا رہے تھے اور عام جنگ کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تلوار (۶۶۱) دست مبارک میں لی اور فرمایا کہ کون اس کا حق ادا کرتا ہے۔ اس سعادت کے لیے دفعتہً بہت سے ہاتھ بڑھے۔ حضرت عمر حضرت زبیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سب ہی کے ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ مگر یہ فخر ابو دجانہ (رضی اللہ عنہ) کے نصیب میں تھا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو جب تلوار نہیں ملی تو انہیں تعجب ہوا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اس کا احساس تھا کہ میں قریش کا مشہور شمشیر زن ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ بھی بہت قریب کا رکھتا ہوں میری والدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی ہیں پھر بھی مجھے تلوار عطا نہیں ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے مقابلہ میں ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کی درخواست منظور فرمائی ہے۔ یقیناً کوئی بات ہے جس کی وجہ سے ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجیح دی ہے۔ اچھا اب مجھے چاہیے کہ میں ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے چلوں اور دیکھوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے دیکھا ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے ایک رومال (سربند) نکالا۔ جس کا رنگ سرخ تھا اور اس کو سر پر کس لیا۔ لوگوں نے کہا یہ عصابۃ الموت ہے جب ابو دجانہ رضی اللہ عنہ مرنے کی ٹھان لیتے ہیں تب یہ ہی باندھا کرتے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس پر ایک طرف لکھا ہوا تھا نصر من اللہ وفتح قریب اور دوسری جانب یہ فقرہ تھا الجبانۃ فی الحرب عار ومن فرلم ینج من النار (۶۶۲) (جنگ میں بزدلی عار ہے اور جو فرار اختیار کرے وہ عذاب دوزخ سے نہیں بچ سکتا۔)

ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے یہ سرخ رومال سر پر باندھا تلوار ہاتھ میں لی اور اکڑتے تنتے ہوئے دشمن کی فوج کی طرف چلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رفتار دیکھی تو فرمایا۔ یہ چال خدا کو ناپسند ہے لیکن اس موقع پر (جب دشمنان خدا سے مقابلہ ہو) پسندیدہ رفتار یہی ہے۔ بہادرانہ ولولہ کا اثر جس طرح رفتار پر تھا گفتار بھی ایسی ہی پرجوش تھی۔ قدم دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے اور زبان پر یہ اشعار (۶۶۳) تھے:

انا الذی عاھدنی خلیلی

ان لا اقوم الدھر فی الکیول

ونحن بالسفح لدی النخیل

اضرب بسیف اللہ والرسول

''میں وہ ہوں کہ میرے جگری حبیب نے مجھ سے عہد لیا ہے کہ جب کہ ہم دامن کوہ میں کھجور کے باغ کے پاس تھے۔ میں کبھی بھی فوج کی پچھلی صف میں نہیں رہوں گا میں اللہ اور رسول کی تلوار سے (دشمنوں کو) مارتا رہوں گا۔''

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابودجانہ فوجوں کو چیرتے لاشوں پر لاشے گراتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ہندہ سامنے آ گئی۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کی تلوار اس کے سر تک پہنچ گئی تھی مگر جیسے ہی احساس ہوا کہ عورت ہے۔ تلوار روک لی کہ سیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان نہیں کہ کسی عورت پر آزمائی جائے (۶۶۴)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے۔ قریش کا علمبردار عثمان بن ابی طلحہ آپ کی تلوار کی نذر ہو چکا تھا۔ اسی حالت میں سباع بن عبدالعزیٰ غبشانی سامنے آ گیا۔ پکارا! او مقطعتہ البظور (۶۶۵) ختنے کرنے والی کے بچے کہاں جاتا ہے یہ کہہ کر تلوار ماری اور اس کو افسانہ ماضی بنا دیا۔

وحشی ایک حبشی غلام تھا۔ اس کے آقا جبیر بن مطعم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے ہی سباع بن عبدالعزیٰ کو پچھاڑ کر پلٹے حبشی نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے تھے جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہوتا تھا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی۔ (۶۶۶)

غسیل الملائکہ:

حضرت حنظلہ نوجوان مجاہد تھے۔ نئی شادی ہوئی تھی۔ اہلیہ کے پاس خلوت کدہ میں تھے کہ حملہ کی خبر پہونچی۔ فوراً میدان کی طرف دوڑے۔ ابو عامر جس نے حملہ میں پہل کر کے سنگ باری کی تھی۔ حنظلہ کے باپ تھے۔ حضرت حنظلہ نے اجازت (۶۶۷) چاہی کہ یہ باپ پر حملہ کر دیں لیکن رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے آپ نے اجازت نہیں دی۔

حنظلہ نے کفار کے سپہ سالار ابوسفیان پر حملہ کر دیا اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابوسفیان کا فیصلہ کر دے۔ دفعتہً شداد بن الاسود نے جھپٹ کر حضرت حنظلہ کے وار کو روکا اور حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا۔ (۶۶۸) رضی اللہ عنہ۔ یہ وہ حنظلہ ہیں جنہیں غسیل الملائکہ کہتے ہیں جن کے جنازہ کو فرشتوں نے غسل دیا تھا (۶۶۹) عجیب کرشمہ قدرت ہے باپ فاسق اور بیٹا غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ۔

نماز ایک وقت کی نہیں اور جنت میں داخلہ:

بنی عبدالاشہل کا ایک نوجوان عمرو بن ثابت بن وقش جس کو اصیرم کہا کرتے تھے اس کے سامنے اسلام کا تذکرہ ہوا کرتا تھا مگر وہ مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس کے قبیلہ کے آدمی کفار قریش کے ساتھ میدان احد میں آئے مگر یہ اپنے قبیلہ ہی میں رہ گیا تھا۔ خاص اس صبح کو جب یہاں میدان جنگ گرم ہونے والا تھا۔ ایک جذبہ ابھرا۔ اس نے اسلام قبول کیا اور احد کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیکھا کہ یہاں رن پڑ رہا ہے۔ وہ بھی تلوار سونت کر دشمنان

اسلام پر حملے کرنے لگا آخر کار خود زخمی ہوا اور گر پڑا۔ قبیلہ کے لوگوں نے دیکھا کہ زخموں سے چور ہے دم توڑ رہا ہے۔ ان کو تعجب ہوا کہ یہ میدان میں کب پہنچا اور کیوں پہنچا۔ اس سے دریافت کیا۔ یہاں کیسے اور کیوں آئے ہماری حمایت میں یا اسلام کی حمایت میں جواب دیا۔ میں ایمان لا چکا ہوں اور رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جاں نثار بن کر جان دے رہا ہوں۔ یہ جواب دیا اور اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ آنحضرت ﷺ نے بشارت دی۔ انه لمن اهل الجنة یہ جنتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دلچسپ سوال کیا کرتے تھے ایسے شخص کا نام بتاؤ جس نے نماز بالکل نہیں پڑھی اور جنت میں پہنچ گیا۔ پھر خود اصیرم کا نام لے کر یہ قصہ سنایا کرتے تھے۔ (۶۷۰)

نومید مباش کہ رندان بادہ خوار
ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

لنگڑا جنت میں:

عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ لنگڑے تھے۔ لنگ کی وجہ سے چلنا بھی مشکل تھا ان کے چار لڑکے تھے۔ چاروں بہت بہادر جیسے شیر کے بچے۔ غزوۂ احد کے موقع پر لڑکوں نے منع کیا آپ پا شکستہ ہیں۔ چلنا مشکل ہے۔ مکان میں رہیں یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: لنگڑا ہوں مگر قربان ہونے کے لیے تو میدان جہاد میں جا سکتا ہوں۔ ممکن ہے اپنے لنگڑے پاؤں سے جنت ہی میں پہنچ جاؤں۔

گر نتواں بدوست راہ بردن
شرط یاری ست در طلب مردن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تو یہ جواب دیا کہ آپ معذور ہیں آپ پر جہاد فرض نہیں اور لڑکوں کو اشارہ فرما دیا کہ بڑے میاں اگر شوق پورا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کیوں روکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھنے کے بعد بھی بڑے میاں سے نہ رہا گیا۔ میدان جنگ میں پہنچے اور شوق شہادت پورا کیا۔ (۶۷۱)

جانے ست ہر آئینہ بخواہد رفتن
اندر غم عشق تو رود اولی

بہترین یہودی:

قبیلہ بنی ثعلبہ بن غیطون کا ایک یہودی مخیریق اپنے مذہب کا بہت پابند اور قبیلہ کا مشہور آدمی تھا۔ حق و باطل کا یہ معرکہ برپا ہوا تو اس کو بھی جوش آ گیا اور یہودیوں کو للکار کر کہا: تم خوب سمجھتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد ہم سب پر لازم اور ضروری ہے۔ لوگوں نے کہا آج یوم السبت (شنبہ کا دن ہے اس دن جنگ وغیرہ درست نہیں ہے) مخیریق نے جواب دیا۔ جب مدد کرنی ضروری ہے تو سبت کی کوئی پابندی نہیں پھر تلوار لے کر

چلا اور ساتھیوں سے کہہ گیا کہ اگر میں مارا جاؤں تو تم میرا ترکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دینا۔ یہ کہہ کر میدان جنگ میں پہنچا اور مارا گیا۔ پھر اس کی تمام جائیداد آنحضرت صلی اللہ وسلم کے حوالے کر دی گئی۔ یہ سات باغ تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو وقف فرما دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مخیریق یہودیوں میں سب سے بہتر تھا۔

محمد بن کعب قرظی فرمایا کرتے تھے کہ یہ اسلام میں سب سے پہلا وقف تھا۔ (بدایہ ونہایہ ص ۳۷ ج ۴)

مشرکین کا جھنڈا سرنگوں:

مجاہدین کے پے درپے کامیاب حملوں نے دشمن کے پیر اکھاڑ دیئے۔ ناز پروردہ خواتین جو بہادری کی ہوا بھرنے کے لیے آگے آگے تھیں حواس باختہ پیچھے ہٹنے لگیں۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ ابوسفیان کی بیوی ہندہ دامن سمیٹے ہوئے بھاگ رہی ہے۔ پنڈلیاں کھلی ہوئی ہیں۔ پازیب ڈھلک رہے ہیں اور پہاڑ پر بدحواس چڑھی جارہی ہے اس کی سہیلیاں پیچھے پیچھے ہیں۔

بنی عبدالدار کا آخری شخص ارطاۃ بن شرجیل تھا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو بھی قتل کر دیا تو بنی عبدالدار میں سے کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ جھنڈا سنبھالے۔ البتہ ابوطلحہ کے حبشی غلام صواب کو غیرت آئی۔ اس نے آقاؤں کی لاج رکھنے کے لیے جھنڈا سنبھالا لیکن جیسے ہی علم ہاتھ میں لیا کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ ایک ساتھ کٹ کر گر پڑے پھر بھی اس نے گوارا نہ کیا کہ وہ علم خاک پر سرنگوں دیکھے۔ جیسے ہی ہاتھ نیچے گرے وہ جھنڈے کو سینہ سے لگائے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا اور گردن کے سہارے سے اس کو کھڑا رکھا۔ اس حالت میں یہ کہتا ہوا مارا گیا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ (۶۷۲)

جھنڈا دیر تک زمین پر پڑا رہا۔ پھر جب بھاگنے والے کچھ سنبھلے (جس کی تفصیل آگے آتی ہے) تو ایک خاتون عمرہ بن علقمہ دلیرانہ بڑھی اور علم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا۔ (۶۷۳)

تعاقب اور غنیمت:

دشمن کے علم بردار قتل ہو چکے۔ جھنڈا گر چکا۔ پیش رو خواتین بدحواس بھاگ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ پہاڑوں اور ٹیلوں پر چڑھ گئیں۔ دشمن کے جتھے ٹوٹ گئے۔ میدان خالی ہو گیا۔ مسلمان ان کا تعاقب کرتے ہوئے ان کے خیموں تک پہنچ گئے جنگ بدر کا سماں آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ کامیابی یقینی ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف چند حضرات رہ گئے جو حفاظت کی غرض سے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بلاشبہ اللہ کا وعدہ پورا ہو گیا۔ مسلمانوں نے ایک ہی مرحلہ میں تنیس مشرکین کو تہ تیغ کر دیا۔

ہزیمت وانتشار اور اس کی وجہ

دست بدست پاداشِ عمل

(۱) وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وعده اذ تحسونهم باذنه حتى اذا فشلتم وتنازعتم فى الامر وعصيتم من بعدما اراكم ما تحبون منكم من يريد الدنيا ومنكم من يريد الاخرة ثم صرفكم عنهم ليبتليكم ولقد عفا عنكم والله ذو فضل على المومنين اذ تصعدون ولا تلوون على احد والرسول يدعوكم فى اخراجكم

(سورہ آل عمران ع ۱۶)

(۲) اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہ (سورہ آل عمران ع ۱۷)

(۱) ''یہ واقعہ ہے اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ نصرت سچا کر دکھایا تھا جب کہ تم اس کے حکم سے دشمنوں کو بے دریغ تہ تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دکھائی اور جو کام تمہارے ذمہ تھا اس میں جھگڑنے لگے (ایک گروہ نے کہا اب مورچے پر ٹھیرنے کی ضرورت نہیں ہے، دوسرے نے کہا نہیں ہم تو آخر تک یہیں جمے رہیں گے) اور نافرمانی کر بیٹھے (اپنے سردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کی) یہ سب کچھ اس کے بعد کیا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں وہ (نصرت اور کامیابی) دکھا چکا تھا جو تمہیں محبوب ہے۔ تم میں سے کچھ تو ایسے تھے جو دنیا کے خواہش مند تھے (یعنی مال غنیمت کے پیچھے پڑ گئے (جو اگر چہ ناجائز نہیں تھا مگر اس وقت اس کے لیے دوڑنا بے موقع تھا) کچھ ایسے تھے جن کی نظر آخرت پر تھی (یعنی مالِ غنیمت سے بے پرواہو کر اپنی جگہ جمے رہے اور شہید ہوئے) پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارا رُخ دشمن سے پھیر دیا۔ اس طرح تمہاری فتح شکست سے بدل گئی تاکہ تمہیں (اس حادثہ سے) آزمائے (بہر حال) خدا نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور بلاشبہ وہ مومنوں کے لیے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے۔ یاد کرو یہ وہی وقت تھا جب تم (میدان جنگ سے) بھاگے جا رہے تھے اور حال یہ تھا کہ کسی کو پیچھے مڑ کر دیکھتے نہ تھے اور اللہ کا رسول تم کو تمہاری پہلی جماعت میں (عقب میں) پکار رہا تھا۔''

(۲) ''اور جب تم پر مصیبت پڑی اور یہ مصیبت ایسی تھی کہ اس سے دوگنی مصیبت

تمہارے ہاتھوں (بدر میں) دشمنوں پر پڑ چکی تھی تو تم بول اُٹھے یہ مصیبت ہم پر کہاں سے آ پڑی۔ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہہ دو (بے شک مصیبت ضرور پڑی مگر) خود تمہارے ہی ہاتھوں آئی (یاد رکھو) اللہ کو ہر بات پر قدرت حاصل ہے۔"

کتاب اللہ کی مندرجہ بالا آیتوں نے ہزیمت و انتشار کا اجمالی نقشہ بھی پیش کر دیا اور اس کی وجہ بھی بتا دی۔ تفصیل اور تشریح سے پہلے چند باتیں قابل توجہ ہیں:

(۱) غلطی چند افراد کی تھی مگر کتاب اللہ نے مخاطب پوری جماعت کو کیا۔ کیونکہ پوری جماعت جسد واحد اور ایک جسم ہے۔ ایک عضو کی کمزوری پورے بدن کو کمزور کر دیتی ہے۔

(۲) منشا یہ بھی ہے کہ گنہگاروں کی پردہ پوشی ہو۔ کیونکہ جرم قصداً نہیں تھا، ایسا جرم تھا جس کو خطاء اجتہادی یا غلط فہمی بھی کہا جا سکتا ہے اور شان ستاری یہ ہے کہ ایسے مجرموں کی پردہ پوشی کی جائے۔ البتہ غلطی کی وضاحت ضروری تھی تاکہ آئندہ کے لیے تنبیہ ہو اور یہ خامی باقی نہ رہے۔

(۳) بعض الفاظ سخت ہیں کیونکہ کلام اللہ کا اسلوب ہی یہ ہے کہ وہ جن کو اللہ والا قرار دیتا ہے ان کی گرفت سخت کرتا ہے لیکن اس اسلوب کی بنا پر کسی گستاخ مصنف کے لیے جائز نہیں کہ اللہ اور اولیاء اللہ (صحابہ کرام) کے باہمی معاملہ میں مداخلت کر کے واقعہ اُحد یا اس جیسے کسی واقعہ کی تعبیر کے لیے ان کے حق میں توہین آمیز الفاظ استعمال کرے جن کے متعلق حضرت حق جل مجدہ کی شہادت یہ ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً (سورہ حجرات ع ۱)

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا

"اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا اور کفر، فسق اور عصیان کو تمہارے لیے بہت زیادہ قابل نفرت چیز بنا دیا۔ یہی ہیں وہ جو راہ راست پر ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور انعام سے۔" (سورہ حجرات ع ۱)

"تقویٰ کی بات کا اور ان کا دامن چولی کا ساتھ کر دیا اور وہ اس کے بہت زیادہ مستحق اور اہل ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر ایک بات کا پورا علم رکھتا ہے۔" (سورہ فتح ع ۳)

قصہ عزیمت و شکست:

وہ پچاس تیرانداز جن کو درہ کی حفاظت کے لیے مامور فرمایا گیا تھا۔ اُنہوں نے میدان پر نظر ڈالی، دشمن کا جھنڈا گرا ہوا تھا، آس پاس علم برداروں کی لاشوں کا انبار تھا، قریش کے سورما سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے اور مسلمان ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ جوش دلانے والی خواتین کو خیموں میں بھی پناہ نظر نہ آئی تو وہ پہاڑوں اور

ٹیلوں پر چڑھی جارہی تھیں۔ میدان خالی ہو چکا تھا۔ مسلمان دشمن کے خرگاہ اور اصطبل تک پہنچ چکے تھے۔ کامیابی کا حسین چہرہ جو مسلمانوں کو محبوب تھا بے نقاب ہو کر سامنے آ چکا تھا۔

اب یہاں ٹھہرنے کی کیا ضرورت؟ چلو ہم بھی آگے بڑھیں۔ غنیمت میں حصہ لیں۔ دشمن کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کریں۔ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یا امیر و سپہ سالار) کی ہدایت واجب التعمیل ہے۔ مگر جب منشاء ہدایت پورا ہو گیا تو فریضہ تعمیل بھی ادا ہو چکا۔ اب ہم آزاد ہیں۔

اس حفاظتی دستہ کے بیشتر مجاہدین کا فیصلہ یہی ہوا۔ ان کے امیر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ منشاء ہدایت کچھ بھی ہو ہمیں ہدایت پر عمل کرنا ہے۔ ہدایت یہ تھی کہ میدان میں مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست اس دستہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اسی مورچے پر قائم رہے۔ لہٰذا ہمیں اسی مورچہ پر رہنا ہے۔ مگر صرف چند حضرات نے حضرت عبداللہ بن جبیر کی رائے کی موافقت کی وہ یہیں رہے آگے نہ بڑھے۔

قرآن حکیم نے ان حضرات کی تحسین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا مِنۡكُمۡ مَنۡ يُرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ''تم میں وہ بھی تھے جو آخرت چاہتے تھے۔''

باقی تینتالیس آدمی مورچے سے ہٹ کر میدان میں پہنچ گئے اور غنیمت میں حصہ لینے لگے۔ اگرچہ ان کے پاس عذر تھا کہ وہ اپنی فہم کے مطابق اپنی ڈیوٹی انجام دے چکے اور مورچہ سے ہٹنے کے بعد بھی مصروف جہاد ہیں۔ کیونکہ دشمن کو زک دینے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ مالی نقصان پہنچایا جائے اور جب یہ طے ہے کہ مال غنیمت پہلے اللہ اور اس کے رسول کا ہے اس کے بعد وہ ان کو دیا جائے گا جو مستحق قرار دیے جائیں گے، کوئی مجاہد بے ضابطہ ایک دھاگا بھی نہیں رکھ سکتا، ورنہ اس کا جہاد اکارت اور وہ مستحق دوزخ ہوگا تو مال غنیمت کی فراہمی خود غرضی یا نفع اندوزی نہیں بلکہ اللہ اور رسول کے فنڈ کے لیے رضا کارانہ خدمت ہے۔ چونکہ ان کا متعین حصہ لامحالہ ان کو ملے گا لہٰذا حرص کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال ان کے پاس اگرچہ عذر تھے مگر کتاب اللہ نے ان سب کو نظر انداز کر کے یہ تنقید فرمائی۔ مِنۡكُمۡ مَنۡ يُرِيۡدُ الدُّنۡيَا بعض تم میں سے وہ ہیں جو دنیا چاہتے ہیں۔'' کیونکہ صورت ایسی ہی تھی کہ گویا خواہش دنیا اس خطا کاری کا سبب اور محرک بنی تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دامن تقدس کے لیے یہ بھی نازیبا ہے کہ دنیا طلبی کا معمولی دھبہ بھی اس کے کسی شکن پر پڑ جائے۔

لیکن اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے۔ ان کے عذر اگرچہ قابل پذیرائی نہیں ہوئے مگر دلوں کی پاکی نے سند معافی حاصل کر لی۔ چنانچہ اس تنقید کے ساتھ یہ تسلی بھی دے دی گئی۔

وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ ۗ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ

''بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کے لیے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے۔''

وَعَصَیْتُمْ تم نے عصیان کیا:

لیکن ایک نہایت نازک صورت حال اور بھی تھی (روحی فداہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ میں، جب کہ فوجی لباس زیب تن تھا ایک ہدایت دی تھی۔ اس ہدایت کی خلاف ورزی اگر کسی عذر کی بنا پر تھی اور دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا تو روحانی اعتبار سے نظر انداز کی جا سکتی تھی یعنی یہ گناہ معاف ہو سکتا تھا جیسا کہ معاف کر دیا گیا۔ مگر فوجی نظم ونسق کے لحاظ سے خرابی آئی وہ بے نتیجہ نہیں رہ سکتی تھی۔ پانی کا بند قصداً توڑا جائے یا غلطی سے ٹوٹ جائے سیلاب ضرور آئے گا۔ چنانچہ جیسے ہی یہ مورچہ ٹوٹا دشمن کے سیلاب نے لشکر اسلام کو تہ و بالا کر دیا۔ یہی نتیجہ پیش نظر ہے جس کی بنا پر لَقَدْ عَفَا عَنْکُمْ کے ساتھ لفظ عَصَیْتُمْ بھی تاریخ کا آئینہ بن کر لوح قرآن میں کندہ ہے۔

غلطی کا نتیجہ:

مورچہ چھوڑنے والے مجاہدین کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ دشمن کی فوج کو ایسے جرنیل میسر ہیں جو اپنی عقابی نگاہوں سے تحت الثریٰ کی چیزیں بھی دیکھ سکتے ہیں اور جنگی تدبیروں سے اپنے حریف کی فتح کو شکست سے بدل سکتے ہیں۔

خالد بن ولید، عکرمہ بن ابی جہل، جو بعد میں اسلام کے جلیل القدر جرنیل ہوئے۔ اس وقت فوج قریش کے ممتاز کمانڈر تھے۔ خالد بن ولید کی نظر اس مورچہ پر پڑی جو کمزور ہو چکا تھا۔ وہ سواروں کا دستہ لے کر دوڑے اور پہاڑ کے پیچھے سے اس مورچہ پر حملہ کر دیا۔ جو مجاہدین یہاں موجود تھے، انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جب تک وہ زندہ رہے سواروں کے قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔ بالآخر یہ سب جانباز شہید ہوئے اور سواروں کا دستہ دندناتا ہوا منتشر مسلمانوں کے سروں پر پہنچ گیا۔ مسلمانوں کی صفیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور یہ دستہ شیرازہ بند تھا۔ مسلمان پا پیادہ، یہ سوار، عربی گھوڑوں کی ٹاپوں نے گرد اڑایا تو غبار کا بادل سروں پر چھا گیا۔ ایک دوسرے کی پہچان مشکل ہو گئی۔

قریش کی ایک بہادر خاتون (عمرہ بنت علقمہ) کو اُمید کی کرن نظر آئی تو اس نے گرا ہوا جھنڈا بلند کر دیا جو مشرک آس پاس تھے وہ سب جھنڈے کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر آوازیں [۶۷۴] بلند ہوئیں پیچھے پلٹو۔ تو مسلمان اور مشرک دونوں ہی پیچھے پلٹے۔ مگر تعداد میں ایک اور پانچ کا فرق تھا اور حوصلوں میں یہ تفاوت کہ مشرک پراُمید اور مسلمان قدرتاً مایوس۔

یہاں آیت بالا کے پہلے حصہ کی دوبارہ تلاوت کر لیجیے۔ جس کا مضمون ہے:

> ''تم دیکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہو رہا ہے۔ چنانچہ تم دشمنوں کو بے دریغ تہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم نے محبوبہ کامیابی کا نظارہ کر لیا تو تم بزدل بن گئے۔''

ایک سخت جھٹکا

لشکرِ اسلام کو ہزیمت، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم مجروح، دندان مبارک شہید، مسلمانوں کی سراسیمگی۔ پھر اطمینان، صحابہ کرام کا جذبہ ایمان، ذات اقدس محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہر ایک مصیبت ہیچ۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰىکُمْ فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا مَآ اَصَابَکُمْ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغْشٰی طَآئِفَۃً مِّنْکُمْ وَطَآئِفَۃٌ قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاھِلِیَّۃِ (سورہ آل عمران ع ۱۶)

''جب تم دوڑے چلے جارہے تھے اور کسی کو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے تھے اور اللہ کا رسول تم کو پکار رہا تھا تمہارے عقب میں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک غم کے بعد دوسرے غم کا بدلہ دیا (رنج پر رنج پہنچایا) تا کہ غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ سے جاتا رہا نہ اس پر جو تم پر پڑا اور یاد رکھو جو تم کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ پھر (ایسا ہوا) کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل کیا غم کے بعد اطمینان (یعنی) اونگھ۔ جو تمہاری ایک جماعت پر چھا رہی تھی اور ایک جماعت تھی ان کو فکر پڑا تھا اپنی جانوں کا خیال کرتے تھے اللہ کی جناب میں ناحق خیال جو عہد جاہلیت کے خیال تھے۔''

عجیب افراتفری کا وقت تھا۔ میدان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف وہ چند صحابہ تھے جو محافظ دستہ کے طور پر وہاں حاضر تھے۔ باقی مجاہدین میدانِ جنگ سے آگے غنیم کے خیموں تک پہنچے ہوئے تھے کہ دفعتاً خالد بن ولید کا اسپ سوار دستہ درہ سے گزر کر حملہ آور ہوا۔ عمرہ بنت علقمہ نے قریش کا گرا ہوا جھنڈا بلند کر دیا۔ جو مشرک میدان میں باقی تھے وہ فوراً جھنڈے کے گرد جمع ہو گئے۔ بڑی تعداد جو بھاگی جا رہی اس کو آواز دینے لگے وہ بھی پلٹ پڑی۔ مسلمان پہلے سے تعداد میں ایک چوتھائی سے بھی کم تھے مگر وہ جتھہ بند تھے۔ صفیں اس طرح قائم کی گئی تھیں کہ ایک مضبوط حصار کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔ مگر اب یہ قلیل طاقت بھی منتشر تھی اور اسی انتشار کی حالت میں پلٹی تو دشمن کی فوج میں پھنس کر رہ گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جب یہ واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے تو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسری میں پھنسا کر سمجھایا کرتے تھے کہ مسلمان اس طرح مشرکوں کے جال میں [(۶۷۵)] پھنس گئے تھے۔

دشمن کی کثرت کے علاوہ گرد و غبار نے نہ صرف چہروں کو مشتبہ کر دیا تھا بلکہ فضا کو بھی یہاں تک تاریک کر دیا تھا کہ ایک دوسرے کی پہچان مشکل ہو گئی تھی۔ اسی کشمکش میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد ''یمان رضی اللہ

عنہ'' خود مسلمانوں (۶۷۶) کے نرغہ ہی میں آ گئے۔ ان پر تلواریں برس پڑیں۔ حضرت حذیفہ چلائے کہ ''میرے والد'' ہیں۔ مگر جب تک ان کی آواز کانوں میں پڑے حضرت ''یمان رضی اللہ عنہ'' شہید ہو چکے تھے۔ اب پچھتانے سے کیا ہوسکتا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی شکایت کا موقع نہ تھا۔ انہیں حسرت سے یہی کہنا پڑا۔ مسلمانو! خدا تمہیں بخش دے۔ (۶۷۷)

اسی ہلچل اور اضطراب میں عبداللہ بن قمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئے۔ اس نے تلوار سے آپ پر حملہ کیا۔ اسلام کی بہادر خاتون حضرت اُم عمارہ مزنیہ سامنے آ گئیں۔ تلوار ان کے مونڈھے پر پڑی جس سے اتنا گہرا زخم ہو گیا کہ اس کا گڑھا ہمیشہ یادگار، حضرت اُم عمارہ نے بھی تلوار کا جواب تلوار سے دیا۔ مگر وہ زرہ پہنے ہوئے تھا اس پر اثر نہیں ہوا۔ (۶۷۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں جانب پسلیوں پر بھی ابن قمیہ کی تلوار پڑی۔ آہنی زرہوں کی وجہ سے (جو جسد اطہر پر تھیں) زخم تو نہیں ہوا مگر اس کی دکھن بہت دیر تک باقی رہی (۶۷۹) اس مرتبہ حضرت طلحہ ؓ نے تلوار کو ہاتھ سے روکنا چاہا۔ حضرت طلحہ کی اُنگلیاں کٹ گئیں مگر تلوار نہ رُک سکی۔ (۶۸۰)

مہاجرین اسلام کے علم بردار ''حضرت مصعب بن عمیر ؓ'' نے ابن قمیہ کا مقابلہ بڑی ہمت سے کیا مگر جان بچانے میں کامیاب نہ ہوسکے البتہ جام شہادت نوش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

علم بردار شہید ہوئے، جھنڈا گرا۔ ابن قمیہ نے شور مچا دیا۔ میں نے ''محمد'' صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا۔ (۶۸۱)

مسلمان جو پہلے سے گھرے ہوئے اور سراسیمہ تھے اس آواز سے ان کے حواس اور بھی خطا ہو گئے۔ کسی نے ہمت ہار دی مگر جو ہمت والے تھے ان کا بھی زور نہیں چل رہا تھا۔ جو جہاں تھا وہیں کھڑا ہوا تھا۔ کچھ وہ تھے جو اس گھمسان سے باہر تھے مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس بھیڑ میں گھسیں۔ بعض نے پہاڑوں کا راستہ لیا۔ ایک دو مدینہ کی طرف چل دیے۔

حضرت عمر فاروق اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ جیسے باحوصلہ بہادروں کے بھی دل ٹوٹ گئے تھے۔ میدان کے ایک کنارہ پر پریشان حال کھڑے تھے۔ کچھ اور مہاجر و انصار بھی ان کے ساتھ تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن نضر (۶۸۲) اس طرف پہنچے ان سے دریافت کیا کیسے کھڑے ہو۔ جواب ملا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو چکے۔

حضرت انس بن نضر نے فوراً جواب دیا: آپ کے بعد جی کر کیا کریں گے۔ جس پر رسول اللہ نے جان دی تم بھی اس پر مر مٹو۔ (۶۸۳) یہ کہہ کر تلوار سنبھالی، غنیم کی فوج کی طرف لپکے۔ راستہ میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہاں جاتے ہو۔ جواب دیا رب نضر کی قسم اُحد کے اس طرف بوئے جنت سونگھ رہا ہوں۔ پھر دشمن کی فوج میں گھس گئے اور لڑ کر جان دے دی۔ شہادت کے بعد ان کی لاش دیکھی گئی تو اسی سے زیادہ تیر، تلوار

اور نیزہ کے زخم تھے۔کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔صرف ان کی ہمشیرہ نے اُنگلی (یا) تل دیکھ کر پہچانا۔ (۶۸۴)

گر نثار قدم یار گرامی نہ کنم

گوہر جاں بچہ کارے دگرم باز آید

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی انہیں مشاقان شہادت میں سے تھے۔ یہ رات ہی کو اپنے لختِ جگر جابر سے کہہ چکے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جاں نثارانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو سب سے پہلے قربان ہوں گے میں ان میں سب سے پہلا شخص ہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔سینہ پر بہت سے زخم کھا کر آپ نے جامِ شہادت نوش کیا۔کینہ پرور دشمنوں نے ان کے ناک کان بھی کاٹ ڈالے تھے۔ (۶۸۵)

حضرت ثابت بن دحداح انصاری نے انصاری رضی اللہ عنہ دوستوں کو مخاطب کر کے کہا:

جماعت انصار! اگر محمد رسول اللہ شہید کر دیے گئے ہیں تو رب محمد تو حی لا یموت ہے آگے بڑھو۔حی قیوم کے دین کی حمایت میں جانیں قربان کر دو۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے۔انصاری دوستوں کی جماعت ساتھ ساتھ تھی۔ قریش کے ایک جتھ پر حملہ کر دیا جس میں خالد بن ولید،عکرمہ بن ابی جہل عمرو بن العاص اور ضرار بن الخطاب وغیرہ تھے۔تلواروں اور نیزوں سے سخت مقابلہ کیا اور ایک ایک کر کے تمام ساتھی شہید ہو گئے۔ (۶۸۶)

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

رحمت عالمین دشمنوں کے نرغہ میں:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کو آواز دی الی عباد اللہ الی عبداللہ اس وقت تیس صحابہ آپ کی خدمت میں حاضر (۶۸۷) تھے لیکن دشمن کا دباؤ بڑھا تو اس ریلے میں یہ حضرات بھی جدا ہو گئے۔ ایک (۶۸۸) درجن یا اس سے بھی کم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ گئے لیکن جب اور گھمسان ہوا تو یہ بھی بچھڑ گئے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سب سے الگ تھے۔ جب پتھرآ کر لگا،اس گھمسان میں تیر اور تلوار کا ہوش ان دشمنوں کو بھی نہ تھا اس لیے پتھراؤ شروع کر دیا تھا۔تین بد بخت تھے جن کے پتھر یکے بعد دیگرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگے۔عتبہ بن ابی وقاص،عبداللہ بن شہاب زہری،ابن قمیہ حارثی۔

عتبہ بن ابی وقاص کا پتھر چہرہ مبارک پر داھنی جانب لگا جس کے نیچے کے دو دانت داھنی جانب کے شہید ہو گئے۔ نیچے کا ہونٹ چھٹ گیا۔عبداللہ بن شہاب زہری کا پتھر پیشانی مبارک پر لگا۔عبداللہ بن قمیہ جو پہلے بار بار حملے کر چکا تھا اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے شور مچا چکا تھا کہ میں نے محمد کو قتل کر دیا جب اس نے یہ دیکھا کہ یہ "زندہ جاوید" موجود ہے تو دور ہی سے پتھر پھینک کر مارا جو جھالر سے ٹکراتا ہوا چہرہ پر لگا جس سے جھالر کی دو کڑیاں رُخسارِ انور میں گھس گئیں۔ (۶۸۹)

ابو عامر فاسق نے جو گڑھے کھدوائے تھے ان میں کا ایک گڑھا یہاں بھی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ) اس میں گر گئے (۶۹۰) جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں گھٹنے بھی چھل گئے (۶۹۱) اب تھوڑا سا وقفہ ایسا گزرا کہ یہ قبلہ دین وایمان آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا کہ شمع نبوت کے پروانوں پر یہ لمحات کیسے گزرے۔ ایک ہیجان انگیز اضطراب تھا جس نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ یہی وہ وقفہ ہے جس میں پچاس (۶۹۲) سے زیادہ سرفروش شہید ہو گئے۔

جستجو اور کامیابی:

جاں نثاران با اخلاص کے دل مضطرب، دست و بازو دشمنوں کے دفاع میں مصروف مگر، نگاہیں آقا رحمت کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی نظر پڑی۔ خود کے ڈھلکے ہوئے جھالر (مغفر) سے چہرہ مبارک چھپا ہوا تھا صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ حسن جہاں آراء اور جمال روح آفریں کے انہیں دو چشموں سے حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کعبہ مقصود کو پہچانا۔

بے تابانہ زبان سے نکلا مسلمانو! بشارت ہو رسول اللہ یہ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اشارہ کیا شور نہ کریں (۶۹۳) مگر اس مژدہ جاں بخش کی بھنک جس کے کان میں پڑی وہ اس آواز کی طرف دوڑا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس طرف دوڑے۔ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا جوان کے آگے تھا بڑی دلیری اور بے جگری سے لڑ رہا تھا اور دشمنوں کو دھکیل رہا تھا۔ خیال ہوا یہ طلحہ ہیں۔ دیکھا تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک اور شخص پر میری نظر پڑی۔ اس کے سب طرف دشمن تھے پچھلی طرف میں تھا۔ یہ دشمنوں پر تلوار چلا رہا تھا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کھسک رہا تھا۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا تھا۔ یہ صاحب میرے بعد پہنچے۔ میں نے پہچانا یہ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ اسی طرح دشمنوں کو ہٹاتے ہوئے ہم شاہ دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئے۔ روئے مبارک مجروح تھا۔ دندان مبارک شہید تھا مغفر کی کڑیاں رُخسار مبارک میں گڑی ہوئی تھیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کڑیاں نکالنے کا ارادہ کیا تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے قسم دے کر کہا۔ اس خدمت کا موقع انہیں دیجیے۔ ہاتھ سے کڑیاں نکالنے میں تکلیف زیادہ ہوئی تو دانتوں میں دبا کر ایک کڑے کو کھینچا۔ کڑی نکل آئی مگر ساتھ ہی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا دانت بھی ٹوٹ گیا۔

دوسری کڑی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نکالنا چاہتے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے پھر قسم دے کر کہا کہ مجھے ہی موقعہ دیجیے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے دوسرے دانت سے دبا کر کڑی نکالی تو ساتھ ساتھ ابوعبیدہ کا

دوسرا دانت بھی شہید ہوگیا۔

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ مگر چہرے کی رونق ایسی بڑھ گئی کہ کوئی دنداں شکستہ ایسا حسین نہیں معلوم ہوتا تھا۔ (۶۹۴)

دشمنوں کو جیسے ہی اندازہ ہوا انہوں نے اس طرف تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ یہ دونوں بزرگ دانت نکالنے میں مصروف تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ تیروں کو بازو پر لیتے رہے۔ اسی سے زیادہ تیروں اور تلواروں کے زخم بدن پر لگے۔ ایک بازو بالکل شل (۶۹۵) ہوگیا۔ یہی ایثار تھا جس کی بنا پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ذلك يوم كله لطلحة (۶۹۶)

اسی اثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ گڑھے سے نکل کر اُوپر تشریف رکھیں مگر ضعف اور نقاہت کے علاوہ دو زرہوں کا بوجھ بھی تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہنے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چڑھنا چاہا مگر چڑھا نہیں گیا تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نیچے بیٹھ گئے اور آقا دو جہاں کو پشت پر بٹھا کر اُوپر چڑھا دیا۔ (۶۹۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر فرمایا اوجب طلحة (۶۹۸) طلحہ نے جنت پکی کر لی۔

اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حاضر تھے۔ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُوپر چڑھنے میں سہارا دیا۔ (۶۹۹)

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک شیدائی مالک بن سنان رضی اللہ عنہ نے (حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد) چہرہ مبارک سے خون بہتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت اور کچھ نہیں کر سکتے تھے تو لب لگا کر خون چوس (۷۰۰) لیا اور جب منہ بھر گیا تو تھوکنے کے بجائے نگل لیا۔ (۷۰۱)

چٹان کے اُوپر سے میدان سامنے تھا۔ جیسے ہی مضطرب جان نثاروں کو دیدار نصیب ہوا مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ شکست و ناکامی کا سارا غم جاتا رہا اور دیوانہ وار شمع رسالت کی طرف دوڑنے لگے لیکن ساتھ ساتھ دشمنوں نے بھی اس طرف کا رُخ کیا۔ تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی اور آگے بڑھ بڑھ کر تلواروں سے حملے کرنے لگے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنا شانہ اور پہلو تیروں کی طرف کیے ہوئے تھے۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ بھی پہنچے اور ڈھال بن کر کھڑے ہوگئے۔ سینہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر جھکائے ہوئے تھے اور کمر پر تلواریں پڑ رہی تھیں، تیر برس رہے تھے۔ (۷۰۲)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ آگے آئے اور نشست صحیح کر کے دشمنوں پر تیر برسانے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیر اُٹھا اُٹھا کر دیتے جاتے تھے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تاک تاک کر مار رہے تھے۔

اس وقت معرکہ حق و باطل کی تاریخ میں ایک نہایت نادر مثال کا اضافہ ہو رہا تھا یعنی ابووقاص کے ایک

بیٹے عتبہ نے پتھر مار کر روئے انور کو مجروح کیا تھا۔ دوسرا بیٹا ''سعد'' اس کی حفاظت کے لیے تیر اندازی کا کمال دکھار ہا تھا اور لسان مقدس سے کلمات تحسین سن رہا تھا کہ تم پر میرے ماں باپ قربان۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا خون اپنا بیان ہے:

نَثَلَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَا كِنَانَتَهٗ يَوْمَ اُحُدٍ وَقَالَ اِرْمِ فِدَاكَ اَبِيْ وَاُمِّيْ

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سامنے اپنے ترکش سے تیر نکال کر ڈال دیے اور فرمایا میرے ماں باپ تم پر قربان تیر مارو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے میرے کانوں نے کبھی نہیں سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے لیے اپنے ماں باپ دونوں جمع کر کے ''فداک ابی وامی'' فرمایا ہو۔ یہ شرف صرف حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ (۷۰۳)

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ مشہور تیرانداز تھے۔ کمان پر آپ کا ہاتھ بہت بھاری پڑتا تھا۔ بڑی زور سے تانت کھینچتے تھے۔ مضبوط کمان ہی آپ کا ہاتھ سہار سکتی تھی۔ آپ کا تیر نشانہ کو پار کرتے ہوئے بہت دور پہنچتا تھا۔ اس روز کئی کمانیں آپ کے ہاتھ میں ٹوٹ گئیں۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایک طرف تھے دوسری طرف حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ڈھال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کے سامنے آڑ کر لی تھی۔ اب ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے تیر کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیکھتے کہ کہاں پہنچا لیکن جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گردن اُٹھاتے، ابوطلحہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے رسول خدا! آپ پر جان عزیز قربان۔ آپ گردن نہ اُٹھائیں۔ نصیب اعداء کہیں کوئی تیر نہ لگ جائے۔ یہ میرا سینہ آپ کے سامنے ہے۔ (۷۰۴)

تیر ختم ہونے لگے تو جس جس کے پاس ترکش تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ترکش لیتے اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے سامنے تیر ڈال دیتے تھے۔ (۷۰۵)

یہ قدر انداز تھے۔ اسی طرح تیغ زن اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔ اسی میں مشتاقان شہادت کے ارمان جاں نثاری بھی پورے ہو رہے تھے۔ ایک مرتبہ دشمنوں کا ہجوم ہوا۔ آپ نے فرمایا: من رجل یشری لنا نفسہ (۷۰۶) کوئی مرد ہے جو میرے لیے اپنی جان قربان کرے۔ دفعتاً سات جان نثار انصاری (۷۰۷) سامنے آئے اور شمشیر زنی کے جوہر دکھاتے ہوئے سب شہید ہو گئے۔ ان میں پیش قدمی کرنے والے بہادر زیاد بن سکن انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ سب سے آخر میں مجروح ہو کر گرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو اُٹھا کر میرے سامنے لاؤ۔ ابھی کچھ جان باقی تھی جیسے ہی قریب پہنچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر سر رکھ دیا اور جان دے دی۔

منم وہمیں تمنا کہ بوقت جاں سپردن
بہ رخ تو دیدہ باشم تو درون دیدہ باشی

ایک بہادر مسلمان بے پروائی سے کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر پوچھا یا رسول اللہ میں مارا جاؤں تو کہاں رہوں گا۔ ارشاد ہوا جنت میں۔ یہ بشارت کانوں میں پڑی تو بے خود تھا کھجوریں پھینکیں کہ اتنی دیر بھی کیوں ہو۔ تلوار سنبھالی، کفار پر ٹوٹ پڑا اور جان دے دی۔ (۷۰۸)

گر مشاہدہ دوست از پس مرگ است

حیات خضر و مسیحا نصیب دشمن باد

اس مدافعت اور بے نظیر جان نثاری کے باوجود دشمنوں کا ہجوم ذات اقدس پر اتنا تھا کہ تقریباً ستر مرتبہ آپ پر تلواروں کے حملے ہوئے۔ (۷۰۹)

حفاظت کے غیبی اسباب:

سیّدنا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر موجود رہے اور دشمنوں پر تیر برساتے رہے، بڑے وثوق سے فرماتے ہیں کہ میں برابر دیکھتا رہا کہ دو شخص آپ کے ساتھ ہیں اور بڑی سختی سے مدافعت کر رہے ہیں۔ ان کے لباس سپید تھے ان کو نہ میں نے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد کبھی دیکھا۔ (۷۱۰)

رئیس مکہ اُمیہ بن خلف غزوہ بدر میں مارا گیا تھا۔ اس کا بھائی ''ابی بن خلف'' مکہ میں کہا کرتا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میں قتل کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کا یہ دعویٰ سنتے رہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ بھی فرما دیا تھا وہ نہیں بلکہ انشاء اللہ میں اس کو قتل کروں گا۔

اس وقت جب دشمنوں کی طرف سے پے در پے حملے ہو رہے تھے اور جاں نثار خدام اپنی جانوں پر کھیل کر مدافعت کر رہے تھے ابی بن خلف گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ صحابہ اس کی طرف بڑھنے لگے تو آپ نے سب کو منع کر دیا اور فرمایا اس کو میرے پاس آنے دو۔ جب وہ قریب پہنچ گیا تو آپ نے حضرت حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ سے جو برابر میں کھڑے تھے حربہ لے لیا اور ابی بن خلف کے اُوپر پھینک مارا۔ وہ حربہ ابی کی گردن پر اُچٹتا ہوا لگا جس سے خراش آ گیا مگر اس معمولی خراش کا یہ اثر ہوا کہ ابی تڑپ کر گھوڑے سے گر پڑا۔ فوراً اُٹھا، سوار ہوا پھر گر گیا۔ اس طرح گرتا پڑتا چنگھاڑتا ہوا بھاگا۔ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا پریشان ہونے کی بات نہیں، نہ اتنے چیخنے کی کوئی وجہ ہے، معمولی خراش ہے۔ تم بلاوجہ اتنے بے تاب ہو رہے ہو۔ ابی نے کہا یہ معمولی ضرب نہیں۔ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی ضرب ہے۔ اگر وہ تھوک بھی دیتا تو (۷۱۱) مجھے مار ڈالتا۔ مجھے جو تکلیف ہے اگر سارے مکہ والوں پر تقسیم کر دی جائے تو سب کی جان نکل جائے۔

ابی بن خلف اسی طرح تڑپتا رہا۔ یہاں تک کہ واپسی میں جب ''سرف''، (۷۱۲) پہنچا تو اس نے دم توڑ دیا۔ وہیں اس کو دبا دیا گیا۔ (۷۱۳)

صرف یہی ایک بدنصیب تھا جس کو دست نبی سے گزند پہنچا۔ ورنہ آپ پر تیر برستے رہے، تلواریں پڑتی رہیں۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ کیونکہ سب سے زیادہ بدنصیب وہ ہے جو نبی کے ہاتھ سے مارا جائے (۷۱۴) آپ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو اپنے ہاتھ سے بدنصیب و بدبخت بنائیں۔

بے خودی عشق و محبت

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست

فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّکَیْلاَ تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلاَ مَا اَصَابَکُمْ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً نُعَاسًا یَغْشٰی طَائِفَۃً مِنْکُمْ (سورہ آل عمران ع ۱۶)

''پس بدلہ میں دیا تم کو غم پر غم (اندوہ بالا اندوہ) (۷۱۵) تا کہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے جاتا رہا اور نہ اس (مصیبت) پر جو تم پر پڑی اور اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو پھر نازل کیا تم پر غم (ابتری اور پریشانی) کے بعد امن (اطمینان و سکون اور بے خوفی) ایک غنودگی جو تمہارے ایک گروہ پر چھا رہی تھی۔''

یہ حصہ دامن کوہ میں تھا جہاں جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ دشمن اُوپر سے حملہ کر سکتا تھا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے ہٹے اُوپر ٹیلے پر تشریف لے گئے۔ یہاں ایک چٹان کے پیچھے کچھ مسلمان تھے جو مایوس ہو کر اور ہمت ہار کر یہاں بیٹھ گئے تھے اور سوچ رہے تھے کہ مستقبل کیا ہوگا۔ کسی کا خیال یہ بھی تھا کہ عبداللہ بن ابی سے کچھ بات چیت کی (۷۱۶) جائے کہ دفعتاً ایک مسلح شخص زرہ پوش خود لگائے ہوئے سامنے آیا۔ اس کے ساتھ اور بھی آدمی تھے۔ یہ پہلے سے سہمے ہوئے تھے۔ خیال کیا کہ دشمن یہاں بھی حملہ آور ہو گیا۔ فوراً کمانیں سنبھالیں اور تیر سیدھے کرنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا میں محمد رسول اللہ ہوں۔ (۷۱۷) اب کیا تھا مردہ قالبوں میں جان پڑ گئی۔ مسرت کی لہر دوڑ گئی سارے غم غلط ہو گئے۔ جان دو جہان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شہادت کی خبر شور محشر تھا جس نے زندوں کو مردہ بنا دیا تھا۔ اب سلامتی کی خبر ہی نہیں پہنچی بلکہ جمال جاں پرور کی زیارت ہو گئی تو مردہ روحیں زندہ ہو گئیں، جو بچھڑ گئے تھے وہ مل گئے، رحمۃ للعالمین کا دامن شفقت سب پر سایہ فگن ہوا تو مضطرب روحوں کو وہ سکون اور بے چین دلوں کو وہ چین نصیب ہوا کہ نیند آنے لگی، غنودگی طاری ہو گئی، وحی الٰہی نے اسی انعام بیکراں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے جو سرعنوان ہیں جن کا مفہوم یہ ہے:

ایک (۷۱۸) رنج شکست کا تھا، اس پر دوسرا صدمہ اس افواہ سے پہنچا کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) شہید کر دیے گئے۔ یہ غم اور صدمہ پہلے کے مقابلہ میں اتنا سخت تھا کہ پچھلی

تمام مصیبت اور پریشانی فراموش ہوگئی اور جب یہ خبر غلط ثابت ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوہ روح پرور نظر آیا تو پہلا غم ختم ہوگیا۔ اب نہ صدمہ رہا نہ افسوس بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک اطمینان اور سکون عطا فرمایا ایسا سکون جس کا اثر صرف دل پر نہیں بلکہ دماغ پر بھی پڑا اور غنودگی طاری ہوگئی۔ (جو میدان جنگ میں ایمان کی علامت ہوتی ہے)''

وہی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جنہوں نے تیر پھینکتے پھینکتے کئی کمانیں توڑ دی تھیں۔ فرمایا کرتے تھے اس وقت جو سکون میسر ہوا تو خود میری حالت یہ تھی کہ ایسی غنودگی طاری ہوئی کہ تلوار میرے ہاتھ سے بار بار گر جاتی تھی۔ میں اُٹھاتا تھا پھر گر جاتی تھی۔ (۷۱۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے اکابر کا ارشاد ہے کہ میدانِ جنگ میں نیند ایمان کی علامت ہے (اللہ پر مکمل بھروسہ ہوتا ہے جس سے دل بے خوف اور مطمئن ہو جاتا ہے) اور نماز میں نیند شیطان کے اثر سے ہوتی ہے۔ (۷۲۰)

انصار میں سے ایک محترمہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں شہید ہو گئے تھے ان تین جان کاہ حادثوں کی خبر باری باری اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی وہ ہر بار صرف یہ پوچھتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں۔ لوگوں نے کہا بخیر ہیں۔ پاس آ کر روئے انور کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی کیں اور بے اختیار پکار اُٹھی:

كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جُلَلٌ ''آپ سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔''(۷۲۱)

اے شہ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم۔ (۷۲۲)

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ اور ان کا آخری پیغام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جاں نثاروں کے حلقہ پر نظر ڈال رہے تھے اور حالات دریافت فرما رہے تھے۔ اسی میں ارشاد ہوا سعد بن ربیع نظر نہیں آ رہے۔ انہیں تلاش کرو زندہ ہیں یا شہید ہو گئے۔ انصار میں سے ایک صاحب اُٹھے کہ میں پتہ لگاتا ہوں۔ کشتگان راہ حق کی لاشیں جو ابھی میدان میں منتشر تھیں ان کو دیکھا ان میں حضرت سعد بن ربیع بھی ہیں۔ قریب پہنچے تو ابھی رمق باقی تھی۔ میں نے آواز دے کر کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے کہ آپ کو دیکھو، آپ کس حال میں ہیں۔ فرمایا رُخصت ہو رہا ہوں۔ محبوب آقا محبوب رب العالمین کو میرا اسلام پہنچا دیجیے اور شکریہ ادا کر دیجیے کہ ہمیں حق کا راستہ بتایا۔ اُمتوں کی اصلاح اور رہنمائی کی جو جزا انبیاء علیہم السلام کو دی جائے گی میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بہتر جزا ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے اور دیکھو میرا یہ پیغام ہے:

جب تک کوئی ایک جھپکنے والی آنکھ بھی تم میں رہے اگر دشمن نے آقا دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا بال بیکا کر دیا تو تمہارے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا کہ خدا کے حضور میں پیش کرسکو۔

یہ آخری پیغام سنایا اور رخصت ہو گئے۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پورا ماجرا سنا دیا۔ (۷۲۳)

یہ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ ان متقدمین میں سے تھے جو مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے تقریباً دو سال پہلے سے ایک نقیب کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مہاجرین کی آمد کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مہاجر اور انصار کے درمیان رشتہ اخوت قائم کیا تھا تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو انہیں سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کا بھائی قرار دیا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی املاک کا نصف حصہ اس بھائی چارہ کی بنا پر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کو دے دیا تھا اور یہ پیش کش بھی کی تھی کہ ان کی دو بیویوں میں سے جس کو مناسب سمجھیں مجھے بتا دیں میں اس کو طلاق دے دوں گا جب عدت گزر جائے تو وہ نکاح کر لیں۔ (۷۲۴)

ایک صاحب نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ایک لڑکی کو چھاتی پر بٹھائے ہوئے ہیں اور چمکار رہے ہیں۔ کسی نے دریافت کیا کہ یہ کس کی صاحبزادی ہیں۔ فرمایا اس شخص کی جو مجھ سے بہتر تھے۔ جو بیعت عقبہ کے وقت نقیب بنائے گئے۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے اور احد میں شہید ہوئے۔ (۷۲۵)

ایک اور جھڑپ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ٹیلے پر تشریف فرما تھے۔ گرداگرد جاں نثار حاضر تھے تو دیکھا۔ ابوسفیان پہاڑ کی بلندی پر چڑھا ہوا ہے۔ سواروں کا ایک دستہ ساتھ ہے۔ خالد بن ولید آگے آگئے ہیں اور مسلمانوں پر حملے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر وہی جملے آگئے جو غزوہ بدر کے موقع پر بار بار صادر ہوئے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ اِنْ تَشَاءُ لَا تُعْبَدُ فِي الْاَرْضِ

''خداوندا اگر تیری مشیت یہی ہے تو روئے زمین سے تیری عبادت ختم ہو جائے گی۔''

قلب مبارک مصروف دعا تھا اور فدا کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اس پہاڑ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ معمولی سا مقابلہ ہوا۔ دونوں طرف سے تیر اور پتھر برسائے گئے۔ مگر دشمن ٹھہر نہیں سکا۔ (۷۲۶) وہ پسپا ہو کر یہاں سے ہٹا اور دوسرے پہاڑ پر پہنچ کر فقرہ بازی شروع کر دی۔

ابوسفیان نے پکار کر پوچھا محمد ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرما دیا، کوئی جواب نہ دے۔ پھر اسی طرح ابن ابی قحافہ (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) ابن خطاب (عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کو پکارا اور جب جواب

نہ ملا تو پکار کر کہا، سب مارے گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولے دشمن خدا غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو محفوظ رکھا ہے جو تجھے رُسوا کریں گے۔

پھر ابوسفیان نے نعرہ لگایا اعل ھبل ہبل (بت کا نام) اُونچا رہ (تیری جے ہو) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جواب دو اللہ اعلیٰ واجل خدا سب سے اُونچا اور سب سے بڑا ہے۔ پھر ابوسفیان نے پکارا:

لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ

ہمیں عزیٰ (بت کا نام) نصیب ہے تمہارے پاس عزیٰ نہیں (تم عزیٰ کی حمایت سے محروم ہو)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جواب دو:

اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ

''اللہ ہمارا مددگار ہے۔ تمہارا کوئی مددگار نہیں۔''

ابوسفیان نے کہا آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے اور جنگ کنوئیں کا ڈول ہوا کرتی ہے۔ کبھی ایک کا ڈول اُوپر کبھی دوسرے کا۔ تم دیکھو گے کچھ مردوں کے ناک کان کاٹ دیے ہیں۔ میں نے اس کا حکم نہیں کیا تھا مگر میں اس سے ناراض بھی نہیں ہوں۔ (۷۲۸)

لشکر قریش واپس:

غزوہ اُحد کا ہنگامہ ظہر کے وقت تک ختم ہو چکا تھا۔ ظہر کی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر پڑھی۔ بہت سے صحابہ کرام جو مجروح و مضروب تھے انہوں نے بھی بیٹھ کر نماز پڑھی۔ (۷۲۹)

تقریباً یہی وقت تھا کہ لشکر قریش میدان اُحد سے روانہ ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی کہ پتہ لگائیں قریش کس طرف جا رہے ہیں۔ اگر مدینہ کا رُخ کر رہے ہیں تو ہم فوراً مدینہ پہنچ کر ان کا مقابلہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرما دیا کہ اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر روانہ ہوں گے اور اُونٹوں کو ہنکا کر لے چلیں گے تو وہ مدینہ جائیں گے اور اگر مکہ کا قصد کریں گے تو جیسا کہ لمبے سفر کا قاعدہ ہے اُونٹوں پر سوار ہوں گے اور گھوڑوں کو ساتھ لے چلیں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے اور واپس آ کر خبر دی کہ اُونٹوں پر سوار ہو کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ (۷۳۰)

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی زخمی حالت میں میدان میں تشریف لائے۔ زخمیوں کی خبر گیری فرمائی۔ شہداء کی لاشوں کو دیکھا۔ ان کے جو عزیز پہنچ رہے تھے ان کو دلاسا دیتے رہے اور تعزیت فرماتے رہے۔

فاتح مرعوب اور ہیبت زدہ، شکست خوردہ مطمئن اور بے خوف

(۱) سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا (سورہ آل عمران ع ۱۶)

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُعَاسًا

''وہ وقت دور نہیں کہ ہم منکرین حق کے دلوں میں تمہاری ہیبت بٹھا دیں گے۔ یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے خدا کے ساتھ ان کو بھی شریک ٹھہرالیا جن کے لیے (معبود حقیقی) نے کوئی سند نہیں نازل کی۔''

منطق سربگریباں ہے۔ دلائل کی زبان بند ہوگئی ہے۔ کوئی وجہ نہیں بتائی جاسکتی کہ قریش کا یہ لشکر جرار کامیابی کے بعد ناکام کیوں ہوگیا۔

لڑائی کی مصروفیت میں زیادہ دن نہیں لگے، بدھ یا جمعرات کو یہ لشکر مکہ سے چلا تھا، بدھ کو ذوالحلیفہ پہنچ گیا، جمعرات جمعہ آرام کیا، آج رات بھی آرام سے گزری، خوب سونے کا موقع ملا، صبح کو بھیڑ ہوئی، پہلے قریش کو ایک جھٹکا لگا، پھر ایسے سنبھلے کہ کئی درجن مسلمانوں کو شہید کر ڈالا، جو باقی تھے وہ چوگنی پچ گنی تعداد کے لشکر میں پھنس گئے، ایک کو دوسرے کی خبر نہیں رہی، مسلمان نے مسلمان کو مار دیا، جھنڈا گر گیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجروح ہوگئے، ان کے ساتھی منتشر ہوگئے، کچھ پہاڑوں پر چڑھ گئے، کسی نے مدینہ کی راہ لی، جو شہید ہوئے قریش کی عورتوں نے بڑے اطمینان سے دل کھول کر ان کی بے حرمتی کی۔ ان کے کانوں اور ناکوں کے ہار بنا کر گلے میں ڈالے، کامیابی کے ترانے گائے:

سوال یہ ہے کہ مسلمان جب نیم جان ہو چکے تھے تو کیا بات ہوئی فوج قریش نے تلوار کیوں روک لی سب کو تہ تیغ کیوں نہیں کر دیا۔

مدینہ یہاں سے صرف دو تین میل کے فاصلہ پر تھا، وہ اس وقت تقریباً خالی تھا، مجاہدین میدان جہاد میں خستہ اور شکستہ پا تھے، مدینہ میں وہ تھے جو مجاہدین کو میدانِ جنگ میں چھوڑ گئے تھے، وہ دل سے مشرکین کے ساتھ تھے، وہ یقیناً قریش کا استقبال کرتے جن کو وہ حرم کا محافظ اور اپنا مذہبی پیشوا سمجھتے تھے۔ اگر وہ استقبال نہ کرتے بالفرض مقابلہ کرتے تو یہ طاقت جو مسلمانوں کو میدان میں شکست دے چکی تھی ان بھگوڑوں کو آسانی سے شکست دے سکتی تھی۔ دو سو مسلح سوار مدینہ میں قیامت برپا کر سکتے تھے۔ وہ دھمکی جو مکہ سے لکھ کر بھیجی تھی کہ ''مدینہ کے جوانوں کو قتل کر دیں گے، عورتوں کو باندیاں بنائیں گے'' اس وقت بہت آسانی سے پوری کی جاسکتی تھی۔ مشرکین کی فوج رہنماؤں سے بھی خالی نہیں تھی۔ بہترین جرنیل اس میں موجود تھے۔ خود ابوسفیان معمولی درجہ کا لیڈر اور جرنیل نہیں تھا۔ پھر خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن اُمیہ جیسے باہمت جرنیل اس کے رفیق اور

مددگار تھے۔ قریش کے بہترین دماغ اس کے مشیر تھے لیکن یہ کیا ہوا کہ میدانِ جنگ میں ان کی تلواریں رُک گئیں۔ پھر پہاڑ کی بلندی سے مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ کیا تو اگرچہ پوزیشن بہت اچھی تھی کہ قریش کی فوج بلندی پر تھی۔ مسلمان نیچے تھے مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کچھ ساتھیوں کے ساتھ جیسے ہی جوابی حملہ کیا تو تعجب ہوتا ہے کہ ابوسفیان اور حضرت خالد بن الولید جیسے بہادر جرنیل اتنی بہترین پوزیشن بھی نہ سنبھال سکے اور پسپا ہو کر دوسرے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ وہاں سے کچھ فقرے کسے پھر تیزی کے ساتھ اُتر کر مکہ کا راستہ لیا۔ غور کیجیے یہ کیا تماشہ ہے۔ اس مضحکہ خیز تماشہ کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہورہا تھا جو جنگ کے آغاز میں کیا تھا اور اس کے پورے ہونے میں کچھ تاخیر اس لیے ہوگئی تھی کہ کچھ مسلمانوں نے حکم عدولی کر کے کم ہمتی اور نزاع باہمی کا وہ راستہ اختیار کرلیا تھا جو ان کے لیے زیبا ہی نہیں تھا بلکہ اس اُمت خیر کی منشاء بعثت کے خلاف تھا۔ اس پر فی الفور تنبیہ ضروری تھی تا کہ دامن تقدس پر جو دھبہ لگا ہے وہ ہاتھ در ہاتھ صاف ہو جائے اور عظیم الشان مستقبل کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔

کتاب اللہ کی مندرجہ بالا آیات کا بغور مطالعہ فرمائیے جن کا مفہوم یہ ہے کہ:

''ہم عنقریب ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس معرکہ حق و باطل میں انہوں نے اس کو چھوڑ دیا جو امداد و نصرت کا حقیقی مرکز ہے جس کی مدد مدد ہوتی ہے۔ اور ان کو لے لیا (۷۳۱) اور ان کو خدا کا شریک گردان دیا جو خود تہی دامن ہیں۔ جو خود اپنے لیے مدد کے محتاج ہیں، جن کے پاس کوئی صحیح دلیل، کوئی حجۃ اور برہان نہیں ہے۔ بس قدرتی بات ہے کہ ان کے دل عزم و ہمت سے خالی ہوں اور صاحب عزم وہ ہیں جو حق کے حامی اور رب حقیقی کے پرستار ہیں۔''

یہ تھے فاتح جو حقیقت سے محروم تھے، حقیقی طاقت سے منہ موڑے ہوئے تھے، ان کو جو فتح میسر آئی وہ صرف مسلمانوں کی ایک غلطی کے نتیجہ میں تھی۔ جس طرح یہ غلطی عارضی تھی۔ یہ فتح بھی عارضی اور محض نمائشی تھی۔ ان کے ضمیر خود غیر مطمئن تھے۔ لہٰذا مزید فتح حاصل کرنے کے بجائے ابوسفیان اور اس کے باطل پرست ساتھیوں نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ جو ''نمائش'' میسر آ گئی ہے وہ باقی رہ جائے۔

ان کے بالمقابل وہ خدا پرست تھے جو سب کو چھوڑ کر اپنے رب اور اپنے مالک حقیقی سے رشتہ جوڑ چکے تھے وہ ان کا محبوب حقیقی اور معبود برحق تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب حقیقی کے محبوب تھے اس لیے ان کے بھی محبوب تھے۔ جو محبوب حقیقی کے لیے قربان ہونا اپنا نصب العین بنا چکے تھے۔ کچھ لغزش ہوئی کہ وہ دشمن کے خیموں میں جا گھسے۔ دنیا اگرچہ مطلوب نہیں تھی کیونکہ دشمن اور اس کے خیموں سے جو کچھ لے رہے تھے وہ خدا کے لیے لے رہے تھے۔ مگر صورت ایسی ہی ہوگئی تھی جو طالبان دنیا کی ہوتی ہے لیکن جیسے ہی انہوں نے پیچھے سے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی الی عباد اللّٰہ ''اللہ کے بندو میری طرف آؤ'' وہ فوراً چونک اُٹھے۔ دنیا

طلبی کا یہ غبار فوراً جھڑ گیا۔ محبت کی چنگاریاں بھڑ کنے لگیں۔ کچھ مسلمان جوان کے عزیز وقریب یا مخلص دوست تھے شہید ہوئے ان کے غم واندوہ کی اوس ان چنگاریوں پر پڑی لیکن جیسے ہی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی افواہ اُڑی۔ اس نے تیل کا کام کیا اور محبت کی چنگاریاں شعلہ بن کر تن من کو بھسم کرنے لگیں لیکن جیسے ہی ساقی کوثر کا جلوہ نظر پڑا دھڑ کتے ہوئے دلوں کو آب حیات میسر آ گیا۔ بھڑ کتے ہوئے شعلوں پر حوض کوثر کے چھینٹے پڑ گئے۔ اب جو بھی تھا مخمور تھا۔ سکون کی نینداس پر طاری تھی۔ خوف و ہراس کافور ہو گیا تھا۔ امن و اطمینان کی پھریری نے ہر سوختہ جگر کو بے خود کر دیا:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ

''پھر نازل کیا تم پر اس غم کے بعد امن اور اطمینان ''ایک غنودگی'' جو تمہاری ایک جماعت پر چھا رہی تھی۔''

مگر وہ مردہ دل جو سوزش عشق سے نا آشنا تھا۔ وہ اس تمام کیف و سرور سے محروم رہے۔ یہی عشق و محبت کا فلسفہ تھا (جس کی قرآن حکیم ترجمانی کر رہا ہے) جس نے فاتح کو مرعوب اور ہیبت زدہ بنا دیا اور مفتوح وشکست خوردہ کو امن واطمینان کے جام جان آفرین سے سرشار کر دیا۔

وہ مال غنیمت جوان کے ہاتھ سے جا تا رہا تھا اس کا ان کو غم نہ تھا۔ کیونکہ وہ قطعاً مقصود نہ تھا ستر ساتھیوں کی جدائی کی مصیبت بھی باعث اندوہ نہ رہی تھی۔ کیونکہ وہ اگرچہ نظروں سے اوجھل ہوئے مگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔ موت ان کو ضرور آئی مگر اس موت نے حیات ابدی کا وہ چولا ان کو پہنا دیا کہ اب ان کو مردہ سمجھنا بھی درست نہیں رہا۔ کتاب اللہ نے تنبیہ فرما دی:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتاً بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ

(سورہ آل عمران ع ۱۶)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے ان کی نسبت یہ خیال ہرگز نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں نہیں وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے حضور میں روزی پا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے جو کچھ انہیں عطا فرمایا ہے وہ اس سے خوشحال ہیں اور جو لوگ ان کے پیچھے (دنیا میں) رہ گئے اور ابھی ان سے ملے نہیں ہیں ان کے لیے خوش ہو رہے ہیں کہ نہ تو ان کے لیے کسی طرح کا کھٹکا ہو گا نہ کسی طرح کی غمگینی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے عطیوں سے مسرور ہیں نیز اس بات سے کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ اللہ ایمان رکھنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔''

مگر برا ہو کفر و نفاق اور ضعف ایمان کا جس نے سیاہ بختوں کو اب بھی رُسوا کیا:

وَطَائِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ

''یہ وہ جماعت (۷۳۲) تھی جسے اس وقت بھی اپنی جانوں کی پڑی تھی۔ وہ اللہ کے جناب میں عہد جاہلیت کے سے ظنون واوہام رکھتی تھی۔ یہ کہتی تھی جو کچھ ہوا کیا اس میں ہمارا کوئی دخل تھا۔''

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ شدت خوف و ہراس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہم حاضر تھے اور ہم پر نیند کا غلبہ ہوا اور حالت یہ ہوگئی کہ ہر ایک کی ٹھوڑی سینہ سے لگی ہوئی تھی، اس غنودگی کی حالت میں معتب بن قشیر کی یہ آواز میرے کانوں میں پڑی کہ وہ کہہ رہا تھا۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هٰهُنَا

''اگر اس مہم میں ہمارا بھی کوئی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔''

مدینہ طیبہ میں خبر خواتین کی آمد اور ان کی خدمات:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کا غل ہوا تو جو مایوس ہو کر پلٹے تھے یہ وحشت انگیز خبر انہوں نے مدینہ میں پہنچا دی تو اب عورتوں سے بھی نہ رہا گیا۔ حضرت اُم ایمن رضی اللہ عنہا نکلیں۔ یہی خبر دینے والا ان کے سامنے آ گیا۔ آپ نے دونوں ہاتھوں میں مٹی بھر کر اس کے منہ پر ماری اور فرمایا تلوار مجھے دو اور سوت کی انٹی تم لو۔ گھر میں بیٹھ کر سوت کاتو۔ پھر آپ میدان میں پہنچیں اور پیاسے زخمیوں کو پانی پلانا شروع کر دیا۔ ایک شخص حباب بن عرفہ تیر پھینک رہا تھا۔ اس کا تیر آپ کے لگ گیا تو آپ گر پڑیں اور بند کھل گیا۔ جس پر حباب خوب ہنسا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے پھل کا ایک تیر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو دیا کہ حباب کے ماریں۔ وہ تیر حباب کے سینہ میں جا کر لگا جس سے وہ بھی چت گر گیا اور اس کا ستر کھل گیا۔ اس کلمہ بکلمہ انتقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا پڑے۔ (سیرۃ حلبیہ)

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے دشمن پر تیر برسا رہے تھے اور کئی کمانیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ چکی تھیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ (۷۳۳) اُم سلیم اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما پہنچیں اور مشکیزے بھر کر پیاسے زخمیوں کو پانی پلانے کی خدمت انہوں نے بھی شروع کر دی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا والد ماجد (رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ چہرہ مبارک کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم احتیاط فرما رہے تھے کہ زمین پر کوئی قطرہ نہ

گرے۔ خون کپڑوں ہی پر لے رہے تھے۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ پانی لائے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے زخم دھونے شروع کیے۔ مگر خون برابر بہہ رہا تھا تو چٹائی جلا کر اس کی راکھ زخموں پر رکھ دی خون بند ہو گیا۔

حضرت اُم سلیط رضی اللہ عنہا (حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی والدہ) میدان میں پہنچیں اور تیروں کی بارش میں زخمیوں کی خدمت کی۔ (رضی اللہ عنہا)

شہیدوں کی لاشیں، تجہیز و تکفین اور نماز

قریشی عورتوں کے دلوں پر جو غزوہ بدر کی چوٹ تھی اس کا بدلہ انہوں نے احد کے شہیدوں سے لیا۔ اس تھوڑے سے وقفے میں کہ مسلمان سمٹ کر پہاڑ کی طرف چلے گئے تھے وہ میدان میں گھومیں اور جو لاش سامنے آئی اس کے ناک کان کاٹ لیے۔

ابوسفیان کی بیوی ''ہند'' جو بدر میں اپنے باپ، بھائی اور چچا کے مارے جانے کا[۴۳۵] خار کھائے ہوئے تھی (جب اپنے باپ کے قاتل) سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش پر پہنچی تو ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا۔ نگلنا چاہتی تھی مگر گلے سے نہ اُترا تو چبا کر اُگل دیا۔[۴۳۶] پھر شہیدوں کی ناکوں اور کانوں کا ہار بنایا اور یہ پھولوں کا ہار گلے میں ڈالا۔[۴۳۷]

ابوسفیان پہنچا، اس نے حمزہ رضی اللہ عنہ شہید کے منہ پر نیزہ کی بھال مار کر کہا ذق عقق اے نافرمان! اس کو چکھ۔'' قبیلہ بنو حارث کے ایک سردار حلیس بن زمان نے یہ حرکت دیکھی تو اس کو ملامت کی کہ تمہارے ہی خاندان کا ایک بڑا آدمی تھا اس کی لاش کو اس طرح ذلیل کر رہے ہو۔ حلیس کے اس جملہ سے ابوسفیان چونکا۔ فوراً معذرت کرنے لگا۔ واقعی غلطی ہوئی، اس کا چرچا نہ کیجیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا:

> ''میرا جذبہ تو یہ ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش اسی حالت میں پڑی رہے اور قیامت کے روز اس کے اجزا درندوں کے پیٹ اور پرندوں کے پوٹوں سے جمع ہوں (جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی انتہائی مظلومیت کی شہادت دیں) مگر اس جذبہ پر عمل اس لیے نہیں کرتا کہ پھر یہ ایک سنت[۴۳۸] مان لی جائے گی۔ اس کے علاوہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن صفیہ اس کو برداشت نہیں کریں گی۔
>
> پھر آپ نے فرمایا مجھے جبرئیل علیہ السلام نے خبر دی ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا یہ لقب ساتوں آسمانوں میں لکھ دیا گیا ہے۔ اسد اللہ واسد رسولہ[۴۳۹]

حضرت صفیہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن شکست کی خبر سن کر مدینہ سے نکلیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فرزند ارجمند حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن العوام سے فرما دیا کہ وہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو

یہیں تسلی تشفی دے دیں۔ لاش کے پاس نہ جانے دیں۔ اپنے بھائی کی یہ حالت نہ دیکھ سکیں گی۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کی خبر اپنی والدہ کو دے دی۔ فرمایا میں اپنے بھائی کا ماجرا سن چکی ہوں۔ راہ خدا میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں ہے۔ تم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلا دو میں صبر سے کام لوں گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ کو اجازت دے دی۔ وہ لاش پر گئیں۔ خون کا جوش تھا اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے لیکن انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر خاموش ہو گئیں اور مغفرت و ترقی مراتب کی دعا مانگی۔ (۷۴۰)

مثلہ کی ممانعت:

ناک کان کاٹ دینے اور صورت بگاڑ دینے کو عربی زبان میں مثلہ کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ شہداء اُحد کا عموماً اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا خصوصاً ''مثلہ'' کیا گیا ہے تو روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (۷۴۱) فرمایا: ''اگر خدا نے مجھے قریش پر فتح عطا فرمائی تو میں ان کے تیس آدمیوں کا مثلہ کروں گا'' (۷۴۲) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے زبان مبارک سے یہ الفاظ سنے تو ہر ایک نے عہد کر لیا کہ جب بھی ہمیں موقع ملے گا ہم ایسا مثلہ کریں گے کہ تاریخ عرب میں اس کی نظیر نہ ہوگی لیکن پھر فوراً ہی ان ارشادات خداوندی نے ان سب حضرات کو چونکا دیا۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (سورہ نحل ع ۱۶)

''اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں اگر سختی کرو تو ایسی ہی اور اتنی ہی کرو جتنی تمہارے ساتھ کی گئی اور اگر تم نے صبر سے کام لیا تو بلاشبہ صابرین کے لیے صبر ہی بہتر ہے۔
اے نبی! صبر کر اور تیرا صبر کرنا نہیں مگر اللہ کی مدد سے اور ان (دشمنانِ حق) کے حال پر غم نہ کھا۔ نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ انہیں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور نیک عملی میں سرگرم رہتے ہیں۔''

اس کے بعد نہ صرف یہ کہ آپ نے اپنے اس قول سے رجوع فرمایا، بلکہ آپ کا طریقہ یہ ہو گیا کہ جب بھی آپ کوئی فوج یا فوج کا دستہ کسی محاذ پر روانہ فرماتے تھے تو سب سے پہلے ان کو ہدایت یہ ہوتی تھی کہ مثلہ کسی کا نہ کریں۔ دوسری ہدایت یہ ہوتی کہ صدقہ کرتے رہیں۔ (۷۴۳)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہمشیر زادے (اُمیمہ بنت عبدالمطلب کے فرزند) حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ دعا مانگا کرتے تھے کہ راہِ خدا میں قربان ہوں اور اللہ کے راستے میں ان کے ناک کان کاٹے جائیں اور

اسی وجہ سے ان کو "المجدع في سبيل الله" کہا گیا۔ ان کی لاش بھی یہیں پڑی ہوئی تھی۔ ان کا پیٹ چاک نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ ناک کاٹ لی گئی تھی۔ (۷۴۴)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے رات ہی کو اپنے لختِ جگر (جابر) کو پاس بٹھا کر وصیت کی تھی کہ صبح کو جاں نثاران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو سب سے پہلے قربان ہوں گے مجھے توقع (۷۴۵) ہے کہ میں ان میں سب سے پہلا شخص ہوں گا۔ پھر فرمایا تم یہ یقین رکھو میں جن کو چھوڑ کر رُخصت ہوں گا ان میں محبوب رب العالمین آقا دو جہاں کے بعد سب سے زیادہ عزیز تم ہو (دیکھو) میں اپنے ذمہ قرض چھوڑ رہا ہوں اس کو تم ادا کرو گے۔ اپنی بہنوں کا پورا خیال رکھنا (سات بہنیں تھیں) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ والد ماجد رضی اللہ عنہ کا جوجذبہ تھا وہ پورا ہوا، وہ انہیں میں تھے جو سب سے پہلے شہید ہوئے۔ (۷۴۶)

شہادت کے بعد ان پر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ میں رو رہا تھا اور بار بار کپڑا ہٹا کر زیارت کر رہا تھا مجھے لوگوں نے منع بھی کیا مگر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے دو تین مرتبہ اسی طرح زیارت کی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ اُٹھانے کا حکم دیا۔ جنازہ اُٹھایا جانے لگا تو میری پھوپھی کی چیخ نکل گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں روتی ہو، جب تک جنازہ اُٹھا میں برابر دیکھتا رہا کہ فرشتے ان پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ (۷۴۷)

مہاجرین کے علمبردار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا جنازہ سامنے آیا تو آقا دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ ہیں کہ خدا سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دکھایا۔ (۷۴۸)

غسل اور کفن:

شہیدوں کو غسل نہیں دیا جاتا۔ خونِ شہادت کے چھینٹے اللہ کے یہاں مشک و عنبر سے بھی زیادہ عطر افشاں اور قیمتی ہوتے ہیں، ان کو دھویا نہیں جاتا، کپڑے بھی نہیں بدلے جاتے، کفن بھی نہیں پہنایا جاتا، انہیں کپڑوں میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ البتہ زرہ وغیرہ جو بدن پر ہو یا کپڑے کچھ زائد ہوں تو وہ اُتار لیے جاتے ہیں اور اگر کپڑے کفنِ مسنون (۷۴۹) سے کم ہوں تو ان کو پورا کر دیا جاتا ہے۔ شہداء اُحد کی تجہیز و تکفین میں بھی یہی عمل ہوا لیکن سید الشہداء حمزہ اور علمبردار مہاجرین مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما کی لاشوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس میں ان کے کپڑے (۷۵۰) بھی پورے نہیں رہے تھے اس لیے اضافہ کیا گیا۔ مگر اضافہ کی نوعیت کیا تھی۔ اس حدیثِ غم کو آپ کان لگا کر سنئے:

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اکابر صحابہ میں سے تھے۔ جملہ فضائل کے مالک غزوہ بدر میں بھی شریک تھے اور غزوہ اُحد میں صرف شریک ہی نہیں رہے بلکہ تقریباً بیس (۷۵۱) زخم بھی کھائے تھے۔ ان کے صاحبزادے حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں۔ والد صاحب (حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ) کا روزہ تھا۔ افطار کا وقت ہوا، کھانا لایا گیا۔ فرمانے لگے مصعب بن عمیر مجھ سے بہتر اور

افضل تھے۔غزوۂ اُحد میں شہید کیے گئے۔مگر تنگ دستی کی یہ حالت تھی کہ پورا کفن فراہم نہ ہو سکا۔صرف ایک چادر میسر آئی وہ بھی پوری نہیں تھی۔سر چھپاتے تو پیر کھل جاتے تھے اور پیر چھپاتے تو سر کھل جاتا تھا۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مجھ سے بہتر اور افضل تھے وہ بھی شہید ہوئے۔پورا کفن ان کے لیے بھی میسر نہیں آیا۔صرف ایک کپڑا تھا وہ بھی اتنا چھوٹا کہ سر اور پیر دونوں نہیں چھپ سکتے تھے۔ (۷۵۲)

بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سر چھپا دیں اور پیروں پر اذخر (۷۵۳) (گھاس) ڈال دیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان بزرگوں نے جو کچھ کمایا تھا اس کو صحیح سالم بچا کر لے گئے۔ اس کا کوئی فیض ان کو دنیا میں نہیں ملا لیکن آج ہمیں وہ فراخی میسر ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ آخرت کا بدلہ کہیں دنیا میں تو نہیں مل رہا۔حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف یہ واقعہ بیان فرما رہے تھے اور گریہ ان پر طاری تھا یہاں تک کہ ان سے کھانا نہیں کھایا گیا، چھوڑ دیا۔ (۷۵۴)

یہ بھی بس ان دونوں کی خصوصیت تھی کہ ایک ایک کپڑا ان کو الگ الگ دے دیا گیا۔ورنہ ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی کپڑے سے دو دو شہیدوں کا کفن پورا کیا گیا۔ (۷۵۵)

دفن:

وقت تنگ تھا، دشمن کا خطرہ موجود، شہداء کی تعداد زیادہ، مدینہ کی زمین سخت (۷۵۶) کام کرنے والے تھکے ماندہ اور زخموں سے چور تھے۔لہٰذا رائے یہ ہوئی کہ ایک ایک قبر میں دو دو دفن کیے جائیں۔حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ ایک قبر میں۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد، حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام اور حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہما ایک قبر میں دفن کیے گئے۔ (۷۵۷) اسی طرح دو دو شہید ایک ایک قبر میں دفن کیے گئے۔جن کو قرآن زیادہ یاد ہوتا تھا ان کو مقدم کیا جاتا تھا۔ (۷۵۸) کتنے مبارک تھے وہ الفاظ جو اس وقت لسان رسالت سے صادر ہوتے تھے: انا شهيد على هولاء يوم القيامة (۷۵۹) ''قیامت کے روز میں ان کی گواہی دوں گا'' کچھ شہیدوں کے وارثوں نے اپنے شہیدوں کو مدینہ لے جا کر دفن کرنا چاہا۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بہنوں کے اصرار پر میں بھی والد صاحب کے جنازہ کو لانے گیا تھا مگر پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان فرما دیا گیا کہ سب کو یہیں دفن کیا جائے گا۔جو لے جا رہے ہیں وہ بھی واپس لے آئیں۔چنانچہ میں بھی والد صاحب کے جنازہ کو واپس لے گیا۔ (۷۶۰)

نماز:

دفن کی طرح نماز میں بھی اختصار کیا گیا۔چنانچہ دس دس شہیدوں کی نماز ساتھ ساتھ پڑھائی گئی۔جنازے یکے بعد دیگرے قبلے کی طرف رکھ دیے جاتے تھے اور نماز کے بعد ان کو اُٹھا دیا جاتا تھا۔مگر سیّد الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جنازہ برابر رکھا رہا۔ان پر نماز سات مرتبہ پڑھائی گئی۔ (۷۶۱)

خصوصی دعائیں:

جب لشکر قریش واپس ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا برابر میں آ جاؤ ہم سب مل کر خدا کا شکر ادا کریں اور دعا مانگیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے اور تمام صحابہ پیچھے صف بستہ ہو گئے۔ آپ نے دعا (۷۶۳) فرمائی:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّہ اَللّٰھُمَّ لَا قَابِضَ بِمَا بَسَطْتَّ وَلَا بَاسِطَ لِمَا قَبَضْتَ وَلَا ھَادِیَ لِمَنْ اَضْلَلْتَ، وَلَا مُضِلَّ لِمَنْ ھَدَیْتَ۔ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُقَرِّبَ لِمَا بَاعَدْتَ وَلَا مُبْعِدَ لِمَا قَرَّبْتَ اَللّٰھُمَّ اَبْسِطْ عَلَیْنَا مِنْ بَرَکَاتِکَ وَرَحْمَتِکَ وَفَضْلِکَ وَرِزْقِکَ اَللّٰھُمَّ اَسْئَلُکَ النَّعِیْمَ الْمُقِیْمَ الَّذِیْ لَا یَحُوْلُ وَلَا یَزُوْلُ اَللّٰھُمَّ اَسْئَلُکَ النَّعِیْمَ یَوْمَ الْعَیْلَۃِ وَالا من یوم الخوف۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَائِذٌ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا اَعْطَیْتَنَا وَشَرِّ مَا مَنَعْتَنَا۔ اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَیْنَا الْاِیْمَانَ وَزَیِّنْہُ فِیْ قُلُوْبِنَا وَ کَرِّہْ اِلَیْنَا الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِیْنَ۔ اَللّٰھُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَحْیِنَا مُسْلِمِیْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِیْنَ۔ غَیْرَ خَزَایَا وَلَا مَفْتُوْنِیْنَ۔ اَللّٰھُمَّ قَاتِلِ الْکَفَرَۃَ الَّذِیْنَ یُکَذِّبُوْنَ رُسُلَکَ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِکَ وَاجْعَلْ عَلَیْھِمْ رِجْزَکَ وَعَذَابَکَ۔ اَللّٰھُمَّ قَاتِلِ الْکَفَرَۃَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ اِلٰہَ الْحَقِّ۔

اس کے بعد جب بھی اس طرف گزر ہوتا آپ صلی اللہ فرمایا کرتے تھے: السلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار (۷۶۴) پھر اس واقعہ سے کئی سال بعد وفات سے کچھ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء اُحد کے لیے اسی طرح نماز پڑھی جیسے جنازہ کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ منبر پر تشریف لے گئے اور حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا: (۷۶۵)

اِنِّیْ فرط لَکُمْ وَاَنَا شَھِیْدٌ عَلَیْکُمْ۔ وَاِنِّیْ وَاللّٰہِ لَاَنْظُرُ اِلٰی حَوْضِیَ الْاٰنَ وَاِنِّیْ اُوْتِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ اَوْ مَفَاتِیْحَ الْاَرْضِ۔ وَاِنِّیْ وَاللّٰہِ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمْ اَنْ تُشْرِکُوْا بَعْدِیْ وَلٰکِنْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ اَنْ تَنَافَسُوْا فِیْھَا۔

''میں تمہارا ہراول ہوں (تم سے پہلے جا رہا ہوں کہ انتظام کروں) میں تمہارا گواہ ہوں گا۔ واللہ میں اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں (میری آنکھوں کے سامنے ہے) مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں (یا یہ فرمایا) مجھے زمین کی کنجیاں دے دی گئی ہیں۔ مجھے واللہ اس کا خوف نہیں ہے کہ تم میرے بعد مشرک بن جاؤ گے۔ البتہ مجھے یہ خوف ہے کہ تم دنیا میں پھنس جاؤ گے اور ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو گے۔''

مدینہ شریف کو واپسی:

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ہوئے، مسلمان گرداگرد تھے، جن میں اکثر مجروح تھے، وہ خواتین جو میدان میں پہنچ گئی تھیں اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد چودہ ہوگئی تھی، وہ بھی ساتھ تھیں۔ جب جبل اُحد کے کنارے پر پہنچے تو سب نے صف بستہ ہو کر دعا کی۔ عورتوں کی صف سب سے پیچھے تھی (۷۶۶) دعا پہلے گزر چکی ہے) دعا کے بعد روانگی ہوئی۔ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے گھوڑے کی باگ سنبھالی۔ کچھ راستہ طے کیا تھا کہ ایک خاتون سامنے آئیں یہ حمنہ بنت جحش تھیں۔ (اُم المومنین حضرت زینب بنت جحش کی بہن رضی اللہ عنہما) ان کو خبر دی گئی کہ آپ کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ پھر خبر دی گئی، آپ کے ماموں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ اس صابر خاتون نے ہر مرتبہ خبر سن کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا دعا مغفرت کی اور خاموش ہو گئیں۔ پھر ان کو بتایا گیا کہ ان کے شوہر مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ تڑپ گئیں اور بے اختیار ان کی چیخ نکل گئی۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک خاتون کی نظر میں شوہر کا جو مقام ہوتا ہے وہ کسی اور کا نہیں ہوتا (۷۶۷) ان سے دریافت کیا گیا کہ ماموں اور بھائی کی شہادت پر آپ بے تاب نہیں ہوئیں۔ شوہر کی شہادت سے اتنی بے تاب کیوں ہو گئیں۔ جواب دیا بچوں کی یتیمی کے خیال (۷۶۸) نے تڑپا دیا۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی (۷۶۹)۔

آگے بڑھے تو ایک سن رسیدہ خاتون دوڑتی ہوئی آئیں۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے (جو گھوڑے کی باگ سنبھالے ہوئے تھے) عرض کیا یا رسول اللہ! یہ میری والدہ ہیں۔ آپ نے فرمایا مرحبا مرحبا اور گھوڑا روک لیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت عمرو بن معاذ رضی اللہ عنہ اسی روز اسی غزوہ میں شہید ہو گئے تھے۔ اب ان کی والدہ قریب آئیں تو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تسکین بخش کلمات ارشاد فرمائے۔ اس جاں نثار صابر خاتون نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ! آپ سلامت چاہییں ہر ایک قربانی ہیچ ہے:

گر فنا شد من و دلم چہ باک

عرض اندر جہاں سلامت تست

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں بھی بشارت ہے اور سب کو بشارت دے دو کہ انشاء اللہ جنت میں سب ساتھ ہوں (۷۷۰) گے۔

عرب میں نوحہ کا عام دستور تھا۔ اس میں مرنے والے کا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ اب تک نوحہ کی ممانعت نہیں ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آبادی میں داخل ہوئے تو مدینہ کے ہر کوچہ اور گلی سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہوا۔ حمزۃ لا بواکی لہ (ایک حمزہ ہیں کہ ان کو رونے والیاں نہیں ہیں) ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا عبرت دلانا ہو کہ شہداء میں ایسے بھی ہیں جن کے رونے والے عزیز بھی ان سے چھوٹے ہوئے ہیں۔ مگر حضرات انصار نے اس جملہ سے یہی اثر لیا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا بھی نوحہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اپنے یہاں کی عورتوں کو در دولت پر بھیج دیا۔ (۷۷۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا شانہ نبوت پر پہنچی تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ سعد بن عبادۃ نے دونوں طرف سہارا دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھوڑے سے اُتارا۔ آپ مکان میں تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہوگئی۔ آپ نے انہیں دونوں سرداران انصار کے سہارے مسجد میں تشریف لا کر نماز مغرب ادا فرمائی۔ واپس پہنچے تو دیکھا حجرہ مبارکہ میں خواتین کا ہجوم ہے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا نوحہ ہو رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی ہمدردی پر ان کے لیے دعائے خیر فرمائی اور ان کو رخصت کیا اور فرمایا میرا یہ منشاء قطعاً نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ویسے بھی سمجھایا کہ نوحہ ٹھیک نہیں ہے۔ (۷۷۲)

اس کے بعد جب تک نوحہ کی ممانعت نہیں ہوئی انصاری خواتین کا یہ دستور ہو گیا کہ جس کسی عزیز کا نوحہ کرتی تھیں پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا نام لے کر نوحہ کیا کرتی تھیں۔ پھر اپنے عزیز کا نوحہ کیا کرتی تھیں۔ (۷۷۳)

نماز عشاء کے بعد آرام فرمانے کا وقت ہوا تو قبیلہ اوس اور خزرج کے جاں نثار مسجد میں آ گئے اور شب بھر مسجد میں قیام فرمایا کہ قریش کی طرف سے اچانک کوئی حملہ نہ ہو جائے۔ (۷۷۴)

پیشین گوئی:

منافقوں کو اس وقت موقع مل گیا تھا۔ طرح طرح کے شگوفے شروع کیے حضرت علی (۷۷۵) رضی اللہ عنہ ان باتوں سے کچھ دل تنگ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لن ینالوا منا مثل ھذا الیوم حتی نستلم الرکن (۷۷۶)

قریش نے جتنا نقصان ہمیں آج پہنچایا ہے ایسا نقصان آئندہ کبھی نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہاں تک کہ ہم حجر اسود کو بوسہ دیں گے۔ (یعنی مکہ فتح کر لیں گے) (۷۷۷)

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی شفقت ورأفت

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ (سورہ آل عمران ع ۱۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان یہ ہے کہ مقابلہ مدینہ میں رہ کر کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ظاہر بھی فرما دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک خواب بھی بیان فرماتے ہیں جس کی تعبیر میں یہ بات صاف ہے کہ مدینہ گویا ایک ذرہ اور آہنی پیراہن ہے۔ اس کو اُتار دینا خطرہ سے خالی نہیں ہے ہماری تہذیب کے تکلفات جو بڑوں کے سامنے لب کشائی کی اجازت نہیں دیتے ان کا فتویٰ ان نوجوانوں کے بارے میں کیا ہوگا جو اس متین اور سنجیدہ رائے کے خلاف کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے مچل رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پچاس مجاہدین کا دستہ درہ پر مقرر فرما دیتے ہیں اور یہ ہدایت فرما دیتے ہیں کہ ہمیں فتح ہو یا شکست تم یہاں سے نہ ہٹنا۔ اگر تم دیکھو کہ دشمن ہمارے تکے بوٹی کر رہا ہے پرندے ہماری بوٹیاں نوچ رہے ہیں تب بھی تمہیں یہاں رہنا ہے۔ جب تک میں اجازت نہ دے دوں یہاں سے نہیں ہٹنا۔ (۷۷۸)

جس وقت آپ یہ حکم فرما رہے ہیں تو شان رسالت کے ساتھ نئی شان یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوجی لباس میں ملبوس ہیں۔ دو زرہیں جسد مبارک پر ہیں۔ سر پر خود اور خود کے ساتھ مغفر ہے۔ ایک جانب تلوار آویزاں ہے، دوسری جانب کمان لگی ہوئی ہے۔ شانہ مبارک پر ترکش پڑا ہوا ہے۔ ہاتھ میں نیزہ ہے۔ (۷۷۹)

قانون جنگ کے ماہر بتا سکتے ہیں کہ ایک کمانڈر جب جملہ نشانات سے آراستہ ہو کر حکم کرے تو اس کی خلاف ورزی کو کیا کہا جاتا ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ غالباً یہ انتہائی جرم ہے۔ فوجی عدالت اس کی سزا سخت سے سخت تجویز کرے گی۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہاں عدالت وہ ہے جس کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (سورہ توبہ ع ۱۶)

''بہت ہی شاق ہے اس پر تمہاری تکلیف اور زحمت۔ تمہارے نفع کا لالچی ہے، مسلمانوں کے لیے بہت بڑا مشفق بہت بڑا صاحب رحم۔''

ایک حاکم ماتحت کی شوخی برداشت نہیں کر سکتا لیکن اگر حاکم باپ ہو یا وہ ہو جس کی شفقت باپ سے بھی کہیں زیادہ ہو؟

یہاں یہی عجیب وغریب ماجرا ہے جس کی طرف کتاب اللہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے اور عربی ادب سے ذوق رکھنے والے محسوس کر سکتے ہیں کہ اشارہ کا انداز کس قدر عجیب ہے جو سراسر معجزانہ ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ (سورہ آل عمران ع ۱۷)

''خدا کی بڑی ہی رحمت ہے کہ تم ان کے لیے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔''

پھر نہایت ہی عجیب وغریب معنوی اور روحانی لطیفہ یہ ہے کہ جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ ان کو رحمت عالمین بنا کر بھیجنے والا ارحم الراحمین ہے۔

لہٰذا صرف یہی نہیں ہوا کہ ان کوتاہیوں اور لغزشوں پر درگزر کو حضرت حق جل مجدہ نے پسند فرمایا ہو۔ بلکہ ساتھ ہی یہ سفارش بھی فرمادی کہ ان خطا کاروں پر جو اعتماد پہلے تھا اس میں کمی نہ آئے۔ اسی طرح اعتماد کرو جس طرح پہلے کرتے تھے اور جس طرح پہلے مشورہ کرتے تھے۔ ایسے ہی آئندہ بھی ان سے مشورہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ سابق مشورہ کا تلخ تجربہ، مشورہ کی اہمیت کو کم کردے ارشاد خداوندی ہے:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (سورہ آل عمران ع ۱۷)

''پس ان کو معاف کرو۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش (مغفرت) طلب کرو اور جو کام درپیش ہو اس میں ان سے مشورہ کرو۔''

پس جن کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا اور خود معاف ہی نہیں فرمایا بلکہ اپنے رسول محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی معاف کرنے کی سفارش فرمائی۔ کس کی ہمت ہے کہ ان کی شان میں لب کشائی کرے۔

اس سے بڑھ کر گمراہی اور کور باطنی کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول برحق کو ہدایت کرے کہ ان پر پورا اعتماد کرو۔ جو معاملات درپیش ہوں ان میں ان سے مشورہ کرو اور کوئی دریدہ دہن شوخ چشم ان پر بے اعتمادی ظاہر کرے ان کو معاذ اللہ خائن اور ناقابل اعتبار قرار دے۔ معاذ اللہ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم۔

لغزش پاء کی معافی:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ تا غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورہ آل عمران ع ۱۱)

''تم میں سے جن لوگوں نے اس دن لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا، جس دن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو ان کی لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے جو انہوں نے پیدا کرلی تھیں۔ شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے تھے (یہ بات نہیں تھی کہ ایمان میں کوئی فتور آ گیا ہو۔ بہر حال) یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ لغزش معاف کردی۔ وہ یقیناً بخشش دینے والا اور بہت بڑا بردبار ہے۔'' (سورہ آل عمران ع ۱۶)

یہ کوئی قابل قدر خدمت نہیں ہے کہ آج جب کہ چودھویں صدی قریب الختم ہے ان کی مکمل فہرست مرتب کی جائے جو پہلی صدی ہجری کے صرف تیسرے سال میں غزوۂ احد کے موقع پر ڈگمگا گئے تھے اور کوئی کسی پہاڑ پر چڑھ گیا تھا اور کسی نے مدینہ کی راہ لی تھی۔ حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو شمار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ صرف آٹھ نام تحریر کرسکے ہیں اور بظاہر اس سے زیادہ فہرست مرتب بھی نہیں ہوسکتی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت رافع بن المعلی رضی اللہ عنہ حضرت حارثہ بن زید رضی اللہ عنہ، ابو حذیفہ بن

عتبہ رضی اللہ عنہ، ولید بن عتبہ رضی اللہ عنہ، خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ، سعد بن عثمان رضی اللہ عنہ، عتبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ (۷۸۰) لیکن جب عرش معلٰی سے ان کی معافی کا اعلان صادر ہو گیا تو کیا کسی کی ہمت ہے کہ ان حضرات کو مطعون کرکے رب العرش کا مقابلہ کرے۔ (معاذ اللہ)

غداروں سے چشم پوشی:

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللَّهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ (سورہ نساء ع ۱۶)

''مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو فریق بن گئے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان بدعملیوں کی وجہ سے جو انہوں نے کمائی ہیں، انہیں اُلٹ دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو ایسے لوگوں کو راہ دکھاد و جن پر خدا نے راہ گم کر دی ہے۔''

وہ تیر انداز جن کی ڈیوٹی درہ پر لگائی گئی تھی اور وہ وہاں سے بلا اجازت چلے آئے تھے ان کی غلطی بہت بڑی غلطی تھی۔ اس کا بہت برا نتیجہ پوری جماعت کو بھگتنا پڑا۔ مگر یہ غلطی سمجھ کی غلطی تھی۔ ان کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ ان کا ایمان، کھرا سونا تھا ان کو معاف کیا گیا اور ان پر اعتماد بحال کیا گیا۔ خود حضرت حق جل مجدہ نے اس کی سفارش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تمام مسلمانوں سے فرمائی لیکن عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین جو عین جنگ کے وقت اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدان سے پلٹا تھا اس کے دل میں چور اور نیت میں فتور تھا۔ تمام مسلمان اس بات کو جانتے تھے۔ چنانچہ جب مسلمان شکستہ حال مدینہ میں واپس آئے تو ان منافقوں نے آواز ے کسے۔ ''ہمیں معاملہ میں دخل دینے کا موقع نہیں دیا، اگر ہماری بات مانی جاتی تو میدانِ جنگ میں بے بسی کی موت نہ مرتے۔''

لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا (سورہ آل عمران ع ۱۷)

''اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔''

ایسے غدار جو جنگ کی نازک حالت میں شکست کی صورت پیدا کریں وہ لامحالہ مستحق ''گردن زدنی'' ہوتے ہیں۔ فوجی قانون ان کے قتل کا فیصلہ کرتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام کے درمیان بحث چلی کہ کیوں نہ ان غداروں کو تہ تیغ کیا جائے۔ ایک جماعت ان کے حق میں بھی قبول معذرت کی رائے رکھتی تھی دوسری جماعت کی رائے یہ بھی کہ ان کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ ان کی گردنیں اُڑا دی جائیں اس بحث کا خاتمہ کتاب اللہ کی اس آیت سے ہوا فما لکم فی المنافقین الایۃ (سر عنوان ملاحظہ فرمائیے)

مگر کیا اس آیت میں کوئی سزا تجویز کی گئی ہے، کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رحمت کا وہ چشمہ جو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبع فیض سے اُبل رہا تھا اور ارحم الراحمین کی رحمت کاملہ اس کی موجوں میں اضافہ کر رہی تھی

جس طرح اس نے ان خطا کاروں کو معاف کیا جن کی غلط فہمی تھی۔ اس موقع پر ان غداروں کو بھی نظرانداز کر دیا اور ان کا معاملہ دنیا کے بجائے آخرت کے حوالے کر دیا جن کا غدر واقعی غدر تھا۔

بحث کرنے والے کا جوش اس جملہ پر ڈھیلا پڑ گیا۔ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ" کیا تم چاہتے ہو کہ ان کو راہ دکھاؤ جن کی راہ خدا نے گم کر دی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تسکین کی ایک اور صورت اختیار فرمائی۔ ارشاد ہوا:

اِنَّهَا طَيِّبَةٌ تَنْفِي الْخُبْثَ كَمَا تَنْفِي النَّارُ خُبْثَ الْفِضَّةِ

"یہ (مدینہ) طیبہ ہے وہ کھوٹ کو نکال باہر کرے گا۔ جیسے آگ کی بھٹی چاندی کا کھوٹ باہر کر دیتی ہے۔"

حکمت درگزر:

ان پلٹنے والے تین سو میں اکثر و بیشتر وہ تھے جو رفتہ رفتہ بااخلاص مومن ہو گئے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم فراست اس کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ ان کی جڑیں کاٹ دے جو کچھ عرصے کے بعد شجر طوبیٰ بننے والے تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غداروں کے اخراج یا ان کو سزا دینے کا مسئلہ خصوصیات مدینہ طیبہ کے حوالہ فرما دیا۔ ارشاد مبارک کا منشا یہ ہے کہ وہ بدباطن جن کے دل حق وصداقت کے لیے ہموار نہیں ہوں گے یہ ارض پاک خود ان کو نکال پھینکے گی۔

حملہ آوروں کے مستقبل کی فکر:

اسی شفقت ورأفت کا یہ اثر تھا کہ اس روف رحیم کو اپنے زخموں کی فکر نہیں تھی، بلکہ فکر قوم کی تھی اور پریشانی اس کی تھی کہ اس قوم کی فلاح وکامیابی کی کیا صورت ہوگی جس نے اپنے نبی کی شان میں یہ گستاخی کی۔ (۷۸۲)

اس طرح کے مواقع اور بھی آئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مستقبل اُمت کی فکر حد سے فزوں ہوئی اور صورت اضطراب پیدا ہوگئی۔ چنانچہ کبھی ارشاد ربانی یہ ہوا:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (سورہ شعراء، رکوع اوّل)

"شاید تم اپنی جان گھونٹ لو گے اس پر کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے (آپ کی بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔"

کبھی ارشاد ہوا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (سورہ کہف ع۱)

"شاید تم گھونٹ ڈالو گے اپنی جان ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں اس بات کو پچتا پچتا کر۔"

(شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

اسی طرح اس موقع پر بھی حضرت حق جل مجدہ نے ان الفاظ میں رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین فرمائی:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ

(سورہ آل عمران ع ۱۴)

''اس معاملہ میں (کہ قوم کو فلاح اور کامیابی میسر آتی ہے یا نہیں) تمہیں کوئی دخل نہیں ہے تمہارا کام یہ ہے کہ ان لوگوں کو راہِ حق کی دعوت دو اور کسی حال میں بھی ان کی طرف سے مایوس نہ ہو) یہ کام اللہ کا ہے کہ چاہے ان سے درگزر کرے (اور ان کو کامیابی اور فلاح بخش دے) اور چاہے انہیں عذاب دے (جس کے وہ مستحق ہیں کیونکہ) بلاشبہ وہ ظالم ہیں۔''

ذات اقدس پر حملہ کرنے والے:

ان کی فہرست بہت طویل ہوسکتی ہے جنہوں نے حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر تیروں یا تلواروں سے حملے کیے۔ حدیث کے مشہور امام ''زہری'' کا اندازہ یہ ہے کہ اس ہنگامہ میں ستر (۷۸۳) مرتبہ آپ پر تلوار کے حملے ہوئے مگر اللہ تعالیٰ نے سب سے محفوظ رکھا۔ ان حملہ کرنے والوں کی کوئی فہرست اصحاب سیرت نے مرتب نہیں کی اور جب مطمح نظر عفو و درگزر ہو تو ایسی فہرست مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہوسکتی ہے۔ البتہ چار آدمیوں کے نام ارباب سیرت کی زبان پر آ گئے۔

(۱) اُمیہ بن خلف۔ مگر یہ حملہ کرنے کے لیے آیا تھا حملہ نہیں کر سکا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اُوپر حربہ پھینک مارا۔ جس کی خراش اگرچہ معمولی تھی مگر اس کے حق میں وہی مہلک ثابت ہوئی۔

(۲) ابن قمیہ۔ اس کی تلوار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن کے قریب مونڈھے پر لگی لیکن ذرہ میں اٹک کر رہ گئی اس سے جسد مبارک پر کوئی زخم نہیں آیا۔ البتہ ضرب کی تکلیف ایک ماہ سے زیادہ تک رہی۔ پھر اس نے پتھر پھینک مارا جس سے مغفر کی کڑیاں رُخسار مبارک میں گھس گئیں یہ شخص اس جنگ سے واپس ہو کر گھر پہنچا۔ کچھ دنوں بعد اپنے ایک بکرے کی تلاش میں پہاڑ پر چڑھا وہاں پکڑنے لگا تو اس نے ٹکر ماری جس سے یہ گر گیا اور لڑھکتا ہوا پہاڑ کے نیچے پہنچا۔ اس میں اس کا بدن پھٹ گیا۔ یہ بھی ایک روایت ہے کہ وہ پہاڑ سے نیچے گرا تو یہاں ایک پہاڑی بکرے نے اس کو سینگ مار مار کر ہلاک کر دیا۔ (۷۸۴)

(۳) عتبہ بن ابی وقاص، ایک روایت یہ ہے کہ اسلام سے مشرف ہوئے پھر ان کا انتقال ہوا مگر ان کے پتھر سے دندان مبارک شہید ہوئے تھے تو اس واقعہ کے بعد جتنے بیٹے پوتے پیدا ہوئے، قدرتی طور پر ان کے یہ دانت نہیں تھے۔ (۷۸۵)

(۴) عبداللہ بن شہاب زہری۔ یہ اسلام سے مشرف ہوئے اور حدیث کے مشہور حافظ امام زہری انہیں کے خاندان (۷۸۶) سے تعلق رکھتے ہیں۔

احتیاطی تدبیریں، ایثار اور غیر معمولی مستعدی

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ (سورہ آل عمران ع ۱۸)

''جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا۔ اس کے بعد کہ ان کو لگ چکا تھا زخم۔ ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

فراست نبوی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب میدان اُحد میں یہ اطلاع دی تھی کہ غنیم مکہ کی طرف روانہ ہوا ہے تو اگرچہ اطمینان ہو گیا تھا کہ مدینہ محفوظ ہے لیکن پھر بھی خطرہ تھا کہ دشمن راستہ سے پلٹ کر دوبارہ حملہ کر دے۔ لہٰذا بطور حفظ ماتقدم یہ بھی ضروری تھا کہ ایک دستہ دشمن کے تعاقب میں بھیج دیا جائے تاکہ اگر وہ پلٹنا چاہے تو یہ دستہ روک تھام کر سکے۔ پھر یہ بھی ضروری تھا کہ شب میں مدینہ کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جائے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے لشکر کے متعلق یہ طے فرمایا کہ مدینہ پہنچے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جملہ مجاہدین کے ساتھ مغرب سے پہلے مدینہ طیبہ رونق افروز ہو گئے اور وہاں حفاظت کے انتظامات فرما دیے۔ یہ یقینی بات تھی کہ دشمن اگر رات کو مدینہ پر حملہ کرتا تو سب سے پہلے کاشانہ نبوت کا رخ کرتا۔ چنانچہ حضرات انصار کے عمائدین بارگاہ نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو گئے اور رات وہیں گزاری۔ زخمیوں کی تعداد کافی تھی۔ رات کو لوگوں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی (۷۸۷) یہ اس لشکر کا ماجرا تھا جو مدینہ میں آیا لیکن:

دشمن کے تعاقب میں دستہ:

میدان اُحد میں روانگی سے پیشتر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا **من یذھب فی اثرہ** (۷۸۸) ان کا تعاقب کون کرے گا۔ فوراً ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی جماعت اس مہم کے لیے تیار ہو کر روانہ ہو گئی۔ (۷۸۹)

حمراء الاسد تک یورش:

مدینہ طیبہ میں رات خیریت سے گزر گئی۔ دشمن نے مدینہ طیبہ پر یورش نہیں کی لیکن یہ خطرہ باقی تھا کہ دشمن راستہ سے پلٹ کر دوبارہ حملہ کر دے۔ کوئی شخص اسی روز مکہ معظمہ سے مدینہ پہنچا تھا۔ راستہ میں ابوسفیان سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بھی آ کر ذکر کیا کہ لشکر قریش میں یہ بات چل رہی تھی کہ ہمیں دوبارہ حملہ کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ ہم سخت غلطی کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ وہ نیم جان ہو چکے ہیں، ان پر فوراً حملہ کر دیا جائے تو ان کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ ہم اسی مقصد سے آئے تھے جب کہ اس مقصد

کے پورا ہونے کا موقع ہے تو ادھورا کام کر کے واپس ہو جانا دانشمندی ہے نہ تقاضاء شجاعت ہے۔ ابوسفیان کا رجحان یہی تھا۔ مگر صفوان بن اُمیہ اس کی مخالفت کر رہا تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ مدینہ میں اور مسلمان بھی ہیں جو تازہ دم ہوں گے۔ ہماری یہ فتح بھی مسلمانوں کی خود اپنی ایک غلطی کے باعث ہوئی ہے۔ اب دوبارہ حملہ کرنے میں خطرہ ہے کہ ہم کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ پھر ہماری یہ شہرت ختم ہو جائے گی۔ رُسوائی اور بدنامی پلے پڑے گی۔ (۷۹۰)

بہر حال رات گزرنے کے بعد اتوار کی صبح کو جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرما دیا کہ اعلان کر دیں۔ (۷۹۱)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے دشمن کے تعاقب میں چلو اور حکم ہے کہ صرف وہی لوگ چلیں جو کل ہمارے ساتھ جنگ میں شریک تھے۔ (۷۹۲)

نوجوان مجاہد صادق:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ جن کے والد ماجد کل شہید ہو چکے تھے انہوں نے یہ اعلان سنا تو وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ کل میں اس لیے حاضر نہیں ہو سکا تھا کہ والد صاحب جہاد میں تشریف لے گئے تھے اور مجھے فرما گئے تھے کہ میں بہنوں کے پاس رہوں۔ والد صاحب کی وصیت ختم ہو چکی۔ اب طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ حضرت اقدس جہاد میں تشریف لے جائیں اور میں گھر پر پڑا رہوں۔ مجھے بھی اجازت دی جائے کہ یہ سعادت حاصل کر سکوں، خدا کرے مجھے بھی شہادت میسر آ جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوان کا جذبہ دیکھا تو ان کو اجازت دے دی۔ (۷۹۳)

عبداللہ بن ابی اور اس ٹائپ کے کچھ اور آدمیوں نے بھی ساتھ چلنے کی اجازت چاہی آنحضرت نے ان کو منع فرما دیا۔ (۷۹۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا طلب فرمایا جو اسی طرح بندھا ہوا تھا۔ اس کا پھریرہ ابھی تک اُتارا نہیں گیا تھا۔ یہ جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا فرما دیا (۷۹۵)۔ آپ نے حمراء الاسد کا قصد فرمایا۔ یہ مدینہ طیبہ سے آٹھ دس میل تھا۔ حضرت ثابت بن ضحاک راستہ بتانے کے لیے آگے آگے چلے۔ (۷۹۶)

اَلَّذِیۡنَ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ (مجروحین):

جن کو ساتھ چلنے کا حکم ہوا تھا جو کل کی جنگ میں شریک تھے ان میں زیادہ تر مجروح اور مضروب تھے جو رات بھر زخم سینکتے اور مرہم پٹی کرتے رہے تھے۔ ان میں سب سے مقدم خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی تھا۔ پیشانی اور رُخسار مبارک مجروح، دندان مبارک شہید، لب مبارک چھِتے ہوئے، دہنے مونڈھے پر چوٹ کا اثر، اس کا درد وکرب باقی، دونوں گھٹنوں میں چوٹ لگی ہوئی اور کھال چھلی ہوئی۔ (۷۹۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ:

• حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے بدن پر نو زخم، عتبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے بدن پر نو جگہ چوٹ اور زخم، خرش بن صمہ رضی اللہ عنہ کے بدن پر دس زخم، کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اس سے زیادہ زخم بدن پر لیے ہوئے، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بدن پر بیس زخم، طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈھال بن کر تیر اپنے اُوپر لیتے رہے اور ایک مرتبہ بے ہوش (۷۹۸) ہو گئے تھے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان پر پانی کے چھینٹے ڈالے اور ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی) ان کے بدن پر ستر سے زیادہ زخم۔ ایک اُنگلی کٹی ہوئی۔ ہاتھ اتنا مجروح کہ وہ بیکار ہو گیا۔ کبھی اس میں طاقت ہی نہیں آئی۔ اسی طرح کم وبیش اور رفقاء کرام بھی تھے جو اس وقت اپنے مشفق آقا کی زیرِ قیادت، حمراء الاسد کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ قرآن حکیم کی آیت بالا جن کی تحسین وآفرین کر رہی ہے۔

اس مجروح مگر باحوصلہ لشکر نے حمراء اسد پہنچ کر قیام کیا دشمن آگے ''روحاء'' پہنچ چکا تھا جو مدینہ سے تقریباً چھتیس میل ہے۔ وہ وہاں سے پلٹنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ وہاں قبیلہ خزاعہ کے رئیس ''معبد'' پہنچ گئے۔ اس پورے قبیلہ کو مسلمانوں سے اور اسلام سے ہمدردی تھی۔ اگرچہ یہ سب ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ معبد کے متعلق بھی ابوسفیان کو یہی یقین تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔

معبد خزاعی نے ابوسفیان کو خبر دی کہ مدینہ کے مسلمانوں کو جب اُحد کی شکست کا علم ہوا تو ان میں ہر ایک آگ بگولا ہو گیا اور قریش پر دانت پیسنے لگا۔ یہ سب لوگ انتقام لینے کے لیے نکل پڑے ہیں ممکن ہے آج ہی تم تک پہنچ جائیں۔ ابوسفیان کا رجحان اگرچہ یہ ہو گیا تھا کہ پلٹ کر حملے کرے لیکن صفوان بن اُمیہ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ اب معبد خزاعی کے اس بیان سے صفوان کی بات پکی ہو گئی اور یہی طے ہوا کہ پلٹنے کے بجائے مکہ کی طرف تیزی سے بڑھنا چاہیے۔ (۷۹۹)

حمراء اسد میں قیام ایک تدبیر اور اس کا اثر:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر تین روز قیام فرمایا۔ زخموں کو سینکنے کے لیے رات کو آگ کی ضرورت بھی پڑتی تھی لیکن جنگی مصلحت کے لحاظ سے بھی یہ مناسب تھا کہ رات کو جگہ جگہ آگ جلائی جائے۔ چنانچہ پانچ سو پوار آگ کے لگ جاتے تھے جن کی روشنی دور دور تک جاتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑی فوج پڑی ہوئی ہے۔ (۸۰۰)

دشمن واپس اور مسلمان اتنی تعداد میں موجود اور اطمینان سے وسیع میدان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے یہ ایسی تدبیر تھی جس نے شکست کے باوجود آس پاس کے قبائل میں مسلمانوں کی حیثیت قائم رکھی اور بڑی حد تک مسلمان شکست کے نتائج بد سے محفوظ ہو گئے۔ (۸۰۱)

مسلمانوں کی خوراک کھجور تھی لیکن یہاں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ رئیس خزرج نے تیس اُونٹ بھی بھیج دیے تھے جو ذبح کیے گئے۔

دو شہیدوں کی قبر:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین آدمیوں کو بطور مخبر بھیجا تھا کہ دشمن کی فوج کا جائزہ لیں۔ اسی مقام (حمراء اسد) پر ان میں سے دو آدمی دشمن کے ہاتھ لگ گئے۔ ان دونوں کو شہید کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب وہاں پہنچے تو ان کی لاشیں دیکھیں۔ غزوہ اُحد کے شہداء کی طرح ان دونوں کو بھی ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ (۸۰۲)

شوق بے پناہ:

عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ اور رافع بن سہیل رضی اللہ عنہ دو بھائی تھے۔ جنگ اُحد میں شریک رہے تھے۔ دونوں زخمی ہو گئے تھے۔ حضرت رافع رضی اللہ عنہ کی ٹانگ میں ایسی ضرب آئی تھی کہ ان کو چلنا مشکل تھا۔ مگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اعلان کانوں میں پڑا تو آپس میں کہنے لگے۔ آج تک کبھی کسی غزوہ میں ہم پیچھے نہیں رہے۔ کیا آج ہم اس غزوہ اور اس سفر کی شرکت سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بلا سواری پاپیادہ یہ دونوں روانہ ہو گئے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے زخم کم تھے ان میں طاقت تھی۔ جب ان کے بھائی رافع رضی اللہ عنہ چلنے سے معذور ہو جاتے تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ان کو چڈھی چڑھا کر لے چلتے تھے اسی طرح یہ سفر ختم کیا۔ مغرب بعد عشاء کے قریب حمراء الاسد پہنچے، جب لوگ آگ کے پوار لگا رہے تھے محافظین نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا۔ جب معلوم ہوا کہ یہ انصاری صاحبان ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاخیر کی وجہ دریافت کی۔ جب ان صاحبان نے پورا واقعہ بیان کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی۔ (۸۰۳)

براہِ عشق گر دریا خلد خارے نباید از رہش پرہیز کردن
کہ از خارش نبسے گلہا شگوفد قدم بر خار باید تیز کردن

الحب فی اللہ اور البغض فی اللہ کے عملی نمونے

فضیلت صحابہ رضی اللہ عنہم پر قرآنی شہادت

ارشاد ربانی ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (سورہ مجادلہ ح ۲۸ ع ۳)

''جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور رسول کے برخلاف ہیں خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے یا بھائی یا ان کے کنبہ کے، یہی ہیں وہ جن کے دلوں میں لکھ دیا ہے (اللہ تعالیٰ نے) ایمان اور ان کی مدد کی اپنے غیب کے فیض سے اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی۔ وہ ہیں جتھا (گروہ) اللہ کا خوب سن لو جتھا ہے اللہ کا وہی ہے مراد کو پہنچنے والا۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ (الحدیث)

''کوئی شخص مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہے جب تک اس کو مجھ سے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایسی محبت اور ایسا تعلق خاطر نہ ہو جائے کہ اس کے مقابلہ میں والد، اولاد اور انسانوں میں سے جو بھی ہو اس کی محبت ہیچ اور بے حقیقت ہو۔''

غزوہ بدر اور غزوہ اُحد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جاں نثاری اور فداکاری کے کچھ واقعات آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ان پر دوبارہ نظر ڈال لیجیے اور فیصلہ فرمائیے کہ:

(الف) آیات کتاب اللہ اور ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کے پرکھنے کی جو کسوٹی تجویز فرمائی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کسوٹی پر کہاں تک صحیح اُترتے ہیں۔

(ب) اگر یہ قبا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے تن زیبا پر بالکل ٹھیک اور نہایت موزوں ہے تو کیا خلعت فضیلت کے سب سے زیادہ مستحق یہی حضرات نہ ہوں گے۔ کیا کائنات کی آنکھ کا تارا ان بزرگوں کے علاوہ کسی اور جماعت کو قرار دیا جا سکتا ہے؟

نتیجہ جنگ:

یہی کہا جاتا ہے اور ذہنوں میں یہی بیٹھا ہوا ہے کہ غزوہ اُحد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ مگر یہ تصور ایسا

ہی ہے جیسے اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہونے والا، درجہ دوم کی کامیابی کو ناکامی سمجھنے لگتا ہے۔

قریش نے مدینہ والوں کو لکھا تھا کہ ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نکال دو یا اس سے جنگ کرو ورنہ ہم مدینہ پہنچیں گے۔ تمہارے جوانوں کو قتل کریں گے، عورتوں کو باندیاں بنالیں گے۔''

غزوہ بدر میں شکست ہوئی تو یہ غصہ اور بڑھ گیا۔ بظاہر بدر کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے اور درحقیقت اپنی بنیادی دھمکی کو عمل میں لانے کے لیے قریش نے پوری تیاری کی۔ نہ صرف مکہ بلکہ بیرونِ مکہ کے ہم نوا قبائل کو بھی ساتھ لیا۔ پورا پروپیگنڈہ کر کے ہر ایک جنگجو کو مشتعل کیا۔ کافی دولت صرف کی۔ تقریباً سوا تین ہزار کا لشکر جرار غصہ سے دانت پیستا ہوا مدینہ کی طرف بڑھا اور حدود مدینہ کی ڈیوڑھی (ذوالحلیفہ) تک پہنچ گیا پھر کیا ہوا۔

اللہ والوں کا ایک لشکر مدینہ سے چلا۔ اس لشکر کے سر پر پہنچ گیا۔ صرف چند گھنٹہ مقابلہ کیا اور اس لشکر جرار کو حواس باختہ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ پھر تعاقب کیا اور یہاں تک خوف زدہ کر دیا کہ پلٹنے کا نام بھی نہ لے سکا۔

یہ اللہ والوں کی فتح ہے یا شکست؟

مسلمانوں نے اس کو شکست صرف اس لیے کہا کہ:

(۱) ان کا محبوب آقا جس کی عافیت ان کو اپنی ہر ایک چیز سے زیادہ محبوب تھی وہ مجروح ہو گیا تھا اور یہ المیہ خود ان کی ایک غلطی کی بنا پر پیش آیا تھا۔

(۲) جانی نقصان قریش کی مقابلہ میں نسبتاً زیادہ ہوا تھا۔

وحی الٰہی نے عتاب آمیز انداز صرف اس لیے اختیار کیا کہ ارشاد رسول اللہ ﷺ کی تعمیل میں کچھ افراد نے پوری بیداری اور پختگی سے کام نہیں لیا تھا۔ اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَار.

تنبیہات وہدایات

مسلمانوں کی کامیابی اور ترقی کا نظام عمل

(۱) دل میں خوف خدا (تقویٰ) عزم میں پختگی، تعلق باللہ کے اصول پر یکجہتی اور تنظیم واتحاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۱۱)

''اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو ایسا ڈرنا جو واقعی ڈرنا ہو اور ہرگز نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو (سب سے ضروری نصب العین) اسلام پر مضبوطی سے قائم رہو (اور دیکھو) مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو''

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

''اور ضروری ہے کہ ایک جماعت تم میں ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دیتی ہے (بلاتی رہے) اچھی باتوں اور نیک کاموں کا حکم دیتی رہے اور برائی سے منع کرتی رہے، ایسے ہی لوگ کامیاب وبامراد ہوں گے۔''

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (سورہ آل عمران ع ۱۱)

''اور ان کی طرح نہ ہو جانا جو پھوٹ گئے (خدا کے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے کے بجائے الگ الگ ہو گئے) اس کے باوجود کہ کتاب اللہ کی روشن اور واضح دلیلیں ان کے سامنے آ چکی تھیں (یقین کرو) یہی لوگ ہیں جن کے لیے کامیابی کے بجائے بڑا (سخت) عذاب ہے۔ جس روز سفید (اور روشن) ہوں گے کچھ چہرے اور کالے ہو جائیں گے کچھ منہ۔ پس جن کے منہ کالے (اور چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا ایمان لانے کے بعد تم لوگ کافر ہو گئے تھے تو جیسی کچھ تمہاری منکرانہ چال تھی

اب اس کے بدلہ میں عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے چہرے روشن ہوں گے (چمک رہے ہوں گے) وہ اللہ کی رحمت کے سایہ میں ہوں گے (ان کو بشارت ہوگی کہ) وہ رحمت کے اسی سایہ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے)''

(۲) انقلابات کے کچھ قدرتی اصول ہیں۔ مسلمانوں کی ترقی بھی انہیں اصول کی پابند ہوگی نصرت خداوندی بھی اسی وقت ہوگی، جب ترقی پذیر اصول کے تقاضوں کو پورا کرتے رہو۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (سورہ آل عمران)

''تم سے پہلے بھی دنیا میں (قوموں کے عروج وزوال کے) دستور اور قوانین رہ چکے ہیں (وہ تمہارے لیے معطل نہیں ہو جائیں گے) پس دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ احکام حق کو جھٹلانے والے تھے، ان کا انجام کیا ہوا (اور پاداش عمل میں کیسے نتائج پیش آئے) یہ لوگوں کی فہم وبصیرت کے لیے ایک بیان ہے اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت و موعظت ہے۔''

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (سورہ آل عمران ع ۱۴)

''اگر تمہیں (احد کی لڑائی میں) زخم لگا ہے تو دوسرے فریق کو بھی ایسا ہی زخم (بدر میں) لگ چکا ہے۔ یہ ہار جیت کے واقعات ہیں جنہیں ہم انسانوں میں یوں ہی ادلتے بدلتے رہتے ہیں (کبھی ایک گروہ کے حق میں میدان جنگ کا فیصلہ ہوتا ہے، کبھی دوسرے کے حق میں) پس یہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے تم ہمت ہار بیٹھو۔ اصل چیز جو سوچنے کی ہے وہ ایمانی قوت ہے اگر تمہارے اندر ایمان کی سچی روح موجود ہے تو پھر رفعت اور سربلندی صرف تمہارے ہی لیے ہے)''

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (سورہ آل عمران ع ۱۴)

''(مسلمانو!) کیا تم سمجھتے ہو کہ (محض ایمان کا دعویٰ کرکے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے (اور ایمان وعمل کی آزمائشوں سے تمہیں گزرنا نہ پڑے گا) حالانکہ ابھی تو وہ موقع بھی پیش نہیں آیا کہ اللہ تمہیں آزمائش میں ڈال کر یہ بات واضح کر دیتا کہ کون لوگ راہ حق میں پوری کوشش کرنے والے ہیں اور کتنے ہیں جو مشکلوں اور شدتوں میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔''

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (سورہ آل عمران ع ۱۴)

''اور (دیکھو) نہ تو ہمت ہارو اور نہ غمگین ہو تم ہی سب سے سر بلند ہو بشرطیکہ سچے مومن ہو۔''

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔

''اور (دیکھو) کتنے نبی ہیں جس کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جہاد کیا (لیکن ایسا نہیں ہوا کہ) سختیوں کی وجہ سے جو انہیں راہ حق میں پیش آئیں انہوں نے ہمت ہار دی اور نہ ایسا ہوا کہ وہ کمزور پڑ گئے ہوں (اور سست ہو گئے ہوں) اور نہ وہ کبھی (حریف کے مقابلہ میں) دبے نہ بے بس ہوئے اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو مشکلوں اور مصیبتوں میں ثابت قدم رہتے ہیں۔

اور (سختیوں اور مصیبتوں کا کتنا ہی ہجوم کیوں نہ ہو) ان کی زبانوں سے اس کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا کہ اے ہمارے رب ہمارے گناہ بخش دے، ہم سے ہمارے کام میں جو بے جا زیادتیاں ہوگئی ہوں ان سے درگزر فرما۔ ہمارے قدم راہ حق میں جما دے اور منکرین حق کے گروہ پر ہمیں فتح مند کر۔''

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران ع ۱۵)

''(جب ان کے ایمان و عمل کا یہ حال تھا) تو خدا نے بھی انہیں دونوں جہان میں اجر عطا فرمایا۔ دنیا کا بھی ثواب دیا (کہ فتح و کامرانی ان کے حصہ میں آئی) اور آخرت کا بھی بہترین ثواب دیا (کہ نعیم ابدی کے مستحق ہوئے) اور اللہ انہیں لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو نیک کردار ہوتے ہیں۔

یہ نصب العین اصول اور عقائد و نظریات ہیں۔ کوئی شخصیت خواہ کتنی ہی بلند ہو بناء کار اور بنیادی مقصد نہیں ہے۔ شخصیت کے لیے قربانی کی جا سکتی ہے لیکن اگر یہ شخصیت قربان ہو جائے تو نصب العین کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔''

③ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (سورہ عمران ع ۱۵)

''اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول ہو چکے ہیں (جو

اپنے اپنے وقت میں مبعوث ہوئے اور راہ حق کی دعوت دے کر رخصت ہو گئے) پھر اگر
ایسا ہو کہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) وفات پا جائیں یا (راہ حق میں بالفرض) قتل کر دیے
جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں راہ حق سے پھر جاؤ گے (اور ان کے مرنے کے ساتھ تمہاری
حق پرستی بھی ختم ہو جائے گی) اور جو کوئی راہ حق سے اُلٹے پاؤں پھر جائے گا (وہ اپنا ہی
نقصان کرے گا۔) اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور جو لوگ شکر گزار ہیں (نعمت حق کی
قدر سمجھنے والے ہیں) وہ وقت دور نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کا اجر عطا فرمائے گا۔''

④ بھروسہ خدا پر ہو۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (سورہ آل عمران ع ۱۷)

'' (مسلمانو!) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی نہیں جو تم پر غالب آ سکے اور اگر وہی تمہیں
چھوڑ بیٹھے تو بتاؤ کون ہے جو اس کے چھوڑ دینے کے بعد تمہارا مددگار ہو سکے اور اللہ ہی پر
بھروسہ رکھنا چاہیے مسلمانوں کو۔) ''

غزوہ اُحد میں جھٹکا کیوں لگا:

(الف) اسباب۔

اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (سورہ آل عمران ع ۱۷)

'' جب (جنگ اُحد میں) تم پر مصیبت پڑی اور یہ مصیبت ایسی تھی کہ اس سے دوگنی
مصیبت تمہارے ہاتھوں (بدر میں) دشمنوں پر پڑ چکی تھی تو تم بول اُٹھے یہ مصیبت ہم پر
کہاں سے آئی (اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں سے کہہ دو (مصیبت تو ضرور آ
پڑی مگر) خود تمہارے ہاتھوں سے آئی اگر تم کمزوری نہ دکھاتے اور احکام رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کی تعمیل کرتے تو کبھی یہ مصیبت پیش نہ آتی۔''

(ب) حکمت و مصلحت۔

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران ع ۱۴)

'' (اس حادثہ کی ایک مصلحت یہ بھی تھی) کہ اس بات کی آزمائش ہو جائے کہ سچا ایمان
رکھنے والا ہے اور یہ کہ کرے کچھ تم میں کے شہید (ان کو درجہ شہادت عطا فرمائے) اور اللہ

تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا (اور ایک مصلحت یہ بھی تھی) کہ اللہ تعالیٰ نکھار دے ایمان والوں کو اور گھٹا دے منکرین حق کو (کہ اہل ایمان کی پختگی کے نتیجہ میں اہل باطل پست اور نابود ہوں گے۔"

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (سورہ آل عمران ع ۱۸)

"ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ ایمان والوں کو ایسی حالت میں چھوڑے رکھے جس حالت میں تم آج کل اپنے آپ کو پاتے ہو (کہ منافق اور مومن دونوں ملے جلے ہیں) وہ ضرور ایسا کرے گا کہ ناپاک کو پاک سے الگ کردے۔ (اور منافق مومنوں سے الگ پہچان لیے جائیں۔)"

لایعنی اور بیکار باتیں، فلسفہ موت وحیات

راہ حق میں مرنا اور قتل فی سبیل اللہ با مقصد موت اور بہترین سرمایہ ہے

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَی اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ۔

(سورہ آل عمران ع ۱۷)

مسلمانو! ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور جن کا شیوہ یہ ہے کہ اگر ان کے بھائی بند سفر میں گئے ہوئے ہوں یا لڑائی میں مشغول ہو گئے ہوں تو کہنے لگتے ہیں اگر یہ ہمارے پاس ہوتے تو ان کو نہ موت آتی اور نہ وہ قتل کیے جاتے۔

(مسلمانو! تم اس قسم کی لغو اور بے ہودہ باتوں سے احتیاط برتو۔ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے موت و حیات کا معاملہ خدا کے حوالہ کر دو اور مضبوطی اور مستعدی سے کام لو) تا کہ تمہارے اس اعتماد اور استقلال کو اللہ تعالیٰ ان منافقوں اور منکرین حق کے دلوں کا داغ بنا دے۔ (اور یاد رکھو) موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے وہی مارتا اور جلاتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی نظر رہتی ہے۔

اور (دیکھو) اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے یا اپنی موت مر گئے تو اللہ کی طرف سے جو رحمت وبخشش تمہارے حصہ میں آئے گی وہ یقیناً ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کی پونجی لوگ جمع کیا کرتے ہیں اور (یاد رکھو) تم اپنی موت مرو یا مارے جاؤ، ہر حال میں ہونا یہی ہے کہ تم اللہ کے حضور جمع کیے جاؤ گے۔''

یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ یُخْفُوْنَ فِیْ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (سورہ آل عمران ع ۱۶)

''اس گروہ کے لوگ کہتے تھے کہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے اختیار کی کیا بات تھی (جو خدا کو کرنا تھا کر دیا) اے نبی! تم ان لوگوں سے کہہ دو (اس معاملہ پر ہی کیا موقوف ہے)

ساری باتیں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں (لیکن اللہ ہی نے ہر نتیجہ کے لیے اس کے اسباب بھی مقرر کر دیے ہیں) اصل یہ ہے کہ جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے وہ تم پر ظاہر نہیں کرتے۔

(حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے عقیدہ کامیابی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں کا وہ معاذ اللہ مذاق بناتے ہیں) کہتے ہیں اگر واقعی کامیابی اور کامرانی کا کوئی حصہ بھی ہمارے لیے ہوتا تو ہم یہاں تہ تیغ نہ کیے جاتے۔ اے نبی! آپ فرما دیجیے اگر تم اپنے گھروں کے اندر (چھپے) ہوتے تب بھی جن کے لیے مارا جانا تھا، وہ گھر سے ضرور نکلتے اور اپنے مارے جانے کی جگہ پہنچ کر رہتے (جب اعلیٰ مقصد سامنے ہو تو موت سے ڈرنا بے معنی ہے) واقعہ یہ ہے کہ اس جنگ میں جو کچھ ہوا اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں از انجملہ ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ جو کچھ سینوں میں چھپا ہوا ہے اس کے لیے تمہیں آزمائش میں ڈالے اور جو کدورتیں تمہارے دلوں میں پیدا ہو گئی تھیں انہیں پاک وصاف کر دے اور اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو انسانوں کے دلوں میں پوشیدہ ہے۔''

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ۔ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ (سورہ آل عمران ع ۱۶)

''مسلمانو! اگر تم ان لوگوں کے کہنے میں آ گئے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تو (یاد رکھو) وہ تمہیں راہ حق سے اُلٹے پاؤں لوٹا دیں گے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ (سعادت کی راہ چل کر پھر) تباہی اور نامرادی میں جا گرو گے (یہ دشمنانِ حق تمہارے کارساز و رفیق نہیں ہو سکتے) تمہارا کارساز و رفیق تو اللہ ہے۔ مدد کرنے والوں میں سب سے بہتر مددگار وہی ہے۔''

تقدیس شان رسالت:

وَمَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ۔

''دیکھو! نبی کے لیے ممکن نہیں کہ (وہ اللہ کی امانت، وحی وغیرہ یا بندوں کی امانت مال غنیمت وغیرہ میں) کسی طرح کی خیانت کرے (کیونکہ جو نبی ہوگا وہ خائن نہیں ہو سکتا) اور جو کوئی خیانت کرتا ہے جو کچھ اس نے خیانت کی ہے (اسے دنیا میں لوگوں کی نظروں

سے کتنا ہی چھپا لے، قیامت کے دن نہیں چھپا سکے گا) وہ قیامت کے دن اس خیانت کو اپنے ساتھ لیے ہوئے آئے گا۔ پھر ہر جان اور ہر ایک نفس کو اس کی کمائی کے مطابق پورا پورا بدلہ ملنا ہے۔ یہ نہ ہوگا کہ کسی کے ساتھ بھی کوئی ناانصافی کی جائے۔

کیا ایسا آدمی جس نے اللہ کی خوشنودیوں کی راہ اختیار کی ہے (اور جو کام کرتا ہے وہ اللہ کا پسندیدہ کام ہوتا ہے) (وہ اس آدمی کی طرح ہوسکتا ہے جس نے (اپنی بداعمالیوں سے) اللہ کا غضب بٹورا اور جس کا ٹھکانا جہنم جیسا برا ٹھکانا ہوا (نہیں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا) اللہ کے نزدیک لوگوں کے (الگ الگ) مرتبے ہیں اور جیسے کچھ ان کے اعمال ہیں اللہ انہیں دیکھ رہا ہے۔''

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران ع ۱۷)

''بلاشبہ اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان ہے کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا جو انہیں میں سے ہے وہ اللہ کی آیتیں انہیں سناتا ہے۔ ہر طرح کی برائیوں سے انہیں پاک کرتا ہے اور کتاب ودانشمندی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس نے ہدایت کی راہ ان پر کھول دی حالانکہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

غزوہ اُحد کے بعد

اسلام کو تباہ و برباد کرنے کی نئی صورتیں اور تدبیریں

① پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے کہ یہ معرکہ اتفاق نہیں تھا۔ بلکہ ان کوششوں کا نتیجہ تھا جو تقریباً تین سال سے جاری تھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے پنجہ سے نکل کر ''مدینہ منورہ'' رونق افروز ہو گئے تھے، غزوہ بدر کے بعد ان میں منتقمانہ جذبات کی شدت و وحدت بھی پیدا ہو گئی تھی۔

ان کوششوں کا دائرہ صرف ''قریش مکہ'' تک محدود نہیں رہا تھا بلکہ مقرروں اور شعراء کے ذریعہ اس آگ کو دور دور تک پھیلانے کی کوشش کی گئی۔

② جنگ اُحد میں ''قریش'' کو صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ مقتولین معرکہ بدر کا انتقام لے لیا۔ چنانچہ واپسی کے وقت ابوسفیان نے پکار کر کہا تھا:

یوم بیوم بدر والحرب سجال

یہ بدر کا بدلہ ہوا اور جیسے کنویں میں ڈول اُوپر نیچے ہوتے رہتے ہیں کبھی کسی کا ڈول اُوپر ہو جاتا ہے کبھی کسی کا۔ ایسے ہی جنگ میں کبھی ایک فریق کا غلبہ ہو جاتا ہے کبھی دوسرے کا۔

لیکن اسلام کی بیخ کنی جو قریش کا اصل مقصد تھا اس میں کامیابی تو کیا ہوتی، اس کے برعکس قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہوا، گلشن یقین میں تازگی آئی اور خمار عشق اور بڑھ گیا۔ چنانچہ غزوہ احد کے تذکرہ کے بعد کتاب اللہ کی آیتیں یہ ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ تا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔

''(وہ برگزیدہ بندے) جنہوں نے (غزوہ اُحد کا) زخم لگنے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہا۔ جب ان سے کہا گیا کہ لوگ تمہارے (ختم کرنے کے) لیے اکٹھے ہو رہے ہیں تمہیں ان سے خائف ہونا چاہیے تو ان کے ایمان اور بڑھ گئے اور ان کی زبان سے نکلا حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔'' (سورہ آل عمران ع ۱۸)

غزوہ اُحد کے بعد قریش کا دعویٰ اور ان کا پروپیگنڈا کچھ بھی ہوا ہو مگر اتنی بات خود قریش اور قریش کے علاوہ عرب کے جملہ قبائل سمجھ چکے تھے کہ مسلمانوں کو ختم کر دینا صرف قریش کے بس کی بات نہیں ہے۔ پس اگر اپنے دھرم، استھانوں اور اپنے دیوتاؤں کو اسلام کی زد سے بچانا ہے تو ہر قبیلہ کا فرض ہے کہ قریش کی مدد کرے اور جس صورت سے بھی مسلمانوں کو زک پہنچا سکتا ہو زک پہنچائے۔

غزوۂ احد، شوال ۳ھ میں ہوا۔ اس سے تقریباً دو ماہ بعد حج کا وقت آیا۔ حج کے موقع پر عرب کے تمام قبائل مکہ معظمہ پہنچا کرتے تھے اور کچھ اس طرح لین دین ہوا کرتا تھا کہ قریش ان کی خدمت کیا کرتے تھے اور قبائل عرب کے دلوں میں قریش کی عظمت بڑھا کرتی تھی۔ یہ لین دین اس سال بھی ہوا بلکہ بڑھ چڑھ کر ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام دشمنی کا جذبہ جو قبائل عرب میں پیدا کیا جا رہا تھا اور غزوہ بدر کے بعد جس کا خاص اہتمام و انتظام کیا گیا تھا اس وقت اس نے جارحانہ شکل اختیار کر لی چنانچہ جیسے ہی لوگ حج سے واپس ہوئے ۴ھ کی ابتداء (ماہ محرم) ہی سے اسلام اور مسلمانوں کی تخریب واستیصال کی تین صورتیں عمل میں لائی جانے لگیں۔

(۱) مختلف قبائل کی طرف سے حملہ کی تیاری۔

(۲) مسلمانوں کی پوری پوری جماعتوں کو دھوکہ دے کر قتل کر دینا۔

(۳) سرور کائنات جان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی کوشش۔

یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شخصیت ایک معجزہ تھی اگر سلسلہ روحانیت میں بلند نظر حد اعجاز سے آگے بڑھی ہوئی تھی تو سیاست اور تدبیر مملکت میں بھی نظر کی گہرائی اور دور اندیشی معجزہ کی شان رکھتی تھی۔

دشمن کی چال کے جواب میں جو تدبیریں اختیار کی گئیں اگر چہ اللہ نے ان کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا (سورہ طارق)

''لوگ طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی طرح طرح کی تدبیریں کر رہا ہوں۔''

لیکن اس مادی دنیا میں خداوندی تدابیر انہیں مادی انسانوں کے ذریعہ نمودار ہوئیں جن کے جان و مال کو اللہ تعالیٰ نے جنت کے معاوضہ میں خرید لیا تھا۔ (۸۰۵)

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (سورہ توبہ ع ۱۴)

اور پہلے گزر چکا ہے کہ افضلیت جہاد کی علت ہی یہ ہے کہ مجاہد اپنے نفس کا بندہ بن کر جہاد نہیں کرتا بلکہ رضاء الٰہی کے تابع اور منشاء الٰہی کی تکمیل کے لیے ایک ''آلہ'' بن کر جانی اور مالی قربانی پیش کیا کرتا ہے۔ بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیریں اگر چہ من جانب اللہ تھیں مگر سلسلہ اسباب میں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے تدبر کا نتیجہ تھیں اس لیے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے گوہر درخشاں ہیں۔

بہر حال دشمنانِ اسلام نے جو راستے اختیار کیے ان کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اقدام یہ تھا کہ جس قبیلہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ حملہ کی تیاری کر رہا ہے اس سے پہلے کہ وہ آگے آئے آپ نے پہلے ہی مجاہدین کا دستہ ان کے سر پر بھیج دیا اور شورش کی چنگاریوں کو وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ اگر وہ شورش ایک شخص کے

خاتمہ سے ختم ہو سکتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک شخص کے متعلق تدبیر اختیار کی اور پورے قبیلہ کو جنگ کی مصیبت میں مبتلا نہیں کیا۔ چند واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

سریہ ابوسلمہ:

طلیحہ اور سلمہ حملہ کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے گھوم (۸۰۶) پھر کر اور قبائل کو بھی آمادہ کیا تھا۔ ابھی یہ کوئی حرکت نہیں کر سکے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سو پچاس مجاہدین کا دستہ ان پر یورش کے لیے بھیج دیا۔ اپنے ایک عزیز رشتہ دار ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی رضی اللہ عنہ کو اس کا علمبردار بنایا۔ اسی لیے اس کو ''سریہ ابوسلمہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ دستہ بہت تیزی سے ''قطن'' پہنچا جو حملہ آوروں کا مرکز تھا۔ ان کی چراگاہ پر حملہ کر کے ان کے مویشی ضبط کر لیے۔ تین چرواہوں کو گرفتار کر لیا۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے چند روز یہاں قیام کیا۔ پچاس مجاہدین کو اپنے ساتھ رکھا۔ باقی مجاہدین کی دو ٹولیاں بنا کر ان قبائل کی طرف بھیج دیں جو اس تیاری میں شریک تھے۔ ان مجاہدین نے ان کی چراگاہوں پر حملے کر کے مویشی ضبط کر لیے۔ (۸۰۷) اس طرح اس علاقہ کی شورش کو ابھرنے سے پہلے فرو کر دیا۔

طلیحہ اور سلمہ کون تھے اور کہاں تھے؟

طلیحہ (۸۰۸) اور سلمہ فرزندان خویلد، قبیلہ بنی اسد کے سردار تھے۔ قبیلہ بنی اسد بن خزیمہ ''فید'' کے پہاڑی علاقہ میں ''کوہ قطن'' پر آباد تھا۔ ایک چشمہ بھی ان کے قبضہ میں تھا جو خوش حالی کی علامت اور ضمانت سمجھا جایا کرتا تھا۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا تعارف:

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اس سریہ کے قائد اور علمبردار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ والدہ محترمہ حضرت برہ بنت عبدالمطلب تھیں۔ ثوبیہ کا دودھ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے بھی پیا تھا۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ (۸۰۹) یہ سریہ محرم (۸۱۰) ۴ھ میں مدینہ طیبہ سے روانہ ہوا تھا۔

سریہ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ:

عرفہ کے قریب ایک مقام ''عرنہ'' ہے اس کے نشیبی حصہ کو ''بطن عرنہ'' کہا جاتا ہے۔

عرنہ کے کچھ آدمی مدینہ حاضر ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔ ان کو مدینہ منورہ کی آب و ہوا موافق نہیں آئی۔ ان کے پیٹ بڑھ گئے اور استسقاء ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر اونٹوں کی چراگاہ میں ان کے قیام کا انتظام فرما دیا اور ایک نسخہ بتا دیا کہ اونٹ کا دودھ زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ یہ نسخہ ایسا موافق آیا

کہ چند دنوں میں مرض جاتا رہا۔ صحت بحال ہوگئی تندرست اور توانا ہو گئے۔ لیکن ان بدبختوں نے اس شفقت اور مراعات سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ جب ہٹے کٹے ہو گئے تو چراگاہ پر ڈاکا ڈالا۔ اُونٹ لوٹ لیے اور نگراں کو شہید کر دیا۔ اس کی اطلاع مدینہ منورہ میں پہنچی تو ان کا تعاقب کیا گیا۔ ان سب کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈکیتی اور قتل ناحق کی سزا ان کو دے دی گئی۔ اسی مقام (عرنہ) میں ایک شخص مقیم تھا سفیان بن خالد۔ اس کا تعلق قبیلہ بنی ہزل سے تھا۔ پھر اس نے اپنا الحاق قبیلہ ''بنی لحیان'' سے کرایا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو ہزلی ثم لحیانی کہا جاتا تھا ''سفیان بن خالد ہزلی ثم لحیانی'' اس کا پورا نام ہوتا تھا باوجودیکہ عرنہ کا رہنے والا نہیں تھا مگر اس نے یہاں اپنا اثر پورا جما رکھا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند رفقاء کو مکہ کے کچھ حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا اس نے بنولحیان کو ان کے پیچھے لگا کر ان سب کو شہید کرا(۸۱۱) دیا اور چونکہ مدینہ پر حملہ کرنے کی ہوا چل رہی تھی تو اس نے حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ ابھی تیاری مکمل نہیں ہوئی تھی کہ حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ تنہا حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کی جرأت نے ایک دستہ فوج کا کام کیا اور اس طرح یہ قبیلہ بھی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ گیا۔

روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس اقدام کی اجازت حاصل کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حلیہ بھی بتا دیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اس کی شکل ایسی مہیب اور ڈراؤنی ہے کہ جب تم دیکھو گے تو ڈر جاؤ گے اور تمہیں شیطان یاد آ جائے گا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس وقت تو میں نے عرض کر دیا تھا کہ حضرت میں کسی سے ڈرا نہیں کرتا۔ لیکن واقعی سفیان بن خالد کا ڈھنگ اور اس کی صورت کچھ ایسی تھی کہ جب میں نے اس کو دیکھا تو دل دہل گیا اور مجھ پر رعب چھانے لگا۔ مگر میں فوراً سنبھلا اور اس سے باتیں شروع کر دیں۔ میری مرعوبیت ختم ہوگئی۔ وہ اس وقت بطن عرنہ میں تھا۔ ایک مجمع اس کے ساتھ تھا جو اس کے خیمہ کے قریب تھا ساتھ رہا۔ پھر مجمع رخصت ہو گیا۔ مگر میں نے کہہ دیا تھا کہ میں قبیلہ خزاعہ کا ہوں۔ پھر اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔ اس کو یہ بھی توقع دلائی کہ اس مہم میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ وہ میری باتوں سے ایسا مانوس ہوا کہ مجھے رخصت نہیں کیا یہاں تک کہ رات ہوگئی اور وہ تنہا خیمہ میں رہ گیا۔ میں نے موقع پا کر اس کو قتل کر دیا۔ جب اس کے ساتھیوں کو پتہ چلا تو وہ میری تلاش میں دوڑے۔ میں ایک غار میں چھپ گیا تھا۔ وہ اس غار کے قریب بھی آئے مگر وہاں مکڑی نے جالا تن دیا تھا۔ اس غار کا ان کو خیال بھی نہیں ہوا۔ جب رات ہوئی تو میں غار سے نکلا۔ پھر رات کو چلتا تھا دن کو چھپ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میں مدینہ پہنچ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر(۸۱۲) ہوا پورا قصہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحسین فرمائی اور دعا دی(۸۱۳) حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ ۵ محرم الحرام ۴ھ کو اس مہم کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے تھے ۲۳ محرم الحرام ۴ھ کو واپس پہنچے۔ اٹھارہ روز مدینہ سے غیر حاضر رہے۔(۸۱۴)

خون ناحق کی لرزہ خیز مثالیں

خدا پرستوں کی جماعتوں کو دھوکے سے قتل کرنے کی وارداتیں

بیر معونہ اور رجیع کے حادثات

① علاقہ نجد میں بنو سلیم آباد تھے۔ رعل، ذکوان، عصیہ، بنی لحیان اور بنو عامر کے قبائل کے نام تھے۔ ان کے رئیس کا نام عامر تھا۔ (ابن طفیل، بن مالک، بن جعفر بن کلاب)

عامر بن طفیل کے مزاج میں خشونت تھی۔ دماغ میں نخوت اور طرہ یہ کہ رئیس سے بڑھ کر بادشاہ بننے کا بھی شوق تھا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو تین صورتیں پیش کیں۔

① حکومت کا اس طرح بٹوارہ ہو کہ شہری علاقوں پر میری اور اہل بادیہ پر آپ کی حکومت ہو۔

② یا آپ مجھے اپنا قائم مقام (ولی عہد) نامزد کر دیں۔

③ ان میں سے کوئی بات تسلیم نہیں ہے تو قبیلہ غطفان کے ہزاروں بہادر شہ سواروں کو لے کر آپ پر حملہ کروں گا۔[۸۱۶]

اسی[۸۱۷] سال کی عمر تھی تب یہ دم خم تھا۔

ظاہر ہے ان میں سے کوئی بات بھی قابل تسلیم نہیں تھی۔ چنانچہ یہ کور باطن محروم واپس ہوا۔ کچھ دنوں بعد اس کا چچا عامر بن مالک جس کی کنیت (ابو براء تھی اور ملاعب[۸۱۸] الاسنہ کے خطاب سے مشہور تھا) بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔[۸۱۹] اور خود اپنی طرف[۸۲۰] سے بھی اور رعل وذکوان وغیرہ قبائل کی طرف سے بھی اپنے حریفوں کے مقابلہ پر امداد کی درخواست کی۔ یہ قبائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیے ہوئے تھے۔ آپ نے درخواست منظور فرمائی اور حضرات انصار میں سے ستر مجاہد منتخب فرمائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ابو براء عامر کو اسلام کی دعوت بھی دی تو اس کا خوش نما جواب یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے منتخب اصحاب کو بھیجیں گے تو وہ فریضہ دعوت بھی انجام دیں گے اور اُمید ہے کہ ان کی دعوت کامیاب ہوگی۔ اس بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتخاب کے وقت اس کا بھی خیال فرمایا اور ایسے ہی صحابہ کو منتخب فرمایا جو علم وفضل میں امتیازی شان رکھتے تھے اور ان کو قراء کہا جاتا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان صحابہ کی شان یہ بیان[۸۲۱] کی ہے:

كَانُوْا يَحْتَطِبُوْنَ بِالنَّهَارِ وَيُصَلُّوْنَ بِاللَّيْلِ[۸۲۲]

كَانُوْا قَوْمًا يَسْتَعْذِبُوْنَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (طبقات ص ۳۸ ج ۳)

دن کو لکڑیاں چن کر معاش فراہم کیا کرتے اور رات کو نوافل میں مشغول رہتے تھے۔ بارگاہِ رسالت کے

لیے (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پینے کا پانی بھی مشکیزوں میں بھر کر یہی حضرات لایا کرتے تھے۔ چند حضرات کے نام نامی یہ تھے:

منذر بن عمرو، حارث بن صمہ، حرام بن ملحان، عروۃ بن اسماء بن الصلت، نافع بن بدیل، عامر بن فہیرہ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

حضرت منذر بن عمرو اس جماعت کے قائد اور امیر بنائے گئے۔

باوجودیکہ اہل قبائل امداد کی درخواست لے کر آئے تھے اور درخواست ہی کی بنا پر ان صحابہ کو بھیجا جا رہا تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ ابن ہشام اور ابن سعد کی روایتوں میں ہے کہ آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) ابو براء عامر سے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''مجھے اہل نجد'' کی طرف سے خطرہ ہے۔ لیکن ابو براء نے بڑے وثوق سے سینہ ٹھونک کر کہا تھا میں ذمہ دار ہوں کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔ لیکن ضمیر پر تنویر کا خدشہ بے معنی نہیں تھا۔ جب یہ قافلہ ''بیر معونہ'' پہنچا تو یہ خدشہ تاریخ کا سانحہ عظیم بن کر سامنے آ گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائل کے سردار عامر بن طفیل کے نام خط لکھا تھا۔ طے یہ ہوا کہ تین صاحبان جا کر عامر بن طفیل کو یہ مکتوب گرامی پیش کر دیں۔

حضرت حرام بن ملحان، حضرت کعب بن زید اور حضرت منذر بن محمد بن عقبہ رضی اللہ عنہم (خزرجی) حضرت کعب بن زید رضی اللہ عنہ کے پاؤں میں لنگ تھا۔ اس وجہ سے بعض روایتوں میں اعرج [۸۲۳] ہی کہا گیا ہے، نام نہیں لیا گیا۔

یہ تینوں حضرات روانہ ہوئے۔ قبیلہ کی آبادی کے پاس پہنچے۔ حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ ان تین میں امیر تھے۔ انہوں نے فریضہ قیادت و سیادت اس طرح انجام دیا کہ اپنے دونوں ساتھیوں کو کہا کہ آپ یہیں ٹھیریں۔ عامر بن طفیل کے پاس میں تنہا جاتا ہوں۔ اگر خدشہ کی بات پیش آئی تو صرف ایک پر گزرے گی۔ آپ دونوں صاحبان جا کر دوسرے ساتھیوں کو مطلع کر دینا۔

اس عزم کے ساتھ حضرت حرام روانہ ہوئے۔ یعنی مار ڈالنے اور قتل کر دینے کا عزم نہیں بلکہ قربان ہونے اور فدا ہونے کی تمنا لے کر چلے۔ عامر کے پاس پہنچے اس کو مکتوب گرامی دیا۔ عامر نے خط پڑھنے کے بجائے ساتھ والوں کو اشارہ کر دیا۔ چنانچہ ایک بدبخت نے اس نامہ بردپیامبر (حضرت حرام) کے پیچھے سے نیزہ مارا۔ نیزہ پار ہو گیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا۔ حضرت حرام زخمی ہو کر گرے مگر معلوم ہے اس وقت بے ساختہ اس تڑپتے ہوئے بسمل کی زبان سے کیا الفاظ نکلے تھے۔ تاریخ نے وہ الفاظ قلمبند کر رکھے ہیں۔ الفاظ یہ تھے **فزت ورب الکعبہ** رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس حادثہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

قَالَ بِالدَّمِ هٰكَذَا فَنَضَحَهٗ عَلٰى وَجْهِهٖ وَرَأْسِهٖ ثُمَّ قَالَ فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ (بخاری شریف ص ۵۸۶)

''جب خون کا فوارہ چھوٹنے لگا تو ایسا کیا کہ اپنے چہرے اور سر پر خون کا چھپکا مارا۔ پھر کہا میں کامیاب ہو گیا قسم رب کعبہ کی۔''

اس عجیب وغریب قربانی پر بھی سنگ دل عامر بن طفیل کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا بلکہ گھوڑا دوڑا کر قبائل میں پہنچا۔ صرف ایک قبیلہ (بنو عامر) نے تو اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ باقی قبائل رعل، ذکوان، عصیہ کے لڑاکو اس کے ساتھ دوڑ پڑے۔ بیر معونہ پہنچ کر قراء کرام کو سب طرف سے گھیر لیا۔ ان پر حملہ اچانک ہوا تھا اور حملہ آور بہت زیادہ تھے لہٰذا مقابلہ کا نتیجہ صرف یہی ہوا کہ ہر ایک قاری نے جامِ شہادت نوش کیا رضی اللہ عنہم۔ ان ستر میں سے صرف ایک صاحب ''حضرت کعب بن زید رضی اللہ عنہ'' (اعرج) جن کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا، زندہ رہ گئے، جو کسی طرح مدینہ پہنچے۔ پھر اگلے سال غزوہ خندق میں شہید ہوئے۔ [۸۲۴]

دو صاحب حضرت عمرو بن اُمیہ ضمری اور منذر بن محمد انصاری رضی اللہ عنہما اس طرف اپنے اُونٹ لے گئے تھے۔ انہوں نے دور سے دیکھا کہ گدھ اُڑ رہے ہیں۔ گوشت کے لوتھڑے ان کے پنجوں میں ہیں جن سے خون ٹپک رہا ہے۔ انہیں خیال ہوا کہ کوئی معرکہ ہوا ہے اور لاشیں پڑی ہوئی ہیں جن پر یہ گدھ منڈلا رہے ہیں اور ان کا گوشت نوچ رہے ہیں۔ وہ اس میدان کی طرف بڑھے جہاں شہیدوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور قاتل اپنی کامیابی پر سرمست تھے۔ جب ان کو حقیقت حال کا علم ہوا تو حضرت منذر بن محمد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہمیں فوراً مدینہ پہنچ کر اس کی اطلاع کرنی چاہیے لیکن حضرت عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ نے اس کی تائید نہیں کی۔ آپ نے فرمایا ''میں اس میدان سے نہیں ٹل سکتا جہاں منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ شہید ہوا ہو۔ میں مقابلہ کروں گا اور اپنی جان کھپاؤں گا۔ آپ مدینہ جا کر خبر کر سکتے ہیں۔''

لیکن ان کے رفیق منذر بن محمد انصاری رضی اللہ عنہ کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ اپنے رفیق سفر کا ساتھ چھوڑ دیں چنانچہ ان دونوں نے حملہ کر دیا۔ نتیجہ ظاہر تھا؟ حضرت منذر بن محمد انصاری رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن اُمیہ ضمیری کو گرفتار کر لیا گیا اور عامر بن طفیل کے سامنے پیش کیا گیا کہ وہ جس طرح چاہے قتل کرے۔

مگر عمرو بن اُمیہ ضمیری سے ایک تاریخ [۸۲۵] بننے والی تھی۔ ان کی زندگی کے دن باقی تھے۔ عامر بن طفیل نے صرف اس بنا پر کہ حضرت عمرو بن اُمیہ کا تعلق ''بنو ضمیرہ'' سے تھا جو قبیلہ ''مضر'' [۸۲۶] کی شاخ تھا (جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا) ان کے قتل کا حکم نہیں دیا۔ پھر یہ کہہ کر کہ اس کی ماں نے غلام آزاد کرنے کی منت مان رکھی ہے اپنی ماں کی طرف سے ان کو آزاد کر دیا۔ البتہ پیشانی کے بال کاٹ دیے۔ [۸۲۷]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع اور قنوت نازلہ:

حضرت عمرو بن اُمیہ ضمیری اور حضرت منذر بن محمد انصاری کو گوشت خور پرندوں کی پرواز سے مظلوم قراء کی

شہادت کا اشارہ ملا تھا لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو طائر قدسی (فرشتہ) نے فوراً ہی اس سانحہ کی اطلاع دے دی جو اسلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ دردناک حادثہ تھا، ساتھ ساتھ ان شہداء حق کا پیغام بھی پہنچا دیا کہ

بَلِّغُوا عَنَّا قَوْمَنَا اَنْ قَدْ لَقِينَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَاَرْضَانَا

''ہماری قوم کو یہ خبر پہنچا دو کہ ہم اپنے رب سے ملے وہ ہم سے خوش ہو گیا اور اس نے ہمیں خوش کر دیا۔''

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان شہداء کا یہ پیغام قرآن پاک کی آیت کی طرح ایک عرصہ تک پڑھا گیا۔ (۸۲۸)

یہ ان بزرگوں کے تقدس اور معصومیت ومظلومیت کی برکت تھی کہ موت ان کے لیے فرحت بخش حیات جاوداں بن گئی۔ لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حادثہ کا اتنا صدمہ ہوا کہ بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ ایسا صدمہ اور کبھی نہیں ہوا تھا۔ (۸۲۹)

یہ ہوسکتا تھا کہ آپ اپنی پوری طاقت سے ان غداروں اور سرکشوں پر حملہ کر دیتے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقام کا معاملہ حضرت حق جل مجدہ کے حوالہ کیا۔ جس کی شکل یہ تھی کہ آپ ایک ماہ تک نماز صبح میں رکوع اور سجدہ کے درمیان (قومہ میں) یہ دعا پڑھتے رہے:

اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ۔ (۸۳۰)

''اے اللہ! کفار مضر کو سختی سے پامال کر دے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے قحط کی طرح ان کو قحط میں مبتلا کر دے۔''

حضرت عامر بن فہیرہ:

یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وہی آزاد کردہ غلام ہیں جو ہجرت کے وقت راز دار تھے۔ جب تک غار ثور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قیام رہا دونوں وقت دودھ کی اُونٹنی لے جا کر ان بزرگوں کو تازہ دودھ پلاتے تھے۔ راز داری کے ساتھ جاتے اور آتے اور دن بھر جبل ثور کے دامن میں بکریاں چراتے ہوئے پاسبانی کرتے رہتے۔ جب غار ثور سے روانگی ہوئی تو مدینہ طیبہ تک موکب ہمایوں کی نگرانی کرتے رہے کہ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔

ان ستر قراء میں (جو بیر معونہ کے حادثہ میں شہید ہوئے) یہ بھی شامل تھے۔ حضرت عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے گرفتار کر لیا گیا تو (رئیس المشرکین) عامر بن طفیل نے ایک لاش کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کس کی لاش ہے۔ میں نے جواب دیا حضرت عامر بن فہیرہ رفیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ عامر بن طفیل نے کہا عجیب ماجرا میں نے دیکھا یہ لاش اُٹھائی گئی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ آسمان

کے قریب تک اس کو لے جایا گیا پھر یہاں لاکر رکھ دیا گیا۔

حضرت جبار بن سلمٰی کلابی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت عامر میرے نیزے سے شہید ہوئے۔ جب ان کے زخم لگا تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ فزت واللہ (خدا کی قسم کامیاب ہوگیا) مجھے حیرت ہوئی۔ ''فزت'' کہنے کا یہ موقع ہے اور کامیاب کس بات میں ہوئے؟ میں حضرت ضحاک بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ میں نے دریافت کیا۔ ''فـــزت'' کا کیا مطلب۔ کس چیز میں کامیاب ہوگئے۔ فرمایا حصولِ جنت میں۔ حضرت جبار کہتے ہیں کہ میرے مسلمان ہونے کا محرک یہی فقرہ تھا۔ (۸۳۱)

عامر بن طفیل (رئیس المشرکین) کا حشر:

آل سلول کی کوئی عورت تھی جو ''اُم فلاں'' کہلاتی تھی یہ اس کے یہاں ٹھیرا ہوا تھا کہ طاعون میں مبتلا ہو گیا۔ طاعون کی گلٹی اتنی بڑی تھی جیسے اُونٹ کی گلٹی ہوتی ہے اس نے سمجھا یہ اس عورت کی نحوست ہے۔ پس اپنا گھوڑا منگایا اور سوار ہو کر چلا۔ مگر کہیں پہنچنے نہ پایا تھا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر ہی اس کی جان نکل گئی۔ (۸۳۲)

تاریخ:

بیر معونہ کا یہ حادثہ عظیم غزوہ اُحد سے چار ماہ اور ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھتیس ماہ بعد پیش آیا۔ صفر ۴ھ میں۔ (۸۳۳) یہی زمانہ تھا کہ عرب کے دو مشہور قبیلوں عضل اور قارہ کے چند آدمی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوئے کہ ہمارے قبیلوں میں اسلام سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ آپ کچھ آدمی بھیج دیں جو لوگوں کو مسلمان بنائیں اور اسلام کے طریقے ان کو سکھائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس صحابہ (۸۳۴) کو ان کے ساتھ کر دیا۔ ان میں سے سات کے نام یہ تھے۔

مرثد بن ابی مرثد غنوی، خالد بن بکیر لیثی، عاصم بن ثابت، خبیب بن عدی، زید بن دثنہ، عبداللہ بن طارق، معتب بن عبید رضی اللہ عنہم۔

عاصم بن ثابت رضی اللہ کو ان کا امیر مقرر کیا (۸۳۵) اور ان کو یہ بھی ہدایت کر دی کہ حالات معلوم کرتے رہیں۔ (۸۳۶)

جب یہ حضرات مقام ہدہ (۸۳۷) پر پہنچے جو عسفان اور مکہ کے وسط میں ہے تو ان غداروں نے بدعہدی کی اور جیسا کہ پہلے سریہ عبداللہ بن انیس کے بیان میں گزر چکا ہے سفیان بن خالد نے قبیلہ بنولحیان کو اشارہ کر دیا کہ ان کا کام تمام کر دیں۔ بنولحیان کے دو سو آدمی جن میں ایک سو تیر انداز تھے فوراً ان کے تعاقب میں چل دیے۔ حضرات صحابہ نے اس مجموعہ کو دیکھا تو بڑھ کر ایک ٹیلہ پر چڑھ گئے۔ حملہ آوروں نے ٹیلہ کو گھیر لیا۔ مگر مقابلہ مشکل تھا اس لیے انہوں نے قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلایا کہ ہم آپ لوگوں کو قتل نہیں کریں گے۔ البتہ آپ لوگوں کے ذریعہ اہل مکہ سے کچھ باتیں منوائیں گے اور کچھ مطالبات حاصل کریں گے۔ (۸۳۸)

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ ان کی قسموں سے مطمئن نہیں ہوئے اور فرمایا ''میں گوارا نہیں کرتا کہ کافر کی پناہ لوں'' حضرت عاصم نے خدا سے دعا کی کہ ان کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دے اور مقابلہ کرتے ہوئے یہ بھی شہید ہوئے۔ ان کے ساتھ چھ افراد اور بھی شہید ہو گئے صرف تین باقی رہ گئے حملہ آوروں نے ان تینوں کو پھر اطمینان دلایا کہ وہ نیچے آ جائیں ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ جب زیادہ اصرار کیا تو حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما اُتر آئے۔ ان غداروں نے فوراً اپنی کمانوں کے تانت اُتارے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس دیے۔ حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ جو ابھی اُوپر تھے انہوں نے فرمایا یہ پہلی بدعہدی اور غداری ہے میں اس طرح اپنے آپ کو حوالہ نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر مقابلہ پر ڈٹ گئے مگر دوسو کے مقابلہ پر تنہا کیا کر سکتے تھے۔ حملہ آوروں نے انہیں کھینچ کر شہید کر ڈالا۔ (۸۳۹)

اب حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما ان کی قید میں باقی رہ گئے۔ ان دونوں کو مکہ میں لائے۔

قبیلہ ہذیل کے دو آدمیوں کو اہل مکہ نے گرفتار کر رکھا تھا۔ لحیانی حملہ آوروں نے ان دونوں کو رہا کرا لیا اور حضرت خبیب اور حضرت زید کو فدیہ میں دے دیا۔

اب یہ دونوں بزرگ غلاموں کی طرح فروخت کیے گئے اور خریدار وہ بنے جن کے عزیز غزوہ بدر میں مارے گئے تھے اور غزوہ اُحد کے بعد بھی ان کے دماغ جوش انتقام سے کھول رہے تھے۔ اُمیہ بن صلت (مقتول بدر) کے بیٹے صفوان بن اُمیہ نے (جو مکہ کا رئیس اور ابوسفیان کا دست و بازو تھا) حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو خریدا اور اپنے باپ کے قصاص میں بڑی شان سے قتل کرایا۔

کفار اشہر حرم (۸۴۰) کا احترام کرتے تھے اور حرم مکہ کا بھی، اشہر حرم تو گزر چکے تھے مگر حرم مکہ کا احترام باقی تھا۔ اس لیے حرم مکہ سے باہر ''تنعیم'' میں ان کے قتل کا انتظام کیا گیا۔ قتل کا تماشہ دیکھنے کے لیے مکہ کے دوسرے رؤسا کے ساتھ ابوسفیان بھی آ گیا۔ جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کہا۔ تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں۔ سچ کہنا:

> کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اس وقت تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہوں ہم ان کی گردن اُڑائیں اور تم اپنے باپ بچوں میں آرام کرو۔

ایک عاشق صادق کے سامنے ایک عجیب سوال آیا۔ غیرت عشق تڑپ اُٹھی۔ فوراً جواب دیا:

> محمد (فداہ روحی) اس وقت اس موقع پر میری جگہ ہوں اور میں اپنے گھر میں ہوں اس کو تو میں کیا چاہتا اور پسند کرتا۔ میں تو اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوں اور وہاں ان کے پاء مبارک میں کانٹا چبھ جائے اور میں اپنے گھر اپنے بال بچوں میں بیٹھا رہوں۔

ابوسفیان نے یہ جواب سنا تو حیران رہ گیا اور کہنے لگا ایسے دوست دیکھنے میں نہیں آئے جو اس طرح محبت

کرتے ہوں جیسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق ہیں۔ (۸۴۱)

صفوان کا غلام "نسطاس" قتل کے لیے مامور تھا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا جواب ختم ہوا تو "نسطاس" نے جسد عاشق کو بار سر سے ہلکا کر دیا۔ (۸۴۲)

دوسرے بزرگ حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں شریک تھے۔ وہاں ان کے ہاتھ سے حارث بن عامر مارا گیا تھا۔ حارث کے لڑکوں نے آپ کو خریدا۔ ان کو شہید کرنے کے لیے بھی حرم شریف سے باہر تنعیم میں ایسا ہی جشن کیا گیا۔ البتہ اضافہ یہ کیا گیا کہ تلوار سے گردن اڑا دینے کے بجائے ان کو سولی پر چڑھا کر شہید کیا گیا۔ (۸۴۳) ایک کھمبے میں اوپر کی طرف ایک آڑی لکڑی جوڑی جاتی تھی۔ ملزم کی کمر کو کھمبہ سے اور دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر آڑی لکڑی سے باندھ دیا جاتا تھا۔ پھر کمر اور ہاتھوں میں کیلیں ٹھونک دی جاتی تھیں۔ جن کی تکلیف سے ملزم سسک سسک کر مر جاتا تھا۔ یہ سولی ہوتی تھی۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے اپنے خریدار قاتلوں سے کہہ رکھا تھا کہ میں صرف تین باتیں چاہتا ہوں۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی، میرے کھانے میں ایسے جانور کا گوشت نہ ہو جس کو کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، جب قتل کرنا ہو تو پہلے مجھے خبر کر دو۔ (۸۴۴)

ان قاتلوں نے یہ عہد پورا کیا۔ پہلے خبر کر دی حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے بال صاف کیے غسل کیا اور جب قتل گاہ میں لے گئے تو آپ نے فرمایا مجھے مہلت دیجیے کہ میں دو رکعت پڑھ لوں۔ آپ نے دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر فرمایا آپ لوگوں کا اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ میں "موت سے گھبرا رہا ہوں اور نماز ایک بہانہ ہے" تو میں اور بھی پڑھتا۔ یہ شہید حق کی سنت ہے جو قربان گاہ میں شہادت سے پہلے ادا کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے یہ سنت جاری کی (۸۴۵)۔ نماز کے بعد حضرت خبیب نے دعا کی:

اَللّٰهُمَّ اَحْصِهِمْ عَدَدًا وَاقْتُلْهُمْ بَدَدًا وَلَا تُبْقِ مِنْهُمْ اَحَدًا

"اے اللہ! ان لوگوں کو گن گن کر ختم کر ان کو الگ الگ کر کے قتل کر۔ ان میں سے ایک کو بھی باقی نہ رہنے دے۔"

پھر یہ شعر پڑھے:

فَلَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا
عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ فِی اللّٰهِ مصرعی
وذلك فی ذات الالہ وان یشاء
یبارك فی اوصال شلو ممزع

"جب میں اسلام پر قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ پچھڑ کر (قتل کے بعد) کس رُخ پر گرتا ہوں اور کس طرح مارا جاتا ہوں۔ یہ (جان سپاری) اللہ کی ذات کے

بارے میں ہے وہ اگر چاہے گا تو بدن کے ان جوڑوں میں برکت تج دے گا، جو پارہ پارہ
ہو چکے ہوں گے۔''

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اپنے ان جذبات میں گم تھے کہ حارث مقتول کا لڑکا عقبہ جس کی کنیت ابوسروعہ تھی آگے بڑھا اور ان کو سول پر چڑھا دیا۔ جب آپ کو سولی پر باندھا جا رہا تھا تو آپ نے فرمایا خداوند! ہم نے تیرے رسول کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ تو اپنے رسول کو اس کی خبر کر دے جو ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ (۸۴۷)

یہ دعا قبول ہوئی۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو مکہ میں سولی پر چڑھایا گیا اور اسی وقت مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کی تفصیل بیان فرمادی۔ (۸۴۸)

عقبہ بن حارث آلہ کار:

یہ قاتل (عقبہ) جو اپنے باپ کے قصاص میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کر رہا تھا نابالغ تھا۔ وہ خود بیان کیا کرتا تھا کہ میں اتنا چھوٹا تھا کہ میں قتل کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھ سے قتل کرایا گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ ''بنو عبدالدار'' کے ایک شخص ''ابومیسرہ'' نے خنجر میرے ہاتھ میں تھمایا اور خود چلا کر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو لب دم کیا (۸۴۹) ایک روایت یہ بھی ہے کہ مکہ کے جو لوگ بدر میں مارے گئے تھے ان کے بچوں کو جن کی تعداد چالیس ہوگئی تھی اکٹھا کیا اور ہر ایک کے ہاتھ میں نیزہ دے دیا کہ خبیب رضی اللہ عنہ کے ماریں۔ اس نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا چنانچہ ان سب نے باری باری حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے جسد مبارک کو نیزوں سے چھلنی کر دیا۔ (۸۵۰)

بلندی اخلاق اور ظہور کرامت:

حارث مقتول کی لڑکی جو بعد میں اسلام سے مشرف ہوئیں بیان کیا کرتی تھیں کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ہمارے یہاں قید رہے۔ خدا کی قسم حضرت خبیب رضی اللہ عنہ جیسا باخیر قیدی دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ لوہے کی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے۔ مکہ میں انگور ڈھونڈے کو نہیں ملتے تھے۔ مگر میں نے ایک روز دیکھا کہ انگور کا پورا خوشہ ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ تناول فرما رہے ہیں۔ یہ کسی انسان نے لا کر نہیں دیے تھے۔ یہ اللہ کا دیا ہوا رزق تھا جسے وہ تناول فرما رہے تھے۔

بچوں پر رحم:

یہی محترمہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے ایک روز استرا مانگا۔ ان کو استرا دے دیا گیا۔ میرا بچہ وہاں کھیل رہا تھا۔ مجھے خیال بھی نہیں رہا بچہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ استرا حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہے اور بچہ زانو پر بیٹھا ہوا ہے میں یہ دیکھ کر سہم گئی۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے

میری گھبراہٹ پہچان لی۔فرمایا تمہیں یہ خوف ہے کہ میں بچہ کو ذبح کر دوں گا؟ (۸۵۱)

ما کنت لا فعل ذلك ''مجھ سے ممکن ہی نہیں کہ میں ایسا کرسکوں۔''

ضمیر مجرم کی خوف زدگی:

مشہور یہ تھا کہ جس کو بددعا دی جائے اگر وہ فوراً زمین پر لیٹ جائے تو بددعا اثر نہیں کرتی۔سیّدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو جب سولی دی گئی تو میں بچہ تھا اور اپنے والد (ابوسفیان) کے ساتھ میں بھی وہاں پہنچا ہوا تھا۔جب حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی زبان سے بددعا کے الفاظ نکلے تو ابوسفیان کی حالت یہ تھی کہ وہ گھبرا کر جلدی جلدی مجھے زمین پر لٹا رہے تھے کہ کہیں ''دعاء بد نہ لگ جائے۔''(۸۵۲)

ایک صاحب سعید بن عامر بن خدیم جمحی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کے ایک علاقہ (ڈویژن) کا عامل مقرر فرمادیا تھا۔ان کو یہ شکایت تھی کہ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔لوگ اس کو مرگی سمجھتے تھے۔مگر جب حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے خود حضرت سعید سے دریافت کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ مرگی نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو جب سولی دی جارہی تھی تو میں بھی وہاں موجود تھا۔اس وقت ان کی دعا کے کلمات کچھ ایسے پردرد تھے کہ جب بھی مجھے ان کا خیال آتا ہے میں اپنے قابو میں نہیں رہتا بے ہوش ہو جاتا ہوں۔(۸۵۳)

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی نعش کا قدرتی احترام:

قریش کی ایک رئیس زادی سلافہ بن سعد کا لڑکا غزوہ بدر میں حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ اگر کبھی ''عاصم'' (رضی اللہ عنہ) پر قابو چل جائے تو ان کی کھوپڑی میں شراب پیوں گی۔

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو قبیلہ ہذیل کے لوگوں نے چاہا کہ ان کا سر لے جا کر رقم وصول کر لیں۔چنانچہ وہ اس ارادہ سے اس مقام پر پہنچے جہاں حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی لاش پڑی ہوئی تھی مگر قدرت کو منظور نہیں تھا کہ بہادر شہید وفا کی لاش کی یہ بے حرمتی ہو۔چنانچہ شہد کی بڑی مکھیوں کا ایک دل وہاں نمودار ہوا اور اس نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی لاش کو گھیر لیا۔یہ لوگ جو سر کاٹنے آئے تھے مجبور ہو گئے اور طے کیا کہ رات کو جب مکھیاں چلی جائیں گی تب آ کر یہ لاش لے جائیں گے۔مگر قدرت کی یہ ناز پروری ملاحظہ فرمائیے کہ رات کو سیلاب آیا اور ان کی لاش بہا کر لے گیا (رضی اللہ عنہم اجمعین) بنو ہذیل کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔(۸۵۴)

شمع رحمت کو بجھانے کی کوشش

اسلام اور مسلمانون کے استیصال کی تین صورتیں جو خاص طور پر غزوہ احد کے بعد عمل میں لائی گئیں ان میں سے دو کا تذکرہ صفحات بالا میں گذر چکا ہے۔ اس افسوسناک مقصد کے لیے قبائل کی ہم آہنگی اور یکجہتی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہ تمام واقعات ایک ہی زمانہ میں چند ہفتوں کے اندر اندر ہوئے۔ زائرین بیت اللہ حج سے فارغ ہو کر اواخر ذی الحجہ یا ابتداء محرم الحرام میں اپنے اپنے قبیلوں میں پہنچا کرتے تھے۔ محرم کی انہیں ابتدائی تاریخوں سے ان واقعات کا آغاز ہوا اور یکسانیت کی انتہا یہ ہے کہ ان واقعات کی خبریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہی شب میں پہنچیں (۸۵۵)

تخریبی منصوبہ کا تیسرا جز خود ذات اقدس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گزند پہنچانا تھا۔ ابوسفیان نے اس کا بھی انتظام کیا۔ واقدی کی روایت ہے کہ مکہ معظمہ میں ابوسفیان نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بے تکلف بازاروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان کو شہید کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کون ہے جو ہمت کر کے جائے اور محمد (روحی فداہ) کو قتل کر کے ہمارے مقتولین کا بدلہ لے لے اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جانشینوں کی طرف سے مطالبہ ہوا تو دیت یا خون بہا ہم ادا کر دیں گے۔

ایک اعرابی نے ابوسفیان کی اس تحریک پر لبیک کہا۔ وہ ابوسفیان کے مکان پر تنہائی میں پہونچا اور عہد و معاہدہ کر کے اس کام کے لیے روانہ ہو گیا۔ ابوسفیان نے سانڈنی اور سامان سفر کا انتظام کیا۔ اس نے پانچ روز میں مسافت طے کی اور چھٹے دن کی صبح کو مدینہ منورہ میں در آمد ہو گیا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبدالاشہل تشریف لے گئے ہیں تو سانڈنی دوڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رفقاء کرام کے مختصر سے مجمع میں تشریف فرما تھے۔ اس شخص کو آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

''برے ارادے سے آ رہا ہے مگر کچھ نہیں کر سکے گا۔'' (انشاء اللہ)

چنانچہ ارشادگرامی صحیح ثابت ہوا۔ چہرہ مبارک پر نظر پڑی تو ساری ہمت جاتی رہی۔ رعب چھا گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اس مشتبہ شخص کو گرفتار کر لیا تو رہائی کے لیے اسی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دوہائی دینے لگا جسے قتل کرنے آیا تھا۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رہا کرا دیا۔ اگلے روز یہ اعرابی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ پوری روئیداد سنا دی پھر کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں (۸۵۶) داخل ہو گیا اور اس کا مستحق ہو گیا کہ جب اس کا ذکر کیا جائے تو رضی اللہ عنہ کہا جائے۔

حضرت عمرو بن اُمیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے اقدامات

حضرت خبیب اور حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما کی رہائی کی کوشش

حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو آپ پہچان گئے ہوں گے۔ یہ وہی بزرگ ہیں کہ جب بیر معونہ کے قریب پہنچ کر ان کو شہادت قراء کے دردناک حادثہ کا علم ہوا تھا تو انہوں نے اپنے رفیق سفر منذر بن محمد انصاری (رضی اللہ عنہما) سے کہا تھا کہ میں اس جگہ سے نہیں ٹل سکتا جہاں منذر بن عمرو جیسا بہادر بلاوجہ شہید کر دیا گیا ہو۔ پھر جب ان دونوں نے حملہ کیا تو ان کے رفیق شہید ہو گئے تھے اور یہ گرفتار کر لیے گئے تھے پھر عامر بن طفیل نے ان کو اپنی ماں کی طرف سے بطور فدیہ رہا کر دیا تھا اور پیشانی کے بال کاٹ لیے تھے۔

ان کے متعلق پرانی بات تو یہ تھی کان فاتکافی الجاھلیة (۸۵۷) اسلام سے پہلے یہ پیشہ ور قاتل تھے مگر اسلام کے بعد ان کی خصوصیت یہ تھی۔

كَانَ مِنْ رِجَالِ الْعَرَبِ نَجْدَةً وَجُرْأَةً (۸۵۸)

''بہادری اور دلیری میں عرب کے ممتاز افراد میں ان کا شمار ہوتا تھا۔''

پھر یہ سلیقہ مند بھی ایسے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سفارت میں (۸۵۹) بھیجا کرتے تھے۔ غزوہ بدر اور اُحد میں یہ شریک رہے تھے اس وقت مشرکین مکہ کی فوج کے جانبازوں میں تھے۔ اس کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو مظلوم مسلمانوں کی رہائی کے لیے جان کی بازی لگا دی۔

عامر بن طفیل کی غلامی سے رہائی کے بعد یہ خاموش نہیں بیٹھے۔ اب عام روایت تو یہ ہے کہ جب مقام قرقرہ پر پہنچے تو قبیلہ بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو افسوس ہوا کہ بنو عامر ہمارے حلیف ہیں برا ہوا ان کے آدمی مارے گئے۔ ان کا خون بہا دینا پڑے گا لیکن اس اثنا میں کوئی اور خدمت بھی انجام دی یا نہیں۔ اس کی وضاحت عام روایتوں میں نہیں ہے۔ البتہ واقدی (۸۶۰) نے ایک روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اور ان کے ساتھ حصرت سلمہ بن اسلم (رضی اللہ عنہما) کو مکہ بھیجا تھا کہ ابوسفیان کو قتل کر دیں۔ (۸۶۱)

ان دونوں بزرگوں کا اس موقع پر مکہ معظمہ جانا اور ابوسفیان کے درپے ہونا تو ثابت ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا۔ کیونکہ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ انہیں حضرت عمرو بن امیہ نے مکہ پہنچ کر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی لاش اٹھالانے کی کوشش کی اور آخر میں یہ ہے کہ جب مدینہ منورہ پہنچے تو شور مچ گیا کہ عمرو بن اُمیہ آ گئے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ بیر معونہ کے واقعہ کے بعد مدینہ منورہ میں حاضری اس وقت ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ان کا انتظار تھا۔ تشریف آوری نہیں ہوئی تھی اور بیر معونہ کے واقعہ کے بعد یہ بالا

بالا مکہ چلے گئے تھے۔ علاوہ ازیں محرم الحرام [۸۶۲] ۳ھ کے آخر میں بیر معونہ اور رجیع کے حادثات پیش آئے اور جیسے ہی محرم [۸۶۳] ختم ہوا حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کو شہید کر دیا تو اس چند روزہ مدت میں یہ ممکن نہیں ہے کہ عمرو بن امیہ نے بیر معونہ کے علاقہ سے مدینہ طیبہ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت لی ہو اور پھر ایسے وقت مکہ معظمہ پہنچ گئے ہوں کہ اسی روز یا اس سے دو ایک دن پہلے حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کو شہید کیا گیا ہو۔

پس متفرق روایتوں کو جوڑا جائے تو واقعات کی ترتیب یہ ہے کہ:

عامر بن طفیل کے یہاں سے نجات پانے کے بعد حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو جیسے ہی حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کی گرفتاری کا علم ہوا تو یہ از خود ایک رفیق [۸۶۳] کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ پہنچ گئے کہ ان گرفتاران بلا حضرت زید و حضرت خبیب رضی اللہ عنہما کو دشمنوں کے شکنجہ سے رہا کرائیں۔ لیکن جب مکہ معظمہ پہنچے اور معلوم ہوا کہ یہ دونوں شہید کر دیئے گئے تو انہوں نے ابوسفیان کے قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ اب خود حضرت عمرو بن اُمیہ کی زبانی اس سفر کی سرگذشت ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے طے کیا کہ پہلے ہم کعبہ مکرمہ کا طواف کریں گے پھر ابوسفیان کو قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ ہم نے پہلے طواف کیا۔ پھر ہم اپنے منصوبہ کے لیے نکلے۔

چاندنی رات تھی، گرمیوں کا موسم تھا، مکہ والے اس موسم میں اپنے مکانوں کے سامنے چھڑکاؤ کر کے بیٹھا کرتے تھے۔ ہم جیسے ہی طواف سے فارغ ہو کر باہر نکلے اتفاق سے ابوسفیان کے فرزند رشید معاویہ سامنے آ گئے انہوں نے ہمیں پہچان لیا اور لوگوں کو خبر کر دی۔

مکہ والے خصوصاً مجھے خوب جانتے تھے۔ میرے فن سے بھی واقف تھے وہ چونک گئے۔ ابوسفیان نے کہا۔ عمرو بن امیہ کسی شرارت کے لیے یہاں آیا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ میری تلاش میں دوڑ پڑے۔ ہمیں بھی اپنی فکر ہوئی۔ ہم پہاڑ کی طرف لپکے اور ایک غار میں جا کر چھپ گئے۔ رات بھر وہ تلاش کرتے رہے اور ہم غار میں چھپے رہے۔

اگلا دن ہوا۔ ہم غار ہی میں تھے کہ بنو تیم کا ایک شخص عثمان بن مالک بن عبداللہ تیمی اپنے اونٹ کا چارہ لینے کے لیے اس طرف آ گیا اور اس نے ہمیں دیکھ لیا ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ اب جا کر خبر کر دے گا اور ہم گرفتار کر لیے جائیں گے لہٰذا میں نے اس کے سینہ میں خنجر پیوست کر کے اس کو جاں بلب کر دیا اور غار میں جا کر چھپ گیا۔ مکہ کے جاسوس جو اس طرف گھوم رہے تھے انہوں اس کو تڑپتا ہوا دیکھا تو اس کے پاس پہنچے ماجرا دریافت کیا۔ اس کا آخری سانس تھا اس نے یہ تو بتا دیا کہ عمرو بن امیہ نے مجھ پر حملہ کیا تھا لیکن غار کا پتہ نہیں بتا سکا اور مر گیا تو اب مکہ والوں نے زیادہ شدت سے میری تلاش جاری کر دی اور گرفتار کرنے والے کے لیے انعام کا اعلان کر دیا لوگ ہمیں تلاش کر رہے تھے اور ہم اسی غار میں تھے یہاں تک کہ رات ہو گئی۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی پر چڑھایا جا چکا تھا اب ہماری کوشش یہ تھی کہ ان کی لاش سولی پر سے اتار کر لیجائیں۔ جب رات ہوگئی تو ہم دونوں غار سے نکلے، تنعیم پہنچے جہاں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی دی گئی تھی ساتھی نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ وہاں پہرا لگا ہوا ہے اس نے آکر مجھے خبر دی۔ میں نے ساتھی کو وہیں ٹھیرایا اور یہ ہدایت کر دی کہ اگر کچھ خطرہ محسوس کریں تو اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ پہنچ جائیں۔ اپنے متعلق میں نے کہہ دیا کہ میں جاتا ہوں اور لاش کو اٹھا کر لاتا ہوں۔ چنانچہ میں پہونچا اور سولی کے کھمبہ کو اٹھا کر چل دیا۔ مگر وہ بہت بھاری تھا۔ تقریباً بیس گز چلنے پایا تھا کہ لوگ جاگ گئے اور مجھے بھی احساس ہوا کہ کھمبہ خالی ہے لاش اتار لی گئی ہے۔ (۸۶۵) اب کھمبہ کو اٹھا کر لانا بیکار تھا۔ میں نے کھمبہ کو زمین پر پٹخ دیا۔ پہرہ دار میرے پیچھے دوڑے۔ مگر مجھے پکڑ نہیں سکے۔ میں پھر ایک غار میں چھپ گیا۔ میرا ساتھی تنہا رہ گیا تھا۔ وہ حسب قرارداد اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ پہنچ گیا۔ جب مجھے کچھ اطمینان ہو گیا تو میں نے بھی مدینہ کی راہ لی۔ میں راستہ میں تھا کہ دو آدمیوں نے مجھے گھیر لیا۔ یہ قریش کے جاسوس تھے۔ میں ان سے مرعوب نہیں ہوا۔ بلکہ میں نے خود ان پر اپنا رعب جمایا اور کہہ دیا کہ تم اپنے آپ کو گرفتار سمجھو اور میرے حوالے ہو جاؤ انہوں نے سرتابی کی تو میں نے ایک کو ختم کر دیا۔ تب دوسرا کان دبا کر میرے ساتھ ہولیا۔ میں اس کو لیے ہوئے مدینہ پہنچا۔ انصار کے بچے کھیل رہے تھے وہ مجھے پہچان نہیں سکے البتہ بڑے آدمیوں نے پہچان لیا اور خوش ہو کر لپٹنے لگے۔ جب بچوں نے اپنے بڑوں کی زبان سے میرا نام سنا تو وہ دوڑے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور میرے آنے کی بشارت سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور دعائیں دیں۔ (۸۶۶)

بنو عامر کے دو آدمیوں کا قتل:

پہلے گذر چکا ہے کہ عامر بن طفیل نے حضرات قراء پر حملہ کرنے کے لیے جب قبائل کا گشت کیا تو قبیلہ رعل ذکوان اور عصیہ کے لوگ تو ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے مگر قبیلہ بنو عامر کے سرداروں نے ساتھ نہیں دیا اور کہہ دیا کہ ہم عہد شکنی کے لیے تیار نہیں ہیں۔

یہ بھی گذر چکا ہے کہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ حضرات قراء کے ساتھ نہیں گئے تھے بلکہ ان کی شہادت کے بعد وہاں پہنچے تھے پھر مقابلہ کرتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے تھے۔ حضرت عمرو بن اُمیہ کو یہ خبر نہیں تھی کہ بنو عامر نے معاہدہ کا احترام کیا ہے اس کو پامال نہیں کیا۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ جب حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ رہائی پا کر روانہ ہوئے تو مقام قرقرہ پر قبیلہ بنو عامر کے دو آدمی مل گئے۔ حضرت عمرو بن امیہ ان کو بھی غدار اور عہد شکن ہی سمجھے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے موقع پا کر ان دونوں کو قتل کر دیا۔ پھر جب براہ راست یا جیسا کہ سابق روایت سے معلوم ہوتا ہے مکہ میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان کی لاش کو نکال لینے کی کوشش کے بعد مدینہ طیبہ پہنچے تو حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے جہاں قریش کے ایک قیدی کو پیش کیا، اپنی کار

گذاریوں میں اس کا بھی تذکرہ کیا کہ بنو عامر کے دو آدمیوں کو انہوں نے غدار سمجھ کر قتل کر دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے افسوس ہوا اور فرمایا ان سے تو ہمارا معاہدہ ہے ان مقتولوں کی دیت ادا کرنی پڑے گی۔ میں دیت ادا کروں گا۔ (۸٦٧)

بنو نضیر کی عہد شکنی اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی کوشش

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ فَكَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (سورہ مائدہ ع ۲)

گذر چکا ہے کہ حضرت عمرو بن اُمیہ ضمری رضی اللہ عنہ جب عامر بن طفیل کی بندش سے چھٹکارا پا کر مقام قرقرہ پر پہنچے تھے تو بنی عامر کے دو آدمیوں کو غدار سمجھ کر قتل کر دیا تھا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے افسوس کیا تھا کہ یہ قبیلہ وفادار رہا ہے اس کے مقتولین کی ہمیں دیت ادا کرنی ہوگی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدہ قبائل سے کر رکھا تھا اس کی رو سے دیت کی ادائیگی میں ہر ایک حلیف قبیلہ کو حصہ لینا ہوتا تھا۔ اس حلف اور عہد کے بموجب ان عامری مقتولین کی دیت میں بنو نضیر کو بھی مدد کرنی چاہیے تھی۔ اسی مدد کے مطالبہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کی آبادی میں تشریف لے جانے والے تھے۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بنو نضیر کا اعزاز واحترام تھا کہ مدد کی اپیل کے لیے خود بہ نفس نفیس تشریف لے جانے کا ارادہ فرمایا۔ مگر نہایت شرم کی بات ہے کہ بنو نضیر نے اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور اپنی ناپاک آرزو کو پورا کرنے کا منصوبہ (۸٦۸) تیار کر لیا۔

انہوں نے ایسی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کا انتظام کیا تھا کہ وہاں اوپر سے پتھر گرا کر نیچے بیٹھنے والے کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں رونق افروز ہوئے تو یہ منصوبہ مکمل تھا۔ ایک یہودی عمرو بن مجاش بن کعب بالا خانہ کے اوپر پہنچا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بروقت اس کا احساس ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء کو تو اشارہ فرما دیا کہ وہ وہاں ٹھہریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموشی سے وہاں سے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ پھر جب معلوم ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچ گئے ہیں تو باقی رفقاء بھی واپس تشریف لے آئے۔ (۸٦۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے کی اطلاع پہلے ان یہودیوں ہی کو ہوئی جو اس سازش کے سرغنہ تھے۔ ایک یہودی نے ان سے آ کر کہا۔ آپ کس انتظار میں ہیں؟ میں مدینہ سے آ رہا ہوں۔ میں مدینہ سے نکل

رہا تھا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں داخل ہو رہے تھے۔ (۸۷۰)

رفقاء میں حضرات شیخین سیدنا ابوبکر صدیق وعمر فاروق رضی اللہ عنہما حضرت عثمان حضرت علی حضرت طلحہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین کے اسماء گرامی شمار کرائے گئے۔ (۸۷۱) اور یہ بھی روایت ہے کہ یہودیوں کے منصوبہ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ الہام ربانی ہو گیا تھا۔ (۸۷۲)

یہ واقعہ ربیع الاول ۵ھ میں ہوا۔ ابن سعد نے سبت (شنبہ) کے دن کی بھی تصریح کر دی ہے۔ یہ منصوبہ اس درجہ مکمل تھا کہ وحی الٰہی نے اس کی ناکامی کو دست قدرت کا کارنامہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کو اللہ تعالیٰ کا مخصوص انعام قرار دیا۔ چنانچہ زیب (۸۷۳) عنوان آیت میں مسلمانوں کو ہدایت ہے:

مسلمانو! اپنے اوپر اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے پورا ارادہ کر لیا تھا کہ تم پر ہاتھ بڑھائے تو خدا نے (اپنے فضل وکرم سے) ایسا کیا کہ ان کے ہاتھوں کو روک دیا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جس پر مسلمانوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔ (۸۷۴)

حکم اخراج ——— مدینہ چھوڑ دو

قریش کا خط بنونضیر کے نام، کعب بن اشرف کی اشتعال انگیز اور عہد شکن حرکتیں، پھر بنونضیر کا قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ، جنگ کے لیے ان کی ہمت بندھانا۔ صفحات بالا میں ان کی تفصیل گذر چکی ہے۔ یہ تمام باتیں معاہدہ کے خلاف تھیں۔ لیکن کعب بن اشرف کے قتل کے بعد جب یہود بنونضیر نے دوبارہ معاہدہ کیا تو ان سب باتوں پر خاک ڈال دی گئی تھی اور یہ مذموم حرکتیں بھلا دی گئی تھیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نئے معاہدہ کے بعد بھی یہودیوں کی ذہنیت نہیں بدلی۔

وقتی دفاع کے طور پر وہ معاہدہ کیا گیا تھا۔ جیسے ہی اطمینان نصیب ہوا یہود کی زہریلی ذہنیت اور تیز ہو گئی۔ اور اب ذات اقدس رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کرنے کی سازش شروع کر دی۔ چنانچہ ایک پیغام بھیجا کہ یہود اور مسلمانوں کے تیس تیس آدمی جمع ہو کر مناظرہ کریں۔ علماء یہود اگر قائل ہو گئے تو ہم سب مسلمان ہو جائیں گے۔ پھر خود ہی خیال کیا کہ یہ تعداد زیادہ ہے۔ صرف تین تین آدمی ہونے چاہییں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی تجویز بھی منظور فرمائی پھر یہ ترمیم بھی منظور فرمالی اور گفتگو کرنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ایک انصاری نے خبر دی کہ ان کی بہن جو بنی نضیر میں رہتی ہے اس نے خاص طور پر یہ اطلاع دی ہے کہ مناظرہ یا گفتگو صرف بہانہ ہے اور طے یہ ہے کہ تین آدمی کپڑوں میں خنجر چھپا کر جائیں گے اور موقع پا کر جان دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دیں گے۔

یہ خبر باوثوق ذرائع سے پہنچی تھی لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ ملتوی فرما دیا اور مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ (۸۷۵)

یہود کا یہ منصوبہ نا کام رہا تو اب اس موقع پر جب دیت کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو پتھر گرا کر شہید کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ یہ دوسری مرتبہ نقض عہد تھا نقض عہد پر بار بار چشم پوشی معاہدہ کی توہین اور غداری کی حوصلہ افزائی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برداشت نہیں کیا۔ لہٰذا بنونضیر کے سرداروں کو طلب فرما کر ان کے جرائم شمار کرائے جن کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا کہ دس روز کے اندر بنونضیر مدینہ کی سرزمین سے نکل جائیں۔ دس روز کے بعد ان کو پناہ نہیں دی جائے گی۔ (۸۷۶)

زیرِ عنوان آیت کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک اور سازش کا ذکر بھی کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑے اہتمام سے کھانے کی دعوت دی گئی اور اتنے ہی اہتمام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کے انتظامات بھی مکمل کر لیے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سازش کا علم ہو گیا اور دعوت میں تشریف نہیں لے گئے۔ مگر اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخذہ بھی نہیں فرمایا۔ (۸۷۷)

تعمیل حکم سے گریز، لیت ولعل، انکار

هُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا تا شَدِیْدُ الْعِقَابِ (سورہ حشر ع ۱)

> وہی ہے جس نے کفار اہل کتاب کو ان کے گھروں سے پہلی بار اٹھا کر نکال دیا۔ تمہارا گمان بھی نہیں تھا کہ وہ نکلیں گے اور انہوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچا لیں گے سو ان پر خدا ایسی جگہ سے پہنچا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی اجاڑ رہے تھے۔ پس عبرت کرو اے عقل و دانش والو۔ اور اگر اللہ تعالیٰ ان کی قسمت میں جلاوطن ہونا نہ لکھ چکا ہوتا تو ان کو دنیا ہی میں سزا دیتا اور ان کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو شخص اللہ کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

بنونضیر کو اپنی طاقت پر زعم تھا اور بجا زعم تھا۔ کیونکہ جیسا کہ قریش نے لکھا تھا کہ ان کا ایک اسٹیٹ تھا۔ جس کی حفاظت کے لیے ان کے پاس مسلح جوان بھی تھے اور مضبوط قلعہ بھی تھا جس کے سامنے باغات کا حصار تھا۔ ان کے ہم مذہب اور ہم نوا بنوقریظہ تھے ان کا بھی اسی طرح اسٹیٹ تھا۔ پھر منافقین کی طاقت ان کی پشت پر تھی جس کو قبائل عرب کی تقویت حاصل تھی۔ لہذا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ احد کے شکست خوردہ اور زخم رسیدہ

مسلمان ان پر حاوی ہوسکیں گے۔ اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان جو بالمشافہہ صادر فرمایا تھا۔ پھر حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ باضابطہ بھیجا درخورِ اعتنا نہ تھا۔ چنانچہ تعمیل کے بجائے مخالفانہ بلکہ باغیانہ جذبات کے تنور بھڑکنے لگے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کہنے پر جس کو زیادہ سے زیادہ اوس اور خزرج کے ان قبائل کی حمایت حاصل ہے جو کل تک ہمارے مقروض اور باجگذار تھے ہم اپنے محلات چھوڑ دیں اور نکل جائیں نہ ہم خود نکل سکتے ہیں، نہ ہم کو نکالا جاسکتا ہے۔

بیشک کچھ افراد سنجیدہ اور دور اندیش بھی تھے۔ کنانہ بن صوریہ، ایک یہودی عالم تھا اس نے بہت سمجھایا:

> نادانو! ظاہری شوکت وحشمت پر نظر مت ڈالو۔ حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو تم پوری طرح جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔ وہ تمام علامتیں جو تمہاری مقدس کتاب میں آنے والے نبی کے متعلق بتائی گئی ہیں اس نبی میں پائی جاری ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مخالفت کر کے تم کامیاب نہیں ہوگے اور تمہیں لامحالہ نکلنا پڑے گا۔ دین اور دنیا کی بھلائی اسی میں ہے کہ تم عناد کو چھوڑو۔ صداقت کے سامنے گردن جھکادو۔ (۸۷۸)

کہا جاتا ہے کہ یہود کے سرداروں میں سے ''سلام بن مشکم'' نے بھی کنانہ ابن صوریا کی تائید کی (۸۷۹) اس نے ایک درمیانی شکل تجویز کی ہم یہاں سے چلے جائیں اور اپنی املاک (مکانات، باغات اور آراضی) کے متعلق کوئی معاہدہ کرلیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ جو معاہدہ ہوگا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو پوری طرح نبھائیں گے۔ اس طرح ہماری جائیدادیں محفوظ رہیں گی اور آمدنی ہمیں ملتی رہے گی۔

لیکن لیڈر حیی بن اخطب تھا۔ اس کا پارا نہیں اترا۔ عوام کو مشتعل کرنے کے لیے اس کے پاس ایک نعرہ تھا ہم تورات مقدس کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم موسیٰ نبی (علیہ السلام) کا دامن نہیں جھٹک سکتے۔ (۸۸۰)

ادھر عبداللہ بن ابی بن سلول ''رئیس المنافقین'' نے کہلا کر بھیجا کہ ہمت مت ہارو۔ مقابلہ کرو میں عرب کے دو ہزار جوان بھیجتا ہوں وہ تمہارے لیے اپنی جانیں قربان کریں گے۔ عرب کا مشہور طاقتور اور کثیر تعداد قبیلہ ''غطفان'' تمہارا حامی ہے۔ میں اس کو بھی آمادہ کرتا ہوں کہ اپنے جوان تمہاری مدد کے لیے بھیجے، ہم ہر حال میں تمہارے ساتھ رہیں گے۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں۔

> لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَکُمْ وَلَا نُطِیْعُ فِیْکُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّکُمْ
>
> ''واللہ اگر تم کو نکالا گیا ہم تمہارے ساتھ ہوں گے یقیناً ہم بھی نکل جائیں گے۔ ہم تمہارے معاملے میں کسی کا کہنا نہیں مانیں گے اور (اگر بالفرض) جنگ ہوئی تو یقین رکھو کہ ہم ضرور پوری پوری مدد تمہاری کریں گے۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ حیی بن اخطب نے کہلا بھیجا:

اِنَّا لَا نَخْرُجُ مِنْ دِیَارِنَا فَاصْنَعْ مَا بَدَالَکَ

''ہم اپنے مکانات سے نہیں نکلیں گے آپ جو چاہیں کریں۔''

حیی کا بھائی جدی بن اخطب یہ پیغام لے کر مدینہ پہنچا۔ جب اس نے یہ پیغام پہنچایا۔ تو ایک عجیب صورت سامنے آئی (یعنی) سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بے ساختہ اللہ اکبر نکلا۔ اب مسلمانوں نے بھی اللہ اکبر کہا (جس سے پورا مدینہ گونج گیا) ساتھ ساتھ فرمان رسالت مسلمانوں کے لیے صادر ہوا کہ نماز عصر بنونضیر کے میدان میں پڑھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم بردار بنایا اور مدینہ کا انتظام حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا۔ (۸۸۱)

حامیانِ بنونضیر کے متعلق کلامِ الٰہی کی پیشین گوئی اور اس کی تصدیق:

جب محاذ بنونضیر کے لیڈروں میں رازدارانہ مشورے اور باہمی معاہدے ہو رہے تھے منافقین اور ان کے ہم نوا بڑھ بڑھ کر کہہ رہے تھے کہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ بنونضیر نکل جائیں۔ ہم ہزاروں جوان ان کی حمایت کے لیے میدان میں اتار دیں گے۔ اور اگر بفرض محال نکلنا ہی پڑا تو ہم سب ساتھ ہوں گے۔ قیامت تک یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی کے کہنے پر آ کر بنونضیر کا ساتھ چھوڑ دیں۔ جب اس طرح کا طوفان برپا تھا اور غیض وغضب کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اسی وقت کا نقشہ کتاب اللہ نے ان آیات میں کھینچا ہے اور اہل ایمان کو اطمینان دلایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا تا جَزَاءُ الظّٰلِمِيْنَ

''کیا آپ نے ان کی حالت پر نظر نہیں ڈالی جنہوں نے نفاق کی راہ اختیار کی (عبداللہ بن ابی وغیرہ) اپنے ان اہل کتاب بھائیوں سے جو کفر کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں (یعنی بنونضیر سے) کہہ رہے ہیں واللہ (۸۸۲) (ہم ہر حال میں تمہارے ساتھ ہیں) اگر تم نکالے گئے تو ہم تمہارے ساتھ نکل جائیں گے اور ہم تمہارے معاملہ میں کبھی کسی کا کہنا نہیں مانیں گے اور اگر تم سے کسی کی لڑائی ہو تو ہم یقیناً تمہاری پوری پوری مدد کریں گے۔ اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ واللہ! اگر اہل کتاب (بنونضیر وغیرہ) نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر (بفرض محال) ان کی مدد بھی کی تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ پھر ان کی کوئی مدد نہیں ہو گی۔ بیشک تم لوگوں کا خوف ان کے دلوں میں اللہ سے بھی زیادہ ہے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ بصیرت (اور نظر کی گہرائی) نہیں رکھتے اور (تنہا بنونضیر تو کیا اگر سب متحد ہو جائیں تو) یہ سب مل کر بھی تم سے نہیں لڑیں گے مگر حفاظت والی بستیوں میں یا دیوار (قلعہ یا شہر پناہ) کی آڑ میں۔ ان کی لڑائی آپس میں بہت سخت ہے۔ آپ ان کو متفق سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دل منتشر (غیر متفق اور پھٹے ہوئے) ہیں۔ یہ اس وجہ سے

کہ وہ ایسے لوگ ہیں (جو اغراض پرستی میں مبتلا ہیں) دانش اور عقل نہیں رکھتے۔ان کی مثال انہیں جیسی ہے جو ان سے کچھ ہی پہلے ہوئے ہیں جو (دنیا میں بھی) اپنے کردار کا مزہ چکھ چکے ہیں اور آخرت میں بھی ان کے لیے دردناک عذاب ہونے والا ہے۔(یہ بنو قینقاع) کے یہودی ہیں جن کے اخراج وغیرہ کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے) شیطان جیسی مثال ہے کہ انسان سے کہتا ہے کافر ہو جا۔ پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں پس آخر انجام دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے جہاں ہمیشہ رہیں گے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔'' (سورہ حشر ع۲)

تفصیل واقعہ:

گذر چکا ہے کہ جدی بن اخطب نے جب حیی بن اخطب (رئیس و امیر بنونضیر) کا پیغام بارگاہ رسالت میں پہنچایا کہ جو کچھ کرنا ہو کر لو ہم نہیں نکلیں گے تو سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر بے ساختہ اللہ اکبر جاری ہوا۔ جس پر مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی اور فوراً ہی تیاری شروع ہو گئی۔ جدی بن اخطب یہ منظر دیکھ کر اپنے پشت پناہ عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) کے پاس پہنچا وہ اپنے مکان میں تھا چند مصاحب وہاں موجود تھے مگر اس کو تعجب ہوا کہ۔ عبداللہ بن ابی کا جوش ڈھیلا تھا۔ اس نے صرف یہ کہا کہ میں حلیف قبائل (غطفان وغیرہ) کے پاس آدمی بھیج رہا ہوں اور خود کوئی تیاری نہیں کی۔ جدی بن اخطب یاس اور حوصلہ شکنی کا تحفہ لے کر اپنے بھائی حیی بن اخطب کے پاس پہنچا اور کہہ دیا کہ میں خیر نہیں بلکہ شر لے کر واپس ہوا ہوں۔ ابھی یہ اپنے گشت اور دورہ کی روائیداد پوری نہیں سنا چکا تھا کہ مجاہدین اسلام بنی نضیر کے میدان میں پہنچ گئے۔ یہ عصر کا وقت تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے تیاری کی اور اسی میدان میں نماز کے لیے صف بستہ ہو گئے۔

بنونضیر میں ہمت ہوتی تو ان کے لیے موقع تھا کہ میدان میں مقابلہ کرتے۔ مگر ان کی پہلی شکست یہ تھی کہ سامنے آنے کے بجائے قلعہ بند ہو گئے۔ ان کے دعوے کیا ہوئے۔ جذبات کیوں سرد ہو گئے اور ہمتیں کیوں پست ہو گئیں۔ ظاہری سبب کوئی نہیں۔ کلام الٰہی نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے:

فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (سورہ حشر ع۱)

''پہنچ گیا ان پر اللہ ایسی جگہ سے کہ ان کو خیال بھی نہیں تھا اور ڈال دیا ان کے دلوں میں رعب۔''

اب مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ بڑے لوگوں کی یہ ہمت بھی نہیں ہوئی کہ قلعہ کے کمیں گاہوں سے مسلمانوں پر حملہ کریں۔ کچھ لڑکوں نے قلعہ کی دیواروں سے کچھ تیر برسائے کچھ پتھر پھینکے مگر بہت جلد ان کو خاموش کر دیا گیا۔

قبائل عرب جن کو بلانے کے لیے عبداللہ بن ابی نے آدمی بھیجے تھے۔ وہ بھی اپنی جگہ سمٹ کر بیٹھ گئے۔ کسی نے کوئی جنبش نہیں کی۔

ابن حیی بن اخطب کو سلام بن مشکم کی تجویز یاد آئی کہ کچھ شرطیں طے کر لی جائیں۔ مگر اس کا وقت گذر چکا تھا۔ اب ان کے متعلق فیصلہ یہ تھا کہ جو کچھ وہ لے جاسکتے ہیں لے جائیں۔ باقی ان کی جدئیدادیں ضبط کی جائیں گی سب سے ان کو دست بردار ہونا پڑے گا۔ حیی بن اخطب نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کیا۔ لیکن سلام بن مشکم نے کہا کہ: اس سے بدتر فیصلہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا موقع نہ دو اور یہی فیصلہ منظور کر لو۔

حیی بن اخطب: اس سے بدتر فیصلہ کیا ہوسکتا ہے۔

سلام بن مشکم: یہ کہ جوانوں کو قتل کیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا جائے۔

بہرحال چند روز اسی لیت و لعل میں گذرے۔ اس عرصہ میں محاصرہ بدستور رہا۔ بالآخر یہی فیصلہ تسلیم کرنا پڑا کہ جو کچھ لے جاسکتے ہیں وہ لے جائیں اور یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ (۸۸۴)

تخریب:

اصول جنگ کے بموجب محاصرہ میں دن بدن شدت ہونی چاہیے تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان درختوں کے کاٹ ڈالنے کا حکم دیدیا (۸۸۵) جو قلعہ کے لیے حصار کا کام دے سکتے تھے۔ اس پر طنز کیا گیا کہ دعویٰ ہے اصلاح اور تعمیر کا۔ (۸۸۶) اور عمل یہ ہے کہ پھل دار درخت کاٹے جاتے ہیں۔ کلام اللہ نے اس طنز کا جواب دیتے ہوئے اس تخریب کی ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ ارشاد ہوا:

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِيْنَ

(سورہ حشر ع۱)

جنگ کا مقصد ہی ہوتا ہے کہ حریف کو نقصان پہنچایا جائے اور اس کی گردن نیچی کی جائے۔ لہٰذا اس مقصد سے اگر درخت کاٹے گئے ہیں یا کچھ درخت کسی مصلحت سے باقی رکھے گئے ہیں تو اس کو ارشاد ربانی کی تعمیل کہنا چاہیے۔

بیشک اصل مقصود تعمیر و ترقی اور اصلاح ہے۔ مگر تعمیر کے لیے بھی بسا اوقات تخریب کی ضرورت ہوتی ہے۔ بوسیدہ دیواریں گرا کر ہی نئے محل کی بنیادیں بھری جاتی ہیں۔

احساس شکست:

تخریب کی دوسری صورت وہ تھی جو یہود نے پالیسی کے طور پر اختیار کی کہ نکلنے سے پہلے اپنی جائیدادوں کو خود تباہ کیا۔ چنانچہ ایک طرف فیصلہ کے متعلق بات چیت چل رہی تھی اور دوسری جانب اپنے مکانات اور اپنی جائیدادیں خود برباد کر رہے تھے کہ مسلمانوں کا قبضہ اس حالت میں ہو کہ پوری آبادی کھنڈر بن چکی ہو۔ (۸۸۸)

ارشاد ربانی ہے:

يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَلْبَابِ

''برباد کر رہے ہیں اپنے مکانات اپنے ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے پس عبرت لو اے ارباب دانش۔''

(بیرون قلعہ مسلمان برباد کر رہے تھے اور اندرون قلعہ خود یہود [889] اور حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ ان کے مکان نہایت آراستہ تھے تو اندر سے ان کی آرائش خود ختم کر رہے تھے کہ مسلمان ایسے پر تکلف آراستہ مکانوں میں نہ رہ سکیں اور باہر سے مسلمان توڑ پھوڑ کر رہے تھے اور بیہقی نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہودیوں کے عالیشان محلات قلعوں جیسے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بنو نضیر کی آبادی میں تشریف لے گئے تو یہ اپنے مکانات میں محفوظ ہو گئے۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم فرمایا کہ وہ گلیوں کوچوں میں گھس جائیں۔ تو اب آبادی سے باہر باغات جلائے جا رہے تھے درخت کاٹے جا رہے تھے اور آبادی کے اندر مسلمان باہر سے مکانات منہدم کر رہے تھے اور اندر سے خود یہودی توڑ پھوڑ کر کے آرائش ختم کر رہے تھے، چوکھٹ کڑیاں اور تختے نکال رہے تھے۔ یہ عبرت انگیز صورت تھی جس سے سبق لینے کی ہدایت اہل دانش کو کی گئی ہے۔ [890]

نکلنے کی شان:

طے یہ کیا گیا تھا کہ حلقہ [891] یعنی اسلحہ کے علاوہ جو سامان چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ تمام سامان یہاں تک کہ گھروں کے چوکھٹ، بازو، کڑیاں، تختے، کیلیں اور کھونٹیاں تک لاد کر [892] لے گئے اور اس شان سے روانہ ہوئے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا۔ اُونٹوں پر سوار تھے۔ عورتیں اعلیٰ قسم کے کپڑوں میں ملبوس تمام زیوروں سے آراستہ تھیں۔ ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا۔ مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گانا گاتی تھیں۔ عروہ بن ورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ [893] اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سروسامان کا قافلہ کبھی ان کی نظر سے نہیں گذرا تھا۔

سرداران بنو نضیر:

حیی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق اور کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق روساء بنی نضیر خیبر چلے گئے۔ اپنا سونا بھی جو چمڑوں کے تھیلوں میں بھرا ہوا تھا اپنے ساتھ لے گئے۔ سلام بن ابی الحقیق یہ اعلان کرتا جاتا تھا کہ یہاں کے باغات سے بہتر خیبر کے باغات ہیں۔ وہاں ہمارا راج ہوگا۔ چنانچہ پہنچے تو وہاں کے یہودیوں نے ان کو اپنا رئیس تسلیم کر لیا۔ [894] باقی یہودی اذرعات وغیرہ مقامات پر چلے گئے۔

حق پرست افراد:

یہودی عالم کنانہ بن صوریا کی تقریر پہلے گذر چکی ہے۔اس نے کہا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔ان کی دعوت قبول کرلو۔سلام بن مشکم نے بھی اس کی تائید کی تھی۔لیکن حسرت ناک بدقسمتی یہ ہے کہ اس اعتراف کے باوجود ان کو مسلمان ہونے کی توفیق نہیں ہوئی۔صرف دو شخص تھے جنہوں نے حق کو پہچان کر اس کو تسلیم بھی کیا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔یامین بن عمیر (۸۹۵) اور ابوسعد بن وہب (۸۹۶) (رضی اللہ عنہما)۔

عمرو بن حجاش مقتول:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس شرف میں پوری امت سے ممتاز ہیں کہ محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق ومحبت میں درجہ فنا جو اولیاء اللہ کو مدتوں کی ریاضتوں کے بعد بھی میسر نہیں آتا،ایک صحابی کو ایمان کی پہلی منزل ہی میں یہ درجہ میسر آجایا کرتا تھا۔چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ومرغوب سے محبت اور جو رحمتہ دوجہان صلی اللہ علیہ وسلم سے بیگانہ ہوتا تھا اس سے نفرت پہلے ہی مرحلہ میں پیدا ہو جاتی تھی۔قبیلہ بنونضیر کے یہی بزرگ حضرت یامین بن عمیر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو عمرو بن حجاش سے اتنی نفرت ہو گئی کہ اس کی زندگی کے درپے ہو گئے حتیٰ کہ ایک شخص کو کچھ رقم دے کر اسے قتل کرادیا۔عمرو بن حجاش وہی تھا جو اوپر چڑھا ہوا تھا کہ جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنونضیر میں تشریف فرما ہوں اوپر سے پتھر گرادیا جائے۔ (۸۹۷)

انصار کے یہودی لڑکوں کا مسئلہ:

اسلام سے پہلے انصار یعنی اوس اور خزرج کے مشرک چونکہ عموماً یہودیوں سے عقیدت رکھتے تھے تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ جن عورتوں کے بچے نہیں جیتے تھے وہ منت مان لیا کرتی تھیں کہ بچہ اگر زندہ رہا تو وہ اس کو یہودی بنا دے گی۔یہ منت مانے ہوئے بچے اب ہوشیار ہو گئے (۸۹۸) تھے۔جب بنونضیر کو نکالا گیا تو ان کے والدین نے چاہا کہ ان کو جبراً روک لیں۔یہودیوں کے ساتھ نہ جانے دیں۔مگر کتاب اللہ نے اس کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا۔چنانچہ ارشاد ربانی نازل ہوا: (۸۹۹)

لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (سورہ بقرہ ع ۳۴)

رسد:

انقلابات عالم کی تاریخ ایسے والنٹیروں کی مثال نہیں پیش کر سکے گی جن کا توشہ سراسر توکل رہا ہو۔جن کے عزائم اس درجہ انقلاب انگیز ہوں کہ بڑے بڑے فرعونوں اور قارونوں کے دلوں کو لرزا دیں اور سرمایہ کی یہ شان ہو کہ زنبیل سفر میں مٹھی بھر جو بھی پڑے ہوئے نہ ہوں۔بنونضیر کی طرف کوچ کے حکم کی تعمیل اس عجلت سے کی گئی کہ

زوال کے بعد سے ابھی عصر کا وقت بھی نہیں ہوا تھا کہ مجاہدین کی فوج وہاں پہنچ گئی۔ مگر ہاتھ سب کے خالی نہ کسی کے پاس ناشتہ یا توشہ نہ کسی کو توشہ کی فکر۔ مگر ؏

''خدا خود میر سامان ست ارباب توکل را''

قبیلہ خزرج کے رئیس حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عنایت فرمائی کہ جب تک یہ محاصرہ رہا کھجوروں کا رسد وہ پیش کرتے رہے۔ (۹۰۰)

مدت محاصرہ:

عام روایت یہ ہے کہ پندرہ روز تک محاصرہ رہا۔

ادیبانہ سخن سنجی:

بنو نضیر کے اس واقعہ کے بعد حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے ایک قصیدہ موزوں کیا۔ جس کے چند اشعار (۹۰۱) یہ ہیں۔

تقاعد معشر نصروا قريشا

وليس لهم ببلدتهم نصير

هم اوتوا الكتاب فضيعو

فهم عمى عن التوراة بور

كفرتم بالقرآن لقد لقيتم

بتصديق الذى قال النذير۔

وہ جماعت جس نے قریش کی مدد کی عاجز ہو کر بیٹھ گئی حالت یہ ہے کہ خود ان کے شہر میں ان کا کوئی مددگار نہیں یہ وہ ہیں جن کو کتاب (تورات) دی گئی تھی مگر انہوں نے اس کو ضائع کر دیا۔ اس پر عمل نہیں کیا۔

پس وہ تورات سے اندھے ہو کر تباہ ہو گئے۔ (اے اہل کتاب) تم نے قرآن پاک کا انکار کیا تو خود تمہارے سامنے حضرت بشیر ونذیر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کی تصدیق آ گئی تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ سچ تھا۔

پھر چونکہ قریش نے خطوط لکھ کر بنو نضیر کو اس سرکشی اور بغاوت پر آمادہ کیا تھا لہٰذا قریش کے متعلق حضرت حسان نے فرمایا:

وهان على سراة بنى لوى

حريق بالبويرة مستيطر

بنولوی (قریش) کو معمولی معلوم ہو رہی ہے وہ آگ جو بویرہ میں لگی ہوئی پھیل رہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچازاد بھائی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب بھی شاعر تھے۔ اس وقت تک اسلام سے مشرف نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کے جواب میں کہا:

ادام اللّٰہ ذلك من صنیع

وحرق فی فواحیھا سعیر

ستعلم اینا منھا بنزہ

وتعلم ای ارضینا تضیر

اللہ تعالیٰ اس عمل کو باقی رکھے اور یہ آگ جلتے جلتے بویرہ کے اطراف (مدینہ منورہ) تک پہنچ جائے۔

عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس آگ سے ہم دور ہیں یا تم اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے یا تمہاری سرزمین کو۔

بویرہ مسجد قباء سے غرب کی جانب مدینہ منورہ اور تیماء کے درمیان ایک مقام تھا حضرت حسان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں جو آگ لگائی گئی ہے کیا قریش اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے کیا ان کے نزدیک یہ معمولی بات ہے۔ ابوسفیان بن حارث اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہماری دعا ہے کہ یہ آگ بڑھے اور بڑھتے بڑھتے بویرہ کے اطراف یعنی مدینہ طیبہ تک پہنچ جائے تب معلوم ہوگا کہ کس کو نقصان پہنچا اور کس کے گھر میں آگ لگی۔

واضح رہے کہ یہ ابوسفیان بعد میں مسلمان ہو گئے اور ایسے جاں نثار کو غزوہ حنین میں جب ابتداء میں مسلمانوں کے کچھ پاؤں اکھڑ گئے تھے تو یہ نہ صرف ثابت قدم رہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آپ کے گھوڑے کی باگ ہاتھ میں سنبھالے رہے۔ رضی اللہ عنہ۔

اموال بنی نضیر:

منقولہ اموال لیجانے کی اجازت تھی۔ صرف اسلحہ مستثنیٰ کیے گئے تھے چنانچہ اسلحہ پر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا تین سو چالیس تلواریں تھی۔ پچاس زرہ اور پچاس خود۔ [۹۰۱] منقولہ کے علاوہ غیر منقولہ جائدادیں یعنی باغات اور کھیت وہ ضبط کیے گئے اور کتاب اللہ نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص فرما دیا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ (الایہ، ع ا سورہ حشر)

''مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان سے (اس طرح) دلوایا (کہ

تمہیں اس کے حاصل کرنے میں کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑی) تم نے اس پر (اس کے حاصل کرنے پر) نہ گھوڑے دوڑائے نہ اُونٹ۔(یعنی نہ سفر کی مشقت ہوئی کیونکہ یہ قبیلہ مدینہ سے صرف دو میل تھا اور نہ باقاعدہ مقابلہ کی نوبت آئی) لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو جس پر چاہے مسلط فرما دیتا ہے (چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان جائدادوں پر مسلط کر دیا پس اس میں تمہارا حق نہیں ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی ہیں آپ کو ان میں تصرف کا پورا اختیار ہے)''

بہر حال نص قرآن نے ان جائیدادوں کو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک قرار دے دیا۔ مگر معلوم ہے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مالکانہ اختیارات کو کس طرح جامہ عمل پہنایا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر حصہ حضرات مہاجرین کو عنایت فرما دیا۔

بعض انصاری حضرات جو بہت تنگدست اور مفلوک الحال تھے ان کو عنایت فرمایا، اہل وعیال کا سال بھر کا خرچہ مقرر فرما دیا۔ جو فاضل بچتا وہ سامان جہاد کی تیاری میں صرف فرماتے تھے۔

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان جائدادوں کی تولیت حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی فرمائش پر ان کے حوالے فرما دی۔ مگر ان دونوں میں کچھ اختلاف ہو گیا اور اتنا بڑھا کہ دوبارہ معاملہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اس وقت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

میں آپ سب کو اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس کے حکم سے آسمان اور زمین قائم ہیں اور دریافت کرتا ہوں کیا آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ لا نورث ماترکنا صدقة [۹۰۳] سب نے اقرار کیا کہ بے شک آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خاص طور پر حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا؟ ان دونوں نے بھی تصدیق کی کہ بیشک آنخضرت صلی اللہ عنہ وسلم نے یہ فرمایا تھا۔

پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

وَمَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ تا قوله تعالٰى قَدِيْرٌ۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کی جائدادیں اپنے رسول کے لیے مخصوص فرما دی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو ان جائدادوں میں سے کچھ

نہیں دیا تھا۔ بلاشبہ جائدادیں خالص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھیں (مگر) واللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جائدادوں کو الگ چھانٹ کر نہیں رکھا نہ اپنی ذات کے لیے ان کو مخصوص کیا بلکہ تمہیں عطا کیا تمہارے درمیان تقسیم کیا۔ یہاں تک کہ (تقسیم کے بعد یہ ٹکڑے) جو اس وقت موجود ہیں باقی رہ گئے ان کی پیداوار کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ اہل وعیال کا خرچہ ایک سال کا نکال لیا کرتے تھے پھر جو بچتا تھا اس کو مصارف میں صرف کرتے تھے جہاں اللہ کے مال صرف ہوتے ہیں (یعنی اسلحہ وغیرہ سامان جہاد اور مصالح عامہ میں صرف فرما دیا کرتے تھے)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو مخاطب کر کے فرمایا:

میں آپ دونوں کو اللہ کی قسم دے کر دریافت کرتا ہوں کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر ایسا ہی نہیں کرتے رہے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے فرمایا بے شک ایسا ہی کیا کرتے تھے۔" (۹۰۴)

الحاصل یہ جائدادیں من جانب اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئیں تو آپ نے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو	بیر حجر
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو	بیر جرم
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو	سوالہ
حضرت صہیب بن سنان کو	خراطہ

زبیر بن عوام اور ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہما کو بویلہ اور اسی طرح دوسرے مہاجرین کو جائدادیں بخشیں اور بقول ابن سعد ووسع فی الناس منہا (لوگوں میں وسعت پیدا کر دی، سب ہی کو کچھ عطا فرمایا جس سے ان کے یہاں کچھ گنجائش پیدا ہوگئی فاقہ اور افلاس کی سابق تنگی باقی نہیں رہی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی کچھ عطا فرمانا چاہا۔ ان پیکران اخلاص نے معذرت کر دی اور سفارش کی کہ جو کچھ ان کو مل سکتا ہو وہ مہاجرین کو عنایت فرما دیں۔ تاہم دو انصاری صاحبان کو جو زیادہ مفلس اور مفلوک الحال تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جائیدادیں عطا فرما دی (یہ حضرات سہل بن حنیف انصاری اور حضرت ابودجانہ انصاری تھے رضی اللہ عنہما) (۹۰۵)

پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقروض کی نماز پڑھنے سے انکار فرما دیا کرتے تھے اور اب یہ اعلان فرما دیا کہ

من ترک مالا فلا هله ومن ترک دينا اوضياعا فالي وعلي (۹۰۷)

حضرات انصار کے اس ایثار کو جس قدر سراہا جائے کم ہے کہ اب تک ان بزرگوں نے مہاجرین حضرات کی ہر طرح امداد کی تھی یہاں تک کہ ان کو اپنی جائدادوں میں شریک کر لیا تھا اور اب جائداد ملنے کا وقت آیا تو قطعاً

گوارا نہیں کیا کہ اس ایثار اور خدمت کا کوئی معاوضہ لیں بلکہ اصرار کیا کہ جو جائدادیں قبضہ میں آئی ہیں وہ حضرات مہاجرین ہی کو دی جائیں۔ یہی ایثار ہے جس کی تحسین رب العرش نے اپنے کلام پاک میں فرمائی۔ یوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ۔ وہ اپنے آپ سے دوسروں کو (مہاجرین کو) مقدم رکھتے ہیں باوجودیکہ ان کو سخت ضرورت ہوتی ہے۔

ایک فاضل محدث مدظلہ العالی کی اصلاح:

بنونضیر کی جائدادوں کے متعلق ایک بحث عہد زریں کے حصہ دوم میں بھی گذری ہے (ص ۳۵ تا ص ۴۲) وہاں بھی یہی آیتیں پیش کی گئی ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے افادات نقل کیے گئے ہیں ص ۱۳۵ ۱۳۱ پر چند سطور احقر کی طرف سے بھی مستزاد ہیں۔ ان کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیخ الحدیث (مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ) نے تحریر فرمایا ہے:

قولکم۔ ان تمام آمدنیوں کو الخ۔ آمدنیوں کے بجائے مال و جائیداد ہونا چاہیے یہی صحیح تعبیر ہے اور آپ نے ص ۱۳۳ میں یہی تعبیر اختیار فرمائی ہے اور آگے ہلالین کے درمیان آپ نے جو اضافہ فرمایا ہے وہ ناچیز کی سمجھ سے واجب الحذف ہے کیونکہ اس سے مطلقاً اراضی کی پیداوار کا بحکم فے ہونا مفہوم ہوتا ہے یا اس کا وہم پیدا ہوتا ہے حالانکہ شرعاً ایسا ہرگز نہیں ہے۔ سورہ حشر کی ان آیات میں اس مال و متاع اور جائیداد کا حکم مذکور ہے جو بنونضیر (کفار) سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تھیں اس سے یہ تو مستفاد ہوتا ہے کہ آئندہ بھی جو جائدادیں کفار سے بغیر لڑائی کے مسلمانوں کے ہاتھ میں آئیں گی ان کا یہی حکم ہے۔ لیکن یہ مستفاد نہیں ہوتا کہ ہر زمین کی پیداوار فے ہے اور اس کا یہی حکم ہے جو اموال بنی النضیر کا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ ایسا سمجھ رہے ہیں بلکہ منشاء یہ ہے کہ آپ کی عبارت موہم ہے اس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ (انتہٰی مکتوب حضرت شیخ الحدیث اعظمی)

شکریہ:

احقر نے عہد زریں کے حصہ اول اور حصہ دوم حضرت شیخ الحدیث موصوف کی خدمت میں پیش کرکے ترمیم و اصلاح اور تبصرہ کی درخواست کی تھی۔ بار بار کے اصرار پر شیخ الحدیث ممدوح کا تبصرہ موصول ہوا جو ایک کتابچہ میں شائع کیا جا چکا ہے۔ تبصرہ کے ساتھ تین صفحہ کے مضمون میں چند اصلاحات ہیں جن میں سے اہم اصلاح وہ ہے جو اوپر تحریر کی گئی۔

راقم الحروف حضرت شیخ الحدیث مدظلہ العالی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس اصلاح کو قبول کرتا ہے فی الواقع ہلالین کے درمیان کی یہ عبارت (بالفاظ دیگر آراضی کی پیداوار کیونکہ وہ بھی لشکر کشی کے بغیر حاصل ہوتی ہے) حذف سمجھی جائے۔ یہ عبارت اس موقع پر بلاشبہ موہم ہے۔ اس عبارت سے خلط مبحث ہوگیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دو مبحث علیحدہ علیحدہ ہیں ایک بنو نضیر کی جائیداد اور اس کے متعلق ارشادات ربانی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل (جس کی وضاحت سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا خطاب میں گزر چکی ہے) اس کے پیش نظر یہ بات واضح ہے کہ ارشاد ربانی (فما اوجفتم علیہ الایۃ) میں فے سے مراد بنی نضیر کی جائیدادیں ہی ہیں صرف آمدنی مراد نہیں ہے۔ دوسری بحث خود لفظ فے کے متعلق ہے کہ فے صرف جائیداد کو کہا جاتا ہے یا جائداد کی آمدنی یا پیداوار بھی لفظ فے کے عموم میں داخل ہو جاتی ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں تحریر فرمایا ہے۔ جو مال اہل حرب سے بلا قتال حاصل ہو وہ فے ہے (کذافی الہدایہ) اموال بنی نضیر بھی اسی قبیل سے تھے (بیان القرآن ص ۱۱۴ ج ۱۱ تفسیر سورہ حشر) مگر علامہ ابن رشد کا بیان ہے:

واما الفی عند الجمهور فهو کل ما صار للمسلمین من الکفار من قبل الرعب والخوف من غیر ان یوجف علیه بخیل او رجل (صفحہ ۳۴۳ جلد ۱، بدایۃ المجتهد ونهایۃ المقتصد)

اس عموم کے تحت جزیہ بھی فے ہو گا۔ حضرت الامام الحافظ ابی عبید القاسم بن سلام رحمہ اللہ نے مزید وضاحت فرمائی ہے۔ آپ نے لفظ فے کو جو وسعت دی اس کے تحت پیداوار بھی ''فے'' میں داخل ہے۔ آپ کا ارشاد ہے۔

واما مال الفی فما اجتبی علیه من اموال اهل الذمة مما صو لحوا علیه من جزیة رؤوسهم التی بها حقنت دماء هم وحرمت اموالهم ومنه خراج الارضین التی اقسمت عنوه ثم اقرها الامام فی ایدی اهل الذمة علی وسق (مکیال معلوم) یودونه ومنه وظیفه الارض الصلح التی منعها اهلها حتی صولحوا منها علی خراج مسمی ومنه ما یاخذة العاشر من اموال اهل الذمة التی یمرون بها علیه لتجارتهم ومنه ما یوخذ من اهل الحرب اذا دخلوا بلاد الاسلام للتجارات فکل هذا من الفی (کتاب الاموال للامام ابی عبید رحمة الله علیه صفحه ۱۶)

اس کے علاوہ سورہ حشر میں جو مصارف بیان کیے گئے ہیں ان کا اشارہ یہی ہے کہ پیداوار کو بھی فے قرار دیا جائے۔ چنانچہ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے خلیفہ ہارون الرشید کو خطاب کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا۔

فاما الفی یا امیر المؤمنین فهو الخراج عندنا خراج الارض واللّٰه اعلم لان الله تبارك وتعالیٰ یقول فی کتابه ما افاء الله علی رسوله من اهل القری فلله وللرسول الی ان قال ابو یوسف ثم قال تعالی والذین جاؤوا من بعدهم الایة فهذا والله اعلم من جاء من بعدهم من المؤمنین الی یوم القیامة والله اعلم بالصواب (کتاب الخراج للامام ابی یوسف فصل فی الفی والخروج صفحه ۲۳)

غزوات کا دوسرا دور

بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ

حوادث اور واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے غزوہ احد کے تذکرہ کے بعد غزوہ احزاب کا تذکرہ آنا چاہیے مگر جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے ہمارا سلسلہ تحریر ازالۃ الخفاء کے تابع ہے۔ پھر اس میں قصہ از قصہ مے خیزد کی نوعیت پیدا ہوگئی ہے۔ فضائل اور ایثار صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر آیا تو جہاد فی سبیل اللہ کی تفسیر کی گئی (عہد زریں جلد اوّل ص ۱۶۸) پھر غزوات وسرا یا جہاد فی سبیل اللہ کے عملی نمونے تھے۔ لہٰذا ان کا تذکرہ ضروری تھا۔ پہلے مجمل تذکرہ آیا (ص ۱۷۱ ج ۱) مگر اس نے تفصیل کے لیے تشنگی پیدا کر دی اور جب سیراب ہونے کے لیے کوزوں کی طرف ہاتھ بڑھا تو سب سے پہلے احزاب کا جام رنگیں سامنے آ گیا۔

یہ آخری غزوہ تھا جس میں مشرکین کی طرف سے اقدام ہوا تھا۔ اس غزوہ کے خاتمہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی تھی کہ اب اقدام ہماری طرف سے ہوگا۔ (۲۳۳ ج ۱)

جب اس آخری غزوہ کے تذکرہ سے ۲۰ صفحات رنگین کیے گئے تو خدمات وایثار صحابہ کے وسیع باب کا مطالبہ ہوا کہ اس آخری غزوہ سے پہلے غزوات یعنی (بدر واحد) کا بھی تذکرہ تفصیل سے کیا جائے۔ جو نہ صرف فضائل صحابہ بلکہ اسلام کی عظیم الشان تاریخ میں بھی وہ اہمیت رکھتے ہیں کہ کلام اللہ کی تقریباً دوسو آیتیں ان کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ اس طرح اگرچہ ترتیب میں فرق ہوگیا کہ غزوہ احزاب کا تذکرہ پہلے آ گیا (ص ۱۹۳ ج ۱ تا ۲۱۱ ج ۱) اور بدر واحد کا تذکرہ بعد میں مگر الحمدللہ آیات کتاب اللہ کی روشنی میں ان تینوں غزووں کا ذکر مکمل ہوگیا۔

غزوہ احزاب کے خاتمہ پر جو لسان رسالت سے صادر ہوا تھا۔ نحن نسیر الیھم ''اب ہم ان کی طرف چل کر جائیں گے۔'' آئندہ صفحات میں اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

محرک: مکہ معظّمہ کے متعلق صرف یہی بات نہیں تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات مہاجرین کا آبائی وطن تھا۔ یہاں یہ حضرات پیدا ہوئے تھے۔ بڑھے پلے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بلد حرام اور باعظمت شہر اطمینان گاہ روح اور مرکز ایمان بھی تھا۔ جہاں خدا کا وہ تجلّی گاہ تھا جس کی زیارت کے لیے کئی ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نوع انسان کی تمام سعید روحوں کو دعوت عام دے چکے تھے، جہاں اولاد آدم کی پاک روحیں حاضر ہوتیں اور بیت عتیق کی زیارت کر کے سعادت ابدی کی دستاویزیں حاصل کرتی تھیں۔ اس قرارگاہ روح اور مہبط ایمان کی زیارت کا شوق فطرت ایمانی کا جزو ہے جس قدر ایمان مکمل ہوگا اتنا ہی زیادہ یہ شوق

اضطراب انگیز اور روح فرسا ہوگا۔

سیّدنا بلال رضی اللہ عنہ حبشی الاصل تھے مکہ ان کا آبائی وطن نہیں تھا۔ ایک غلام کی حیثیت سے مکہ میں رہے تھے پھر مسلمان ہوئے تو مکہ کا ایک ایک ذرہ ان کا دشمن ہوگیا تھا جو لمحہ گذرتا تھا مصیبتوں کے طوفان میں گذرتا تھا مگر مدینہ منورہ آنے کے بعد ایک عرصہ تک یہ حالت تھی کہ مکہ کا خیال آتا تو رونے لگتے تھے اسی اثنا میں کچھ طبیعت خراب ہوئی تو لوگوں نے سنا کہ وہ مکہ کے شوق میں یہ شعر گنگنا رہے ہیں۔ بخاری نے ان اشعار کو نقل کیا ہے۔

الا ليت شعري هل ابيتن ليلة بوا دو حولي اذخر وجليل

وهل اردن يوما مياه مجنة وهل يبدون لي شامة وطفيل

''اے کاش میں جان لیتا کیا پھر کبھی ایسا ہوگا کہ میں رات گذاروں وادی میں اور میرے گرداگرد اذخر اور جلیل ہوں (یہ گھاسوں کے نام ہیں جو مکہ میں ہوتی ہیں) اور کیا کبھی ایسا ہوگا کہ میں مجنہ کے چشمہ پر فروکش ہوں اور کیا کبھی ایسا ہوگا کہ کوہ شامہ مجھے دکھائی دے اور کوہ طفیل کو میں دیکھ سکوں۔'' (بخاری شریف ص ۲۵۳)

جب ایک حبشی الاصل جس نے مکہ میں چند سال گذارے تھے اس کے جذبات مکہ معظمہ کے متعلق یہ تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء و مہاجرین کے جذبات کا کیا ٹھکانا۔ جس کے فطری جذبات کے ساتھ جذبہ ایمانی بھی آتش شوق کو تیز کرتا رہتا تھا جنہوں نے طفولیت اور شباب کے دو عزیز ترین دور اسی مقدس اور محبوب شہر کے گلی کوچوں میں گذارے تھے جس سے ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارا نہیں تھی مگر اب تقریباً چھ سال پورے ہو رہے تھے کہ اس طرف کی ہوا بھی لگنی مشکل تھی ان میں سے کچھ کے اہل و عیال بھی مکہ ہی میں تھے۔ نہ وہ مکہ سے نکل سکتے تھے نہ یہ مکہ میں داخل ہو سکتے تھے۔

بہر حال ان ایمانی محرکات اور فطری جذبات کے سبب سے اور غالباً اس لیے کہ اسلام کا قافلہ جو ضرورتاً مدینہ طیبہ میں فروکش ہوگیا تھا۔ اس کا رخ حقیقی منزل اور اس اصلی مرکز کی طرف ہونا چاہیے اور جب کہ محمد رسول الله والذين معه۔ ملت ابراہیمی کے حقیقی محافظ اور علمبردار ہیں تو اتنا حق ان کو ضرور ملنا چاہیے کہ مسجد حرام میں داخل ہوسکیں اور اپنے ایمانی جذبات کی تشنگیوں کو سیراب کرسکیں) ارادہ کیا گیا کہ اس بلد امین میں حاضری کی کوشش کی جائے۔

چنانچہ شوال ۶ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اداء عمرہ کا قصد فرمایا لیکن اس قصد کے یہ معنی تھے کہ جس نرغہ میں گذشتہ سال غزوہ احزاب کے موقع پر پورا مدینہ منورہ محصور ہوگیا تھا اب عمرہ کرنے والوں کی جماعت خود بخود اس ابتلا اور نرغہ کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہی تھی۔ کیونکہ اداء عمرہ کے لیے لازم تھا کہ مکہ معظّمہ میں داخل ہوں۔ مکہ معظّمہ انہیں مشرکین کا محفوظ قلعہ بنا ہوا تھا جو بدر اور احد کے معرکوں میں مسلمانوں پر

مصیبت کے پہاڑ توڑ چکے تھے اور سال گذشتہ اپنے تمام احزاب کو لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے کہ اسلام اور عاملین اسلام کو صفحہ ہستی سے محو کر ڈالیں اس بناء پر یہ قصد کرنا ایک بہت بڑے خطرہ کو دعوت دینا تھا اور ہر ایک کی ہمت نہیں تھی کہ اس سفر میں ہمر کابی کا شوق کرے۔

منافقین کا تو تذکرہ ہی کیا۔ وہ تو احد میں جنگ سے پہلے میدان چھوڑ آئے تھے اور غزوہ احزاب میں یہ کہہ کر گھروں میں بیٹھ گئے تھے کہ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ (ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں) وہ اس موقع پر جان حزیں کو دو دراز سفر کی زحمت میں کب ڈال سکتے تھے۔ بادیہ نشین اعراب جن کے جذبات مصلحت بینی کے وسوسوں سے آزاد رہا کرتے ہیں وہ بھی ساتھ نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ جدید الایمان (نومسلم) جن کے دلوں میں ابھی ایمان کی جڑیں مضبوط نہیں جمی تھیں۔ ان کو تو یہ یقین ہو گیا تھا:

لَنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا (سورہ فتح)

''رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمان اپنے گھروں کو کبھی بھی واپس نہ ہوں گے۔''

بہرحال جس طرح غزوہ بدر کے موقعہ پر صرف تین سو تیرہ کے لیے یہ سعادت مقرر کی گئی تھی کہ اسلام کے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سخت معرکہ میں شرکت کر کے مغفرت اور رضا خداوندی کی بشارتیں سنیں اور ابدی فوز و فلاح کا طرہ امتیاز حاصل کر لیں اسی طرح قسام ازل نے اس موقع پر صرف چودہ سو اہل ایمان کے لیے یہ سعادت مقدر کی تھی کہ امتحان گاہ ایمان میں کوہ استقلال ثابت ہوں اور رضا خداوندی کی سند حاصل کریں۔

موکبہ ہمایوں مدینہ منورہ سے روانہ ہوا تو چونکہ جنگ کا قصد نہیں تھا۔ صرف عمرہ مقصود تھا اس لیے حکم ہوا کہ احرام باندھ لیا جائے، قربانی کے اونٹ ساتھ لے لیے جائیں، ہتھیار نہ لگائے جائیں، صرف تلوار جو اس زمانہ میں اور بالخصوص عرب میں سفر کی ضروریات میں سے تھی ساتھ لے جائی جائے۔ مگر اس طرح کہ نیام میں بند ہو یا کپڑے میں لپٹی ہوئی ہو۔ چنانچہ ذوالحلیفہ پہنچ کر (جو مدینہ سے چند میل ہے) احرام باندھ لیا گیا اور احرام (۹۰۸) کے قاعدے کے مطابق قربانی کے جانوروں کی گردنوں میں قلادے یا نعل لٹکا دیئے گئے۔ لیکن حریفان اسلام کو جیسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل و حرکت کا علم ہوا جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیج کر ایک بڑی فوج مقابلہ کے لیے تیار کر لی اور یہ طے کر لیا کہ داعی اسلام اور حامیان ملت بیضا کو کسی طرح بھی مکہ معظمہ میں داخل ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خفیہ (۹۰۹) رپورٹر نے مقام عسفان پر رپورٹ دی:

ان قريشا جمعوا لك جموعا وقد جمعوا لك الاحابيش وهم مقاتلوك وصادوك عن البيت ومانعوك۔ (بخاری شریف ج ۲ غزوہ حدیبیہ)

''قریش نے آپ کے مقابلہ کے لیے بہت سے گروہ اکٹھے کر لیے ہیں۔ انہوں نے

آپ سے جنگ کے لیے متفرق قبائل کے آدمیوں کو جمع کرلیا ہے وہ آپ سے جنگ کریں گے اور آپ کو بیت اللہ شریف سے واپس کردیں گے اور آپ کے راستہ میں رکاوٹ ڈالیں گے۔''

ابھی رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ رفقاء کرام منزل تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ حضرت خالد بن الولید (رضی اللہ عنہ) جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے ایک دستہ لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے کہ نہتے مسلمانوں کو راستہ میں پریشان کریں گے۔ خالد بن ولید مکہ سے چل کر وادی غمیم تک پہنچ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو چونکہ لڑنا مقصود نہیں تھا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ بدل دیا اور دوسرے راستہ سے حدیبیہ پہنچ گئے۔ (۹۱۰) اور بدیل بن ورقاء کو (جو قبیلہ خزاعہ کے سردار تھے اور ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے) قریش کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں لڑنا مقصود نہیں ہے۔ جنگ نے قریش کی حالت زار کردی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک معین مدت کے لیے معاہدہ صلح کرلیں اور مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیں۔ اگر اس پیغام امن کو قریش منظور نہ کریں تو مجھے بھی جنگ کے لیے مجبور ہونا پڑے گا اور اس خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہوجائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو، کردے۔

بدیل نے یہ پیغام قریش کو پہنچایا جس کے نتیجہ میں ''عروہ بن مسعود ثقفی'' قریش کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کے لیے آئے۔ لیکن گفتگو ناکام رہی۔

عروہ بن مسعود ثقفی نے واپس جاکر یہ اشارہ تو کردیا کہ اگر جنگ ہوئی تو نتیجہ قریش کے حق میں نہ ہوگا۔ اس نے کہا:

''میں نے قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں مگر وہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی جو ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں کو ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے کوئی شخص ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ وضو کرنے میں جو پانی گرتا ہے اس پر ساتھی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بلغم یا لعاب دہن گرتا ہے تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہروں اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔''

لیکن قریش نے کوئی نتیجہ خیز جواب نہیں دیا بلکہ قریش کے سکوت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کیا کہ گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جاری کریں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراش بن اُمیہ کو قریش کے پاس بھیجا مگر قریش نے دوبارہ تحریک مصالحت کا جواب یہ دیا کہ حضرت خراش کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری میں رہا کرتا تھا مار ڈالا اور خود حضرت خراش پر یہی گذرنے والی تھی کہ دوسرے قبائل

کے لوگوں نے بچالیا۔ وہ کسی طرح صحیح سالم دربار رسالت میں واپس پہنچ گئے۔

مزید برآں قریش نے ایک دستہ بھیج دیا کہ وہ لشکر اسلام پر حملہ آور ہو لیکن یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ گو یہ سخت شرارت تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن عفو اس سے زیادہ وسیع تھا۔ آپ نے سب کو معاف فرماتے ہوئے رہا فرما دیا۔

کلام الٰہی نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ
(سورہ فتح)

''وہی خدا ہے جس نے مکہ میں ان لوگوں کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا۔''

کفار کی اس بدخلقی جہالت اور اقدام جنگ کے باوجود رحمتہ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ مصالحت غالب رہا اور جوابی کارروائی کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ایک مرتبہ صلح کی پیش کش فرمائی۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو صلح اور آشتی کی اس مقدس سفارت کے لیے منتخب فرمایا۔ کیونکہ مکہ معظمہ میں آپ رضی اللہ عنہ کے ایسے اثرات اب بھی تھے جن کی بنا پر آپ رضی اللہ عنہ کے لیے خطرہ کم تھا اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی قرابت کے باعث آپ رضی اللہ عنہ کی شان مسلمانوں میں بھی ممتاز تھی جس کی بنا پر اس سفارت کو سب سے زیادہ باوقار اور باعزت سفارت کہا جا سکتا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے ایک عزیز (امان بن سعید) کی حمایت میں مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا۔

قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نظر بند کر لیا لیکن عام طور پر خبر مشہور ہوگئی کہ وہ قتل کر دیئے گئے۔ یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عثمان کے خون کا قصاص لینا فرض ہے''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ببول کے درخت کے نیچے تشریف فرما ہوئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہ نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا۔ اس بیعت کا نام بیعت رضوان ہے۔ یہ تاریخ اسلام کا مہتم بالشان واقعہ ہے۔ معاہدہ کرنے والے گویا موت کی دستاویز پر دستخط کر رہے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ دشمن کے فولادی پنجے میں وہ جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مرکز مدینہ طیبہ سے کٹے ہوئے ہیں۔ گردوپیش میں سیکڑوں میل تک معاون و مددگار تو کیا کوئی نام لینے والا ہمدردی کرنے والا بھی نہیں ہے۔

مدینہ طیبہ میں جس خطرہ نے بہت سے کمزور ایمان والوں کی ہمتیں پست کر دی تھیں آج وہ خطرہ حقیقت

بن کر سامنے آ رہا تھا لیکن یہ وہ لوگ تھے جو قتل فی سبیل اللہ کو ابدی حیات جان حزیں کی قربانی کو معراج ایمان اور سیدالانبیاء افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں مرگ ناگہاں کو سعادت عظمیٰ یقین کرتے تھے۔

یہ وہ تھے کہ اگر زخمی ہو کر گرتے تو کرب وکراہ یا آہ وفغاں کے بجائے ان کی زبان بیساختہ پکار اٹھتی تھی **فزت و رب الکعبہ**۔ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

بہرحال اس تیاری کا اثر یہ ہوا کہ کفار قریش کے رویہ میں کسی قدر نرمی پیدا ہوئی اور انہوں نے صداء مصالحت پر کان لگانے کا ارادہ کرلیا۔ قریش کے نمائندے آنے شروع ہوئے۔ ان سے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوئی۔ بالآخر چند سال تک آپس میں نہ لڑنے کا معاہدہ ہو گیا جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ معاہدہ کی شرطیں اگرچہ مسلمانوں کے حق میں بہت سخت تھیں مگر وحی الٰہی نے اس کو فتح مبین [911] قرار دیا اور ان بے شمار کامیابیوں نے جو اس صلح کے بعد دعوت اسلام کو نصیب ہوئیں۔ وحی الٰہی کی صداقت کا مشاہدہ ہر ایک چشم بینا کے سامنے پیش کر دیا۔

اس تمہید کے بعد اب آپ سورہ فتح کی آیات کا مطالعہ کیجئے اور ان چودہ سو صحابہ کرام کے فضائل کا اندازہ فرمایئے جو اس موقع پر حاضر تھے اور چونکہ چاروں خلفاء راشدین سیدالانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفاقت باسعادت کا حق ادا کرتے ہوئے اس تمام قضیہ میں بھی پیش پیش رہے۔ لہٰذا ان فضائل ومناقب کے وہ اولین مستحق ہیں اور اس طرح حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ان آیات سے ان حضرات کی خلافت خاصہ پر جو استدلال کیا ہے وہ بھی واجب التسلیم ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

خدا تعالیٰ در سورہ فتح دلائل باہرہ بر فضل اہل حدیبیہ کہ خلفاء ازاں جماعت اند ذکر میفرماید:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ۔

''وہی ہے جس نے نازل کیا سکینہ (چین ضبط واطمینان) اہل ایمان کے دلوں میں۔ تا کہ وہ اس ایمان کے ساتھ جو ان کو پہلے سے حاصل تھا ایمان میں اور بڑھ جائیں۔''

یہ مومن جن کے دلوں کو سکون بخشا کون تھے۔ یہی حضرات تھے جن میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم بھی تھے۔

پس یہ ارشاد خداوندی جس طرح ان بزرگان ملت کے ایمان پر شہادت پیش کر رہا ہے یہ بھی واضح کر رہا ہے کہ:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب کو سکینہ سے نوازا تھا۔

(۲) اور اس طرح ان کے ایمان کو مضبوط اور ان کے یقین واذعان کو مستحکم کیا تھا۔ یعنی یہ آیت ان چودہ سو صحابہ کے ایمان واذعان، سکینہ اور استحکام واستقلال ایمان اور اضافہ یقین واذعان کی تصدیق پیش کر رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور سعادت کیا ہو سکتی ہے کہ خدا خود کسی جماعت کے ایمان مستحکم کا اعلان کرے۔

دوسری آیت ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (ع۲۲)

''بیشک جو مسلمان آپ سے بیعت کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ آپ سے نہیں بلکہ اپنے اللہ سے بیعت کر رہے ہیں ان بیعت کرنے والے ہاتھوں پر خدا کا ہاتھ ہے۔ پس جو شخص عہد شکنی کرتا ہے وہ اپنے ہی برے کو عہد شکنی کر رہا ہے (اس کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا) اور جو شخص اس بات کو پورا کرے گا جس پر اس نے اللہ سے عہد کیا ہے تو اللہ تعالیٰ عنقریب اس کو بہت بڑا اصلہ عطا فرمائے گا۔''

آیت کریمہ واضح کر رہی ہے کہ اس وقت اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت ہو رہی ہے۔ مگر وہ درحقیقت دست خدا پر بیعت ہے کیونکہ حضرت حق جل مجدہ کی مرضی اور منشا کے عین مطابق ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوسکتی ہے کہ دست خدا پر بیعت ہو اور مزید فضلیت یہ ہو کہ **یداللہ فوق ایدیھم** یعنی دست خدا ان کے ہاتھوں پر سایہ فگن ہو۔

ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا
(سورہ فتح ع۳)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوش ہوا جب کہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے اور جو خلوص ان بیعت کرنے والوں کے دلوں میں تھا خدا کو وہ بھی معلوم تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں میں اطمینان قلب پیدا کیا اور ان کو اس کے بدلے میں ایسی فتح عطا فرمائی جو بہت ہی قریب تھی اور بکثرت غنیمتیں بھی دیں جن کو یہ لوگ حاصل کریں گے اور اللہ تعالیٰ بڑا زبردست بڑی حکمت والا ہے۔''

افادات:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے سورہ فتح کی آیات سے حضرات خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت خاصہ کے لیے زبردست استدلال کیا ہے اور اس استدلال میں سورہ فتح کی تقریباً تمام ہی آیات پیش کر دی ہیں۔ آپ نے ان دونوں آیتوں کے بعد مندرجہ ذیل آیت پیش کی ہے:

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰی قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ۔ فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا

اَلِیْمًا (سورہ فتح ع ۲)

''آپ ان دیہاتیوں (گنواروں) سے جو پیچھے رہ گئے تھے کہہ دیجیے عنقریب تم کو ایسی قوم کے مقابلہ کے لیے دعوت دی جائے گی جو سخت جنگ جو ہوگی۔ تم ان سے جنگ کرتے رہو یا وہ اطاعت قبول کرلیں۔ پس اگر تم اس وقت حکم بجالائے تو اللہ تعالیٰ تم کو اچھا صلہ عطا فرمائے گا اور اگر تم نے اسی طرح روگردانی کی جس طرح تم اس سے پہلے کہ (حدیبیہ میں) روگردانی کر چکے ہو تو خدا تم کو سخت دردناک سزا دے گا۔''

آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ:

(۱) مستقبل قریب میں کسی بڑی اور طاقتور جماعت کے مقابلہ کے لیے دعوت دی جائے گی۔

(۲) اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کو اجر عظیم ملے گا۔

(۳) جو لبیک کہنے میں کوتاہی کریں گے ان کو عذاب الیم میں مبتلا کیا جائے گا۔

چونکہ جنگ و جہاد بغیر کسی امیر کے نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا اس دعوت کا کوئی داعی ہوگا جو دعوت پیش کرے گا اس کی اطاعت واجب ہوگی۔ یعنی دعوت کی تعمیل کرنے والوں کو اجر عظیم ملے گا اور پہلوتہی کرنے والوں کو عذاب الیم۔ یہی معنی واجب کے ہوا کرتے ہیں۔ واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ دعوت خلفاء راشدین بالخصوص حضرات شیخین یعنی صدیق اکبر اور فاروق اعظم اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ علیہم نے پیش کی۔ لہٰذا نص آیت کے مطابق یہ حضرات واجب الاطاعت ہوئے۔ یہی معنی خلافت برحق کے ہیں۔

یہ قوم جس کو اولی باس شدید ''مضبوط طاقت والی'' کہا گیا ہے۔ کون سی قوم ہے؟ ''حسن'' فرماتے ہیں وہ فارس اور روم ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں فارس کے دیہاتی اور عجم کے کردی مراد ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی ہے کہ فارس اور روم مراد ہیں۔

آیت مذکورہ بالا کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن جریج فرماتے ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حدیبیہ کے موقع پر مدینہ طیبہ کے قرب و جوار کے بادیہ نشینوں کو یعنی قبیلہ جہینہ اور قبیلہ فرینہ کے نمائندگان اور عمائدین کو بلایا تھا ایسے ہی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب فارس پر حملہ کا ارادہ فرمایا تو ان قبائل کو بلایا۔ ان سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ اگر اس وقت جہاد میں حصہ لو گے تو سابق کا بھی کفارہ ادا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ ''اجر حسن'' عطا فرمائے گا اور اگر پہلی مرتبہ کی طرح روگردانی کرو گے تو اللہ تعالیٰ دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔

مذکورہ روایات سے ثابت ہوا کہ حضرات صحابہ نے بھی ان آیات کا محمل اس دور کی خلافت کو سمجھا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ارشاد کی کسی نے مخالفت نہیں کی بلکہ اس کی تعمیل کرتے ہوئے فارس اور روم پر چڑھائی کی، سخت ترین معرکوں میں داد شجاعت دی اور اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق ''مغانم کثیرہ'' اور

''اجرِ حسن'' حاصل کیا۔

حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ دوپہر کا وقت تھا۔ ہم آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانچی نے اعلان کیا۔ ایھا الناس البیع نزل روح القدس (لوگو! آؤ بیعت کرو روح القدس نازل ہوئے ہیں) چنانچہ ہم جلدی کر کے اٹھے۔ حضرت رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور میں حاضر ہوئے اور بیعت کی۔ آپ ایک درخت [(۹۱۲)] کے نیچے تشریف فرما تھے اور لوگوں سے بیعت لے رہے تھے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کا نمبر آیا تو (چونکہ وہ مکہ میں ایلچی بنا کر بھیجے گئے تھے اور ان کی شہادت کی افواہ پر ہی یہ بیعت لی جا رہی تھی تو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر دوسرے پر رکھا اور اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غائبانہ بیعت لی۔
اس وقت کچھ بے تکلف خدام نے کہا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے خوش نصیب ہیں کہ خود طواف کعبہ کی سعادت اور مسرت حاصل کر رہے ہیں اور ہم یہاں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا ناممکن ہے کہ عثمان مجھ سے پہلے طواف کر لیں خواہ وہ مکہ میں کتنے ہی عرصہ رہیں۔

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں فروکش ہوئے تو قریش کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے اصحاب میں سے کسی ایک کو قریش کے پاس بھیجیں۔ پہلے اس کام کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اطمینان نہیں کہ میں اس مقصد میں کامیاب [(۹۱۴)] ہو سکوں گا۔ (ان کو مجھ سے خاص عداوت ہے اور وہ مجھے سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں) اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر مجھے ایذا پہنچائی گئی تو مکہ معظمہ میں بنی کعب (یعنی قریش) کا کوئی ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جو میری حمایت کرے اور میری وجہ سے دوسروں کی مخالفت مول لے۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس خدمت کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ ان کے خاندان کے آدمی بھی مکہ معظمہ میں ایسے ہیں کہ ان کی موجودگی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایذا نہیں دی جا سکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عذر کی معقولیت کو تسلیم فرمایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا کر قریش کے پاس بھیجا کہ ان کو آگاہ کر دیں کہ ہم جنگ کے لیے نہیں آئے بلکہ عمرہ ادا کرنے کے لیے عمرہ کا احرام باندھ کر آئے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ بھی ہدایت فرمائی کہ دعوت اسلام پیش کریں اور جو مسلمان مرد یا عورتیں مکہ میں ہیں ان کے پاس جائیں ان کو فتح کی بشارت سنائیں اور یہ خبر دے دیں کہ اللہ تعالیٰ عنقریب اپنے دین کو مکہ پر غالب کر دے گا اور اس کی ضرورت نہ رہے گی کہ مکہ میں رہ کر دین و ایمان کو چھپایا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قریش کے پاس پہنچے۔ ان کو پیغام پہنچایا۔ مگر قریش نے پیغام صلح کا جواب اس طرح دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کونظر بند کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے بیعت کی فرمائش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے، اعلان کیا کہ روح القدس (حضرت جبرئیل علیہ السلام) نازل ہوئے ہیں اور انہوں نے بیعت کا حکم پہنچایا لہٰذا اللہ تعالیٰ کے نام پر نکل کھڑے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرو۔ بس مسلمان بڑھ بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔ مسلمانوں نے آپ سے اس بات پر بیعت کی کہ وہ کسی حالت میں بھی راہ فرار نہ اختیار کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تیاری نے مشرکین قریش کو مرعوب کر دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان تمام اہل ایمان کو جن کو محصور کر رکھا تھا کفار قریش نے رہا کر دیا اور موادعت اور صلح کی تحریک پیش کی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اس وقت ہماری تعداد چودہ سو تھی۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ سنبھالے ہوئے درخت کے نیچے تھے۔ یہ درخت سمرہ (ببول) تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس پر بیعت کی تھی کہ راہ فرار اختیار نہ کریں گے بیعت میں یہ نہیں کہا جارہا تھا کہ ہم مر جائیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان کا حکم فرمایا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارت لے کر مکہ معظمہ گئے ہوئے تھے۔ حاضرین بیعت کر چکے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اے اللہ! بیشک ''عثمان'' اللہ اور رسول کے کام میں ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک بیعت کرنے والوں کے اپنے ہاتھوں سے بہت افضل تھا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حدیبیہ کے موقع پر ہم چودہ سو تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے متعلق فرمایا۔ أَنْتُمْ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ تم ان سب سے بہتر ہو جو روئے زمین پر ہیں۔

حضرت جابر اور حضرت مسلم ام مبشر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جن مسلمانوں نے شجرہ کے نیچے بیعت کی ان میں سے کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا۔

حضرت ابوامامہ باہلی۔ فرماتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ لقد رضی الله عن المومنين الخ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ شجرہ کے نیچے بیعت کرنے والوں میں میں بھی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو امامہ تم میرے ہو اور میں تمہارا۔

بہر حال اس سے بڑھ کر فضیلت کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے کلام برحق میں ان حضرات سے اپنی

رضامندی کا اعلان فرمارہے ہیں اور ساتھ ہی فعلم مافی قلوبهم (جان لیا اس کو جو ان کے دلوں میں تھا) فرما کران کے قلوب کے پاک صاف ہونے کا بھی اظہار فرمارہے ہیں۔ فیالهم من محامد

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فتح قریب سے مراد فتح خیبر ہے کہ جب وہ حدیبیہ سے واپس ہوں گے تو یہ فتح نصیب ہوگی۔

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے جنگ صفین کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یوم حدیبیہ کو یعنی اس روز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان صلح ہوئی تھی ہماری عجیب حالت تھی۔ اس روز ہم نے صلح ضرور کی۔ مگر کمزوری کے سبب سے نہیں کیونکہ اگر جنگ ہوتی تو ہمارے اندر مقابلہ کی پوری طاقت تھی۔ بلکہ دوسرے مقاصد کے لیے صلح کی (جو جنگ سے بہت زیادہ اہم تھے) مگر بظاہر یہ صلح ایک ناکامی تھی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا۔ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ہیں؟ رسول اللہ علیہ وسلم: بیشک۔ حضرت عمر: کیا ہمارے مقتول جنت میں اور ان کے دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بیشک۔ حضرت عمر: پھر کیا بات ہے کہ ہم دین کے بارے میں ایک گھٹیا بات اختیار کریں اور واپس ہو جائیں اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں فرمایا ہے۔ یعنی فیصلہ کن جنگ کے بغیر ہم کیوں واپس ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر ارشاد فرمایا۔ ابن خطاب بیشک میں اللہ کا رسول ہوں اور اس کا یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کبھی بھی ناکام نہیں کرے گا۔ حضرت عمر خاموش ہو گئے۔ مگر ان کو اطمینان نہیں ہوا۔ وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور وہی سوالات کیے جو رسول اللہ علیہ وسلم سے کیے تھے اور اتفاق سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے وہی جوابات دیئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے تھے۔ آخر میں آپ نے فرمایا۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو ناکام نہیں کرے گا۔ یہ گفتگو ختم ہی ہوئی تھی کہ سورہ فتح نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور سورہ فتح کی آیتیں ان کو سنائیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعجب آمیز لہجہ میں دریافت کیا۔ کیا یہ فتح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بیشک فتح ہے:

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝ وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

"اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے تم سے بہت سی غنیمتوں کا جن کو تم حاصل کرو گے۔ فی الحال اس نے تم کو یہ (خیبر کی غنیمت) عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا

اور تا کہ یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے قدرت کا ایک نمونہ ہو جائے نیز اس لیے کہ خدا تم کو سیدھی راہ چلائے۔ ایک (۹۱۵) اور فتح کا بھی وعدہ (۹۱۶) ہے جس پر تم اس وقت قادر نہ ہو سکے مگر وہ اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے اور اگر یہ کافر تم سے لڑتے تو ضرور پیٹھ دے کر بھاگتے۔ پھر وہ اپنا نہ کوئی یار پاتے نہ مددگار۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا (۹۱۷) یہی دستور قائم کر رکھا ہے جو پہلے سے ہوتا چلا آ رہا ہے اور آپ خدا کے آئین میں کسی قسم کا ردوبدل نہ پائیں گے۔"

آیت مذکورہ بالا میں دو غنیمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

(۱) وہ بہت سی غنیمتیں جن کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے (۲) اور وہ غنیمت جو فوراً عطا فرما دی ہے۔ ان کا مصداق معین کرنے میں ائمہ تفسیر کے متعدد قول ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ مغانم کثیرہ سے مراد وہ تمام غنیمتیں ہیں جو آج تک مسلمانوں کو حاصل ہو رہی ہیں اور فوری غنیمت سے مراد خیبر کی غنیمت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فوری غنیمت سے مراد فتح مکہ لیتے ہیں (جو واقعہ حدیبیہ سے دو سال بعد ہوئی۔ یعنی ۷ھ میں۔) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ فوری غنیمت سے مراد خیبر کی غنیمتیں ہیں۔ آیت کریمہ کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھ تم سے روکے۔ یعنی مکہ والوں کو اس سے روکا کہ تمہارے اوپر حرم شریف میں حملہ کر دیں اور اللہ تعالیٰ نے جو مکہ کو حرمت و عظمت عطا فرمائی ہے اس کو وہ پامال کر دیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ والوں کو اس سے روکا کہ وہ تمہارے اوپر حملہ کر دیں جب کہ تم احرام باندھے ہوئے تھے۔ مروان اور مسور بن مخرمہ (رضی اللہ عنہما) ان آیات کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس ہو رہے تھے تو مکہ اور مدینہ کے درمیان سورۂ فتح نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے خیبر عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا تھا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس ہو کر ذی الحجہ کے مہینہ میں مدینہ طیبہ پہنچے ختم ذی الحجہ تک مدینہ منورہ میں قیام فرمایا۔ پھر ماہ محرم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی جانب کوچ فرمایا۔ آپ راستہ میں رجیع مقام پر خیمہ زن ہوئے جو غطفان اور خیبر کے درمیان ایک وادی تھی۔ وہاں اس کا خوف رہا کہ قبیلہ غطفان خیبر والوں کی امداد کے لیے لشکر اسلام پر حملہ نہ کر دے۔ صبح تک اس مقام پر قیام فرمایا پھر خیبر پر حملہ کیا۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ بھی فوری غنیمت کی تفسیر فتح خیبر ہی کرتے ہیں اور لوگوں کے ہاتھ روکنے سے مراد یہ ہے کہ اس موقع پر جب کہ جانبازان اسلام حدیبیہ گئے ہوئے تھے آس پاس کے مخالف قبائل نے مدینہ پر حملہ نہیں کیا۔ حضرت عطیہ بھی فوری غنیمت کا مصداق فتح خیبر ہی کو قرار دیتے ہیں۔ اور حضرت ابن جریج اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قبیلہ اسد اور قبیلہ غطفان کا اجتماع ہوا۔ عیینہ بن حصن اور مالک بن عوف بن نضر ان کی قیادت کر رہے تھے اور خیبر والے بیر معونہ پر پہنچ گئے تھے (ان تینوں کی مشترک طاقت بہت اچھی تھی)

لیکن ان کے دلوں میں خداوند عالم نے رعب ڈال دیا۔لشکر اسلام کا ضبط ونظم اور جذبہ اور ایثار وفدائیت کو دیکھ کر یہ لوگ مرعوب ہو گئے۔بس وہیں سے ہزیمت اختیار کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر نہیں آ سکے۔ انہیں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمایا ہے کہ اگر وہ جنگ کرتے تب بھی نتیجہ یہی ہوتا کہ پیٹھ دکھا کر راہ فرار اختیار کرتے۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (سورہ فتح)

''اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب ان کافروں نے اپنے قلوب میں اس غیرت و حمیت کو جگہ دی جو جاہلیت کی حمیت تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں کو اپنی طرف سے ضبط اور اطمینان عطا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پرہیزگاری کی بات پر جمائے رکھا اور یہی لوگ اس تقویٰ کی بات کے زیادہ حق دار اور اس کلمہ تقویٰ کے حقیقی اہل ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شے کو خوب جانتا ہے۔''

آیت کا آخری حصہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کمال ایمان اعلیٰ درجہ کے تقویٰ اور ان کی بہترین صلاحیتوں کے لیے نہایت واضح شہادت ہے۔ کیونکہ اس آیت میں:

(۱) صحابہ کرام کو مومنین کا خطاب دیا گیا ہے۔
(۲) ان کے اوپر نزول سکینہ کی دوبارہ اطلاع دی گئی ہے۔
(۳) یہ واضح کیا گیا ہے کہ کلمہ تقویٰ ان کے رگ وپے میں پیوست کر دیا گیا ہے۔
(۴) وہ اس کلمہ تقویٰ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔
(۵) وہ اپنے اندر کلمہ تقویٰ کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

کلمہ تقویٰ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بحوالہ حضرت حمران پیش کی ہے۔روایت یہ ہے:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ جو شخص بھی سچے دل سے اس کو ادا کر دے گا اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ حرام کر دے گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اتنا ہی فرمایا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے۔ میں تمہیں بتادوں وہ کلمہ یہ ہے۔ وہ کلمہ اخلاص ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لیے لازم کر دیا ہے۔ یہ وہی کلمہ تقویٰ ہے جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کے انتقال کے وقت اصرار کیا تھا کہ وہ اس کو ایک مرتبہ ادا کر دیں۔ یعنی سچے دل سے لا الہ الا اللہ ادا کرنا۔

افادات:

حضرت ابوادریس راوی ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اس آیت میں حمیة الجاهلیة کے بعد اس طرح پڑھا کرتے تھے۔

وَلَوْ حَمَيْتُمْ كَمَا حَمَوْا لَفَسَدَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ الخ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اس طرح پڑھتے ہیں تو آپ نے اس کو شدت سے محسوس کیا اور فوراً ہی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو طلب فرمالیا اور کچھ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو بھی جن میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی تھے جمع کرلیا۔ جب حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ آئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ کوئی صاحب سورہ فتح سنائیں گے؟ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو پیش کیا اور سورہ فتح اسی طرح جس طرح عام طور پر پڑھی جاتی ہے پڑھ کر سنادی۔ تب حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے سختی سے باز پرس کی کہ آپ سورہ فتح اس طرح کیوں پڑھتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا امیر المومنین مجھے بھی کچھ عرض کرنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ضرور فرمائیے۔ حضرت ابن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: امیر المومنین جانتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خلوت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تنہائی میں قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ آپ صاحبان دروازہ پر رہتے تھے اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ پس اگر آپ کی رائے ہو کہ جس طرح مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا ہے اسی طرح میں بھی پڑھاؤں تب تو بیشک میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں ورنہ آج کے بعد کسی کو ایک حرف بھی نہ پڑھاؤں گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں۔ آپ پڑھاتے رہیے۔

(حضرت شاہ صاحب اس روایت کو پیش کرکے بظاہر اس آیت کی تفسیر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ قرأت شاذہ اصولاً خبر واحد کا درجہ رکھتی ہے جو خبر واحد کی طرح مضمون آیت کی تفسیر اور اس کا محمل معین کردیتی ہے۔ واللہ اعلم)

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ (تاختم سورہ فتح)

ان آیتوں کی پوری تفسیر اور ان کے متعلق احادیث پہلے گذر چکی ہیں۔ یہاں بطور لطائف قرآنیہ صرف دو روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ زَرْعٍ۔ کی اصل عبد المطلب ہیں۔ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (کا دور) فَاٰزَرَهٗ یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دور فَاسْتَغْلَظَ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور فَاسْتَوٰى حضرت عثمان رضی اللہ کا دور لیغیظ بهم الكفار۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور ہے۔ (باوجودیکہ آپس میں خانہ جنگی ہورہی تھی لیکن تیسری طاقت کے مقابلہ میں اس دور میں بھی یہ سب متحد تھے۔ یہ بات کفار کے لیے غیظ وغضب کا باعث تھی۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اشداء علی الکفار کا مصداق حضرت عمر رضی اللہ عنہ رحماء بینھم کا مصداق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رکعا سجدا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم۔ سیماھم فی وجوھھم۔ الایت۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم

فَاٰزَرَہٗ۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ فَاسْتَغْلَظَ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ وعداللہ الذین امنوا الخ۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

افادات:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما جنازہ پر پہنچے۔ پس قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے میں اپنے حجرہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے رونے کو الگ الگ پہچان رہی تھی (یعنی اتنی آواز سے رو رہے تھے کہ میرے حجرہ تک رونے کی آواز اس طرح پہنچ رہی تھی کہ ہر ایک کی آواز الگ الگ پہنچاننے میں آ رہی تھی) اس گریہ وبکا کا سبب یہ تھا کہ جیسا کہ آیت میں ہے وہ آپس میں ایک دوسرے پر بہت زیادہ مہربان تھے ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ ایسے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا ہوتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رویا نہیں کرتے تھے۔ البتہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غم ہوتا تھا تو آپ ریش مبارک کو پکڑ لیا کرتے تھے۔ (غالباً ہونٹوں سے دبا لیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم)

ذلك مثلھم فی التوارۃ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: منشا یہ ہے کہ ان کی یہ صفات تورات وانجیل میں زمین وآسمان کی پیدائش سے بھی پہلے لکھی ہوئی تھیں (یعنی یہ صفات لوح محفوظ میں مکتوب تھیں) حضرت عمار رضی اللہ عنہ مولی بنی ہاشم سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے تقدیر کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا تقدیر کو برحق ماننے کے لیے سورہ فتح کی آخری آیات کافی ہیں جن میں صحابہ کرام کی صفات بیان کی گئی ہیں (یعنی محمد رسول اللہ سے آخر تک) کیونکہ یہ تمثیل اللہ تعالٰی کے علم ازلی میں زمین وآسمان کی پیدائش سے بھی پہلے سے تھی۔

غزوۂ خیبر

فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (سورہ فتح)

یہ غزوہ کیا تھا وعدہ خداوندی کی تکمیل تھا۔ ایثار و فدائیت کے وہ مقدس پیکر جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر اس بے نظیر گرویدگی اور فدائیت کا ثبوت دیا تھا کہ مکہ کے فرعون منش سرداران کے جذبہ ایثار کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی کا احسان تھا کہ اس نے مکہ کے جنگجو قریش کو جس نے (احابیش) اپنے حلیف قبائل کے بہادروں کو بھی مکہ میں جمع کر کے ایسی طاقت بنالی تھی کہ اگر ارادہ خداوندی حائل نہ ہوتا تو ان چودہ سو بے وطن نہتوں کو اس طرح پیس سکتے تھے کہ کہیں ان کی ہڈیوں کے ریزے بھی نظر نہ آتے۔ ان خونخوار دشمنوں کو اس موقع پر اقدام جنگ سے باز رکھنا بیشک اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا لیکن اس فضل و کرم کا محرک بھی جذبہ ایثار اور شمع محمدی کے ان پروانوں کی وہ گرویدگی اور ان کا وہ صبر و استقلال تھا جس نے عروہ بن مسعود ثقفی جیسے جہاں دیدہ کو بھی اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ قریش کے بھرے مجمع میں کھلے بندوں اظہار کرے۔

> میں نے قیصر و کسریٰ کی شاہانہ شان و شوکت دیکھی ہے، میں نے نجاشی کا دربار بھی دیکھا ہے۔ مگر قسم رب کعبہ کی جو عقیدت اور فدائیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں دیکھی ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ تم کتنے ہی بہادر سہی۔ بیشک تم مسلح ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی نہتے مگر تمہاری بہادری اور جنگی تیاری جاں نثاران محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فدائیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

بہر حال اس ایثار اور اس صبر و استقلال پر ان کے لیے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا گیا تھا۔ جن میں سے ایک غنیمت فی الحال حاصل ہونے والی تھی۔ یہ اموال خیبر کی غنیمت تھی۔ جس کے متعلق یہ تصریح فرمادی گئی تھی کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے صرف وہی جائیں گے جو سفر حدیبیہ میں ہمرکاب تھے جنہوں نے درخت کے نیچے سردار دو جہاں ﷺ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا تھا کہ قربان ہو جائیں گے مگر میدان سے نہ ہٹیں گے۔

لیکن اسلام جس کی حقیقت ہی گردن نہادن اور جاں سپاری ہے اس کے ماحول میں وعدہ خداوندی اور منصوبہ قدرت کے ظہور کے لیے بھی ضروری ہے کہ مجاہدانہ عزم و ہمت اور سرفروشانہ جدوجہد سے اس کا استقبال کیا جائے۔ چنانچہ حدیبیہ سے واپس ہو کر کچھ عرصہ مدینہ منورہ میں قیام فرمایا گیا۔ اور جب امام الانبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کا لقب پانے والا ان چودہ سو جانبازوں کو لے کر خیبر پہونچا۔ تو وہاں تقریباً بیس ہزار مسلح جوان چھ قلعوں میں آمادہ جنگ تھے۔ جن کو شکست دینے کے بعد وعدہ خداوندی کا ظہور ہو سکتا تھا۔

مقابلے ہوئے نصرت خداوندی ان چودہ سو مجاہدین با اخلاص کی پشت پناہ تھی۔ یکے بعد دیگرے سب قلعے فتح ہو گئے لیکن قلعہ قموص باقی رہ گیا۔ جو سب سے زیادہ مضبوط تھا اور عرب کا مشہور پہلوان مرحب جو ہزار سوار

کے برابر مانا جاتا تھا اس قلعہ کا رئیس تھا۔ تقریباً دو ہفتہ اس قلعہ کا محاصرہ رہا۔ اس پر بار بار حملہ کیا گیا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر غیرت حق کو جنبش ہوئی۔ ایک دن شام کو پیغمبر حق نے ارشاد فرمایا:

''کل میں علم اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح عنایت فرمائے گا۔ یہ شخص خدا اور خدا کے رسول کو چاہتا ہے اور خدا اور خدا کے رسول بھی اس کو چاہتے ہیں۔''

(بخاری شریف)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قابل فخر کارنامہ:

یہ رات نہایت امید اور اضطراب کی رات تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم منتظر تھے کہ کون خوش قسمت ہے جس کو یہ تاج فخر پہنایا جائے گا۔ صبح کو دفعتہً یہ آواز گوش نواز ہوئی: علی کہاں ہیں؟ یہ آواز غیر متوقع تھی کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آشوب تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں لیکن جس کے متعلق خود قرآن حکیم کی تصریح ہے۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (مسلمانوں کا خود اپنی جانوں پر اتنا حق نہیں ہے جتنا حق ان پر نبی کا ہے۔ تو اس کی نداء برحق کے بعد کیا موقع تھا کہ ''جان حزیں'' کسی بیماری کا کوئی عذر پیش کر سکے، سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب دہن کو طوطیا ر چشم بنایا۔ حضرت علی کی چشم بیمار میں سچے موتیوں کا نکھار پیدا ہو گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیا اور دعا فرمائی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قابل فخر جھنڈے کا پھریرا اڑاتے ہوئے قلعہ پر حملہ آور ہوئے۔ مرحب قلعہ سے گرجتا ہوا نکلا:

قد علمت خیبر انی مرحب　　　شاکی السلاح بطل مجرب

خیبر خوب جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں
سلاح پوش ہوں دلیر ہوں تجربہ کار ہوں

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کلہ بکلہ جواب دینے کے لیے تیار تھے۔ آپ نے یہ رجز پڑھا:

انا الذی سمتنی امی حیدرہ　　　کلیث غابات کریہ المنظرہ

میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا
میں شیر نیستاں کی طرح دہشت انگیز صورت رکھتا ہوں

فخریہ ترانہ کے بعد مقابلہ ہوا تو تلوار حیدری ایک ہی وار میں مرحب کے سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک پہنچ گئی۔ ایک مرحب کا مارا جانا ایک ہزار کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے برابر تھا۔ دشمنوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اب ان کے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ یہ تھا اللہ تعالیٰ کے اس منصوبہ کا ظہور:

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ

''اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت سی نعمتوں کا وعدہ کیا ہے فی الحال اس نے تم کو یہ غنیمت عطا کر دی ہے۔''

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ لیکن یہود نے درخواست کی کہ کاشت کا حق ہمیں دیا جائے ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کرتے رہیں گے۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ یہ آمدنی سال بہ سال مدینہ پہنچ کر ان مجاہدین میں تقسیم ہونے لگی۔

اضافہ از محمد میاں

فتح مکہ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک رزمیہ ترانے کی آواز سمع مبارک میں گونجنے لگی۔ پہلا شعر یہ تھا:

یارب انی ناشد محمدا حلف ابینا وابیہ الا تلدا

اے اللہ میں یاد دلا رہا ہوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پرانا معاہدہ جو ہمارے اور ان کے آباؤ اجداد (۹۱۹) میں ہوا تھا۔

مجمع سامنے آیا، معلوم ہوا قبیلہ خزاعہ کے چالیس ناقہ سوار فریاد لے کر آئے ہیں، عمرو بن سالم ان کا قائد ہے۔ یہ سوار خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اشعار میں سرگذشت بیان کرتے ہوئے اپنی درخواست پیش کی۔ اس منظوم درخواست کے باقی اشعار یہ ہیں:

قد کنتم ولدا وکنا والدا ثمت اسلمنا ولم ننزع یدا

ہم بمنزلہ باپ کے اور آپ بمنزلہ اولاد کے۔ (لہٰذا ہماری نصرت اور اعانت آپ پر لازم ہے) اس کے علاوہ یہ کہ ہم ہمیشہ آپ کی بات مانتے رہے ہیں کبھی آپ کی مدد سے دست کش نہیں ہوئے۔

فانصر ھداك اللہ نصرا اعتدا وادع عباد اللہ یاتوك مددا

پس ہماری فوری مدد فرمایئے اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت کرے (صحیح کاموں کی توفیق بخشے) اور اللہ کے خاص بندوں کو پکاریئے وہ آپ کی کمک کو آئیں گے۔

فیھم رسول اللہ قد تجردا ان سیم خسفا وجھہ تربدا

ان میں اللہ کے رسول بھی ہیں جو اپنے کمالات میں منفرد ہیں (جن کی شان یہ ہے کہ وہ کوئی ذلت اور خواری برداشت نہیں کر سکتے) اگر ذلیل کرنے کا قصد کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے انور غیرت وحمیت سے تمتما جاتا ہے۔

فی فیلق کالجریجری مزبدا

ایسے لشکر ساتھ لے کر آئے جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہو۔

ان قریشا اخلفوك الموعدا ونقضوا میثاقك الموکدا

یہ درخواست اس لیے کی جا رہی ہے کہ قریش نے آپ سے وعدہ خلافی کی اور توڑ ڈالا

آپ کے عہد کو جو بہت پختگی سے کیا گیا تھا۔

وجعلوا لی فی کداء رصدا

اور مقام کداء میں آدمیوں کو میری تاک میں بٹھا دیا۔

وزعموا ان لست ادعوا احدا وھم اذل واقل عددا

اور ان کا گمان یہ تھا کہ میں کسی کو مدد کے لیے نہیں بلاؤں گا اور وہ سب (ہم لوگ) ذلیل ہیں اور شمار میں بہت کم ہیں۔

ھم بیتونا بالوتیر مجدا

ان لوگوں نے ہم سب پر شبخون مارا جب ہم چشمہ وتیر پر سو رہے تھے۔ (۹۲۰)

وقتلونا رکعا سجدا

اور ہم کو قتل کیا جب (حرم مکہ میں اپنے مسلک کے بموجب) رکوع اور سجدے کر رہے تھے۔

واقعہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے آپ حدیبیہ کے صلح نامہ پر نظر ڈالیے، اس صلح نامہ کی رو سے قبائل کو اختیار تھا کہ وہ جس فریق سے چاہیں معاہدہ کر لیں اور اس کے حلیف بن جائیں چنانچہ بنو بکر نے قریش سے معاہدہ کیا اور بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے۔ بنو بکر اور بنو خزاعہ میں مدت سے کشیدگی چلی آ رہی تھی۔ آخری واقعہ یہ تھا کہ بنو بکر نے بنو خزاعہ کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا تو اس کے انتقام میں بنو خزاعہ نے موقع پا کر بنو بکر کے تین آدمی قتل کر دیئے تھے۔ بنو بکر اپنے تینوں مقتولوں کا قصاص نہیں لینے پائے تھے کہ قریش نے قبائل عرب کو اسلام کے خلاف متحد کرنا شروع کر دیا۔ صلح حدیبیہ کے باعث جب اس اتحاد میں رخنہ پڑا کہ کچھ قبائل مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے اور کچھ قریش کے ساتھ تو پرانی عداوتیں پھر رنگ لانے لگیں۔ بنو بکر کے سر پر اپنے مقتولین کے انتقام کا جنون سوار ہوا۔ قریش نے ان کو اسلحہ کی مدد دی۔ بنو بکر نے آگے بڑھ کر بنو خزاعہ پر شبخون مارا۔ کچھ لوگ پانی کے چشمہ پر جس کا نام وتیر تھا سو رہے تھے وہاں ان کو قتل کیا۔ قبیلہ کے لوگوں نے بھاگ کر حرم کعبہ میں پناہ لی۔ مگر ان کو وہاں بھی قتل کیا گیا۔ یہ مظلوم جب الھك الھك (اپنے خدا کے واسطے اپنے خدا کے واسطے) کہہ کر رحم کی درخواست کرتے تو یہ ظالم ان کے جواب میں کہتے تھے لا الہ الیوم (آج کوئی خدا نہیں) (۹۲۱) اسلحہ سے جو مدد دی تھی اس کے علاوہ اس موقع پر بھی اپنے چہروں کو نقاب (ڈھانٹوں) سے چھپا کر بنو بکر کی مدد کی۔ مکہ میں بنو خزاعہ کے ایک سردار بدیل بن ورقاء کی حویلی تھی، خزاعہ کے کچھ لوگوں نے وہاں پناہ لی مگر بنو بکر اور قریش کے رؤسا اس حویلی میں گھس گئے پناہ گزینوں کو قتل کر کے جو کچھ ان کے پاس تھا لوٹ لیا۔ (۹۲۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات سنے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت رنج ہوا۔ آپ نے وفد کو

اطمینان دلایا اور قریش کے پاس پیغام بھیجا کہ:

(۱) مقتولین کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش بنوبکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

(۳) ورنہ اعلان کر دیں کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قریش نے جب بنوبکر کی مدد کر کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی تو وہ اس کے نتائج سے ناواقف نہ تھے۔ چنانچہ اس پیغام کے جواب میں قریش کی طرف سے قرطہ بن عمرو نے جواب دیا کہ تیسری بات منظور ہے۔ ہم معاہدہ حدیبیہ کے فسخ کرنے پر راضی ہیں۔ (۹۲۳) لیکن قاصد کے چلے آنے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی انہوں نے ابوسفیان کو تجدید معاہدہ کے لیے مدینہ بھیجا۔ ابوسفیان نے مدینہ پہنچ کر بارگاہ رسالت میں درخواست پیش کی۔ وہاں سے کچھ جواب نہ ملا تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہما) کو واسطہ بنانا چاہا لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ دھرے۔ ہر طرف سے مجبور ہو کر سیدہ فاطمہ زہرا (رضی اللہ عنہا) کے پاس آیا۔ سیّدنا امام حسن (رضی اللہ عنہ) پانچ برس کے تھے۔ ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں مصالحت کرا دی تو آج سے عرب کا سردار مانا جائے گا۔ جناب سیّدہ نے فرمایا۔ بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل۔ بالآخر ابوسفیان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایما سے مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔

ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا کہ یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں نہ اعلان جنگ ہے کہ لڑائی کی تیاری کریں۔ (۹۲۴)

احترام معاہدہ اور مظلوموں کی فریاد رسی کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اگر چشم پوشی کی جائے تو قریش اور حامیان قریش کی دست درازی سے دوسرے قبائل بھی محفوظ نہیں رہ سکتے جو مسلمانوں کے حلیف ہیں۔ پس معاہدہ کی پابندی، فریق مظلوم کی دادرسی اور اپنے حلیف (دوست دار) قبائل کی آئندہ حفاظت کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کا عزم فرمالیا۔ اس کی تشہیر کو مناسب نہیں سمجھا۔ راز داری کے ساتھ تیاری کی گئی اور احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ پہنچنے پائے۔ (۹۲۵)

ایک سبق آموز واقعہ:

لسان رسالت سے حکم صادر ہوا: علی، زبیر اور مقداد رضی اللہ عنہ خاخ کے باغ میں پہنچیں۔ وہاں ایک شتر سوار عورت ملے گی اس کے پاس ایک خط ہوگا وہ خط چھین لائیں۔

ارشاد گرامی کی فوراً تعمیل ہوئی۔ خاخ مدینہ سے تقریباً بارہ (۹۲۶) میل تھا۔ تینوں حضرات گھوڑے دوڑاتے ہوئے پہنچے۔ وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشان دہی کے بموجب عورت ملی۔ انہوں نے عورت سے خط

مانگا۔ اس نے اول انکار کیا۔ جب ان مجاہدین نے زیادہ زور ڈالا اور برہنہ کر کے تلاشی لینے کی دھمکی دی تو چوٹی میں سے خط نکال کر ان حضرات کے حوالے کیا۔

یہ حضرات خط لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی تھے غزوہ بدر میں شرکت کا شرف حاصل کیے ہوئے تھے۔ یہ خط انہیں حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی طرف سے مکہ کے چند سرداروں کے نام تھا۔ اس میں یہاں کے حالات کی ایک جھلک تھی۔ [۹۲۷] خط سامنے آیا تو سب کو تعجب ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بے تاب ہو گئے۔ عرض کیا اجازت ہو تو اس منافق کی گردن اڑا دوں۔

یہ سب کچھ تھا۔ مگر جبین رحمت پر شکن نہیں تھی۔ نہایت بردباری کے ساتھ ارشاد ہوا:

یا حاطب۔ ماھذا؟ حاطب یہ کیا؟

حضرت حاطب بن بلتعہ: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے صفائی پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔

یہ درست ہے بہت سے مہاجر بھائیوں کے عزیز وقریب مکہ میں ہیں۔ مگر یہ قریشی ہیں۔ قریش سے ان کی بھی رشتہ داری اور ان کے ان اعزاء واقارب کی بھی رشتہ داری ہے جو مکہ میں ہیں۔ کوئی نازک وقت ہو تو یہ خطرہ نہیں کہ قریش ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ مگر میرا معاملہ یہ ہے کہ میں قریشی نہیں ہوں میں حلیف کی حیثیت سے قریش کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے رشتہ دار جو مکہ میں ہیں وہ بے یارو مددگار ہیں۔ ان کا کوئی عزیز وقریب مکہ میں نہیں ہے۔ قریش سے ان کی رشتہ داری نہیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں قریش پر کوئی احسان کروں تا کہ آڑے وقت میں وہ میرے رشتہ داروں کو ایذا نہ پہنچائیں۔ خدا جانتا ہے نہ کفر نہ نفاق نہ عظمت اسلام کے اعتراف سے انحراف ہے۔ صرف اتنی غرض تھی جس کی وجہ سے یہ حرکت کر بیٹھا۔

لسان نبوت سے صادر ہوا۔ انه قد صدقکم بے شک حاطب نے تم سے سچی بات کہہ دی۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

یہ بدری ہیں اور تمہیں کیا معلوم اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو خطاب کر کے فرمادیا:

اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم [۹۲۸]

”جو چاہو کرو میں تمہیں بخش چکا ہوں“ [۹۲۹]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے اہل بدر کا مرتبہ عالی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا تو ان پر رقت طاری ہوگئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور عرض کیا۔ اللّٰہ ورسوله اعلم۔ [۹۳۰]

روانگی:

غرض۔ [۹۳۱] ۱۰ رمضان المبارک ۸ ھ کو دس ہزار حق پرست وخدا شناس مجاہدین کا باوقار لشکر سید الکونین

رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرقیادت مدینہ طیبہ سے روانہ ہوا۔ ابھی چند میل طے کیے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ سامنے آ گئے۔ یہ مع اہل وعیال مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ جا رہے تھے۔ یہ اگرچہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار رہے تھے۔ (۹۳۲)

یہ بھی روایت ہے کہ آپ مسلمان ہو چکے تھے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء کے بموجب ایمان کو چھپائے ہوئے مکہ میں مقیم تھے۔ یہ آپ کی خوش قسمتی تھی کہ ابھی دار ہجرت (مدینہ طیبہ) نہیں پہنچے تھے کہ غزوہ فتح کے لیے کوچ شروع ہو گیا۔ آپ نے موقع غنیمت جانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ایماء پایا۔ آپ فوج میں شامل ہو کر ہمرکاب آقاءِ دوجہاں ہو گئے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور متعلقین اور سامان کو مدینہ بھیج دیا۔

مرالظہران میں قیام:

یہ مقام مکہ معظمہ سے تقریباً ایک منزل ہے۔ اس قدوسی لشکر نے یہاں پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ دس ہزار مجاہدین کے خیمے پوری وادی میں پھیل گئے اور جب رات کے وقت خیموں کے سامنے الاؤ جلائے گئے تو گویا ایک روشن شہر آباد ہو گیا۔

جس رازداری کے ساتھ یہ سفر کیا گیا اس کی کامیابی یہ تھی کہ قریش اب تک بے خبر تھے۔ کچھ سرداروں کے کانوں میں بھنک پڑی تھی کہ ایک بہت بڑی فوج آ رہی ہے۔ اسی بھنک کی چھان بین کے لیے خفیہ طور (۹۳۳) سے قریش کے چند سربراہ ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء مکہ سے چلے تھے اور اتفاق سے یہاں پہنچ گئے تھے اور اس لمبے چوڑے میدان کو جو میلوں میں پھیلا ہوا تھا جگمگاتا دیکھا تو حیران رہ گئے۔

یہ گمان بھی نہیں ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کی یہ شان وشوکت ہے جن کو چند سال پہلے مکہ سے نکالا تھا۔ خزاعہ وغیرہ قبائل کی طرف خیالات دوڑنے لگے۔ بدیل بن ورقاء نے کہا۔ یہ قبیلہ خزاعہ کا لشکر ہے۔ ابوسفیان نے تردید کی کہ ان کی تعداد اتنی کہاں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مجاہدین کا حفاظتی دستہ گشت کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا اور اس نے ان تینوں کو گرفتار کر لیا۔ تب انہیں معلوم ہوا کہ لشکر کن کا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس محافظ دستہ میں نہیں تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر پر سوار ہو کر نکلے تھے کہ کوئی مناسب آدمی مل جائے تو مکہ والوں کو پیغام پہنچا دیں کہ مصلحت یہی ہے کہ امان مانگ لیں جنگ ہوئی تو وہ تباہ ہو جائیں گے۔ ابوسفیان کی آواز حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے کان میں پڑی تو وہ بھی یہاں پہنچ گئے۔

اب ان نظربندوں کو بارگاہ رسالت میں پیش کرنے کے لیے لے جانے لگے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ

نے مناسب سمجھا کہ ابوسفیان کو لشکر کا گشت کرا دیں تا کہ وہ آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اسلام کس طرح قبائل عرب کو فتح کر چکا ہے اور اب ان کے لیے بہتر کیا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کو اپنے ہی خچر پر بٹھا لیا اور قبائل کے خیموں کا گشت کرانے لگے۔ جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے خیمہ پر پہنچے اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی نظر ابوسفیان پر پڑی تو آپ تلوار لے کر لپکے کہ دشمن اسلام ابوسفیان کو اس سے پہلے ختم کر دیں کہ وہ بارگاہ رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچ کر پروانہ امن حاصل کر سکے۔ مگر حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی غافل نہیں تھے انہوں نے خچر کو تیز کر دیا اور ابوسفیان کو لیے ہوئے خیمہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچ گئے۔ پیچھے پیچھے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ بھی پہنچے اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اصرار تھا کہ اس فتنہ مجسم کے بوجھ سے زمین کو ہلکا کر دیں لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو پناہ دے چکے تھے۔ دونوں میں گفتگو ہوئی۔ تیز تیز باتیں بھی ہوئیں مگر جان بخشی اور پناہ کی جو دیوار پختہ ہو چکی تھی وہ منہدم نہیں ہوئی۔

یہ بحث ختم ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ابوسفیان کو اپنے خیمہ میں لے جائیں اور صبح کو اپنے ساتھ لائیں۔ حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء جو پہلے ہی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ عاطفت میں پہنچ چکے تھے اسلام سے مشرف ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مکہ کے حالات دریافت کیے۔ پھر یہ اجازت لے کر رات ہی کو مکہ واپس ہو گئے تا کہ اہل مکہ کو صورت حال سے آگاہ اور ان کو پر امن رہنے کی ہدایت کر دیں۔

صبح ہوئی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو لے کر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے۔ ابوسفیان کو اپنے تمام کارنامے یقیناً یاد ہوں گے۔ اسلام کی بیخ کنی کی مسلسل کوشش، مدینہ پر بار بار حملے، قبائل عرب کو مشتعل کرنا، پھر ان سب کو لے کر مدینہ پر چڑھائی کرنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرانے کی خفیہ سازش وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک جرم ابوسفیان کے خون کا مطالبہ کر رہا تھا۔ لیکن ابوسفیان مطمئن تھا کہ وہ اس صادق وامین کے حضور میں حاضر ہے جس کی نظر رحمت اثر میں کسی بھی مسلمان کی زبان کا لفظ پناہ وہ حصار ہے جس کو توڑا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ ان سنگین جرائم میں کسی جرم کے تذکرہ کے بجائے لسان رحمت سے صادر ہوا۔ یا اباسفیان الم یان لک ان تعلم ان لا اله الاالله (۹۳۴) (ابوسفیان کیا تمہیں اب تک یقین نہیں ہوا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے)

ابوسفیان: کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کیا اس میں شک ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ ابوسفیان: بلا شبہ میں آپ کے حلم وکرم، عفو ودرگذر، حسن سلوک اور آپ کی صداقت وعفت کا قائل ہوں آپ کے مکارم اخلاق کو تسلیم کرتا ہوں مگر آپ کی رسالت کے متعلق ذہن صاف نہیں ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اشارہ کیا کہ اس وقت اس بحث کا موقع نہیں ہے کلمہ شہادت پڑھ لو۔ ورنہ تباہی ہی تباہی ہے۔

ابوسفیان کو بھی احساس ہوا: اس نے اعتراف کیا۔

اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه وَاَشهد اَنَّ مُحَمَّدًا عبده ورسوله

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی طرح اور بھی تھے کہ اس ہنگامی حالت میں ان کا ذہن صاف نہیں تھا۔ مگر رعب داب یا ڈرانے دھمکانے سے کسی کا ذہن صاف نہیں ہوسکتا تھا نہ یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ بلکہ تالیف قلب اور مانوس کرنے کا نسخہ استعمال کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی دو تین ہفتہ کی مدت میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ اور اطراف مکہ میں تشریف فرما رہے۔ ذہنوں کی اُلجھنیں جاتی رہیں اور یہ مولفتہ القلوب۔ کامل الایمان [(۹۳۵)] ہو گئے پھر وہ کارنامے انجام دیئے جن سے تاریخ اسلام روشن ہے۔

یہ تالیف قلب اور مانوس کرنے کی پہلی صورت یہ تھی کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سفارش کی کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ شہرت وعزت کے آدمی ہیں کوئی ایسی صورت تجویز فرما دی جائے کہ ان کی عزت قائم رہے ارشاد ہوا: اعلان کر دیا جائے کہ ان کی حویلی پناہ گاہ ہوگی۔ جو ابوسفیان کی حویلی میں پہنچ جائے اس کو پناہ۔ [(۹۳۶)]

مرالظہران سے روانگی:

مکہ کی طرف روانگی شروع ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو تاکہ جنود اللہ (مجاہدین حق پرست وخدا شناس کے لشکر) کی شان وشوکت یہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

الگ الگ قبیلوں کی فوجیں تھیں، ان کے علم تھے، علمبردار تھے۔ یہ فوجیں یکے بعد دیگرے گذرنے لگیں ابوسفیان رضی اللہ عنہ [(۹۳۷)] نے سرزمین عرب میں ایسا نظام کب دیکھا تھا۔ اس نے متاثر ہو کر حضرت عباس سے کہا۔

یا ابا الفضل لقد اصبح ملك ابن اخيك اليوم عظيما

ابوالفضل (حضرت عباس کی کنیت) تمہارے برادرزادہ کی سلطنت بہت بڑھ گئی ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فوراً ٹوکا سلطنت نہیں۔ نبوت ہے (یعنی سیاسی اقتدار اور جبر وقہر نے یہ نظام قائم نہیں کیا (جو سلطنت کی خصوصیت ہے) بلکہ پیغمبرانہ صداقت، دیانت وامانت اور اعلیٰ اخلاق نے دلوں کو رام کیا ہے پھر دعوت الی اللہ کے نصب العین پر سب کو متحد کر کے ایثار وفدائیت کا یہ نظام بنایا ہے۔ جس کا مقصد ذاتی، خاندانی یا قومی اقتدار نہیں بلکہ اس کا مقصد ہے خدا شناسی، خدا پرستی، خدمت خلق، اعلاء کلمۃ الحق اور اس پر اپنی جان [(۹۳۸)] قربان کرنا۔

مثالی ضبط ونظم:

ایک بڑی فوج اپنی نرالی شان کے ساتھ سامنے سے گذری۔ یہ حضرات انصار رضی اللہ عنہم کی فوج تھی۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ قبیلہ خزرج کے سردار اس کے علمبردار تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی نظر جیسے

ہی ابوسفیان پر پڑی فرط جوش سے پکار اٹھے۔ الیوم یوم الملحمۃ۔ آج گھمسان کا دن ہے الیوم تستحل الکعبۃ آج کعبہ کی حرمت (۹۳۹) پامال کی جائے گی۔

آخر میں ایک دستہ سامنے آیا۔ یہ سب سے چھوٹا دستہ تھا مگر ایسا دستہ تھا کہ اس کے سنجیدہ وقار سے دلوں پر ہیبت طاری ہوتی تھی ساتھ ہی اس کے نور تقدس سے ضمیر روشن ہوتے تھے۔ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چند رفقاء اس دستہ میں تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص جھنڈا اس دستہ کے ساتھ تھا۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اس کے علمبردار تھے۔

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی نظر چہرہ انور پر پڑی تو پکار اٹھے۔ حضور نے سنا! سعد بن عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے ہیں پھر سعد کا مقولہ نقل کیا۔ ارشاد ہوا: سعد نے غلط کہا ہے۔ آج خانہ کعبہ کی بے حرمتی نہیں ہوگی۔ بلکہ آج کا دن وہ دن ہے کہ اللہ تعالیٰ کعبہ کی عظمت بڑھائے گا اور وہ دن ہے کہ خانہ کعبہ کو غلاف (۹۴۰) پہنایا جائے گا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا: جھنڈا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے لے لیا جائے۔ پھر حکم ہوا: جھنڈا سعد کے فرزند (۹۴۱) قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو دیدیا (۹۴۲) جائے۔

اس مشاہدہ کے بعد ابوسفیان رضی اللہ عنہ تیزی سے مکہ معظمہ پہنچا اور اعلان کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت بڑا لشکر لے کر آ رہے ہیں۔ کسی کی طاقت نہیں کہ مقابلہ کر سکے۔ اسلام لے آ ؤ۔ سلامت رہو گے ابوسفیان کی بیوی ہندا بھی اسی ترنگ میں تھی وہ ابوسفیان کا اعلان سن کر بھڑک اٹھی۔ غصہ میں ابوسفیان کی مونچھیں نوچ لیں اور چلا کر کہا یہ بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔ کوئی اس کی بات نہ مانے۔ ابوسفیان نے کہ بی بی خیریت اسی میں ہے ورنہ تباہ ہو جائے گی۔ گھر میں جا دروازہ بند کر کے بیٹھ جا۔ بہر حال لوگوں نے اس اعلان پر تیزی سے عمل کیا۔ اپنے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے یا حرم شریف کی طرف دوڑ گئے۔

مکہ معظّمہ میں داخلہ، اعلان امن اور فرمان عفو:

پھر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا کہ مکہ کی بالائی جانب سے داخل ہوں اور مقام حجون پر جھنڈا نصب کر دیں اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دوسری جانب (مکہ کی نشیبی جانب) سے داخلہ کا حکم ہوا اور اعلان کر دیا گیا۔

جو شخص (۹۴۳) ہتھیار ڈال دے اس کو پناہ۔
جو شخص (۹۴۴) اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے۔
جو ابوسفیان کی حویلی میں پہنچ جائے۔
جو حکیم بن حزام کے مکان میں پناہ لے لے۔
جو حرم شریف میں پناہ لے لے وہ محفوظ۔

آج رمضان المبارک کی بیس ہے۔ پیر کا دن، امن پناہ اور حفاظت جان و مال کے اعلان کے ساتھ مجاہدین تقدس مآب کا مکہ میں فاتحانہ داخلہ ہو رہا ہے۔ لوگ اطمینان کا سانس لے رہے ہیں۔ صرف ایک جانب کچھ شورہ پشت حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کے مقابلہ پر آئے۔ دو مسلمانوں (حضرت کرز بن جابر فہری اور حضرت حبش بن اشعر رضی اللہ عنہما) کو شہید کر دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے دستہ نے جواب دیا تو ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

یہ افواج مجاہدین کا داخلہ تھا اور خود سرور کائنات وارث ابراہیم خلیل اللہ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰت والتسلیمات کے داخلہ کی شان یہ تھی کہ ناقہ پر سوار اسامہ بن زید (یعنی آزاد کردہ غلام کے نوجوان فرزند) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ردیف، سر پر سیاہ عمامہ اور زبان، مبارک پر سورہ انا فتحنا جو رقت انگیز انداز سے تلاوت فرما رہے تھے خشوع وخضوع کا یہ عالم کہ سر مبارک جھکتے جھکتے ہودج کے کنارہ سے لگ گیا تھا۔ یہی پالان کا کنارہ سجدہ گاہ بنا ہوا تھا۔ جبین نبوت اس پر سجدہ ریز تھی۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

قیام گاہ، غسل اور نماز فتح:

ارشاد ہوا، شعب ابی طالب میں قیام کا انتظام کیا جائے۔ وہاں سرخ چمڑے کا خیمہ نصب کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں رونق افروز ہوئے تو پہلے غسل فرمایا۔ پھر آٹھ رکعتیں (۹۴۵) پڑھیں۔ یہ چاشت (۹۴۶) کا وقت تھا (تقریباً ۱۱ بجے دن)۔

مسجد حرام میں داخلہ:

مجاہدین کرام کے مختلف دستے جو مختلف سمتوں سے داخل ہوئے تھے جب حرم شریف کے قریب پہنچ چکے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تشریف لے گئے یہاں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔

محمد رسول اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیح وارث اور قرآن پاک کے الفاظ میں اولی الناس بابراھیم تھے (تمام انسانوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قریب تر) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو حکم ہوا تھا۔ طھر بیتی (پاک کر میرے گھر کو) دور محمدی میں اس کی تعمیل آپ پر فرض تھی۔ حرم بیت اللہ میں داخل ہو کر سب سے پہلے آپ نے اسی فرض کو انجام دیا۔

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

دست مبارک میں کمان تھی اور زبان مبارک پر تھا۔

(آیا حق اور نابود ہو گیا باطل بے شک باطل نابود ہونے کے لیے ہی ہے)

یہ نابود ہونے اور مٹنے والا باطل اس درجہ کمزور ہو چکا تھا کہ نوک کمان کی معمولی ٹھونگ سے بڑے سے بڑا بت زمین پر اوندھا ہو رہا تھا۔

دیواروں میں جو تصویریں نقش تھیں ان کو آپ نے کھرچوا دیا۔ پھر آپ نے زمزم سے دیواریں دھلوائیں۔

جو مجسمے بیت اللہ میں تھے ان کو نکالا گیا تو ان میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے اور حضرت مریم علیہا السلام کے نام کے مجسمے بھی تھے کچھ فرشتوں کی مورتیاں تھیں۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے نام کے جو مجسمے تھے ان کے ہاتھ میں وہ تیر تھے جو فال نکالنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "خدا لعنت کرے ان افترا پردازوں پر وہ جانتے تھے کہ ان مقدسین نے کبھی فال نہیں نکالا۔"(۹۴۷)

خانہ کعبہ کے اندر دوگانہ:

خانہ کعبہ آلائش شرک سے پاک ہو چکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے اندر تشریف لائے اور دو رکعت پڑھ کر پرستش خدائے واحد کے ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو از سرنو جوڑا۔ کعبہ کے گوشوں میں تسبیح وتہلیل اور حمد و تکبیر پڑھ کر فضاء کعبہ کو ہم ساز تسبیح ملائک بنایا(۹۴۸) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دروازہ کھول کر باہر تشریف لائے تو اتنے وقفہ میں حرم کعبہ اہل مکہ سے کھچا کھچ بھر چکا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باب کعبہ کے دونوں چوکھٹوں پر ہاتھ رکھ کر خطبہ ارشاد فرمایا یہ اس خدا پرست فاتح کا خطبہ تھا جو انسان کو آداب انسانیت سکھانے آیا تھا اور جس نے خاص حالات سے متاثر ہو کر مکہ پر لشکر کشی کی تھی اب وہ داستان ماضی پر خاتمہ کی مہر لگا کر مستقبل کے متعلق چند بنیادی اصول کا اعلان کر رہا تھا۔

باب کعبہ پر خطبہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۱) لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك له صدق وعدہ ونصر عبدہ وهزم الاحزاب وحدہ۔

(۲) الا کل ماثرة او دم او مال یدعی فهو موضوع تحت قدمی هاتین الا سدانة البیت وسقایة الحاج۔

(۳) الا وقتیل الخطاء وشبه العمد بالسوط والعصا— ففیه الدیة المغلظة مائة من الابل اربعون منها ما فی بطونها اولادها۔

(۴) یا معشر قریش ان اللہ قد اذهب عنکم نخوة الجاهلیة وتعظیمها بالاباء الناس من ادم و ادم من تراب۔

(۵) یا ایها الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی۔ الآیة(۹۴۹)

ترجمہ: (۱) نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ تنہا اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس خدائے واحد نے

اپنا وعدہ پورا فرمایا اپنے بندے کی مدد کی اور اس نے تن تنہا تمام جماعتوں کو شکست دیدی۔

(۲) ہر ایک (۹۵۰) رسم وریت۔ کسی بھی خون یا مال کا مطالبہ جو روایتی طور پر چلا آ رہا تھا۔ آج وہ سب میرے ان پیروں کے نیچے ہے (سب ختم ہے) مگر سدانة البیت (بیت اللہ کی دربانی اور کلید برداری) اور سقایة الحاج (حاجیوں کے پانی کا انتظام) یعنی پرانی رسم وریت اور پرانے رواج کے یہ دو منصب باقی رہیں گے)۔

(۳) یہ بھی سن لو۔ کوئی شخص غلطی (۹۵۱) سے مارا جائے یا کوڑے یا لاٹھی کی ضرب سے کسی کی موت ہو جائے جس کو شبہ عمد کہا جاتا ہے اس صورت میں دیت مغلظہ ہو گی۔ یعنی سو اونٹ جن میں سے چالیس حاملہ اونٹنیاں ہوں گی۔

(۴) اے قوم قریش۔ اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کا جو غرور تمہارے اندر تھا کہ ہم سب سے اونچے ہیں اور زمانہ جاہلیت کی یہ نخوت کہ باپ دادا کی عظمت کی بنا پر اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں ختم کر دی ہیں۔ اب ایک ہی حقیقت تسلیم کی جائے گی کہ تمام انسان آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے۔

(۵) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اے لوگو ہم نے تم کو پیدا کیا ایک مرد اور عورت سے اور رکھ دیئے تمہارے قبیلے اور گوت (خاندان) کہ آپس میں پہچان ہو۔ اللہ کے یہاں مرتبہ اس کا بڑا ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھا ہوا ہے (سب سے زیادہ خدا شناس وخدا ترس ہے)

عام معافی، سب کچھ فراموش:

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع پر نظر ڈالی۔ یہ مجمع انہیں مجرمین کا تھا جو تقریباً بیس سال سے اسلام کی بیخ کنی میں برابر سرگرم رہے تھے۔ جنہوں نے اسلام کا نام لینے والوں اور خود ذات اقدس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح کے ظلم وستم کا تختہ مشق بنایا تھا۔ اب یہ محصور تھے ایک لشکر جرار کے شکنجہ میں کسے ہوئے تھے۔ یہ منتظر تھے کہ ان کے متعلق کیا فیصلہ ہو گا۔ لب کشائی کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی تو دریائے رحمت خود جوش میں آیا۔ ارشاد ہوا:

یا معشر قریش — ما ترون انی فاعل بکم

اہل قریش۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ میرا فیصلہ تمہارے متعلق کیا ہو گا؟

یہ سب ظالم تھے، جفا کار تھے، مشرک وکافر تھے، مگر مزاج شناس بھی تھے اور سخن شناس بھی۔ جواب دیا:

اخ کریم، ابن اخ کریم

ہم بھلائی کی توقع رکھتے ہیں۔آپ خود شریف بھائی کے چشم وچراغ۔

جواب میں ارشاد ہوا:

لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم طلقاء

(جو کچھ ہونا تھا ہو چکا) آج تم پر کوئی الزام نہیں غلام بنانے کا قاعدہ جنگ جاری نہیں کیا جائے گا۔(لہٰذا) جاؤتم سب آزاد۔

منصب کلید برداری وآب رسانی:

خطبہ سے فارغ ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حرم کعبہ میں تشریف فرما ہوئے۔ بیت اللہ کی کنجی دست مبارک میں تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ کنجی ان کوعطا ہو جائے تا کہ سقایت زمزم (آب رسانی) کے منصب کے ساتھ منصب سدانت (کلیدی برداری ودربانی) کا شرف بھی ان کو حاصل ہو جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟

عثمان حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا:

هاك مفتاحك— اليوم يوم برو وفاء

یہ اپنی کنجی لیجئے۔یہ حسن سلوک اور وعدہ وفا کرنے کا دن ہے۔

بام کعبہ پر اذان:

نماز ظہر کا وقت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ بام کعبہ پر چڑھ کر اذان دیں۔ قریش مکہ کے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی۔جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پکار پکار کر اعلان ہو رہا تھا جن کی مخالفت میں وہ بیس سال صرف کر چکے تھے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کی رگ حمیت پھڑکی۔ایک نے کہا خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔دوسرے نے کہا اب جینا بے کار ہے[۹۵۳]۔مگر عام طور پر ذہن ہموار ہو چکے تھے اور صداء اذان ان کے لیے نغمہ جان فزا بن چکا تھا۔اس کے بعد حرم مکہ میں اذان کی خدمت مستقل طور پر حضرت ابو محذورہ کے سپرد فرمائی اور ۲۱ سالہ نوجوان حضرت عتاب بن اسید کو والی مکہ بنایا ایک درہم روزانہ ان کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔[۹۵۴]

حضرات انصار کو تشویش اور محبوب رب العالمین کی طرف سے اطمینان دہانی:

حرم کعبہ سے فارغ ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر تشریف لے گئے اور قبلہ رو ہو کر بہت دیر تک دعا کرتے رہے۔حضرات انصار کا ہجوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔یہاں مکہ والے

بھی پہنچنے لگے اور دست مبارک پر بیعت ہونے لگے۔ حضرات انصار میں سے کسی کو خیال آیا کہ شاید اب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وطن عزیز میں قیام فرمائیں اور ہم شرف قربت سے محروم ہو جائیں۔ یہ بات آہستہ آہستہ آپس میں چلی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھانپ لیا۔ فرمایا یہ کیا وسوسہ ہے جو آپ صاحبان کو پریشان کر رہا ہے۔ اطمینان رکھو میرا تمہارا ساتھ چھوٹنے والا نہیں ہے:

المحیا محیاکم والممات مماتکم

جینا تمہارے ساتھ مرنا تمہارے ساتھ

صلوات الله عليه وعلى اله واصحابه اجمعين ابدا دائما

غزوہ حنین وطائف اور اسباب شکست وفتح

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(آیت ۲۵-۲۷ سورہ نمبر ۹ توبہ)

''بیشک اللہ مدد کر چکا ہے تمہاری بہت سے میدانوں میں اور جنگ حنین کے موقع پر۔ جب تم میں ناز پیدا کر دیا تھا تمہاری کثرت نے (تم اترا گئے تھے اپنی کثرت پر) پس تمہارے کام کچھ نہ آئی یہ کثرت اور تنگ ہوگئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے۔ پھر تم ہٹ گئے پیٹھ دے کر۔ پھر اُتاری اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اور اُتاریں فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور ماردی (عذاب دیا) کافروں کو اور یہی سزا تھی منکروں کی۔ پھر التفات فرمائے گا اس کے بعد اللہ تعالیٰ جس پر چاہے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔'' (سورہ توبہ)

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت تھی جس کے دامن تقدس پر اس ذات حق جل مجدہ کو (جس نے ان کے دلوں میں ایمان کی بے انتہا محبت پیدا کر کے ایمان کو ان کے دلوں میں سجا دیا تھا اور کفر وفسوق وعصیان سے ان کے دلوں میں نفرت بھر دی تھی اور اپنے فضل وکرم سے ان کو راشد قرار دیا تھا۔ (سورہ حجرات رکوع ۱) کسی گناہ کا خواہ وہ ذہنی اور فکری ہو معمولی دھبہ بھی گوارا نہیں تھا۔

(۱) جنگ احد کے موقع پر کچھ صحابہ سے لغزش ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا وہ مطلب لے لیا جو اگرچہ اجتہاداً صحیح تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کے مطابق نہیں تھا تو دشمن کے ہاتھوں ان کو شکست دے کر اس لغزش پر تنبیہ فرمائی گئی اور پھر اس شکست کو ان کی لغزش کا کفارہ قرار دے کر معافی اور درگذر کا اعلان بھی فرما دیا گیا۔ (سورہ آل عمران رکوع ۱۶)

(۲) اسی طرح غزوہ حنین کے موقع پر کچھ ناز اور اتراہٹ پیدا ہوا جو عام مسلمانوں کے لحاظ سے قابل گرفت نہیں تھا۔ لیکن آپ ﷺ نے دیکھا حضرات صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے وحی الٰہی کے الفاظ کس طرح گرج رہے ہیں۔ اعجبتکم کثرتکم۔ (تمہیں اترا دیا تمہاری کثرت نے) پھر ان کو چند لمحے کے لیے شکست دے کر ایک طرف کفارہ ادا کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بشارت بھی سنائی جا رہی ہے۔ ثم یتوب اللہ

الایۃ ''اس کے بعد جس پر چاہے گا اللہ تعالیٰ التفات فرمائے گا اور اس کی توبہ قبول کر لے گا'' یہ سب اس لیے ہے کہ اس مقدس جماعت کے دامن تقدس پر جو گرد پڑ گئی ہے وہ صاف ہو جائے۔

اتراہٹ اور ناز کیا تھا:

آج مسلم ممالک کے رہنما بھی اپنی فوجی پوزیشن کو سامنے رکھ کر فریق مخالف کے متعلق طمطراق سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم ایک جھٹکے میں ان کو ختم کر دیں گے۔ ان کو انشاء اللہ کہنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ کیا اس قسم کی اتراہٹ اور ناز ان صحابہ کرام یا کسی صحابی کے اندر پیدا ہوا تھا؟ (معاذ اللہ) یہ مکروہ اور بدنما صورت یقیناً نہیں تھی اور قطعاً نہیں تھی۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک؟

حقیقت یہ ہے کہ جب ان مجاہدین حق نے جن کی تعداد جنگ بدر میں صرف تین سو تیرہ تھی اپنی تعداد کو بارہ ہزار سے بھی متجاوز دیکھا تو کسی کی زبان پر آ گیا۔

لَنْ نُغْلَبَ الْيَوْمَ مِنْ قِلَّةٍ

''آج ہم تعداد کی کمی کے باعث ہرگز مغلوب نہیں ہو سکتے۔''

یہ ایک قیاس (۶۵۷) تھا۔ اس کا مقصد حوصلہ افزائی بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا قیاس نہ کفر ہے نہ شرک وفسق۔ اس قیاس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے (معاذ اللہ) البتہ اس قیاس میں ایک طرح کی بو استغناء اور بے نیازی کی آتی ہے۔ اگرچہ اس کا احساس انہیں پاک اور لطیف نفوس کو ہو سکتا ہے جو عبدیت اور فنا فی اللہ کے مدارج طے کر چکے ہوں۔

یعنی اپنی ذات اور اپنے اسباب پر نظر ڈالنا ان خدا شناس پاکبازوں کی نظر میں گناہ اور جرم ہے جو اپنی انانیت ختم کر چکے ہوں، جن کے دل و دماغ پر یہ حقیقت چھا چکی ہو اور اس کا یقین ہی نہیں بلکہ اس کا ان کو عین الیقین حاصل ہو چکا ہو کہ وہ ہیچ در ہیچ ہیں۔ ان کی ہستی حباب سے بھی کم ہے۔ ان کی حقیقت حضرت حق کے مقابلہ میں ذرہ سے بھی حقیر ہے۔ ذرہ میں اگر چمک ہے تو وہ اس کی اپنی ہرگز نہیں جو چمک بھی ہے وہ حضرت آفتاب کا پرتو ہے اور یہ پرتو بھی اس وقت تک جلوہ گر ہے جب تک ذرہ آفتاب رو ہے آفتاب سے کچھ بھی رخ ہٹا تو ذرہ ایسا بے حقیقت ہے کہ اس کو شمار میں لانا بھی عبث ہے۔ یہ بہت ہی باریک اور لطیف نکتہ ہے اور یہی لطیف اور نہایت باریک نکتہ اس تنبیہ اور عتاب کا محرک ہے اور اسی بنا پر یہاں بدر کا ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح بدر والی یاس انگیز قلت میں تمہیں نصرت خداوندی کی ضرورت تھی اور اس کی بنا پر کامیابی ہوئی آج اگرچہ اس قلت کے مقابلہ میں کثرت ہے مگر یہ کثرت بھی اسی طرح محتاج نصرت ہے جس طرح بدر والی قلت محتاج نصرت تھی۔ اس تنبیہ کے بعد وحی الٰہی نے جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:
(۶۵۸)

حنین وطائف:

طائف ایک پہاڑ ہے مکہ معظمہ سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر۔ یہاں قبیلہ ثقیف آباد تھا۔ طائف اور مکہ کے بیچ میں ایک میدانی علاقہ کا نام حنین ہے۔ قبیلہ ہوازن یہاں آباد تھا۔ ثقیف اور ہوازن عرب کے مشہور قبیلے تھے قریش کی طرح ان کو بھی اپنی عظمت وعزت اور اپنی شجاعت پر ناز تھا، تیراندازی میں ان کو ایسی مہارت تھی کہ پورے عرب میں ان کا جواب نہیں تھا۔

مکہ فتح ہو گیا ہمارے تیرتھ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، ہمارے صنم خانہ کو پھر بیت اللہ بنا دیا گیا، ہمارے ہوتے ہوئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھ یہ کر گذریں جن کو ہم نے طائف میں گھسنے نہیں دیا تھا اور ایک دفعہ آ گئے تھے تو اینٹوں اور پتھروں کی بوچھاڑ سے لہولہان کر کے نکالا تھا۔ جس کو پھر مکہ سے بھی ہجرت کرنی پڑی تھی۔ ان کی یہ ہمت کہ ہمارے ہوتے ہوئے وہ فاتح مکہ بنیں!

یہ جذبات تھے جنہوں نے ان قبائل کو مشتعل کیا۔ انہوں نے فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی۔

یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

ایک میدان کا نام اوطاس تھا۔ یہ جنگ کے لیے موزوں تھا، نہ زمین سخت تھی نہ ایسی نرم اور ریتلی کہ پیر دھنسیں، اس کو پڑاؤ کے لیے منتخب کیا اور اپنے ساتھ اپنی عورتوں، بچوں، تمام مویشی اور سامان واسباب کو بھی لے کر یہاں آ پڑے۔ خیال یہ تھا کہ بال بچے ساتھ ہوں گے تو ان کی حفاظت کی حمیت وغیرت بھی جمے رہنے پر مجبور کرے گی اور لڑنے والوں کے پیر نہیں اکھڑنے دے گی۔

وہ اپنے ساتھ اونٹ کے ایک ہودہ پر بٹھا کر درید بن صمہ کو بھی لائے تھے۔ یہ اگرچہ سو سال سے بھی زیادہ عمر کا بوڑھا تھا بصارت بھی جاتی رہی تھی۔ مگر فنون جنگ کا ماہر اور لڑائیوں کا بڑا تجربہ کار مانا جاتا تھا۔ اس کو اسی غرض سے تبرکاً ساتھ لائے تھے کہ نازک موقع پر اس سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ (۹۵۹)

درید نے عورتوں، بچوں اور بھیڑوں بکریوں کی آواز سنی تو چونک کر بولا، یہ آوازیں کیسی؟ لوگوں نے غرض بیان کی۔ درید نے کہا۔ تم نے بڑی غلطی کی، جب پیر اکھڑ جاتے ہیں تو نہ عورتیں بچے جما سکتے ہیں نہ بھیڑ بکریاں۔ میدان جنگ میں قدم جمانے والی چیز قوت بازو اور تیغ وسنان ہے عزیز واقارب اور مال ودولت نہیں۔

مالک بن عوف نضری تقریباً تیس سالہ نوجوان اس جنگ کا قائد اعظم تھا۔ درید نے اس کو بلا کر سمجھایا کہ جنگجو بہادروں کو میدان میں رکھو۔ عورتوں، بچوں اور سامان واسباب کو کسی قریب کے مقام پر محفوظ کر دو تا کہ اگر برا وقت آن پڑے تو ان کی عزت پر آنچ نہ آئے۔ مگر مالک بن عوف جو طے کر چکا تھا اس سے ہٹنے کے لیے

آمادہ نہیں ہوا اور یہ دھمکی دی کہ اگر اس پر زیادہ زور ڈالا گیا تو وہ خودکشی کر لے گا لوگوں نے یہ اصرار دیکھ تو خاموش ہو گئے۔

مالک بن عوف میدان میں پہلے پہنچ چکا تھا، اس نے مناسب مقامات پر فوجیں مقرر کر دیں اور حکم دیا کہ جیسے ہی مسلمان پہونچیں تلواروں کے نیام توڑ دیں اور سب مل کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں، تیراندازوں کے دستے پہاڑوں کی کمین گاہوں میں بٹھا دیئے کہ جب مسلمان اس طرف سے گذریں ان پر تیروں کی بارش برسا دیں۔

لشکر اسلام کی تیاری:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل کی تیاری کی خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن حدرد کو بھیجا۔ وہ جاسوس بن کر آئے اور کئی دن تک ان قبائل میں رہ کر حالات معلوم کیے۔ اس مخبری کے بعد صورت حال کا صحیح اندازہ ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری شروع کی سامان جنگ کا جائزہ لیا تو زرہیں کچھ کم تھیں نقد رقم کی بھی ضرورت تھی۔ صفوان بن امیہ مکہ کا رئیس اعظم تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سو زرہیں طلب فرمائیں اس نے کہا غصب یا عاریۃً۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ غصب نہیں بلکہ عاریۃً جتنی لی جائے گی اتنی ہی واپس کی جائے گی اور اگر کچھ ضائع ہو گئیں تو ان کا معاوضہ دیا جائے گا۔

اتفاق سے دوران جنگ میں کچھ زرہیں ضائع ہو گئیں۔ جب واپس کرنے کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاوضہ پیش فرمایا۔ مگر حضرت صفوان نے عرض کیا۔ وہ وقت اور تھا جب میں نے یہ گستاخانہ گفتگو کی تھی۔ اب تو اسلام دل میں گھر کر چکا ہے۔ زرہیں کیا اب تو جان کی پونجی بھی اس معذرت کے ساتھ حاضر ہے۔

یک جان چہ متاعیست کہ سازیم فدایت
اما چہ تواں کرد کہ حاضر ہمین ست

ایک دوسرے رئیس عبداللہ بن ربیعہ سے تیس ہزار درہم قرض لیے۔

روانگی:

تیاری مکمل ہونے کے بعد ۵ شوال ۸ ھ (۲۸ جنوری ۶۳۰ء) کو اسلامی فوجیں حنین کی طرف بڑھیں۔

دس ہزار وہ مجاہدین تھے جو مدینہ سے آئے تھے۔ ان کے علاوہ دو ہزار سے زائد مکہ کے نوجوان تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ان میں کچھ ایسے جوشیلے بھی تھے جنہوں نے پورے ہتھیار بھی نہیں لیے تھے۔ یہ فوج ظفر موج شام کے وقت میدان کارزار کے قریب پہنچی۔ جیسے ہی پیشانی مشرق پر صبح صادق کا جھومر چمکا۔ فریضہ نماز ادا کیا اور ابھی پوری طرح اُجالا بھی نہیں ہوا تھا کہ میدان حنین کی طرف قدم بڑھنے لگے۔ یہ میدان نشیب میں تھا سب طرف پہاڑ تھے اور پہاڑی راستے ایسے ڈھلوان تھے کہ پیر جمنے مشکل

تھے۔ میدان جنگ کے بیشتر مقامات پر دشمن کی فوجیں قابض اور راستہ کے پہاڑوں پر تیر انداز دستے مسلمانوں کے منتظر تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ مسلمان میدان جنگ میں داخل ہو جائیں تو سامنے سے فوجین تیغ وسنان سے ان کا قلع قمع کر دیں اور اوپر سے قدر اندازوں کے تیران کے پرخچے اڑا دیں۔

پہلے وہلہ میں وہ کامیاب رہے جب سامنے سے شدت سے حملہ ہوا اور سب طرف سے تیروں کی بارش شروع ہوئی تو قدرتی بات تھی کہ مسلمانوں کے پیرا کھڑ گئے وہ زیادہ بدحواس ہو گئے، جو اپنی بہادری کے زعم میں مکہ سے آئے تھے ''لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں''۔ جو لوگ دشمن کے حامی اور اس کے منصوبہ سے کچھ واقف تھے، وہ اس انتشار اور بعض کے فرار سے بہت خوش ہوئے کچھ جلد بازوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ان کے پیر سمندر سے ورے نہیں رک (۹۶۰) سکتے۔

یہ سب کچھ تھا اور ارشاد خداوندی کے بموجب حالت یہ ہوگئی تھی کہ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ''تنگ ہوگئی تم پر (مسلمانوں پر) زمین باوجود اپنی وسعت کے'' لیکن فضل خداوندی مسلمانوں پر سایہ فگن تھا۔ یہ جو کچھ ہوا وہ من جانب اللہ انتباہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا محور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیکر مقدس تھا جو اپنی جگہ استقلال و استقامت کا پہاڑ بن کر کھڑا رہا۔ جس میں اگر جنبش ہوئی تو صرف یہ کہ وہ اپنے سفید خچر (۹۶۱) سے نیچے اترا، تلوار ہاتھ میں لی اور یہ رجزیہ کلمات کہتا ہوا گرجا:

انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب

انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب

ہاں، ہاں، میں ہی ہوں نبی اس میں کوئی جھوٹ نہیں، میں ہی ہوں عبدالمطلب کا (۹۶۲) بیٹا اس کے گھرانے کا چشم و چراغ۔

پاؤں اُکھڑنا اور انتشار اضطراراً تھا، فوراً سنبھلے، دس بارہ صحابہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تھے وہ تو اس تیزی سے پلٹے اور آقا دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے کہ یہ پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ جدا ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت علی حضرت عباس، فضل بن عباس اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم انہیں قریبی جاں نثاروں میں تھے۔ ایک نئے جان باز (۹۶۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب تھے انہوں نے آگے بڑھ کر خچر کی باگ پکڑ لی۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خچر پر سوار تھے ابوسفیان بن حارث اس کی باگ تھامے ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر رجز۔ انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب پھر آپ نے ایک جانب نظر ڈالی اور پکارا۔ یامعشر الانصار۔ جواب آیا لبیك دوسری جانب آواز دی۔ یامعشر المهاجرین۔ جواب آیا۔ لبیك حضرت عباس نہایت بلند آواز تھے۔ آپ نے ان کو حکم دیا آواز دو۔ حضرت عباس نے آواز دی:

یا معشر الانصار　　　　یا اصحاب الشجرة

جماعت انصار اے بیعت رضوان والو۔ (جنہوں نے ایک درخت کے نیچے حدیبیہ کے موقع پر عہد کیا تھا کہ جان دیدیں گے مگر میداں سے نہیں ہٹیں گے)۔

ان پر اثر آوازوں کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج پلٹ پڑی۔ جن لوگوں کے گھوڑے یا اونٹ گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے وہ اپنی سواریوں سے کودے۔ شمشیر بکف میدان کی طرف دوڑے اور ایثار و فدائیت کے جوہر دکھانے شروع کردیئے۔ دفعتہً لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ ثقیف و اہواز کے سوار بھاگ نکلے۔ جورہ گئے ان کی گردنوں میں طوق غلامی تھا۔

اس موقع پر اس معجزہ کا بھی ظہور ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی کی ایک مٹھی اٹھا کر شاھت الوجوہ کہتے ہوئے دشمن کے لشکر کی طرف پھینکی۔ جس کی گرد ہر شخص کی آنکھوں میں پڑی جس نے اسے فرار پر مجبور کردیا۔ چنانچہ پورا لشکر چند لمحوں میں کائی کی طرح چھٹ گیا۔

ثقیف کی ایک شاخ (بنو مالک) کے جوان جم کر لڑے۔ اپنے ستر آدمی بھینٹ چڑھائے جب ان کا علم بردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔

بھاگنے والوں کی کچھ ٹولیاں مقام نخلہ پہنچیں۔ درید بن صمہ کئی ہزار کی جمعیت لے کر اوطاس میں ٹھیرا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامر اشعری کو تھوڑی سی فوج دے کر اوطاس بھیجا۔ حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے مگر ان کے برادر زادے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ جیسے ہی جھنڈا گرا پوری جمعیۃ فرار ہوگئی۔ مالک بن عوف جو قائد اور سپہ سالار تھا کئی ہزار کو اپنے ساتھ لے کر طائف پہنچا اور وہاں قلعہ بند ہوگیا۔ (۹۶۴)

غزوہ طائف:

یہ وہی طائف ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے تشریف لے گئے تھے تو یہاں کے مغرور رئیسوں نے بات بھی نہیں سنی تھی۔ قبیلہ ثقیف یہاں آباد ہے، بہت خوش حال ہے، بہادری میں بھی مشہور ہے۔ اپنے آپ کو قریش کا ہم پلہ اور پورے عرب کی ناک سمجھتا ہے۔ طائف کا مضبوط قلعہ پہاڑ پر ہونے کی وجہ سے ناقابل تسخیر ہے اور ایک مضبوط دیوار شہر کے چاروں طرف گھوم رہی ہے جس کی وجہ سے پورا شہر محفوظ ہے۔

ہوازن کا سپہ سالار مالک بن عوف نصری حنین میں شکست کھا کر اپنی پوری فوج کو لے کر یہاں پہنچ گیا ہے۔ قلعہ کو زیادہ مستحکم اور شہر پناہ کی مرمت کر کے اس کو بھی قلعہ بنالیا ہے۔ طائف کا یہ علاقہ خود بھی زرخیز ہے اس کے علاوہ غلہ اور جملہ سامان خورد نوش اتنا فراہم کرلیا گیا ہے کہ کئی سال کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ یہ اقدام کرسکیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو متاثر کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو بطور مقدمۃ الجیش پہلے روانہ کیا پھر خود مجاہدین کی پوری فوج کے ساتھ عزم

طائف ہوئے۔ حنین کے مال غنیمت اور اسیران جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں۔ حضرت مسعود (۹۶۵) بن عمرو الغفاری رضی اللہ عنہ کو ان کا نگراں مقرر فرمایا۔

منجنیق اور دبابہ وضبور کا استعمال:

قلعہ طائف پر حملہ کے لیے مناسب آلات جنگ کی ضرورت تھی۔ منجنیق ضبور اور دبابہ۔ ترقی یافتہ آلات جنگ تھے جو قلعہ پر حملے کے وقت استعمال کیے جاتے تھے۔ جب مجاہدین اسلام نے طائف کا محاصرہ کیا تو یہ آلات ان کے پاس موجود تھے اور ان کے استعمال کا طریقہ بھی وہ سیکھ (۹۶۶) چکے تھے۔

گولہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ بڑے بڑے پتھر منجنیق کے ذریعہ پھینکے جاتے تھے۔ دبابہ چھوٹا سا برج مورچہ ہوتا تھا جس کے اوپر لوہا یا چمڑا مڑھا ہوا ہوتا تھا۔ فوجی اس میں بیٹھ کر قلعہ تک پہنچتے اور قلعہ کی دیوار میں نقب لگاتے تھے۔ ضبور بھی اسی طرح کا ہوتا تھا۔

حضرات مجاہدین نے قلعہ طائف پر حملہ کیا تو کچھ مجاہدین دبابہ میں محفوظ ہو کر قلعہ کی دیوار تک پہنچے لیکن اہل طائف نے لوہے کی سلاخیں گرم کر کے ان کے اوپر برسائیں۔ دبابہ پر چمڑا منڈھا (۹۶۷) ہوا تھا جو سلاخوں کی تپش برداشت نہیں کر سکا۔ ان کو واپس آنا پڑا۔ کچھ مجاہدین شہید ہو گئے۔ اس کے علاوہ قلعہ کے اوپر سے اس شدت سے تیر برسائے کہ حملہ آوروں کو پسپا ہونا پڑا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بہادران طائف سے مطالبہ کیا کہ وہ مقابلہ پر آ کر جنگ کریں۔ ان پہلوانوں نے جواب دیا۔ ہمیں مقابلہ پر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس کئی سال کا سامان خورد نوش محفوظ ہے۔ (۹۶۸)

اب شکست دینے یا کسی گفتگو پر آمادہ کرنے کی صورت یہ تھی کہ مالی نقصان پہنچایا جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ باغات کاٹ دیئے جائیں مگر اہل طائف جیسے ہوشیار تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس بھی تھے۔ انہوں نے اللہ کا اور قریش سے اپنی قرابت اور رشتہ داری کا واسطہ دیا۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واسطہ کا احترام کرتے ہوئے حکم واپس لے لیا۔ (۹۶۹)

ایک غلام حارث بن کلدہ کسی طرح چرخی (۹۷۰) سے چمٹ کر نیچے اتر آئے اور اسلام سے مشرف ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد قرار دیا۔ طائف کے غلاموں کو اس کی خبر ہوئی تو تانتا بندھ گیا ۲۳ غلام کسی طرح نکل آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسلام سے مشرف ہوئے اور آزادی سے ہمکنار۔ (۹۷۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ ایک دودھ کا پیالہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک مرغ نے اس میں چونچ ماردی جس سے دودھ گر گیا۔ آپ نے خواب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بیان فرمایا۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ غالباً یہ قلعہ ابھی فتح نہیں ہوگا۔ (۹۷۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوفل بن (۹۷۳) معاویہ دیلیمی کو بلا کر ان سے دریافت فرمایا کہ تمہاری کیا

رائے ہے۔ نوفل نے عرض کیا یا رسول اللہ لومڑی اپنے بھٹ میں ہے۔ کوشش کی جائے گی تو پکڑ لی جائے گی۔ اگر چھوڑ دی جائے تب بھی کوئی اندیشہ نہیں (۹۷۴) ہے۔ لومڑی کو پکڑنے کی کوشش میں مدت صرف کرنا اور محاصرہ کو طول دینا کسی کشور کشا فاتح کا کام ہو سکتا ہے لیکن خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو دلوں کو فتح کرنے اور ان کو راہ حق پر لگانے کے لیے آئے تھے وہ اتنا وقت نہیں دے سکتے تھے اور اس حملہ کا مقصد حاصل ہو چکا تھا کہ اہل طائف کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور مسلمانوں پر حملہ کر دینے کا خطرہ جاتا رہا۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محاصرہ اٹھا لینے کا حکم فرما دیا۔

اس وقت بعض صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ان کے لیے بددعا کر دیجئے۔ یہ صاحب منجنیق اور دبابہ کے بجائے دعائے مستجاب سے ان پر بربادی نازل کرانا چاہتے تھے۔ مگر ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا کے بجائے دعا فرمائی۔ اللھم اھد ثقیفا وأتِ بھم (۹۷۵) اے اللہ ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو لے آ۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ طائف کے رئیس اعظم عروہ بن مسعود (۹۷۶) تو لشکر اسلام کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مدینہ پہنچنے بھی نہیں پائے تھے کہ حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے۔ ان کے بعد ثقیف کا ایک وفد مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ انہوں نے چند روز قیام کر کے مسلمانوں کے طور و طریق دیکھے اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ ہوازن کا قائد اعظم اور اہل ہوازن کی طرف سے جنگ حنین کا فیلڈ مارشل مالک بن عوف نصری بھی ایک جماعت لے کر آیا اور تاج اسلام سر پر رکھا۔ رضی اللہ عنہم۔

مال غنیمت کی تقسیم اور صنادید قریش کو انعامات

طائف سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ تشریف لائے جہاں مال غنیمت محفوظ تھا۔ قاعدہ کے مطابق چار حصے مجاہدین کو عطا فرمائے۔ ہر ایک مجاہد کے حصہ میں چار اونٹ اور چالیس بکریاں آئیں۔ جن کے پاس گھوڑے تھے ان کو دو دو سہام مزید دیئے گئے تو ان کے حصہ میں فی کس بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں (۹۷۸)۔ ایک خمس جو باقی رہ گیا تھا جس کی تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر تھی۔ اس میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے انہیں رؤسا کو جو اسلام کی مخالفت میں سرگرم رہے تھے اور اب اسلام کے قائل ہو گئے تھے بڑی فراخ حوصلگی سے بڑے بڑے انعامات عطا فرمائے۔ مثلاً قریش کے سردار اعظم ابوسفیان اور اس کی اولاد کو تین سو اونٹ، حضرت حکیم بن حزام کو دو سو، نضیر بن حارث بن کلدہ ثقفی، صفوان بن اُمیہ، قیس بن عدی، سہیل بن عمرو، حویطب بن عبدالعزیٰ، اقرع بن حابس، عیینہ بن حصین وغیرہ رؤسا اور سرداران قریش کو سو سو اونٹ۔ ان کے سوا بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے۔ جو اعرابی موجود تھے ان کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطیات بخشے مگر وہ زیادہ کا مطالبہ کرنے لگے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب طرف سے گھیر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک درخت کے تنہ سے جا لگے۔ ان اعرابیوں نے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر بھی چھین لی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے پاس جنگل کے درختوں کے برابر اونٹ ہوں تو وہ بھی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تقسیم کردوں۔ آپ مجھے نہ کبھی بخیل پائیں گے نہ بزدل اور نہ سخت مزاج۔ مگر اس وقت جو کچھ موجود تھا وہ تقسیم ہو چکا ہے۔ اب مہربانی کرو میری چادر واپس دیدو۔ (۹۷۸)

حضرت انصار رضی اللہ عنہ کا تاثر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دلداری:

وہ غیر معمولی انعامات جن کی تفصیل پہلے گذری عموماً اہل مکہ کو دیئے گئے جو جدید الاسلام تھے اور چند روز پہلے تک مسلمانوں کے خلاف رہے تھے۔ کچھ انصاری نوجوانوں کو اس کا احساس ہوا۔ کسی نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو انعامات دیئے اور ہمیں محروم رکھا۔ حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک خون قریش کے قطرے ٹپک رہے ہیں، کوئی بولا مشکلات میں ہم اور انعام دوسروں کو۔ اس کی کن فن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار کو طلب فرمایا۔

ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا۔ جس میں صرف حضرات انصار ہی حاضر تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ کیا باتیں مجھ تک پہنچ رہی ہیں؟ حضرات انصار نے عرض کیا بیشک ہم نے بھی یہ باتیں سنی ہیں۔ مگر یہ صرف ناسمجھ نوجوانوں کی باتیں ہیں۔ ہمارے کسی ذمہ دار نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرات انصار۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ تم، گمراہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ تمہیں ہدایت بخشی۔ تم میں پھوٹ تھی۔ ایک دوسرے سے جدا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ تم کو دولت مند کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطاب فرما رہے تھے اور حضرات انصار (رضی اللہ عنہم) ایک ایک فقرہ پر کہتے جاتے تھے۔ **اللّٰہ و رسولہ امن** ''اللہ کے اور اس کے رسول کے احسانات بہت زیادہ ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ تم کہہ سکتے ہو۔ لوگ آپ کی تکذیب کرتے تھے ہم نے تصدیق کی جب آپ کو لوگوں نے پناہ نہیں دی ہم نے پناہ دی۔ آپ خالی ہاتھ تھے ہم نے آپ کی ہر طرح مدد کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا سچ کہتے ہو لیکن اے انصار کیا یہ تمہیں پسند نہیں کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر اپنے گھر لوٹو۔ اے انصار! اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ لوگ کسی وادی میں جائیں میں انصار کی وادی ہی میں رہوں گا۔ انصار میرا پیراہن ہیں (میرا پوست) دوسرے لوگ عبا ہیں (جو کرتے کے اوپر بدن سے الگ رہتا ہے۔)

یہ فقرے لسان رسالت سے صادر ہوئے۔ حضرات انصار بے اختیار چیخ اٹھے۔ ہم کو صرف محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہیں۔ بہت سوں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہوگئیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں۔ میں نے جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں بلکہ تالیف قلب اور مانوس کرنے کی خاطر دیا۔(۹۷۹)

وفد ہوازن کی آمد غلاموں کی آزادی اور رائے عامہ معلوم کرنے کا نبوی طریقہ:

تقسیم غنائم کے بعد ہوازن کا وفد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں نو آدمی تھے، یہ اسلام سے مشرف ہوا۔ پھر اپنے مال وسامان اور اپنے اہل وعیال کی واپسی کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ اسی قبیلہ کی تھیں۔ اسی قبیلہ کے خطیب زہیر بن صرد کھڑے ہوئے۔ عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اسیروں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپیاں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خالائیں ہیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گود کھلایا تھا یہ ان کی کتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے آپ کو گود کھلایا ایسے خوش نصیب آج کیسے محروم ہو سکتے ہیں۔(۹۸۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

سچی بات بہت پیاری ہوتی ہے۔ مجھے سچی بات بہت محبوب ہے۔ میں آپ صاحبان کا انتظار کرتا رہا۔ مایوس ہو کر میں نے مال غنیمت تقسیم کر دیا اور قیدی بھی تقسیم کر دیئے اب یہ نہ میرے رہے ہیں نہ میرے اختیار میں ہیں کہ میں حکم کر کے سب کو واپس کرا دوں۔ اب آپ دو میں سے ایک بات منظور کر لیجئے۔ مال واپس لینا چاہتے ہو یا قیدی جو غلام بن چکے ان کو واپس لینا چاہتے ہو؟

ارکان وفد نے جواب دیا:

ہم اپنے قیدیوں کو واپس لینا چاہتے ہیں۔

ارکان وفد سے یہ بات طے کرنے کے بعد آپ نے مسلمانوں کے اجتماع میں تقریر فرمائی۔ حمد وثنا کے بعد فرمایا: تمہارے یہ بھائی اہل ہوازن تائب ہو کر آئے ہیں میں نے ان سے طے کر لیا ہے کہ ان کو صرف ان کے قیدی واپس مل سکیں گے۔ لہٰذا ان کو ان کے اہل وعیال واپس کرنے ہیں جو قیدی تھے اور جو تقسیم کے بعد آپ صاحبان کی ملک ہو چکے ہیں ان کو غلام کی حیثیت سے آپ بیچ بھی سکتے ہیں۔

اب جو صاحب خوشی سے واپس کر(۹۸۱) دیں بہت بہتر ہے لیکن جو اس کا عوض لینا چاہیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جیسے ہی آئندہ ایسا موقع ہوگا کہ ہمارے قبضہ میں غلام آئیں ان کا معاوضہ چکا دیا جائے گا۔

مجمع سے آواز بلند ہوئی قد طیبنا ذلك یارسول اللہ ۔ ہم اس کے لیے بڑی خوشی سے تیار ہیں۔ یعنی بلا کسی شرط کے ان غلاموں کو آزاد کر دیں وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ چلے جائیں۔

رائے عامہ معلوم کرنے کا نبوی طریقہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آپ کے اس اجتماعی جواب سے ہر ایک کے دل کی بات نہیں معلوم ہوئی۔ کیا واقعی ہر ایک شخص بلا تکلف دل کی رضامندی سے بلا شرط معاوضہ غلام آزاد کر رہا ہے یا دل سے راضی نہیں ہے اور محض مجمع کے لحاظ سے یہ جواب دے رہا ہے۔ لہٰذا آپ لوگ جائیں ہر ایک جماعت اور قبیلہ کے عریف[۹۸۲] (میر محلّہ یا قبیلہ) کا یہ کام ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص کی رائے معلوم کرے اور ہمارے سامنے روداد بیان کرے۔ چنانچہ مجمع منتشر ہو گیا۔ عرفاء قبائل نے فرداً فرداً ہر شخص کی آزادانہ رائے معلوم کی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر رپورٹ پیش کی کہ ہر شخص بخوشی تیار ہے اور بلا شرط اپنے غلام کو آزاد کر رہا ہے۔ اس تحقیق وتفتیش کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چھ ہزار قیدیوں کو واپس فرما دیا۔[۹۸۳]

جنگ تبوک یا غزوہ ذات عسرت عیسائی طاقتوں سے سلسلہ جنگ کا آغاز

بین الاقوامی تعلقات کا ذریعہ سفارت ہی ہوتا ہے۔ یہ رشتہ اگر منقطع ہو جائے تو عالمی امن اور انسانی اخوت کا تصور بھی ناممکن ہے۔ شرجیل اسی بین الاقوامی جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ پس وہ داعی امن واصلاح جس کی دعوت کا ایک بنیادی اصول یہ تھا کہ ''تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں'' اس کے لیے کب ممکن تھا کہ اس کے سامنے یہ ''بین الاقوامی جرم'' سرزد ہو اور وہ خاموشی سے انگیز کر لے۔

''شرجیل'' ''موتہ'' کا رئیس ہے جو شام (سوریا) کے ایک قصبہ کا نام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ سے واپس ہو کر دنیا کے مشہور بادشاہوں اور نوابوں کے نام دعوت اسلام کے خطوط بھیجے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرجیل کو بھی یہ شرف بخشا کہ مکتوب دعوت اس کے نام بھی بھیجا۔

حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ نامہ بر تھے۔ اگر یہ مغرور (شرجیل) ''دعوتِ حق'' کو اپنے لیے توہین سمجھتا تھا تو قاعدہ کی بات یہ تھی کہ اس کی باز پرس حکومتی سطح پر اصل ''داعی'' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتا۔ مگر یہ ناآشنائے تہذیب وآئین یہ ہمت تو کر نہیں سکا اس نے ناکردہ گناہ سفیر کو شہید کرا دیا۔ یہ ایک صریح ظلم اور کھلا ہوا غدر تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً تین ہزار مجاہدین کی فوج حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت روانہ کر دی۔ ہرقل جو عیسائی ریاستوں کے بلاک کا شہنشاہ تھا اس علاقہ میں آیا ہوا تھا۔ شرجیل نے اس سے امداد کی درخواست کی اور ایک لاکھ فوج فراہم کر لی۔

تین ہزار کا مقابلہ ایک لاکھ سے ہوا تو یکے بعد دیگرے تین کمانڈر شہید ہو گئے۔ حضرت زید بن حارثہ (محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جعفر طیار رضی اللہ عنہ (ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ''عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ'' (رفیق رسول اللہ علیہ وسلم)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تقریباً ایک سال پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ ایک دستہ کی کمان ان کے بھی سپرد تھی۔ جب یہ تین قائد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسی ترتیب کے ساتھ نامزد تھے شہید ہو گئے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے خود آگے بڑھ کر پوری فوج کی کمان سنبھال لی۔ تقریباً ۳۶ گھنٹہ سخت مقابلہ رہا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آٹھ تلواریں یکے بعد دیگرے ٹوٹ گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی تعداد سے تقریباً چالیس گنی زیادہ فوج کو پسپا ہونے پر مجبور کیا اور مسلمان مجاہدین کو صحیح وسالم نکال لانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد شام کے تمام قبائل عرب نے تہیہ کر لیا کہ مسلمانوں پر حملہ کر دیں اور شہنشاہ قسطنطنیہ نے بھی ان کی اعانت کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ شاہی فوجیں شام میں جمع ہونے لگیں۔ جس کی خبریں مدینہ پہنچیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاعی تدبر نے فیصلہ کیا کہ ان فوجوں کو سرزمین حجاز میں داخل ہونے سے پہلے ہی روک لیا جائے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری کا اعلان فرما دیا۔

یہ واقعات کا ایک سلسلہ تھا مگر مشیت خداوندی کی کچھ اور حکمتیں بھی یہاں کارفرما تھیں اس موقع پر کچھ اشارہ اس طرف کر دینا بھی ضروری ہے۔

(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف عرب کے لیے نہیں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اقوام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اُم القری ومن حولها یعنی مکہ اور ماحول مکہ (ارض حجاز) کے بعد سب سے پہلے دائرہ رحمت میں شام کا وہ علاقہ آنے والا تھا جو دور بنو اسرائیل میں ''الارض المقدسہ'' رہا تھا جس کے متعلق زبور میں لکھ دیا گیا تھا ان لارض یرثها عبادی الصالحون (سورہ انبیاء ع ۷) ''یہ ملک! اس کے وارث ہوں گے میرے صالح بندے'') اور اس کے بعد بعثت محمدی کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا تھا۔

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ورسالت کی غرض صرف یہ ہے کہ جملہ اقوام عالم پہ رحم ہو۔''

پھر یہ غرض صرف ایک تمنا اور آرزو نہیں تھی بلکہ رب السموات والارض کی مشیت اور اس کا فیصلہ تھا کہ ایسا ضرور ہوگا: لیظهره علی الدین کله ''تاکہ اس دین کو ہر دین پر بالا کر دے۔''

(۲) بے شک دعوت وتبلیغ فوجوں کے ذریعہ نہیں ہوا کرتی۔ مذہب کا تعلق دل سے ہے۔ دل کی گرویدگی کا نام اعتقاد ہے۔ جنگی طاقتیں مادی ڈھانچوں میں انقلاب برپا کر سکتی ہیں، دلوں کی دنیا نہیں بدل سکتیں، اس کا

راستہ تو صرف یہ ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ

''اپنے رب کے راستہ کی طرف بلاؤ دانشمندی اور اچھی نصیحت سے اور ان سے تبادلہ خیالات بھی ایسے انداز سے کرو جو نہایت ہی بہتر ہو۔''

یعنی دعوت و تبلیغ کے لیے توپوں کی گڑگڑاہٹ اور تلواروں کی جھنکار تو کیا ہوتی تبادلہ خیالات کے متعلق بھی ہدایت یہ ہے کہ ایسی طرح ہو جو نہایت ہی حسین، دلکش اور پیارا ہو۔ برائی کے بدلہ میں برائی اگرچہ قانوناً درست ہے مگر دعوت و اصلاح کا مقام اس سے بہت بلند ہے یہاں انتقام تو کیا تصور انتقام بھی قابل برداشت نہیں۔ مصلح کا منشا اور نصب العین برائی کو ختم کر دینا ہوتا ہے۔ انتقام سے برائی پھیلتی ہے برائی ختم نہیں ہوتی۔ برائی جب ہی ختم ہو سکتی ہے جب برے کو اچھا بنا دو۔ دشمن کو دوست بنالو۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (سورہ حم سجدہ)

''یعنی نصب العین یہ ہو کہ دشمن دوست بن جائے، مخالف موافق ہو جائے، اس نصب العین کو سامنے رکھ کر برائی کا جواب ایسے انداز سے دو جو بہت ہی مناسب اور موزوں ہو''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طے کردہ راستہ یہی تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ممالک اور مختلف قوموں کے بادشاہوں اور سربرآوردہ لوگوں کو خطوط لکھے یا مبلغین کو بھیجا۔ ہرقل کے نام جو تبلیغی دعوت نامہ گیا تھا اس کے جواب میں ''ہرقل'' کا جو پہلا عمل تھا کہ اس نے سمجھنے کی کوشش کی اور دعوت دینے والے کے متعلق تحقیقات کی۔ وہ اگر اسی راستہ پر چلتا رہتا تو رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا منشا، خوشگوار فضا میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر شرجیل نے اپنے کبر و نخوت اور اپنے عاجلانہ اقدام سے اس کا رُخ سمجھنے سمجھانے کے بجائے جنگ کی طرف پھیر دیا۔

(۳) کسی ملک کی با اقتدار پارٹی اگر اپنے اقتدار کی خاطر راہ حق میں رکاوٹ ڈالتی ہے تو صرف یہی جرم نہیں کرتی کہ وہ خود سعادت ابدی سے محروم رہ جاتی ہے بلکہ وہ ہزاروں لاکھوں مخلوق جو اس کے شکنجہ اقتدار میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے وہ اس کو بھی سعادت سے محروم کر دیتی ہے۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کو جو مکتوب گرامی بھیجا تھا اس میں تنبیہ فرمادی تھی۔ فعلیك اثم الاریسیین رعایا کا گناہ تمہارے سر ہوگا۔

(۴) رائے کی پابندی اور ضمیر کی لاچارگی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ شرجیل کے حلقہ اقتدار میں ایک بیرونی سفیر بھی صحیح بات نہیں کہہ سکتا۔ وہ صرف اس بنا پر قتل کر دیا جاتا ہے کہ وہ پیغام حق کا نامہ بردار کیوں بنا۔ شرجیل سے اس کے ملک کا کوئی حصہ یا کوئی ٹیکس نہیں طلب کیا گیا تھا۔ اس کو ابدی سعادت اور اُخروی نجات کا راستہ بتایا گیا تھا۔ اس کو دعوت فکر دی گئی تھی کہ وہ خود بھی اپنے حال اور مستقبل پر غور کرے اور جو اس کے زیر اقتدار ہیں ان کو بھی غور و فکر اور تبادلہ خیالات کا موقع دے۔ مگر جب بیرونی رہنما اور غیر ملکی سفیر کی قدرتی اور بین

الاقوامی آزادی بھی برداشت نہیں ہو سکی تو خود اس کے ملک کے باشندوں کی کیا حالت ہوگی جو اس کے ماتحت اور زیر دست تھے۔ بے شک ان کے جسم زنجیروں میں جکڑے ہوئے نہیں تھے مگر ان کے ضمیر اور ان کے فکر، یقیناً مغلوب، مقہور اور ایسے جکڑ بند تھے کہ آزادی اور رائے کا تصور بھی ان کے لیے اپنی ہلاکت کے مترادف تھا۔

(۵) ایک رؤف رحیم جس کے دل کا ریشہ ریشہ نوع انسان کی ہمدردی، بے کسوں کی غم خواری، زیردستوں کی امداد اور جذبہ دستگیری سے پر درد اور پرسوز ہو۔ وہ کب برداشت کر سکتا ہے کہ ابن آدم جو ایک ہی جسم آدمیت کے اعضاء ہیں اس طرح نیم جان بلکہ بے جان بنے رہیں۔ ان کی حیثیت مویشی جیسی ہو۔ جن کے کاندھوں پر جوا تو ہر وقت رہتا ہے مگر ان کو آسائش زندگی کی مہلت کسی وقت بھی نہیں دی جاتی۔ غور و فکر کی تمام صلاحیتیں پامال رہتی ہیں۔ ان کا مذہب وہی ہوتا ہے جو ان کے آقا اور مالک کا اشارہ ہو۔

(۶) جب سے عربوں کو اپنی تاریخ کا علم تھا یہ پہلا موقع تھا کہ سرزمین حجاز میں ایک باضابطہ حکومت قائم ہوئی اور بیرونِ حجاز یمن، بحرین وغیرہ اس کے باج گزار ہوئے۔ لوگوں کو خیال ہو سکتا تھا کہ منزل یہی ہے۔ سفر ختم ہو چکا ہے۔ اب رخت سفر کھول دینا چاہیے لیکن رحمت حق کب برداشت کر سکتی تھی کہ ارض حجاز میں رشد و ہدیٰ کی گھنگھور گھٹائیں برسیں۔ یہاں کے خارستان لالہ زار بنیں اور اس کے آس پاس خلق خدا کی کھیتی پانی کے ایک ایک قطرہ کو ترستی رہے۔

(۷) پھر کیا یہ بھی ممکن تھا کہ قیصر و کسریٰ کی جبار طاقتوں اور آس پاس کے دشمن قبائل کے بیچ میں یہ نوخیز اسلامی مملکت باقی رہ سکے اور افتراق و انتشار کے اسی جہنم کا لقمہ بن جائے جس کے کنارہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس سالہ جدوجہد کے بعد بمشکل ہٹایا(۹۸۴) تھا اور ترقی اور کامرانی کے راستہ پر لگایا تھا۔

بے شک یہ تمام طاقتیں چاہتی تھیں کہ اللہ کے چراغ کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں لیکن اس کے بالمقابل فیصلہ قضا و قدر یہ تھا کہ یہ نور بڑھے گا اور اس کی کرنیں پورے عالم کو روشن کریں گی۔

(۸) اب جو بھی اس نور حق کا گرویدہ تھا اور جو بھی یہ چاہتا تھا کہ فتح و نصرت اور غلبہ دین حق کا وہ وعدہ پورا ہو جو لیظھرہ علی الدین کلہ کے الفاظ کے ساتھ تاریخ انقلاب کی پیشانی پر کندہ کر دیا گیا تھا۔ اس کی ایک ہی تمنا ہو سکتی تھی یہ تمنا کیا ہوتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمنا وہی تھی جس کی عکاسی ان آیات میں کی گئی جو اسی زمانہ میں نازل ہوئی تھیں۔ آیات ملاحظہ فرمائیے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (تا) وَهُمْ صَاغِرُوْنَ (سورہ توبہ)

''اہل کتاب میں سے جن کا حال یہ ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں، نہ آخرت کے دن پر نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرایا اور نہ سچے دین پر ہی عمل پیرا ہیں تو مسلمانو! ان سے بھی جنگ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیں اور حالت ایسی ہو جائے کہ ان

کے بل ڈھیلے ہو گئے ہوں (ان کی سرکشی ٹوٹ چکی ہو)'' (سورہ توبہ)

یہ سورہ توبہ کے چوتھے رکوع کی آیتیں ہیں جن میں یہ اعلان ہے۔ اگلے رکوع میں اس اعلان کی وجوہات تفصیل سے بیان فرمائی گئی ہیں۔ مثلاً

(۱) ان لوگوں نے مذہبی عقائد میں تحریف کر دی۔ یہودیوں کی ایک جماعت حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''ابن اللہ'' پکارنے لگے۔

(۲) ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے ''احبار، علماء اور مشائخ'' کو پروردگار بنا لیا اور

(۳) ان احبار اور رہبان (علماء و مشائخ) کی حالت یہ ہے کہ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق اور ناروا کھاتے ہیں۔

(۴) اپنی اس نفع اندوزی اور اجارہ داری کی خاطر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

(۵) سونے اور چاندی کا کنز (اکتناز) کرتے ہیں۔ راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور ''کنز'' بنا کر رکھتے ہیں۔

(۶) حالانکہ خود اپنے دین و مذہب کے خلاف ان کی یہ شرمناک خصوصیتیں ہیں اس کے باوجود ان کا منصوبہ یہ ہے کہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی اپنی پھونکوں سے بجھا دیں (اسلام اور مسلمانوں کو ختم کر دیں)

(۷) اللہ تعالیٰ کے طے کردہ منصوبہ کے خلاف وہ اپنا منصوبہ کامیاب کرنا چاہتے ہیں اور اسی کوشش میں رات دن مصروف ہیں۔

پہلی قسط:

یہ اعلانِ جنگ جس کا اشارہ مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا اس کی پہلی قسط یہ ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ

(سورہ توبہ ع ۱۶)

''ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس (پھیلے ہوئے) ہیں اور چاہیے کہ (جنگ اس طرح ہو کہ وہ) تمہاری سختی (اور مضبوطی) محسوس کریں اور یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ان کا ساتھی ہے جو ہر حال میں متقی ہوتے ہیں۔'' (سورہ توبہ ع ۱۶)

جنگ کا نیا دور:

بہرحال اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاعی تدبیر کہیے یا اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کی تعمیل قرار دیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ کا نیا دور شروع ہو رہا تھا یعنی آٹھ سال پہلے جب کفار مکہ نے مدینہ طیبہ کی طرف اقدام کر کے اسلام کے پودے کو اکھاڑنا چاہا تھا اور اس کے لیے جان و مال کی بازی لگا دی تھی۔ اس وقت

مسلمانوں کواجازت دی گئی تھی کہ ان حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے ان کو ناکام ونامراد بنائیں اور اپنی مظلومیت کے ورق کو پلٹ دیں۔ اس اجازت کا سبب یہ(۹۸۵) تھا کہ:

''مسلمان بے قصور اپنے گھروں سے اور اپنے شہر سے نکالے گئے ان پر طرح طرح کے ظلم کیے گئے صرف اس جرم میں کہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔''

اب آٹھ سال بعد یہ صورت ہے کہ بیرون حجاز کی وہ طاقت جو دنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھی جاتی ہے اور اس کے تمام اعوان وانصار یہ سب چاہ رہے ہیں کہ ظلم وتشدد کا بازار گرم کریں اور نور خدا کی شمع کو گل کر دیں۔ یہ عیسائی طاقتیں ہیں جو مسلمانوں کے لیے موت کے بادل تیار کر رہی ہیں۔ تنازع للبقاء اگر فطری عمل ہے تو یہ عمل فطرت کا تقاضا ہے کہ ان بادلوں کو چھانٹا جائے۔ مگر تشویش یہ ہے کہ حالات حد درجہ نازک ہیں مثلاً:

حالات کی نزاکت:

(۱) بے شک مسلمانوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔ تقریباً پورا حجاز مسلمان ہو چکا ہے مگر قیصر روم کی شاہی فوجوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد اتنی ہی کم ہے اور ان کی بے سروسامانی ایسی ہے جیسے غزوہ بدر میں افواج کفر کے مقابلہ میں تھی۔

غزوہ بدر میں تین سو تیرہ کا مقابلہ ایک ہزار سے تھا۔ جملہ حشم وخدم کو ملا کر مخالفین کی تعداد کسی نے تین ہزار بیان کر دی ہے اگر اس آخری عدد کو لیا جائے تب بھی ایک کا مقابلہ دس سے تھا لیکن ابھی گزر چکا ہے کہ غزوہ موتہ میں تین ہزار مسلمانوں کو ایک لاکھ سے ٹکرانا پڑا تھا یعنی ایک مسلمان کو تینتیس نصاریٰ سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

(۲) مسلمانوں کی تعداد کا اضافہ بھی عجیب طرح ہوا تھا۔ فتح مکہ کے بعد اچانک غیر معمولی اضافہ ہوا۔ قبائل عرب کے وفود مدینہ منورہ کی طرف دوڑنے لگے۔ مدینہ والوں کے مالی وسائل بہت محدود تھے۔ باہمی اشتراک ومعاونت کی زندگی تھی اس کا قدرتی نتیجہ وہ تنگی وعسرت تھی جو سب پر چھائی ہوئی تھی۔

(۳) ساز وسامان۔ اوّل تو صحراء عرب کے باشندے جن میں زیادہ تر بدوی تھے شام اور روم جیسے زرخیز متمدن ممالک کے مقابلہ میں خود ہی مفلس اور بے زر وبے پر تھے اور خصوصیت سے اس وقت حالت یہ تھی کہ باہر سے غلہ کی آمد بند تھی جس سے قحط پڑا ہوا تھا خود مدینہ کی پیداوار یعنی کھجور اس کے بھی ذخیرے ختم ہو چکے تھے یعنی پہلے موسم کی کھجوریں ختم ہو رہی تھیں۔ تازہ کھجوریں درختوں پر تھیں وہ ابھی ٹوٹی نہیں تھیں ان کے توڑنے کا وقت آ رہا تھا۔

(۴) فصل کا زمانہ خوشی اور فرحت کا زمانہ بھی ہوتا تھا اور اس میں مشغولیت بھی زیادہ سے زیادہ رہتی تھی۔ دستور یہ تھا کہ باغوں والے اپنے بچوں کو باغوں میں ہی لے جاتے تھے۔ مزدوری کرنے والے بھی کنبہ ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ سب مل کر کھجوریں توڑتے پھر ان کو فروخت کرتے یا خشک کر کے ذخیرہ کرتے ہیں جاتے

تھے۔ سال بھر کی عام غذا کھجوریں تھیں اور اس کا خاص موسم یہی تھا۔ یہ اگر ہاتھ سے جاتا رہتا تو سارا سال برباد تھا۔ یہ حالات ایسے تھے جن کی وجہ سے یہ زمانہ نہایت عسرت اور تنگی کا زمانہ تھا۔ اسی وجہ سے اس جنگ کو بھی جس کا سامان اس وقت کیا گیا "غزوہ ذات عسرت" کہا گیا۔

(۵) ان سب پر مستزاد یہ کہ گرمی نہایت سخت تھی۔ گرمی بھی عرب کی گرمی جس میں سفر کرنا موت اور ہلاکت سے کھیلنا تھا۔

(۶) اب تک معرکے حدودِ حجاز میں تھے۔ مگر یہ معرکہ سرزمین حجاز سے باہر ہونے والا تھا جس کے لیے کافی مسافت طے کرنی پڑتی اور سامان سفر بھی زیادہ درکار تھا۔

اس وقت بھی ملوکیت کا سکہ چل رہا تھا اور آج بھی جب کہ جمہوریت کا دور دورہ ہے تو سلسلہ جنگ عوام کی غربت کا علاج بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ جب بھرتی شروع ہوتی ہے تو عموماً ضرورت مند اور فاقہ زدہ نوجوان فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں لیکن جس کا نام جہاد ہے، جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے وہ فوجی بھرتی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔

جہاد ایک فریضہ ہے۔ اس کو نماز روزہ کی طرح فرض سمجھ کر انجام دیا جاتا ہے، جس طرح نماز روزہ اور حج کے جملہ مصارف خود نمازی یا حج کرنے والے کو برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ جہاد کے بھی جملہ مصارف مجاہد کو اپنی ذات سے برداشت کرنے ہوتے ہیں اور صاحب استطاعت کا کام یہ بھی ہوتا ہے کہ حکومت کو چندہ دے کر کسی غریب مجاہد کی ضروریات اپنے ذمہ لیں۔ حالات کی تبدیلی سے اگر چہ ان احکام میں تبدیلی ہوتی رہی مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں یہی طریقہ رائج رہا۔ لہٰذا عام مسلمانوں کی تنگ دستی بہت دُشوار مرحلہ تھا اور قحط کے زمانہ میں تحریک ایثار کا کامیاب ہونا بہت ہی مشکل تھا۔

(۷) راہِ خدا میں خرچ۔ جانی و مالی قربانیوں کا سلسلہ جو ابتدا سے چل رہا تھا اور مدینہ میں جس نے جہاد فی سبیل اللہ کی صورت بھی اختیار کر لی تھی۔ غور کیجیے وہ کس درجہ پریشان کن تھا اس پر مستزاد چند ماہ پہلے حنین وطائف کے غزوے پیش آئے تھے انہوں نے مسلمانوں کو چور کر دیا تھا۔

(۸) یہ مقابلہ بیزنطائی شاہنشاہی سے تھا جو مشرقی یورپ میں رومۃ الکبریٰ کی عظمت کی جانشین تھی اور ابھی حال میں شہنشاہ ایران کی فوجوں کو شکست دے چکی تھی۔ اس بناء پر منافقوں کو اپنی جگہ یقین تھا کہ مسلمانوں کے خاتمے کے دن آ گئے ہیں۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے جو منافقوں کا سرغنہ تھا لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سفر سے لوٹنے والے نہیں ہیں۔

غرض اس طرح کے بہت سے حالات تھے جو جنگ بدر کی تاریخ کو دہرا رہے تھے۔ ان حالات میں جس طرح اقدام کا فیصلہ وہی کر سکتا تھا جس کا حوصلہ غیر معمولی ہو۔ جس کی ہمت بہت بلند ہو۔ جس کی شجاعت بے نظیر ہو اور ان اوصاف کے ساتھ جنگ کی مہارت بھی غیر معمولی رکھتا ہو یعنی آج کل کی اصطلاح میں بہترین فیلڈ

مارشل ہو۔ اسی طرح اس فیصلہ کی تعمیل کے لیے بھی وہی تیار ہوسکتا تھا جو ایثار مجسم ہو۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں جو اللہ کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ چکا ہو اور اہل تصوف کی زبان میں رضائے مولیٰ کے لیے اپنے آپ کو فنا کر چکا ہو۔

عشق بستان و خویشتن بفروش
کہ ازیں خوب تر تجارت نیست

غالباً یہی وجہ ہے کہ کلام الٰہی نے اس موقع پر ترغیب اور ترہیب کے دونوں پہلو اس طرح واضح کیے جس کی نظیر کسی اور جگہ نہیں ہے۔ مثلاً ایک طرف ارشاد ہوا کہ ابدی سعادت مندی فلاح و بہبود اور ترقی کا مدار اس پر ہے کہ اپنا سب کچھ حتیٰ کہ رشتہ اور قرابت کی دلچسپیوں کو بھی اللہ اور رسول کے لیے قربان کردو۔ جو کچھ ہو وہ اللہ اور رسول کا حکم اور اس کی تعمیل ہو۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو تمہاری حفاظت اور تمہاری بقا کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُكُمْ وَاَبْنَآءُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ (تا) وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ
(سورہ توبہ ع ۳)

ترجمہ: ”اے اللہ کے رسول آپ مسلمانوں کو بتا دیجیے کہ اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری (خاندان) تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ سے اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو (کلمہ حق تمہارا محتاج نہیں) انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ تعالیٰ کا (مقررہ قانون ہے کہ وہ) فاسقوں پر کامیابی اور سعادت کی راہ نہیں کھولتا۔“ (سورہ توبہ ع ۳)

یہاں آٹھ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ غور کرو گے تو ایک متمدن زندگی کے تمام علائق ان میں آگئے ہیں۔ نیز جس ترتیب سے ذکر کیا تعلقات کی گرفت کا سلسلہ کچھ اسی طرح درجہ بدرجہ چلتا ہے۔ فرمایا انسان کی شخصی زندگی کی اُلفتوں کے بڑے رشتے یہی ہیں اور اپنی جگہ سب مطلوب اور ضروری ہیں لیکن اگر محبت ایمانی میں اور ان میں مقابلہ ہو جائے تو پھر مومن وہ ہے جس پر ان تمام اُلفتوں میں سے کسی اُلفت کا بھی جادو نہ چل سکے اور کوئی تعلق بھی اسے اتباع حق سے نہ روک سکے۔

یہ ترہیب (دھمکی) کا پہلو تھا۔ ترغیب کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ (تا) اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ
(سورہ توبہ ع ۱۵)

ترجمہ: ”مدینہ کے باشندوں اور ان اعرابیوں کو جو اس کے اطراف میں بستے ہیں۔ ق

نہیں تھا کہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دیں اور پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ بات لائق تھی کہ اس کی جان کی پرواہ نہ کر کے محض اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں اس لیے کہ اللہ کی راہ میں انہیں جو مصیبت بھی پیش آتی وہ ان کے لیے ایک نیک عمل شمار کی جاتی ۔ ہر پیاس جو وہ سہتے ، ہر محنت جو وہ اُٹھاتے ، ہر مخمصہ جس میں پڑتے ، ہر وہ قدم جو وہاں چلتا جہاں چلنا کافروں کے لیے غیظ وغضب کا باعث ہوتا۔ ہر وہ چیز جو (مال غنیمت میں) دشمنوں سے پاتے (یہ سب کچھ) ان کے لیے عمل نیک لکھا جاتا۔ کیونکہ اللہ نیک کرداروں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا اور اس طرح اللہ کی راہ میں جو رقم بھی وہ نکالتے چھوٹی یا بڑی اور جو میدان بھی وہ طے کرتے اس کی نیکی ان کے نام لکھی جاتی تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کا انہیں بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے۔

پختہ مغزانِ عشق اور مردمانِ خام

ناز پروردہ تنعم نہ برد راہ بدوست
عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

ایک داغ بل، ایک امتیاز وتفریق:

غزوہ بدر کو اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان فرمایا۔ یعنی اس روز اگر چہ سخت مقابلہ ہوا اور کچھ اس طرح ہوا کہ مسلمان اتنے سخت مقابلہ کے لیے پہلے سے تیار نہیں تھے۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جماعت نکھر کر سامنے آ گئی جس کے ایثار اور عزم واستقلال نے ثابت کر دیا کہ زندگی اس کی ہے۔ زندہ رہنے کا حق اس کا ہے۔ صنادید قریش اور کفار مکہ اس کے مستحق نہیں ہیں۔

یہ خداوندی فیصلہ جو غزوہ بدر کے موقع پر ہو گیا تھا اس کا ظہور تقریباً چھ سال بعد ہوا۔ جب لشکر اسلام کے دستے امن کا پرچم لہراتے ہوئے، سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت حرم مکہ میں داخل ہوئے۔

آج جب کہ فاتحین مکہ کے لشکر حدود حجاز سے گزر کر ''الارض المقدسہ'' کا رُخ کرنے والے ہیں اور وقت آ رہا ہے کہ وعدہ خداوندی ''لیظھرہ علی الدین کلہ'' کا ظہور ہو۔ ایک ایسے ہی ''فرقان'' کی ضرورت ہے جو کھرے کو کھوٹے سے جدا کر دے۔

اور بے شک آج آفتاب رسالت نصف النہار پر تھا۔ اس آفتاب کے ہوا خواہ جذبات عشق ومحبت میں کچھ ایسے وارفتہ تھے کہ ان کو اس تصور سے بھی وحشت ہوتی تھی کہ یہ آفتاب غروب ہونے والا ہے۔ مگر وہ خدا جس نے اس آفتاب درخشاں کو پروان چڑھایا تھا اس کے علم میں تھا کہ فریضہ نبوت ورسالت مکمل ہو چکا ہے۔

اب ان ہوا خواہ جان نثاروں کی ڈیوٹی ہے کہ ان شرائط کو انجام دیں جو ''ظہور دین'' یعنی کلمہ حق کی فتح اور کامرانی کے لیے ضروری ہیں۔ اس موقع پر اور بھی زیادہ ضروری تھا کہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو جائے تاکہ جو کھرے ثابت ہوں ان کو آئندہ کا منصوبہ سمجھا دیا جائے اور اس کے شرائط ولوازمات سے ان کو آگاہ کر دیا جائے۔

یہ غزوہ جس کی تیاری ان نازک حالات میں بڑے ولولہ اور جوش سے اگرچہ اس میں جنگ کی نوبت نہیں آئی لیکن اس کا عظیم الشان فائدہ یہی ہوا کہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو گیا۔ مستقبل کا راستہ صاف ہو گیا اور اس پروگرام کی تلقین ہوگئی جس پر جاں فروشان حق کو چلنا تھا۔

آپ ابتداء کے چار رکوع چھوڑ کر سورہ توبہ کے باقی رکوع آخر تک پڑھ جایئے اور ان پر گہری نظر سے غور فرمایئے۔ معلوم ہوگا ایک منصوبہ سامنے ہے قدرت کا ایک تھرمامیٹر کارفرما ہے جو مردمان خام کو پختہ کاروں سے جدا کر رہا ہے اور پختہ کاروں کو ایک طویل سفر کے لیے آمادہ کر رہا ہے۔ یہی نازک حالات جو اقتصادی اور معاشی لحاظ سے درپیش ہیں ایک کسوٹی ہیں اسی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے اور فیصلہ لکھا جا رہا ہے۔

اس وقت جو جذبات اور رجحانات بے اختیار اُبھر رہے ہیں وہ انہیں کو جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں چار حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

(۱) منافق: جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور ممکن ہے اپنی جگہ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے بھی ہوں لیکن ان کے رجحانات اسلام کے برعکس تھے۔ یہ رجحانات کوششوں کی شکل میں نمایاں بھی ہوتے تھے مگر یہ کوششیں خفیہ ہوتی تھیں۔ وہ دانستہ ہوں یا دوسرے کے فریب میں آکر اس وجہ سے سرزد ہوئی ہوں کہ ان کو فطری طور پر تعمیر سے زیادہ تخریب سے دلچسپی تھی۔

(۲) عمل میں کمزور۔

(۳) ایمان وعمل میں پختہ مگر اس وقت کچھ غلطی ہوگئی۔

(۴) اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اور ان کے ساتھی اور پیرو۔

اس موقع پر یہ دوبارہ سمجھ لیجیے کہ اسلام جس جہاد کی تعلیم دیتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ آپ نمبر اول کی جنگی طاقت فراہم کر کے دشمن پر ٹوٹ پڑیں اور اس کا خاتمہ کر دیں۔ ممکن ہے نتیجہ یہی ہو کہ دشمن ختم ہو جائے۔ مگر جہاد کی بنیاد اس جذبہ پر نہیں ہے کہ کسی قوم کو ختم کرنا نصب العین ہو۔ جہاد کی بنیاد عشق ومحبت اور جذبہ فدائیت پر ہے۔ جہاد خود آپ کی آزمائش ہے کہ آپ نفسانی اغراض سے کہاں تک بلند ہو چکے ہیں۔ خود آپ کے اخلاص و للّٰہیت کی گہرائی کہاں تک ہے۔ آپ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ متقی ہیں، اس دعویٰ میں آپ کہاں تک سچے ہیں۔ کیا غیظ وغضب کے وقت بھی آپ کا قدم طریق اعتدال پر قائم رہتا ہے کیا وہاں بھی آپ محرمات کا احترام کرتے ہیں جہاں جنگ کے عام قاعدوں کے لحاظ سے وحشت و بربریت کی عام اجازت ہوتی ہے۔

جہاں فوجیوں کی دلچسپی کی خاطر عصمت وعفت کے الفاظ بے معنی بتا دیے جاتے ہیں۔ کیا اس موقع پر بھی آپ عہد و پیمان کے پابند رہتے ہیں جہاں کمزور کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کا آپ کو موقع مل رہا ہو۔

آپ نے پڑھا۔ اس موقع پر قرآن پاک میں ارشاد ہوا کہ:

''تم ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں'' تو اس حکم کے ساتھ ساتھ یہ تنبیہ بھی ضروری سمجھی۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ

یعنی اپنے اقدامات اور اپنی کوششوں میں خدا کی نصرت اور مدد شامل حال دیکھنا چاہتے ہو تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب تم خود متقی ہو یعنی حدود الٰہیہ، ضابطہ اخلاق اور قوانین شریعت کے پورے پابند ہو۔

بہر حال خوف خدا، ایثار، فدائیت، اخلاص، للہیت، احکام الٰہی کی پابندی تقویٰ اور پرہیزگاری یہی معیاری اوصاف ہیں جن کی بنیاد پر مذکورہ بالا چار درجے قائم کیے گئے۔ اب ہر ایک درجہ کا کردار ملاحظہ فرمائیے جس کو قرآن حکیم میں پیش کیا گیا ہے تاکہ دودھ اور پانی الگ الگ ہو جائے۔

(۱) منافقوں کا کردار:

منافقوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے اس سفر سے جان بچائی۔

(۱) کوئی کہتا۔ ویسے تو مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ دور کا سفر ہے اور فلاں کام فوری درپیش ہے۔ فلاں بات نا قابل حل ہے۔ فلاں اُلجھاؤ سلجھایا نہیں جا سکتا۔ اب جیسا آپ کا حکم ہو۔ مقصود یہ تھا کہ کسی بہانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اجازت حاصل کر لیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ایسے نہیں ہیں کہ کسی کو مجبور کر کے ساتھ لے جائیں۔ ان کی رحمت و رأفت ہمیشہ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتی ہے۔ وہ لامحالہ یہی فرمائیں گے کہ مجبور ہو تو نہ جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حیلے بہانے سنتے پھر یہ دیکھ کر کہ وہ بخوشی چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں فرما دیتے۔ اچھا نہ جاؤ۔ تمہیں رُخصت ہے۔ ان میں سے بعضوں نے بات بنانے کے لیے یہ بھی کہا کہ مال حاضر ہے لے لیجیے۔ مگر نکلنا دُشوار ہے۔

سورہ توبہ کے چھٹے اور ساتویں رکوع میں انہیں بہانہ بازوں کو بے نقاب کیا گیا ہے ارشاد ہوا ہے:

''اگر کوئی بات ایسی ہوتی کہ فوری فائدہ دکھائی دیتا اور سفر بھی دور کا نہ ہوتا (تو ان کے نفاق پر پردہ پڑا رہتا) وہ بلا تامل تمہارے پیچھے ہو لیتے (ظاہر میں حکم کی تعمیل کرتے۔ مگر دل میں دنیا کی طمع اور مکر وفریب کی چالیں ہوتیں اور وقت پر دھوکہ دے دیتے جیسے اُحد وغیرہ میں ایسا کر چکے تھے مگر یہاں مشکل یہ آن پڑی کہ معاملہ نکل آیا عرب سے باہر دور دراز کا) یہ مسافت ان کے لیے بعید ہو گئی ہے اور یہ راہ ان کو دور معلوم ہو رہی ہے (تب بھی تم دیکھو گے کہ یہ) قسمیں کھا کھا کر مسلمانوں سے کہیں گے اگر ہم مقدور رکھتے تو

ضرور تمہارے ساتھ نکلتے۔"

ملاحظہ ہو آیت کریمہ:

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا (تا) مَعَكُمْ (سورہ توبہ ع ٦)

معیار:

کتاب اللہ نے اس موقع پر مومن اور منافق کی تفریق یہ کی کہ مومن حیلہ بہانہ اور تردد تذبذب سے نا آشنا ہوتا ہے۔ آیت کریمہ لا یستاذنك الذین الایت کا ترجمہ یہ ہے:

"جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی آپ سے اجازت کے طلبگار نہ ہوں گے۔ اپنے مال سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں (یہ ان کا نصب العین اور مقصود زندگی ہے۔ اس میں اجازت لینے کا کیا مطلب؟ اور معذرت کا کیا موقع) اور اللہ جانتا ہے کون متقی ہیں (ہاں حیلہ و بہانہ اور تردد و تذبذب منافق کی خصوصیت ہے، چنانچہ) آپ سے اجازت وہی طلب کرتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر صحیح ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے دل میں شک پڑ گئے ہیں وہ ریب اور تردد کے مرض میں مبتلا ہیں (عزم اور فیصلہ سے محروم ہیں۔" (سورہ توبہ ع ۷)

(۲) ایک صاحب تھے "جد بن قیس" منافقوں کی ایک ٹولی کے سردار۔ آپ نے اپنا عذر تقویٰ اور طہارت کے رنگ میں پیش کیا۔ آپ نے فرمایا میں عورتوں کے معاملہ میں بہت کچا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ بنو اصفر (رومیوں کی سفید فام) عورتوں کو دیکھ کر مفتون اور بے قابو نہ ہو جاؤں۔

اسی طرح کے بے ہودہ عذر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی رکوع میں ارشاد ہے:

وَمِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ الاية

"کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں مجھے اجازت دیجیے کہ (گھر میں بیٹھا رہوں) اور فتنہ میں نہ ڈالیے۔"

قرآن حکیم نے اس کے جواب میں اعلان کیا ہے کہ یہ خود فتنہ میں پڑ گئے ہیں اس سے بڑھ کر فتنہ کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ۔ (ع سورہ توبہ)

"ہلکے ہو یا بوجھل جس حال میں بھی ہو نکل کھڑے ہو اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔"

اور اس شخص کی حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہیں سنتا اور ادا فرض سے منہ موڑ کر گھر میں بیٹھا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے۔

(۳) تمام منافقوں کے متعلق تو یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ بیرونی دشمنوں سے ساز باز رکھتے تھے اور مدینہ طیبہ میں وہ جاسوسوں (اور پانچویں کالم والوں) کا کام کرتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کچھ لوگ وہ تھے جو ''ابوعامر راہب'' سے تعلق رکھتے تھے اور اس کی ساری تجویزوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

ابوعامر راہب:

غزوۂ اُحد کے سلسلہ میں اس کا نام خاص شہرت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی کی تجویز تھی کہ میدانِ جنگ کے جس حصہ میں مسلمان پہنچنے والے ہوں وہاں گہرے گڑھے کھودے جائیں اور ان پر معمولی پٹاؤ ڈال کر ان کو ہموار کر دیا جائے اسی قسم کا ایک نامعلوم گڑھا تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گر گئے تھے۔

یہ ابوعامر قبیلہ خزرج کا ایک آدمی تھا جو ظہور اسلام سے پہلے عیسائی ہو گیا تھا، مذہبی کاموں میں اس کی سرگرمیاں یہاں تک نمایاں تھیں کہ اس کو راہب کہنے لگے اور یہ خطاب گویا اس کے نام کا جز بن گیا۔ مدینہ کے لوگ اس سے کافی متاثر تھے اور ایک تجویز یہ تھی کہ اوس اور خزرج کی باہمی جنگ ختم ہو جائے تو اس کو سردار اور بادشاہ تسلیم کیا جائے لیکن اوس اور خزرج کے اصحاب بصیرت نے جب اپنی نجات اسلامی تعلیمات میں دیکھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ''دامن رحمت'' سے وابستہ ہو گئے تو ابوعامر کی بادشاہ بنانے کی تجویز ختم ہو گئی۔ ابوعامر کے لیے یہ ایک حادثہ عظیم تھا اور جب اسلام کی ننھی سرزمین مدینہ میں ایک درخت بن کر اپنا سایہ سب طرف ڈالنے لگی تو ''ابوعامر'' اس کو برداشت نہیں کر سکا۔ وہ اسلام کے خلاف سازش میں مصروف ہو گیا۔ پہلے قریش مکہ کا ساتھ دیا۔ پھر شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس پہنچا اور اسے مسلمانوں کے خلاف حملہ کے لیے بھڑکایا۔ ممکن ہے شرجیل کی یہ برافروختگی کہ اس نے بلا سوچے سمجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کو شہید کر ڈالا، اسی ابوعامر کی اشتعال انگیزی کا نتیجہ ہو۔

بہرحال شرجیل کے اس واقعہ سے، پھر غزوہ موتہ کے واقعہ سے اس کو سازش کا موقع بہت اچھا مل گیا تھا۔

پھر جس طرح وہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو حملہ پر آمادہ کر رہا تھا اس نے یہ بھی کوشش کی کہ قلب مدینہ میں اس کا ایک اڈہ بن جائے تا کہ سازشی کارروائیوں میں سہولت ہو۔

قبا جو مدینہ منورہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے، جہاں مہاجرین کا قافلہ سب سے پہلے پہنچا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکہ معظمہ سے آتے ہوئے سب سے پہلے یہیں قیام فرمایا تھا اور کم و بیش دو ہفتے کے اس قیام میں وہاں ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ اسی کے قریب کچھ لوگ رہتے تھے جن کی تعداد ایک درجن کے قریب بتائی گئی ہے۔ ان کو قبا والوں سے خواہ مخواہ بیر تھا اور جب مہاجرین فی سبیل اللہ کا سب سے پہلا فرودگاہ ہونے کے باعث قبا اور اہل قبا کی عزت بڑھی تو اگرچہ یہ بارہ آدمی بھی حالات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ مگر اس حسد اور بغض و عناد نے نفاق کی نوعیت اختیار کر لی۔ پھر جیسے جیسے اہل قبا کا درجہ اسلام میں بڑھتا رہا ان کا نفاق

اتنا ہی پختہ ہوتا رہا۔ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ''ان کے دلوں میں مرض ہے خدا کرے ان کا مرض اور بڑھے۔''

ابو عامر سے ان کا تعلق پہلے سے تھا اب جذبات کے اتحاد نے ان کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا۔ بہر حال ابو عامر نے اسی مقام کو سازش کا اڈہ بنانے کے لیے منتخب کر لیا اور اب نہایت حسین تجویز مذہبی رنگ کی سوچی گئی کہ یہاں ایک مسجد بنالی جائے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ قبا والوں کی سربراہی سے نجات مل گئی۔ پھر چونکہ اب مسجد ایک ہی ہے نماز کے وقت اگر وہاں حاضری نہ ہو تو اداء فرض سے کوتاہی کا الزام آتا ہے جس سے نفاق کا بھانڈا پھوٹتا ہے۔ مسجد اگر الگ ہوگی تو غیر حاضری چھپی رہے گی اور نماز اپنے اختیار کی ہو جائے گی ضرورت ہوگی پڑھ لیا کریں گے۔ پھر مدینہ میں یا مدینہ کے اردگرد بھی جو لوگ اس خیال کے ہیں وہ اگر مل کر بیٹھیں گے تو نماز کا بہانہ ایسا ہے کہ کوئی شبہ بھی نہیں ہو سکے گا اس طرح سازش منصوبہ بھی کامیاب ہو سکے گا۔

مدینہ طیبہ میں کچھ مخلص صحابہ تھے جو اپنے جسمانی عذر کے باعث مسجد میں حاضر نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اجازت دے دی تھی کہ وہ گھر پر نماز پڑھ لیا کریں تو ان کی عقیدتمندی نے یہ تمنا بھی بارگاہِ رسالت میں پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان پر تشریف لا کر کسی جگہ نماز پڑھ لیں تو اسی بابرکت جگہ کو اپنے گھر کی مسجد (جاء نماز) بنالیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درخواست منظور فرمالی تھی اور ان کے مکان پر تشریف لے جا کر نفلیں پڑھ لی تھیں۔ اسی جگہ کو ان مخلصین نے سجدہ گاہ بنالیا۔

ان منافقین نے بھی یہ حرص کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ ایک روز ان کی مسجد میں تشریف لے چلیں وہاں نماز پڑھ لیں تاکہ ان کی مسجد بابرکت ہو جائے۔ مقصد یہ تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بھی اس کے مسجد ہونے کی تصدیق ہو جائے گی تو ان کا پہلو مضبوط اور شک وشبہ سے محفوظ ہو جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کی وہ نرمی جس کو قرآن حکیم نے رحمت خداوندی کا مخصوص عطیہ قرار دیا ہے۔ فبما رحمة من الله لنت لهم وہ ان بدنیت اور بدباطن لوگوں کے لیے بھی شفیع بن گئی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخواست کو منظور فرماتے ہوئے اس وقت دوسری مشغولیتوں کے باعث معذرت فرمادی۔ البتہ وعدہ فرمالیا کہ جب غزوہ تبوک سے واپس ہوں گے اس مسجد میں پہنچ کر نماز پڑھ لیں گے۔

مسجد ضرار:

یہی مسجد جس کی طویل روئداد پیش کی گئی، تاریخ اسلام میں مسجد ضرار (ضرر پہنچانے کی غرض سے بنائی ہوئی مسجد) کے نام سے مشہور ہے۔ قرآن حکیم میں اس کے لیے یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس طویل حقیقت کو

ان مختصر الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا وَتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ (سورہ توبہ ع ۱۳)

ترجمہ: ''اور (منافقوں میں وہ بھی ہیں) جنھوں نے اس غرض سے ایک مسجد بنا کھڑی کی کہ نقصان پہنچائیں، کفر کریں، مومنوں میں تفرقہ ڈالیں اور ان کے لیے ایک کمین گاہ تیار کردیں جواب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ بھلائی ہو لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں۔'' (سورہ توبہ ع ۱۳)

اس آیت میں مسجد بنانے کے چار مقصد بیان کیے گئے ہیں:

(ا) ضرار یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ قبا کے مخلص مومنین کو نقصان پہنچے۔ کیونکہ مسجد قبا کی وجہ سے ان کو ایک عزت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ حسد وعناد سے چاہتے ہیں کہ ان کی خصوصیت باقی نہ رہے۔

(ب) وکفراً کفر کے مقاصد پورے ہوں۔ مثلاً ان کو نماز سے جان بچانے کا موقع مل جائے۔

(ج) تَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے۔ کیونکہ جو مسلمان اب تک ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے تھے اب وہ بٹ جائیں گے اور جماعت کی اس تفریق سے اور تفرقے بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ بالخصوص جب منشا ہی تفریق ہو۔

(د) اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ اللہ اور اس کے رسول سے جس نے جنگ کی اس کے لیے ایک کمین گاہ مہیا کردی جائے یا اس انتظار اور اس توقع میں پہلے سے ایک جگہ بنادی جائے کہ وہ یہاں آئیں تو ان کا ایک کمین گاہ پہلے سے تیار ہو۔

مسجد ضرار کا حشر:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں نماز پڑھنے کی درخواست منظور فرمائی تھی۔ یہ درخواست اگرچہ پرفریب تھی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے فریب کا علم نہیں تھا۔ عالم الغیب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کوئی منصوبہ دل کی کسی گہرائی میں خواہ کتنا ہی پوشیدہ اور مخفی ہو اللہ تعالیٰ کے علم محیط سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی فتنہ پردازیوں سے آگاہ کرتے ہوئے ہدایت فرمادی:

لَا تَقُمْ فِیْہِ اَبَدًا۔ ''اے نبی! تم کبھی بھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا۔''

چنانچہ جب واپس ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد کو منہدم کرادیا۔

امتیاز اور معیار:

مسجد کا معیار یہ نہیں ہے کہ عمارت نہایت خوبصورت ہے۔ اس کے مینارے اور گنبد بہت اُونچے ہیں۔ خوبصورت جانمازیں یا قیمتی قالینیں اس میں بچھی ہوئی ہوں۔ مسجد کا مقصد ذکر اللہ ہے۔ کلمۃ اللہ کی بلندی، اللہ والوں کا خشوع وخضوع اس کی زینت ہے۔ مسجد کی بنیادیں تقویٰ اور طہارت اور رضاء الٰہی پر ہونی چاہییں۔ کسی دُنیاوی غرض سے مسجد بنائی جائے تو وہ سجدہ گاہ نہیں بلکہ فتنہ گاہ ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے جہنم کے کنارے کھوکھلی بنیاد پر کوئی عمارت کھڑی کردی جائے۔ کلام اللہ نے دونوں مسجدوں میں یہی امتیاز قائم کرتے ہوئے ان پاکباز صحابہ کی تعریف کی۔ ان کو نہ صرف رضاء مولیٰ بلکہ محبوب خدا ہونے کی سند عطا فرمائی جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیاد پاک وصاف ہو جائیں۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ (تا) وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(سورہ توبہ ع ۱۳)

''یہ بات کہ آپ کھڑے ہوں اور بندگانِ خدا آپ کے پیچھے نماز پڑھیں اس کی مستحق وہی مسجد ہے جس کی بنیاد اوّل دن سے تقویٰ پر رکھی گئی۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ستھرے ہوں اور اللہ ان سے محبت رکھتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ستھرا بننا چاہتے ہوں۔

(اچھا اب تم ہی بتاؤ) کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ شخص (بہتر ہے) جس نے ایک کھائی کے گرتے ہوئے ڈھانگ (کنارے) پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھی بس وہ اس (تعمیر کرنے والے کو) لے کر آتش دوزخ کے گڑھے میں جا گری۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں (کامیابی و سعادت) کا راستہ نہیں دکھاتا جو ظلم کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ عمارت جو انہوں نے بنائی (یعنی مسجد ضرار) ہمیشہ ان کے دلوں کو شک وشبہ سے مضطرب رکھے گی (یہ کانٹا نکلنے والا نہیں) مگر یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں (کیونکہ یہ ان کے نفاق کی بہت بڑی شرارت تھی جو چلی نہیں۔ اس لیے ہمیشہ اس کی وجہ سے خوف وہراس کی حالت میں رہیں گے) اور اللہ سب کا حال جاننے والا اپنے کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔'' (سورہ توبہ ع ۱۳)

(۴) ہم نے مسجد ضرار کو ختم کر دیے جانے کی بات کچھ پہلے کہہ دی تا کہ یہ قصہ ختم ہو جائے ورنہ یہ بیان اس وقت کا ہو رہا تھا جب غزوہ تبوک کے لیے دعوت دی جا رہی تھی اور مجاہدین جہاد فی سبیل اللہ کے دستے کی روانگی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس وقت منافقوں کا یہ کردار تھا جو اُوپر کے نمبروں میں ذکر کیا گیا۔ منافق طرح

طرح کے بہانے کر رہے تھے اور خوش تھے کہ وہ چکمہ دینے میں کامیاب ہو گئے اور اپنی اس نمائشی کامیابی پر ایسے نازاں تھے کہ دوسروں کو بھی جان چرانے کے مشورے دے رہے تھے کلام اللہ کی مندرجہ ذیل آیتوں نے ان کی نفسیات کا نقشہ کھینچتے ہوئے بدترین نتائج سے آگاہ کر دیا ہے۔ ساتھ ہی صحابہ کرام کے کردار کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ الایتہ (سورہ توبہ ع ۱۱)

''خوش ہیں منافق اس بات پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش کے خلاف اپنے راحت کدوں اور اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور انہیں یہ بات ناگوار ہے کہ اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ انہوں نے (صرف یہی نہیں کیا کہ خود جان چرالی بلکہ جانے والوں کی ہمتیں بھی پست کرنے لگے چنانچہ) لوگوں سے کہا کہ اس گرمی میں (گھر کا آرام چھوڑ کر) کوچ نہ کرو۔ اے پیغمبر تم کہو کہ دوزخ کی آگ کی گرمی تو اس سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ کاش وہ بصیرت رکھتے (تو ایسی ناسمجھی کی بات نہ کہتے) اچھا یہ تھوڑا ہنس لیں۔ پھر ان کو ان بداعمالیوں کے پاداش ہیں۔ یہ کماتے رہے ہیں بہت کچھ رونا ہے۔'' (سورہ توبہ ع ۱)

رفقاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار:

مگر ان کوتاہ ہمت، جان چرانے والوں کے مقابلہ میں خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب ایمان رفقاء ہیں جن کی شان یہ ہے کہ وہ جانی اور مالی قربانیوں کو زندگی کا نصب العین بنا چکے ہیں۔ ان کے دل کی چین یہی ہے اور اسی سے ان کے جذبات فدائیت کو سکون ملتا ہے اللہ کی راہ میں جان و مال لٹاتے رہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورہ توبہ ع ۱۱)

''یہی لوگ ہیں جن کے لیے خوبیاں ہیں اور یہی ہیں کامیاب۔''

عمل میں کمزور:

(الف) ان میں سے کچھ وہ اعراب تھے جن کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (سورہ توبہ ع ۱۲)

''اعرابی کفر و نفاق میں سب سے زیادہ سخت اور اس کے زیادہ مستحق ہیں (کہ ان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے) کہ ان حکموں کی انہیں خبر نہیں ہے جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیے

ہوئے ہیں (کیونکہ آبادیوں میں نہ رہنے کے سبب سے تعلیم وتربیت کا موقع انہیں حاصل نہیں ہے) اور اللہ سب کا حال جاننے والا ہے۔ اپنے کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

(ب) کچھ ایسے بزرگ تھے جو ایمان کے پختہ۔ مگر میدان عمل میں ان کے قدم بوجھل رہتے تھے۔ یہ اس موقع پر بھی ساتھ نہیں چل سکے مگر ان لوگوں نے حیلے نہیں تراشے۔ بہانہ نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس آئے تو ہر شخص نے صفائی سے اپنی کمزوری اور غفلت کا اعتراف کیا اور اپنی کوتاہی پر نادم ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی کہ مستحق کرامت گناہگارانند۔

ارشاد ربانی ہے:

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلاً صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا الآية (سورہ توبہ ع ۱۱)

"کچھ اور ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے ملے جلے کام کیے۔ کچھ اچھے، کچھ برے۔ کچھ بعید نہیں اللہ تعالیٰ ان پر التفات فرمائے اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا بڑا ہی رحمت والا ہے۔ (سورہ توبہ ع ۱۳)

امتیاز:

باتیں بنانے والے منافقوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم سفر سے تو معذور ہیں البتہ مالی امداد کر سکتے ہیں۔ ان کی اس مصنوعی پیشکش کو رد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی تھی:

"آپ فرما دیجیے۔ خوشی سے خرچ کرو یا جبر وقہر سمجھ کر تمہاری پیشکش ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ تم فاسق اور نافرمان لوگ ہو (بات یہ ہے کہ روپیہ نہیں بلکہ جذبہ صحیح درکار ہے) اور خرچ کرنے کی قبولیت سے وہ اس لیے محروم کیے گئے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں (ان کا اقرار ایمان محض ظاہری ہے چنانچہ) ان کی نماز بھی زبردستی ہوتی ہے۔ سستی سے پیر ملتے ہوئے وہ نماز کو آتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں وہ بھی اس طرح کہ دل میں کراہیت اور ناگواری ہوتی ہے تو (دیکھو) یہ بات کہ ان لوگوں کے پاس دولت ہے اور وہ صاحب اولاد ہیں اس پر آپ تعجب نہ کریں یہ تو صرف اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال ودولت کی راہ ہی سے انہیں دنیاوی زندگی میں عذاب دینا چاہا ہے (کہ نفاق اور بخل کی وجہ سے مال کا غم وبال جان ہو رہا ہے اور اولاد کو اپنے سے برگشتہ اور اسلام میں ثابت قدم دیکھ کر وہ رات دن کڑھ رہے ہیں باقی رہا آخرت کا معاملہ) تو ان کی جانیں اس حالت میں نکلیں گی کہ وہ ایمان سے محروم ہوں گے۔" (سورہ توبہ ع ۷)

یہ ان سخن ساز منافقوں کی پیشکش کے متعلق خداوندی تنبیہات تھیں۔ ان کے مقابلے میں یہ مزور شمس مسلمان جن کو توقع دلائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت سے محروم نہیں رہیں گے۔ چونکہ ان کا ایمان پختہ اور

جذبہ صحیح ہے۔لہٰذا ان کے متعلق اللہ رب العزت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے:

ان لوگوں کے مال سے صدقات قبول کیجیے، یہ ایک صحیح جذبہ کے ساتھ خرچ کرتے ہیں لہٰذا آپ ان کا صدقہ (یعنی ان کی سچی پیش کش قبول کریں گے تو اس کا نتیجہ ہوگا کہ ان کو بخل اور طمع کی برائیوں سے) پاک کر دیں گے (کہ صدقہ کا یہی مقصد ہوتا ہے (اور اس طرح جذبہ خیر ترقی کرے گا) آپ اعلیٰ اخلاق کے لیے) ان کی تربیت بھی کر دیں گے (ان کو بابرکت بنا دیں گے) ساتھ ہی ان کے لیے دعاء خیر بھی کیجیے (چونکہ ان کا جذبہ صحیح اور آپ سے ان کا تعلق سچا ہے تو) یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کی دعا ان کے دلوں کے لیے راحت اور سکون ہے اور اللہ تعالیٰ (دعائیں) سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

(سورہ توبہ ع ۱۳)

ہدایت:

ان ضعیف العمل مومنین کو آئندہ کے لیے ہدایت ہوئی۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ۔ الآیۃ (سورہ توبہ ع ۱۳)

''آپ فرما دیجیے۔عمل کیے جاؤ۔اب اللہ تعالیٰ دیکھے گا تمہارے عمل کیسے ہوتے ہیں اور اللہ کا رسول بھی دیکھے گا اور مسلمان بھی دیکھیں گے اور پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔جس کے عمل سے نہ کوئی ظاہری بات پوشیدہ ہے، نہ کوئی چھپی بات۔پس وہ بتلائے گا کہ جو کچھ تم کرتے رہے اس کی حقیقت کیا تھی۔'' (ع ۱۳ سورۂ توبہ)

انداز کلام ملاحظہ ہو۔اُمیدوار بنایا جا رہا ہے اطمینان نہیں دلایا جا رہا، مومن کی شان یہی ہونی چاہیے۔اس کی کشتی، ایک طرف ساحل مراد ہو اور دوسری طرف خوف تلاطم، بیم و رجا کے منجدھار میں اس کا سفینہ رواں رہتا ہے۔بہت کم ایسے ہوتے ہیں کہ بشارتوں کے بعد بھی بیم و رجا کی دو آتشہ ان کو میسر رہے۔اُمت کے لا تعداد مغفورین و مرحومین میں صرف دس ہی ایسے ہوئے ہیں جن کو بشارتوں سے نوازا گیا۔آپ نے دیکھا سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ایک طرف وہ بشارتیں میسر ہیں جن کے اشارے کتاب اللہ کی آیات میں ہیں اور جن کی تشریح صادق مصدوق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان نبوت نے کی ہے۔دوسری جانب خود ان کے بیم و رجا اور عجز و انکساری کی حالت یہ ہے کہ درخت کو دیکھتے ہیں تو گریہ و بکا کے ساتھ فرماتے ہیں ''کاش میں درخت ہوتا کہ کاٹ کر ختم کر دیا جاتا'' خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طرف بشارت دے دی گئی کہ یہ ممکن نہیں کہ آپ کی موجودگی میں عذاب نازل ہو۔دوسری جانب خشیۃ اور خوف خدا کی حالت یہ ہے کہ آندھی کا طوفان آتا ہے تو گھبرا جاتے ہیں کہ یہی آندھی اور طوفان ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قوم ہود کو برباد کیا تھا۔

''ایں چنیں زیبا روش کمتر بود اندر جہاں''

جرم عشاق اور سزائے جرم

سورہ توبہ کے اسی رکوع ۱۳ کی چھٹی آیت میں ارشاد ہوا ہے:

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔

''اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ اس انتظار میں کہ اللہ کا حکم کیا ہوتا ہے، ملتوی ہو گیا ہے۔ یہ اسی کے اختیار میں ہے کہ ان کو عذاب دے یا ان کی توبہ قبول فرمالے۔''

یہ لوگ کون تھے؟ یہ کل تین بزرگ تھے۔ مرارہ بن الربیع، کعب بن مالک، ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہم۔

ان میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تو ان بہتر سابقین انصار میں سے تھے جنہوں نے عقبہ ثانیہ میں بیعت کی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دیتے ہوئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی خاطر ہر طرح کی قربانی کا وعدہ کیا تھا۔

حضرت ہلال بن اُمیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہما اس بیعت میں تو شریک نہیں تھے۔ البتہ غزوہ بدر میں شرکت کر کے اپنی جاں نثاری کا وہ ثبوت دے چکے تھے جس کا اعتراف کلام خداوندی نے بھی کیا ہے۔ ان تینوں بزرگوں سے بھی کوتاہی ہوئی اور غزوہ تبوک میں شریک نہیں ہو سکے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ واپس تشریف لائے اور ساتھ نہ جانے والے حیلے بہانے یا حقیقی عذر پیش کر کے معافی مانگنے لگے تو ان صاحبان نے کوئی عذر پیش نہیں کیا۔ بلکہ صاف صاف تسلیم کر لیا کہ ہماری سستی اور کوتاہی تھی کہ ہم اس سعادت سے محروم رہے۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت بالا کی تعمیل کرتے ہوئے فرما دیا تھا کہ حکم الٰہی کا انتظار کرو۔

یہ انتظار کا حکم کیوں ہوا۔ ان کے متعلق اسی وقت کوئی فیصلہ کیوں نہیں کیا گیا۔ خود ان کی قابل قدر خدمات اور ان کی قربانیاں ممتاز شان رکھتی تھیں جس سے ان کا درجہ بھی ممتاز تھا۔ اس خصوصیت کا تقاضا تھا کہ ان کا معاملہ بھی خاص ہو ؎ ''جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے''

عاشق صادق سے کوتاہی کیوں ہوئی۔ اس نے صدا محبوب پر کان کیوں نہیں دھرا۔ عاشق صادق اور صحرا نوردی سے اجتناب؟

اب ایک اور امتحان کی ضرورت ہوگی تاکہ سند عشق بحال ہو سکے۔ چنانچہ انتظار کرنے کے حکم کے ساتھ محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہوا: مسلمان ان سے نہ ملیں۔ خود ان کی بیویوں کو بھی یہی حکم ہوا کہ ان سے الگ ہو کر رہو۔

چنانچہ اچانک ان صاحبوں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ مدینہ اور اطراف مدینہ کی پوری آبادی نے ان سے رُخ پھیر لیا تھا۔ عزیز و قریب تک جدا ہو گئے۔ کوئی ان کے سلام کا جواب نہیں دیتا تھا۔ آخر جب

پورے پچاس دن اس حالت میں گذر گئے تب ان کی توبہ قبول ہوئی اور کتاب اللہ کی آیات نے ان کو معافی کی بشارت سنائی (تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیے) ان تینوں صحابیوں میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی سرگذشت تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے اور اپنے ایمان و عمل کا جائزہ لیجئے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

تقریباً ہر ایک غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف مجھے حاصل رہا اس موقع پر بھی فیصلہ یہی تھا کہ موکبہ ہمایوں کے ساتھ چلوں گا لیکن ایک کے بعد ایک دن گذرتا گیا اور میں اسی خیال میں رہا کہ یہ کام نپٹالوں تو روانہ ہو جاؤں۔ اسی طرح آج کل ہوتے ہوتے کئی دن گذر گئے۔ اتنے میں خبر اُڑی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لا رہے ہیں۔ تب میری آنکھیں کھلیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ بہرحال سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے اور حسب معمول پہلے مسجد میں تشریف لائے۔ جو پیچھے رہ گئے تھے وہ آ آ کر معذرتیں کرنے لگے اور قسمیں کھا کر اپنی سچائی بیان کرنے لگے یہ کچھ اوپر اسی آدمی تھے۔ انہوں نے جو کچھ ظاہر کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے رہے اور دلوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑتے رہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

مجھے بھی پہلے خیال آتا تھا کہ کوئی عذر بیان کر دوں گا۔ کچھ باتیں بھی میں نے سوچ لی تھیں اور گھر کے آدمیوں سے بھی مشورہ کیا تھا۔ مگر پھر یہ سمجھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حیلے حوالے غلط ہیں جو صحیح بات ہے وہی کہنی چاہیے۔ میں یہی طے کر چکا تھا۔ اب جب اس مجلس مبارک میں یہ عذر کرنے والے اپنے اپنے عذر بیان کر چکے تو میری باری آئی۔ میں نے سلام عرض کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔ مگر مسکراہٹ خوشی کی نہیں تھی بلکہ انداز خفگی کا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آپ کیوں رہ گئے۔ آپ تو سفر کے لیے اونٹنی بھی خرید چکے تھے۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باتیں بنانی مجھے بھی آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قوت خطابت عطا فرمائی ہے۔ مگر معاملہ اگر کسی دنیا دار سے ہوتا تو میں کچھ باتیں بنا سکتا تھا۔ مگر یہاں معاملہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کر بھی لوں تب بھی خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقت حال سے مطلع فرما دے گا۔ پھر میں معتوب ہو جاؤں گا اور اگر صحیح بات کہوں تو یقیناً اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوں گے مگر پھر معافی کی توقع بھی رہے گی۔

صحیح بات یہی ہے کہ کوئی عذر نہیں تھا۔ میں اچھا خاصا تندرست تھا۔ مالی سہولت بھی مجھے میسر تھی۔ یقیناً مجھے چلنا چاہیے تھا، یہ یقیناً میری سستی اور کوتاہی تھی کہ میں نہیں گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیشک تم نے سچی بات کہی۔ اچھا جاؤ انتظار کرو دیکھو اللہ تعالیٰ کا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔

میں نے اجازت لی اور واپس ہوا۔ میں جیسے ہی مجلس مبارک سے نکلا کچھ لوگ میرے پیچھے لگ گئے کہ تم نے غلطی کی۔ تم بھی کوئی بات بنا دیتے۔ اس وقت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناراض نہ ہوتے۔ پھر کسی موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مغفرت کی دعا کرا لیتے مقصد حاصل ہو جاتا، جگ ہنسائی نہ ہوتی۔ اب کچھ لوگوں نے اس طرح ملامت شروع کی کہ مجھے خیال آیا کہ واپس جا کر کوئی بات بنا دوں تا کہ ناراضگی ختم ہو۔ مگر پھر ضمیر نے اجازت نہیں دی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی بات بناؤں۔

میں نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا میرے سوا کسی اور کو بھی ایسا حکم ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا ہاں اور دو آدمیوں کو۔ مرارہ بن ربیع اور ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہما کو۔

اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہوا کہ ہم تینوں سے کوئی بات چیت نہ کرے تو سب نے منہ پھیر لیا۔ اچانک دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ گویا کل تک جس دنیا میں تھا آج وہ دنیا ہی نہیں رہی تھی۔ اس آزمائش میں جو دونوں میرے شریک تھے وہ گھروں میں بند ہو کر بیٹھ رہے لیکن میں سخت جان تھا۔ اس حالت میں بھی روزانہ گھر سے نکلتا۔ مسجد میں حاضری دیتا۔ جماعت میں شریک ہوتا۔ پھر ایک گوشہ میں سب سے الگ بیٹھ جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نماز کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جا کر سلام کرتا۔ پھر اپنے جی میں کہتا۔ دیکھوں سلام کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں کو حرکت ہوتی ہے یا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گوشہ چشم سے کبھی کبھی دیکھ لیتے لیکن جب میری نگاہ حسرت اٹھتی تو رخ پھر جاتا۔

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر

وہ جو وقت ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں ہے

ایک دن شہر سے نکلا تو ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے باغ تک پہنچ گیا۔ یہ میرے چچیرے بھائی تھے اور اپنے تمام عزیزوں میں زیادہ محبت انہیں سے تھی۔ مگر عجیب ماجرا دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔ تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا ابوقتادہ تم نہیں جانتے کہ میں مسلمان ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کی اپنے دل میں پوری محبت رکھتا ہوں؟ اس پر بھی انہوں نے میری طرف رخ نہیں کیا لیکن جب میں نے یہی بات بار بار دھرائی تو صرف اتنا کہا:

اللہ ورسولہ اعلم (اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے)

تب مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور آنکھیں بے اختیار آنسو برسانے لگیں۔

وہاں سے واپس ہوا تو راستہ میں ایک قبطی مل گیا۔ وہ لوگوں سے میرا پتہ پوچھ رہا تھا۔ اتفاقاً میں سامنے گیا تو لوگوں نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے شاہ غسان کا خط نکال کر میرے حوالہ کیا۔ خط میں لکھا تھا۔

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے آقا نے آپ پر سختی کی ہے تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم تمہاری شایان شان قدر و منزلت کریں گے۔“

خط پڑھ کر میں نے کہا یہ ایک نئی مصیبت آئی۔ گویا پچھلی باتیں ناکافی تھیں کہ یہ نوبت آ گئی کہ دشمنان دین مجھ سے یہ توقع رکھ رہے ہیں (معاذ اللہ)

جب اس حالت پر چالیس راتیں گذر چکیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک آدمی آیا اور کہا حکم ہوا کہ تم اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ۔ میں نے کہا طلاق دیدوں کہا نہیں۔ صرف علیحدگی کا حکم ہوا۔ ہلال اور مرارہ (رضی اللہ عنہما) کو بھی ایسا ہی حکم ہوا ہے۔ اس پر میں نے اپنی بیوی کو اس کے میکے بھجوا دیا۔

جب دس دن اور گذر گئے پچاس راتیں پوری ہو گئیں تو صبح کے وقت میں اپنے مکان کی چھت پر نماز پڑھ کر بیٹھا تھا اور ٹھیک وہی حالت تھی جس کی تصویر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام شریف میں کھینچ دی ہے کہ زندگی سے تنگ آ گیا تھا اور خدا کی زمین اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ مجھ پر تنگ ہو گئی تھی۔ اچانک سنتا ہوں۔ کوئی آدمی کوہ سلع سے پکار رہا ہے۔ کعب بن مالک بشارت ہو تمہاری توبہ قبول ہو گئی۔

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

اب لوگ جوق در جوق مجھے مبارک باد دینے دوڑے۔ ایک آدمی گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا لیکن بشارت کی آواز اس سے بھی زیادہ تیز ثابت ہوئی۔

میں مسجد میں حاضر ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب خوش ہوتے تو چہرہ مبارک چمکنے لگتا تھا جیسے چاند مسکرا رہا ہو۔ میں نے دیکھا اس وقت بھی مسرت سے چہرہ مبارک درخشاں ہے۔ فرمایا ''کعب بشارت ہو آج کا دن تمہاری پوری زندگی کا سب سے بہتر دن ہے۔'' (صحیحین)

میں نے خوشی میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں چاہتا ہوں کہ اپنی تمام جائداد راہ خدا میں دیدوں۔ فرمایا: نہیں۔ سب نہیں میں نے کہا نصف فرمایا نہیں۔ عرض کیا اچھا میرا حصہ جو خیبر میں ہے وہ میں راہ خدا میں دیتا ہوں۔ یہ پیشکش منظور ہوئی۔ (بخاری شریف)

میں نے عرض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے سچائی کی بنیاد پر قبولیت کی عزت بخشی ہے اب میں عہد کرتا ہوں کہ کسی موقع پر بھی قول حق سے پہلو تہی نہیں کروں گا خواہ کتنی ہی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ختم ہوا۔ اب وہ آیتیں جو اس موقع پر نازل ہوئیں ان کی تلاوت سے پہلے چند سبق یاد کر لیجئے جو اس واقعہ کی روح ہیں:

(۱) دنیا کی تاریخ پڑھو۔ کیا اس ایثار و اخلاص کی مثال مل سکتی ہے کہ ایک صاحب حیثیت جو ایسی قابلیت اور شہرت کا مالک ہے کہ دوسرے ملک کے بادشاہ اس کی آرزو رکھتے ہیں کہ وہ ان کا مشیر کار اور وزیر دربار ہو۔ اتنا اونچا شخص کس درجہ اپنے آپ کو فنا کر رہا ہے۔

(۲) یہ فنائیت اور یہ ایثار اللہ اور رسول سے یہ عاشقانہ تعلق صرف ایک دو کی بات نہیں بلکہ پوری فضا اسی رنگ میں رنگی ہوئی اور پورا ماحول اسی میں ڈوبا ہوا ہے۔ فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا یہ عالم ہے کہ جوں ہی قطع تعلق کا حکم ہوا تمام شہر نے دفعتۃً رُخ پھیر لیا چوری چھپے بھی کسی نے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی حتیٰ کہ ان کے محبوب سے محبوب عزیزوں کو بھی یہ خیال نہیں گذرا کہ ایک لمحہ کے لیے اس پر عمل نہ کریں یا کم از کم تعمیل میں نرمی یا تساہل سے کام لیں۔ ابوقتادہ کو دیکھو۔ حضرت کعب نے اپنے ایمان واسلام کا واسطہ دیا۔ یہ یقین دلایا کہ انہیں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو ابوقتادہ نے صرف یہی کہا۔ اللہ ورسولہ اعلم ان تین لفظوں میں اس دور کے مسلمانوں کی پوری تصویر موجود ہے یعنی مجھے معلوم تو سب کچھ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم پکے مسلمان ہو۔ لیکن اپنے جاننے کو کیا کروں جاننا تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اس کا حکم یہی ہے کہ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں۔

صوفیاء کرام کے یہاں لفظ فنا بہت بولا جاتا ہے مگر کیا ان کے حلقوں میں ایسی مثال مل سکتی ہے کہ اپنی تمام مرادیں فنا جو باقی وہ صرف مراد محبوب باقی۔

(۳) یہ اطاعت کوئی ضابطہ پری نہیں بلکہ ایک جذبہ ہے جو فطرت بن چکا ہے۔ چنانچہ اس کی تعمیل کے لیے نہ کوئی مادی قوت ہے، نہ کسی فرماں روا کی کوئی دھمکی، نہ کوئی عدالت، نہ قانون۔ صرف ایک ذات ہے جس کے لبوں نے حرکت کی تھی اور اتنی بات سب کو معلوم ہوگئی تھی کہ اس کی مرضی یہی ہے بس اتنی بات کا معلوم ہو جانا اس کے لیے کافی تھا کہ سب کے دل مجسم طاعت وامتثال بن گئے۔ کیا اجتماعی فداکاری کی کوئی ایسی مثال کسی تاریخ میں مل سکتی ہے۔؟

(۴) پھر یہ بھی دیکھو کہ مسلمانوں کی باہمی اخوت ومحبت کا کیا حال تھا۔ اس سختی کے ساتھ حکم کی تعمیل تو سب نے کی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان تینوں ساتھیوں کی مصیبت کے غم سے کوئی دل خالی بھی نہیں تھا۔ سب کے دلوں کو لگی تھی کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے۔ جوں ہی قبولیت کا اعلان ہوا ایک پر ایک دوڑنے لگا کہ سب سے پہلے مژدہ کون سنائے۔ کوہ سلع پر سے جس نے پکار کر سب سے پہلے بشارت سنائی تھی حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے ان کا نام نہیں لیا۔ مگر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور وہ جو گھوڑا دوڑا کر پہنچے تھے بتایا گیا ہے کہ وہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔

قبولیت توبہ کی شان

چونکہ یہ تینوں حضرات مومنین با اخلاص تھے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے اخلاص کامل ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک لغزش پر ان کو یہ غیر معمولی اور انوکھی سزا دی گئی تا کہ دامن اخلاص پر جو دھبہ پڑ گیا ہے وہ پوری طرح صاف ہو جائے تو اب فضل خداوندی نے یہ بھی چاہا کہ جب یہ دھبہ مٹ چکا تو ان کی مساویانہ شان بھی نمایاں ہو جائے۔ چنانچہ

قبولیت توبہ کی جو آیتیں نازل ہوئیں ان کا پیرایہ یہ ہے کہ پہلے خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لایا گیا۔ پھر مہاجرین اور انصار کا۔ اس کے بعد ان تین صاحبان کی توبہ کا ذکر کیا گیا۔ گویا ایک ہی صف ہے اور ایک ہی جماعت ہے جس میں سب سے پہلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پھر مہاجرین وانصار ہیں پھر یہ تین صاحبان ہیں۔ اس پوری جماعت کی توبہ کو شرف قبولیت سے نوازا جا رہا ہے۔ اب یہ تینوں حضرات اس کے بجائے کہ اپنی پس ماندگی پر ماتم کریں بڑی خوشی سے کہہ سکتے ہیں۔

گدایان را ازیں معنی خبر نیست

کہ سلطان جہان باماست امروز

اب آیات تلاوت کیجئے:

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِنْهُمْ۔ (الآیۃ ۶)

ترجمہ: ''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر متوجہ ہو گیا (بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب مہربان ہو گیا) اور مہاجرین اور انصار پر جو بڑی تنگی اور بے سروسامانی کی گھڑی میں اس کے ساتھ رہے اور اس وقت ساتھ رہے جب کہ حالت ایسی ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگا جائیں۔ پھر مہربان ہوا ان پر بلاشبہ وہ شفقت رکھنے والا بہت رحمت فرمانے والا ہے۔ اور (ہاں) ان تینوں شخصوں پر بھی (مہربان ہوا) جو معلق حالت میں چھوڑ دیئے گئے تھے (کہ ارشاد ہوا تھا انتظار کرو) اور (اللہ کی یہ مہربانی اس وقت ہوئی جب) زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آ گئے تھے اور سمجھ چکے تھے کہ پناہ مل سکتی ہے تو صرف رحمت حق کے دامن میں اور کہیں ان کو پناہ نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نظر رحمت سے التفات فرمایا ان پر تا کہ وہ بھی خدا کی طرف رجوع رہیں (پھر آئیں) بیشک اللہ ہی ہے مہربان رحم فرمانے والا۔'' (سورہ توبہ ع ۱۳)

ترجمہ پر دوبارہ نظر ڈالئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین وانصار کے ذکر میں جس طرح ایک نکتہ یہ ہے کہ ان خطا کاروں کی مساویانہ شان پھر نکھر آئے اور کہنے لگیں کہ ''سلطان جہاں باماست امروز'' اسی طرح ان آیات کا اشارہ یہ بھی ہے کہ ان تین ساتھیوں کی اس لغزش یا پھر ان کے اس امتحان وابتلاء سے سب ہی دل گرفتہ اور پریشان تھے اور سب ہی کے دل تڑپ تڑپ کر ان کے لیے دعا کر رہے تھے کہ ان کی توبہ قبول ہو اور یہ اپنے منصب عالی پر فائز ہوں۔ چونکہ اس درد میں سب شریک تھے تو قبول توبہ کی بشارت میں بھی سب کو شریک فرمایا گیا۔ یعنی پورا معاشرہ جس میں رسول اللہ ﷺ بھی اپنی پیغمبرانہ عظمت کے ساتھ شامل ہیں جسد واحد اور ایک جسم

ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ:

چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضو ہا را نماند قرار

(اللہ علم بالصواب)

پر شکستہ دردمندان عشق

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانیکہ گرفتار نہ بود

یہ ان کی باتیں تھیں جو امتحان گاہ عشق میں کسی وجہ سے ناکام رہے تھے۔ اب عشاق بامراد کی باتیں سنئے۔
① ان میں کچھ وہ بھی ہیں جو فی الحقیقت کامیاب ہیں مگر بظاہر ناکام۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہیں کہ ہم نامراد ہیں۔ اور رضا مولیٰ بشارت سنا رہی ہے کہ نہیں تم بامراد ہو۔ یہ کون ہیں۔ وہی ہیں جن کے جذبات کی تصویر تو یہ ہے:

عش بستان و خویشتن بفروش
کہ ازیں خوب تر تجارت نیست

مگر کیفیت یہ ہے کہ کوئی آنکھوں سے معذور ہے، کوئی صحت سے مجبور ہے، کوئی پا شکستہ ہے، کوئی پر شکستہ، کوئی ناتواں ہے، کوئی بے سامان۔ ان کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى۔ الآية (تا) وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورہ توبہ رکوع ۱۲)

ترجمہ: ''ناتوانوں پر بیماروں پر اور ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کے لیے کچھ میسر نہیں کچھ گناہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی میں کوشاں رہیں (کیونکہ ایسے لوگ احسان نیک عملی) کے دائرہ سے باہر نہیں ہیں۔ نیک عملوں پر کوئی الزام نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔'' (سورہ توبہ ع ۱۲)

کامیابی یہ ہے کہ کلام الٰہی ان کو زمرہ محسنین میں شمار کر رہا ہے۔ زہے قسمت۔ اس پر ایک فاضل کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

کوئی بات دنیا میں اس سے زیادہ عجیب نہیں ہو سکتی کہ وحشی اور بہائم صفت انسان اچانک محبت و اخلاص اور ایثار و جاں فروشی کے فرشتے بن جائیں لیکن قرآن حکیم کی تعلیم نے ایسا ہی انقلاب پیدا کیا۔

اس وقت کے ناموافق حالات کا اندازہ کیجئے پھر ان دردمندان عشق کو دیکھئے کہ شدت

دردو غم سے بے اختیار ہو کر رو رہے ہیں۔ کس بات پر۔ اس پر کہ عیش و راحت میں انہیں حصہ نہیں ملا؟ نہیں بلکہ اس پر کہ راہ حق کی مصیبتوں اور قربانیوں میں شریک ہونے سے رہ گئے۔ (ترجمان القرآن مختصراً)

(۲) اس کے بعد اسی قسم کے کچھ اور بزرگوں کی عجیب وغریب شان ملاحظہ فرمایئے جن کے متعلق ارشاد خداوندی ہے:

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوْكَ (تا) مَا يُنْفِقُوْنَ (سورہ توبہ ع ۱۲)

''نہ ان لوگوں پر کچھ الزام ہے۔ جن کا حال یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ ان کے لیے سواری بہم پہنچا دیجئے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہہ دیا میں یہ گنجائش نہیں پاتا کہ آپ صاحبان کے لیے سواری کا انتظام کر سکوں تو وہ اس حالت میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں کہ افسوس ہمیں میسر نہیں کہ اس راہ میں کچھ خرچ کر سکیں۔'' (ع ۱۲ سورہ توبہ)

پہلے گذر چکا ہے کہ اس دور میں نہ تو سرکاری فوج وجود میں آئی تھی، نہ رضا کاروں کی کوئی الگ قسم تھی، نہ سپاہیوں کے مصارف کے لیے حکومت کا کوئی خزانہ تھا۔ سبھی رضا کار تھے اور سب کے لیے ضروری تھا کہ اپنا خرچ خود اٹھائیں اور ہو سکے تو دوسروں کا بھی خرچ اٹھائیں۔ پس فرمایا جو لوگ فی الحقیقت مقدور نہیں رکھتے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان پر الزام آئے۔ خصوصاً یہ لوگ جن کے ایمان واخلاص کا عالم یہ ہے کہ جب ان کے لیے سواری کا انتظام نہ ہو سکا اور آپ کے ادب واحترام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی کہ زیادہ اصرار کریں تو وہ خاموش ہو کر لوٹ گئے۔ لیکن آنکھیں جو درد دل کی غماز ہیں خاموش نہ رہ سکیں۔ غم وحسرت کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

زچشم آستیں بردار واشکم را تماشا کن

پھر یہ رونا وقتی نہیں تھا کہ کچھ آنسو بہے اور آنکھیں تازہ ہو گئیں۔ بلکہ ابن جریر کی روایت ہے کہ گریہ کی کیفیت ان پر یہاں تک طاری رہی کہ لوگوں نے ان کا نام بَکَّائِیْن رکھ دیا یعنی بہت رونے والے۔

امتیاز:

یہ ہے فرق مومن اور منافق کا۔ کہاں وہ منافق کہ قدرت رکھنے پر بھی حیلے بہانے نکالتے ہیں اور کہاں یہ مومنین با اخلاص اور دردمندان عشق کہ مقدرت نہ رکھنے پر دل کی لگن چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ آنسوؤں کا طوفان ہے جو آنکھوں سے اُمنڈ رہا ہے۔ سبحان اللہ۔ ان آنسوؤں کی قدر و قیمت جو ایمان کی تپش سے بہے تھے؟ کہ ہمیشہ کے لیے ان کا ذکر کتاب اللہ نے محفوظ کر دیا۔ آج بھی کہ تقریباً چودہ صدیاں گذر گئیں ممکن نہیں کہ ایک مومن یہ آیت پڑھے اور ان آنسوؤں کی یاد میں خود اس کی آنکھیں بھی اشکبار نہ ہو جائیں۔

مومنین صادقین ان کی حیثیت اور ان کا پروگرام

غزوہ تبوک۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کا آخری غزوہ ہے اور یہ سورت اگرچہ آخری سورت نہیں ہے مگر ایسے وقت نازل ہوئی ہے جب دعوت اسلام ایک دور سے گذر کر دوسرے دور میں میں داخل ہو رہی ہے۔

عرب کے کونہ کونہ میں اسلام پہونچ چکا ہے۔ پختہ مکانات میں رہنے والے شہریوں سے لے کر کچی جھونپڑیوں، کمبلوں اور کھالوں کے خیموں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں رہنے والے بدووں تک دعوت اسلام پہنچ چکی ہے۔ یہ سب حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو دربار رسالت میں حاضر ہو کر زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں اور ایک ہی نظر میں دلوں کی دنیا بدل چکے ہیں بہت سے وہ بھی ہیں جنہیں حاضری کا موقع نہیں مل سکا۔ انہوں نے اپنی پہاڑی گھاٹیوں یا صحرائی خیموں میں رہتے ہوئے اپنے قبیلوں کے نمائندوں سے اسلام کی باتیں سنیں ان پر عمل شروع کیا ان کی مکمل تربیت باقی ہے۔ یہ غزوہ تبوک تک کے حالات ہیں۔ ہم نے اس کو دعوت اسلام کا دور اول کہا ہے۔

اس دور میں لڑائیاں بھی ہوئیں۔ مقابلے بھی ہوئے صلح اور معاہدے بھی ہوئے مگر جو کچھ ہوا حدود عرب کے اندر رہا۔ اب یہ قدم رحمت حدود عرب سے آگے بڑھ رہا ہے کہاں تک بڑھے گا اس کی کوئی حد نہیں۔ البتہ کس طرح بڑھنا چاہیے، قدم بڑھانے والوں کا نصب العین کیا ہو، ان کے اوصاف و اخلاق کیا ہوں، وہ دنیا میں کیا نمونہ پیش کریں۔ اس موقع پر یہ سوالات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

آپ سورہ توبہ کے ساتھ انفال کو بھی ملا لیجئے۔ پھر دیکھئے غزوہ بدر سے لے کر تبوک کے اس آخری غزوہ تک جہاد فی سبیل اللہ کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاد کس طرح ہو۔ کن کن سے ہو، کن اوقات میں ہو، سامان جہاد کی تیاری کس طرح ہو، اپنا اور غنیم کا تناسب کم سے کم کیا ہو، مجاہدین کے باہمی تعلقات کیسے ہوں، ان کا بھروسہ کس پر ہو، سلسلہ جنگ کب تک جاری رہے، نصرت الٰہی کب ہوتی ہے، کس طرح ہوتی ہے اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں، پسپائی کب ہو سکتی ہے، صلح کب ہو سکتی ہے، معاہدات کی اہمیت، معاہدہ کب ٹوٹتا ہے، مسلمان ملکی غیر ملکی، غیر مسلم ملکی اور غیر ملکی، جزیہ مال غنیمت، مال غنیمت ایک امانت ہے اس امانت کی تقسیم کس طرح ہو۔

مختصر یہ کہ جب ان دونوں سورتوں میں اس پورے دور کے اہم واقعات پیش کرتے ہوئے یہ تمام مسائل سمجھا دیئے گئے ہیں اور گویا ایک جنگی دستور اساسی مسلمانوں کو عطا فرمایا گیا ہے تو پھر بطور خلاصہ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جب مسلمان اس دوسرے دور میں داخل ہو رہے ہیں تو ان کا نصب العین کیا ہو۔

دین اسلام اللہ کا دین ہے۔اس کا بانی اللہ تعالیٰ ہے۔دین اور بانی دین کے پیش نظر ان کی حیثیت کیا ہے جو اپنے آپ کو حاملین دین سمجھتے ہیں۔اس حیثیت کو تسلیم کر کے انہیں کیا ہونا چاہیے اور جب وہ پیکر وفا بن کر جلوہ انداز ہوں گے تو اس کے نتائج خود ان کے حق میں کیا ہوں گے اور عالم انسانیت کے حق میں کیا ہوں گے۔

نصب العین:

ارشادربانی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (تا) بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ توبہ ع ۱۴)

ترجمہ: ''بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں اور ان کے مال بھی اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کے لیے جنت کی جاودانی زندگی ہو۔(کسی دنیوی یا اپنے ذاتی مقصد کے لیے نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا (اس نے ایسا ہی قانون ٹھیرا دیا) تورات انجیل اور قرآن تینوں کتابوں میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو۔پس مسلمانو اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا ہے۔خوشیاں مناؤ اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے (ان لوگوں کے اوصاف و اعمال کیا ہیں اور کیا ہونے چاہیں؟ یہ ہیں) اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے، والے اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے، سیاحت کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدود کی حفاظت کرنے والے۔''

اے پیغمبر (یہی سچے مومن ہیں) اور مومنوں کو ابدی کامیابی اور لازوال سعادت کی خوش خبری دیدو۔'' (سورہ توبہ ع ۱۴)

ترجمہ پر دوبارہ نظر ڈالئے۔سب سے پہلے مومن کی حیثیت یا یہ کہو کہ حب ایمانی کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

حیثیت

یہ جو کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے تو ایمان کا معاملہ یوں سمجھو کہ انہوں نے اپنا سب کچھ اللہ کے ہاتھ بیچ ڈالا۔جان بھی اور مال و متاع بھی۔اب ان کی کوئی چیز اپنی نہیں رہی اب ان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہیں اللہ کے ہیں ان کا جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔

اچھا اس پیشکش کا معاوضہ اللہ کی طرف سے کیا ہوا۔یہ ہوا کہ نعیم ابدی کی کامرانیاں انہیں عطا ہوئیں۔

یہ گویا خرید وفروخت کا ایک معاملہ تھا جو اللہ تعالیٰ میں اور عشاق حق میں طے پا گیا۔ اب نہ بیچنے والا اپنا متاع واپس لے سکتا ہے نہ خریدنے والا قیمت لوٹائے گا۔ (۹۸۶)

اوصاف وخصائل اور مدارج:

ان سچے مومنین کے اوصاف کیا ہونے چاہئیں۔

(۱) التائبون۔ یعنی وہ جو اپنی توبہ میں سچے اور پکے ہوتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنی غفلتوں اور لغزشوں پر نادم رہتے ہیں۔

(۲) العابدون۔ یعنی وہ جو اللہ کی عبادت میں سرگرم رہتے ہیں اور ان کی ساری بندگیاں اور نیازمندیاں صرف اسی کے لیے ہوتی ہیں۔

عبادت نماز روزہ، حج اور زکوۃ بھی ہے۔ یعنی خاص وقتوں اور خاص شکلوں کی عبادتیں جو دین حق نے مقرر کی ہیں انہیں پورے اخلاص اور خشوع کے ساتھ ادا کرے اور عبادت یہ بھی ہے کہ ان ظاہری شکلوں کی روح اس کے دل ودماغ میں سرایت کر جائے اس کی فکری حالت عابدانہ ہو جائے۔ پھر وہ جو کچھ سنے، جو کچھ کہے، جو کچھ وہ کرے سب میں عابدانہ روح کام کر رہی ہو۔

(۳) الحامدون۔ یعنی وہ جو اپنی زبان، دل، فکر اور عقل وفہم سے اللہ تعالیٰ کی ستائش کرتے رہتے ہیں۔

> زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش رات دن کی گردش، ہواؤں کا چلنا بادلوں کا دوڑنا، ابر رحمت سے خشک زمینوں کا شاداب بن جانا، خشکی اور تری کی بیشمار مخلوقات۔ ان سب پر انسان کا اقتدار ان تمام چیزوں میں ارباب بصیرت کے لیے قدرت خداوندی کی نشانیاں ہیں۔ ان نشانیوں میں غور وخوض۔ ان سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا، اس کے جمال وکمال کا گرویدہ ہونا۔ اس کی محمودیت ومحبوبیت کے نقوش دل میں جمانا۔

یہ ہے فکر کی محمودیت ومحبوبیت کے نقوش دل میں جمانا۔

اور جس ہستی کی محمودیت ومحبوبیت دل ودماغ میں بس جائے گی ضروری ہے کہ زبان سے بھی بے اختیار اس کی حمد وثنا کے ترانے نکلنے لگیں۔

(۴) السائحون جو راہ حق میں سیاحت کرتے ہیں، علم کی تلاش میں نکلتے ہیں، پہلی قوموں اور امتوں کے حالات کی تحقیق کر کے مستقبل کے لیے سبق حاصل کرتے ہیں، راہ حق میں جدوجہد کرتے ہوئے دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پہنچتے ہیں، حج کے لیے خشکی اور تری کی مسافتیں طے کرتے ہیں۔ (وغیرہ وغیرہ)

(۵) الراکعون الساجدون۔ وہ جو اللہ کے آگے جھک جاتے ہیں اور رکوع اور سجود سے کبھی نہیں تھکتے۔ یہ رکوع اور سجود کی حالت جسم پر بھی طاری ہوتی ہے اور قلب پر بھی۔ جذبات ورجحانات بھی اس سے متاثر ہوتے

ہیں اور اس کے اقوال و اعمال میں بھی اس کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔

(۶) الامرون بالمعروف والناھون عن المنکر۔ وہ جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ یعنی صرف اپنے ہی نفس کی اصلاح پر قانع نہیں ہو جاتے بلکہ دوسروں کی بھی اصلاح کرتے ہیں اور دنیا میں حق و انصاف کے رواج و قیام کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

(۷) الحافظون لحدود اللّٰہ۔ یعنی انفرادی زندگی ہو یا جماعتی۔ خانگی ہو یا کاروباری جہاں جہاں جو حدیں اللہ نے قائم کی ہیں ان کے محافظ رہتے ہیں۔ خود بھی ان کی پابندی کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی پابندی کراتے ہیں۔ یہ وہ حدیں ہیں کہ اگر یہ ٹوٹتی ہیں تو عالم انسانیت کے امن اور ترقی و اصلاح کی بنیادیں اکھڑ جاتی ہیں۔

یہ اوصاف و اخلاق جن کا تذکرہ اوپر کے سات نمبروں میں کیا گیا جوان داعیان اسلام کے اوصاف و کمالات ہونے چاہییں جو دعوت اسلام کا نصب العین لے کر حدود عرب سے باہر قدم رکھ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آج ۹ھ میں جب غزوہ تبوک سے فراغت ہو چکی ہے کیا ان اوصاف کی تعلیم آج دی جا رہی ہے اور آج مسلمانوں پر لازم کیا جا رہا ہے کہ وہ ان اوصاف و کمالات سے آراستہ ہوں یا کوئی جماعت ہے جو ان اوصاف سے آراستہ ہو چکی ہے اور ہو بہو یہ کمالات اس کی فطرت بن چکے ہیں۔ قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ جماعت صحابہ وہ ہے جو ان اوصاف سے آراستہ ہے۔ یہ کمالات اس کی فطرت کا جوہر بن چکے ہیں اور یہ آیت ان کی تصویر کھینچ کر دنیا انسانیت کے سامنے ایک مقدس نمونہ پیش کر رہی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (الآیۃ ع ۱۲)

''اور مہاجرین اور انصار میں جو لوگ سبقت کر کے سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نعیم ابدی کے باغ تیار کر دیئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اس لیے وہ خشک ہونے والے نہیں ہیں) وہ ہمیشہ اسی نعمت اور سرور کی زندگی میں رہیں گے اور یہ ہے بہت ہی بڑی فیروز مندی۔''

(سورہ توبہ ع ۱۳)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امت کے بہترین طبقے تین ہیں۔

(الف) مہاجرین میں سے ''سابقون اولون'' یعنی مکہ کے وہ حق پرست جنہوں نے دعوت حق کی قبولیت میں سبقت کی اور سب سے پہلے ایمان لائے۔ پھر صلح حدیبیہ سے پہلے کہ انتہائی غربت اور مصیبت کا زمانہ تھا۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی۔

بالاتفاق سب سے پہلے ایمان لانے والی ہستی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا وارضاہا کی تھی۔ ان کے بعد گھر کے آدمیوں میں سے حضرت علی (جن کی عمر تقریباً دس سال تھی) اور زید بن حارثہ ایمان لائے (رضی اللہ عنہم) اور باہر کے آدمیوں میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔

(ب) انصار میں سے ''سابقون اولون'' یعنی مدینہ کے وہ حق شناس جنہوں نے عین اس وقت جب کہ تمام جزیرہ عرب داعی حق کو جھٹلا رہا تھا اور خود اس کے اہل وطن اس کے قتل و ہلاکت کے درپے تھے دعوت حق قبول کی اور عقبہ اولیٰ، ثانیہ اور ثالثہ میں بیعت کا ہاتھ بڑھایا۔ پہلی بیعت میں دو (۲) دوسری میں بارہ (۱۲) اور تیسری بیعت میں ستر مرد اور دو (۷۲) عورتیں تھیں۔

(ج) وہ لوگ جو ان دونوں جماعتوں کے قدم بقدم چلے اور گو بعد کو آئے مگر ان کا شمار پہلوں ہی کے ساتھ ہوا (چونکہ بعد کے آنے والوں میں بعض منافق اور کچے دل کے آدمی بھی تھے۔ اس لیے باحسان کی قید لگا دی اور یہ کہا گیا کہ جنہوں نے راست بازی سے ان کی پیروی کی)

دنیا میں جب کبھی سچائی کا ظہور ہوا ہے تو اس کا پہلا دور ہمیشہ غربت اور بیکسی کا رہا ہے اور ان ساری دنیوی ترغیبوں سے خالی رہا ہے جو کسی انسان کے دل کو مائل کر سکتی ہیں۔ پس جو نفوس قدسی اس وقت حق کا ساتھ دیتے ہیں ان کی حق شناسی اور حق پرستی کے درجہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ وہ داعی حق کا پہلے پہل ساتھ دے کر خود بھی داعیان حق کے گروہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کی حق پرستی دنیا کے ہر طرح کے تاثرات سے ایک قلم منزہ ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام میں مہاجرین وانصار کی جماعت کا یہی مقام ہے اس لیے السابقون الاولون سے زیادہ ان کے وصف میں کچھ کہنا ضروری نہ ہوا کیونکہ یہاں اسبقیت اور اوّلیت سے بڑھ کر کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے پہل حضرت ابوبکر کو دعوت دی اور اس پیکر صدق وصفا نے سنتے ہی قبول کر لی۔ تو غور کرو اس وقت اس معاملہ کا حال کیا تھا۔

پورے کرہ ارض میں تن تنہا دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک نے بلایا تھا دوسرا دوڑ گیا تھا۔ جس نے بلایا اس کے اندر وحی الٰہی کا یقین بول رہا تھا۔ لیکن جو دوڑا اس نے کیا دیکھا تھا کہ ایک عجیب وغریب بات سنتے ہی قبول کر لی اور بیٹھے بٹھائے تمام ملک اور قوم کو اپنا دشمن جانی بنا لیا۔

یاراں خبر دہید کہ این جلوہ گاہ کیست

اس طرح غور کرو جب عقبہ اولیٰ میں دو اور عقبہ ثانیہ میں بارہ آدمی بیعت کر رہے تھے تو کس سے کر رہے تھے کس حال میں کر رہے تھے۔ جس مظلوم کو گیارہ برس سے تمام جزیرہ عرب جھٹلا رہا تھا اور جو خود اپنی قوم اور اپنے وطن میں دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس نے کہا مجھے قبول کر لو اور ساری دنیا کی دشمنی مول لے لو اور ان عشاق حق نے کہا۔ ہم نے قبول کیا اور تیرے لیے سارے جہان کی دشمنیاں اور ہر طرح کی مصیبتیں اپنے سر لے لیں۔

دو عالم نقد جاں بردست دارند
بہ بازارے کہ سودا تو باشد

یہی وجہ ہے کہ یہاں ان کا معاملہ ایسے پیرایہ میں پیش کیا گیا۔ جس سے بڑھ کر پیرایہ بیان عشاق حق کے لیے نہیں ہوسکتا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

منافقوں کی تعداد:

کلام اللہ کی عظمت شان اس کو گوارا نہیں کرتی کہ افراد کا نام لے کر ان کی مذمت کرے بلکہ ان کے اوصاف اور خصوصیات بیان کر کے ان پر تنقید کی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ افراد اور اشخاص کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ امراض قابل اصلاح ہیں اور جب تک وہ مرض باقی ہے مذمت اور نکارت باقی ہے۔

اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ اس وصف کا مصداق کوئی شخص موجود ہی ہو۔ مثلاً ارشاد ہوا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (سورہ بقرہ ع ۵۲)

"کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی باتیں تمہیں اس دنیاوی زندگی میں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو شاہد بھی بناتا رہتا ہے۔ (خدا شاہد ہے میرے دل میں کچھ نہیں) حالانکہ وہ سخت قسم کا جھگڑالو ہوتا ہے۔"

اس آیت میں انسانی طبعیت کی ایک بہت ہی قابل نفرت کمزوری بیان کی گئی ہے کہ دل میں کینہ کپٹ بھرا ہوا ہے مگر چکنی چپڑی باتیں کر کے مخاطب کو موہ لینا چاہتا ہے اور اپنی بات میں قوت پیدا کرنے کے لیے یہ قسمیں بھی کھاتا رہتا ہے۔

اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک یا چند اشخاص ایسے ہوئے ہوں اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس طرح کی خصلت کا مظاہر کیا ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی گروہ میں ایسے افراد ہوتے اور بکثرت ہوتے ہیں۔

اس تمہید کا منشا یہ ہے کہ ان آیتوں کا جو منافقین کے حق میں گذری ہیں پیرایہ بیان بھی یہی ہے۔ کسی کا نام نہیں لیا گیا۔ وصف بیان کیا گیا ہے۔ پھر وہ وصف بھی ایسے انداز سے کہ کسی خاص شخص کی نشان دہی نہیں کی گئی۔

اب جو عام الفاظ ان صفات کے بیان کرنے میں لائے گئے ہیں ایک ناواقف کو ان سے مغالطہ ہوتا ہے کہ شاید بہت سے آدمی ہوں گے جو ان اوصاف سے متصف ہوں گے اور اس بنا پر کبھی دماغ پر یہ اثر پڑتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود میں خدا جانے ان کی تعداد کتنی زیادہ ہوگی۔

یہاں یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ الفاظ اگرچہ ہمہ گیر ہیں مگر ان منافقین اور کمزور ایمان والوں کی تعداد ایسی

تھی کہ اگر یہ دور مسعود نہ ہوتا۔یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دور مقدس نہ ہوتا۔جس میں تقویٰ طہارت اور مکارم اخلاق کا آفتاب نصف النہار پر تھا تو شاید ان کا پتہ بھی نہ چلتا۔

صاف وشفاف آئینہ پر مکھی کی بیٹ بھی جو سوئی کے ناکہ کے برابر ہوتی ہے پہاڑ معلوم ہوتی ہے اور بسا اوقات دیکھنے والے کی نظر پہلے اسی پر جاتی ہے۔یہی حال اس زمانہ کے بدخو منافقوں کا بھی تھا۔وہ بدنما داغ ضرور تھے مگر ان کی بدنمائی بھی زیادہ نمایاں اسی لیے ہوئی کہ وہ جماعت صحابہ کے صاف اور شفاف آئینہ سے چھو رہا تھا۔ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی مجموعی تعداد شاید پچاس بھی نہ ہو۔کیونکہ آپ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے بیان میں پڑھ چکے ہیں کہ غزوہ تبوک سے واپسی پر جن لوگوں نے اپنے بناوٹی عذر پیش کیے جن میں منافقوں کے علاوہ کمزور ایمان کے اعراب اور بدوی بھی تھے ان کی تعداد کچھ اوپر اسی تھی اسی طرح جو لوگ مسجد ضرار کی بنا وتعمیر کے ذمہ دار تھے ان کی تعداد دس بارہ تھی جب کہ اس غزوہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد تیس ہزار بیان کی گئی ہے۔

تعلیم کی اہمیت

غزوہ تبوک کے سلسلہ میں تقریباً نصف سورہ توبہ کی تفسیر بیان کی جا چکی ہے اس تفسیر میں جس بات کو نمایاں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مستقبل کے متعلق امت مرحومہ کو ہدایات دی گئی ہیں۔ان کے فرائض بیان کیے گئے ہیں۔ اوصاف واخلاق کی تعلیم دی گئی ہے نصب العین کو بلند سے بلند تر کیا گیا ہے اس سلسلہ میں ایک خاص مسئلہ جو زیادہ مستحق توجہ ہے وہ مسئلہ تعلیم ہے۔

حیرت ہوتی ہے۔تعلیمی جدوجہد کو بھی وہی اہمیت دی گئی ہے جو جہاد فی سبیل اللہ قتل وقتال اور راہ خدا میں جانی اور مالی قربانیاں پیش کرنے کو دی گئی ہے۔

غور فرمائیے۔سورہ توبہ کا پندرھواں رکوع جس کے آغاز میں مسلمانوں کو یہ ہدایت ہے کہ خدا سے تقویٰ کرو اور اہل صدق کے ساتھ رہو۔اس رکوع میں جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے جو سفر ہو اس کے قدم قدم پر ثواب ہے اس سفر میں جو زحمت بھی ہو وہ باعث اجر عظیم ہے۔

بھوک پیاس کی تکلیف ہو، موسم کی پریشانی ہو، حالات کی ناموافقت ہو، جو خرچ ان کو کرنا پڑے۔جو وادی ان کو طے کرنی پڑے ان میں سے ہر ایک میں ثواب ہے ان سب ناگواریوں کو عمل صالح کی فہرست میں درج کیا جاتا ہے۔جیسے ہی یہ بیان ختم ہوا ہے فوراً ارشاد ہوا:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (سورہ توبہ ع ۱۷)

''یہ تو ممکن نہیں کہ سب کے سب مسلمان نکل کھڑے ہوں (اور تعلیم دین کے کسی مرکز میں پہنچ کر تعلیم وتربیت حاصل کریں) پس ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ان کے ہر گروہ میں سے

ایک جماعت نکلے اس جماعت کے افراد علم حاصل کریں دینی بصیرت اور علمی حذاقت و مہارت حاصل کریں اس طرح وہ فاضل و کامل ہو کر جب اپنے گروہ میں واپس آئیں تو اپنی اپنی قوموں کو جہالت وغفلت کی خرابیوں سے آگاہ کریں۔ یہ ایک ایسی صورت ہے جس پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کی قومیں خرابیوں سے بچیں گی (ان کی اصلاح ہوگی اور وہ دینی و دنیاوی ترقی کرسکیں گی۔''

سلسلہ کلام کا ربط یہ ثابت کرتا ہے کہ دینی بصیرت اور تعلیمی مہارت حاصل کرنے کے لیے جو سفر ہوگا وہ بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس کے مراتب بھی وہی ہیں جو مجاہدین فی سبیل اللہ کے سفر کے ہیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہی سمجھا اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی یہی تشریح فرمائی۔

کثیر بن قیس ایک جلیل القدر تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں دمشق کی جامع مسجد میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص آیا اس نے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

میں آپ کی خدمت میں مدینۃ الرسول (مدینہ منورہ) سے آرہا ہوں۔ صرف ایک حدیث کے متعلق تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ صرف اسی غرض سے یہ (ایک مہینہ کا) سفر طے کیا ہے اس کے علاوہ اور مجھے کوئی کام نہیں۔

یہ طالب جو مدینہ منورہ سے آیا تھا ابھی اس نے اس حدیث کا ذکر بھی نہیں کیا تھا جس کی تحقیق کے لیے یہ مدینہ سے چل کر آیا تھا کہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرمانے لگے۔

(اگر آپ صرف اسی غرض سے آئے ہیں کہ علم حاصل کریں تو میں مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے آپ کو ایک خوشخبری سنا دوں) میں نے خود سنا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی ایسے راستے پر چلے جس کا مقصد طلب علم ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسے راستے پر چلائے گا جو جنت کو لے جانے والا راستہ ہوگا اور واقعہ یہ ہے کہ طالب علم کی خوشنودی کے لیے فرشتے پر بچھاتے ہیں اور جو صاحب علم دوسروں کو بھی تعلیم دے اس کے لیے زمین اور آسمان کی ہر چیز یہاں تک کہ وہ مچھلیاں بھی جو پانی کی گہرائیوں میں ہوں دعا کرتی رہتی ہیں۔ (صحاح)

آپ ''اوصاف وخصائل اور پروگرام'' کے سلسلہ میں ''السائحون'' کی تشریح ملاحظہ فرما چکے ہیں یعنی سیاحت کرنے والے۔

سیاحت سے کیسی سیاحت مراد ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں الذین یسیحون فی الارض لطلب العلم یعنی سیاحت سے علمی سیاحت مراد ہے۔ یعنی جو لوگ طلب علم کے لیے سیاحت کرتے ہیں اور مہینوں کی منزلیں طے کرکے کسی محدث یا فقیہ کے پاس پہنچتے ہیں اور اس سے علم حاصل کرتے ہیں۔

اللھم وفقنا لما تحب وترضی واجعل الاخرۃ خیرا لنا من الاولی

جہاد فی سبیل کے سلسلہ میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی خدمات کا بیان ختم ہوا۔ صحابہ کرام۔ خلفاء راشدین اور خلافتِ راشدہ سے متعلق دیگر مباحث ازالۃ الخفاء سے اخذ کر کے تیسری جلد میں پیش کیے جائیں گے (انشاء اللہ)

محتاج دعا محمد میاں (رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً)
۲۲ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ ۸ جولائی ۱۹۶۹ء

حواشی

(۱) سیدنا شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ موضح القرآن میں تحریر فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے ان کی اولاد اوران سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا پھر بہشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعا یہ کہ خدا کی خدائی ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت ہے۔ (یعنی ہر شخص خود ذمہ دار ہے) پھر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا تو پھر کیا حاصل؟ تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ سارا جہان قائل ہے اور جو منکر ہے یا شرک کرتا ہے سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے۔

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فتح الرحمٰن میں فرماتے ہیں: یعنی از بنی آدم پیمان گرفت برائے پیغامبران۔

(۳) آیت کے سیاق پر نظر ڈالیے اس کا تعلق مادی ترقیات سے ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ میں ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُتارا آسمان سے پانی پھر ہم نے نکالے اس سے میوے طرح طرح ان کے رنگ اور پہاڑوں میں گھاٹیاں ہیں سفید اور سرخ طرح طرح ان کے رنگ اور کالے بھجنگ اور آدمیوں میں اور کیڑوں میں اور چوپایوں میں کئی رنگ کے ہیں اسی طرح اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے (سورہ فاطر ع)

(۴) اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے انبیاء علیہم السلام کو علاتی (باپ شریک) بھائیوں سے تشبیہ دی ہے۔ **الانبیاء اولاد علات** (بخاری شریف) بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں **امھاتھم شتی و دینھم واحد**۔ ان کی مائیں مختلف ہیں اور دین ایک ہے۔ بس دین پدر اور باپ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ جزوی احکام جو یکے بعد دیگرے آتے رہے یا مختلف زمانوں یا مختلف ملکوں میں جو بدلتے رہے وہ امہات (مائیں) ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

(۵) قال اللہ تعالیٰ۔ ملة ابیکم ابراھیم ھو سما کم المسلمین (سورہ حج)

(۶) یہ میرا رب ہے۔ یہ بہت بڑا ہے۔

(۷) سیدنا حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے فلک کا ترجمہ ''گھیرا'' کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے الفاظ میں پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے۔ نہ سورج کو پہنچے کہ پکڑے چاند کو اور نہ رات آگے بڑھے دن سے ہر کوئی ایک ایک گھیرے میں تیرتے ہیں۔

(۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ نے ہمیں یہ سبق بھی دیا کہ عقل سلیم وجود خدا اور توحید تک رہنمائی کر سکتی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے صفات اور خود انسان کے مآل وانجام جیسے مسائل میں عقل کی رہنمائی کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے وحی الٰہی کی ضرورت ہے اسی وجہ سے توحید یعنی خدا کو ماننے اور اس کے لاشریک ہونے پر اعتقاد رکھنے کے وہ بھی مکلف ہیں جن کو کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔ البتہ دوسرے عقائد کی تعلیم انبیاء علیہم السلام کے علاوہ عقل کے ذریعہ صحیح طور پر نہیں ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے مکلف وہ ہیں جن کو انبیاء علیہم السلام کے پیغامات پہونچے یا وہ ایسے دور میں ہیں کہ انبیاء علیہم اسلام کی تعلیمات معلوم کر سکتے ہیں۔

(۹) **وار ادو بہ کیدا فجعلنا ھم الاخسرین** (سورہ انبیاء ع ۴) ''دیکھو انہوں نے چاہا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایک چال چلیں لیکن ہم نے انہیں نامراد کر دیا۔''

(۱۰) **انی ذاھب الی ربی سیھدین (صافات ع ۳)**

(۱۱) سفر الیشاء یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

شہر بابل دارالسلطنت نمرود میں جہاں تارح یعنی آزر اور ابراہیم علیہ السلام اور ان کے تمام خاندان کے لوگ رہتے تھے ایک شخص (حکیم ہنرمند ذکی الطبع فطین جو اکثر علوم وصنائع میں کمال رکھتا تھا) رہتا تھا۔ اس کا نام رقیون تھا مگر وہ بہت مفلس محتاج ومفلوک تھا۔

تنگدستی وتنگی سے وطن میں رہنا نامناسب سمجھ کر مصر کی راہ لی۔ جب وہ وہاں پہونچا اور اس کی لیاقت ودانش مندی باشندگان مصر پر ظاہر ہو گئی تو بادشاہ مصر نے اس کو براہ قدردانی اعیان سلطنت میں داخل کیا۔ رفتہ رفتہ بالکل حاوی ہوا۔ بالآخر وہاں کا بادشاہ ہوگیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس کا لقب فرعون ہوا۔ اسی فرعون کے زمانہ بادشاہت میں بوجہ قحط سالی حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے مع اہل بیت کے مصر تشریف لے گئے۔ (النصوص الباہرہ فی حریۃ الہاجرہ)

(۱۲) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ علماء کا ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت ہاجرہ کے باپ ایک قبطی بادشاہ تھے۔ (فتح الباری باب قول اللہ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا) مگر ربی شلومو اسحاق توریت کا ایک مفسر کتاب پیدائش کے سولہویں باب کی پہلی آیت کی تفسیر میں کہتا ہے۔ وہ (ہاجرہ۔ عبرانی لفظ ھاغار) فرعون کی بیٹی تھی۔ جب دیکھا ان کی (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی کرامات کو جو بوجہ سارہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی) واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہو کر اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ۔ (النصوص الباہرہ۔ بحوالہ الخطبات الاحمدیہ)

(۱۳) توریت میں یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت چھیاسی سال تھی۔ پیدائش ۱۶/۱۶

(۱۴) چنانچہ جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی گئی تو حضرت سارہ نے بڑے تعجب سے کہا۔ **یا ویلتی الد وانا عجوز وھذا بعلی شیخا** (سورہ ہود ع ۷) ہائے مجھ نگوڑی کے اب اولاد ہوگی بڑھیا تو ہو چکی ہوں اور یہ بڑے میاں میرے شوہر بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ توریت میں ہے کہ جب حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت سارہ کی عمر نوے سال تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال (پیدائش ۱۷/۱۷، ۱۸/۱۷)

(۱۵) دوسرا نتیجہ سیدنا حضرت اسحاق علیہ السلام۔ توریت کے بیان کے بموجب حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے چودہ برس چھوٹے تھے۔

(۱۶) دعا بھولاء الکلمات ورفع یدیہ۔ (بخاری شریف) باب قولہ تعالیٰ۔ **واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا**۔ علامہ عبدالوہاب نجار کی رائے ہے کہ یہ دعا خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد کی تھی۔ قرآن پاک کے سلسلہ کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر بخاری شریف کی روایت میں اس دعا کا اسی موقع پر تذکرہ ہے۔ بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دونوں موقعوں پر یہ دعا کی۔ البتہ اس موقع پر دعا کے چند کلمات فراست اور دور بینی کی بنا پر ہیں اور تعمیر کعبہ کے بعد ایک واقعہ اور حقیقت کی بنیاد پر۔ واللہ اعلم

(۱۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت ہاجرہ اگر ڈول نہ باندھتیں تو یہ چاہ زمزم کے بجائے چشمہ زمزم ہوتا۔ (صحیح بخاری)

(۱۸) توریت کی سابق روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت اسحاق حضرت اسمٰعیل (علیہما السلام) سے چودہ سال چھوٹے تھے۔ کیونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی عمر ۸۶ سال تھی اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کے وقت سو سال اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر اس قربانی کے وقت ۱۳ سال تھی۔ اس حساب سے ذبح اسمٰعیل علیہ السلام کا واقعہ چھوٹے بھائی حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش سے ایک سال پہلے کا واقعہ ہے البتہ اگر قربانی کے وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر ۱۵ سال تھی جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ تب اکلوتا فرزند کہنا نہیں ہوگا۔ البتہ چہیتا کہہ سکتے ہے۔ واللہ اعلم

(۱۹) **رب ھب لی من الصالحین (صافات)**

(۲۰) **فبشرناہ بغلام حلیم (صافات)**

(۲۱) سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ آپ کو معلوم ہے۔ قربانی اور اس کے نتیجہ میں برکت وافزائش کا فلسفہ یہیں سمجھ میں آتا ہے۔ نسل ابراہیمی کی دوسری شاخ حضرت اسحاق علیہ السلام سے چلی۔ وہ بنو اسحاق کے بجائے بنو اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ کئی ہزار سال تک فضیلت کا تاج اس کے سر پر رہا۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا خطاب تھا۔ یہ مشہور ہے یوسف کا قصہ تھا۔ فضیلت اور افزائش بنی اسرائیل کی شرط پوری ہوئی اور کیا اس شاخ کو بنو اسحاق کے بجائے بنو اسرائیل کا خطاب ملنے سے یہ ہوا۔

حضرت اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) سے یہ شرط پوری کرائی گئی۔ ہاں حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسرائیل (یعقوب) میں ... قربانی میں فرق ہے۔ وہی فرق بنواسمٰعیل اور بنواسرائیل کے فضائل میں بھی ہے۔ محمد میاں

(۲۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام جب حضرت ہاجرہ کو یہاں چھوڑ کر روانہ ہونے لگے تو حضرت ہاجرہ نے پکار کر کہا آپ ہمیں کہاں چھوڑ رہے ہیں۔ جہاں نہ کوئی مونس ہے نہ زندگی کا کوئی سہارا حضرت ہاجرہ بار بار یہ دہائی دے رہی تھیں۔ اکلوتے بیٹے کی چہیتی ماں کی زبان سے جب یہ الفاظ نکل رہے ہوں گے تو سینہ پر ہاتھ رکھ کر سوچو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی۔ مگر یہ مقام خلت تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش تھے گویا کچھ سن ہی نہیں رہے۔ بالآخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے جس کی آپ تعمیل کر رہے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا (نعم) ہاں۔ حضرت ہاجرہ کو معلوم ہوا کہ یہ ان کے پروردگار کی مرضی ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام پورا کر رہے ہیں تو فرمایا اذا لا یضیعنا جب مرضی مولا یہی ہے تو ہمارا آقا ہمیں برباد نہیں کر سکتا۔ (بخاری شریف)

(۲۳) **وکذالک نری ابراھیم ملکوت السموات والارض** (سورۂ انعام ع ۹)

(۲۴) **ولیکون من الموقنین** (سورۂ انعام ع ۹)

(۲۵) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر بیت المقدس سے جو بنواسرائیل کا قبلہ تھا پہلے ہوئی اور آیت کا مفہوم بھی یہی قرار دیا گیا ہے مگر یہ روایت بھی قابل اعتماد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب سرزمین ہند میں اتارے گئے تو ان کو بڑی وحشت اس سے ہوئی کہ ملائکہ کی تسبیح وتحمید کے نغمے جو جنت میں سنا کرتے تھے اس سے محروم ہو گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس روحانی اذیت کی شکایت اپنے پروردگار سے کی تو حضرت حق جل مجدہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو آگاہ فرمایا کہ جس طرح میرے عرش کے گرد فرشتے طواف کرتے رہتے ہیں اسی طرح کا ایک بیت زمین میں اتار دیا گیا ہے فرشتے اس کا طواف کرتے رہتے ہیں تم وہاں جاؤ۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے قدم بڑھایا اور اس خطہ میں پہنچ گئے جہاں مکہ آباد ہونے والا تھا اور یہاں اس بیت کا طواف شروع کر دیا جو عرش معلی کا پرتو تھا جس کے گرد فرشتے طواف کرتے تھے۔ (فتح الباری ج ۱۳)

(۲۶) ہر آئینہ اول خانہ کہ مقرر کردہ شد برائے مردمان (حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ) تحقیق پہلا گھر جو ٹھہرا لوگوں کے واسطے (حضرت شاہ عبدالقادر صاحب)

(۲۷) مثلاً قرآن شریف میں ارشاد ہے:

(الف) جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور ان کے بچہ کو چھوڑ کر رخصت ہونے لگے تو اس وقت دعا کی۔ میں نے اپنی ذریت کو وادی غیر ذی زرع میں تیرے بیت کے قریب آباد کیا ہے۔ اس وقت تک حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت کی تعمیر نہیں کی تھی وہ اب سے کم از کم پندرہ سولہ سال بعد ہوئی جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اس قابل ہوئے کہ پتھر اٹھا اٹھا کر لائیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیتے رہیں۔ (ب) پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کو بھی ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ **واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت** ۔ ترجمہ: یہ نہیں ہے کہ جب بنیادیں رکھ رہے تھے بلکہ ترجمہ یہ ہے کہ جب بنیادیں بلند کر رہے تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے الفاظ میں جب بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ احادیث میں اشاروں کی بات صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ بخاری شریف کی اسی روایت میں جس کے اقتباسات ان سطور میں بار بار پیش کیے گئے ہیں۔ اسی روایت میں ہے کہ حضرت ہاجرہ کو فرشتہ نے اطمینان دلایا کہ ہلاک اور برباد ہونے کا تمہیں خوف نہ ہونا چاہئے یہاں بیت اللہ ہے۔ یہ لڑکا اور اس کا باپ اس کی تعمیر کرے گا۔

بیہقی اور مصنف عبدالرزاق کی روایتیں فتح الباری کے حوالہ سے پہلے بھی آ چکی ہیں کہ بیت اللہ کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے ڈالی تھی طوفان نوح کے زمانہ میں اس کو اٹھا لیا گیا تھا ہر دور میں انبیاء علیہم السلام اس کا طواف کیا کرتے تھے یہ عرش الٰہی کا پرتو ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام جب فرشتوں کی تسبیح نہ سن سکے تو پریشان ہو کر اللہ تعالیٰ سے التجا کی تو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی یہ جگہ بتائی کہ یہاں

پہنچو یہاں بھی فرشتے طواف کرتے رہتے ہیں۔

(۲۸) اکمة مرتفعة علی ماحولها (بخاری شریف باب یزفون النسلان فی المشی) ٹیلہ جو اپنے اردگرد کی زمین سے بلند تھا۔

(۲۹) وکان البیت مرتفعا من الارض کالرابیة تاتیه السیول فتاخذ علی یمینه وشماله (بخاری شریف باب مذکور)

(۳۰) واذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت (الایہ۔ سورہ بقرہ ع ۱۵)

(۳۱) واذ بوانا لا ابراهیم مکان البیت الایۃ۔ سورہ حج ع ۴۳)

(۳۲) دھندا یہی ہے۔ فطرت ایک حرکت میں مصروف ہے۔ جیسے جیسے اسباب مہیا ہوتے رہتے ہیں ان کے نتیجہ کی درخواست بارگاہ رب العالمین میں پیش ہوتی رہتی ہے۔ وہاں سے اس کا جواب صادر ہوتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ سبب کا نتیجہ اور علت کا معلول ہے۔ مگر کارخانہ قدرت کے واقف کاروں کی شہادت یہ ہے کہ سبب کا سبب ہونا بھی امر الٰہی سے ہے اور علت کا علت ہونا بھی فیضان قدرت اور حکم خداوندی سے ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ''شان'' کی تفسیر فرماتے ہیں یعنی تعذیب یا تنعیم ۔ اسعاد یا اشقاء احیاء یا اماتہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳۳) یہ اجتماع ضدین کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ سے یہ انتہائی تقریب کہ شرف ہم کلامی حاصل ہوتا ہے اور قلب مبارک اشارات خداوندی اور مرضیات الٰہیہ کے لیے مطلع اور مشرق کی شان رکھے۔ دوسری طرف اتنی عاجزی اور لاچاری کہتری اور ہیچ تری کا یقین۔ نبی اور رسول کا ظرف ہی اس اجتماع ضدین کو برداشت کرسکتا ہے۔ کسی اور کے ظرف میں یہ صلاحیت نہیں۔ مزید وضاحت مطلوب ہوتو غور فرمائیے جو انبیاء علیہم السلام کی گرد کو بھی نہیں پہنچے کس طرح بھٹک گئے ہیں۔ انتہا یہ کہ کوئی نعرہ لگا نے لگا انا الحق کسی نے کہہ دیا۔ لوائی فوق لواء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

(۳۴) یعنی مقصد اول کی فصل ششم میں جس میں قرآن پاک کی ان آیات کو بھی ذکر کیا ہے جو اگرچہ خاص طور پر حضرات خلفاء سے متعلق نہیں ہیں مگر ان میں حضرات خلفاء کی فضیلتوں اور ان کے کارناموں کی طرف اشارے موجود ہیں کسی میں خلافت خاصہ کی طرف اشارہ ہے۔ نیز اس فصل میں وہ آیتیں ہیں جو حضرات خلفاء کی موافقت اور تائید کررہی ہیں اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن کا سبب نزول خلفاء اربعہ یا ان میں سے کوئی ایک ہوئے ہیں۔

(۳۵) فصل ششم آیت سوم۔ اس آیت کے تحت میں جو حدیثیں ازالۃ الخفا میں پیش کی گئی ہیں ان کو ہم نے چند صفحوں کے بعد بشارت عیسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں پیش کیا ہے۔

(۳۶) آیت ۲۶ فصل ششم مقصد اول۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''اکتب'' کی تفسیر فرماتے ہیں۔ مقدر کن ودر صورت تحفہ۔ ثبوت حسنہ نازل گردان و صورت مثالیہ ثبوت حسنہ در دنیا و آخرت برائے امت من مخلوف فرما۔ حضرت شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ قبولیت دعا کا نتیجہ تو عرصہ بعد ظاہر ہوگا فی الحال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست یہ تھی کہ (الف) عالم صورت میں یعنی حسنہ تحفہ مقدر میں یہ درج فرما دے کہ ان کو حسنہ نیکی اور بھلائی نصیب ہوگی (ب) عالم مثال میں حسنہ کی تصویر قائم کردے۔ یعنی دنیا و آخرت میں جس طرح یہ بھلائی اور خوبی پیش آنے والی ہو اس کی مثالی ہیئت قائم فرمادے۔ یہ وہ دو کام ہیں جو کردے۔ لفظ ''اکتب'' جو آیت میں ہے اس کا مطلب یہی ہے۔

(۳۷) حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنا یہود و نصاریٰ پر تو اس لیے لازم ہوگیا کہ توراۃ اور انجیل میں آپ کے اوصاف موجود ہیں اور تمام دنیا پر اس لیے لازم ہوگیا کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی جلالت وعظمت آپ کے معجزات اور آپ کی صداقت وللہیت دنیا کے مسلمات میں شامل ہے۔ لہٰذا تمام دنیا کے لیے خود یہ حجت قائم ہو گئی ہے۔

(۳۸) اس اونٹنی کا بچہ خریدنا یا اس کی نسل کا کوئی بچہ خریدنا جائز ہے۔ جواز میں کلام نہیں مگر راہ خدا میں دی ہوئی چیز سے ذاتی نفع حاصل کرنے کا معمولی سا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اعلیٰ تقویٰ کے لیے اس معمولی سے شبہ کو بھی پسند نہیں فرماتے اس سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی شان تقویٰ کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

(۳۹) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ عمل مقبول ہے اور یہ اخروی حسنہ ہے لہٰذا یہ حدیث آیت سے تعلق رکھتی ہے۔

(۴۰) ہمارے یہاں جو قراءت مشہور اور رائج ہے اس میں ریشا سے پوری آیت یہ ہے۔ **یابنی ادم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سواتکم وریشا ولباس التقوی ذلك خیر** ۔ اے اولاد آدم! ہم نے اتاری تم پر پوشاک کہ ڈھانکے تمہارے عیب اور رونق بنے اور کپڑے پرہیزگاری کے سو بہتر ہیں۔ (سورہ اعراف رکوع ۳)

(۴۱) لباس التقویٰ کی تفسیر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے السمت الحسن فرمائی ہے یعنی بہتر اوصاف وخصائل اور بہتر کیرکٹر فیشن کے شوقین حضرات کے لیے یہ آیت خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ بیشک اجازت ہے کہ آپ یورپین وضع اختیار کریں مگر اللہ کے یہاں وہ لباس پسندیدہ ہے جس سے تقویٰ اور طہارت جھلکتی ہو۔ واللہ اعلم

(۴۲) استدلال کی صورت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک آیت کی تفسیر کر رہے ہیں۔ یہ تفسیر خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی شہادت ہے مزید شہادت یہ ہے کہ اس کے راوی حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہیں۔ رضی اللہ عنہم۔

(۴۳) **وان الرجل لن یھلك حتی یوثر شھوته علی دینه** ۔ ترجمہ لفظی یہ ہے کہ انسان ہرگز ہلاک نہیں ہوگا یہاں تک کہ ترجیح دے اپنی شہوت وخواہش کو اپنے دین پر۔

(۴۴) **اذا جاء اجلھم لایستاخرون ساعة ولا یستقدمون** ۔

(۴۵) اس مسئلہ کا تعلق قضاوقدر سے ہے۔ علماء نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ قضا کے دو درجے ہیں۔ ایک وہ قضا اور فیصلہ جس کا علم پرواز ملائک کو ہوتا ہے۔ دوسرا وہ قضا اور فیصلہ جو علم الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ پہلے درجہ میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور درجہ دوم میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ درجہ دوم کو قضا مبرم کہا جاتا ہے۔ یعنی (قطعی اور حتمی فیصلہ) کما قال اللہ. **ما یبدل القول لدی انظر الی قوله لدی۔**

(۴۶) ۳ سے ۸ تک جو حدیثیں پیش کی گئی ہیں ان سے ان بزرگوں کے تقوے تعلق باللہ اور ایمان بالآخرت کا پتہ چلتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اس بشارت کی تصدیق ہیں جو آیت میں دی گئی ہے کہ۔ **فسا کتبھا للذین یتقون ویوتون الزکوۃ** الخ

(۴۷) اس کے باوجود جبر نہیں ہے کیونکہ اختیار سلب نہیں ہوتا۔ شراب کا پیالہ ہاتھ میں لینے اور معاذ اللہ منہ کو لگانے کے وقت بھی انسان کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ اس کو منہ سے الگ کرلے اور پھینک دے۔ اب اگر وہ معاذ اللہ پی رہا ہے تو جبراً نہیں بلکہ اپنے اختیار سے پی رہا ہے یہ اختیار ہی ثواب یا عذاب کی بنیاد ہے۔ اگر یہ اختیار سلب ہو جائے تو انسان شرعاً مجبور مانا جاتا ہے۔ مجبور مجرم نہیں مانا جاتا۔ واللہ اعلم (مترجم)

(۴۸) قراء صاحبان

(۴۹) ملاحظہ ہو تفسیر آیت سوم از فصل سوم مقصد اول ص ۱۳۱ ج ۱

(۵۰) یہ لفظ اگرچہ اس آیت سے پہلے ہے مگر مثلھم میں خبر کا مرجع الذین معه ہیں۔

(۵۱) ملاحظہ ہو آیت ۱۵، فصل ششم

(۵۲) ایضاً ملاحظہ ہو فصل ششم تفسیر آیت سورہ انبیاء ۱۵) صفحہ ۲۱۰

(۵۳) اخرج عبداللہ بن احمد فی زوائد الزھد من طریق ابی اسحق۔ ازالہ ص ۳۲

(۵۴) اخرج ابونعیم من طریق شھر بن حوشب عن کعب (ازالہ ص ۳۲)

(۵۵) ابن عساکر۔ ازالہ ص ۳۳

(۵۶) اخرج الطبرانی و ابو نعیم فی الحلیة ازالہ ص ۳۳

(۵۷) ابن عساکر

(۵۸ الدفر ذلیل دانستن (قاموس)

(۵۹) ابن عساکر

(۶۰) اخرج ابن راہویہ فی مسندہ بسند حسن۔

(۶۱) حضرت عبداللہ بن سلام چونکہ کتب سابقہ کے بہت بڑے عالم تھے تو غالب یہ ہے کہ آپ نے کتب سابقہ میں کچھ پیشین گوئیاں اور کچھ علامتیں ایسی پائی ہوں گی یا ممکن ہے سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی بات سنی ہوگی جس سے آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت کا اندازہ کیے ہوئے تھے اسی بنا پر قریش کو تنبیہ کرتے تھے کہ وہ اس خون ناحق میں شریک نہ ہوں۔ بہرحال کتب سابقہ سے کچھ علامتیں معلوم ہوئی ہوں یا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ معلوم ہوا ہو۔ دونوں صورتوں میں اس باب سے حدیث کی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی خلفاء راشدین کے متعلق پیشین گوئیاں۔

(۶۲) ابن سعد و ابن عساکر۔ ازالہ ص ۳۳

(۶۳) ابن عساکر من طریق محمد بن یوسف عن جدہ عبداللہ بن سلام (ازالہ ص ۳۳)

(۶۴) ایضا من طریق محمد بن یوسف۔

(۶۵) حاکم (ازالہ ص ۳۳)

(۶۶) جنگ کے لیے ضروری ہے کہ کامیابی کی توقع ہو تب ہی حوصلہ بلند ہوتا ہے اسی لیے فوج کو کامیابی کا یقین دلایا جاتا ہے تاکہ کامیابی کی توقع پر فوج اور کمانڈر کے حوصلے بلند رہیں لیکن یہاں ناکامی کے یقین کے ساتھ اقدام جنگ بالکل نرالی بات ہے۔ مگر سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کی شان دوسری ہے۔ ان کے نزدیک کامیابی یہ ہے کہ راہ حق پر قدم مضبوطی سے جما رہے اس میں اگر موت بھی آتی ہے تو وہ بھی کامیابی ہے۔ شہادت کے وقت جو فزت و رب الکعبہ کہتے ہوں ان کے لیے شہادت سے زیادہ اور کیا چیز عزیز ہو سکتی ہے۔

(۶۷) ابوالقاسم البغوی۔ ازالہ الخفا ص ۳۲)

(۶۸) یہ بتانا مشکل ہے کہ ''یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ'' کس کا قول ہے۔ ذی قربات کا یا حضرت سعید بن عبدالعزیز کا جنہوں نے یہ روایت کی ہے۔ محمد میاں۔

(۶۹) ابن راہویہ و طبرانی۔ ازالہ ص ۳۳

(۷۰) ابن سعد۔

(۷۱) ابو اسحاق حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔ محمد میاں

(۷۲) ازالة الخفاء ص ۳۴۔

(۷۳) آیت ۳۔ متعلقہ مقدمہ اس پیشین گوئی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں ہے۔ ۱۲

(۷۴) ابن عساکر۔

(۷۵) ازالہ ص ۲۱۱۔

(۷۶) ابن عساکر

(۷۷) اخرجه ابویعلي و الطبراني في الاوسط و ابن عساكر و الحسن في جزئه المشهور

(۷۸) اخرجہ الدارقطنی فی الافراد والخطیب وابن عساکر

(۷۹) ازالۃ الخفاء ص ۱۴۱ فصل سوم آیت ۶

(۸۰) والذین معہ یعنی جن کو آپ رضی اللہ عنہ کی معیت حاصل ہے اس سے وہ حضرات مراد ہیں جو صلح حدیبیہ میں آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے کیونکہ ان کو معیت زمانی بھی حاصل تھی اور معیت مکانی بھی۔ لفظ مع کے یہی حقیقی معنے تھے۔ باقی دینی معیت بھی لفظ مع سے مراد ہو سکتی ہے مگر وہ ایک مجازی معنی ہیں اور جب تک کسی لفظ کے حقیقی معنی مراد لیے جا سکیں مجازی معنے مراد نہیں لیے جاتے۔ لایلتفت الی المجاز مادام للحقیقۃ مساغ (ازالۃ)

(۸۱) ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام کی صفت اور تعریف میں اس آیت میں چند الفاظ آئے ہیں مگر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کوئی لفظ نہیں آیا۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ لفظ رسول جملہ صفات پر حاوی ہے۔ کدام فضیلت است کہ در ضمن رسول اللہ نیامد و کل الصید فی جوف الفراء

(۸۲) حدیث شریف میں ہے الصلوۃ معراج المومنین۔ نماز مسلمانوں کی معراج ہے۔ یعنی جس طرح سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں بارگاہ رب العزت میں راز و نیاز اور مناجات کا موقعہ ملا تھا۔ مومن کے لیے یہ موقعہ نماز میں حاصل ہے۔ کیونکہ (بموجب ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نماز پڑھنے والا خدا سے راز و نیاز کرتا ہے۔ قال صلی اللہ علیہ وسلم المصلی یناجی ربہ (صحاح) محمد میاں

علاوہ ازیں معراج اس لیے بھی ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا خلاصہ بھی نماز ہے یعنی اس انتہائی تقرب اور روحانیت کے انتہائی عروج کا حاصل یہ تھا کہ بارگاہ رب العزت میں تقرب حاصل کرنے کا وہ طریقہ بتا دیا گیا جو سب سے اعلیٰ اور اکمل ہے جس سے آخری نبی کی امت کو نوازا گیا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) محمد میاں۔

(۸۳) حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں ذالک اینجا اشارہ است لکلمہ کزرع کقولہ تعالی وقضینا الیہ ذلک الامران دابر ھولاء

(۸۴) حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ ہیں۔ واز انہا نامے ونشانے نماند لیکن حکومت قیصر کا نام نشان تو باقی رہا اور علماء محدثین کا یہ ارشاد بالکل صحیح اور قابل قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کا جو مکتوب گرامی کسریٰ کے نام بھیجا تھا اس نے اس کو چاک کر ڈالا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس کی سلطنت بھی اسی طرح پارہ پارہ ہو جائے گی چنانچہ واقعہ یہی ہوا اس کی حکومت پارہ پارہ ہوگئی اور قیصر (ہرقل روم) نے نامہ مبارک کی عزت کی تو اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کی حکومت باقی رہ گئی۔ البتہ شام وغیرہ سے اس کی شاہنشاہیت ختم ہوگئی۔ بہر حال نام و نشان باقی نہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ (واللہ اعلم)

(۸۵) حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت سے خلفاء راشدین کی خلافت خاصہ پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ باید دانست کہ خلفاء از جملہ والذین معہ بودند بالقطع پس اشداء علی الکفار رحماء بینھم الخ وصف ایشاں باشد۔ و ایں یکے از لوازم خلافت خاصہ است۔ اس کے بعد آیت کریمہ۔ وعد اللہ الذین امنوا وعملوا الصالحات منھم کے متعلق فرماتے ہیں ضمیر منھم راجع است بانچہ آزر واستغلظ وستوی علی سوقہ مفہوم گشت (ازالۃ الخفاء ص ۴۳)

۸۶) ازالۃ الخفاص ۴۳۔ جلد اوّل تفسیر آیت ششم

(۸۷) حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان روایتوں کو فصل ششم میں تیسری آیت کے بعد نقل فرمایا ہے۔ ص ۱۵۹ محمد میاں

(۸۸) اخرجہ الدارمی عن کعب رضی اللہ عنہ

(۸۹) یہ روایت بھی دارمی نے نقل کی ہے۔ الفاظ میں معمولی فرق ہے مضمون ایک ہی ہے۔ محمد میاں

(۹۰) اس سے اس بات کی تلقین بھی ہوتی ہے کہ جماعت کی صفیں فوج کی صف کی طرح بالکل سیدھی اور ہموار ہوں اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو فوجی قواعد کا بہترین عامل ہونا چاہئے۔ ان کی فوجیں باضابطہ ہوں۔ محض بھیڑ نہ ہو ارشاد ربانی ہے۔ ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص (سورہ صف) اللہ تعالیٰ ان کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس

طرح صف باندھ کر جنگ کرتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیواریں ہیں۔

(۹۱) یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ چونکہ کتاب اللہ سے تمام امت اسلامیہ کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے قیام قیامت تک ہوگی اس سب کی تعلیم مقصود ہے اس لیے اوصاف و خصائل اور ان کے متعلق انعامات الٰہیہ کے وعدوں کے بیان کرنے میں کسی خاص جماعت یا فرد کا نام نہیں لیا گیا مگر آیات کا سیاق وسباق واضح کر دیتا ہے کہ ان خصائل واوصاف کے پہلے مصداق حضرات صحابہ ہیں ورنہ نزول قرآن کے وقت یہ تمام خطابات بے محل اور عبث ہوں گے (معاذ اللہ) مصداق کے بغیر محض ایک خیالی اور فرضی جماعت کو جس کا واقع اور نفس الامر میں وجود نہ ہو سامنے رکھ کر اس کے اوصاف کو شمار کرانا ہوا میں پل باندھنے اور خیالی پلاؤ پکانے کے مترادف ہے جس کو شاعری کہا جا سکتا ہے وگرنہ موعظہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا کوئی صاحب ایمان ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ قرآن حکیم صرف خیالی دنیا کی تصویر کھینچتا ہے۔ العیاذ باللہ۔ کلام الٰہی اس تدلیس وتلبیس اور سخن سازی سے مبرا اور منزہ ہے۔ بلاشبہ قرآنی آیتوں کے نزول کے وقت اس کے ارشادات کے مصداق موجود تھے۔ یہی وہ تھے جو دعاء ابراہیم علیہ السلام کے بموجب رحمۃ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاس قدسیہ سے فیضیاب ہوئے اور ان تمام وعدوں کے مستحق بنے جو کتاب اللہ ملت ابراہیمی اور دین محمدی (صلوات اللہ علیہم وعلی سائر الانبیاء اجمعین) کے متبعین باخلاص کے لیے کیے گئے ہیں۔

(۹۲) حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بلحاظ عرف آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خیر کے موقع پر بیدریغ خرچ کرتے ہیں۔ نہ وقت کی قید ہے نہ اظہار یا اختصار کی۔ پوشیدہ طور پر امداد کا موقع ہوتا ہے پوشیدہ امداد کرتے ہیں اور کوئی ایسا موقع ہو جہاں دوسروں کو ترغیب مقصود ہو وہاں علانیہ خرچ کرتے ہیں۔ ازالۃ الخفاء ص ۱۶۱)

(۹۳) واضح رہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ بنو تیم سے تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاشمی تھے۔

(۹۴) یہ واضح ہے کہ حضرت طلحہ جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل صف میں تھے۔ اسی جنگ میں آپ شہید ہوئے۔ روایت یہ ہے کہ آپ شہادت سے کچھ پہلے میدان سے ہٹ چکے تھے۔ آپ پر کسی نامعلوم شخص نے اچانک حملہ کیا اور آپ شہید ہو گئے اور یہ بھی روایت ہے کہ شہادت کے وقت آپ نے کسی شخص سے جو سامنے تھا فرمایا تھا کہ تم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہہ دینا کہ وہ آپ کا حامی بن کر دنیا سے جا رہا ہے۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے مگر چونکہ ان بزرگوں کی ساری مخالفت لوجہ اللہ تھی یعنی ہر شخص اس پر عمل پیرا ہونا ضروری سمجھتا تھا جو اس کے نزدیک حق تھا ان کی مخالفت کسی ذاتی مفاد یا دشمنی کی بنا پر نہیں تھی۔ لہٰذا ذاتی طور پر ان بزرگوں کے سینے صاف تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حقیقت کو ظاہر فرما رہے ہیں مگر یہ ہمدانی شخص کینہ پرور ہے وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خفگی کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے اوپر ان بزرگوں کو بھی قیاس کر رہا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر (محمد میاں)

(۹۵) ازالۃ الخفاء ص ۲۰۱ و ص ۲۰۲)

(۹۶) بدر صغریٰ جنگ اُحد سے اگلے سال کا واقعہ ہے جس کا محرک ابوسفیان کا وہ اعلان تھا جو غزوۂ احد کے موقع پر کیا گیا تھا کہ آئندہ سال ہم پھر حملہ کریں گے اور تمہاری جڑیں کھود ڈالیں گے۔ صحابہ کرام نے اس سال بھی مقابلہ کی تیاری کی۔ چنانچہ انہوں نے بہت بڑی فوج تیار کی جو جنگ اُحد کی فوج سے دوگنی تھی۔ مگر اس مرتبہ اس نے پہلے سرد جنگ کا سلسلہ شروع کیا یعنی پروپیگنڈے کے ذریعہ حضرات صحابہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ جنگ اُحد کی غیر معمولی شکست کے بعد کچھ ضرور تھا کہ مسلمان پروپیگنڈے سے مرعوب ہو جاتے مگر یہ خدا کا فضل تھا کہ ان کے حوصلے بہت بلند رہے اور جب کہ انہوں نے جوش کے ساتھ انہوں نے کوچ شروع کیا تو ابوسفیان اور اس کے تمام سورماؤں کی ہمتیں پست ہو گئیں یہاں تک کہ جان بچانے کو غنیمت سمجھا اور جنگ کیے بغیر واپس ہو گئے چونکہ اسلام بھی جنگ کو مقصود اور نصب العین کی حیثیت نہیں دیتا۔ لہٰذا جب دشمن واپس ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی واپس تشریف لے آئے۔ (محمد میاں)

(۹۷) اہل حرب سے وہ غیر مسلم مراد ہیں جن سے مہاجرین اور انصار کا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی معاہدہ ہوا تو آیت کریمہ میں معاہدہ کی پابندی کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ محمد میاں

(۹۸) مگر شرط یہ ہے کہ یہ غیر مسلم حریف آپ کا حلیف نہ ہو۔ میاں محمد

(۹۹) خلاصہ یہ کہ مسجد کی آبادکاری کا صحیح طریقہ جو خدا کے یہاں شرف قبولیت حاصل کر لے اس کو وہی لوگ معلوم کر سکتے ہیں جو ایمان باللہ اور فرائض اولیہ کے ابتدائی اور بنیادی امور کو انجام دے چکے ہوں۔ لہٰذا انہیں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مساجد اللہ کو آباد کریں۔ باقی وہ مشرک جن کا کفر خود ان کے برخلاف شہادت دے رہا ہے اور واضح کر رہا ہے کہ نقطہ نظر کی صحت سے یہ محروم ہیں ان کے اعمال ظاہر میں کتنے ہی خوش نما ہوں۔ مگر چونکہ روح قبولیت سے محروم ہیں اس لیے وہ کاغذی باغ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ اگر اس اصولی نکتہ کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور صرف اعمال کا موازنہ کیا جائے تو کونسی عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ زائرین بیت اللہ کو پانی پلانا یا مسجد حرام کی خدمت ترک وطن یا جہاد فی سبیل اللہ جیسے زہرہ گداز اور صبر آزما کاموں کے ہم پلہ ہے۔ محمد میاں

(۱۰۰) الزالۃ الخلفاء بسلسلہ آیت سورہ حشر ص ۲۴۲ تا ص ۲۴۶۔

(۱۰۱) یہ آیتیں سورہ انعام کی ہیں۔ سورہ انعام کے متعلق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ سورۂ انعام نواجب قرآن سے ہے اور الدر النشیر میں ہے۔ **الانعام من نجائب القرآن او نواجبہ** یعنی راوی کو شک ہے کہ نجائب ہے یا نواجب۔ بہرحال مفہوم ایک ہی ہے کہ سورۂ انعام قرآن پاک کی افضل ترین سورتوں میں سے ہے۔ (**نجائب جمع نجیبہ** منتخبہ) نواجب (نفیس اور عمدہ)

(ب) حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی اسلام کے لیے شرح صدر ہو گیا تھا غالباً اسی کی تائید میں حضرت قیس رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل روایت پیش فرماتے ہیں:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لے گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا۔ آپ کیا کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے مولاء برحق کی طرف راجع۔ حضرت عبداللہ بن مسعود بہت اچھا ہے۔

(ج) صحابہ اور عہد صحابہ کے متعلق سورۂ انعام کی چند آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ آیت کریمہ (**قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یذیق بعضکم باس بعض**) ترجمہ۔ آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تمہارے اُوپر کی طرف سے عذاب بھیج دے یا پیروں کے نیچے سے یا تم میں سے بعض کی سختی (قوت اور زور) چکھائے بعض کو۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ہو کر رہے گا اور اس کی کوئی توجیہ اور تاویل نہیں وارد ہوئی ہے (ترمذی شریف) حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک کو دوسرے کی قوت اور سختی کا مزہ چکھانے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں خانہ جنگی ہوگی جو ۳۵ھ کے ختم ہونے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں) ہوئی۔

(د) آیۃ کریمہ **الذین امنو ولم یلبسوا ایمانھم بظلم** (ترجمہ۔ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان میں ظلم کی آمیزش نہیں کی) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی گئی اور کہا گیا کہ ایسا کون ہے جس نے ظلم نہ کیا ہو اور اپنے ایمان کو ظلم سے مکدر نہ کر دیا ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم نے آسان مفہوم کو سخت کر لیا۔ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں ہے۔ **ان الشرك لظلم عظیم**

(ہ) حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مضمون منقول ہے۔ نیز روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دختر نیک اختر ام کلثوم رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا تو آپ کے احباب مبارکباد کے لیے آپ کے یہاں پہنچے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ مجھے نکاح اور نساء کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ لہٰذا میں نے اس لیے نکاح نہیں کیا بلکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ہر ایک نسبی رشتہ اور ہر ایک تعلق منقطع ہو جائیگا مگر میرے نسبی رشتہ اور میرے ساتھ توسل و تعلق باقی رہے گا۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میرا تعلق قرابت قائم ہو جائے۔ ازالۃ الخفاء ص ۷)

(۱۰۲) پس زندہ کیا ہم نے اس کو۔ ۱۲

(۱۰۳) پس ہدایت بخشی ہم نے اس کو۔ ۱۲

(۱۰۴) تاریکیوں میں۔

(۱۰۵) کفر اور گمراہی میں۔

(۱۰۶) اس روایت کے انداز سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات جس کو مسلمان پسند کریں وہ عنداللہ پسندیدہ ہے اور جس کو ناپسند کریں وہ عنداللہ ناپسندیدہ ہے۔ حضرات صحابہ کرام کے لیے ہے جن کے قلوب خیر قلوب العباد تھے۔ قرین قیاس بھی یہی ہے کیونکہ آج تو ہم دیکھتے ہیں کہ نماز روزہ پانچ فیصدی مسلمانوں کو پسند ہے اور ۸۴ فیصدی کھیل تماشہ اور لغویات و محرمات میں مبتلا ہیں۔ فقہاء کرام کے یہاں بھی وہی اجماع معتبر ہے جو خیر القرون میں یعنی عہد صحابہ میں ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ محمد میاں

(۱۰۷) یہ سورۂ انعام کے انیسویں رکوع کی آیتیں ہیں۔ ترجمہ اور مطلب یہ ہے (اے پیغمبر اسلام) آپ فرما دیجئے۔ آؤ۔ پڑھ کر سناؤں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے۔ خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی روزی دیتے ہیں تم کو اور ان کو اور بے حیائی کی باتوں کے پاس بھی نہ جاؤ۔ کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں۔ اور کسی جان کو قتل نہ کرو جسے خدا نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ ہاں یہ کہ کسی حق کی بنا پر قتل کرنا پڑے (جیسے قصاص میں) یہ ہیں وہ باتیں جن کی خدا نے تمہیں وصیت کی ہے تا کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو اور (اسی طرح حکم دیا ہے کہ) پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے۔ مگر یہ کہ ایسی صورت سے جو بہت ہی بہتر ہو۔ (یعنی یتیموں کے فائدہ کی خاطر ان کے مال کے پاس جا سکتے ہو اور اس کی حفاظت اور ترقی کا منصوبہ بنا سکتے ہو مگر وہ ایسا ہونا چاہئے کہ سب سے بہتر منصوبہ ہو۔ اس سے بہتر نہ بن سکے۔ مگر یہ بھی اس وقت تک کہ یتیم اپنی عمر کو پہنچ جائیں اور ان میں کام سنبھالنے کی قوت پیدا ہو جائے اور انصاف و دیانت کے ساتھ ناپ تول پورا کرو۔ ہم کسی جان پر اس کے مقدور سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے (پس جہاں تک تمہارے بس میں ہے انصاف و دیانت کی کوشش کرو) اور جب کبھی کوئی بات کہو تو انصاف کی کہو۔ اگرچہ معاملہ اپنے قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے اسے پورا کرو۔ یہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تمہیں حکم دیا ہے تا کہ نصیحت پکڑو۔ نیز اللہ نے فرمایا ہے۔ یہ ہے میری راہ سیدھی پس اس پر گامزن رہو اور دوسری راہوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا کر تتر بتر کر دیں گی۔ جس کی وصیت کی تم کو خدا نے تا کہ تم پرہیزگار اور متقی ہو جاؤ۔ (ع ۱۹ سورہ انعام)

(۱۰۸) یہ سورۂ نحل کے تیرھویں رکوع کی آیت ہے ترجمہ اور مطلب یہ ہے (مسلمانو!) اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے تم کو کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو (سب کے ساتھ) بھلائی کرو اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرو اور تمہیں روکتا ہے بے حیائی کی باتوں سے ہر طرح کی برائیوں سے اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تا کہ تم سمجھو اور نصیحت پکڑو۔

(۱۰۹) اس آیت کے الفاظ اگرچہ ہر ایک مومن کے لیے عام ہیں اور اسی بناء پر حضرت مجاہد اور عمرو بن میمون ہر ایسے شخص کو جس کی موت ایمان پر ہو اس آیت کا مصداق قرار دے رہے ہیں اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت اس کی تائید بھی کرتی ہے لیکن حضرت ابو درداء کی مرفوع روایت اس آیت کا مصداق مہاجرین قرار دے رہی ہے اور غالباً اسی مناسبت سے حضرت شاہ صاحب نے اس آیت کو اس سلسلہ میں پیش بھی فرمایا اور اس لحاظ سے اس کو طبقات صحابہ کے ضمن میں لانا بھی مناسب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی تفسیر ہر ایک سے مختلف ہے ان کے قول کے مطابق شہید کے لیے قتل ہونا ضروری نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ مغفور ہو۔

واللہ اعلم بالصواب۔ محمد میاں

حضرت شاہ صاحب نے افادہ کے طور پر۔ ترکیب نحوی کے سلسلہ میں حضرت ضحاک کا قول بھی نقل کر دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ **اولیك هم الصديقون** پر آیت ہو جاتی ہے اس کے بعد دوسرا حصہ یہ ہوتا ہے **والشهداء عند ربهم لهم اجرهم و نورهم۔**

(۱۱۰) سورۂ حدید کی ایک آیت ہے۔

ما اصاب من مصيبة في الارض ولا في انفسكم الا في كتاب من قبل ان نبراها. ان ذلك على الله يسير ۔ ع ۳ (نہیں پڑی کوئی مصیبت ملک میں اور نہ خود تم میں مگر وہ ایک کتاب (تحریر میں آ چکی) تھی اس سے پہلے کہ پیدا کریں ہم اس کو بیشک یہ اللہ پر آسان ہے)

حضرت شاہ صاحب نے ان مصائب کا لحاظ کرتے ہوئے جو صحابہ کرام کو ہجرت سے پہلے یا ہجرت کے وقت یا ہجرت کے بعد برداشت کرنا پڑے ہیں اس موقع پر آیت مذکورہ کی تفسیر میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ آنے والی مصیبت کے متعلق سب سے پہلے آسمانوں میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ انہیں عجیب و غریب فیصلوں کی بناء پر حضرت حق جل مجدہ نے کلام پاک میں اپنے متعلق ارشاد فرمایا ہے **كل يوم هو في شان** (ہر روز اس کی شان نرالی ہے) اس کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ نفاذ فیصلہ کی صورت میں یہ ہوتی ہے کہ ایک وقت مقرر کر دیا جاتا ہے اور اس مقرر وقت تک اس مصیبت کو روک لیا جاتا ہے۔ پھر جب یہ مقررہ وقت آ جاتا ہے تو اس کی رکاوٹ ختم کر دی جاتی ہے پھر کوئی طاقت نہیں جو اس مصیبت کو لوٹا سکے۔ وقت مقرر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ طے کر دیا جاتا ہے کہ یہ مصیبت جو قحط یا رزق کی کمی یا کسی اور صورت میں کسی خاص طبقہ میں یا عام انسانوں میں آنے والی ہے وہ فلاں دن آئے گی اس کا مہینہ سال اور وہ شہر یا علاقہ جہاں مصیبت آئے گی سب کچھ درج کر دیا جاتا ہے۔ یہ مصیبت ایسے افعال کی بنا پر آتی ہے جو غیر فطری ہوتے ہیں مگر لوگوں کو ان کی عادت پڑ جاتی ہے اور غیر فطری کو طبعی بنا لیتے ہیں جیسے کوئی شخص چھڑی رکھنے کا عادی نہیں ہے وہ اول اول چھڑی لیتا ہے تو اس کو بار معلوم ہوتی ہے رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی بن جاتا ہے اور یہاں تک کہ اس کا محتاج ہو جاتا ہے کہ چھڑی کے چھوڑنے کی طاقت اس میں نہیں رہتی۔

(۱۱) حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ اگرچہ طبقہ علیا یعنی **السابقون المقربون** کے آپس میں بھی بہت سے مرتبے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خلیفہ خاص۔ اس طبقہ کا شرف و اعزاز رکھتا ہو اس کے بعد سورہ واقعہ کے متعلق چند احادیث پیش کرتے ہیں۔ جن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سورہ الحاقہ۔ سورہ عم تیساءلون سورہ والنازعات سورہ اذا الشمس کورت اور سورہ **اذا السماء انفطرت** کو مداومت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ پس آپ پر ضعف اور پیری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ آپ پر بہت تیزی سے بڑھاپے کا اثر ہوتا جا رہا ہے؟ محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا۔ مجھ کو سورہ ہود اور اس جیسی سورتوں نے (یعنی جن میں قیامت دوزخ اور عذاب وغیرہ کا تذکرہ ہے) بوڑھا کر دیا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جب سورہ واقعہ نازل ہوئی اور اس میں یہ آیت پڑھی گئی **ثلة من الاولين. وقليل من الاخرين** (ایک جماعت پہلے لوگوں میں کی اور تھوڑے سے پچھلوں میں سے۔) تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پچھلے لوگوں میں سے ایک جماعت اور ہم میں سے تھوڑے سے؟ (یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سمجھا کہ اوّلین سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی امت میں اسلام سے پہلے گذر چکے ہیں) اس واقعہ سے تقریباً ایک سال بعد یہ آیت نازل ہوئی **ثلة من الا ولين وثلة من الاخرين** یعنی پچھلے لوگوں میں سے بھی ایک جماعت اور بعد کے اہل ایمان کی بھی ایک جماعت تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آؤ عمر سنو۔ اللہ تعالیٰ نے کیا نازل فرمایا ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر مجھ تک ایک ثلۃ (جماعت) ہے اور دوسری جماعت یعنی آخرین کی جماعت مجھ سے شروع ہوتی ہے اور ہمارے ثلۃ جماعت کی تکمیل میں سودان کے وہ حبشی بھی شامل ہیں جو اُونٹ چراتے ہیں اور کلمہ توحید لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہیں۔ اس روایت کے مطابق **السابقون** سے مراد انبیاء علیہم السلام ہوں گے اور وہ صدیق اور شہداء جو انبیاء علیہم السلام کے مرتبہ میں ہوں جیسا کہ احادیث میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت صدیق اکبر ؓ یا حضرت علی ؓ کے متعلق وارد ہوا ہے اور اصحاب الیمین سے مراد تمام اہل ایمان ہوں گے جن میں انبیاء اور غیر انبیاء سب شامل ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مناسبت سے کہ لحم طیر (پرندوں کے گوشت) کا تذکرہ سورہ واقعہ میں ہے۔ حضرت ابو سعید خدری حضرت انس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے حدیثیں نقل کی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کے پرندے اونٹوں کے برابر بڑے بڑے ہوں گے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ ان کا گوشت کس قدر خوشگوار ہوگا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اور اس کو کھانے والے اس سے بھی زیادہ خوشگوار ہوں گے اور مجھے توقع ہے کہ ابوبکر تم ان میں سے ہو گے آخر میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے جو متعدد سندوں سے مروی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ میت کے سامنے رہو اور اس کو تذکیر کرتے رہو کیونکہ وہ ان کو دیکھتے ہیں جن کو تم نہیں دیکھ سکتے۔

(۱۱۲) سورہ بقرہ میں ہے **لولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الارض ولكن الله ذو فضل على العالمين** ۳۲ (ترجمہ) اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کو دفع کرتا رہتا ہے (راستہ سے ہٹاتا رہتا ہے) تو دنیا برباد ہو جاتی لیکن اللہ تعالیٰ تمام عالموں کے لیے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔ فساد اور بربادی کی صورت یہ بھی تھی کہ عدل و انصاف کا نام و نشان نہ رہتا اور فساد کی صورت یہ بھی تھی کہ دنیا مادی ترقیات کے راستہ پر قدم نہ بڑھاتی مگر خوف اور خطرہ اور جنگی طاقت کا توازن جس طرح ظالم کا راستہ روک کر بسا اوقات اس کو انصاف پر مجبور کرتا ہے اسی طرح وہ بیدار اور چوکنا رکھ کر قوت عمل کو متحرک بھی بناتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان نئی نئی ایجادیں کرتا ہے۔ مثل مشہور ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(۱۱۳) کبھی یہ کیفیت فوری طور پر بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی خاص سبب سے اس کی غیرت ایمانی میں حرکت پیدا ہوئی وہ میدان کارزار میں کود اور اپنی جان قربان کردی یہ شخص یقیناً شہید ہے۔ ۱۲

(۱۱۴) اضافہ از محمد میاں عفی عنہ۔

(۱۱۵) اضافہ از محمد میاں عفی عنہ۔

(۱۱۶) اضافہ از محمد میاں عفی عنہ۔

(۱۱۷) **سلمان منا اهل البيت** بغوی وغیرہ بحوالہ تفسیر مظہری۔

(۱۱۸) کیونکہ انسان خود اپنا دشمن اور بدخواہ تو ہو بھی سکتا ہے اور بعض اوقات جہل و بغاوت کی بنا پر اس کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جن پر خفی سے خفی منافع اور مصالح روشن ہیں کسی حال میں بھی بدخواہی کا امکان نہیں ہے **فانه لا يامرهم ولا يرضى منهم الا بمافيه صلاحهم ونجاحهم بخلاف النفس** (بیضاوی) **والدليل عليه قوله تعالىٰ عزيز عليه ماعنتتم حريص عليكم**۔ (محمد میاں)

حضرت مولانا شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ نبی نائب ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا جان و مال میں اپنے تصرف نہیں چلتا نبی کا۔ اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنی روا نہیں اور نبی حکم کرے تو فرض ہے۔ (موضح القرآن)

(۱۱۹) ابوداؤد شریف اور نسائی شریف کی روایت ہے کہ افعال حج ادا کرتے ہوئے جب صفا پر پہنچے تو قبلہ رو ہو کر تین دفعہ پڑھتے **لا اله الا الله وحده لاشريك له له الملك وله الحمد يحيي ويميت وهو على كل شي قدير** لا انہ لا سے

وحدہ انجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔ اس کے بعد دعا مانگے۔ (حصن حصین)

(۱۲۰) صحیحین کی روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر سے واپس ہوتے تو راستہ میں کوئی ٹیلہ یا پہاڑی پڑتی تھی تو اس پر چڑھتے ہوئے تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے تھے پھر فرمایا کرتے تھے۔ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شی قدیر. ائبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔ (حصن حصین منزل چہارم)

(۱۲۱) جب حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عام صحابہ کو تین دن ہو گئے تھے تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا جانے کتنے روز گذر گئے ہوں گے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو صوم وصال کی عادت تھی کئی کئی روز کا متواتر روزہ رکھا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میرا رب مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے۔ چونکہ عام مسلمانوں اور خود صحابہ کرام کو یہ خصوصیت حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا ان کو صوم وصال کی اجازت نہیں تھی۔ پس جو ذات پاک صوم وصال کی عادی ہو اس کی حالت تین روز کے فاقہ میں ناقابل ضبط نہیں ہوسکتی کہ چہرے پر آثار نمایاں ہوں۔ واللہ اعلم۔ محمد میاں۔

(۱۲۲) ایک صاع دوسوستر تولہ کا ہوتا ہے یعنی اسی کی تول سے تین سیر چھ چھٹانک اور آج کل کی زبان میں تین کیلو سے کچھ زائد۔

(۱۲۳) استعو صبحافًا۔ فتح الباری ج (۱) ص ۳۱۹

(۱۲۴) ان محترمہ کا اسم گرامی سہیلہ بنت مسعود تھا۔ انصاری خاتون تھیں۔ کیا ٹھکانا ہے ان کی قوت ایمانی کا اور ان کی فہم وفراست کا۔ ہمارا جو کام تھا ہم نے کر دیا اب اللہ تعالیٰ جانے اور اس کا رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جانے اس اعتماد پر ہزاروں درویشوں کے توکل قربان کئے جاسکتے ہیں صحابہ کی یہی شان ہے جس نے ان کو کائنات کی آنکھ کا تارا بنا دیا ہے محمد میاں۔

(۱۲۵) محترمہ کا سلیقہ اور شعور ضبط ونظم ملاحظہ ہو۔

(۱۲۶) راستے دونوں بتا دیئے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ خیر اور حق کا راستہ چلنے کے لیے ہے اور شر وجہل کا راستہ بچنے کے لیے۔

(۱۲۷) حقیقت جہاد کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کے ارشاد کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ جب تک سرکش اور معاند قوموں کی بربادی کا کام فرشتوں کے ذمہ رہا جہاد مشروع نہیں تھا۔ جہاد کا حکم اہل ایمان کو جب ہی دیا گیا جب فرشتوں کے ذریعہ امم عاصیہ کی بربادی کا طریقہ ختم کیا گیا۔ محمد میاں

(۱۲۸) جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور پہونچے دل گلوں تک اور اٹکلنے لگے تم اللہ تعالیٰ پر کئی اٹکلیں (شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ)

(۱۲۹) حضرت عطاء جلیل القدر تابعی ہیں کتاب الکنی میں ان کا مقولہ نقل کیا گیا ہے۔ ان اللہ یسبح و تسبیحہ سبوح قدوس سبقت رحمت غضبی یعنی اللہ تعالیٰ بھی تسبیح پڑھتے ہیں اور ان کی تسبیح یہ ہے۔ میں سبوح قدوس ہوں میری رحمت میرے غصہ سے آگے بڑھی ہوئی ہے۔ فیض الباری ج ۳-۴۴

(۱۳۰) دونوں ہاتھ پھیلائے جائیں تو یہ لمبائی جو ایک ہاتھ کی انگلیوں سے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں تک ہوگی سینہ کی چوڑائی سمیت یہ باع کہلاتی ہے جو تقریباً پونے دو گز ہوتی ہے۔ محمد میاں۔

(۱۳۱) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ان خواص کے لیے نمونہ ہو تو عوام کے لیے تو لامحالہ بہترین نمونہ ہوگی۔

(۱۳۲) بربادی اور ہلاکت ثمود کے متعلق سورہ ھود میں یہ ہے فاخذتھم الصیحۃ چیخ (چنگھاڑ) نے ان کو آ پکڑا۔ سورہ اعراف میں صیحہ کے بجائے رجفہ وارد ہوا ہے۔ فاخذتھم الرجفۃ (ان کو پکڑا زلزلہ نے) ان دونوں تعبیروں کا خیال کرتے ہوئے یہی بات معین ہو جاتی ہے کہ صیحہ (چیخ) سے مراد وہ گڑگڑاہٹ ہے جو زلزلہ کے وقت ہوا کرتی ہے اور الفاظ کے فرق نے یہ بھی بتا دیا کہ جس طرح یہ زلزلہ عجیب تھا اس کی گڑگڑاہٹ بھی عجیب تھی وہ ایسی چنگھاڑ کی طرح تھی جو دلوں پر ایسی دہشت پیدا کر دے کہ ان کی حرکت بند ہو جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

(۱۳۳) سلسلہ نسب یہ بیان کیا گیا ہے کہ عاد پسر عوص۔ پسر ارم۔ پسر سام۔ پسر نوح علیہ السلام۔ ثمود پسر گو۔ پسر ارم۔ پسر سام۔ پسر نوح علیہ السلام اور یقطان یا قحطان جو عرب عاربہ کے جد اعلیٰ ہیں ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ یقطان پسر عبیر۔ پسر شالح۔ پسر ارفخشد پسر سام۔ پسر نوح علیہ السلام۔ بائبل کتاب پیدائش۔

(۱۳۴) بعض مؤرخوں کا یہ قول ہے کہ عرب بائدہ یعنی عاد و ثمود وغیرہ اور عرب عاربہ دونوں یقطان کی اولاد ہیں یعنی سلسلہ نسب سام کے بجائے یقطان میں مل جاتا ہے۔ (خطبات احمدیہ) تاریخ ابوالفداء وارض القرآن)

(۱۳۵) ثمود سامی نسل کے قدیم ترین پیغمبروں میں سے ہوئے ہیں۔ عرب آپ سے خوب واقف تھے۔ جنوبی عرب میں آج بھی قبر نبی ہود کے نام سے ایک مقام مرجع خلائق و زیارت گاہ ہے۔ جس کا ذکر انگریزی سیاح بھی برابر کرتے ہیں۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ آپ ہی کا نام تورا (کتاب پیدائش) میں عبر کر کے آیا ہے۔ ان کی قوم عاد جنوبی عرب میں آباد تھی اور اس کے حدود مشرق میں خلیج فارس کے شمال سے مغرب میں بحر قلزم کے جنوب تک وسیع تھے گویا آج کے یمن۔ عمان وغیرہ سب اس میں شامل تھے۔ ان کا پایہ تخت یمنی شہر حضر موت تھا۔ اپنے زمانہ کی متمدن ترین قوم تھے۔ اپنے لمبے سفروں کے لیے ضرب المثل۔ (تفسیر ماجدی وارض القرآن)

(۱۳۶) ان کے دارالحکومت کا نام حجر تھا۔ یہ شہر حجاز سے شام کو جانے والے قدیم راستہ پر واقع تھا۔ اب عموماً اس شہر کو مدائن صالح کہتے ہیں۔ یہ شمالی عرب کی زبردست قوم تھی۔ فن تعمیر میں عاد کی طرح اس کو بھی کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا، پتھر وں کی عمارتیں اور مقبرے تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں ان پر ارامی وثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں (ارض القرآن)

(۱۳۷) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خاص اس مقام پر تھے کہ جہاں یہ بحر مردہ یا بحر لوط ہے۔ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس قوم کا تختہ الٹ گیا تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی بھر آیا اسی لیے اس کا نام بحر میت یا بحر لوط یا بحر مردہ ہے۔

(۱۳۸) اس کا اندازیہ ہے کہ عرب عام طور پر اس کو جانتے ہیں۔

(۱۳۹) اللہ تعالیٰ مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے مراتب بلند فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آپ نے بڑی جانفشانی سے اپنی مشہور تصنیف قصص القرآن میں آیات قرآنیہ اور احادیث کی مدد سے ہر ایک واقعہ کو اس کی اصل صورت میں پیش فرما کر اس گرد کو صاف کر دیا ہے جو تحریف شدہ تورات نے انبیاء علیہم السلام کے دامن تقدس پر ڈال رکھا تھا۔ جس سے دامن نبوت کا پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔

(۱۴۰) تفسیر ماجدی۔

(۱۴۱) کشتی نہیں بلکہ بہت بڑا جہاز۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ایسا بڑا جہاز جیسے یورپ اور امریکہ کے درمیان چلتے ہیں۔ صحیح اور اسلم طریقہ وہ ہے جو اکابر مفسرین نے اختیار کیا کہ طول و عرض کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اتنی بات ظاہر ہے کہ یہ جہاز اتنا بڑا ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو سکے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہوا تھا۔ **احمل فیھا من کل زوجین اثنین واھلک ومن امن وما امن معه الا قلیل** سوہ ھود ع۴۔ ہر ایک جاندار کے دو دو جوڑے اس میں چڑھا لو۔ اپنے گھر کے آدمیوں اور ان کو جو ایمان لے آئیں سوار کر لو۔ مگر ان میں ایمان لانے والے تھوڑے تھے۔

(۱۴۲) جودی کوہ ادارات کی ایک چوٹی کا نام تھا۔

(۱۴۳) عاد و ثمود یا قوم لوط اور قوم نوح علیہا السلام کی بربادی کے واقعات تو زمانہ قبل از تاریخ کے واقعات ہیں یعنی اس زمانہ میں ہوئے جس کی تاریخ اس وقت محفوظ نہیں لیکن اٹلی کے مشہور اور گل وگلزار شہر پامپئی کی زلزلہ سے بربادی تو عہد تاریخ کی بات ہے ۶۳ء تھا جب ایک زلزلہ سے یہاں کے فسق پیشہ باشندے تباہ و ہلاک ہو کر رہ گئے اور جو کچھ بچ رہے تھے انہیں ۷۹ء میں ایک قدرتی آتش باری نے بھون ڈالا۔ (تفسیر ماجدی حاشیہ سورہ اعراف)

(۱۴۴) جو کمزور پڑے تھے۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

(۱۴۵) المستفاد من مبالغة سنقتل واللہ علم محمد میاں

(۱۴۶) جہاد فرض ہونے کے لیے یہ تناسب ہے یعنی یہ تناسب نہیں ہوگا تو جہاد فرض نہیں ہوگا۔مگر توفیق خداوندی اور حوصلہ و ہمت کے لیے کوئی تناسب شرط نہیں ہے چنانچہ غزوہ موتہ میں تین ہزار نے ایک لاکھ سے مقابلہ کیا یعنی ایک نے تمیں کا مقابلہ کیا۔تاہم یہ ضروری ہے کہ کامیابی کے امکانات ہوں۔موہوم تصورات کی بنا پر جہاد فرض نہیں ہوتا۔

(۱۴۷) ان کی اولاد سے یہ علاقے آباد ہوئے۔آباد ہونے کے وقت تنہا یا چند افراد ہوں گے مگر چند پشتوں کے بعد گنے چنے افراد کی اولاد ہزاروں تک پہنچ گئی کیونکہ اگر ایک شخص کی اولاد پانچ ہو اور کم از کم یہی تعداد ہر پشت میں ہوتی رہے۔مثلاً ہر ایک کے جانشین پانچ پانچ ہوتے رہیں تو ایک شخص کی اولاد پانچ پشتوں بعد ۶۲۵ ہوجائے گی اور دس پشتوں بعد اس کی تعداد ۱۹۵۳۱۲ ہوجائے گی۔

(۱۴۸) اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ان اقوام بائدہ کے تذکرہ میں قرآن شریف میں بادشاہ یا فوج کا کہیں ذکر نہیں آیا۔بادشاہ کا ذکر قرآن شریف میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں آیا ہے وہ بھی لفظ ملک (بادشاہ) کے ساتھ نہیں۔بلکہ الذی اتاہ اللہ الملک سورہ بقرہ ع ۳۵۔فرمایا گیا ہے (وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے ملک دیدیا تھا) ملک (بادشاہ) کا لفظ حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں استعمال کیا گیا ہے۔پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سب سے پہلے نبی ہیں جن کے تذکرہ میں مـــــلاء (پارلیمنٹ یا ارکان شوریٰ) اور جند (لشکر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔توریت کی تفصیل کے بموجب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کی گیارہویں پشت میں ہیں اور آپ کی پیدائش طوفان نوح سے ۲۹۲ دوسو بانوے سال بعد ہوئی۔حضرت یوسف علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چوتھی پشت میں ہوئے۔تقریباً سو سال بعد وہ وقت آیا جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے حاکم اور فرمانروا ہوئے اس وقت سے بنو اسرائیل کا قیام مصر میں ہوا۔

(۱۴۹) یہ ہمارے مشاہدہ کی بات ہے جس کو ہم نے پیش کردیا ورنہ صحیح مثال یہ ہے کہ اسلام کی بہت سی خصوصی تعلیمات، یورپین اقوام کا قومی مزاج بن چکی ہیں۔علم اخلاق اور تہذیب کی جو کچھ روشنی یورپ میں ہے خود یورپ کے انصاف پسند علماء کا اعتراف ہے کہ وہ مسلمانوں کا طفیل ہے۔یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔متعصب مستشرقین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ یورپ کی تہذیب و ترقی کا آغاز صلیبی لڑائیوں کے بعد سے ہوا۔ان لڑائیوں میں مسلمانوں سے مقابلہ بھی رہا۔نتیجہ میں عیسائیوں کو شکست ہوئی۔سالہا سال کی جنگ کے بعد بھی وہ یروشلم پر قابض نہیں ہوسکے۔مگر اسی مقابلہ میں مسلمانوں کی جس تہذیب کا مشاہدہ ان عیسائی فوجوں کے رنگروٹوں نے کیا اس نے ان کے تصورات اور خیالات میں وہ انقلاب پیدا کیا جو یورپ کی آئندہ ترقیات کی بنیاد بنا۔

فرانس کا مشہور انصاف پسند محقق موسیو لیبان لکھتا ہے۔صلیبی جنگوں کے اچھے نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ صلیبی سردار وہ کسی قدر ذلیل اور پست خیال کیوں نہ ہوں وہ مشرق کے تکلفات اور شان کو دیکھ کر حیرت میں آگئے اور تجارت کے ذریعہ انہیں ان کی تقلید کا موقع ملا۔ بارہویں اور زیادہ تر تیرہویں صدی میں ہتھیاروں لباس اور مکانات کے مشرقی تکلفات یورپ میں رائج ہوئے اور جیسے جیسے اسباب معاشرت کا تکلف بڑھتا گیا صحت کو بھی ترقی ہوتی گئی۔ص ۲ تمدن عرب۔۔۔ایک صفحہ کے بعد یہی مصنف لکھتا ہے۔یہی صلیبی جنگیں تھیں جنھوں نے یورپ سے وحشیانہ اخلاق و اوضاع کو دور کیا اور وہ رجحان پیدا کردیا جس پر علمی اور ادبی ترقی نے جو یورپ میں دارالعلوموں کے ذریعہ شائع ہوئی وہ اثر ڈالا جو ایک دن نشاۃ ثانیہ کی صورت میں ظاہر ہونے والا تھا۔(تمدن عرب صفحہ ۳۱۲)

آزادی رائے، ضمیر کی آزادی مساوات خدمت خلق جو جمہوریت کی روح ہے۔عورتوں کے مساویانہ حقوق جس پر یورپ کو ناز ہے۔جس یورپ کی حالت یہ تھی کہ بقول موسیو لیبان چارلس نہم۔شاہ فرانس کے حکم سے ایک رات میں ملک کے تمام پروٹسٹنٹ عیسائی قتل کرڈالے گئے جن کی تعداد پیرس میں دس ہزار پانسو تھی۔تمدن عرف ص ۲۵۳۔صلیبی جنگ میں عیسائی فوجیوں کے (عیسائی مجاہدین) کے متعلق اس زمانہ کے شاہ قسطنطنیہ (این کامینن) کا بیان ہے کہ ان کا ایک مستقل مشغلہ یہ تھا کہ جو بچہ ان کے سامنے آتا اس کا تکہ بوٹی کرکے آگ میں جلادیتے۔تمدن عرب ۲۹۶۔بیت المقدس کی زیارت کو اکثر وہی جاتے تھے جو اس قسم کے بدمعاش ہوتے تھے جن

کی فطرت میں شرارت بھری ہوئی تھی وہ دوزخ کی آگ سے بچنے کے لیے جاتے اور عربوں نے اتنی آزادی دے رکھی تھی کہ بیت المقدس میں وہ باجے بجاتے ہوئے مشعلیں روشن کرتے ہوئے نہایت شان سے جاتے تھے۔ تمدن عرب ص ۲۹۳۔ عربوں کے اصلاحی اثرات کے متعلق موسیو بارتھے اپنی کتاب متعلقہ قرآن میں لکھتا ہے۔۔۔ عربوں کی معاشرت اوران کی تقلید نے ہمارے زمانہ متوسط کے امرا کی زبوں عادتوں کو درست کیا اور یہ سردار بلا اس کے کہ ان کی بہادری میں فرق آیا ہو ایسے اخلاق سیکھ گئے جو انسان میں اعلیٰ درجہ کی رفعت اور قدر رکھتے ہیں (تمدن عرب ص ۵۲۲)

موسیو لیبان لکھتا ہے۔ فی الواقع تمام مذاہب عالم میں یہ فخر اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے پہلے پہل وحدانیت خالص ومحض کی اشاعت دنیا میں کی۔ تمدن عرب ۱۲۰

چرم جس پر لکھا جاتا ہے۔ وہ بہت مہنگا ہو گیا تو پادریوں نے پرانی کتابوں کے حروف صاف کر کے ان کا چمڑا استعمال کرنا شروع کر دیا اور اگر عرب کاغذ ایجاد نہ کرتے تو پادری صاحبان تمام پرانی کتابیں ختم کر دیتے۔ تمدن عرب ۴۴۳

چند صدیوں میں عربوں نے اندلس کے ملک کو علمی اور مالی ترقی کے لحاظ سے بالکل بدل دیا اور اس کو یورپ کا سرتاج بنا دیا۔ یہ تغیر محض مالی اور علمی نہیں تھا بلکہ اخلاقی بھی تھا۔ انہوں نے اقوام نصاریٰ کو ایک بیش بہا خصلت انسانی سکھائی یعنی اقلیت سکھانے کا قصد کیا۔ یعنی مذاہب مخالف کے ساتھ رواداری مفتوح اقوام کے ساتھ ان کا برتاؤ اس درجہ نرم تھا کہ انہوں نے سرقفہ (پوپ پادریوں) کو مذہبی مجالس منعقد کرنے کی اجازت بھی دیدی تھی۔ تمدن عرب ۲۵۸

جبکہ اندلس نے عربوں کی حکومت میں ایسے زمانہ میں اعلیٰ تمدن حاصل کیا جب یورپ شدید وحشیانہ حالت میں تھا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ کے تمدن کے لحاظ سے عیسائی اقوام یورپ کو (اگر وہ عرب فرانس پر قبضہ کر لیتے) بہت کچھ فائدہ پہنچتا اور نقصان نہ ہوتا۔ اسلام کی رحمت ان اقوام مغرب کے اخلاق میں لینیت (نرمی، رحم) پیدا کر دیتی اور انہیں مذہبی خونریزیوں سے، سینٹ برتھو مولے کے قتل عام سے۔ مذہبی عدالتوں کے مظالم سے جنہوں نے کئی صدی تک یورپ میں خون کے دریا بہائے اور جن سے مسلمان قطعاً ناواقف تھے بچالیتی وہ جذبہ جو انسانی ترقی کا باعث ہوتا ہے کسی قوم میں نہیں تھا جو عربوں میں تھا۔

(۱۵۰) قرآن پاک میں لفظ ملاء ہے جس کے معنے یہ بیان کئے گئے ہیں **جماعۃ یجتمعون علی رای** (راغب) **الملاء من القوم وجوھھم واشرافھم** (روح المعانی)

(۱۵۱) قصص القرآن۔

(۱۵۲) طالوت بن کش۔ قوم بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ تسلیم کئے گئے ہیں۔ زمانہ حکومت ۱۰۲۸ قبل مسیح تا ۱۰۱۲ ق م، حضرت شموئیل نے جو اس زمانہ میں بنو اسرائیل کے نبی تھے ان کو بادشاہت یا فوج کی قیادت کے لیے نامزد کیا تھا۔ حضرت شموئیل از ۱۱۰۰ قبل مسیح تا ۱۰۲۰ ق۔م ان کا زمانہ ہے۔ شام میں ایک کوہستانی علاقہ افرائیم کے نام سے تھا اس کے شہر رامہ میں آپ رہتے تھے۔ توریت میں سموئیل کی کتاب کے پہلے حصہ میں طالوت کو بادشاہ بنانے اور ان کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے حضرت سموئیل زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتے رہے جب بوڑھے ہوئے تو بنو اسرائیل کے سردار رامہ بن سموئیل کے پاس آئے اور کہا کہ آپ ضعیف ہو گئے ہیں آپ کے لڑکے آپ کی راہ پر نہیں چلتے آپ کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دیں جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے۔ یہ بات سموئیل کو بری لگی۔ سموئیل نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ خداوند نے سموئیل سے کہا جو لوگ تجھ سے کہتے ہیں کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا وہ تم سے بہت کچھ کام لے گا۔ تمہاری اولاد کو نوکر رکھے گا۔ اسے فوج میں بھرتی کرے گا۔ ان سے رتھ کھچوائے گا۔ تمہارے باغات وہ اپنے آدمیوں کو دیدیگا۔ تمہاری پیداوار سے ٹیکس وصول کرے گا۔ تم سے بیگار بھی لے گا تم اس کے غلام بن جاؤ گے۔ تم اس دن اس بادشاہ کے سبب سے فریاد کرو گے پھر اس دن خدا تم کو جواب نہ دے گا۔ مگر حضرت سموئیل کی تمام نصیحتوں کے جواب میں بنو اسرائیل کے نمائندوں نے یہی کہا کہ ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں۔ جو ہمارے اوپر ہو اور ہم بھی دوسری قوموں کی طرح ہوں۔ سموئیل نے جب

۱۷ آیت ۱۵ تا باب ۱۸ آیت ۲۲۔ چنانچہ حضرت سموئیل نے طالوت کو جس کا نام بائیبل میں ''ساول'' ہے۔ ان کا بادشاہ بنایا۔ یہ قبیلہ بن یمین (یعنی حضرت یامین) کی اولاد سے تھا۔ عمر ۳۰ سال۔ ایسا حسین کہ بنی اسرائیل میں اس جیسا کوئی حسین نہیں تھا۔ قد اتنا لانبا تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔ ان کے باپ کے کچھ گدھے گم ہو گئے تھے۔ ساول ان کو تلاش کرنے نکلے تھے کہ حضرت سموئیل کے یہاں پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سموئیل نبی کو اشارہ کیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا ہے چنانچہ حضرت سموئیل نے تیل کی کپی ان کے سر پر انڈیلی اور اسے چوما اور کہا خداوند نے تجھے مسیح کیا تاکہ تو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔ اس کے بعد انہوں نے بنو اسرائیل کا اجتماع عام کیا اور طالوت (ساول) کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ سموئیل باب ۹ و ۱۰

(۱۵۳) داود بن یسی۔ بن عوبید۔ (۱۰۲۴ تا ۹۶۲ قبل مسیح) یہ بنو اسرائیل کے دوسرے بادشاہ ہیں۔ پہلے بادشاہ طالوت تھے۔ آپ طالوت کی فوج میں ایک نوجوان سپاہی کی حیثیت سے تھے لیکن طالوت کی جنگ جالوت سے ہوئی تو۔ توریت میں ہے اور ایسا ہوا کہ جب فلسطی (جالوت) اٹھا اور آگے بڑھ کر داود کے مقابلہ کے لیے نزدیک ہوا تو داود نے پھرتی کی۔ داود نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک پتھر لیا اور فلاخن میں دھر کر فلسطی کے ماتھے پر ایسا مارا کہ وہ پتھر فلسطی کے ماتھے میں غرق ہو گیا اور وہ زمین پر منہ کے بل گر پڑا۔ سو داود ایک فلاخن اور ایک پتھر سے اس فلسطی پر غالب ہوا۔ اور اس فلسطی کو مارا اور قتل کیا۔ سموئیل باب ۱۷ آیت ۴۸ تا ۵۰

اور فلسطیوں نے جو دیکھا کہ ان کا پہلوان مارا پڑا تو وہ بھاگ نکلے اور اسرائیل اور یہودا کے لوگ اٹھے اور للکارے اور فلسطیوں کو وادی تک اور رعقران کے پھاٹک تک رگیدا۔ سموئیل باب ۱۷ آیت ۴۸ تا ۵۰

طالوت نے ان کے کارنامے دیکھے تو لڑکی ان کے عقد میں دیدی اور حضرت داود کو اپنا داماد بنالیا۔ طالوت جب مع اپنے بڑے لڑکے کے میدان جنگ میں کام آ گئے تو قبیلہ یہودا نے آپ کو اپنا بادشاہ منتخب کرلیا پھر دو سال کی کشمکش کے بعد دوسرے قبیلوں کے لوگوں نے آپ ہی پر اتفاق کرلیا۔ سات سال تک آپ نے پایہ تخت حیران (یعنی الجلیل) کو رکھا۔ اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے نکال کر اسے دارالسلطنت بنایا آپ نے گردوپیش کے حکمرانوں کو مغلوب کیا اور حدود سلطنت کو بہت وسیع کرلیا۔ آپ کا عہد حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحات ملکی اور حسن انتظام دونوں کے لیے یادگار ہے۔ خلاصہ توریت کتاب سموئیل۔

(۱۵۴) یہ آیت بھی ایک کسوٹی یا تھرمامیٹر ہے۔ اس کے ترجموں سے ارباب بصیرت علماء کے مختلف رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ یہ ہے۔ اگر نبودے دفع کردن خدا مردماں رابعض رابدست بعضے ویران کردہ باشد۔ خلوتہاء رہبانان وعبادتخانہاء نصاریٰ وعبادتخانہاء یہود وعباتخانہاء مسلمانان۔ یاد کردہ میشود دران مواضع نام خدا بسیارے وابستہ نصرت خواہد داد خدا کسے کہ قصد نصرت دین وے کند۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے **یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا** کے ترجمہ میں۔ دراں مساجد کے بجائے دراں مواضع فرمایا ہے۔ گویا **یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا** صوامع وبیع وغیرہ سب کی صفت ہے اور قرآن حکیم میں صوامع وغیرہ کی یہ صفت اسی حالت کے مناسب ہے جب یہ مواضع اور یہ مقامات۔ صراط مستقیم پر قائم تھے اور بجا طور پر مرکز ہدایت تھے ہم نے ترجمہ اسی مناسبت سے کیا ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ یہ ہے اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک سے تو ڈھائے جاتے سب تکیے اور مدرسے اور عبادتخانے اور مسجدیں جن میں پڑھا جاتا ہے اللہ کا نام بہت۔ یہ گویا سب کو مساجد کے تابع کر رہے ہیں اور ان مقامات سے مسلمانوں کے مختلف عبادت خانے مراد لے رہے ہیں۔ اس کی تفسیر میں آپ فرماتے ہیں۔ اللہ قادر ہے جو چاہے ایک دم میں کرے لیکن انسان سے یہی معاملہ ہے پہلے برے آپس میں سزا پاویں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ اور دیکھو اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم وتشدد کرنے کے لیے بے روک چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں گرجے عبادت گاہیں مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ یاد رکھو جو کوئی اللہ

کی (سچائی کی) حمایت کرے گا ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی تو ترجمہ میں عموماً حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں اگر اللہ لوگوں کا زور ایک دوسرے سے نہ گھٹاتا رہتا تو نصاریٰ کی خانقاہیں اور عبادتخانے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے۔ مولانا عبدالماجد صاحب تفسیر میں فرماتے ہیں تو اب تک جو عمارتیں توحید کا مرکز رہی ہیں مثلاً مسجدیں جواب بھی اسی غرض کے لیے ہیں اور اہل کتاب کی مذہبی عمارتیں جو اپنے زمانہ میں یہ کام انجام دے چکی ہیں سب ختم ہو گئی ہوتیں۔ واللہ اعلم بالصواب

(۱۵۵) **لو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض**

(۱۵۶) تورات میں ان کی تعداد چھ سو بتائی گئی ہے مگر صحابہ کرام کی تحقیق یہ ہے کہ ان کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ (بخاری شریف ۵۶۴ باب عدا صحاب بدر)

(۱۵۷) مولانا عنایت رسول صاحب چڑیا کوٹی کی تحقیقات کا ذکر آگے آئے گا۔ آپ کی تحقیق یہ ہے کہ یہاں آبادی تھی۔ حضرت سام بن نوح یہاں رہا کرتے تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بچپن میں یہاں نہیں چھوڑا گیا۔ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو حضرت سام کے پاس بھیج دیا تھا کہ یہاں رہیں اور حضرت سام کی وفات کے بعد وہ یہاں کے امام وقائد مان لیے جائیں۔ اس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر چوبیس پچیس سال تھی توریت کی منتشر اور متضاد آیتوں کے بجھے ہوئے چراغ چڑیا کوٹی صاحب کی تحقیق کا سرمایہ ہیں۔ توریت کی ان متضاد آیتوں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث پر مفصل بحث [illegible] یہاں تو صرف اتنی تنبیہ کافی ہے کہ کتاب اللہ کے واضح الفاظ کے مقابلوں میں تورات کا سہارا ڈھونڈھنا تحقیق نہیں ہے بلکہ تحقیق کی توہین اور بارگاہ حق وصداقت کی شان میں گستاخی ہے۔ کتاب اللہ کا کھلا ہوا اعلان یاد رہنا چاہئے **ان یتبعون الا الظن و ان الظن لا یغنی من الحق شیا** سورہ النجم (وہ صرف ظنی چیز کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور حق کے مقابلہ میں ظن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ قصہ بے کار ہے۔) البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس مقام پر یا اس کے قریب کوئی پڑاؤ ہو۔ جیسا کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے حضرت مسیح علیہ السلام سے ڈھائی ہزار برس پہلے یہ کاروان تجارت کا ایک منزل گاہ تھا دو ہزار سال قبل مسیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند عزیز اسماعیل علیہ السلام کو یہاں آباد کیا۔ ارض القرآن ۹۸ ج ۱

(۱۵۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **فھما لا یخلو علیھما احد بغیر مکہ الا لم یوافقاہ** بخاری شریف [illegible] حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ یہ بات صرف مکہ معظمہ میں ہے کہ یہاں صرف گوشت کھاتے رہو اور پانی پیتے رہو تو صحت بحال رہتی ہے ہر جگہ کی آب و ہوا ایسی نہیں ہوتی کہ وہاں صرف گوشت کی غذا کافی ہو سکے یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر ہے (فتح الباری)

(۱۵۹) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک طویل روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔ اس روایت کا ایک جز یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دفعہ مکہ معظمہ آئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر گئے اتفاق سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت موجود نہیں تھے ان کی اہلیہ موجود تھیں۔ انہوں نے اب تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہیں دیکھا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خاتون سے ایک اجنبی مسافر کی طرح بات چیت کی۔ آپ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی خیریت دریافت کی۔ پھر دریافت کیا یہاں تمہاری غذا کیا ہے۔ اہلیہ نے جواب دیا گوشت کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی **اللھم بارك لھم فی اللحم والماء** اے اللہ ان کے لیے پانی اور گوشت میں برکت مرحمت فرما۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس زمانہ میں اس نو آبادی میں غلہ نہیں آتا تھا۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غلہ کے لیے برکت کی دعا نہیں مانگی۔ بخاری شریف ۴۷۵

(۱۶۰) جب خانہ کعبہ کی تعمیر کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ معظمہ تشریف لائے تو بخاری میں ہے۔ **وافق اسمعیل من ورء**

زمزم یصلح نبلا لہ حضرت اسماعیل سے زمزم کے اس طرف ملاقات ہوئی۔ اس وقت حضرت اسماعیل اپنے تیر درست کررہے تھے۔ بخاری شریف ۶۷ ۴ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسلم کے نوجوانوں کو دیکھا جو تیراندازی کی مشق کررہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خوب مشق کرلو تمہارے باپ (یعنی مورث اعلیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام) بھی تیراندازی کے ماہر تھے۔ ارموا بنی اسمعیل فان ابا کم کان رامیا (بخاری شریف ۴۰۶)

(۱۶۱) قال ومن کفر فامتعه قلیلا ثم اضطره الی عذاب النار وبئس المصیر (سورہ بقرہ ع ۱۵) اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کفر کرے گا اس کو بھی تھوڑی مدت کے لیے بہرہ اندوز کروں گا۔ پھر اس کو لازمی طور پر دوزخ میں پہنچادوں گا اور بہت برا ٹھکانا ہے۔

(۱۶۲) اس آیت کے یہ معنے بھی لکھے گئے ہیں اور ان کے لیے زمین کی پیداوار سے سامان رزق مہیا کردے (ترجمان القرآن)

(۱۶۳) مؤرخ ابوالفداء کا بیان ہے کہ ابرہہ تیرہ ہاتھی لے کر آیا تھا ایک مست ہاتھی اس لیے مہیا کیا تھا کہ وہ خانہ کعبہ کو منہدم کرے گا۔ اس کا نام محمود تھا۔ لیکن جب حملہ کا وقت آیا تو یہ ہاتھی اپنی جگہ جم گیا۔ بہت کچھ مارا پیٹا گیا۔ مگر وہ خانہ کعبہ کی طرف ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ ہاں دوسری طرف اس کا رخ کردیتے تھے تو خوب لپک کر چلتا تھا۔ یہاں ہاتھی کا یہ تماشا ہو رہا تھا کہ آسمان پر پرندوں کی قطار نمودار ہوئی۔ ہر ایک پرندہ تین کنکریاں لیے ہوئے تھا۔ ایک چونچ میں اور دو دو پنجوں میں۔ یہ کنکریاں چنے کے اور مسور کے برابر تھیں جس کے یہ کنکریاں لگتی تھیں وہ مرجاتا تھا۔ پھر خدا تعالیٰ نے ایک رو بھیج دی۔ جس نے سب کو بہا کر سمندر میں ڈال دیا۔ ابرہہ اور اس کے کچھ ساتھی بچ گئے۔ وہ یمن کو بھاگے مگر ابرہہ پایہ تخت تک نہیں پہنچ سکا اس کے بدن میں ایسا عارضہ ہوگیا کہ اس کے اعضا گل گل کر گر رہے تھے۔ صنعا پہونچ کر وہ مرگیا۔

(۱۶۴) مثلاً بنوثقیف نے لات کو اپنا دیوتا بنا رکھا تھا۔ طائف میں اس کے نام کا بیت تھا۔ بنومعتب اسی کے حاجب وکلید بردار تھے۔ باشندگان یثرب اوس اور خزرج اور ان کے جو ہم مشرب وپیرو تھے ان کا مخصوص دیوتا منات تھا۔ اس کا بیت ساحل بحر پر مشال کے ایک جانب مقام قدید پر تھا۔

قبیلہ دوس قبیلہ خثعم قبیلہ بجیلہ اور جو اس علاقہ میں رہتے تھے ان کا دیوتا، ذوالخلصہ تھا۔ جس کا بیت تبالہ میں تھا۔ اجا ر وسلمی وغیرہ یعنی جبال طے کے باشندوں کا دیوتا فلس تھا۔ اور حمیر اور اہل یمن نے رئام کو اپنا دیوتا مان رکھا تھا جس کے نام کا بیت یمن کے شہر صنعا میں تھا۔ بنی ربیعہ بنی کعب کا دیوتا الگ تھا اس کا نام رضا تھا۔ بنوبکر بنوثعلب بنووائل اور آیاد کا دیوتا ذوالکعبات تھا سنداد میں اس کے نام کا بیت تھا۔ سیرت ابن ہشام ۵۴ تا ۵۶

(۱۶۵) قریش اور بنی کنانہ کا مخصوص دیوتا عزیٰ تھا۔ جس کا بیت مقام نخلہ پر تھا اس کی سدانت وحجابت قبیلہ سلیم کی شاخ بنی شیبان کے سپرد تھی۔ یہی بنی شیبان یا بنی سلیم تھے جو بنی ہاشم اور خاص طور پر خواجہ ابوطالب کے حلیف تھے۔ ابن ہشام ۴۴ ج)

(۱۶۶) سیرت ابن ہشام ۴۳ ج ۱

(۱۶۷) قحطان جس کو توریت میں یقطان کہا جاتا ہے جو حضرت سام بن نوح کی اولاد میں ہے۔ عرب عاربہ کا جد اعلیٰ ہے۔ اس نے یمن کو اپنا وطن بنایا۔ جرہم اسی کا لڑکا بتایا جاتا ہے۔ مؤرخ ابوالفداء کہتے ہیں کہ قحطان کے دو بیٹے تھے۔ یعرب (توریت کا نام یارح) اور جرہم۔ یعرب یمن میں رہا اور جرہم حجاز کا مالک ہوگیا۔ کچھ مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ یعرب ہی کا نام جرہم ہے۔ تو گویا جو یمن کا مالک تھا اس نے اپنی اولاد حجاز میں بھی بھیج دی جو بنو جرہم کے نام سے مشہور ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جرہم قحطان کا بھائی تھا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ جرہم اور قحطان کا باہمی تعلق صرف یہ ہے کہ یہ دونوں حضرت سام بن نوح کی اولاد میں سے یعنی سامی النسل ہونے کے سوا اور کوئی رشتہ نہیں ہے نہ آپس میں بھائی بھائی ہیں نہ باپ بیٹے۔ واللہ اعلم

(۱۶۸) یمن ایک طرف سواحل ہندوستان کے مقابل واقع ہے۔ دوسری طرف سواحل افریقہ کے اس کے ایک حصہ (عیر) کا دامن حجاز سے ملا ہوا ہے۔ اندرونی حدود صحراء عرب سے ملی ہوئی ہیں۔

(۱۶۹) توریت میں شبا۔ ایک قبیلہ کے جداعلیٰ کا نام ہے۔ عرب روایت کے مطابق اس جداعلیٰ کا نام عمر یا شمس تھا اور لقب سبا تھا۔ جو قحطان کا پوتا تھا۔ مرکز حکومت یمن کا مشرقی حصہ تھا۔ شہر مارب جس کو شہر سبا بھی کہتے تھے اس کا دارالسلطنت تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ مغرب میں حضر موت تک وسیع ہو گیا تھا اور چونکہ تاجر قوم تھی اس لیے بہت سے بحری اور تجارتی راستوں پر بھی اس کو قبضہ کرنا پڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً گیارہ سو برس پہلے اس کا عروج شروع ہوا جس کا سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ایک ایک سو پندرہ برس پہلے (۱۱۵ ق۔م) تک رہا۔

(۱۷۰) مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے ارض القرآن میں ایک یونانی مؤرخ اگارتھر شیدلیس یا اگارتھر کیڈس کا (جو سو مسیح سے ... سو برس پہلے اور سبا کا معاصر تھا) بیان نقل کیا ہے کہ یہاں کے لوگ (سبا) تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند ہیں۔ ان کے ... تخت میں سونے چاندی کے برتن۔ تخت تختوں کے پائے۔ مکانات کے چوکھٹ سونے چاندی کے نقش ونگار سے آراستہ جو ... سے مرصع ہوتے ہیں۔ بہترین دستکار ہیں جو بڑی محنت اور اعلیٰ قسم کی مہارت سے یہ جڑاؤ تخت۔ تختوں کے پائے۔ چوکیاں مکانوں کی کھڑکیاں ... چوکھٹ وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ ارض القرآن ص ۲۶۹

دستکاری کے علاوہ انجینئری بھی حیرت انگیز تھی۔ یہاں کوئی ندی نہیں تھی تو پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند بنا دیتے تھے جن میں پہاڑوں کا پانی رکتا تھا ان میں سب سے بڑا بند وہ تھا جو خود دارالسلطنت مارب میں تھا جس کو سد مارب یا عرم مارب کہتے تھے اسی کے ٹوٹنے سے جو سیلاب آیا اس کو کلام اللہ شریف میں سیل العرم فرمایا گیا ہے۔ اس بند کا طول ... فٹ تھا ... اور جو پانی اس میں رکتا تھا اس کا احاطہ کئی مربع میل تھا۔

(۱۷۱) اسی مؤرخ اگارتھر کیڈس کا بیان ہے۔ سبا عرب کے سرسبز حصہ میں رہتے ہیں جہاں بہت اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں ان کی قسمیں اور ان درختوں کی قسمیں جو یہاں ہوتے ہیں شمار کرنی مشکل ہیں جو زمین ساحل دریا پر ہے اس میں نہایت خوبصورت درخت ہوتے ہیں۔ اندرون ملک بخورات دارچینی اور چھواروں کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں۔ یہاں کے درختوں سے جو خوشبو نکلتی ہے اس کی تعریف لفظوں میں نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے جنت کی خوشبو یہاں پھیلا دی گئی ہے۔ ساحل یہاں سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ مگر ساحل پر گذرنے والے بھی ان درختوں کی خوشبو کی مہک سونگھتے رہتے ہیں۔

(۱۷۲) ملکہ سبا (بلقیس) کے متعلق قرآن شریف میں یہ ہے کہ جب وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا کہ محل کے اندر چلیے تو جیسے ہی محل کے فرش یا صحن پر اس کی نظر پڑی وہ سمجھی کہ یہاں پانی بھرا ہوا ہے اور اس طرف قدم بڑھتے لگی تو یہ سمجھ کر کہ پانی کچھ گہرا ہے اس نے صرف ٹخنے ہی نہیں کھولے بلکہ پنڈلیاں کھول لیں۔ فوراً ہی اس کو بتایا گیا کہ یہ پانی نہیں ہے بلکہ **صرح ممرد من قواریر** یہ ایک محل ہے جو آبگینوں سے جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ یہ صرف ایک صفت ہے کہ پورا فرش پانی معلوم ہوتا ہے۔ اب اس نے کہا **رب انی ظلمت نفسی واسلمت مع سلیمان للہ رب العلمین** (اے میرے پروردگار میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ اور میں سلیمان کے ساتھ ہو کر رب العلمین پر ایمان لے آئی) یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اس جواب کا کیا موقع تھا۔ یہ تو ایک ایسا موقع تھا کہ وہ خاموش رہتی یا کوئی جملہ ایسا اس کی زبان سے نکلتا جس سے شرمندگی کا اظہار ہوتا اور دوسری طرف قہقہے بلند ہوتے کہ ملکہ کو خوب بے وقوف بنایا۔ مگر نہ اظہار شرمندگی ہے نہ قہقہے کی آواز۔ خاموشی اور سناٹا ہے اور صدا بلند ہوتی ہے تو یہ کہ اے پروردگار میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔

۱۹۴۲ء کی بات ہے جب مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز مراد آباد جیل میں نظر بند تھے وہ اس نظر بندی میں چوری چھپے وہ قصص القرآن مرتب فرمایا کرتے تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز بھی بسلسلہ نظر بندی یہیں تشریف فرما تھے۔ یہاں صبح کے وقت چار کے بعد تھوڑی دیر مجلس رہا کرتی تھی۔ مجاہد ملت نے حضرت شیخ الاسلام (نور اللہ مرقدہما) سے یہی سوال کر لیا۔ حضرت شیخ الاسلام نے اپنے استاد حضرت مولانا محمود حسن صاحب (اسیر مالٹا) شیخ الہند

کے حوالے سے ایک نہایت عجیب نکتہ بیان فرمایا جو اس ماحول اور اس کے پس منظر کے بالکل مطابق ہے جس سے اس پوری حکایت کی دلچسپ لطافت ظاہر ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی معصوم کی شان سے بہت بعید تھا کہ وہ اپنے مہمان سے اس کا مذاق کرتا خصوصاً جبکہ مہمان خاتون تھی۔ قرآن حکیم ان دونوں کے آپس میں ازدواجی تعلق کے قائم ہونے سے بالکل خاموش ہے مفسرین نے دونوں روایتیں بیان کی ہیں ایک یہ بھی ہے کہ نکاح ہوا اور بلقیس اپنے دارالسلطنت میں واپس چلی گئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام ہر ماہ ان سے ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ دوسری روایت یہ کہ خود سلیمان علیہ السلام نے کسی اور سردار سے اس کا نکاح کرا دیا تھا۔ البتہ اسرائیلی تالمود اس تمام قصہ ہی معاشقہ کا پہلو نمایاں کرتی ہے جو شان انبیاء کے بالکل خلاف ہے۔ بہرحال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بلقیس سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔ تب بھی آپ کی مرسلانہ متانت اور شاہانہ وقار دونوں اجازت نہیں دیتے کہ خود اپنی ملکہ یا ہونے والی ملکہ سے ایسا مذاق کیا جائے علاوہ ازیں اگر مقصد مذاق تھا تو کتاب اللہ اور وحی الٰہی کی شان اس سے بلند ہے کہ مذاق کی باتوں کو اپنے دامن میں جگہ دے۔ واقعہ یہ ہے کہ دولت یا جاہ عظمت یا ازدواجی تعلق کا شوق نہیں بلکہ دعوت اسلام کا ایک حقیقی اور صادق جذبہ شروع سے آخر تک کارفرما ہے۔ مختلف مرحلوں پر اس کا پیرایہ اور اس کا انداز بدلتا رہا ہے۔ ہدہد کی ابتدائی رپورٹ ملاحظہ فرمایئے وہ کہتا ہے میں پوری تحقیق اور کامل یقین سے سبا کی حالت پیش کر رہا ہوں۔ ایک عورت ان پر مالکانہ اقتدار رکھتی ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے اور بہت کچھ ہے۔ ایک بہت بڑا تخت شاہی بھی اس کے پاس ہے لیکن دولت وثروت اور شان وشوکت کے باوجود بے حسی اور کور باطنی کی حالت یہ ہے کہ یہ سب خدا کو چھوڑے ہوئے ہیں آفتاب کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ شیطان کے ہتھکنڈوں میں پھنسے ہوئے ہیں کہ سیدھی راہ ان کو نظر نہیں آتی وہ اس خدا کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمان اور زمینوں کی پوشیدہ طاقتوں کو نمایاں کرتا رہتا ہے اور جس کا علم ہر ایک ظاہر و باطن کو محیط ہے۔ ہدہد نے رپورٹ ایسے انداز سے دی تھی کہ ایک علم بردار توحید فوراً جہاد کا حکم دیدیتا ممکن ہے اس کی خواہش یہی ہو۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جن کو یہ حکم تھا کہ یہ اعلان کرو۔ یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا (اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہوں) ان کو یا ان کی اُمت کو بھی یہ حکم نہیں ہے کہ کسی غیر اسلامی طاقت پر فوراً چڑھ دوڑیں تاوقتیکہ ان کی طرف سے جہاد کا اور جنگ کا کوئی محرک پیش نہ آئے اور انبیاء بنی اسرائیل اگرچہ دعوت ہر ایک کو دے سکتے تھے مگر ان کے فرائض خاص طور پر بنو اسرائیل سے متعلق ہوا کرتے تھے ان کے لیے کب ممکن تھا کہ وہ فوراً جہاد شروع کر دیتے۔ لہٰذا ہدہد کی رپورٹ سے متاثر ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جہاد کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں اس کو یہ لکھا ورنہ کرو میرے مقابل اور چلے آؤ حکم بردار ہو کر۔ گویا دعوت صرف یہ دی گئی کہ آتش پرستوں اور کواکب پرستوں کے بلاک سے نکل کر خدا پرستوں کے سیاسی بلاک میں شامل ہو جاؤ۔ خط نہایت مختصر اور نہایت جامع ہے اور خصوصیت یہ ہے کہ خط کے مضمون کے لیے جتنے الفاظ استعمال کئے گئے اتنے ہی الفاظ بسم اللہ کی عبارت میں ہیں جس میں ذات خداوندی کے تعارف کے بعد اس کے کمالات رحمت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ دعوت کا حکیمانہ اسلوب ہے کہ خط کے الفاظ سے اگر مادی اور سیاسی قوت کا اثر دماغ پر پڑے تو ساتھ ساتھ فوق الفطرت طاقت کا تصور بھی دماغ کو متاثر کر دے۔ ملکہ کی ذکاوت وذہانت کا پہلا نمبر تو یہ تھا کہ اس نے خود حضرت سلیمان علیہ السلام کا امتحان لیا۔ بیش قیمت ہدایا لے کر روانہ ہوئی زر دیدم فولا د نرم مگر نبوت کا ٹکسالی سونا۔ اس میں کھوٹ کا کیا کام اس نے پہلے تو اسی مافوق الفطرت ذات کا تصور ایسے انداز سے پیش کیا کہ جس میں قادر مطلق کی قدرت بے پایاں کی طرف اشارہ کے ساتھ جذبات شکر بھی ملے ہوئے تھے مآاتانی اللہ خیر مما اتاکم (اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مجھے عطا فرمایا ہے وہ بہت بہتر ہے اس سے جو تم کو عطا کیا ہے پس تمہارے اس مال کا اس بیش بہا دولت کے ساتھ کیا جوڑ) یہ جواب بھی ہے اور حکم سابق کی دلیل بھی۔ گویا تم کو اسی لیے طلب کیا ہے کہ خیر اور بہترین دولت تمہارے پاس نہیں ہے میرے پاس ہے۔ اس کے بعد اس نمائشی دولت کا جواب دیا جو ایسا تلخ تھا کہ لالچ دینے والے کے حواس باختہ ہو جائیں۔ ہم ایسے لشکر بھیجیں گے کہ چھکے چھوٹ جائیں گے مقابلہ تو کیا کر سکیں گے مقابلہ کی ہمت

بھی نہیں ہوگی اور ذلیل کر کے ان کو خود ان کے وطن سے نکال دیں گے مگر صرف جواب ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس مافوق الفطرت طاقت کا تصور پختہ کرنے کے لیے ایک معجزہ بھی کر دکھایا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی پل بھر میں اس کا عظیم الشان تخت منگوالیا جس پر بڑا ناز تھا اور حکم دیا کہ اس کا روپ بدل دیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ ملکہ کا ذہن رسائی کر سکتا ہے یا پرستش غیر اللہ کی دلدل میں پھنس کر وہ رسائی فکر سے محروم ہوگئی ہے۔ ملکہ کا جواب اس کی اعلیٰ ذہانت اور ادب شناسی کی دلیل ہے اس نے تخت کو دیکھ کر یہ نہیں کہا ہاں ہاں یہ تو میرا ہی تخت ہے۔ اول تو بڑے کی بارگاہ میں میرا کا لفظ غیر مناسب اور سراسر بے ادبی اس کے علاوہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر گویا غصب کا الزام اس لیے جواب یہ دیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا بعینہ وہی ہو۔ اب یہ ملکہ کا کمال ادب ہے کہ اس محتاط جواب کے ساتھ کچھ اور بھی کہہ دیا جس سے شاہانہ آداب اور پیغمبرانہ احترام کا تقاضا بھی پورا ہوگیا حضور والا ہم تو پہلے ہی آپ کے گرویدہ ہو چکے ہیں۔ ہمیں آپ کی عظمتوں کا پہلے ہی علم ہو چکا ہے اور ہم ان کے معترف ہو گئے ہیں بہت ممکن ہے ملکہ کی اس فطری صلاحیت کی طرف اشارہ مقصود ہو جو اس کے بعد ارشاد ہوا وصدھا ما کانت تعبد من دون اللہ انھا کانت من قوم کافرین اس کو روک رکھا تھا (ایمان لانے) اس بات نے وہ عبادت غیر اللہ کی عادی تھی کیونکہ وہ کافروں ہی میں کی تھی آنکھ کھول کر اس نے انہیں کو دیکھا تھا۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ محل کا یہ مظاہرہ ایک طرح کا امتحان اور حکیمانہ انداز میں حقیقت پرستی کی طرف دعوت تھی۔ جب تخت کے معاملہ میں ملکہ کی رسائی فکر کا اندازہ ہوگیا تو پھر یہ منظر اس کے سامنے پیش کیا گیا جہاں صورت موجود ہے مگر حقیقت کا نام ونشان نہیں ہے آفتاب اور چاند تاروں کی چمک دمک۔ ایک صورت اور ایک نمائش ہے لیکن اگر پانی کا پیاسا اس بلوری فرش سے اپنی پیاس نہیں بجھا سکتا تو خدا پرستی کی تشنگی بھی ان صورتوں کی پوجا سے پوری نہیں ہوسکتی بلکہ ان صورتوں کی پوجا سراسر دھوکا ہے جس کا نتیجہ سراسر محرومی ہے۔ ملکہ نے اس اشارہ کو سمجھا اور نہ صرف سمجھا بلکہ اتنی متاثر ہوئی کہ فوراً اعتراف کر لیا کہ جو کچھ میں نے آج تک کیا وہ سراسر فریب فکر تھا۔ سراسر ظلم تھا جو میں اپنے اوپر کرتی رہی اور اب میں ان کا ساتھ چھوڑتی ہوں جن میں رہ کر میں نے یہ دھوکا کھایا تھا اور دھوکا کھاتی رہی تھی۔ اب میں عہد کرتی ہوں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے حقیقت پرست کے ساتھ رہوں گی اور خداء واحد کی پرستش کرتی رہوں گی جس کے لیے میں اسلام قبول کرتی ہوں۔

آپ نے فرمایا تخت منگوانا اور اس کی صورت بدل دینا یہ بھی ایک سبق اور لطیف پیرایہ میں ایک فہمائش تھی۔ وہ تخت جس کو ہد ہد نے عرش عظیم کہا تھا ناپائیدار اس کی عظمت ناپائیدار وہ صرف نمائش ہے۔ حقیقت کچھ بھی نہیں ہے اس کی حقیقت خود ملکہ ہے۔ بلکہ اگر ہے تو تخت کی عظمت بھی باقی ہے۔ ملکہ اگر نہیں ہے تو وہ اثاث البیت ہے۔ دیکھو سلیمانی محل کے ایک کنارہ پر پڑا ہوا اپنی لاچارگی اور بے ثباتی کا ماتم کر رہا ہے۔ اسی طرح آفتاب اور چاند تارے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر اور اس کے کمالات کی نشانیاں ہیں مگر ان کی تمام حیرت انگیزی پرتو ہے قدرت خداوندی کا۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی پرستش ایسی ہے جیسے ملکہ کو چھوڑ کر اس کے تخت کو کوئی فرماں روا اور شہنشاہ ماننے لگے۔ واللہ اعلم

(۱۷۳) کتاب اللہ شریف کی چند آیتوں کا ترجمہ ملاحظہ فرمالیجئے۔ سبا کی ترقی اور اس کی آبادی اور بربادی کے تمام نقشے سامنے آجائیں گے۔

(۱) باغات کی دو قطاریں، دائیں بائیں (دو طرفہ سلسلہ وار) آمدنی بھی وافر۔ پھل بھی اتنے کہ ختم نہ ہوں۔ سایہ گھنا شادابی فرحت بخش (ہم نے انبیاء علیہم السلام اور ناصحین کی معرفت یا خود زمانہ کی معرفت جو بہترین ناصح ہے ان سے کہا) اپنے رب کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو ایک نعمت اور ایک ہی احسان نہیں ہے دنیوی نعمتیں بھی ہیں کہ طیبۃ (عمدہ اور پاکیزہ صاف ستھرا شہر) اور آخری نعمت عظیم بھی میسر ہے کہ رب کی مہربانیاں شامل حال ہیں جو کوتاہیوں کو بخشنے والا اور خطا کاروں سے درگذر کرنے والا ہے۔

(۲) (لیکن ان نعمتوں اور مہربانیوں کے باوجود) انھوں نے اطاعت خداوندی سے منھ موڑ تعمیل شریعت سے روگردانی کی غرور میں کثرت معاصی میں پڑ گئے اور ناصحین کی کچھ نہیں سنی (ساقیا امروز مے نوشیم فردا کس بدید) (تو ہم نے ان پر ان کی بداعمالیوں کی سزا میں

کہ بند کا سیلاب چھوڑ دیا۔ وہ قابل تخمین پانی جو بند میں رکا ہوا تھا۔ جیسے ہی بند ٹوٹا سیلاب بن کر چڑھ گیا جس سے ان کے دورویہ باغات سب برباد ہو گئے اور ہم نے ان کے دورویہ باغوں کے بدلے میں اور دو باغ دے دیے لیکن پہلے باغوں کے برخلاف ان دونوں باغوں کے پھل نہایت بدمزہ (خوبصورت اور خوشبودار درختوں کے بجائے) جھاؤ اور پیلو کے بے فیض درخت نہ ان کا سایہ ان کے پھل (اور ہاں پھل دار کیا چیز دی گئی) بیری کے کچھ تھوڑے سے درخت وہ بھی شہری نہیں بلکہ جنگلی خودرو۔ جس میں کانٹے بہت اور پھل میں لطافت ندارد ان کو یہ سزا ہم نے ان کی ناسپاسی کے سبب دی اور ہم ایسی سزا بڑے ہی ناسپاس کو دیا کرتے ہیں۔

(۳) اور ہم نے ان کے اور بستیوں کے درمیان جہاں (ہم نے پیداوار وغیرہ کی) برکت رکھی تھی بہت سی آبادیاں قائم کر دی تھیں۔ جو دور سے (شاہراہ سے) نظر آتی تھیں۔ اور ان میں ہم نے سفر کی منزلیں مقرر کر دی تھیں۔ سفر کرو ان میں دن رات بے کھٹکے نہ رہزن کا خطرہ۔ نہ بھوک پیاس کا خوف۔ قدم قدم پر آبادیاں اور ہر جگہ کھانے پینے کا سامان بفراغت۔

(۴) اب ان کی بدقسمتی کہ اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کا شکر یہ تو کیا کرتے ان نعمتوں اور رحمتوں کو زحمت سمجھنے لگے یہ کیا۔ باغات اور آبادیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ سفر کا مزہ بھی نہیں آتا۔ بس وہ کہنے لگے۔ اے ہمارے پروردگار ہمارے سفروں میں درازی کر دے۔ یعنی بیچ کے دیہات اور آبادیاں اجاڑ دے تاکہ منزلوں میں خوب فاصلہ ہو جائے (یہ ایسا ہی مطالبہ تھا جیسے من وسلویٰ کے عوض میں لہسن اور پیاز وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا۔ اس ناشکری کے علاوہ انہوں نے اور بھی نافرمانیاں کیں۔ یعنی خود اپنے اوپر اور اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ سو ہم نے ان کو افسانہ بنا دیا اور انکو تتر بتر کر دیا (قرآن حکیم)

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سیلاب کے علاوہ سبا کی بربادی کا سبب یہ ہوا کہ یہاں کی تجارت ختم ہو گئی۔ وہ صرف سیلاب کے باعث ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کا سبب یہ ہوا کہ چوتھی صدی (ق م) کے اواخر میں یونانیوں اور پہلی صدی (ق م) میں رومیوں نے علی الاتصال شام ومصر پر قبضہ کر لیا یہ عربوں کے بار بار حملوں سے خوف زدہ رہتے تھے۔ عرب اس تجارت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے اس لیے غیر قوموں کو اپنے ملک سے گذرنے نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان اور افریقہ کی تجارت کو بری راستے سے بحری راستے کی طرف منتقل کر دیا۔ اور تمام مال کشتیوں کے ذریعہ بحر احمر کی راہ مصر اور شام کے سواحل پر اترنے لگا۔ اس طریق سفر نے یمن سے شام تک خاک اڑا دی اور سبا کی تمام آبادیاں بے نشان ہو کر رہ گئیں۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں یمن ایک طرف سواحل ہندوستان کے مقابل واقعہ ہے اور دوسری طرف سواحل افریقہ کے سونا۔ بیش قیمت پتھر۔ مسالہ۔ خوشبوئیں ہاتھی دانت یہ چیزیں حبش اور ہندوستان سے یمن آیا کرتی تھیں۔ یمن سے سبا اونٹوں پر لاد کر بحر احمر کے کنارے خشکی خشکی حجاز سے گذر کر شام ومصر لاتے تھے۔ قرآن مجید نے اسی راستہ کو امام مبین (کھلا راستہ) اور اسی سفر کا نام) **رحلة الشتاء والصيف** رکھا ہے جس کو قریش نے جاری کیا تھا۔ ان تجارتی کاروانوں کی آمد ورفت کے سبب سے یمن سے شام تک آبادیوں کی ایک قطار قائم تھی جہاں بے خوف وخطر سفر ہو سکتا تھا۔ ارض القرآن ص ۶۲ یعنی قرآن شریف میں جس بربادی کا ذکر ہے اس کے اسباب میں سے صرف ایک سبب کا تذکرہ ہے۔

(۱۷۴) علامہ سید سلیمان نے ان کی تفصیل بھی کر دی ہے کہ یمن کے دوسرے حصوں میں قبیلہ ہمدان اور قبیلہ اشعر رہ گیا۔ قبائل کندہ اور قضاعہ نجد چلے گئے۔ اوس اور خزرج یثرب (مدینہ) قبیلہ ازدغسان عاملہ اور غان شام لخم اور جذام عراق چلے گئے۔

(۱۷۵) علماء انساب کہتے ہیں کہ حمیر۔ سبا کی اولاد میں تھا اور سبا قحطان کا پوتا یا پڑپوتا تھا۔ تقریباً گیارہ سو برس تک وہ قبیلہ حکمران رہا جو سبا کی طرف منسوب ہو کر سبا کہلاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ السلام کی پیدائش سے ایک سو پندرہ سال پہلے ان کا دور ختم ہو گیا تو اس خاندان کا عروج ہوا جو حمیر میں سبا کی طرف منسوب تھا اور حمیری کہلاتا تھا۔ لغت کے لحاظ سے (حمیر کو اگر حمر سے ماخوذ مانا جائے تو معنی) سرخ (گورے) ہوں گے۔ چونکہ ان کے مقابل امور رقیب حبش۔ کالے ہوتے تھے ان کو حمیر کہا گیا (گورا)۔

(۱۷۶) حبشی کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی سے انہوں نے یمن پر حملہ شروع کیا اور یہ حملہ مسلسل قائم رہا۔ کبھی فاتح ہو کر بڑھے اور کبھی مفتوح ہو کر پیچھے ہٹے۔ آخر حضرت موت اور دیگر ساحلی مقامات پر موقع پا کر جم گئے غالباً شمر یہرش (حارث

الرائش) نے جو یمن اور حضر موت کا پہلا بادشاہ ہوا۔ اس نے یہاں سے حبشیوں کو نکال دیا مگر اکسومی حبش پر پلٹے اور حمیر کو شکست دی۔ ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک یہ فرماں رواں رہے۔ گو وطنی رؤسا بھی اپنی جگہ ماتحت کی حیثیت (تعلق دار کی حیثیت) سے قائم رہے۔ ۳۶۷ء میں ملک یکرب نے ان کو نکال کر یمن اور حضر موت پر دوبارہ حقیقی حکومت قائم کی۔ یہ حکومت ۵۲۵ء تک قائم رہی۔ ۵۲۵ء میں اکسومیوں نے دوبارہ حملہ کر کے ان کو برباد کیا (اسی کے بعد اصحاب الفیل کا ہنگامہ ابرہہ نے برپا کیا) ارض القرآن ۲۹۱ ج ا

(۱۷۷) قرآن حکیم نے لفظ تبع دو جگہ استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ تمرد اور سرکشی کی مثال بنا کر (کہ کفار مکہ سے پہلے قوم نوح اصحاب الرس وغیرہ اور قوم تبع انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں تمرد کر کے اس کا نتیجہ بھگت چکی ہیں (ق) دوسری جگہ نمونہ عبرت کے طور پر (سورہ دخان میں) یہ قریش بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور وہ قومیں جو ان سے پہلے گزریں۔ ہم نے ان سب کو اس لیے برباد کر دیا کہ یہ قومیں مجرم تھیں۔

(۱۷۸) ابن ہشام نے اس کا نام اسعد بتایا ہے۔ باپ کا نام کلی کرب اور کنیت ابو کرب۔ اسعد ابو کرب کے نام سے مشہور ہے چونکہ بہت ذکی اور ذہین تھا اس لیے اس کا وصف تبان بھی مشہور ہو گیا اس کو تبان اسعد یا اسعد تبان بھی کہا جاتا ہے۔ تبان تبانتٌ سے ماخوذ ہے بمعنے ذہانت۔ تبن اور تبان۔ ذکی اس نے پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں ۴۰۰ء سے ۴۲۵ء تک حکومت کی پچیس سال بادشاہ رہا۔ ابن ہشام کی روایت یہ ہے کہ یہ پہلے مدینہ گیا تھا وہاں بنو قریظہ کے یہودیوں سے متاثر ہوا۔ وہاں کے دو یہودی عالموں کا خاص طور سے معتقد ہو گیا۔ مدینہ طیبہ سے مکہ کا ارادہ کیا۔ قبیلہ بنو ہذیل کے لوگوں نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ خانہ کعبہ کے خزانہ کو لوٹ لے۔ اس نے ان یہودی عالموں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اس حرکت سے منع کیا کہ اس طرح وہ خود تباہ ہو جائے گا۔ کامیاب تدبیر یہ ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا احترام کرے۔ ان یہودی عالموں نے کہا یہ خود بھی خانہ کعبہ کا احترام کرتے ہیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو اس کے بانی ہیں وہ ہمارے بھی مورث اعلیٰ ہیں۔ مگر چونکہ یہاں اصنام پرستی ہونے لگی ہے اس لیے ہم یہاں نہیں جاتے اور یہ بھی بتا دیا کہ بنو ہذیل نے اپنے عقیدہ کے مطابق بربادی کا اور تباہی کا مشورہ دیا ہے کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کعبہ کو لوٹنے والا برباد ہو جاتا ہے۔ اسعد ابو کرب نے ان علماء کے مشورہ پر یہاں تک عمل کیا کہ طواف وغیرہ جو رائج تھا وہ سب کیا مزید براں خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا۔ پہلے موٹے کپڑے کا غلاف چڑھایا پھر اس کو اتروا کر یمنی چادروں کا پھر اس سے بھی بڑھیا ریشمی کپڑے کا غلاف پہنایا۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۱۱ تا ۱۵

ابن ہشام نے اس واقعہ کو مذہبی رنگ دیا ہے لیکن جو سیاسی حالات اس دور میں رونما تھے وہ اس حسن ظن کو درست نہیں سمجھتے۔ کتبات وغیرہ کی مدد سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں ۳۸ سال (۳۴۰ تا ۳۷۸ء) ایسے گزرے ہیں کہ اکسومی حبش یمن پر قابض ہو گئے تھے۔ پھر کلی کرب جس کو ملک یکرب بھی کہا جاتا ہے اس نے حبشیوں کو یمن سے نکالا اور دوبارہ حمیر کا اقتدار بحال کیا۔ کلی کرب کے بعد ۳۷۸ء سے اس کا لڑکا عمرو بن کلی کرب حکمراں رہا اس کے بعد یہ اسعد ابو کرب تخت نشین ہوا تھا۔ نجران اس وقت عیسائیت کا گڑھ بن چکا تھا۔ حبشیوں کے نکلنے کے بعد بھی عیسائیت کا یہ مرکز ختم نہیں ہوا۔ بس ایک طرف حبشیوں کا دباؤ تھا۔ دوسری جانب رومی جو حبشیوں کے پشت پناہ تھے وہ مصر پر قابض تھے۔ اب لامحالہ تابع یمن کو مددگاروں کی ضرورت تھی۔ اسعد ابو کرب نے مذہب کے نام پر یہود کی ہمدردی حاصل کی۔ پہلے خود یہودی بن گیا۔ پھر بنو قریظہ کے دو عالموں کو لا کر یمن میں یہودیت کی اشاعت کرائی۔ حجازی عرب کی سب سے بڑی دولت خانہ کعبہ تھی۔ اس پر غلاف چڑھا کر اس نے اہل حجاز کی ہمدردی حاصل کی۔

(۱۷۹) نجران۔ عسیر سے متصل بحر احمر کے ساحل پر ایک چھوٹا سا علاقہ تھا۔ مقابل کے ساحل پر حبش تھا جہاں عیسائیت پھیل چکی تھی۔ اس کے علاوہ رومی سوداگر بھی یمن کے سواحل تک پہونچے تھے۔ یہ سوداگر جہاں جہاں گزرتے سامان تجارت کے ساتھ عیسائیت کی سوغات بھی بانٹتے جاتے تھے۔ عیسائیت راہب بھی مخصوص مقاصد کے ساتھ ملک میں دورہ کرتے تھے نجران ان سے متاثر ہوا۔ تقریباً ۳۳۰ء میں یہاں کے باشندے عیسائی بن گئے۔ پھر دس سال بعد ۳۴۰ء میں حبشیوں نے یمن پر قبضہ کر لیا جس سے نجران کی عیسائیت [illegible] ہو گئی۔ ۳۷۸ء میں اگرچہ کلی کرب نے حبشیوں کو نکال دیا مگر نجران کی عیسائیت ختم نہیں ہوئی۔ اس زمانہ میں جو تبع ہوتے رہے [illegible] تبع کے جس کا نام عبد کلیل تھا باقی سب یہودی تھے۔ ان سب کو نجران کی عیسائیت گوارا نہیں تھی۔ چھٹی صدی کے شروع میں [illegible]

ایک واقعہ پیش آیا جس کا تذکرہ احادیث میں بھی ہے۔اس واقعہ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔واقعہ یہ تھا کہ نجران میں ایک راہب کا مقام تھا۔ایک لڑکا اس راہ سے گزرتا تھا۔راہب اس کو راستہ میں ٹھیرا کر مذہبی تعلیم کا روز کوئی سبق یاد کرا دیتا تھا۔باپ اس کو نجوم کی تعلیم دلانا چاہتا تھا اس نے انجیل کے وعظ یاد کر لیے جب ارباب اقتدار کو معلوم ہوا تو برافروختہ ہو گئے۔تبع یمن ذونواس جو یہودیت کا سب سے بڑا حامی تھا اس نے سنا تو چراغ پا ہو گیا۔آگ بگولا بن کر نجران پہونچا۔لوگ قلعہ بند ہو گئے شہر کا محاصرہ کر لیا جب شہر فتح ہوا تو گڑھوں میں آگ دہکائی اور ایک ایک کر کے عیسائیوں کو بلوایا جس نے یہودیت قبول کرنے سے انکار کیا اس کو نذر آتش کر دیا۔

(۱۸۰) تعجب ہے۔ہمہ داں بزرگ سر سید احمد صاحب اپنی مایہ ناز تصنیف خطبات احمدیہ میں فرماتے ہیں۔

ارباط حبشہ اور ابرہہ خاندانی لقب ہیں۔اس خاندان ابرہہ میں ایک بادشاہ کا نام اشرم تھا۔جو ابرہہ اشرم صاحب الفیل کہلاتا ہے اور جس نے مکہ معظمہ پر ۴۵۷ء دینوی یا ۵۸۰ء میں چڑھائی کی تھی۔خطبات احمدیہ صفحہ ۴۵ آپ کی تحقیق یہ بھی ہے کہ ''ذونواس'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سو چون برس پہلے تھا اور اس زمانہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت تک نو سو بیس برس ہوتے ہیں۔ (حوالہ مذکور) سید صاحب کی تحقیق کا مدار ابوالفدا ء کی تاریخ ہے۔آپ نے اس کی عربی عبارتیں بھی نقل فرمائی ہیں۔باوجودیکہ خود ابوالفدا ء اسی کتاب میں انہیں۔حمیری بادشاہوں کے حالات میں لکھتا ہے کہ ملوک حمیر کی تاریخ اس قدر لچر اور پوچ ہے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ایک کمزوری یہ ہے کہ مدت حکومت دو ہزار سال بتاتے ہیں اور بادشاہ صرف چھبیس۔مؤرخ ابوالفدا ء اپنے قول کی تائید میں صاحب تواریخ الامم کا قول بھی نقل کرتا ہے پھر یہ بھی بتاتا ہے کہ چونکہ سنین اور مدت حکومت کا پتہ چلنا مشکل ہے اس لیے ہم نے مدت حکومت اور سنہ کا تذکرہ نہیں کیا۔سر سید صاحب کے علی الرغم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کتبات کی مدد سے جو محکمہ آثار قدیمہ نے برآمد کیے ہیں حمیری بادشاہوں کے سنہ طے کیے ہیں۔دائرہ المعارف اور انسائیکلوپیڈیا۔بھی آپ کی تحقیقات کا مرجع ہے۔ہم نے سید صاحب ندوی رحمۃ اللہ کی تحقیقات پر اعتماد کیا ہے۔

(۱۸۱) ارض القرآن صفحہ ۳۱۸ جلد ۱۔کامیابی کا سبب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا تھا نئے بادشاہ (نجاشی) نے اظہار وفا ہی کو کافی سمجھا۔

(۱۸۲) ابن ہشام نے ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ سیف بن ذی یزن کی درخواست پہلی مرتبہ کسریٰ نے منظور نہیں کی بلکہ اس کو خلعت اور دس ہزار درہم دے کر رخصت کر دیا۔سیف وہاں سے نکلا تو انعام کی تمام رقم کی بکھیر کر دی۔کسریٰ کو اس کا علم ہوا اس نے سیف بن ذی یزن کو بلایا اور اس سے باز پرس کی کہ یہ توہین کیوں کی۔سیف نے جواب دیا کہ سونا چاندی تو ہمارے پہاڑوں میں بہت موجود ہے۔اس کی مجھے ضرورت نہیں تھی اور جس کی مجھے ضرورت تھی اس کی طرف آپ نے توجہ نہیں کی۔تب کسریٰ نے ارکان دولت سے مشورہ کیا۔اس کا خیال یہ تھا کہ میں حمیری خاندان کی خاطر ایرانی فوج کو خطرہ میں کیوں ڈالوں۔ ارکان دولت نے مشورہ دیا کہ اپنی فوج نہ بھیجئے بلکہ آپ کے یہاں جو غیر ملکی جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں ان کی فوج بنا کر اپنے کسی سپہ سالار کے ماتحت کو اس کو بھیج دیجئے۔چنانچہ ان قیدیوں کی فوج بنا کر دہرز کے ماتحت اس کو بھیجا گیا۔دہرز بھی کوئی قیدی ہی تھا۔آٹھ جہازوں میں یہ فوج روانہ کی گئی۔ ایک جہاز راستہ میں غرق ہو گیا۔سات جہاز یمن پہنچے اور کامیاب ہوئے۔

(۱۸۳) باب اول فصل اوّل۔

(۱۸۴) **باب ماكان عليه حال اهل الجاهلية فاصلحه البنى صلى الله عليه وسلم**

(۱۸۵) عیسائیوں میں ایک فرقہ تھا جو غسل نہ کرنے کو افضل سمجھتا تھا۔وہ اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ اتنے طویل عرصہ سے ہم نے موںھ نہیں دھویا۔

(۱۸۶) احادیث میں دس چیزیں خصال فطرت قرار دی گئی ہیں مثلاً ناخون تراشنا مسواک کرنا ہاتھ پاؤں صاف رکھنا (غسل البراجم) بغلوں اور زیر ناف بال صاف کرنا، خوشبو لگانا، ختنہ، نکاح وغیرہ۔

(۱۸۷) اشہرحرم۔یعنی وہ مہینے جن میں جنگ ممنوع سمجھی جاتی تھی۔وہ چار مہینے ہیں۔ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب المرجب۔
(۱۸۸) مسجد حرام۔خانہ کعبہ کے گرد جو احاطہ ہے وہ مسجد حرام ہے۔
(۱۸۹) مجوس کے کچھ فرقے بہن سے نکاح کو جائز سمجھتے تھے۔
(۱۹۰) توریت کتاب پیدائش باب ۱۴۔ کے ابتدائی فقرے یہ ہیں۔
اور ابراہام نے ایک اور جورو کی۔جس کا نام قطور (قتورہ) تھا اور اس سے زمران اور یقا اور مدان اور مدیان اور اسباق اور سوخ پیدا ہوئے۔پھر تحریر ہے۔اور ابراہام نے سب کچھ اسحاق کو دیا لیکن ان حرموں کے بیٹوں کو جو ابراہام سے ہوئے۔ابراہام نے کچھ انعام دے کے اپنے جیتے جی اپنے بیٹے اسحاق کے پاس سے پورب رخ۔پورب کی سرزمین میں بھیج دیا۔فقرہ ۵-۶ باب یہ سب چھ فرزند۔مکہ میں آ کر آباد ہوئے۔یا متفرق مقامات پر؟ علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق یہ ہے۔یمن سے سواحل بحر احمر کے کنارے کنارے حجاز و مدین سے گزر کر خلیج عقبہ کے کنارے سے نکل کر تیماء وغیرہ کو قطع کرتی ہوئی ایک نہایت قدیم و مشہور تجارتی سڑک تھی ہے جو قدیم زمانہ میں ہندوستان۔یمن اور مصر و شام کے کاروانوں کا تنہا راستہ تھا۔اس راستہ کا ذکر تمام قدیم جغرافیوں میں موجود ہے۔ وادی القری۔(ثمود کا مسکن) مدین (قوم شعیب کی آبادی) سدوم۔قوم لوط کا مسکن۔نیز۔تبوک۔تیماء اور رقیم (یونانی پٹرا) اسی سڑک پر مابین حجاز و شام واقع ہیں اصحاب الایکہ بھی یہیں تھے۔ارض القرآن صفحہ ۲۶ ج ۲۔توریت کے بیان کے بموجب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ایک سو سینتیس برس ہوئی۔ان کے بارہ بیٹے ہوئے اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں بستے تھے۔ان کا قطعہ زمین ان سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا۔پیدائش۔باب ۲۵
(۱۹۱) کتاب پیدائش باب ۲۵ فقرہ ۱۷
(۱۹۲) سرسیّد فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد بجز قیدار کے۔عرب کے مختلف مقامات میں جا بسی تھی۔خطبات احمدیہ صفحہ ۳۳۷۔مولانا سید سلیمان فرماتے ہیں قیدار بر بنائے روایات تورات عرب حجاز میں آباد ہوا۔پھر فرماتے ہیں۔قیدار کی اہمیت و عظمت کے لیے یہ دلائل کافی ہیں کہ اس کا نام تورات کے صفحات میں اسیریا کے کتبات میں اور یونان کے جغرافیہ میں ہر جگہ موجود ہے لیکن اس سے بھی عظیم الشان عزت اس کو یہ حاصل ہے کہ وہ نور الٰہی جو آدم و ابراہیم علیہما السلام کو ودیعت ہوا تھا وہ اسمٰعیل علیہ السلام کے بیٹے قیدار کی پشت سے دنیا میں جلوہ افروز ہوا۔یعنی پیغمبر عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نسل قیدار کی شاخ عدنان سے پیدا ہوئے۔ارض القرآن صفحہ ۱۰۲ و ۱۰۳ ج ۲
(۱۹۳) **فلما ضاقت مكة على ولد اسمعيل انتشروا في البلاد. فلا ينائون قوما الا اظهر هم الله عليهم بدينهم فوطنوهم**۔سیرت ابن ہشام۔
(۱۹۴) ہمارے وطن میں جو جانور بتوں یا دیوی اور دیوتاؤں کے نام پر چھوڑے جاتے ہیں ممکن ہے ان کے لیے بھی خاص قانون اور قاعدے ہوں لیکن بظاہر عربوں کے قدم ان رسومات میں بھی آگے تھے۔ان کے یہاں الگ الگ نام اور الگ الگ ان کے احکام تھے یہ وہی نام ہیں۔سائبہ وہ اُونٹنی جو کسی دیوتا کے نام پر آزاد چھوڑ دی جاتی تھی اور اسے چارہ پانی سے نہ روکا جاتا تھا۔بحیرہ۔بکری کے پانچ بچے ہو جاتے یا اُونٹنی کے دس بچے ہو جاتے تھے تو اس کا کان چیر کر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔اس سے کوئی کام نہ لیتے تھے۔عورتوں کے لیے ان کا دودھ پینا یا اون استعمال کرنا بھی ممنوع ہوتا تھا۔وصیلہ۔اونٹنی اور اونٹ کا پہلوٹھا بچہ مادہ ہوتا اور پھر اسی طرح لگاتار مادہ بچے ہوتے رہتے تو چھٹے بچے کے بعد اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا۔اس کا نام وصیلہ ہوتا۔حامی۔نر اونٹ کی ایک قسم ہے جس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا ان کے گوشت دودھ بال اون کے علیحدہ علیحدہ احکام تھے۔کسی کا استعمال صرف عورتوں کے لیے منع ہوتا کسی کا صرف مردوں کے لیے وغیرہ وغیرہ۔بخاری شریف باب ما جعل اللہ من بحیرۃ تفسیر سورۂ مائدہ
(۱۹۵) عامر اس کے باپ کا نام ہے اور لحی اس کے خاندان کے مورث ہے اس لیے کبھی ابن عامر کہہ دیا جاتا ہے اور کبھی ابن لحی۔یہ

دونوں نام حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں وارد ہوئے ہیں۔ بخاری شریف صفحہ ۶۲ او ۴۹۹

(۱۹۶) بخاری شریف تفسیر سورہ نوح۔

(۱۹۷) قاف، میم اور عین سب مفتوح اور قمعہ بھی کہا گیا ہے یعنی قاف مکسور اور میم مشدد، مفتوح (فتح الباری)

(۱۹۸) بزعم نساب مضران خزاعۃ من ولد عمرو بن لحی بن قمعہ بن الیاس۔ ابن ہشام صفحہ ۵۰

(۱۹۹) جب ہم بطن مر (مرالظہر ان) میں اترے تو ہم سے خزاعہ الگ ہو کر بڑی بڑی جماعتوں میں پہنچ گئے۔

(۲۰۰) فتح الباری صفحہ ۴۲۷۔

(۲۰۱) حوالہ مذکور۔

(۲۰۲) جو عبادت خانہ پہلے سے ان کے یہاں چلا آ رہا ہے۔ میں ایسے کسی معبد کو منہدم نہیں کروں گا۔

(۲۰۳) **قال الامام محمد رحمه الله فان اخذ كل واحد من الفريقين من صاحبه رهنا فغدر المشركون وقتلوا الرهن الذى فى ايد هم فليس يحل للمسلمين ان يقتلوا فى ايديهم من الرهن ولا ان يسترقوهم لانهم كانوا امنين عندنا فلا يبطل حكم امانهم بغدر المشركين لقوله تعالىٰ لاتزر وازرة وزر اخرى** صفحہ ۳۴۲ شرح سیر الکبیر ج ۳)

(۲۰۴) تمدن عرب۔ صفحہ ۲۰۸

(۲۰۵) تمدن عرب صفحہ ۲۴۸۔

(۲۰۶) شرح سیر کبیر صفحہ ۲۸۷ ج ۴۔

(۲۰۷) توریت، کے بیان کے مطابق سدوم وغیرہ کے لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو گرفتار کر لیا تھا اور ان کا تمام مال و سامان لوٹ لیا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے تین سو اٹھارہ خانہ زادوں کو لے کر ان پر حملہ کیا اور حضرت لوط کو چھڑایا۔ صفحہ ۱۴ تا ۱۶)۔ مولانا چڑیا کوٹی نے اسی کو جہاد فرمایا ہے۔

(۲۰۸) فارسی ترجمہ یہ ہے۔ نان و مطہرہ آب را گرفتہ و بہ ہاجرہ دادہ بہ دوشش گذاشت۔ وہم پسرش را باو دادہ اور ا روانہ نمود۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ روٹی اور پانی کا چھاگل لیا اور ہاجرہ کو دے کر اس کے مونڈھے پر رکھ دیا اور اس کے لڑکے کو بھی اس کو دے کر اس کو روانہ کر دیا۔

(۲۰۹) سر سید احمد صاحب فرماتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے کے بیٹے سترہ برس کی عمر میں اپنے بھائیوں کے ساتھ باپ کے مویشی چرایا کرتے تھے اور تیس برس کی عمر میں عزیز مصر کی خواب کی تعبیر بیان کی تھی اور اس کے وزیر ہو گئے تھے۔ خطبات احمدیہ صفحہ ۲۷۔ مگر قرآن پاک کی آیات پر نظر ڈالی جائے تو عمر تیس سال سے بھی کم معلوم ہوتی ہے کیونکہ قافلہ والوں نے جب کنویں، سے نکالا تو یہ کہا تھا۔ یا بشری ھذا غلام

غلام نابالغ کے لیے کہا جاتا ہے۔ پھر جب اس خریدار کے یہاں پہنچ چکے تو اس کے بعد جوان ہوئے **ولما بلغ اشده واستوی** یعنی ۱۷-۱۸ سال کی عمر اس وقت ہونی چاہئے۔ پھر جیل میں رہنے کی مدت **بضع سنين** فرمائی گئی ہے۔ جو دس سال سے کم ہونی چاہئے۔ بس بہت سے بہت ۲۷ سال کی عمر میں آپ عزیز مصر کے وزیر بن گئے اور جن اختیارات کا استنباط قرآن پاک کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ ان کے پیش نظر آپ وزیر اعظم ہو گئے۔

(۲۱۰) محترم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ کی علمی جلالت و عظمت سے انکار کون کر سکتا ہے مگر غالباً آپ کے ادبی ذوق کا تقاضا تھا کہ آپ نے ارض القرآن (صفحہ ۹۸ ج ۱) میں مکہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔ یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبر کی بنا، ایک نوجوان پیغمبر (اسماعیل علیہ السلام) کی ہجرت گاہ اور ایک یتیم پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا مولد ہے لیکن تعجب ہے سید صاحب نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جب پہلی مرتبہ مکہ معظمہ تشریف لائے اگر اس وقت نوجوان تھے تو وہ واقعہ کب پیش آیا جس کی بناء پر ان کو ذبیح اللہ کا خطاب دیا گیا۔ قرآن حکیم نے کوئی عمر نہیں بیان کی مگر اس کا معجزانہ جملہ **فلما بلغ معه السعی** ذبح کے وقت جوان ہونے

سے انکار کرتا ہے۔ علماء محققین نے اس کے معنی یہی کیے ہیں کہ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ چلنے پھرنے لگے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑ ھنے کو بڑے آدمی کے ساتھ جب بچہ چلتا ہے تو عموماً دوڑتا چلتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب سید صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہیں اور یہ بھی تسلیم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ معظمہ میں منی کے مقام پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذبیحہ پیش کرنے کا عزم کیا تھا اور **فلما بلغ معه السعی** سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر ایسی تھی کہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے لگے تھے تو اب لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب حضرت اسمٰعیل مکہ میں پہنچائے گئے تو ان کی عمر اس سے کم تھی یعنی یہ شیرخوارگی یا اس سے قریب کا زمانہ ہوسکتا ہے۔ جوانی کا دور نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۲۱۱) اس آیت میں یہ ہے کہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے جب اخراج کا واقعہ پیش آیا۔ توریت کے بیان کے بموجب حضرت اسحاق حضرت اسمٰعیل علیہما السلام سے چودہ سال چھوٹے ہیں۔ پھر ان کی پیدائش سے دس سال بعد یہ نوبت آئی ہوگی کہ حضرت سارہ کو یہ احساس پیدا ہوا کہ اسحاق کے ساتھ اسمٰعیل (علیہما السلام) کو وارث نہ ہونا چاہئے۔ اس وقت حضرت اسمٰعیل ستره سال کے ہوگئے ہوں گے۔ (علیہم السلام)

(۲۱۲) **فويل الذين يكتبون الكتاب بايديهم ثم يقولون هذا من عندالله** (سورہ بقرہ ع ۹)

(۲۱۳) **و يقولون على الله الكذب وهم يعلمون** (سورہ آل عمران ع ۸)

(۲۱۴) اہل علم واقف ہیں کہ تلقی بالقبول خود ایک ثبوت ہے یعنی اکابر فقہاء اور حضرات محدثین کسی بات کو ایک تسلیم شدہ امر کی طرح پیش کریں۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ یہ امر ایک حقیقت اور ایک وزن رکھتا ہے۔

(۲۱۵) **وكان النبی صلی الله عليه وسلم واصحابه يعفون عن المشركين واهل الكتاب كما امرهم ويصبرون على الاذى. قال الله تعالىٰ ولتسمعن من الذين. الحديث بخاری شریف باب قوله تعالىٰ ولتسمعن من الذين** الخ ص ۶۵۶ وص ۹۱۶ و ۹۲۴۔

(۲۱۶) **ابوداؤد شریف باب كيف كان اخراج اليهود من المدينة**

(۲۱۷) بدر کے موقع پر ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جھونپڑی میں مصروف دعاء تھے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اصرار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا ختم کی اور میدان کی طرف روانہ ہوئے تو زبان مبارک پر اسی آیت کے الفاظ جاری تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہی آیت دہرا رہے تھے (بخاری شریف)

(۲۱۸) **قال ابن مسعود هو القتل بالسيف يوم بدر وهو قول قتاده والسدی** (تفسیر مظہری)

(۲۱۹) **من حمل الفتح على فتح مكه قال معناه لاينفع الذين كفروا وقتلوا وماتوا على الكفر ايمانهم حين رائو العذاب بعد الموت** (تفسیر مظہری)

(۲۲۰) خط کے الفاظ یہ نقل کیے گئے ہیں۔ **انكم اويتم صاحبنا وانا نقسم بالله لتقاتلنه او لتخرجنه اولنسيرن اليكم باجمعنا حتى نقتل مقاتلتكم و نستبيح نسائكم** (ابوداؤد شریف باب خبر النضیر)

(۲۲۱) بخاری شریف صفحہ ۶۵۶ وصفحہ ۹۱۶ وصفحہ ۹۲۴

(۲۲۲) **اخرجه النسائی من طريق ابی اسحاق الفزاری عن يحی بن سعيد** (فتح الباری باب الحراستہ فی الغزو فی سبیل اللہ)

(۲۲۳) بخاری شریف باب **قوله تعالىٰ ولتسمعن من الذين اوتوا الكتاب** الخ صفحہ ۵۴۴ و ۵۴۵ و ۵ و ۸ و ۸۲۳

(۲۲۴) سیرۃ ابن ہشام ذکر سنتہ تسع و تسمیتھا سن الوفود۔

(۲۲۵) اخرجه ابن المنذر و الطبرانی فی الاوسط والحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقی فی الدلائل وضياء فی

المحتار (درمنثور تحت قوله تعالیٰ وعدالله الذين امنو منكم) الاية ـ سورہ نور

(۲۲۶) سیرۃ ابن هشام ـ ذکر غزوسفوان ـ

(۲۲۷) بطانة الرجل اهله و خاصته وصاحبه (قاموس وغیرہ)

(۲۲۸) ربعه كعنبه حال حسن اوامرهم الذى كانوا عليه ـ

(۲۲۹) خون بہا اور دیت اگر چہ قاتل کے جرم کے سبب سے ادا کرنی پڑتی تھی مگر قاتل کے مال سے نہیں دی جاتی تھی بلکہ ان سے لی جاتی تھی جو عاقلہ (آج کل کی اصطلاح میں سوسائٹی) کے آدمی ہوتے تھے اور اگر یہ سوسائٹی پوری رقم نہیں ادا کر سکتی تھی تو دوسری سوسائٹی یا قبیلہ جو اس سے قریبی تعلق رکھتا تھا وہ اس میں حصہ لیتا تھا۔ یہ سوسائٹیاں اور ان کے حلیف معین تھے۔ اس دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے جو معاہدے تھے وہ بدستور ہوں گے اور جو طریقے رائج تھے ان پر عمل ہوتا رہے گا یہاں یہ بات خاص توجہ کی مستحق ہے کہ اس معاہدہ کے بعد اسلامی تعلیمات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ خرید فروخت حرمت سود نکاح طلاق وغیرہ کے جملہ احکام اس کے بعد ہی نازل ہوئے مگر عجیب بات یہ ہے کہ دیت کے احکام اور طریقے تقریباً وہی باقی رہے جو پہلے تھے۔ گویا یہ معاہدہ اگر چہ وقتی تھا مگر اسلام نے اس کا احترام اس وقت بھی کیا جب اس کا اقتدار پوری طرح پورے ملک پر کامل اور مکمل ہو گیا تھا۔

(۲۳۰) بواط جبل من جبال جهينة بقرب ينبع فى ناحية رضوى ـ ورضوى بفتح الراء جبل مشهور عظيم ـ فتح الباری

(۲۳۱) زاد المعاد صفحہ ۲۲۳ ج

(۲۳۲) قال الزهرى اول اية نزلت فى القتال ـ كما اخبرنى عروة عن عائشة اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا ـ اخرجه النسائى واسناده صحيح واخرجه الترمذى وصححه الحاكم من طريق سعيد بن جبير عن ابن عباس قال لما خرج النبى صلى الله عليه وسلم من مكة قال ابوبكر اخرجوا نبيهم ليهلكن فنزلت اذن للذين يقاتلون الاية قال ابن عباس فهى اول اية نزلت فى القتال فتح البارى فى اول كتاب المغازى صفحه ۱۱۳ مصرى ج ۶ ـ

(۲۳۳) پوری آیت کا مضمون یہ ہے کہ اے پیغمبر اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں سب ہی ایمان لے آتے اور دنیا میں اعتقاد و عمل کا اختلاف باقی نہ رہتا لیکن تو دیکھ رہا ہے کہ اللہ نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی مشیت یہی ہوئی کہ طرح طرح کی طبیعتیں اور طرح طرح کی استعدادیں ظہور میں آئیں۔ اور جس طرح ان کی ظاہری صورتیں مختلف ان کے مزاج مختلف ان کی طبیعتیں اور جذبات مختلف ہیں جو خالق ذوالجلال کی حکمت بالغہ کی کھلی ہوئی دلیلیں ہیں۔ اسی طرح ان کے خیالات اور عقائد اور اعمال میں بھی اختلاف باقی رہے۔ یہ رنگ برنگی رخ گیتی کی زینت اور کمال ربوبیت کی دلیل ہے پس اگر لوگ نہیں مانتے اور سب ایمان نہیں لاتے تو کیا آپ ان پر جبر کریں گے اور ایک ایسے فعل کے خواہاں ہوں گے جو مشیت الٰہی کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (ترجمان القرآن۔

(۲۳۴) قالت الحنيفة الاصل الاجزية ان تتاخرالى دارالجزاء وهى الدارالاخرة واما دارالدنيا فهى دار التكليف والا بتلاء قال الله تعالىٰ لااكراه فى الدين فكل ماشرع جزاء فى هذه الدار انما هو لمصالح تعود الينا فى هذه الدار كالقصاص وحدالشرب والقذف والزنا فانها شرعت لحفظ النفوس والاعراض والعقول والانساب والا موال فالقتل للرد لايجب الالدفع شرحرابه لاجزاء على كفره لان جزاء الكفر اعظم من ذلك عندالله فيختص القتل بمن يتاتى منه الحرب وهوالرجل ـ ولو كان جزاء للكفر لما نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم من قتل نساء اهل الحرب ولو كان جزاء للكفرلزم تطهيره بالقتل كما فى القصاص والحدود تفسير مظهرى تحت قوله تعالىٰ اذن للذين يقاتلون الاية

(۲۳۵) ومعنے الاية لولادفع الله الناس لهدمت فى كل شريعة نبى مكان عبادتهم ـ فهدمت فى زمن موسى الكنايس وفى زمن عيسے البيع والصوامع وفى زمن محمد المساجد صلوات الله عليهم وسلامه (تفسیر مظہری)

(۲۳۶) امام صاحب رحمہ اللہ مسجد حرام سے صرف مسجد نہیں بلکہ پورا حرم مراد لیتے ہیں کیونکہ اس پورے شہر کو بسانے کا مقصد اقامت

صلوٰۃ تھا اور دلیل یہ ہے کہ شب معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ام ھانی کے مکان میں تشریف فرماتے تھے جہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے جایا گیا۔ یہ مکان احاطہ خانہ کعبہ سے باہر شہر میں تھا مگر قرآن پاک میں یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مسجد حرام سے لے گیا۔ سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام اور اس بنا پر امام صاحب رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ مکہ کی زمین وقف کی حیثیت رکھتی ہے اس کی بیع درست نہیں اور احادیث میں اگر کسی مکان کے بیچنے کا تذکرہ آیا ہے تو وہ بیع اس کی عمارت کی ہوئی ہے زمین کی نہیں ہوئی (تفسیر مظہری) تفسیر درمنثور میں متعدد حدیثیں نقل کی گئی ہیں جن میں ارض مکہ کی فروخت پر عذاب کی وعید ہے۔

(۲۳۷) کہتے ہیں کعبہ شریفہ کی جگہ آگے سے بزرگ تھی پھر بعد مدتوں کے نشان نہ رہا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا پھر عمارت بنائی اور تازہ کیا (حضرت شاہ عبدالقادر صاحب) قال البغوی انما ذکر مکان البیت لان الکعبۃ رفعت الی السماء زمن الطوفان ثم لما امر اللہ تعالے ابراھیم علیہ السلام ببناء البیت لم یدر این یبنی فبعث اللہ ریحا فجوجا (شدید غیرا ستوء) فنکست لھا ماحول الکعبۃ عن الاساس (تفسیر مظھری)

(۲۳۸) یہ مثال فرمائی اس واسطے کہ جس کی نیت ایک پر ہے وہ قائم ہے اور جہاں نیت بہت طرف گئی وہ سب اس کو راہ میں سے اچک لے گئے یا سب سے منکر ہو کر دہری ہو گئے۔ (حضرت شاہ عبدالقادر صاحب)

(۲۳۹) اور ہر فرقہ کو ہم نے ٹھہرادی ہے قربانی (شاہ صاحب) یعنی مواشی ذبح کرنے نیاز اللہ کے ہر دین میں عبادت رکھا ہے اس کے سوا اور کوئی نیاز ذبح کرنا اس کی عبادت ہوگی تو شرک ہوگا۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب

(۲۴۰) اونٹوں کو لٹا کر ذبح نہیں کیا جاتا بلکہ کھڑے کر کے ذبح کیا جاتا ہے کہ اس طرح ذبح کرنے والے کے لیے بھی آسانی رہتی ہے اور مذبوح کی روح بھی آسانی سے خارج ہو جاتی ہے۔

(۲۴۱) بخاری شریف۔ باب کیف کان عیش اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم و کتاب الاطعمہ صفحہ ۸۴۵ ج او باب مناقب سعد بن ابی وقاص صفحہ ۵۲۷ ج ۱)

(۲۴۲) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فاتح ایران و فارس کو کوفہ کا گورنر بنادیا گیا تھا۔ اسلام کے اس قاعدہ کے مطابق کہ سیاسی امیر ہی نماز کا امام ہوگا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ امامت فرمایا کرتے تھے کہ کچھ شورہ پشتوں نے جو بعد میں ان فتنوں کے بانی اور موید بنے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہوئے تھے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایت کی کہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھاتے۔ اس پر آپ کو دربار فاروقی میں طلب کیا گیا۔ جہاں آپ نے اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا۔ نماز کی کیفیت بھی بیان کی کہ اس طرح پڑھاتے ہیں کہ پہلی دو رکعتیں طویل ہوتی ہیں اور بعد کی دو رکعتیں مختصر (وغیر ذلک) حضرت فاروق رضی اللہ عنہ آپ کے بیان سے مطمئن ہوئے اور تصدیق کرتے ہوئے فرمایا آپ سے یہی توقع تھی ذلک الظن بک یا ابا اسحاق۔ بخاری شریف باب وجوب القرء للامام والماموم صفحہ ۳)

(۲۴۳) بخاری شریف کتاب المغازی صفحہ ۴۵۱

(۲۴۴) طبقات ابن سعد ج ۲

(۲۴۵) فتح الباری

(۲۴۶) فتح الباری۔ ابتداء کتاب المغازی

(۲۴۷) روض الانف وزرقانی وغیرہ میں اس معاہدہ کے مندرجہ ذیل الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔

ھذا کتاب من محمد رسول اللہ لبنی ضمرۃ انھم امنون علی اموالھم وانفسھم وان لھم النصر علی من رامھم۔ الا ان یحار بوا فی دین اللہ۔ مابل بحر صوفتہ وان النبی اذا دعاھم لنصرہ اجابوہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بنوضمرہ کو یہ تحریر دی جاتی ہے کہ ان کا جان و مال محفوظ رہے گا اور جو لوگ ان پر حملہ کریں گے ان کے مقابلہ میں بنی ضمرہ کی مدد کی جائے گی۔ بجز اس صورت کے کہ اللہ کے دین کے بارہ میں کسی پارٹی کی ان سے لڑائی ہو۔ یہ معاہدہ اس

وقت تک کے لیے ہے جب تک سمندر میں یہ خاصیت رہے کہ وہ ان کو تر کر دیتا ہے اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لیے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔

(۲۳۸) فتح الباری صفحہ ۱۷۷ ج ۶ مطبوعہ مصر۔

(۲۳۹) یہ تمام تفصیل سیرۃ ابن ہشام سے ماخوذ ہے۔

(۲۴۰) ھو بستان ابن عامر الذی قرب مکۃ

(۲۴۱) اصل نام عبداللہ بن عباد۔ عرف بن حضرمی اور عمرو بن حضرمی (ابن ہشام)

(۲۴۲) ابن ہشام و فتح الباری۔ (طبقات ابن سعد وغیرہ)

(۲۴۴) ان سے جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہترین صلاحیت اور انداز فکر کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی کے مطابق اصلاح و ترقی کی لگن رات دن ان کو رہتی تھی اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی نے ان کے غور و فکر پر قدغن نہیں کیا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے انتہا یہ کہ بعض جگہ وہی الفاظ صادر ہوئے ہیں جو صحابی کی زبان سے نکلے تھے۔

(۲۴۵) تفسیر ابن جریر صفحہ ۸۴ ج ۱

(۲۴۶) سیرۃ ابن ہشام

(۲۴۷) قال اصحاب السریۃ یا رسول اللہ بل نوجر علی وجھتنا ھذا وھل یکون سفرنا ھذا غزوا فانزل اللہ تعالیٰ ان الذین امنوا والذین ھاجروا وجاھدوا ۔الایۃ۔ ابن ہشام و مظہری وغیرہ

(۲۴۸) ان سے بڑھ کر واجب الاحترام کون ہو سکتا ہے جن کے حق میں وحی الٰہی نازل ہوئی۔ کلام اللہ نے جن کے اقدام کی حمایت اور تائید کی ان کو مہاجر اور مجاہد فی سبیل اللہ قرار دیا اور رحمت و مغفرت کی بشارت سے نوازا۔ مگر اب آپ بیسویں صدی کے ایک مترجم اور مفسر کا انداز تحریر ملاحظہ فرمائیے جو یہ بھی شوق رکھتا ہے کہ اس کو امام وقت قرار دیا جائے اور ایک جماعت اس کو اپنا امیر بھی مانتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔
اس مقام پر یہ بات بھی معلوم رہنی چاہئے کہ جب یہ دستہ قیدی اور مال غنیمت لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسی وقت فرما دیا تھا کہ میں نے تم کو لڑنے کی اجازت تو نہیں دی تھی۔ نیز آپ نے ان کے لائے ہوئے مال غنیمت میں سے بیت المال کا حصہ لینے سے بھی انکار فرما دیا جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ لوٹ ناجائز ہے۔ عام مسلمانوں نے بھی اس فعل پر اپنے ان آدمیوں کی سخت ملامت کی تھی اور مدینہ میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے انہیں اس پر داد دی ہو۔ (انتہی) آپ ان الفاظ پر دوبارہ نظر ڈالیے۔ غور فرمائیے آپ کا دماغ ان الفاظ سے کیا اثر لیتا ہے کیا آپ ان کو مہاجر اور مجاہد فی سبیل اللہ سمجھیں گے یا جذباتی قسم کے جنگجو اور قتل و غارت کے شوقین (معاذ اللہ) اس مترجم نے خود لکھا ہے کہ مال غنیمت کے احکام کی تعلیم جنگ بدر کے بعد ہوئی۔ اس وقت تک نہ مال غنیمت کے احکام تھے نہ کوئی بیت المال تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توقف اس لیے فرمایا تھا کہ اس سلسلہ میں احکام ابھی تک نازل نہیں ہوئے تھے۔ اور یہ مدعی تفسیر لکھتا ہے کہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہ لوٹ ناجائز ہے۔ بیشک اس وقت ان کے اس فعل پر داد کسی نے نہیں دی لیکن داد نہ دینے اور ملامت کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ امیر جماعت اور امیدوار امامت اس فرق کو نظر انداز کر کے وہ لفظ لاتا ہے جس سے ملامت کا تصور پیدا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا میرے ساتھیوں کے بارے میں خوف خدا سے کام لو۔ ان کو ملامت کا نشانہ نہ بناؤ۔ مگر اس مدعی تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ صحابہ کرام کی کمزوری اچھالتا ہے وحی الٰہی ان کی حمایت کرتی ہے اور یہ ان کے درپے رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ان کو اسی درجہ کے یا اس سے کم درجہ کے آدمی ثابت کرے جیسے اس کے ساتھی ہیں۔ معاذ اللہ

(۲۴۹) متلبسا بالحکمۃ والصواب (روح المعانی، مظہری)

(۲۵۰) انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم تا وممار رزقنھم ینفقون (سورہ انفال ع)

(۲۵۱) چنانچہ حضرت عبداللہ بن جحش t کے دستہ نے قافلہ کا سامان چھین لیا۔ قافلہ کے دو آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان کو مدینہ طیبہ میں لے آئے تو چونکہ پہلے سے کوئی تجویز یا اسکیم نہ تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تردد ہوا کہ اس مال کا اور ان قیدیوں کا کیا کیا جائے؟ بہت کافی تامل کے بعد اور ایک روایت کے بموجب تقریباً دو ماہ گزرنے کے بعد جب غزوۂ بدر بھی ہو چکا اور من جانب اللہ مسلمانوں کو مال غنیمت کی اجازت مل گئی تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال اور ان قیدیوں کے بارے میں فیصلہ صادر فرمایا۔

(۲۵۲) صرف ایک شخص الگ رہا تھا۔ اسی لیے وہ قریش کے ساتھ بدر بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا نام تھا حویطب بن عبدالعزیٰ (راویہ موسیٰ بن عقبہ عن الزہری) بدایہ ونہایہ صفحہ ۱۴۵ ج ۲۔

(۲۵۳) ابوسفیان جس کو اس قافلہ کا سردار بنایا گیا تھا اس نے خود بیان کیا تھا کہ مامن قرشي ولا قرشية له نش وفصاعدا الابعث به معنا طبقات ابن سعد ج ۲ صفحہ ۶ قریش کے کسی مرد یا عورت کے پاس ایک نش یا نش کے قریب بھی تھا تو اس نے ہمیں دیدیا تھا۔ نش (نصف اوقیہ) بیس درہم کا ہوتا تھا جس کا وزن تقریباً پونے چار تولہ ہوتا تھا۔ یعنی کسی کے پاس اگر چند تولے چاندی بھی تھی تو اس نے اس تجارت میں لگادی تھی۔

(۲۵۴) ایک دینار عموماً ایک مثقال کا ہوتا تھا یعنی ساڑھے چار ماشہ کا۔ پس اٹھارہ ہزار سات سو پچاس تولہ سونا اس قافلہ کا سرمایہ تھا۔ جو آج کل کم وبیش چالیس لاکھ کا ہوتا ہے۔

(۲۵۵) قال ابن عباس وابن الزبير و محمد بن اسحاق والسدى اقبل ابوسفيان من الشام فى اربعين راكبا من كبار قريش فيهم عمر و بن العاص و مخرمة بن نوفل الزهرى (معالم التنزیل للبغوی)

(۲۵۶) بیہقی کے الفاظ یہ ہیں۔ اقبل ابو سفيان في عيرمعه سبعون راكبا من بطون قريش كلها و فيها مخرمة بن نوفل و عمر و بن العاص درمنثور صفحہ ۵۳) ج ۲

(۲۵۷) ابوجہل اس کو سمجھتا تھا۔ چنانچہ آگے تفصیل آئے گی کہ جب کچھ خیر اندیشوں نے اس سے کہا کہ قافلہ بخیریت پہنچ گیا اب جنگ کی ضرورت نہیں ہے آگے مت بڑھئے تو اس نے جواب دیا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ بدر پہنچ کر جشن کریں تا کہ عرب کو ہمارے حوصلہ کا اندازہ ہو اور ہماری ہیبت ان کے دلوں میں بیٹھ جائے (ابن اسحاق بحوالہ ابن ہشام (بدایہ ونہایہ صفحہ ۱۵۵)

(۲۵۸) جانے کے وقت راستہ روکنے کی بظاہر پالیسی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی واپسی کے وقت ہی قافلوں کا تعاقب کیا گیا۔ اس وقت بھی ایسا ہی کیا گیا۔

((۲۵۹) اذيعدكم الله احدى الطائفتين الاية

(۲۶۰) و كانت بدر موسم من مواسم الجاهلية يجتمع بها العرب بهاسوق و بين بدر والمدين ثمانية برد و ميلان طبقات ابن سعد صفحہ ۶ ج ۲ بہ اراک کثیر بیہقی بحوالہ بدایہ ونہایہ صفحہ ۲۷ ج ۲۔

(۲۶۱) مسند احمد بحوالہ بدایہ ونہایہ ص ۱۶۶۔ ج ۲ اور موسیٰ بن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ عدی بن ابی الزغباء اس سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ بدایہ ونہایہ ص ۱۵۱ ج ۱

(۲۶۲) روایت عمرو بن شیبہ بحوالہ تفسیر مظہری ص ج ۳۔

(۲۶۳) طبقات ابن سعد غزوہ بدر ص ۵ ج ۲

(۲۶۴) القسم الاول من الجزء الثانى

(۲۶۵) عمرو بن شیبہ کی روایت میں حوراء کے بجائے خوار ہے یہ دونوں مقام قریب قریب تھے۔ بظاہر ان سب مواضعات میں یہ حضرات تشریف لے گئے اسی لیے کسی راوی نے ایک مقام کا نام لے دیا کسی نے دوسرے کا۔ معجم البلدان میں خوار کے متعلق تحریر ہے قرى من وادى ستارة پھر ستارہ کے متعلق تحریر ہے جبل سود بين الضيق والحوراء بينها و بين ينبع ثلثة ايام۔

(۲۶۶) ینبع مدینہ طیبہ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل ہے ذوالمروۃ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ سے آٹھ برید کے فاصلہ پر ہے یعنی تقریباً سو میل۔

(۲۶۷) عمرو بن شیبہ (حوالہ مذکور تفسیر مظہری ج ۳)

(۲۶۸) ابن سعد ص ۴۳) ج ۳ تذکرہ طلحہ بن عبیداللہ وذکر سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ص ۱۶۷ ج ۳

(۲۶۹) بینها و بین ینبع ثلاثة ایام۔ معجم البلدان ذکر خوار

(۲۷۰) بعثهما قبل خروجه من المدین۔ بعشرلیا لی۔ ابن سعد۔ ذکر طلحہ ص ۴۳) ج ۴

(۲۷۱) یہ دونوں حضرات واپس ہوئے تو آنحضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم روانہ ہو چکے تھے۔ یہ صاحبان بھی نقش قدم پر روانہ ہو گئے مگر معرکہ کے وقت تک نہیں پہونچ سکے۔ مگر جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم مظفر ومنصور واپس ہو رہے تھے تو مقام تربان پر شرف قدمبوسی حاصل ہوا چونکہ یہ حضرات ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بموجب اپنا فرض (ڈیوٹی) انجام دے رہے تھے تو آپ کا شمار بھی غازیوں میں کیا گیا اور جب ضبط شدہ اموال (غنیمت) تقسیم ہوئے تو ان کو بھی حصہ عنایت کیا گیا۔ (ابن سعد ذکر طلحہ ص ۴۳) ج ۴

(۲۷۲) قال هاشم بن سلیمان لاادری ما استثنی من بعض نساءه مسند احمد۔ بحوالہ بدایہ ونہایہ ص ۲۶۶ ج ۲

(۲۷۳) فخرج رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ فتکلم فقال ان لنا طلبة فمن کان ظهره حاضر فلیر کب معنا فجعل رجال یستاذنو نه فی ظهور هم فی علوالمدین قال لا الامن کان ظهره حاضرا مسند احمد بحوالہ بدایہ ونہایہ ص ۲۶۶

(۲۷۴) بخاری شریف میں ہے و بعض العوالی من المدین علی اربع امیال اونحوها ص ۶۷ اور عینی شرح بخاری میں ہے قال عیاض کانه ارادمعظم عماراتها والا فابعد ها ثمانی امیال (۱۷۲) مسند احمد حوالہ مذکور و بمعناه عن ابن اسحاق و ابن سعد وغیرهما۔

(۲۷۵) اس طرف کوچ کرنا بیکار تھا کیونکہ قافلہ کی روانگی کو اتنے دن گذر چکے تھے کہ وہ اس طرف کی منزلیں یقیناً طے کر چکا تھا اب اس کو مدینہ کے قریب ہونا چاہئے تھا اور اگر وہ راستہ بدل کر آگے بڑھ گیا تھا تو پھر بدر کا مقام ایسا تھا جہاں اس کو پکڑا جا سکتا تھا۔

(۲۷۶) تعجب ہے علامہ شبلی مرحوم نے اتنی واضح بات کی طرف التفات نہیں فرمایا۔ آپ نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں تحریر فرمایا ہے: مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لیے شام کو جایا کرتا تھا مدینہ کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا۔ مکہ سے مدینہ تک جس قدر قبائل آباد تھے عموماً قریش کے زیر اثر تھے۔ بخلاف اس کے مدینہ سے شام کے حدود تک قریش کا اثر نہیں تھا۔ اس بنا پر اگر کاروان تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروان تجارت شام سے آ رہا ہے (آ رہا تھا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو چکی ہے (تقریباً پندرہ روز پہلے) اور آپ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں۔ مکہ کی طرف جاتے ہیں (صحیح جاتے ہیں) اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا (مخبر کی اطلاع کی تصدیق ہو جاتی ہے) اور قریش سے جنگ پیش آ جاتی ہے (سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۳۱۶ و ص ۳۱۷ طبع سوم)

موجودہ دور (چودھویں صدی ہجری مطابق بیسویں صدی عیسوی) کے فاضل محقق علامہ ابوالاعلیٰ مودودی اگرچہ تقلید کے سخت ترین مخالف ہیں۔ مگر اس بارے میں آپ نے علامہ شبلی کی تقلید فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ اور انہوں نے سیدھی جنوب مغرب کی راہ لی۔ جدھر سے قریش کا لشکر آ رہا تھا۔ حالانکہ اگر ابتدا میں لشکر کو لوٹنا مقصود ہوتا تو شمال ومغرب (شام) کی راہ لی جاتی۔ مقدمہ سورہ انفال۔ تفہیم القرآن جلد دوم ص ۲۵)

آپ نے تفہیم القرآن میں کئی نقشے بھی دیئے ہیں۔ مگر پہلا کمال تو یہ کیا کہ نقشہ میں وہ راستہ ہی نہیں دیا جو مدینہ کے قریب سے ہو کر شام جاتا تھا جس کا تذکرہ علامہ شبلی کی تحریر بالا میں ہے اور جو حال کے جغرافیوں میں بھی نمایاں کیا گیا ہے آپ نے صرف وہ راستہ نمایاں کیا ہے جو ساحل سمندر کے قریب قریب شام کو جاتا ہے۔ مزید کمال یہ ہے کہ جو نقشے آپ نے دیئے ہیں خود آپ نے ان کو سمجھنے کی کوشش

نہیں فرمائی کیونکہ آپ کے پیش کردہ نقشہ کے بموجب جو تجارتی راستہ ہے وہ مکہ معظمہ سے رابغ او مستورہ ہوتا ہوا بدر پہونچتا ہے پھر بدر سے ینبع ہوکر سمندر کے کنارہ کنارہ شام پہونچتا ہے اس راستہ پر بدر وہ مقام ہے جو مدینہ سے سب سے زیادہ قریب ہے لیکن یہ قریب تر مقام بھی بقول علامہ شبلی ۴ منزل (تقریباً ۷ میل) ہے مدینہ کے رہنے والے اس راستہ کو بند کرنے کی دھمکی نہیں دے سکتے تھے۔ وہ کسی ایسے ہی راستے کو بند کر سکتے تھے جو مدینہ یا مدینہ کے قریب دس پانچ میل کے فاصلہ سے ہوکر گذرتا ہوا سی میل پہونچ کر راستہ روکنا خلاف قیاس اور نا قابل تسلیم ہے۔ یہ راستہ مدینہ طیبہ سے عین جنوب مغرب میں ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے تو اس وقت قافلہ اسی راستہ پر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لامحالہ اسی طرف تشریف لیجانا چاہئے تھا اگر علامہ مودودی تقلید نہ کرتے اور خود اپنے پیش کردہ نقشہ کو سمجھ کر غور فکر سے کام لیتے تو آپ اس خلجان میں نہ پڑتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوب مغرب کی راہ کیوں لی علاوہ ازیں ایک مستند اور متفقہ طور پر طے شدہ روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ سمندر کے کنارہ پہنچ گئے تھے وہاں ان جیسے اور جواں ہمت بھی پہنچ گئے تو انہوں نے قریش کا یہ راستہ بھی بند کر دیا جو مدینہ کے راستہ کو چھوڑ کر قریش نے اختیار کیا تھا۔ علامہ مودودی کے پیش کردہ نقشہ کے بموجب اگر شام کا تجارتی راستہ صرف یہی تھا تو جس طرح انصار مدینہ کی یہ دھمکی بے معنی ہوتی ہے کہ ہم شام کا راستہ بند کر دیں گے (کیونکہ یہ راستہ مدینہ سے کم از کم پانچ منزل ہے) اسی طرح یہ تسلیم شدہ حقیقت بھی بے معنی ہو جاتی ہے کہ مدینہ کے راستہ کو چھوڑ کر جو راستہ قریش نے اختیار کیا تھا حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ نے ساحل سمندر اپنا مرکز قائم کر کے اس کو مخدوش بنا دیا۔

(۲۷۷) طبقات میں سعد ابن ہاشم وغیرہ نے بیرابی عتبہ لکھا ہے۔

(۲۷۸) ایسا قافلہ اب تک کوئی بھی نہ گذرا تھا جس میں سرداران قریش کی تعداد ستر یا چالیس ہو اور جس کا سامان ایک ہزار اونٹوں پر لدا ہوا ہو۔

(۲۷۹) ۶۳ مہاجرین اور باقی انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین آخر میں جملہ حضرات کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

(۲۸۰) جملہ مؤرخین اور ارباب سیرت یہ تحریر فرماتے ہیں:

تخلف عنه بشر كثير و ذالك لانهم لم يظنوا ان رسول الله صلى الله عليه وسلم يلقى حربا ولم يحتفل بها رسول الله صلى الله عليه وسلم احتفا لا بليغا ابن سعد ابن اسحاق وغير هما

(بہت سے آدمی پیچھے رہ گئے اس لیے کہ ان کو یہ خیال نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ پیش آئے گی۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی زور نہیں دیا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ جس کے پاس سواری موجود ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔

(۲۸۱) قال ابن سعد بين بدرو مدينة ثمانية برد و ميلان ۱۸ مودودی صاحب نے بھی تفہیم القرآن میں سورہ انفال کے مقدمہ میں علامہ شبلی کی اسی رائے کی تقلید کی ہے اور اگرچہ آپ ائمہ مجتہدین کی تقلید کے قائل نہیں ہیں صحابہ کرام کے متعلق بھی آپ کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک مساوی حیثیت کے انسان ہیں جن کو تاریخ نے تقدم کا اعزاز بخش دیا ہے اس لیے آپ ان کے حق میں بے باکانہ تنقید کو بھی جائز حق تسلیم کرتے ہیں۔ آپ نے علامہ شبلی کی یہاں تک تقلید کی ہے کہ آپ کو یہ خیال بھی نہیں رہا کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں اس میں کھلا ہوا تناقض اور تضاد ہے۔

ایک طرف آپ بڑی قوت اور شدت سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کاروان تجارت پر حملہ کرنا ضروری تھا اگر کاروان تجارت بچ کر نکل جاتا تو مسلمانوں کی ہوا اکھڑ جاتی۔ تحریک بے جان ہو جاتی۔ آپ فرماتے ہیں۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ فیصلہ کی گھڑی آپہونچی ہے اور یہ ٹھیک وہ وقت ہے کہ ایک جسورانہ قدم اگر نہ اٹھایا گیا تو تحریک اسلامی ہمیشہ کے لیے بے جان ہو جائے گی بلکہ بعید نہیں کہ اس تحریک کے لیے سر اٹھانے کا پھر کوئی موقع باقی نہ رہے۔ نئے شہر میں ہجرت کر کے آئے ابھی پورے دو سال بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مہاجرین ابھی بے سروسامان انصار بھی ناآزمودہ۔ یہودی قبائل برسر مخالفت۔ خود

مدینہ میں منافقین ومشرکین کا اچھا خاصہ عنصر موجود اور گرد وپیش کے تمام قبائل قریش سے مرعوب بھی اور مذہباً ان کے ہمدرد بھی ایسے حالات میں اگر قریش مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن اگر وہ حملہ نہ کریں اور صرف اپنے زور سے قافلہ کو بچا کر لے جائیں اور مسلمان ویسے بیٹھے رہیں تب بھی یک لخت مسلمانوں کی ایسی ہوا اکھڑ جائے گی کہ عرب کا بچہ بچہ ان پر دلیر ہو جائے گا اور ان کے لیے ملک بھر میں پھر کوئی جائے پناہ باقی نہ رہے گی۔ آس پاس کے سارے قبائل قریش کے اشاروں پر کام کرنا شروع کر دیں گے۔ مسلمانوں کا کوئی رعب واثر نہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے کسی کو ان کی جان مال اور آبرو پر ہاتھ ڈالنے میں تامل ہو۔ انتہی تفہیم القرآن ج اص ۲۵)

ایک طرف یہ زورِ قلم اور قوت استدلال ہے۔ لیکن جب حضرات مؤرخین اور ارباب سیرت یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قافلہ پر حملہ کرنے کی غرض سے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو مودودی کا ارشاد ہوتا ہے بالکل غلط ہے۔ قرآن کے خلاف ہے۔ آپ لوگوں نے احادیث اور مغازی کی کتابوں پر غلط اعتماد کر لیا ہے چنانچہ اسی صفحہ کے حاشیہ پر تحریر ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ بدر کے بیان میں تاریخ وسیرت کے مصنفین نے ان روایات پر اعتماد کر لیا ہے جو حدیث اور مغازی کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں لیکن ان روایات کا بڑا حصہ قرآن کے خلاف ہے اور قابل اعتماد نہیں ہے۔ حاشیہ تفہیم القرآن ص ۲۵، ج ۱)

جہاں تک قرآن کے خلاف ہونے کا تعلق ہے اس پر مفصل بحث انشاء اللہ آئندہ آئے گی۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ تقلید کے سرگرم مخالف مودودی صاحب نے جب علامہ شبلی کی تقلید کی تو انہیں اس کا احساس بھی نہ ہو سکا کہ وہ بے محل زورِ قلم صرف کر رہے ہیں اور ایک ایسی بات کے لیے دلائل کی بھر مار کر رہے ہیں جو نتیجتاً قرآن کے خلاف ہوتی ہے یہ تضاد علامہ شبلی رحمہ اللہ کی تحریر میں بھی ہے کہ ایک طرف وہ مقدمات پیش کرتے ہیں جن سے کاروان تجارت پر حملہ کرنے کی ضرورت ثابت ہوتی ہے لیکن جب ان کو احساس ہوتا ہے کہ یہ تو وہی بات ہے جس کو یورپین مؤرخین لوٹ اور غارتگری سے تعبیر کرتے ہیں تو حضرت علامہ دفعتہً دوسرا رخ اختیار کر لیتے ہیں کہ آپ کا سفر اس غرض سے ہوا ہی نہیں تھا مدینہ طیبہ ہی میں آپ کو قریش کی روانگی کا علم ہو گیا تھا اور آپ قریش کی مدافعت کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ علامہ کے نزدیک واقعہ یہی ہے کہ قریش کی مدافعت کے لیے روانہ ہوئے تھے اور مکہ معظمہ میں جو یہ پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کر رہے ہیں وہ بے بنیاد تھا تو پھر ان مقدمات کو پیش کرنے کی ضرورت کیا تھی جن سے کاروان تجارت پر حملہ کی ضرورت ثابت ہو۔

بہر حال حضرت علامہ شبلی رحمۃ اللہ ایک حد تک معذور تھے۔ آپ نے وہ زمانہ پایا تھا جب آپ کے خیال میں بھی ضروری تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام نے اقدامی جہاد کی تعلیم ہی نہیں دی۔ اسلام دفاعی جنگ کی تعلیم دیتا ہے اور جتنے غزوے ہوئے وہ سب دفاع کی غرض سے تھے۔ کیونکہ انیسویں صدی کے اواخر کا وہ زمانہ تھا جب یورپ کے اس شور نے آسمان کو سر پر اٹھا رکھا تھا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور اسلام وحشت وبربریت کی تعلیم دیتا ہے وہ یہ زمانہ تھا کہ اس وقت تک یورپ میں مسلمانوں کی ایسی طاقت باقی تھی کہ وہ عیسائی حکومتوں کا مقابلہ کر سکتی تھی اور عیسائی حکومتوں کی تمام کوششیں اس میں صرف ہو رہی تھیں کہ یورپ کو مسلمانوں سے خالی کرا دیا جائے۔ علامہ شبلی اور سرسید مرحوم کے زمانہ میں ترکوں کی خلافت باقی تھی اور وہ روس برطانیہ اور فرانس وغیرہ کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اسلام اور عیسائیت کی جنگ کا سلسلہ جاری تھا ترکوں کی فتوحات اور شکستوں پر علامہ شبلی کی بہت سی نظمیں اسی زمانہ کی ہیں۔ یہ دونوں بزرگ عیسائیوں کے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے۔ پھر سرسید مرحوم نے تو راستہ ہی دوسرا اختیار کر لیا جس کی ایک مثال عہد زریں کے حصہ چہارم میں پیش کی گئی ہے لیکن علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فاضل اسلام کی حیثیت سے یورپ کے اعتراضات کے جوابات دیئے اور بہت قابل قدر خدمت انجام دی شکر الله سعیهم)

مگر آپ اس رجحان کو ختم نہ کر سکے کہ اسلام صرف دفاعی جنگ کی تعلیم دیتا ہے حضرت علامہ کے اس رجحان کے برخلاف ہمارا یقین یہ ہے کہ کسی بھی قوم کی باوقار زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ دوسری حکومتیں اس کی گرفت سے مرعوب اور اس کے اقدام سے خائف

رہیں۔اس کے لیے اگر اقدام کی ضرورت ہو تو یہ ممنوع نہیں بلکہ قرآن پاک ایسے اقدام کا حکم دیتا ہے۔قاتلو الذین یلو نکم من الکفار ۔ولیجدو افیکم غلظته(سورہ توبہ) مسلمانو ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے پاس (پھیلے ہوئے) ہیں اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی اور قوت محسوس کریں) مودودی صاحب نے کاروان تجارت پر حملہ کو لوٹ سے تعبیر کیا اس غلط تعبیر کے بعد وہ مجبور ہوئے کہ آنحضرت ﷺ کے دامن مبارک کو اس سے پاک کریں۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوٹ جرائم پیشہ غارت گروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے کوئی منظم جماعت جو بلند مقاصد کے لیے انقلاب برپا کرنا چاہتی ہو۔اس کے اقدام کو لوٹ وہی کہہ سکتا ہے جو اس انقلاب کا مخالف ہو۔ہمارے خیال میں یہ انقلاب ضروری ہی نہیں تھا بلکہ نوع انسان کے حق میں احسان عظیم تھا۔لہٰذا اس کے لیے جو اقدامات کیے گئے وہ سراسر درست اور اصلاحی اقدامات تھے۔کاروان تجارت پر حملہ کا ارادہ بھی دفاعی اور اصلاحی اقدام تھا۔باقی سوالات اور اعتراضات کے جوابات انشاءاللہ آئندہ آئیں گے۔

(۲۸۲)تفسیر مظہری۔وقال فی البدای والعیون هذا قبل ان یرد رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم ابا لبابته من الروحاء ثم کان زمیلاه علیا وزیدا(تفسیر مظہری)

(۲۸۳)سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کو دس سال کی عمر سے آقا و جہان مصطفےٰ ﷺ نے اپنی تربیت میں لے لیا تھا۔ابو طالب کے بجائے آنحضرت ﷺ ہی ان کی ضروریات کے متکفل ہوتے تھے۔اس وقت ان کی عمر تقریباً چوبیس سال تھی۔

(۲۸۴)مسلم شریف اور چار برید۔ابن سعد

(۲۸۵)ابن اسحاق بحواہ بدایہ نہایہ ص ۱۵ ج ۱

(۲۸۶)ابن سعد غزوہ بدر

(۲۸۷)ایضاً

(۲۸۸)بیہقی بحوالہ بدایہ ونہایہ ص ۲۳ ج ۲ وسیر ابن ہشام ص ۲۸۱

(۲۸۹)بدایہ ونہایہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۱

(۲۹۰)طبقات ابن سعد ص ۶ ج ۲

(۲۹۱)سیر ابن ہشام ص ۲۶۵ ج)

(۲۹۲)ابن مردویہ کی روایت یہ ہے کہ یہ گفتگو مقام روحاء پر ہوئی تھی۔حتی اذا کان بالروحاء خطب۔بدایہ ونہایہ ص ۱۵۳ ج ۲

(۲۹۳)ابن ابی حاتم فی تفسیرہ وابن مردویہ بدایہ ونہایہ ص ۱۵۱ ج ۲

(۲۹۴)ابن اسحاق۔سیر ابن ہشام و بدایہ ونہایہ ص ۱۵۳ ج ۲

(۲۹۵)سیر ابن ہشام و بدایہ ونہایہ ص ۱۵۴ بروایت ابن اسحاق

(۲۹۶)بدایہ ونہایہ ص ۱۶۶ بحوالہ مسند احمد

(۲۹۷)مسلم شریف غزوہ بدر میں اسی ایک کا ذکر ہے اور نام کے بجائے یہ لکھا ہے۔غلام اسود لنبی الحجاج۔

(۲۹۸)هم وراء هذا الکثیب الذی تری بالعدو القصوی۔بدایہ ص ۱۵۴ ج ۲)

(۲۹۹)مسلم شریف باب غزوہ بدر

(۳۰۰)ابن اسحاق ابن ہشام وغیرہما

(۳۰۱) المقداد بن عمر و البهرانی و هو المقداد بن الا سود من المها جرین الا ولین۔بدایہ ص ۲۱۳ ج ۲

(۳۰۲)طبقات ابن سعد قسم اول جلد ۲

(۳۰۳)غزوہ بواط میں آنحضرت ﷺ کے رفقاء کی تعداد ابن سعد نے دو سو بیان کی ہے۔یہ تعداد حضرات انصار کی شرکت کے بغیر

پوری نہیں ہوسکتی۔ ورنہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزوہ بدر میں حضرات مہاجرین صرف ۶۵ اور بقول علامہ شبلی صرف ساٹھ کیوں تھے۔

(۳۰۴) مسلم کی روایت میں سعد بن معاذؓ کے بجائے سعد بن عبادہؓ کا نام ہے چونکہ حضرت سعد بن عبادہؓ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے تو علامہ شبلی نے اس سے یہ استدلال کیا کہ یہ گفتگو اور یہ اجتماع مدینہ میں ہوا تھا سیرۃ النبی ﷺ ص ۲۱۴ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نام کی غلطی ہے چنانچہ حافظ ابن کثیر نے اس کی وضاحت کردی ہے ملاحظہ ہو بدایہ ونہایہ ج ۲ ص ۸) ۲ سیرۃ حلبیہ ص ۵۶) ج ۲

(۳۰۵) ذکرہ الاموی فی مغازیہ بدایہ و نہایہ ص ۱۵۳ ج ۲

(۳۰۶) ابن اسحاق ومسلم شریف وغیر ہما۔ بدایہ ص ۱۵۱ وص ۱۵۲ ج ۲

(۳۰۷) بظاہر اس اسلوب کی حکمت یہ ہے کہ دنیا جان لے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کا بلا وجہ مداح نہیں ہے وہ ان کے ہر ایک عمل پر تنقیدی نظر رکھتا ہے بیجا رعایت نہیں کرتا۔ نوع انسان کو عبرت ہو کہ خداوند عالم جب اپنے مقربین پر تنقید کرتا ہے تو ہمارے افعال واعمال بھی تنقید خداوندی سے محفوظ نہیں رہ سکتے لہٰذا گناہوں سے اجتناب کی کوشش کرتے رہیں اور عفو ومغفرت کے طلبگار رہیں (واللہ اعلم بالصواب

(۳۰۸) انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم الآیۃ

(۳۰۹) انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ الآیۃ

(۳۱۰) محمد بن اسحاق موسیٰ بن عقبہ ابن سعد وغیرہم رحمہم اللہ

(۳۱۱) اختلف فی اسلامہا (سیرۃ حلبیہ)

(۳۱۲) بظاہر مشرکین مکہ کو آل غدر کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کے غدار اور باغی و فی السیرۃ الحلبیۃ یا ال غدر ای یا اصحاب الغدر عدم الوفاء و فی کلام السھیل یا ال غدر بضم الغین والدال جمع غدر القوم ص ۵) ج ا

(۳۱۳) اللطیمہ دعاء امسك اوسوقہ اوعیہ تحلمہ (قاموس)۔

(۳۱۴) ترجمہ قریش اپنے قافلہ کی خبر لو۔ قافلہ کی خبر لو جو مشک اور قیمتی سامان لا رہا ہے۔ ابوسفیان امیر قافلہ ہے۔ اس کے پاس تمہاری دولت ہے۔ محمد ﷺ اور اس کے ساتھی راستہ روک رہے ہیں۔ دیکھو دیر کی تو تم اس کو نہ پاسکو گے۔ دہائی دہائی المدد۔

(۳۱۵) البدایہ والنہایہ صفحہ ۱۴۶ و ۱۴۷ جلد ۲۔

(۳۱۶) خون کے بدلہ خون (قصاص کا سلسلہ عربوں میں پشتہا پشت تک چلتا رہتا تھا۔ اسی طرح کا ایک قضیہ تھا کہ عامر کے اشارہ سے بنی بکر کے ایک آدمی نے حفص بن الاحنف کے جوان لڑکے کو قتل کردیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد موقع ملا تو مقتول کے بھائی نے عامر کو قتل کر دیا اور رات کے وقت اس کی تلوار حرم میں لاکر خانہ کعبہ کے پردوں میں لٹکا دی۔ اب بنوبکر مقتول عامر کے قصاص کی فکر میں تھے۔ کئی سال گزر گئے تھے۔ بنوبکر کو اس کا موقع نہیں ملا تھا۔

(۳۱۷) اذ زین لھم الشیطان اعمالھم الایہ۔

(۳۱۸) بخاری شریف۔ کتاب المغازی ص ۲۵۴

(۳۱۹) تہذیب جدید کی یہ بدذوقی ہے کہ اس نے ترنم کا کام لب شیریں کے بجائے ریکارڈ سے لینا شروع کردیا۔

(۳۲۰) ابوجہل نے مرالظہر ان مقام پر دعوت کی تھی جب اونٹ ذبح کیے جا رہے تھے تو ایک اونٹ کے خنجر لگا اور ہاتھ سے نکل کر خیموں کی طرف بھاگ گیا اس کے سینہ سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا اور وہ خیموں کے میدان میں دوڑ رہا تھا۔ اس کے خون کے چھینٹے تمام خیموں میں پہنچے کوئی ایک خیمہ بھی پاک نہیں رہا۔ یہ گویا عاتکہ اور جہم بن صلت کے خوابوں کی تعبیر کا ایک حصہ تھا سیر حلبیہ میں ہے کہ بنوعدی اسی واقعہ سے متاثر ہوئے تھے آخر کار وہ واپس ہوگئے اور جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ ص ۶ ج ا

(۳۲۱) ابن اسحاق بحوالہ بدایہ ص ۱۵۵ ج ۲

(۳۲۲) یکم ذی قعدہ سے ۷ ذی قعدہ تک یہاں میلہ لگا کرتا تھا۔ سیر حلبیہ ص ۶ ج ا)

(۳۲۳) نقیم علیه ثلاثا نخر الجزور ونطعم الطعام و نسقی الخمر و تغزف علینا القیان۔(ابن اسحاق سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۲)

(۳۲۴) تعجب ہے حضرت علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو نظر انداز فرما دیا۔ آپ فرماتے ہیں۔ اگر قریش صرف قافلہ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اس میں اظہار شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی ص ۲۱۲ باوجودیکہ حضرت علامہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قریش کو بدر کے قریب پہونچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا اب لڑنا ضروری نہیں لیکن ابوجہل نے نہ مانا۔ زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۱۸۳ و ص ۱۸۴

(۳۲۵) بنی زہرہ کے سرداروں میں ایک صاحب تھے اخنس بن شریق (جو بعد میں اسلام سے مشرف ہوئے) حضرت اخنس نے ابو جہل سے تنہائی میں گفتگو کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ کیا وہ جھوٹے ہیں۔ ابوجہل نے کہا قطعاً نہیں۔ وہ تو زبان اور ہاتھ کے اتنے سچے ہیں کہ ہم نے ان کا لقب امین تجویز کیا تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ حرم کعبہ کے خاص منصب سقایہ رفادہ اور مشورہ خاندان عبدالمطلب کے پاس پہلے سے تھے۔ اب منصب نبوت بھی اسی خاندان کے حصہ میں آ گیا تو ہم کہاں جائیں اور ہمیں کیا ملا (سیرۃ حلبیہ ص ۶) ج ۱ بہرحال بنی زہرہ کے واپس جانے کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں یقین ہو گیا کہ اس جنگ کی بنیاد رشک وحسد ہے۔ کسی حقیقت پر اس کی بنیاد نہیں ہے۔

(۳۲۶) البلایا تحمل المنایا۔ (ابن سعد و ابن اسحاق) قال فی سیرۃ الحلبیۃ۔ البلا بانی الاصل التوق تبرق علی قبر صاحبہا فلا تعلف و لاتسعی حتی تموت الخ صفحہ ۶۳) جلد ۱۔

(۳۲۷) بعد میں اسلام سے مشرف ہوئے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ بیت المال سے جو عطیہ دیا جاتا ہے اگر وہ بلا طلب اور بلا توقع استغناء نفس کے ساتھ ملے تو اس میں برکت ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس پر نظر رکھنے لگے تو اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے کہ کھا رہا ہے مگر پیٹ نہیں بھرتا حضرت حکیم نے اس ارشاد کو پلے باندھ لیا اور ایسا استغناء اختیار کیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلا کر ان کی خدمت میں ان کا حصہ پیش کیا کرتے تھے مگر یہ معذرت کر دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضرین کو شاہد بنایا کرتے تھے کہ میں ان کا حصہ پیش کر رہا ہوں مگر یہ منظور نہیں کرتے خدا کے یہاں گواہ رہنا۔ بخاری شریف ص ۳۳۴

(۳۲۸) اسی موقع کی بات ہے کہ عتبہ اپنے سرخ اونٹ پر سوار میدان بدر کا چکر لگا رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس پر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فوج قریش میں کوئی بھلا آدمی ہے تو یہی سرخ اونٹ والا ہے اگر اس کے مشورہ پر عمل کریں تو انہیں سعادت میسر آ جائے۔ ان یطیعون یرشد وا (ابن اسحاق بدایہ ص ۷) او سیرۃ ابن ہشام

(۳۲۹) سیدنا ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ

(۳۳۰) تعجب ہے علامہ شبلی مرحوم نے غزوہ بدر کا محرک صرف عمرو بن حضرمی کے قتل کو قرار دیا ہے۔ حالانکہ اصحاب سیرت اور مؤرخین کا متفقہ بیان یہ ہے کہ جب تجارتی قافلہ کی حفاظت کا بہانہ ختم ہو گیا تب ابوجہل نے اس مطالبہ کو ابھارا تھا ورنہ اصل محرک وہی تھا جس کے لیے ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

(۳۳۱) ابن سعد ص ۸ ج ۲

(۳۳۲) ابن سعد و ابن ہشام وغیرہ

(۳۳۳) یرید الله ان یحق الحق بکلماته و یقطع دابر الکافرین۔ (سورہ انفال ع ۵)

(۳۳۴) تعجب ہے حضرت علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو نظر انداز فرما دیا۔ آپ فرماتے ہیں اگر قریش صرف قافلہ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے۔ اس میں اظہ

شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی (ص ۳۲۳)۔ باوجود یکہ حضرت علامہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا اب لڑنا ضروری نہیں لیکن ابوجہل نے نہ مانا۔ زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۲۹۴ و ص ۲۹۵

(۳۳۵) بنی زہرہ کے سرداروں میں ایک صاحب تھے اخنس بن شریق (جو بعد میں اسلام سے مشرف ہوئے) حضرت اخنس نے ابوجہل سے تنہائی میں گفتگو کی کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ کیا وہ جھوٹے ہیں۔ ابوجہل نے کہا قطعاً نہیں۔ وہ تو زبان اور ہاتھ کے اتنے سچے ہیں کہ ہم نے ان کا لقب امین تجویز کیا تھا لیکن بات یہ ہے کہ حرم کعبہ کے خاص منصب سقایہ رفادہ اور مشورہ خاندان عبدالمطلب کے پاس پہلے سے تھے۔ اب منصب نبوت بھی اسی خاندان کے حصہ میں آ گیا تو ہم کہاں جائیں اور ہمیں کیا ملا (سیرۃ حلبیہ ص ۱۷۱ ج ۲) بہرحال بنی زہرہ کے واپس جانے کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں یقین ہوگیا کہ اس جنگ کی بنیاد رشک و حسد ہے۔ کسی حقیقت پر اس کی بنیاد نہیں ہے۔

(۳۳۶) البلايا تحمل المنايا (ابن سعد وابن اسحاق) قال في السيرة الحلبية۔ البلا بانی الاصل التوق تبرق علی قبر صاحبها فلا تعلف ولا تسعی حتی تموت الخ صفحه ۱۷۴، جلد ۲

(۳۳۷) بعد میں اسلام سے مشرف ہوئے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ بیت المال سے جو عطیہ دیا جاتا ہے اگر وہ بلاطلب اور بلاتوقع استغناء نفس کے ساتھ ملے تو اس میں برکت ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس پر نظر رکھنے لگے تو اس کی مثال ایسی ہوجاتی ہے کہ کھا رہا ہے مگر پیٹ نہیں بھرتا۔ حضرت حکیم نے اس ارشاد کو پلے باندھ لیا اور ایسا استغناء اختیار کیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلا کر ان کی خدمت میں ان کا حصہ پیش کیا کرتے تھے مگر یہ معذرت کر دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضرین کو شاہد بنایا کرتے تھے کہ میں ان کا حصہ پیش کر رہا ہوں مگر یہ منظور نہیں کرتے خدا کے یہاں گواہ رہنا۔ بخاری شریف ص ۴۴۵

(۳۳۸) اسی موقع کی بات ہے کہ عتبہ اپنے سرخ اُونٹ پر سوار میدان بدر کا چکر لگا رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس پر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فوج قریش میں کوئی بھلا آدمی ہے تو یہی سرخ اُونٹ والا ہے۔ اگر اس کے مشورہ پر عمل کریں تو انہیں سعادت میسر آ جائے۔ ان يطيعوه يرشدوا ابن اسحاق بدایہ ص ۲۱۸ و سیرۃ ابن ہشام

(۳۳۹) سیدنا ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ

(۳۴۰) تعجب ہے علامہ شبلی مرحوم نے غزوہ بدر کا محرک صرف عمرو بن حضرمی کے قتل کو قرار دیا ہے۔ حالانکہ اصحاب سیرت و مؤرخین کا متفقہ بیان یہ ہے کہ جب تجارتی قافلہ کی حفاظت کا بہانہ ختم ہوگیا تب ابوجہل نے اس مطالبہ کو ابھارا تھا ورنہ اصل محرک وہی تھا جس کے لیے ابوسفیان نے تجارتی قافلہ کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

(۳۴۱) ابن سعد ص ۹ ج ۳

(۳۴۲) ابن سعد و ابن ہشام وغیرہ

(۳۴۳) يريد الله ان يحق الحق بكلماته ويقطع دابر الكافرين (سورہ انفال ع ۱)

(۳۴۴) تعجب ہے حضرت علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں [illegible] قافلہ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ محض شان [illegible]

شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی (ص ۳۲۳)۔ باوجود یکہ حضرت علامہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا اب لڑنا ضروری نہیں لیکن ابوجہل نے نہ مانا۔ زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۲۹۴ و ص ۲۹۵

(۳۴۵) بنی زہرہ کے سرداروں میں ایک صاحب تھے اخنس بن شریق (جو بعد میں اسلام سے مشرف ہوئے) حضرت اخنس نے

ابوجہل سے تنہائی میں گفتگو کی کہ "محمد ﷺ" کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ کیا وہ جھوٹے ہیں۔ ابوجہل نے کہا قطعاً نہیں۔ وہ تو زبان و ہاتھ کے اتنے سچے ہیں کہ ہم نے ان کا لقب امین تجویز کیا تھا لیکن بات یہ ہے کہ حرم کعبہ کے خاص منصب سقایہ رفادہ اور مشورہ خاندان عبدالمطلب کے پاس پہلے سے تھے۔ اب منصب نبوت بھی اسی خاندان کے حصہ میں آ گیا تو ہم کہاں جائیں اور ہمیں کیا ملا (سیرۃ حلبیہ ص ۱۷۱ ج ۲) بہرحال بنی زہرہ کے واپس جانے کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہیں یقین ہوگیا کہ اس جنگ کی بنیاد رشک وحسد ہے۔ کی حقیقت پر اس کی بنیاد نہیں ہے۔

(۳۴۶) البلایا تحمل المنایا (ابن سعد و ابن اسحاق) قال فی السیرۃ الحلبیۃ. البلا بانی الاصل التوق تبرق عمی قبر صاحبها فلا تعلف ولا تسعی حتی تموت، الخ صفحہ ۱۷۴ جلد ۲۔

(۳۴۷) بعد میں اسلام سے مشرف ہوئے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ بیت المال سے جو عطیہ دیا جاتا ہے اگر وہ بے طلب اور بلا توقع استغناء نفس کے ساتھ ملے تو اس میں برکت ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس پر نظر رکھنے لگے تو اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے کہ کھا رہا ہے مگر پیٹ نہیں بھرتا حضرت حکیم نے اس ارشاد کو پلے باندھ لیا اور ایسا استغناء اختیار کیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلا کران کی خدمت میں ان کا حصہ پیش کیا کرتے تھے مگر یہ معذرت کر دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضرین کو شاہد بنا کر کرتے تھے کہ میں ان کا حصہ پیش کر رہا ہوں مگر یہ منظور نہیں کرتے خدا کے یہاں گواہ رہنا۔ (بخاری شریف ص ۴۴۵)

(۳۴۸) اسی موقع کی بات ہے کہ عتبہ اپنے سرخ اُونٹ پر سوار میدان بدر کا چکر لگا رہا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی نظر اس پر پڑی تو آپ ﷺ نے فرمایا فوج قریش میں کوئی بھلا آدمی ہے تو یہی سرخ اُونٹ والا ہے اگر اس کے مشورہ پر عمل کریں تو انہیں سعادت میسر آجائے۔ ان یطیعوہ یرشدوا ابن اسحاق بدایہ ص ۲۱۸ وسیرۃ ابن ہشام

(۳۴۹) سیّدنا ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ

(۳۵۰) تعجب ہے علامہ شبلی مرحوم نے غزوہ بدر کا محرک صرف عمرو بن حضرمی کے قتل کو قرار دیا ہے۔ حالانکہ اصحاب سیرت اور مؤرخین کا متفقہ بیان یہ ہے کہ جب تجارتی قافلہ کی حفاظت کا بہانہ ختم ہوگیا تب ابوجہل نے اس مطالبہ کو ابھارا تھا۔ ورنہ اصل محرک وہی تھا جس کے لیے ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

(۳۵۱) ابن سعد ص ۹ ج ۳

(۳۵۲) ابن سعد وابن ہشام وغیرہ

(۳۵۳) یرید اللّٰہ ان یحق الحق بکلماتہ ویقطع دابر الکافرین (سورہ انفال ۶۲)

(۳۵۴) اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد کی نکتہ سنجی بھی فراموش نہ ہونی چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں:

(۱) آج کل فن جنگ میں جس بات پر زور دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سپاہیوں کی اسپرٹ یعنی معنوی قوئ درست رکھے جائیں یہاں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ صرف اس بات نے کہ پانی کی ضرورت باقی نہیں رہی ریت میں دھنس جانے کا خطرہ جاتا رہا اور نہا دھو لینے کی وجہ سے جسم میں تازگی آ گئی لوگوں کے اندر جس درجہ خود اعتمادی اور سرگرمی پیدا کر دی ہوگی اس کا اندازہ صرف اہل تجربہ ہی کر سکتے ہیں۔ (۲) بعض اوقات قدرتی حوادث کا معمولی سا واقعہ بھی فتح وشکست کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ جنگ واٹرلو کے تمام مؤرخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کی درمیانی رات میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا۔ کیونکہ اس صورت میں نپولین کو زمین خشک ہونے کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا نتیجہ نکلتا کہ بلوشر کے پہنچنے سے پہلے ویلنگٹن کو شکست ہوچکی ہوتی (پھر فرماتے ہیں) (۳) واٹرلو میں اگر بارش نہ ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا لیکن اگر بدر میں نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ تمام روئے زمین کی ہدایت وسعادت کا نقشہ اُلٹ جاتا۔ اسی طرف پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی دعا میں اشارہ کیا تھا اللّٰھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد فی الارض خدایا اگر خدام خلق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہوگئی تو پھر روئے زمین میں تیرے سچے عبادت گزار کوئی نہ رہیں گے۔ تمام

میاں کی گزارش ہے اس موقع پر سورہ بنی اسرائیل کا پہلا اور دوسرا رکوع ضرور مطالعہ کرلیا جائے جس کے آخر میں کلاً نمد ھوء لاء وھوء لاء من عطاء ربك وما كان عطاء ربك محذورا (ہم ہر فریق کو مدد دیتے ہیں ان کو بھی ان کو بھی اور تیرے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ پہلے رکوع میں بخت نصر کی فوج کو جس نے بنی اسرائیل کو تباہ کیا تھا عباداً لنا اولی باس شدید فرمایا گیا ہے (ہمارے ایسے بندے جو بڑے ہی خوفناک تھے) غزوہ بدر میں بندگان پر تقدس نوع انسان کی ابدی سعادت کے لیے ارادہ خداوندی کے آلہ کار بنے ہوئے تھے۔ قدرت کے دست غیب نے جو سامان ان کی کامیابی کے لیے مہیا کیے وحی خداوندی نے ان کو ظاہر فرمادیا۔

(۳۵۵) مسند احمد ابن جریر

(۳۵۶) مسند احمد بحوالہ بدایہ ص ۲۷۸

(۳۵۷) البدایہ والنہایہ ص ۲۶۷

(۳۵۸) عبانا رسول الله ﷺ ببدر ليلا ترمذی شریف باب ماجاء فی الصف والتعبیة عند القتال

(۳۵۹) بخاری شریف

(۳۶۰) بدایہ ونہایہ ص ۲۷۴

(۳۶۱) سیرۃ حلبیہ ص ۱۶۵ ج ۲

(۳۶۲) سیرۃ حلبیہ ص ۱۶۵ ج ۲

(۳۶۳) السيرة الحلبيه صام يوماً اويو مين ثم نادى مناديه انى مفطر فافطروا ص ۱۶۵ السيرة الحلبيه ج ۲

(۳۶۴) ابن اسحاق بحوالہ ابن ہشام ص ۳۸۲ ج ۱

(۳۶۵) مسلم شریف جلد دوم باب الوفا بالعہد ونووی

(۳۶۶) مسلم شریف جلد دوم ص ۱۱۸ سیرۃ حلبیہ میں ان کا نام حبیب بن یساف بتایا گیا ہے۔ ص ۱۶۵ ج ۲

(۳۶۷) درمنثور وسیرۃ حلبیہ ص ۱۷۳ ج ۲

(۳۶۸) لیکن یہ عجیب اتفاق ہوا کہ جن لوگوں نے یہاں آکر پانی پیا اتفاق سے وہ سب جنگ میں کام آگئے۔ صرف ایک کوئی زندہ نہیں پہنچا۔ یہ حضرت حکیم بن حزام تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے اور پھر قسم کھایا کرتے تھے تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جوش میں یہ الفاظ کہا کرتے تھے۔ والذی نجانی من یوم بدر اس ذات کی قسم جس نے مجھے جنگ بدر میں نجات بخشی۔ ابن ہشام ص ۳۷۹ طبری

(۳۶۹) سیرۃ ابن ہشام ص ۳۸۲ ج ۱ ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ مقتول حضرمی کے بھائی عامر نے سب سے پہلے حملہ کیا۔ حضرت مہجع اس کے مقابلہ کو نکلے اور شہید ہوگئے۔ علامہ شبلی نعمانی کو چونکہ اصرار ہے کہ غزوہ بدر کا محرک صرف حضرمی کا قتل تھا اور قاعدہ کے مطابق سب سے پہلے حضرمی کے بھائی عامر کو قصاص لینے کے عزم سے میدان میں آنا چاہیے تھا۔ لہذا ابن سعد کی یہ روایت علامہ کے رجحان کے موافق ہے اسی لیے انہوں نے سیرۃ النبی ﷺ میں بھی یہی روایت قابل اخذ سمجھی اور ابن اسحاق کی روایت کو نظر انداز کردیا۔

(۳۷۰) سیرۃ ابن ہشام ص ۳۸۲ ج ۱

(۳۷۱) سیرۃ ابن ہشام ص ۳۸۱ ج ۱

(۳۷۲) ہر ایک فریق کا دعویٰ یہی ہے کہ خدا کے لیے لڑ رہا ہے۔ مذہبی جنگ ہے۔

(۳۷۳) ابوسفیان کا خسر۔

(۳۷۴) آنحضرت ﷺ سے دس سال بڑے تھے۔ سیرۃ حلبیہ ص ۱۷۸ ج ۱

(۳۷۵) بدایہ ونہایہ ص ۲۷۴ ج ۳

(۳۷۶) یعنی مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان کے دشمن (مشرکین مسلمانوں سے بہت زیادہ ہیں) اور یہ مطلب بھی ہو

سکتا ہے کہ مشرکین اپنے آپ کو دو چند دیکھ رہے تھے۔ یعنی ہر ایک فریق کے حوصلے اتنے بلند تھے کہ وہ اپنے آپ کو کم سمجھنے کے بجائے تعداد سے دو چند سمجھ رہے تھے اور یہ معنی بھی صحیح ہو سکتے ہیں کہ کافر مسلمانوں کو خود اپنی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ مسلمان ایک تہائی تھے مگر دو ہزار نظر آ رہے تھے لیکن اس کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ یہ کسی قدر مقابلہ کے بعد ہوا جب فرشتوں کا نزول ہوا کہ کافروں کو نظر آنے لگا کہ سب طرف سے مسلمان ہی مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(۳۷۷) كان قتل هولاء النصر قبل التقاء الجمعيتين۔ در منثور ج ۳ ص ۱۶۸

(۳۷۸) طبرانی (بدایہ ونہایہ ص ۲۸۳ ج ۳)

(۳۷۹) طبرانی وسیرۃ ابن ہشام ص ۳۸۶ ج ۱۲

(۳۸۰) فلما اصطف القوم قال ابوجهل اللهم اولانا بالحق فانصره ورفع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم يديه فقال يا رب ان تهلك هذه العصابته فلن تعبد في الارض ابدًا ابن اسحاق ابن جرير، ابن المنذر، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما در منثور ص ۱۶۸ ج ۳ وهذا معنى قوله تعالىٰ ان تستفتحوا فقد جاء كم الفتح الآية۔ محمد میاں

(۳۸۱) البداية والنهاية ص ۲۷۲ وذكر الاموى وغيره ان المسلمين عجوا الى الله عزوجل فى الااستغاثة بحنابه والاستعانة به۔ البداية و درمنثور وغيره ص ۲۷۵

(۳۸۲) بیہقی ونسائی بدایہ ص ۲۷۵ وص ۲۷۶ ج ۴

(۳۸۳) نسائی شریف۔ بدایہ ص ۲۷۶ ج ۳

(۳۷۳) مسند احمد بدایہ ص ۲۷۵ ج ۳

(۳۷۴) جس طرح نبی کو اللہ پر یقین کامل ہوتا ہے اسی طرح اپنی حیثیت اور اپنے منصب کا بھی اس کو یقین اور اذعان ہوتا ہے۔ چنانچہ خود آپ ہی فرمایا کرتے تھے اشهد ان محمدا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آپ کو اپنے خاتم الانبیاء ہونے کا بھی یقین کامل تھا۔ لہٰذا اس کا بھی یقین تھا کہ اگر آپ کی دعوت ناکام ہوتی ہے تو پھر خدا کی پرستش زمین میں نہیں ہوگی کیونکہ میرے بعد یہ سلسلہ نبوت و رسالت ختم ہو جائے گا تو نہ وحی نازل ہوگی نہ ہدایت خلق ہوگی۔

(۳۷۵) محمد بن عقیل کی روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں ایک روز تقریر فرما رہے تھے کہ آپ نے دریافت کیا کہ بتاؤ سب سے زیادہ بہادر کون ہے۔ حاضرین نے عرض کیا امیر المومنین آپ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مگر میرا یقین یہ ہے کہ سب سے زیادہ بہادر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ غزوہ بدر کے موقع پر ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک چھپر ڈال دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس چھپر میں تھے اور یہ چھپر دشمنوں کی نظر میں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس پر بار بار حملہ کر رہے تھے۔ اس وقت کسی کی ہمت نہیں تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس چھپر میں رہ سکے۔ مگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو میں نے دیکھا کہ وہ تلوار برہنہ یہاں موجود تھے جو اس طرف کا رُخ کرتا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کے سامنے ہو جاتے تھے۔ مسند بزاز بدایہ ص ۲۷۱ ج ۷۔

(۳۷۶) عن عبدالله بن ثعلبه بن صغير خفق رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم خفه فى العريش ثم انتبه فقال البشر يا ابابكر هذا جبرئيل معتجر بمعامة اخذ بعنان فرسه يقوده على ثناياه الفقع اتاك نصر الله وعدته وامر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فاخذ كفا من الحصى بيده ثم خرج فاستقبل القوم۔ فقال شاهت الوجوه ثم نفحهم بها ثم قال لا صحابه احملوا فلم تكن "لا تهزيمة فقتل من قتل من صنا ديدهم (الاموى) بدايه ونهاية ص ۲۸۴ ج ۳ ابن اسحاق ص ۲۷۶ ج ۳

(۳۷۷) اس ذرہ کا نام ذات الفضول تھا اور جو تلوار حائل کیے ہوئے تھے اس کا نام عضب تھا۔ سیرۃ حلبیہ ص ۱۶۵

(۳۷۸) قال الاموى فى مغازيه وقد قاتل بنفسه الكريمة قتالاً شديداً ببدنه و كذلك ابوبكر الصديق كما كان في العريش يجاهد ان بالدعا والتضرع ثم نزلاً فحرضيا وحثا على القتال وقاتلا بالابدان جمعا بين المقامين الشريفين

بدایہ ص ۲۷۸

(۳۷۹) بخاری شریف میں ص ۵۸۳

(۳۸۰) عن علی قال کنا اذا حمی الباس ولقی القوم اتقینا برسول اللہ ﷺ رواہ النسائی۔ بدایہ ونہایۃ ص ۲۷۹ ج ۳

(۳۸۱) عن علی قال لقد رائتنا یوم بدر ونحن فلوذ برسول اللہ ﷺ وھو اقربنا من العدو و کان من اشد الناس یومئذ باسلہ مسند احمد بدایہ ص ۲۷۹ ج ۳۔

(۳۸۲) یقال ابلی فلان بلاءً حسناً ای قاتل قتالاً شدیداً وصبر صبرا عظیما (روح المعانی)

(۳۸۳) لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو روک دیا کہ وہ آپ کے پاس نہ بیٹھیں۔متعنا بنفسک استیعاب ص ۴۰۴

(۳۸۴) لیکن آنحضرت ﷺ نے عتبہ کے مقابلہ کے لیے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو نامزد فرمایا تھا۔حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے ہی عتبہ قتل ہوا جس کا غصہ عتبہ کی بیٹی ہندہ کو رہا اور اسی غصہ میں اس نے اُحد کے موقعہ پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر چبایا تھا جس کی تفصیل اُحد کے بیان میں آئے گی۔انشاء اللہ یہاں ابن سعد کی روایت ہے کہ چونکہ حضرت ابوحذیفہ باپ کے سامنے میدان میں آنے والے تھے تو ہند نے یہ شعر کہے تھے۔الا حول الا ثعن المشوم طائرہ ابو حذیفہ شر الناس فی الدین اما شکرت اباربال من صغر حتی شبیت شبابا غیر محجون ابن سعد ج ۳ بیان ابو حذیفہ

(۳۸۵) مگر آنحضرت ﷺ نے ان کو باپ کے مقابلہ سے روک دیا ذکر فقھاء نا ان النبی ﷺ نھی ابا حذیفہ عن قتل ابیہ

(۳۸۶) سیرۃ حلبیہ ص ۱۹۹ ج ۲ سیرۃ ابن ہشام ج ۱-۳۸۲ قتلت خالی العاص بن ہشام بن مغیرہ ۲۹۰ بدایۃ جلد ۳

(۳۸۷) سیرۃ حلبیہ ص ۱۸۸ ج ۳

(۳۸۸) یہ وہی عوف بن حارث ہیں جو ابن عفرا بھی کہلاتے ہیں ان کو ابو جہل نے شہید کیا تھا جیسا کہ قتل ابو جہل کے بیان میں آئے گا۔

(۳۸۹) قرآن حکیم نے بتایا کہ شیطانی فطرت ہی یہ ہے کہ انسان کو برائی پر آمادہ کر کے مدد کرنے کے وقت ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کمثل الشیطان اذ قال للانسانی اکفر فلما کفر قال انی بری منک انی اخاف اللّٰہ

(۳۹۰) لقد رائتنا یوم بدر۔ وان احدنا یشیر بسیفہ الی راس المشرک فیقع راسہ عن جسدہ قبل ان یصل الیہ (حاکم بیھقی (صححہ) خصائص کبری ص ۲۰۱ ج ۱)

(۳۹۱) خصائص کبریٰ ص ۲۰۱ ج ۱

(۳۹۲) مسلم وبیہقی بحوالہ خصائص ص ۲۰۱ ج ۱

(۳۹۳) ابن اسحاق ابن جریر بیہقی خصائص ص ۲۰۱ ج ۱

(۳۹۴) خصائص بحوالہ بیہقی

(۳۹۵) خصائص بحوالہ واقدی وبیہقی

(۳۹۶) خصائص ۲۰۴ ج ۲

(۳۹۷) ایضاً

(۳۹۸) بدایہ ونہایہ ص ۲۷۸ ج ۳

(۳۹۹) خصائص ص ۲۰۱ ج ۱

(۴۰۰) سیدنا حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں پیغمبر کا خواب غلط نہیں۔ان میں کافر رہنے والے کم ہی تھے۔اکثر وہ تھے جو پیچھے (بعد میں) مسلمان ہوئے۔(موضح القرآن)

(۴۰۱) جزور فیہ یعنی اونٹ کو کہتے ہیں۔ایک اونٹ کا گوشت سو آدمیوں کے لیے کافی ہوا کرتا تھا اس لیے سو کی تعداد کو اکلہ جزور کہا کرتے تھے۔یعنی اتنے آدمی جو ایک اُونٹ کا گوشت سے سیر ہو سکیں۔اسی عرف عام کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج قریش کا اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک ہزار اور نو سو کے درمیان ہے۔کیونکہ یہ بتایا گیا تھا کہ ایک روز نو اُونٹ ذبح کیے جاتے ہیں اور ایک روز دس اُونٹ۔

(۴۰۲) تفسیر روح المعانی

(۴۰۳) یعنی مسلمانوں سے کافر تین برابر تھے (۳۱۳×۹۳۹) پر اللہ نے دو ہی برابر (تقریباً چھ سو) دکھایا تھا تا کہ خوف نہ کھائیں۔

(۴۰۴) مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ دو چند ہیں۔بایں ہمہ منکرین حق کو شکست ہوئی۔(ترجمان القرآن)

(۴۰۵) ابن ہشام وغیرہ

(۴۰۶) سیرت ابن ہشام ص ۳۹۳

(۴۰۷) بخاری شریف صفحہ ۴۴۴ باب من لم یخمس الاسباب

(۴۰۸) بخاری شریف میں ۴۴۴

(۴۰۹) یہ وہی عوف ہیں جن کا ذکر پہلے بھی گزر چکا ہے کہ دریافت کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کس بات سے خوش ہوتا ہے اور جب معلوم ہوا کہ رضا خدا کی بات یہ ہے کہ کپڑے اُتار کر دشمن سے گتھ جاؤ تو انہوں نے زرہ بھی اُتار پھینکی تھی۔

(۴۱۰) طبقات ابن سعد الجزء الثالث ص ۱۰۸ فی البدریین من الانصار نیز سیرۃ ابن ہشام میں ہے کہ جس وقت بدر کے قیدی مدینہ پہنچے تو اُم المومنین سودہ رضی اللہ عنہا اس وقت عفراء کے یہاں ان کے دونوں بیٹوں معوذ اور عوف کی تعزیت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔سیرۃ ابن ہشام ص ۳۹۳ مطبوعہ مطبع محمد علی از ہر مصر

(۴۱۱) سیرۃ ابن ہشام۔زرہ وغیرہ جو بدن پر تھی۔

(۴۱۲) سلب یعنی چھینا ہوا مال

(۴۱۳) بخاری شریف صفحہ ۴۴۴

(۴۱۴) سیرۃ ابن ہشام

(۴۱۵) هل فوق رجل قتلتموه بخاری شریف صفحہ ۵۷۳ هل اعمد رجل قتلتموه (بن هشام)

(۴۱۶) فلو غیرا کار قتلنی بخاری شریف صفحہ ۵۷۳

(۴۱۷) لقد ارتقیت مرتقی صعبایا رویعی الغنم ابن ہشام صفحہ ۳۸۸ جلد ا

(۴۱۸) البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۸۸ ج ۳

(۴۱۹) فتح الباری صفحہ ۲۳۶

(۴۲۰) بدایہ ونہایہ صفحہ ۲۸۹ ج ۳ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوجہل کے قتل میں اور کون کون شریک تھے۔فرمایا فرشتے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔

(۴۲۱) بخاری شریف صفحہ ۳۰۸ کتاب الوکالہ

(۴۲۲) یہ واقعہ اور برچھی اور تلوار کے متعلق پوری تفصیل بخاری شریف سے ماخوذ ہے۔صفحہ ۵۶۶ و ۵۷۰

(۴۲۳) یہ نابغہ ذبیانی کے قصیدہ کا شعر ہے۔اس کا پہلا مصرعہ یہ ہے لا عیب فیهم غیر ان سیوفهم شاعر اپنے قبیلہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے ان میں کوئی عیب نہیں ہے صرف ایک عیب ہے وہ یہ کہ دشمن کی فوجوں سے مسلسل تصادم کے باعث ان کی تلواریں ایسی ہیں ان میں دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

(۴۲۴) حضرت عروہ فرماتے ہیں کہ اس کی قیمت تین ہزار تک لگائی گئی مگر ہم نے نہیں دی لیکن ہمارے خاندان کے کسی نے لے لی۔

فروخت کر دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس کو اپنے ہی پاس کیوں نہ رکھ لیا تھا۔ (بخاری شریف صفحہ ۵۶۶)

(۴۲۵) ابوالبختری کی طرح مطعم بن عدی بھی تھا جس نے اس معاہدہ کے ختم کرنے میں کوشش کی تھی۔ پھر جب آنحضرت ﷺ طائف سے واپس ہوئے تو اس نے پناہ دی تھی۔ اس کے اسی حسن سلوک کا لحاظ کرتے ہوئے آپؐ نے اسی جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق فرمایا تھا کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان قیدیوں کے متعلق سفارش کرتے تو میں سب کو رہا کر دیتا۔ بخاری شریف صفحہ ۵۷۳۔ پس انسانیت اور مکارم اخلاق کا یہ علم بردار اگر مطعم کے کہنے پر تمام سرداران قریش کو چھوڑنے کے لیے تیار تھا تو کیا ابوالبختری کی سفارش پر اس کے ساتھی کو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا مگر فیصلہ قسمت یہی تھا کہ ابوالبختری دنیا سے محروم رہ جائے۔

(۴۲۶) سیرۃ ابن ہشام وغیرہ

(۴۲۷) ہندوستانی جتنا ناراض نہ ہو وہاں کا فر بھی جلائے نہیں جاتے تھے۔ دفن کیے جاتے تھے۔

(۴۲۸) سہیلی نے ذکر کیا اس میں ایک طرح کا شگون بھی تھا کہ رؤساء کفر کے لیے بنی نجار کا کنواں ہی مناسب تھا۔

(۴۲۹) سیرۃ حلبیہ صفحہ ۱۹۹ ج ۲ و فتح الباری صفحہ ۲۴۰ ج ۷

(۴۳۰) بخاری شریف صفحہ ۵۶۶

(۴۳۱) بخاری شریف صفحہ ۵۶۵

(۴۳۲) ایضاً

(۴۳۳) بخاری شریف صفحہ ۵۶۵

(۴۳۴) اس کی وضاحت حدیث معراج سے ہوتی ہے۔ جس کا ایک حصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ انسانوں کا ایک جم غفیر اس کے دائیں جانب ہے اور ایک جم غفیر بائیں جانب۔ جب وہ دائیں طرف نظر ڈالتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور دائیں طرف کے ہجوم پر نظر ڈالتا ہے تو رونے لگتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی حقیقت دریافت کیا تو بتایا گیا کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ان کے دائیں جانب اہل جنت ہیں اور بائیں جانب اہل دوزخ ہیں۔ جب اہل جنت کو دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور جب دوزخ والوں پر نظر پڑتی ہے تو ابوالبشر پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور رونے لگتے ہیں۔ (بخاری شریف صفحہ ۵۰) رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کے جنازہ کا واقعہ بھی آنحضرت ﷺ کی پیغمبرانہ شفقت کی ایک مثال ہے۔ قرآن حکیم میں بتا دیا گیا تھا کہ ایسے لوگوں کی مغفرت ہرگز نہیں ہوگی۔ آپ ان کے دعا کریں یا نہ کریں اگر آپ ستر مرتبہ ان کے لیے دعا مغفرت کریں گے تب بھی ان کی مغفرت نہیں ہوگی۔ (سورہ توبہ)

لیکن جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہو گیا تو آنحضرت ﷺ نے اس کے کفن کے لیے کرتا عنایت فرمایا اور جب ان کے لڑکے نے جو مومن مخلص تھے نماز پڑھانے کی درخواست کی تو آپ ﷺ نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جسارت کر کے آپ ﷺ کو روکا تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ میں دعا کروں یا نہ کروں۔ لہٰذا میں دعا کرنے کے پہلو کو اختیار کرتا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس کا جنازہ قبر سے نکلوا کر اس کا سر زانوئے مبارک پر رکھا۔ اس کے منہ میں لعاب مبارک ڈالا (بخاری شریف صفحہ ۱۶۹) ایک طرف اس رئیس المنافقین کا کفر و نفاق اور وہ سازشیں ہیں جو یہ منافق اعظم آنحضرت ﷺ کے خلاف کرتا رہا۔ دوسری جانب سید الانبیاء کی یہ تڑپ کہ کسی طرح اس کی نجات ہو جائے۔ شاید دعا کرنا ہی کچھ فائدہ دے دے۔ شاید لعاب دہن سے کوئی فائدہ پہنچ جائے۔

(۴۳۵) ترمذی شریف باب مناقب عمر رضی اللہ عنہ

(۴۳۶) بخاری شریف صفحہ ۵۶۶

(۴۳۷) آپ کے اس ارشاد پر اہل نظر کے سامنے "سماع موتی" کا مسئلہ آ گیا۔ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ آپ ان بے

جان لاشوں سے خطاب فرما رہے ہیں۔ کیا یہ اسے سن رہے ہیں۔ ارشاد ہوا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میری بات کو تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے ہو۔ امام تفسیر حضرت قتادہ رحمۃ اللہ نے اس کی توجیہہ یہ کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات سن لیں۔ توبیخاً و تصغیراً نقمةً وحسرة وندمًا بخاری شریف صفحہ ۵۶۶

(۴۳۸) سیرۃ ابن ہشام

(۴۳۹) والعالیہ۔ قبا، وخطمہ، ووائل وواقف وبنو اُمیہ بن زید، قریظہ والنضیر ۔طبقات ابن سعد صفحہ ۱۲ ج ۳ ذکر غزوہ بدر۔

(۴۴۰) ابن سعد صفحہ ۱۲ ج ۳

(۴۴۱) البدایہ والنہایہ صفحہ ۳۰۴ ج ۳

(۴۴۲) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۹۵ چیچک سے عرب بہت گھبراتے تھے۔ چیچک کے مریض کے پاس نہیں جاتے تھے۔ چنانچہ ابولہب کو بھی اس کے لڑکوں نے الگ ڈال دیا اور جب مر گیا تو اس کی لاش کھینچ کر گڑھے میں ڈال دی۔ اس طرح کتے کی موت سے بھی زیادہ ذلیل موت سے مرا۔ (معاذ اللہ)

(۴۴۳) زمعہ۔ عقیل اور حارث۔ ابن ہشام صفحہ ۳۹۵ ج ۱

(۴۴۴) هكذا في الاصل ولعله لاتنسي الواحد المونث المخاطب من بحث التهي والمفهوم بكيهم جميعا ولا تنسي سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۹۵ ج ۱

(۴۴۵) ترجمہ لفظی ہے۔ ہمارے سوا کسی کالے سر والوں کے لیے غنیمت حلال نہیں کی گئی۔ (درمنثور وابن کثیر وغیرہ)

(۴۴۶) غزوۂ بدر کے موقع پر جو رعب ڈالا گیا اس کا تذکرہ نص قرآنی میں موجود ہے۔ سالقی فی قلوب الذین کفرو الرعب

(۴۴۷) بخاری شریف صفحہ ۴۸ ج ۱

(۴۴۸) بخاری شریف صفحہ ۴۳۲

(۴۴۹) ابن ابی شیبہ وابن جریر ومردویہ بحوالہ درمنثور صفحہ ۱۵۸ ج ۳

(۴۵۰) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۹۶

(۴۵۱) سیرۃ حلبیہ صفحہ ۲۱۴

(۴۵۲) مسند احمد، ابن مردویہ، ابن ابی شیبہ وترمذی وغیرہ بحوالہ تفسیر مظہری صفحہ ۱۱۱ ج ۴

(۴۵۳) بخاری شریف وغیرہ

(۴۵۴) ابن اسحاق و بدایہ ونہایہ صفحہ ۲۹۹ ج ۳

(۴۵۵) ابن اسحاق و بدایہ ونہایہ صفحہ ۲۹۶ ج ۳

(۴۵۶) سیرت حلبیہ صفحہ ۲۱۴ ج ۳

(۴۵۷) اخرجه الحاكم وصححه وابنمردويه والبيهقي في سننه عن علي رضی اللہ عنہ وعبدالرزاق مصنفه وابن ابي شيبه عنبي عبيدة رضی اللہ عنہ درمنثور صفحہ ۲۰۲، جلد ۴۔

(۴۵۸) یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھانجے تھے۔ والدہ کا نام ہالہ تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی درخواست پر ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رشتہ منظور فرمایا تھا۔ میاں بیوی کے تعلقات نہایت خوشگوار رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت ابوالعاص کی شرافت ومروت کی تعریف کیا کرتے تھے۔ یہ نکاح نبوت سے پہلے ہو گیا تھا۔ اسی زمانہ میں دوسری صاحبزادی کا نکاح ابولہب کے لڑکے عتبہ سے ہوا تھا۔ مگر ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ابولہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت شروع کر دی اور لڑکے سے کہا کہ بیوی کو طلاق دے دے۔ لڑکے نے طلاق دے دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صاحبزادی کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ اس طرح جگر گوشہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم دشمن خدا

ابولہب کے لڑکے سے محفوظ رہیں۔

حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ پر بھی زور ڈالا گیا کہ وہ حضرت زینب کو طلاق دے دیں مگر آپ نے انکار کر دیا۔ (سیرۃ ابن ہشام وغیرہ)

(۴۵۹) سیرۃ ابن ہشام وغیرہ۔

(۴۶۰) بطن یا جج (ابن ہشام)

(۴۶۱) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۴۰۰ ج ا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کو اپنی انگوٹھی دے دی تھی۔ انہوں نے ایک چرواہے کے ذریعے وہ انگوٹھی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچا دی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا انگوٹھی دیکھ کر ان کے پاس آ گئیں اور یہ دونوں صاحب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ لے آئے۔ مگر یہ افسانہ بظاہر غلط ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی اس وقت بنوائی اور استعمال فرمائی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہان عجم کو دعوت نامے بھیجے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ مہر کے بغیر کوئی تحریر بادشاہوں کے یہاں قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ یہ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ھ کے بعد کی بات ہے۔

(۴۶۲) استو صفوا بالا ساری خیراً۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۹۴

(۴۶۳) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۹۴

(۴۶۴) سیرۃ حلبیہ صفحہ ۲۱۹ ج ۲

(۴۶۵) بخاری شریف صفحہ ۴۴۲ وغیرہ۔

(۴۶۶) سیرۃ حلبیہ صفحہ ۲۲۲

(۴۶۷) ابن ہشام صفحہ ۳۹۶ ج ا و صفحہ ۳۹۷

(۴۶۸) سیرۃ حلبیہ صفحہ ۲۰۷

(۴۶۹) سورہ بقرہ و یونس وغیرہما

(۴۷۰) درمنثور وغیرہ تحت قولہ تعالیٰ ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللّٰہ کذبا او قال او حی الی ولم یوح الیہ شی (سورہ انعام)

(۴۷۱) اسطرح کا استثنا صرف بنو ہاشم کے لیے نہیں تھا بلکہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے ابوالبختری کے متعلق بھی یہی فرمایا تھا کہ اس کو قتل نہ کیا جائے مگر بدقسمتی اس کے سر پر سوار تھی وہ اس استثنا سے مستفیض نہ ہو سکا۔ اسی طرح جب اسیران جنگ کے متعلق آپ نے اعلان فرمایا کہ بلا فدیہ کسی کو نہ چھوڑا جائے تو آپ نے سہیل بن بیضاء کو مستثنیٰ کر دیا تھا۔ کیونکہ آپ سے عرض کیا گیا تھا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہیں۔ مسند احمد بحوالہ بدایہ ونہایہ، صفحہ ۲۹۸، جلد ۳۔ حضرت سہیل بن بیضاء کی طرح حضرت عباس بھی مستثنیٰ کیے جا سکتے تھے کیونکہ اسلام کی طرف میلان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کا واقعہ ایک نہیں بلکہ بہت سے واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباس یقین رکھتے تھے کہ قرآن حکیم کلام اللہ ہے۔ خاص اسی زمانہ اسارت کا واقعہ جملہ مؤرخین اور اصحاب سیرت نے نقل کیا ہے کہ جب معرکہ میں مسلمانوں کو فتح ہوگئی اور کفار بھاگ گئے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ابوسفیان کے قافلہ پر حملہ کر دیا جائے جو ابھی تک مکہ نہیں پہنچا اور سمندر کے کنارے سفر کر رہا ہے تو حضرت عباس نے جو تسموں سے بندھے ہوئے تھے، پکار کر کہا کہ ایسا نہ کر۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے ایک جماعت کا وعدہ کیا تھا کہ اس پر آپ کو فتح ہوگی۔ چنانچہ فتح ہوگئی۔ دوسری جماعت کے متعلق اللہ کا وعدہ نہیں ہے۔ چنانچہ عباس کا یہ مشورہ مسلمانوں نے قبول کیا اور ابوسفیان کے قافلہ کا خیال چھوڑ دیا۔ بہرحال وہ یقیناً اس کے مستحق تھے کہ ان سے فدیہ نہ لیا جائے مگر فرق یہ تھا کہ سہیل بن بیضاء رشتہ دار نہیں تھے اور حضرت عباس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم تھے۔ چچا سے نہ صرف یہ کہ فدیہ لیا گیا بلکہ زیادہ سے زیادہ لیا گیا اور ایک کے بجائے دو فدیے وصول کیے گئے۔ ایک ان کا دوسرا عقیل کا۔ (رضی اللہ عنہما)

(۴۷۲) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۸۳ ج ا

(۴۷۳) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۹۴ ج ا

(۴۷۴) بیہقی بحوالہ بدایہ ونہایہ صفحہ ۳۰۷ ج ۳

(۴۷۵) تمذین لا یسترقون ولا یتطیرون ولا یکتوون وعلی ربھم یتوکلون بخاری شریف صفحہ ۱۵۰ وصفحہ ۱۵۶ وغیرہ

(۴۷۶) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۸۸۔ وبیہقی وغیرہ

(۴۷۷) مردم شناسی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخصوص خصوصیت تھی۔

(۴۷۸) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۴۰۵ ج ۱

(۴۷۹) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ارشاد بھی یہی ہے۔ مگر مودودی صاحب نے کوئی تحقیق پیش نہیں کی بلکہ سراسر تقلید کی ہے۔ مگر افسوس تقلید صرف تردید میں کی انداز تردید میں تقلید سے محروم رہے۔ انداز تردید میں اگر مودودی صاحب علامہ کی تقلید کر لیتے تو اس طرح تہذیب واحترام کے عنوان سے محروم نہ رہتے۔ علامہ شبلی کے الفاظ ملاحظہ ہوں جو سیرۃ النبی صفحہ ۔۔ کے حوالہ سے اگلے صفحہ پر نقل کیے گئے ہیں کس قدر مہذب، شائستہ اور ادیبانہ ہیں۔ دوسری طرف حضرت مودودی صاحب کا تحکم ملاحظہ ہو۔ تحریر ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنگ بدر کے بیان میں تاریخ وسیرت کے مصنفین نے ان روایات پر اعتماد کر لیا ہے جو حدیث اور مغازی کی کتابوں میں وارد ہوئی ہیں لیکن ان روایات کا بڑا حصہ قرآن کے خلاف ہے اور قابل اعتماد نہیں ہے۔ صفحہ ۱۳۶ تفہیم القرآن جلد ۲ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ علامہ نے اپنی تحریر میں حدیث کا نام نہیں لیا۔ مودودی صاحب کو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ اللہ ''پرخاش'' ہے۔ ان کو بہانہ ملنا چاہیے پھر حدیث کو ان کے حملہ کی زد سے کون بچا سکتا ہے۔

(۴۸۰) حضرت علامہ ارباب تفسیر کا بھی اضافہ فرما دیتے تو بہتر تھا کیونکہ حضرات مفسرین نے بھی وہی تحریر فرمایا ہے جو عام مؤرخین اور ارباب سیر کی تحقیق ہے۔

(۴۸۱) یہاں مودودی صاحب کا حسن سلیقہ قابل ملاحظہ ہے۔ اس آیت کی تشریح میں علامہ کے الفاظ یہ ہیں۔ یہ بھی مسلم ہے کہ صحابہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے۔ اب مودودی صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں جو امام وقت بننے کے خواہشمند ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نمبر ۲ پر اپنا ہی درجہ رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے نفرت انگیز الفاظ یہ ہیں۔ مصلحت پرست لوگ جو اگرچہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے مگر ایسے ایمان کے قائل نہ تھے جس سے جان ومال کا زیاں ہو۔ تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۳۶
ہمیں امامت کے اس آرزومند سے زیادہ ان پر تعجب ہے جو دعویٰ ایمان کامل کے ساتھ اس کی امامت کے سامنے گردن جھکاتے ہیں۔
نعوذ باللہ من شرور انفسنا

(۴۸۲) سیرۃ النبی صفحہ ۲۹۴ طبع سوم ج ۱

(۴۸۳) خود حضرت علامہ نے تحریر فرمایا لیکن ان نوخیز صحابہ نے جو جنگ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے۔ سیرۃ النبی صفحہ ۳۴۲ طبع سوم ج ۱
یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ اصرار کرنے والے چند نہیں ہوں گے بلکہ زیادہ تر یہی ہوں گے۔ ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رائے نہ بدلتے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ صحابہ کی ایک جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کر رہی تھی کہ مدینہ میں رہ کر ہی مقابلہ کرنا چاہیے باہر نہ نکلنا چاہیے۔ ابن سعد ابن ہشام وغیرہ۔

(۴۸۴) لقد نصرکم اللّٰہ ببدر وانتم اذلہ

(۴۸۵) ملاحظہ ہو سلسلہ غزوات صفحہ ۲۸۲ تا ۲۹۰ طبع سوم

(۴۸۶) سیرۃ النبی جلد اوّل صفحہ ۳۲۷ طبع سوم

(۴۸۷) بے موقع نہ ہوگا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشہور ارشاد کی طرف بھی توجہ دلائی جائے لا تتمنوا لقاء العدو ولکن اذا لقیتم فاثبتوا (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم) (صحاح) دشمن سے مڈبھیڑ کی آرزو مت کرو۔ البتہ جب مقابلہ ہو تو جم کر مقابلہ کرو۔

(۴۸۸) مثلاً مسند احمد وغیرہ کے حوالہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے۔ صفحہ ۳۲۶ ج ا
اس روایت کے غیر مربوط جملے خود شہادت دے رہے ہیں کہ اس کے ابتدائی حصہ میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے بعد معرکہ بدر کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مگر وہ اس موقع پر خارج از بحث تھا اس لیے علامہ نے اس حصہ کو نقل بھی نہیں کیا صرف حوالہ دے دیا۔ اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت (صفحہ ۳۲۴ و صفحہ ۳۲۵) کا ایک حصہ حضرت علامہ نے لیا۔ دوسرا حصہ جو مولانا کے مخالف تھا اس کی عجیب سی تاویل کر دی۔ ہم اس روایت کے متعلق حاشیہ میں تبصرہ کر چکے ہیں جہاں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی تقریر نقل کی گئی ہے۔ اسی طرح دلیل (۱) (۲) صفحہ ۳۲۷ کے جوابات بھی حاشیہ میں آ چکے ہیں۔ دلیل نمبر ۳ کا جواب واقعات روانگی کے سلسلہ میں پہلے آ چکا ہے۔ کچھ قریش کی روانگی کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔ دلیل (۴) کا مدار صرف حضرت سعد بن عبادہ کے نام پر ہے جو یقیناً راوی کی غلطی ہے (۵) میں سابق بحث کو پھر دہرایا (۶) کا جواب بھی پہلے آ چکا ہے کہ یہ سفر غیر معمولی تھا اس لیے بچوں کو واپس کر دیا۔ (۷) میں خود یہ الفاظ موجود ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو قافلہ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ صفحہ ۳۳۱

(۴۸۹) مثلاً آیت کریمہ لا یستوی القاعدون کے شان نزول سے متعلق روایت سے استدلال کیا ہے اور بخاری شریف کا حوالہ دے دیا ہے۔ صفحہ ۳۲۲۔ بخاری شریف میں یہ روایت ضرور ہے مگر اس میں یہ کہاں ہے کہ جب بدر کا معرکہ پیش آ رہا تھا اور لوگ مدینہ سے روانہ ہو رہے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو تین بزرگوں سے نقل کیا ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پہلے دونوں بزرگوں کی روایت میں ''بدر'' کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بدر کا تذکرہ ہے مگر اس میں عبداللہ بن مکتوم کا تذکرہ نہیں ہے اور فی الواقع یہ حدیث ہے ہی نہیں بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تفسیر فرمائی ہے کہ قاعدون سے مراد قاعدون عن البدر ہیں۔ تعجب ہے حضرت علامہ کو یہ مغالطہ کیسے ہو گیا۔

(۴۹۰) ذکر الامام الدوانی انه سمع من مشائخ الحدیث ان الدعا عند ذکرھم مستجاب وقد جرب ذلك۔ سیرۃ حلبیہ صفحہ ۱۶۳ ج ۲

(۴۹۱) سیرۃ حلبیہ صفحہ ۱۶۳ ج ۲

(۴۹۲) بدایہ و نہایہ صفحہ ۲۷۷ ج ۳

(۴۹۳) بخاری شریف وغیرہ

(۴۹۴) البدایہ و نہایہ صفحہ ۲۷۴ ج ۳

(۴۹۵) ابن سعد نے اگرچہ شہداء کی تعداد ۱۴ تحریر کی ہے مہاجر ۶، انصار ۸ مگر نام صرف ۱۳ شمار کرائے ہیں۔ (صفحہ ۱۱ ج ۳) حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے چودھواں نام ذوالشمالین کا تحریر کیا ہے۔ ان کا اصل نام عمیر تھا۔ ان کو خرباق بھی کہتے تھے۔ قبیلہ خزاعہ سے ان کا تعلق تھا۔ یہ قبیلہ سلیم بن عکان کا بطن تھا۔ اس لیے ان کو سلیمی بھی کہتے تھے۔ چونکہ انکے ہاتھ لانبے تھے تو ان کو لوگ ذوالشمالین کہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خطاب ذوالشمالین کے بجائے ذوالیدین تجویز فرمایا۔ احادیث میں یہ دونوں نام آتے ہیں۔ واللہ اعلم

(۴۹۶) بخاری شریف صفحہ ۵۷۴

(۴۹۷) ماخوذ از بدایہ و نہایہ صفحہ ۳۱۵ ج ۳ بحوالہ کتاب الاحکام الکبیر للحافظ ضیاء الدین محمد بن عبدالواحد مقدسی وغیرہ۔

(۴۹۸) چند ناموں کے متعلق اختلاف ہے۔ اسی وجہ سے تعداد تین سو تیرہ سے بڑھ جاتی ہے۔ مگر ہم نے اختلاف کو نظر انداز کر دیا ہے۔ نام کو خارج نہیں کیا کیونکہ اختلاف صرف بدری ہونے میں ہے۔ مثلاً حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں شریک تھے یا نہیں صحابی ہونے میں اختلاف نہیں ہے اور ہر ایک صحابی کا نام نامی بابرکت ہے۔

(۴۹۹) ابن سعد یا حافظ ابن کثیر نے جن کے متعلق مہاجر ہونے کی تصریح کر دی ہے ان کے سامنے (مہاجر یا مہاجرین و ذمتین میں سے) لکھ دیا ہے لیکن ان کے علاوہ بھی چند مہاجر ہیں۔ ان کی تصریح اس موقع پر آئے گی جب ان بزرگوں میں سے ہر ایک کے حالات

علیحدہ علیحدہ درج کیے جائیں گے۔(انشاءاللہ)

(۵۰۰) راستہ میں چوٹ لگ گئی تھی اس وجہ سے غزوہ میں شریک نہ ہو سکے۔ مگر شریک کی حیثیت دی گئی۔

(۵۰۱) واقدی کی روایت یہ ہے کہ تیاری مکمل کر لی تھی مگر تشریف نہیں لے جا سکے۔ وفات ہو گئی۔(بدایہ صفحہ ۳۱۹)

(۵۰۲) ان الله اصطفی نوحًا وال ابراهیم الاٰیۃ سورۂ انعام

(۵۰۳) ڈرانے والا خواہ نبی ہو خواہ نبی کی راہ پر ہو۔ موضح القرآن

(۵۰۴) حالانکہ یہ دعویٰ سراسر غلط تھا۔ قرآن حکیم نے اس کی تردید کی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ ان کو دھوکا لگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ قتل نہیں کر سکے۔ بلکہ اللہ نے ان کو اُٹھا لیا۔ ملاحظہ فرمایئے سورہ نساء رکوع ۲۲

(۵۰۵) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے عہدِ زریں حصہ اوّل صفحہ ۳۴ تا ۳۶

(۵۰۶) کذالك جعلنا کم امته وسطا (الاية) سورہ بقرہ رکوع ۱۷

(۵۰۷) سیّدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں اگر نمونہ یہود خواہی کہ بینی۔ علماء سو کہ طالب دُنیا باشند خوگرفتہ بہ تقلید سلف۔ ومعرض از نصوص کتاب وسنت وتعمق وتشدد یا استحسان عالمے را مستند ساختہ از کلام شارع معصوم بے پرواشدہ باشند واحادیث موضوعہ وتاویلات فاسدہ را مقتداء خود ساختہ باشند تماشا کن۔ کانهم هم الفوز الکبیر (مطبع مجتبائی) صفحہ ۱۰

(۵۰۸) وحی الٰہی کا جواب یہ ہے بل لعنهم الله بکفرهم سورہ بقرہ ع ۱۱ یعنی یہ حق پرستی کی پختگی نہیں ہے جس کے بھروسے میں وہ پڑے ہوئے ہیں بلکہ خدا کی پھٹکار ہے کہ وہ حق وصداقت کے سراسر انکار کے باعث قبول حق کی استعداد وصلاحیت کھو چکے ہیں۔

(۵۰۹) ترمذی شریف وصحیحین وتفسیر مظہری سورہ زمر۔ قرآن حکیم نے لیس کمثله شي جیسی تصریحات کی تعلیم دے کر ان تمام تصورات کی نفی کر دی ہے۔ یعنی عالم امکان کی کسی بھی چیز سے حضرت حق جل مجدہ کو تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ اس کی ذات ورا ء الوراء اور بے چون اور بے چگون ہے۔ ہر ایک مشابہت سے بلند و بالا۔

(۵۱۰) قرآن حکیم نے اس کی تردید فرمائی ہے۔ ارشاد ہے ولقد خلقنا السموات والارض فی سته ایام وما مسنا من لغوب (سورۂ قاف) یعنی یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ روز (چھ دوروں) میں زمین وآسمان پیدا کیے۔ مگر یہ قطعاً غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) کسی قسم کا کوئی تھکان ہو گیا تھا۔

(۵۱۱) اتحد ثونهم بما فتح الله علیکم الاية (تفصیل آگے آئے گی) انشاءاللہ

(۵۱۲) یہ تنگ نظری اور گروہ پرستی عیسائیوں نے بھی اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ دونوں کہا کرتے تھے لن یدخل الجنة الا من کان هودًا او نصاریٰ (سورہ بقرہ ع ۱۴) یہودی کہتے تھے کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور عیسائی کہتے تھے کہ صرف عیسائی جنتی ہوں گے۔

(۵۱۳) ترمذی شریف۔ باب فیما جاء فیمن وضح راسه بصخره و بخاری صفحه ۳۲۵

(۵۱۴) جیسا کہ کعب بن اشرف کے واقعہ قتل کے بیان میں اس کی تفصیل آئے گی۔(انشاءاللہ)

(۵۱۵) ان الذین یکتمون ما انز الله من الکتاب ویشترون به ثمنا قلیلا الاية (سورہ بقرہ ع ۲۰)

ترجمہ: جو لوگ ان حکموں کو جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کیے ہیں چھپاتے ہیں اور اس (کتمان حق) کے بدلے دنیا کے حقیر فائدے خریدتے ہیں تو یقین کرو یہ لوگ وہ ہیں جو آگ کے شعلوں سے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔

(۵۱۶) یحرفون الکلم عن مواضعه سورہ مائدہ ع ۳ احکام کو ان کی اصلی جگہ سے پھیر دیتے ہیں۔

(۵۱۷) (الف) لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل الله اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کے علماء ومشائخ (درویشوں) میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق اور ناروا طریقوں سے کھاتے ہیں (اور اس غرض سے کہ انکی یہ مدنی

قائم رہے) لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔
(ب) فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا (سورہ بقرہ ع ۹) پس افسوس ان پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں۔ پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں کہ اس کے بدلے میں ایک حقیری قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کریں۔
(۵۱۸) خاص طور پر ملاحظہ فرمایئے ص ۷۰ تا ص ۷۶ حصہ اوّل
(۵۱۹) اے انسانو! میں تم سب کو خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔
(۵۲۰) اس کی مثال خود یہودیوں میں پائی گئی۔ یہود کا مشہور عالم حضیر جس کی کنیت ابو یوسف تھی اپنے باغ میں پھل توڑ رہا تھا جھولا ہاتھ میں تھا جس میں کچھ تازہ کھجور گھر لے جانے کے لیے ڈالے تھے کہ اس کو خبر پہنچی کہ محمد ﷺ مدینہ میں رونق افروز ہو گئے۔ یہ اسی طرح جھولا ہاتھ میں لیے ہوئے بھاگا اور مجلس مبارک میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی صورت اور آپ ﷺ کے رنگ ڈھنگ کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی تنقیدی نظر کی پہلی شہادت یہ تھی لیس ھذا الوجہ وجہ کذاب یہ چہرہ ایسا ہے کہ جھوٹے آدمی کا چہرہ ایسا نہیں ہوتا۔ وہ قریب پہنچا تو اس نے سنا آپ ﷺ ارشاد فرمار ہے ہیں ایھا الناس افشوا لسلام۔ واطعمو الطعام وصلوا الارحام وصلوا باللیل والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام اے لوگو! آپس میں سلام کو رواج دو (جس سے میل ملاپ بڑھے گا۔ یک جہتی پیدا ہوگی) کھانا کھلاؤ (غریبوں کی مدد کرو) رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ رات کو نماز پڑھو (آخر شب میں عبادت اور مناجات کرو) جب کہ لوگ سو رہے ہوں۔ تم جنت میں سلامتی سے داخل ہو جاؤ گے (اتحاد و اتفاق تعاون باہمی، خدمت خلق رشتہ داروں کی خدمت اور یاد خدا بلکہ عابدانہ زندگی کی تلقین ایک ہی ساتھ)
اس پہلی نظر اور پہلی ملاقات سے ہی یہ یہودی عالم متاثر ہو گئے۔ پھر (دوسرے وقت) حاضر ہوئے۔ توریت کی پیشین گوئیوں کے بموجب جب کچھ باتیں معلوم کیں وہ صحیح پائیں۔ اب لیت ولعل کی گنجائش نہیں رہی۔ فوراً مسلمان ہو گئے۔ یہ آپ کی زندگی میں ایسا انقلاب تھا کہ پھر سابق نام باقی رکھنا بھی پسند نہیں کیا۔ حضیر ابو یوسف کے بجائے نام عبداللہ تجویز کیا اور کنیت سلام۔ چنانچہ مسلمان آپ کو عبداللہ بن سلام کے نام نامی سے پہچانتے ہیں۔ بخاری شریف ص ۵۶۱ و ص ۵۶۱ ترمذی و فتح الباری اسی طرح کا واقعہ سلمان فارسی کا بھی ہے۔ (محشی)
(۵۲۱) بہتان تراشی اور غلط پروپیگنڈے کی اس قوم کو کہاں تک عادت ومہارت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام جب مسلمان ہوئے تو آپ نے اپنے اسلام کے اعلان سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ یہود میں ان کی جو حیثیت ہے خود یہودی زبان سے اس کا اعتراف کرالیں۔ آنحضرت ﷺ جیسے ہی مدینہ پہنچے اور عبداللہ بن سلام آپ کی زیارت سے مشرف ہوئے تو آنحضرت ﷺ کی صداقت دل میں بیٹھ گئی لیکن آنحضرت ﷺ اس علاقہ میں نو وارد تھے۔ یہود کی خصلتوں کا آپ کو تجربہ نہیں ہوا تھا۔ عام طور پر ان کے متعلق حسن ظن تھا۔ مگر عبداللہ بن سلام گھر کے بھیدی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے مسلمان ہونے پر جماعت یہود میں کھلبلی پڑ جائے گی اور وہ غلط پروپیگنڈے کا حربہ ایسی قوت سے استعمال کریں گے کہ ممکن ہے عبداللہ بن سلام آنحضرت ﷺ اور آپ کے مہاجر رفقاء کی نظر میں بھی مشتبہ ہو جائیں۔ پھر عبداللہ بن سلام نہ دین کے رہیں گے نہ دنیا کے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام نے یہ ہوشیاری کی کہ آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ اس سے پہلے کہ میرے اسلام کا اظہار ہو سرور کائنات ﷺ یہود کے عمائدین سے معلوم کرلیں کہ عبداللہ بن سلام کے متعلق ان کے خیالات کیا ہیں۔ چنانچہ آپ نے یہود کے عمائدین کو بلایا۔ وہ حاضر ہوئے حضرت عبداللہ بن سلام آڑ میں چھپ گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ حضیر (عبداللہ بن سلام کا یہودی نام) آپ کے آدمی ہیں ان کے متعلق آپ صاحبان کے کیا خیالات ہیں۔ عمائدین یہود نے جواب دیا ہمارے سردار اور بہت بڑے عالم ہیں ان کے والد بزرگوار بھی بہت بڑے سردار اور بہت بڑے عالم تھے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ جملے ان سے تین دفعہ کہلوائے۔ پھر فرمایا آپ صاحبان کا کیا

خیال ہے اگر وہ مسلمان ہو جائیں۔ عمائدین یہود نے جواب دیا معاذ اللہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر یہ ہو جائے۔ عمائدین یہود نے کہا ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ آپ نے فرمایا اگر ہو جائے۔ عمائدین یہود نے پھر کہا ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سلام کو آواز دی۔ وہ سامنے حاضر ہوئے اور فرمایا اے عمائدین یہود تم جانتے ہو اور خوب جانتے ہو کہ یہ اللہ کے سچے رسول ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سچا کلام لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ تم خدا سے ڈرو اور ایمان لے آؤ۔ عمائدین یہود نے جیسے ہی یہ سنا فوراً پلٹ گئے اور اسی منہ سے کہنے لگے تم جھوٹے ہمیشہ کے جھوٹے تمہارا باپ بھی ایسے ہی جھوٹے تھے ہمیشہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ اب اسی جماعت نے (معاذ اللہ) ان کے جھوٹے ہونے کا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ (بخاری شریف صفحہ ۵۵۶ وغیرہ)

(۵۲۲) یہ جنگ بعاث کے نام سے مشہور ہے۔ بعاث قلعہ کا نام تھا ایک سو بیس برس تک اس جنگ کا سلسلہ چلتا رہا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس لڑائی میں اگر چہ یہ سخت ترین حادثہ بھی پیش آیا کہ دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے لوگ مارے گئے مگر یہ حادثہ ان قبیلوں کے لیے باعث خیر بھی ہوگیا کہ باقی ماندہ لوگوں کی توجہ دعوت اسلام کی طرف منعطف ہوئی اور انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ وہ بڑے لوگ اگر زندہ ہوتے تو ممکن تھا وہ بھی اپنے عظمت کے غرور میں مبتلا رہتے اور دعوت اسلام کے سامنے ان کی گردنیں نہ جھکتیں۔ (بخاری شریف ص ۵۳۳)

(۵۲۳) نحن ابناء الله واحبائه (سورہ مائدہ ع ۳)

(۵۲۴) لن يدخل الجنة الا من كان هودا او نصارى (سورہ بقرہ ع ۱۳)

(۵۲۵) حدیث کے الفاظ یہ ہیں کان النبی ﷺ يحب موافقة اهل الكتاب فيما لم يومر فيه بخاری شریف ص ۷-۹ یعنی جن باتوں میں آنحضرت ﷺ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوتا تھا ان میں اہل کتاب کی موافقت آپ پسند فرماتے تھے۔ حدیث میں "اہل کتاب" کا لفظ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نہ صرف توریت بلکہ حاملین توریت پر بھی اعتماد کرتے تھے کہ توریت کی کسی آیت سے معلوم کرنے کے بجائے اہل توریت کے عمل کو اپنا طریقہ کار بنا لیتے تھے۔

(۵۲۶) قسطلانی وعینی شرح بخاری

(۵۲۷) بخاری شریف ص ۴۸۵

(۵۲۸) علامہ سیوطی نے اپنی تصنیف (توشیح) میں ایسی سات چیزیں شمار کرائی ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے پہلے اہل کتاب کا طریقہ اختیار کرایا پھر اس کو ترک فرمایا ① سیدھے بال رکھنا، پھر مانگ نکالنا ② پہلے آپ خضاب پسند نہیں فرماتے تھے پھر آپ نے پسند فرمایا اور جیسا کہ بعض احادیث میں وارد ہے خود آپ نے بھی خضاب فرمایا ③ صرف عاشورا یعنی فقط ۱۰ محرم کا روزہ پھر آپ نے فرمایا پہلے یا بعد میں ایک روزہ اور رکھا جائے ④ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا پھر کعبہ کی طرف ⑤ حائضہ سے ترک مخالطت کا حکم پھر صرف مجامعت کی ممانعت اس کے علاوہ مخالطت کی اجازت ⑥ تنہا یوم جمعہ کا روزہ پھر اس کی ممانعت اور یہ ہدایت کہ جمعہ کا روزہ رکھنا ہو تو جمعرات یا شنبہ کا بھی روزہ رکھ لیا جائے ⑦ جنازہ کے لیے کھڑا ہونا پھر اس کو ترک کر دینا۔

(۵۲۹) بخاری شریف ص ۵۰۳ لیکن بعد میں یہ طریقہ نہیں رہا۔ آپ مانگ نکالا کرتے تھے۔ چنانچہ جس کے سر پر پٹھے ہوں اس کے لیے سنت یہی ہے کہ بیچ میں مانگ نکالے۔ ثم فرق رسول الله ﷺ بعد بخاری شریف ص ۵۰۳

(۵۳۰) بخاری شریف ص ۴۸۱ وقال الله تعالىٰ فبهداهم اقتده

(۵۳۱) بخاری شریف ص ۲۰ (وغیرہ)

(۵۳۲) یہ مفہوم ہے اس معاہدہ کی دفعات کا جو آنحضرت ﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلی فرصت میں کیا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے اسی حصہ کے صفحات ۳۸۱-۳۷۹ (۱۷-۱۵)

(۵۳۳) سورہ نساء رکوع ۷

(۵۳۴) آنحضرت ﷺ کا کوئی ارشاد ہوتا۔ مسلمان کہتے سمعنا واطعنا ہم نے حکم سنا اور اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ یہودی اسے اس طرح ادا کرتے کہ اطعنا عصینا ہو جاتا۔ یعنی ہم نے کلام سنا اور خلاف ورزی کی (ہم تعمیل کے لیے تیار نہیں ہیں) اسمع کے معنے ہیں ہماری بات سنئے وہ اس کے ساتھ غیر مسمع بھی بڑھا دیتے جس کے معنے ایک تو یہ ہیں کہ خدا تمہیں بری بات نہ سنوائے۔ دوسرے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ بہرے ہو جاؤ۔ سورہ نساء رکوع ۷ یحرفون الکلم عن مواضعه الاية

(۵۳۵) تفسیر مظہری وغیرہ۔ تفسیر آیت ع ۹ سورہ آل عمران

(۵۳۶) یہ ہے سبق آموز حقیقت پسندی کہ یہود کے کچھ آدمی (سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے افراد) مسلمان ہو گئے ہیں تو تمام اہل کتاب پر الزام نہیں لگایا گیا بلکہ یہ فرمایا گیا کہ اہل کتاب میں ایک فریق ایسا ہے اسی طرح دوسری آیات میں بھی جہاں یہود کے افراد کا کوئی جرم بیان کیا گیا ہے حق پرست یہودیوں کو جو اسلام سے مشرف ہو چکے تھے مستثنٰی کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ ایسے صداقت پسندوں کی تعداد آٹے میں نمک جیسی تھی۔

(۵۳۷) بخاری شریف ص ۵۱۳ و ۶۵۴ و ۱۰۱۱ وغیرہ ابوداؤد شریف باب فی رجم الیھودیین

(۵۳۸) حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق منافقین یہود سے ہے آپ فرماتے ہیں وہ جو ان میں منافق تھے خوشامد کے واسطے اپنی کتاب میں سے پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی باتیں مسلمانوں کے پاس بیان کرتے اور وہ جو مخالف تھے ان کو اس پر الزام دیتے کہ اپنے علم میں سے ان کے ہاتھ کیوں سند دیتے ہیں۔ (موضح القرآن)

(۵۳۹) ان میں سے ایک گروہ اعتدال پسند (راہ راست پر) ہے اور زیادہ تر ایسے ہیں کہ جو کچھ کرتے ہیں وہ برائی ہی برائی ہے۔

(۵۴۰) ابوداؤد شریف باب فی خبر النضیر وابن مردویہ بحوالہ فتح الباری ص ۲۶۴ ج ۷ وقال الحافظ ابن الحجر ماروی ابن مردويه اسناده صحيح

(۵۴۱) آیت کریمہ کی پوری تشریح غزوہ بدر کے بیان میں گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دو جماعتیں جو آپس میں (بدر کے موقع پر) بھڑی تھیں ان میں قدرت خدا کی یہ نشانی موجود ہے کہ نصرت خداوندی نہ دولت وثروت کی پابند ہے نہ کثرت عدد اور کثرت ساز و سامان کی۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی مدد اور نصرت اور اپنی مدد سے نواز دیتا ہے۔ (خواہ وہ کتنا ہی بے سروسامان اور بے یار و مددگار ہو)

(۵۴۲) ان پر ذلت اور خواری کا ٹھپہ لگا دیا تھا۔

(۵۴۳) چونکہ اوس اور خزرج کی کافی تعداد دائرہ اسلام میں داخل ہو چکی تھی لہٰذا مسلمانوں کے خاتمہ کے ساتھ یہ قبیلے بھی ختم ہو جاتے اور میدان صاف ہو جاتا۔ تھوڑی سی تعداد منافقین کی رہ جاتی جس میں مقابلہ کی نہ طاقت رہتی نہ جرأت۔ کیونکہ یہ بزدل اور بے عمل لوگوں کی جماعت تھی۔

(۵۴۴) ابوداؤد شریف کیف کان اجلاء الیھود من المدینة

(۵۴۵) روایت میں بنونضیر کا نام ہے مگر جب تمام یہودیوں کا جذبہ یہی تھا تو دوسرے قبیلوں کو معصوم نہیں قرار دیا جا سکتا۔

(۵۴۶) فتح الباری ص ۲۶۵ ج ۷

(۵۴۷) السیرۃ الحلبیہ ص ۱۷۷ ج ۳

(۵۴۸) فتح الباری ص ۲۷۰ ج ۷

(۵۴۹) ان کی جاں نثاری کا قصہ بھی عجیب ہے۔ یہ نوجوان تھے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور ایسے گرویدہ ہوئے کہ قدم مبارک سے لپٹ لپٹ کر بوسہ دینے کی کوشش کرتے تھے اور کہتے تھے حضرت والا میں آپ پر فدا ہوں جو حکم ہوگا میں تعمیل میں کوتاہی نہ کروں گا جان تک قربان کر دوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ایسے جاں باز ہو تو جاؤ تمہارے باپ کافر ہیں انہیں مار آؤ۔

طلحہ بات کے سچے تھے فوراً قتل کے ارادہ سے روانہ ہوگئے۔آنحضرت ﷺ نے واپس بلالیا۔فرمایا میں اس لیے نہیں آیا کہ رشتہ داروں سے براسلوک کروں یا براسلوک کی فرمائش کروں۔صرف تمہاری بات کو آزمانا تھا(اصابہ)

(۵۵۰) انہوں نے خود آنحضرت ﷺ سے سنا تھا یہ درست نہیں ہے کہ مسلمان میت رات کو پڑی رہے اور اس کو دفن نہ کیا جائے۔لہٰذا اس کی تعمیل بھی ضروری سمجھی۔(اصابہ)

(۵۵۱) ایسا ہی کیا گیا۔ان کی وفات ہوگئی تو رات ہی کو نماز جنازہ ادا کر کے دفن کردیا گیا لیکن صبح کو جب آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ قبر پر تشریف لے گئے جو رفقاء آپ کے ساتھ تھے ان سب کے ساتھ ایک صف میں کھڑے ہوئے اور ہاتھ اُٹھا کر دعا فرمائی۔ **اللهم الق طلحته وانت تضحك وهو يضحك اليك** خداوندا طلحہ کو اس طرح اپنے دیدار سے نواز کہ تو بھی ہنستا ہو(راضی ہو)اور وہ بھی ہنستا ہو(راضی ہو) **ضروری وضاحت:** یہاں صرف دعا مغفرت اور ایصالِ ثواب نہیں ہے بلکہ صف کا بھی تذکرہ ہے اس کو آنحضرت ﷺ کی خصوصیت قرار دیا گیا ہے۔اسی طرح شاہ حبش (نجاشی) کی نماز غائبانہ کو بھی علماء احناف آنحضرت ﷺ کی خصوصیت قرار دیتے ہیں۔آنحضرت ﷺ کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔''ان صلواتك سكن لهم'' آپ کی صلوٰۃ مسلمانوں کے لیے سکون اور سراسر اطمینان ہے۔صلوۃ کے معنے نماز بھی ہیں اور دُعا بھی نیز آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ **ان هذه القبور مملوءة ظلمة وان الله ينورها بصلواتي عليهم** یہ شرف اور برکت و مقبولیت بجز آنحضرت ﷺ اور کسی کی دعا یا نماز کو حاصل نہیں ہے۔خود ذات ستودہ صفات کے لیے بھی ایک خصوصیت موجود ہے۔وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ نص قرآن کے بموجب ہر ایک مسلمان کے ولی ہیں۔یہ ولایت عامہ آپ کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔یہ بھی ایک خصوصیت ہی ہے کہ صف میں آنحضرت ﷺ برابر کھڑے ہوئے۔امام کی طرح آگے کھڑے نہیں ہوئے۔واللہ اعلم محمد میاں

(۵۵۲) طبقات ابن سعد ص ۱۹ ج ۳

(۵۵۳) بظاہر الزمہ ہے مرۃ کے معنے قوت کے آتے ہیں۔یہاں یہ معنی نہیں بنتے اور ذمہ کے معنے عہد کے ہیں۔**قال الله تعالیٰ لا يرقبوا فيكم الا ولا ذمه**

(۵۵۴) تاریخ کی شہادت ہے کہ عربوں کی تاریخی جنگ ''فجار'' کا آغاز بھی اسی طرح ایک خاتون کی بے حرمتی سے ہوا تھا۔

(۵۵۵) اسی دور میں متعدد واقعات بھی مسلمانوں کی طرف سے کبھی شریک معاہدہ غیر مسلموں کی طرف سے ہوئے۔ان میں دیت دی گئی جس کے سو اونٹ مقرر تھے۔آنحضرت ﷺ نے جو معاہدہ کیا تھا اس میں تصریح تھی کہ ایسے واقعات میں دیت دی جائے گی اور اسی قاعدے کے بموجب دی جائے گی جو پہلے سے رائج تھا۔

(۵۵۶) طبقات ص ۱۹ ج ۳

(۵۵۷) علامہ ابن سعد رحمہ اللہ نے اس اقدام کے جواز کے لیے قرآن پاک کی ہی آیت پیش کی ہے۔**وما تخافن من قوم خيانة فانبذا اليهم علي سواء ان الله لا يحب الخائنين** (سورہ انفال)

اگر تمہیں کسی قوم سے دغا کا خطرہ ہو تو معاہدہ لوٹا سکتے ہو لیکن یکسانیت کے ساتھ پہلے سے آگاہ کرکے تاکہ ان کو بھی تیاری کا موقع مل جائے اور آپ کا فعل دھوکا نہ سمجھا جائے۔

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر بنو قینقاع نے آغاز جنگ یا اعلان جنگ نہ بھی کیا ہوتا تب بھی آنحضرت ﷺ کے لیے جائز تھا کہ معاہدہ ختم کردیں۔کیونکہ انکی طرف سے جنگ کی تیاری بھی ہو رہی تھی اور اس کی دھمکی بھی دے دی گئی تھی لیکن اس کے بعد خود ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے **فكانوا اول من غدر من اليهود و حاربوا و تحصنوا في حصينهم** ص ۱۹ ج ۳ (ترجمہ) یہود میں یہ لوگ وہ تھے جنہوں نے سب سے پہلے غدر کیا اور جنگ کی اور اپنے قلعہ میں محفوظ ہوگئے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جنگ شروع کردی تھی۔اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے اقدام کیا۔اس طرح ابن سعد کے کلام میں تضاد اور تناقض ہو جاتا ہے مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ

ابن سعد نے دو باتیں بتائی ہیں۔ اوّل یہ کہ آیت کریمہ کی رو سے آنحضرت ﷺ کے لیے جائز ہوگیا تھا کہ معاہد ختم کر کے اعلان جنگ کردیں۔ دوم یہ کہ اگرچہ اقدام کے لیے وجہ جواز موجود تھی مگر اقدام آنحضرت ﷺ نے نہیں کیا۔ بلکہ پہل خود بنی قینقاع کی طرف سے ہوئی اور اسی وجہ سے وہ پہلے ہی قلعہ بند ہوگئے۔

(۵۵۸) ابن سعد ص ۱۹ ج ۳

(۵۵۹) سیرۃ ابن ہشام ص ۵۷ ج ۲

(۵۶۰) آنحضرت ﷺ نے کسی خدمت کے لیے کسی جماعت کو بھیجا تو اس کو سریہ کہا جاتا ہے۔

(۵۶۱) مثلاً حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اور ان کا خاندان۔

(۵۶۲) سیرۃ ابن ہشام و فتح الباری ص ۲۷۹ ج ۷

(۵۶۳) ایک لڑکی کی شادی قبیلہ اوس میں کی تھی۔ اسی رشتہ کی بنا پر حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے جن کا ذکر آگے آتا ہے کعب بن اشرف کو اپنا ماموں بتایا تھا۔

(۵۶۴) سیرۃ حلبیہ ص ۱۷۷ ج ۳

(۵۶۵) سیرۃ حلبیہ ص ۱۷۸ ج ۳

(۵۶۶) کتب تفاسیر۔ تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، مظہری اور درمنثور وغیرہ ایسی تمام سازشوں کے بیان میں اُن کا نام لیا گیا ہے کہیں تنہا اس کا اور کہیں اس کے ساتھ دوسرے سرداروں کا بھی نام لیا گیا ہے۔

(۵۶۷) ابن ہشام نے وہ مرثیے اور قصیدے بھی نقل کیے ہیں۔

(۵۶۸) ابن ہشام وغیرہ۔

(۵۶۹) مشرکین مکہ نے اپنی خدمات شمار کرائیں کہ ہم حاجیوں کے لیے اُونٹ ذبح کرتے ہیں۔ ان کے لیے پانی کا انتظام کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ تو ان سے کہا انتم واللہ اھدی سبیلا ممن ھو علیہ سیرۃ حلبیہ ص ۱۷۸ ج ۳

(۵۷۰) فتح الباری ص ۲۷۰ ج ۷

(۵۷۱) البدایہ والنہایہ ص ۶ ج ۴

(۵۷۲) البدایہ والنہایہ ص ۶ ج ۴

(۵۷۳) سیرۃ حلبیہ ص ۱۷۸ ج ۳ و فتح الباری ص ۲۷۷ ج ۳

(۵۷۴) ابوداؤد شریف باب خبر بنی نضیر

(۵۷۵) المستفاد من کلمتہ قد

(۵۷۶) یعنی اس کا کون ذمہ دار ہے کہ مجھے اس سے نجات دلادے۔

(۵۷۷) بخاری شریف باب قتل کعب بن اشرف۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا اگرچہ وہ میرا ماموں ہوتا ہے۔ (ابن ہشام وغیرہ)

(۵۷۸) سیرۃ ابن ہشام

(۵۷۹) فتح الباری ص ۲۷۰ ج ۷

(۵۸۰) بخاری شریف وغیرہ ص ۵۰

(۵۸۱) بخاری شریف

(۵۸۲) یعنی نماز روزہ اور جہاد وغیرہ کے فرائض مقرر کر کے۔

(۵۸۳) نتیجہ وفات کے بعد سامنے آئے گا۔لہٰذا مرتے دم تک چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔
(۵۸۴) ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع دوسوستر تولہ کا چھ پس ایک وسق پانچ من ڈھائی سیر کا۔
(۵۸۵) ابونائلہ رضاعی بھائی اور محمد بن مسلمہ رشتہ کے بھانجے تھے لیکن جب انہیں بھائی اور بھانجے نے قرض مانگا تھا تو رہن کا مطالبہ کیا اور بے حیائی کی حد ہوگئی کہ ان کی بیویوں کو سب سے پہلے رہن میں طلب کیا۔پھر ان کی اولاد کو (معاذ اللہ) کیا ایسے شخص کا قتل کرنا غلط تھا یا انسانیت کی عظیم الشان خدمت تھی؟
(۵۸۶) یہ اس خاتون کی اعلیٰ ذہانت کی علامت تھی۔
(۵۸۷) یہ تمام واقعہ بخاری شریف سے ماخوذ ہے۔
(۵۸۸) ذرہ کے اُوپر سے تلوار چٹ کر لگ گئی۔سیرۃ ابن ہشام
(۵۸۹) ماخوذ از بخاری شریف باب قتل کعب بن اشرف، وسیرۃ ابن ہشام و فتح الباری۔یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے اس موذی کے خاتمہ پر جس کو طاغوت الیہود کہا جاتا تھا، خدا کا شکر ادا کیا۔
(۵۹۰) سیرۃ ابن ہشام و بدایہ ونہایہ اس سے اس مہم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ تین چار آدمیوں کا قلعہ میں گھس کر مالک کو قتل کر دینا آسان کام نہیں تھا۔
(۵۹۱) کرمانی شرح بخاری باب قتلك اهل الحرب وباب رہن السلاح
(۵۹۲) باب كيف كان اخراج اليهود من المدينه
(۵۹۳) چنانچہ انک باہل الحرب (باضابطہ جنگ کے بغیر عربی کو قتل کردینے) کے سلسلہ میں بھی اس واقعہ کو پیش کیا ہے۔ص ۴۲۵
(۵۹۴) ابوداوٗد شریف باب كيف كان اخراج اليهود من المدينة
(۵۹۵) طبقات ابن سعد ج ۳
(۵۹۶) فباعوها فصارت ذهبا (ثم قال) وكانوا يربحون لتجارتهم للدينار دينارًا (ابن سعد ص ۲۵ ج ۳)
(۵۹۷) پہلے گزر چکا ہے کہ پچاس ہزار دینار کے اٹھارہ ہزار سات سو پچاس تولے ہوتے ہیں۔تقریباً ۶ من کیونکہ ایک دینار ایک مثقال یعنی ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا تھا۔
(۵۹۸) اس بدبخت نے اگرچہ اس وقت آنحضرت ﷺ کی مدح میں پانچ شعر کا قصیدہ کہہ دیا تھا جس کو ابن ہشام نے نقل کیا ہے مگر مکہ پہنچا تو کہا "سحرت محمداً" میں نے محمد ﷺ پر جادو کر دیا۔سیرت حلبیہ ص ۲۲۲ ج ۲
(۵۹۹) ابن سعد ص ۲۰ ج ۳
(۶۰۰) ابن سعد ج ۳ على اثنين وثلاثين شهرا من مهاجره ﷺ
(۶۰۱) مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ جمعہ کے روز آنحضرت ﷺ اس غزوہ کے لیے روانہ ہوئے اور اگلے روز صبح کو یہ غزوہ ہوا۔اختلاف اس میں ہے کہ یہ سوال کا پہلا جمعہ تھا یا دوسرا۔۳ھ کے شوال کی یکم یک شنبہ کو تھی۔(مطابق ۱۷ مارچ ۶۲۴ء) تو پہلا جمعہ ۶ شوال کو ہوا اور دوسرا ۱۳ شوال کو۔ابن سعد کی تحقیق یہ ہے کہ غزوہ ۷ شوال شنبہ کے روز ہوا یعنی ۲۳ مارچ ۶۲۴ء کو یہ بھی روایت ہے کہ قریش مدینہ کے قریب مقام ذی الحلیفہ پر چہارم شنبہ کو پہنچ گئے تھے۔یعنی ۴ شوال کو اس صورت میں مکہ معظمہ سے روانگی ۲۸، ۲۹ رمضان کو ہوئی لیکن ابن جریر وغیرہ کا بیان یہ ہے کہ لشکر قریش مدینہ کے قریب ۱۲ شوال کو پہنچا تھا اور غزوہ احد شوال کے پہلے شنبہ کو نہیں ہوا بلکہ دوسرے ہفتہ میں ہوا۔للنصف میں شوال (ابن جریر) اس روایت کی بنا پر شوال کی یکم شنبہ کے روز مانی جائے گی اور غزوہ کی تاریخ ۱۵ شوال ۳ھ مطابق ۳۰ مارچ ۶۲۴ء
(۶۰۲) سیرت حلبیہ میں یہ ہے کہ ان میں احابیش بھی تھے۔قبیلہ بنی مصطلق اور قبیلہ بنی ہون بن خزیمہ کو احابیش کہا جاتا تھا۔کیونکہ ان

لوگوں نے کوہ حبشی کے قریب جو نشیبی جانب (اسفل مکہ) میں ہے، جمع ہو کر قریش سے عہد کیا تھا کہ انھم مع قریش ید واحدۃ علی غیرھم ماسجی لیل ووضح نھار وما رسا حبشی مکانہ یعنی جب تک رات تاریکی کا پردہ ڈالتی رہے۔ دن روشن ہوتا رہے اور یہ حبشی پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اس وقت تک ہمارا معاہدہ ہے کہ ہم ہر ایک حریف کے مقابلہ میں قریش کے دست و بازو رہیں گے۔ گویا ہم اور قریش ایک ہاتھ ہوں گے۔ سیرۃ حلبیہ ص ۲۴۱ ج ۳

(۶۰۳) عہدِ زریں حصہ دوم غزوہ احد کے اجمالی تذکرہ میں تعداد ۵ ہزار لکھی گئی ہے۔ وہ بھی ایک روایت ہے تاریخ التواریخ میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے مگر زیادہ مؤرخین نے یہی تعداد بیان کی ہے جو ابن سعد کے حوالہ سے یہاں لکھی گئی ہے۔ اگر زرہ پوش اور تیر اندازوں کو شتر سواروں میں داخل مانا جائے تو تعداد تین ہزار دو سو ہوگی۔ ورنہ چار ہزار ہو جائے گی۔ محمد میاں

(۶۰۴) طبقات ابن سعد ج ۳

(۶۰۵) اس خط کے پہنچنے کے بعد اول آنحضرت ﷺ نے دو مخبر تحقیق کے لیے بھیجے۔ پھر ایک صاحب کو لشکر کی تعداد معلوم کرنے کے لیے بھیجا جس نے شام سے پہلے اپنی رپورٹ دے دی تو لامحالہ یہ خط اول وقت دوپہر سے پہلے پہنچ چکا تھا۔

(۶۰۶) سیرت حلبیہ ص ۲۴۱ ج ۲

(۶۰۷) حضرت ہند اور متعدد خواتین بعد میں اسلام سے مشرف ہوئیں اس لیے اب ہم ان کے متعلق رضی اللہ عنہا کہیں گے۔

(۶۰۸) ابن ہشام ص ۶۵ و ۶۶ ج ۲

(۶۰۹) ابن سعد صفحہ ۲۵ جلد ۲

(۶۱۰) غالباً حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو پہلے موقع نہیں مل سکا۔ جب لشکر روانہ ہو چکا اور مدینہ کے قریب پہنچنے والا تھا تب قاصد مہیا ہوا تو یہ تاکید اس لیے کر دی کہ جس قدر پہلے ممکن ہو آنحضرت ﷺ کو اطلاع پہنچ جائے اور ایسا نہ ہو کہ دشمن بے خبری میں مدینہ پر ٹوٹ پڑے یا شب خون مارے۔ اب آنحضرت ﷺ کی یہ مستعدی سبق آموز ہے کہ صرف چند گھنٹہ میں تیار ہو کر دشمن کے محاذ پر پہنچ گئے۔

(۶۱۱) سیرۃ حلبیہ ص ۲۴۱ ج ۲

(۶۱۲) ابن سعد ص ۲۶ ج ۲

(۶۱۳) طبقات ابن سعد ۲۶ ج ۳

(۶۱۴) ابن ہشام ص ۶۶ ج ۲

(۶۱۵) بدایہ ونہایہ ص ۱۲ ج ۴ ابن جریر اور بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور نعمان بن مالک رضی اللہ عنہ کی بھی یہی رائے تھی۔ تفسیر مظہری ص ۱۴۸ ج ۲

(۶۱۶) فغلب علی الامر الذین یریدون الخروج۔ طبقات بن سعد ص ۱۶ ج ۳ وفی البدایہ والنہایہ ابی کثیر من الناس الاخروج الی اللہ ولم ینننا بوا الی قول رسول اللہ ﷺ وراءیہ ص ۱۲ ج ۴

(۶۱۷) طبقات ابن سعد ص ۲۶ ج ۳

(۶۱۸) سیرۃ ابن ہشام ص ۶۷ ج ۲

(۶۱۹) ابن سعد کی تحقیق یہ ہے کہ نماز عصر کے بعد آنحضرت ﷺ دولت خانہ میں تشریف لے گئے تھے۔ ص ۲۶ ج ۳

(۶۲۰) ایک زرہ وہ تھی جو غزوہ بدر میں زیب تن تھی جو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے پیش کی تھی۔ یہی زرہ تھی جو ایک یہودی کے یہاں رہن رکھی ہوئی تھی۔ جب شاہ دو جہان ﷺ نے اس عالم فانی سے رحلت فرمائی پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس زرہ کو چھڑایا تھا۔ اس زرہ کا نام ذات الفضول تھا۔ دوسری زرہ کا نام فضہ تھا۔ یہ بنی قینقاع سے حاصل ہوئی تھی۔ سیرت حلبیہ ص ۲۴۳ ج ۲

(۶۲۱) ایضاً، سیرت حلبیہ ص ۲۴۳ ج ۲ و طبقات بن سعد ص ۲۶ و ۲۷ ج ۳ وغیرہ

(۶۲۲) خود سر پر ہوتا تھا اور آہنی کڑیوں کا جھالر جو گردن کی حفاظت کے لیے خود میں لگایا جاتا تھا یا خود کے نیچے ڈالا جاتا تھا اس کو مغفر کہتے تھے۔

(۶۲۳) طبقات ابن سعد ص ۲۷ ج ۱۶

(۶۲۴) تفسیر مظہری ص ۱۲۹ ج ۲

(۶۲۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب شان نبوت کے مناسب ہے لیکن تاریخ کا ایک طالب علم یہ کہہ سکتا ہے کہ صاحب عزم کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ فیصلہ میں تبدیلی کرتا رہے۔

(۶۲۶) ابن سعد ص ۲۶ ج ۳ وص ۲۷ ج ۳

(۶۲۷) مؤرخ ابن سعد نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اسی خواب کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر نکلنا پسند نہیں فرماتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو جائے۔ ممکن ہے علامہ کی یہ تحقیق صحیح ہو۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ اس خواب کا تعلق تکوینی امور سے ہے تشریع نہیں ہے۔ یعنی آئندہ کے واقعات آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف کیے گئے ہیں۔ رب العالمین کی جانب سے کوئی ہدایت نہیں ہے کہ ایسا کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر اس کا تعلق تشریع سے ہوتا تو آپ پر اس کی اتباع ضروری تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے مشورہ نہ کرتے بلکہ ان کو ہدایت دیتے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے۔ کیونکہ تشریعی امور میں انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی کا درجہ رکھتا ہے۔ بلکہ وحی کی ایک قسم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ محمد میاں

(۶۲۸) اسیران حنین کی واپسی کے سلسلہ میں یہ بات زیادہ کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک رائے واضح طور پر بیان فرما دی تھی لیکن اپنی رائے عالی کی طرح ہر ایک فرد مسلم کی رائے کو اہمیت دی۔ یہاں تک مجمع میں جو حاضرین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت کر دی آپ نے اس کا لحاظ نہیں کیا۔ بلکہ ہر جماعت کے عریف (پنچ) کو ہدایت کی کہ اس اجتماع کے بعد شخصی طور پر ہر ایک کی رائے معلوم کریں۔ جس اس طرح مکمل آزادی کے ساتھ ہر ایک کی رائے کا علم ہو گیا تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا۔ (بخاری شریف)

(۶۲۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حلیمہ سعدیہ سے پہلے چند دنوں ابولہب کی کنیز ثویبہ کا دودھ پیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۸۷ ج ۲ و بخاری شریف ص ۳۶۰

(۶۳۰) ایک مرتبہ شکار سے واپس پہنچے تو حرم کعبہ میں ایک باندی نے شکایت کر دی کہ آج ابوجہل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بہت گستاخی کی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ غصہ میں ابوجہل کے پاس پہنچے اس کو بہت سخت سست کہا اور وہیں اعلان کر دیا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں جو تکلیف رسول خدا کو پہنچاتے ہو مجھے بھی پہنچاؤ۔ (سیرۃ ابن ہشام ص ۱۸۷ ج ۱)

(۶۳۱) طبقات ص ۲۷ ج ۳

(۶۳۲) جو پندرہ سال کے نہیں تھے جن کی عمر ۱۴ سال تھی۔ سیرۃ حلبیہ ص ۲۴۴ ج ۲

(۶۳۳) یہ حضرات جو اس وقت کم سن تھے بعد میں احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند پایہ راوی ہوئے۔ زیادہ تر احادیث انہیں حضرات سے مروی ہیں کیونکہ اکابر صحابہ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد عرصہ تک ان کو علمی خدمات کا موقع ملا اور حضرات تابعین رحمہم اللہ نے زیادہ تر انہیں حضرات سے استفادہ کیا۔

(۶۳۴) سیرۃ حلبیہ ص ۲۴۴ ج ۲

(۶۳۵) سیرۃ ابن ہشام ص ۶۷ و ۶۸ ج ۲

(۶۳۶) سیرۃ ابن ہشام ۶۷ ج ۲

(۶۳۷) ابن ہشام وغیرہ

(۶۳۸) پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ تم کو کسی کی تنگی اور مشقت میں ڈالے بلکہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک صاف کردے اور تم پر اپنی نعمت مکمل کردے۔

(۶۳۹) بخاری شریف ص ۲۵۴

(۶۴۰) سیرۃ ابن ہشام ص ۶۷ ج ۲

(۶۴۱) ابن سعد ص ۲۵ ج ۳

(۶۴۲) سیرۃ ابن ہشام ص ۶۹ ج ۲

(۶۴۳) ابن سعد ج ۳۔ یہ عکرمہ بعد میں مسلمان ہوئے اور عظیم الشان خدمات انجام دیں۔

(۶۴۴) حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے میدان اُحد میں قربانی کی نظیر قائم کردی۔ اسی خاندان کے سات نوجوان یکے بعد دیگرے جھنڈے پر قربان ہوگئے۔

(۶۴۵) ابوطلحہ کا اصل نام عبداللہ تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے۔ طلحہ بن ابی طلحہ عبداللہ بن عبدالعزیٰ بن عثمان بن عبدالدار بن قصی۔ طبقات ابن سعد ص ۲۸ ج ۳

(۶۴۶) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۷ ج ۲

(۶۴۷) ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ قیام گاہ سے روانگی سحر سے پہلے ہوگئی تھی۔ ابن سعد کے زمانہ میں یہاں کوئی پل ہوگا وہ اسی کا پتہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ یہاں پہنچ چکے جہاں پل ہے تب نماز کا وقت ہوا۔ دشمن سامنے تھے اور آنحضرت ﷺ دشمن کی فوج کو دیکھ رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت بلال کو اذان پڑھنے کے لیے فرمایا پھر خود سرور کائنات ﷺ نے نماز پڑھائی۔ اسی مقام سے عبداللہ بن ابی اپنی پارٹی کو لے کر واپس ہوا۔ مگر قرآن پاک کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام گاہ سے روانگی آخر شب یا تڑکے میں نہیں ہوئی تھی بلکہ نماز صبح کے بعد ہوئی تھی۔ واذ غدوت

(۶۴۸) ایک گھوڑا آنحضرت ﷺ کا "سکب" تھا اور بروایت ابن سعد دوسرا گھوڑا ابوبردہ بن نیار کا (ص ۳۲ ج ۳)

(۶۴۹) بدایہ ونہایہ ص ۲۰ ج ۴

(۶۵۰) چنانچہ جب مکہ فتح ہوا تو سقایہ، رفادہ اور خانہ کعبہ کی کلید برداری وغیرہ جن خاندانوں کے سپرد پہلے سے تھیں آنحضرت ﷺ نے بھی انہیں کو یہ خدمات سپرد فرمائیں۔

(۶۵۱) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۳ ج ۲

(۶۵۲) اقبل یصف اصحابه ویسوی الصفوف علی رجلیه ابن سعد ص ۲۷ ج ۳

(۶۵۳) آنحضرت ﷺ کے سمع مبارک تک ترانہ کی آواز پہنچی تو آپ فرماتے تھے اللھم بك احول وبك اصول وفيك اقاتل حسبي الله ونعم الوكيل سیرۃ حلبیہ ص ۲۴۹ ج ۴ (ترجمہ) اے اللہ! تیری ہی مدد سے میں (دشمن کو) روک سکتا ہوں۔ تیری ہی مدد سے میں حملہ کرسکتا ہوں، تیرے ہی بارے میں میں جنگ کررہا ہوں میرے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا ذمہ دار ہے۔

(۶۵۴) ابن سعد ص ۲۸ ج ۲

(۶۵۵) سیرۃ حلبیہ ص ۲۴۷ ج ۲

(۶۵۶) طبقات ابن سعد ص ۲۸ ج ۳

(۶۵۷) حج کے موقع پر حاجیوں کے لیے پانی کا انتظام خواجہ عبدالمطلب کے ذمہ ہوا کرتا تھا۔ وہی ساقی حجاج ہوا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ابن عبدالمطلب ہوں۔ وہ نامور سردار اور بڑا بہادر تھا۔ میں اس کا نام روشن کرنے والا سخی اور بہادر ہوں۔

(۶۵۸) طبقات ابن سعد ص ۲۸ ج ۳

(۶۵۹) یہ بھی بنی عبدالدار کا فرد تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے ارطاۃ بن شرجیل بن ہاشم بن عبدالمناف بن عبدالدار۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۰۰
اس طرح اس گھرانے کے سات آدمی مارے گئے۔

(۶۶۰) طبقات ابن سعد ص ۲۸ و ص ۲۹

(۶۶۱) سیرۃ حلبیہ میں یہ ہے کہ اس تلوار کے ایک جانب یہ شعر کندہ تھافی الجبن عاروفی الاقبال مکرمه والمرء بالجبن لاینجو من القدر۔ بزدلی میں عار ہے اور آگے بڑھنے میں عزت ہے۔ انسان بزدلی کر کے مقدر سے نجات نہیں پا سکتا۔ ص ۲۴۶ ج ۲

(۶۶۲) سیرۃ حلبیہ ص ۲۴۹ و ص ۲۵۰ ج ۲

(۶۶۳) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۰ ج ۲

(۶۶۴) ایضاً

(۶۶۵) عرب میں لڑکیوں کی ختنہ کرائی جاتی تھیں اس کی ماں یہی پیشہ کیا کرتی تھیں۔ اس لیے مقطعۃ البظور کہہ کر پکارا۔ یعنی ختانۃ النساء کے بچے۔ بخاری شریف ۵۸۳ و ابن ہشام ص ۷۰ ج ۲

(۶۶۶) ایضاً، بخاری شریف ص ۵۸۳

(۶۶۷) سیرۃ حلبیہ ص ۲۶۶ ج ۲

(۶۶۸) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۴ ج ۳

(۶۶۹) خلوت خانہ میں تھے لڑائی کا شور سنا تو فوراً ایسے ہی دوڑ کر میدان جنگ میں پہنچ گئے اور شہید ہو گئے۔ غسل کا موقع نہیں ملا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں نے دیکھا فرشتے ان کو غسل دے رہے ہیں۔

(۶۷۰) سیرۃ ابنہشام ص ۸۳ ج ۲

(۶۷۱) سیرۃ ابنہشام ص ۸۳ و ۸۴ ج ۲

(۶۷۲) سیرۃ ابنہشام ص ۷۵ و ص ۷۶ ج ۲

(۶۷۳) ایضاً ص ۷۵ ج ۲

(۶۷۴) آنحضرت ﷺ کے متعلق قرآن حکیم میں ہے والرسول یدعو کم فی اخراکم۔ رسول تم کو پکار رہے تھے تمہارے عقب میں اور اتفاق سے کفار کے لیے بھی یہی ضروری تھا کہ وہ پیچھے مڑیں۔ چنانچہ یہی آواز ادھر سے بھی بلند ہوئی کہ پیچھے پلٹو۔ بخاری شریف میں ہے لما کان یوم احد هزم المشرکون فصرخ ابلیس عباد الله اخراکم الحدیث ص ۵۸۱

(۶۷۵) بدایہ ونہایہ ص ۲۴ ج ۴

(۶۷۶) مسلمانوں کے لیے مغالطہ کا سبب یہ بھی ہوا کہ حضرت یمان کی آمد خلاف توقع تھی۔ یہ بوڑھے ضعیف تھے۔ آنحضرت ﷺ ان کو اور حضرت ثابت بن وقش کو مدینہ میں ہی عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑ آئے تھے۔ مگر پھر بھی ان دونوں کو جہاد میں شرکت کا شوق ہوا۔ یہ دونوں مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے اور راستہ وہ اختیار کیا جو مشرکین کے لشکر کی جانب سے آتا تھا۔ مسلمانوں کو اول تو ان کی آمد کی توقع نہیں تھی۔ پھر آمد بھی مشرکین کی جانب سے ہوئی۔ فتح الباری ص ۲۹۱ ج ۷ و بدایہ ونہایہ ص ۳۳ ج ۳ تو ایسی صورت میں مغالطہ باعث حیرت نہیں بلکہ اگر مغالطہ نہ ہوتا تو بہت عجیب تھا۔ ان دونوں بزرگوں میں سے حضرت ثابت مدینہ میں ہی مشرکین کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ حضرت یمان کو یہ حادثہ پیش آیا۔

(۶۷۷) قاعدہ کے لحاظ سے حضرت یمان رضی اللہ عنہ کی دیت دی جا سکتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے دیت دینے کا ارادہ بھی کیا مگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دیت بھی معاف کر دی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے اس ایثار کو آنحضرت ﷺ نے بہت پسند فرمایا اور آپ کی نظر میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی قدر بہت بڑھ گئی۔ فتح الباری ص ۲۹۱ ج ۷

(۶۷۸) ابن ہشام ص ۸۷ یہ مشکیزہ لے کر پانی پلانے آئی تھیں۔تلوار بھی ساتھ تھی۔ جب میدانِ جنگ میں یہ حالت دیکھی کہ مسلمان منتشر ہیں تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گئیں اور آگے پیچھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرنے لگیں۔ایک روایت میں ہے کہ ان کے بارہ زخم آئے تھے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ میں جب بھی دائیں بائیں نظر ڈالتا رہا ام عمارہ کو دیکھتا رہا کہ وہ مقابلہ کر رہی ہیں۔ان کے شوہر زید بن عاصم اور ان کے دو لخت جگر خبیب اور عبداللہ بھی اس معرکہ میں شریک تھے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی رحمکم اللّٰہ اهل البیت یا فرمایا بارك اللّٰه فیکم اهل بیت حضرت اُم عمارہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دُعا فرمایئے کہ جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میسر آئے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی اللهم اجعلهم رفقای الجنته حضرت اُم عمارہ نے یہ دعا سنی تو جھومنے لگی اور فرمایا اب دنیا کی کوئی مصیبت آئے مجھے پرواہ نہیں۔سیرۃ حلبیہ ص ۲۵۵ ج ۲

(۶۷۹) طبقات ابن سعد ص ۲۹ ج ۳ ایک ماہ سے زیادہ تک رہی۔سیرۃ حلبیہ ص ۲۵۸ ج ۲

(۶۸۰) ابن سعد ص ۲۹ ج ۳

(۶۸۱) ابن سعد ص ۲۹ ج ۳

(۶۸۲) بڑوں کے نام پر چھوٹوں کا نام رکھنا عرب کا عام دستور تھا۔یہ دستور اسلام میں بھی رہا۔چنانچہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے والد نے اپنے بھائی کے نام پر بیٹے کا نام انس رکھا تھا۔

(۶۸۳) ابن ہشام ص ۸۷ ج ۲

(۶۸۴) بخاری شریف ص ۵۷۹ و ۳۹۳ حضرت انس بن نضر شہید کے بھتیجے انس بن مالک اس روایت کے راوی ہیں۔وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے عم محترم (انس بن نضیر) غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکے۔اس کا ان کو کافی احساس تھا۔بڑے جذبہ سے فرمایا کرتے تھے کہ جہاد کا کوئی موقع آ جائے تو میں بھی اللہ میاں کو دکھاؤں گا کہ کس طرح قربان ہوتا ہوں۔جب جنگ اُحد میں مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو حضرت انس بن نضر نے مسلمانوں کے لیے تو دعا کی اللہ ان کی کوتاہی معاف کر دے اور خود اپنی جان قربان کر دی۔حضرت انس فرمایا کرتے تھے میرے چچا اس آیت کے مصداق ہیں **رجال صدقوا ما عاهدوا اللّٰه علیه فمنهم من قضی نحبه ومنهم ینتظر** (سورہ احزاب) (کچھ ایسے مرد ہیں جنہوں نے اس عہد کو سچا کر دکھایا جو اللہ سے کیا تھا۔پھر ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اپنی منت پوری کر چکے اور کچھ انتظار کر رہے ہیں) بخاری شریف ص ۳۹۳

(۶۸۵) بخاری شریف و بدایہ و نہایہ ص ۴۳ ج ۳

(۶۸۶) سیرۃ حلبیہ ص ۲۵۱

(۶۸۷) ابن جریر بحوالہ بدایہ و نہایہ ص ۲۳ ج ۳

(۶۸۸) لوگ بچھڑتے تھے پھر اس مرکز رحمت و راحت سے قریب ہونے کی کوشش کرتے تھے۔چنانچہ یہ تعداد گھٹتی بڑھتی رہی۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت جس کو نسائی اور بیہقی نے نقل کیا ہے یہ ہے کہ آپ کے ساتھ گیارہ انصار اور ایک مہاجر (حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ) باقی رہ گئے۔محمد بن سعد کی روایت ہے کہ ۱۴ صحابہ ساتھ رہ گئے۔۷ مہاجر جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تھے اور سات انصار۔بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ صرف دو صاحب باقی رہ گئے حضرت طلحہ اور حضرت ابوبکر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما لیکن مسلم کی روایت میں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہ ہے کہ ان دو مہاجرین کے علاوہ سات انصار بھی ساتھ رہ گئے تھے۔حافظ بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس گھسان میں مختلف صورتیں پیدا ہوتی رہیں اسی لیے تعداد کا فرق ہوتا رہا۔فتح الباری ص ۲۸۸ ج ۷

(۶۸۹) ابن ہشام ص ۷۷ ج ۳

(۶۹۰) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۷ ج ۳

(۶۹۱) ابن سعد ص ۲۹ ج ۳ سیرۃ حلبیہ ص ۲۵۸ ج ۲

(۶۹۲) کل ستر صحابہ کرام اس جنگ میں شہید ہوئے جن میں وہ بھی ہیں جو مورچہ پر شہید ہوئے تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور چند اور صحابہ پہلے شہید ہو چکے تھے۔ بس اس گھمسان میں شہید ہونے والوں کی تعداد کم و بیش پچاس ہوگی۔

(۶۹۳) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۹

(۶۹۴) مسند ابوداؤد۔ طیالسی بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا البدایہ والنہایہ ص ۲۹ و ۳۰ ج ۳ و سیرت ابن ہشام ص ۷، ج ۲

(۶۹۵) حضرت قیس ابن حازم نے حضرت طلحہ کا یہ بازو شل ہی دیکھا تھا۔ بخاری ص ۵۲۷ و ۵۸۱

(۶۹۶) مسند ابی داؤد طیالسی بحوالہ مذکور۔

(۶۹۷) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۷ ج ۲۔

(۶۹۸) ترمذی شریف۔ مناقب طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

(۶۹۹) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۷ ج ۲

(۷۰۰) جذبہ فدائیت کے علاوہ یہ عقیدہ بھی کارفرما تھا کہ نبی کے جسد اطہر کا خون اگر زمین پر گرتا تو قوم تباہ ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خیال فرمایا۔ چنانچہ خون اپنے کپڑوں پر لیتے رہے زمین پر گرنے نہیں دیا۔

(۷۰۱) حضرت مالک رضی اللہ عنہ کے اس والہانہ ایثار کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی کہ من مس دمه دمی لم تصبه النار میرا خون جس سے چھو جائے اس کو دوزخ میں آگ نہیں چھو سکے گی۔ ابن ہشام ۷۷ ج ۲

(۷۰۲) ابن ہشام ص ۷۸ ج ۲

(۷۰۳) بخاری شریف ص ۵۸۱

(۷۰۴) بخاری شریف ص ۵۸۱

(۷۰۵) ایضاً

(۷۰۶) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۷ ج ۲

(۷۰۷) مسلم شریف ص ۱۰۷ ج ۲

(۷۰۸) بخاری شریف ص ۵۷۹

(۷۰۹) قال عبدالرزاق عن معمر عن الزهری ضربوا بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم سبعین ضربته وقاه الله شرها کلها۔ قاله السیوطی فی التوشیح۔ بخاری شریف حاشیہ ص ۵۸۳

(۷۱۰) بخاری شریف ۵۸۰

(۷۱۱) اب احساس ہوا جب سر پر پڑی۔ الان وقد عصیت من قبل و کنت من المفسدین۔

(۷۱۲) ایک مقام کا نام ہے جو مکہ کے قریب ہے۔

(۷۱۳) سیرۃ ابن ہشام ۷۹ ج ۲

(۷۱۴) اشتد غضب الله علی رجل یقتله رسول الله فی سبیل الله۔ بخاری شریف ص ۵۸۳

(۷۱۵) حضرت شاہ ولی اللہ۔

(۷۱۶) بدایہ ونہایہ ص ۲۳ ج ۲ بحوالہ تاریخ ابن جریر

(۷۱۷) حوالہ مذکور

(۷۱۸) اخرج ابن مردویہ عن عبدالرحمٰن بن عوف فاثابکم غما بغم۔ قال الغم الاول بسبب الهزیمته والثانی حین قیل قتل محمد و کان ذلک عندهم اعظم من الهزیمته درمنثور ص ۸۷ ج ۲ وبمعناه عن قتادة وفیه فانساهم الغم الآخر

اصابهم من الجراح والقتل وما كانوا يرجون من الغنيمة۔ تفسیر ابن جریر ص ۸۴ ج ۴

(۷۱۹) بخاری شریف ص ۵۸۲

(۷۲۰) بدایہ ونہایہ ص ۲۸ ج ۲

(۷۲۱) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۹ ج ۲

(۷۲۲) سیرۃ النبی

(۷۲۳) سیرۃ ابن ہشام ۸۶ ج ۲

(۷۲۴) حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اس کو منظور نہیں کیا اور شکریہ کے ساتھ معذرت کر دی۔ زمین جائیداد کے حصہ پر بھی قبضہ کرنے کے بجائے انہوں نے بازار کا راستہ معلوم کیا اور چند درہم کے سرمایہ سے کام شروع کر دیا لیکن حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے جس ایثار کا ثبوت دیا وہ تو ناقابل فراموش سبق ہے۔ اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا طرز عمل بھی خودداری اور خوداعتمادی کی نادرالوجود نظیر ہے۔

(۷۲۵) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۶ ج ۲

(۷۲۶) مسند احمد بحوالہ بدایہ ونہایہ ص ۲۸ ج ۳

(۷۲۷) سیرۃ ابنہشام ص ۸۰ ج ۲

(۷۲۸) بخاری شریف ص ۵۷۹

(۷۲۹) سیرۃ ابنہشام ص ۸۱ ج ۲

(۷۳۰) سیرۃ ابنہشام ص ۸۶ ج ۲

(۷۳۱) چنانچہ معرکہ کے وقت قریش کا شعار یہی تھا جس سے ان کی پہچان ہو سکے یا لہبل یا لعزی تھا۔ ابن سعد ص ۲۹ ج ۳

(۷۳۲) یہ منافقوں کی جماعت تھی جو جان کے خدشہ سے پہلے ہی الگ ہو گئی تھی اور اب مسلمانوں پر طعن کر رہی تھی کہ ہماری بات مانی جاتی تو یہاں میدان جنگ میں اس طرح موت نہ آتی اور ان میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں جن کا ایمان بھی کمزور تھا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(۷۳۳) تفسیر مظہری بحوالہ ابن سعد ص ۱۵۹ ج ۲

(۷۳۴) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ جن کے پہلے شوہر مالک تھے جو حضرت نضر بن انس کے بھائی تھے جن کی شہادت کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا مسلمان ہو گئیں۔ ان کے شوہر مالک مسلمان نہیں ہوئے۔ خفا ہو کر گھر سے نکل گئے اور شام کی طرف چلے گئے۔ ان سے نکاح ختم ہو گیا تو ابوطلحہ نے پیغام بھیجا۔ ابوطلحہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے پیغام کا جواب دیا کہ اسلام قبول کرتے ہو تو میں رشتہ بھی منظور کرتی ہوں۔ حضرت ابوطلحہ نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر غزوۂ احد میں یہ عظیم الشان خدمت انجام دی کہ خود سپر بن کر آنحضرت ﷺ کی حفاظت کی اور تیراندازی سے دشمن کو بھگایا۔ (مرتب)

(۷۳۵) یہ پکی بات تھی کہ یہ بھی اسلام سے مشرف ہوں گے اور حضرت ابوسفیان وغیرہ خاندان کے افراد بھی اور اب حضرت حق جل مجدہ کی شہادت یہ ہے ونزعنا ما في صدورهم من غل اخوانا على سرر متقابلين سورہ حجر آیت۔ کہ دلوں میں جو کچھ غصہ اور کینہ تھا وہ ہم نے سب کھینچ لیا۔ قیامت کے دن وہ بھائی بھائی کی طرح آمنے سامنے تختوں پر جلوہ افروز ہوں گے۔

(۷۳۶) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۷ ج ۲

(۷۳۷) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۵ ج ۲

(۷۳۸) ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ یہ فرما دیتے کہ لاش کو اس طرح چھوڑ دینا حضرت حمزہ کے لیے مخصوص ہے تو یہ سنت نہ مانی جاتی۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا کوئی فعل اسی وقت سنت مانا جاتا ہے جب اس کے خلاف کوئی تصریح نہ ہو۔ استاد محترم

حضرت علامہ محدث مولانا انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کی تشریح یہ فرمائی تھی کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ ہر شہید کا معاملہ قیامت کے روز یہی ہوگا کہ اس کے گوشت کی بوٹیاں اور ہڈیاں درندوں کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں سے قیامت کے دن برآمد کی جائیں گی۔ حالانکہ یہ صرف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہوئی۔ پس ایک فکری اور نظریاتی غلطی پیدا ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے احتیاط فرمائی۔ حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی اس تشریح سے وہ سوال خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔

(۷۳۹) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۷ ج ۲

(۷۴۰) ایضاً

(۷۴۱) ایضاً

(۷۴۲) اس طرح کے جذبات تقاضاء فطرت ہیں ایسے جذبات نہ ہوں تو صبر وضبط اور استقلال و استقامت کی اہمیت ہی ختم ہو جائے۔ ایسے جذبات کا نہ ہونا کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ یہ جذبات ہوں مگر قابو ہیں اور حکم شریعت اور فرمانِ خداوندی پر اس طرح عمل ہو جیسے فطری جذبہ پر ہوتا ہے۔ پتھر کی مورتی اگر رقص نہیں کرتی تو اس کا کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ فطرت رنگین محو طرب ہو اور دست و پا پابند شریعت رہیں اور ان کی جنبش خلاف شریعت نہ ہو۔

(۷۴۳) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۷ ج ۲

(۷۴۴) البدایہ والنہایہ ص ۴۳ ج ۴

(۷۴۵) یہ خود ان کا جذبہ بھی تھا اور ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ حضرت مبشر بن منذر رضی اللہ عنہ جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے وہ فرما رہے ہیں کہ آپ آج کل میں ہمارے پاس پہنچنے والے ہیں (عینی شرح بخاری)

(۷۴۶) بخاری شریف ص ۱۸۰

(۷۴۷) بخاری شریف ص ۱۷۲

(۷۴۸) بدایہ ونہایہ ص ۴۵ ج ۴

(۷۴۹) یعنی تین کپڑے نہ ہوں۔

(۷۵۰) ترمذی شریف میں ہے کہ اس طرح اور شہداء بھی تھے جن کے کپڑے پورے نہیں تھے۔ باب قتلے احد وذکر حمزہ

(۷۵۱) سیرۃ ابن ہشام ص ۹۷ ج ۲

(۷۵۲) ترمذی شریف باب قتلی احد وذکر حمزہ

(۷۵۳) ایک خاص گھاس جو دنبوں کا چارہ ہوتی ہے چھتوں پر ڈالی جاتی ہے اور سناروں کی بھٹی میں جلائی جاتی ہے وغیرہ۔

(۷۵۴) بخاری شریف ص ۱۷۰

(۷۵۵) بخاری شریف میں ہے کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یجمع بین الرجلین من قتلی احد فی ثوب واحد ص ۱۷۹ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد کے دو دو شہیدوں کو ایک کپڑے میں جمع کر دیتے تھے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک کپڑے (چادر یا تہبند) کے دو ٹکڑے کر دیتے تھے اور بجائے پوری چادر یا تہبند کے اس ٹکڑے سے کفن کا کام لیا کرتے تھے۔ فیض الباری ص ۷۷ ج ۲

(۷۵۶) چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لیے بغلی قبر ہی پسند فرمائی تھی۔ اللحد لنا والشق لغیرنا (صحاح) ہر جگہ کی زمین بغلی قبر کے قابل نہیں ہوتی۔ مدینہ کی زمین سخت ہے۔ یہاں بغلی قبر بننی چاہیے۔

(۷۵۷) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۸ ج ۲

(۷۵۸) بخاری شریف ص ۱۷۹

(۷۵۹) ایضاً ص ۱۷۹

(۷۶۰) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۷ ج ۲ ابن سعد ص ۳۰ ج ۳

(۷۶۱) واقعہ یہ ہے کہ جس کو معانی الآثار میں امام طحاوی نے نقل کیا ہے مگر اس کی تعبیریں مختلف ہوئیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔ وامر بدفنهم فی دماءهم ولم يغسلوا ولم يصل عليهم (بخاری ص ۱۷۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ان کو اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دفن کر دیا جائے۔ ان کو غسل نہیں دیا گیا۔ ان پر نماز بھی نہیں پڑھی گئی (یعنی نہ ایک ایک پر اور نہ جس طرح دو دو دفن کیے گئے تھے۔ اس طرح دو دو پر نماز پڑھی گئی) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے اس میں یہ ہے۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مر علی حمزة وقد مثل به ولم يصل علی احد غيره (باب فی الشهيد يغسل جلد دوم) یعنی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کسی کی نماز نہیں پڑھی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ حمزہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کسی کی نماز مستقل طور پر علیحدہ نہیں پڑھی گئی۔ یہ سید الشہداء تھے۔ اصل یہی رکھے گئے اور سب ان کے تابع کیے گئے۔ ابن سعد نے اس کی تعبیر یہ کی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر نمازیں پڑھی گئیں۔ ابن سعد ص ۳۰ ج ۳ یعنی ستر شہداء میں سے ہر ایک کی نماز میں شریک رہے۔ ابن اسحاق نے ان کی تعداد ۷۲ کرادی۔ صلی علیه اثنین وسبعین صلوة سیرۃ ابن ہشام ص ۸۷ ج ۲

(۷۶۲) مسند احمد۔ عن ابن رفاعة الزرقی عن ابیه۔ والیوم والليلة للنسائی بدایه و نهایه ص ۳۸ ج ۴

(۷۶۳) اے اللہ! تمام حمد تیرے لیے ہے۔ جس کو تو وسعت دے۔ کوئی نہیں جو اس کو سکوڑ سکے اور جس کو تو سکوڑ دے۔ تو کوئی نہیں جو اس کو پھیلا سکے جس کو تو راہ مار دے کوئی نہیں جو اس کی رہنمائی کر سکے اور جس کو تو ہدایت بخش دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا جس کو تو منع کر دے اس کو کوئی عطا نہیں کر سکتا اور جسے تو عطا فرمائے اسے کوئی روک نہیں سکتا جس کو تو دور کر دے اسے کوئی قریب نہیں کر سکتا اور جس کو تو قربت عطا فرمائے اسے کوئی بعید نہیں کر سکتا۔ اے اللہ! ہم پر اپنی برکتیں، اپنی رحمت، اپنا فضل اور اپنا رزق پھیلا دے۔ اے اللہ! تجھ سے اس دائمی اور پائیدار نعمت کی درخواست کرتا ہوں جس میں نہ کبھی کوئی تبدیلی ہو اور نہ اس کو زوال آئے۔ خداوندا! میں فقر و احتیاج کے دن نعمت کی اور خوف کے دن امن کی درخواست تجھ سے کرتا ہوں۔ اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس وقت سے کہ جو نعمتیں تو نے عطا فرمائیں ہیں وہ میرے لیے شر بن جائیں (کہ معاذ اللہ کفران نعمت کرنے لگیں) اور جو نعمتیں تو نے ہم سے روک لی ہیں ان کا کوئی شر ہم تک پہنچے۔ اے اللہ! ہمیں ایمان کی پوری پوری محبت عطا فرما اور اس کو ہمارے دلوں میں آراستہ کر دے اور سجا دے اور کفر فسق۔ عصیان (سرکشی اور حکم وعدولی) سے ہمارے اندر پوری پوری نفرت بھر دے اور ہمیں نیک کردار بنا دے۔ اے اللہ! ہمیں موت دے تو اسلام پر زندہ رکھے تو اسلام پر۔ اے اللہ! ہمیں صالحین میں شامل کر دے۔ ہمیں رُسوا نہ کر اور ایسا بھی نہ ہو کہ ہم فتنہ میں مبتلا ہو جائیں اور ان کافروں سے مقابلہ کر جو تیرے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور تیرے راستہ سے روکتے رہتے ہیں اور ان پر اپنا عتاب اور عذاب نازل فرما۔ اے اللہ! اے سچے معبود! ان اہل کتاب سے مقابلہ کر جو کافر ہیں۔ اے سچے معبود!

(۷۶۴) بدایہ ونہایہ ص ۴۵ ج ۳

(۷۶۵) بخاری شریف ص ۱۷۹

(۷۶۶) سیرۃ حلبیہ ص ۲۸۰ ج ۲

(۷۶۷) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۸ ج ۲

(۷۶۸) سیرۃ حلبیہ ص ۲۸۰ ج ۲

(۷۶۹) اس صابر خاتون۔ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے عدت گزرنے کے بعد حضرت طلحہ سے نکاح کر لیا۔ انہوں نے ان یتیم بچوں کو اپنے بچوں کی طرح رکھا۔ پھر حضرت طلحہ سے محمد بن طلحہ پیدا ہوئے جو تاریخ اسلام میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ یہ دعاء نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت تھی۔ سیرت حلبیہ ص ۲۸۱ ج ۲

(۷۷۰) سیرۃ حلبیہ ص ۲۸۱ ج ۲
(۷۷۱) ابن سعد ص ۳۱ ج ۳ وابن ہشام ص ۸۸ ج ۲
(۷۷۲) البدایہ والنہایہ ص ۴۸ ج ۴
(۷۷۳) ابن سعد ص ۳۱ ج ۳ وسیرۃ حلبیہ ص ۲۸۱ ج ۲
(۷۷۴) ایضاً، حوالہ مذکور
(۷۷۵) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۹ ج ۲
(۷۷۶) ابن سعد ص ۳۱ ج ۳
(۷۷۷) یہ ارشاد گرامی بالکل صحیح ثابت ہوا۔ پھر کسی جنگ میں بھی قریش مسلمانوں کو ایسا نقصان نہیں پہنچا سکے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کی کامیابی عطا فرمائی۔
(۷۷۸) ابن سعد ص ۳۳ ج ۳
(۷۷۹) ابن سعد ص ۲۷ ج ۳
(۷۸۰) درمنثور ص ۸۹ ج ۲
(۷۸۱) بخاری شریف ص ۶۶۰
(۷۸۲) بخاری شریف ص ۵۸۲
(۷۸۳) التوشیح للجلال السیوطی رحمۃ اللہ علیہ
(۷۸۴) سیرۃ حلبیہ ص ۲۵۸ ج ۲
(۷۸۵) سیرۃ حلبیہ ص ۲۵۸ ج ۲
(۷۸۶) سیرۃ حلبیہ ص ۲۵۸ ج ۲
(۷۸۷) بات تلک اللیلتہ علی بابہ ناس من وجوہ الانصار وبات المسلمون یداوون جراحاتہم۔ ابن سعد ص ۳۴ ج ۳
(۷۸۸) بخاری شریف ص ۵۸۴
(۷۸۹) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے بھانجا عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس آیت کی تفسیر بیان کر رہی تھیں جو عنوان بالا میں ہے یعنی الذین استجابوا اللّٰہ والرسول انہوں نے اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد ضمنی طور پر یہ بھی بتا دیا کہ تمہارے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور (میرے والد) ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ان میں تھے۔ اس دستہ کے جملہ حضرات کی فہرست بیان کرنی مقصود نہیں تھی اس لیے اور نام بھی بیان نہیں کیے۔ مگر دوسرے علماء حدیث نے یہ نام بھی بیان کیے ہیں۔ عمر، عثمان، علی، عمار بن یاسر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف، ابوعبیدہ، حذیفہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم۔ فتح الباری ص ۲۹۹ ج ۷
(۷۹۰) بدایہ ونہایہ بروایت موسیٰ بن عقبہ ص ۴۸ ج ۴
(۷۹۱) طبقات ابن سعد ص ۳۴ ج ۳ وابن ہشام ص ۹۰ ج ۲
(۷۹۲) کل گزشتہ کا تجربہ تھا کہ عبداللہ بن ابی کے ساتھ تین سو آدمی میدانِ جنگ سے واپس چلے آئے تھے۔ یہ آنحضرت ﷺ کی غیر معمولی شفقت اور چشم پوشی ہے کہ کسی پارٹی کا نام لینے کے بجائے ایسے الفاظ میں اعلان فرمایا کہ منافق یا کچے لوگ آگے آ ہی نہ سکیں۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی اور اس جیسے کچھ لوگوں نے اس وقت بھی ساتھ چلنا چاہا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اجازت نہیں دی۔ البتہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اجازت چاہی تو ان کو اجازت مرحمت فرما دی۔
(۷۹۳) سیرۃ ابن ہشام ص ۹۰ ج ۲

(۷۹۴) سیرۃ حلبیہ ص ۲۸۴

(۷۹۵) ابن سعد ص ۳۴ ج ۳

(۷۹۶) سیرۃ حلبیہ ص ۲۸۵

(۷۹۷) طبقات ابن سعد ص ۳۴ ج ۳

(۷۹۸) سیرۃ حلبیہ ص ۲۶۴

(۷۹۹) سیرۃ ابن ہشام ص ۹۰ ج ۲

(۸۰۰) ابن سعد ۳۵ ج ۳

(۸۰۱) سیرۃ حلبیہ ص ۲۸۶ ج ۲

(۸۰۲) ابن سعد ص ۳۵ ج ۳

(۸۰۳) سیرت ابن ہشام ص ۹۰ ج ۲ و سیرت حلبیہ ص ۲۹۶ ج ۳

(۸۰۴) بخاری شریف

(۸۰۵) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لی ہیں اور ان کا مال بھی اور اس قیمت پر خرید لی ہیں کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ سورہ توبہ

(۸۰۶) قد سارا فی قومهما ومن اطاعهما يدعونهم الى حرب رسول الله ﷺ طبقات ابن سعد ص ۳۵ ج ۳

(۸۰۷) سیرۃ حلبیہ ص ۱۸۲ ج ۳ یہ مال غنیمت تقسیم کیا گیا۔ خمس وغیرہ کی علیحدگی کے بعد ہر مجاہد کے حصہ میں سات سات اونٹ آئے۔

(۸۰۸) طلیحہ کو اپنی بہادری پر ناز تھا اس کا دعویٰ تھا کہ وہ تن تنہا ایک ہزار سواروں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مگر اس وقت کسی بہادری کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔ پھر مدینہ طیبہ حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا اور پس پشت کچھ عرصہ بعد نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اس نے کچھ طاقت بھی فراہم کر لی۔ پھر تائب ہو کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے ساتھ فریضہ حج بھی ادا کیا۔ سیرۃ حلبیہ ص ۱۸۳ ج ۳

(۸۰۹) سیرۃ حلبیہ ص ۱۸۳ ج ۳

(۸۱۰) طبقات ابن سعد میں ہے کہ ہجرت نبویہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) سے ۳۵ ماہ بعد یہ سریہ روانہ ہوا تھا۔ یعنی اگرچہ ۳ھ شروع ہو گیا تھا۔ مگر ہجرت چونکہ ربیع الاول میں ہوئی تھی اس لیے ہجرت کو ۳۵ ماہ ہی ہوئے تھے۔

(۸۱۱) سیرت حلبیہ ص ۱۸۴ ج ۳

(۸۱۲) پورا واقعہ طبقات ابن سعد سے ماخوذ ہے۔ (ج ۳)

(۸۱۳) آنحضرت ﷺ نے ایک چھڑی عطا فرمائی اور ارشاد فرمایا جنت میں اس چھڑی سے ٹیک لگانا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس چھڑی کو محفوظ رکھا اور مرنے کے وقت وصیت کر دی کہ میرے کفن کے اندر رکھنا۔ (بدن سے لگا کر) آپ کے وارثوں نے وصیت کی تکمیل کی۔ طبقات ابن سعد جلد سوم ص ۳۵، ۳۶

(۸۱۴) طبقات ابن سعد ص ۳۶ ج ۳

(۸۱۵) بخاری شریف ص ۵۸۶

(۸۱۶) بخاری شریف ص ۵۸۶

(۸۱۷) الاصابہ ذکر عمرو بن طفیل

(۸۱۸) نیزوں سے کھیل کرنے والا۔ یہ خطاب اس کو دراء بن عمر نے دیا تھا جو ایک قبیلہ کا سردار اور اس کا حریف تھا۔ ایک موقع پر دراء

نے اپنے بیٹے کو اشارہ کیا کہ وہ عامر بن مالک کو قتل کر دے۔ اس نے عامر پر نیزہ سے حملہ کیا۔ عامر گھوڑے پر سوار تھا اس نے ایسا پینترا بدلا کہ وار خالی گیا۔ دوبارہ حملہ کیا تب بھی پینترا بدل کر حملہ کو ناکام بنا دیا۔ تب دراء نے کہا یالاعب الاسنتہ یہ تو نیزوں سے کھیل کرتا ہے۔ اسی واقعہ کی بنا پر یہ خطاب مشہور ہو گیا (الاصابہ ذکر عامر بن الطفیل)

(۸۱۹) سیرۃ ابن ہشام

(۸۲۰) ابو عامر کی آمد اور اس کی درخواست کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ بخاری شریف، سیرۃ ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور زاد المعاد وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ راوی حضرات نے یہ تفصیل اس ترتیب سے نہیں پیش کی مختلف اجزاء بیان کر دیے ہیں۔ مثلاً دعوت اسلام پیش کرنے کا تذکرہ سیرۃ ابن ہشام اور طبقات ابن سعد میں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد سندوں سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ رعل، ذکوان اور عصیہ وغیرہ نے مدد طلب کی تھی۔ ص ۵۸۶۔ یہ بھی تصریح ہے کہ یہ قبائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیے ہوئے تھے ص ۵۸۸۔ ابن سعد نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ اس میں یہ بھی تصریح ہے کہ ان قبائل کے نمائندے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ص ۳۸ ج ۳

(۸۲۱) بخاری شریف ص ۵۸۶

(۸۲۲) طبقات ابن سعد ص ۳۸ ج ۳

(۸۲۳) بخاری شریف ص ۵۸۶

(۸۲۴) سیرۃ ابن ہشام ج ۲ و بخاری شریف

(۸۲۵) اس کی تفصیل آئے آئے گی۔

(۸۲۶) یہ وہی قبیلہ مضر ہے جس کی شکایت بحرین کے وفد نے کی تھی (جو وفد عبد القیس کے نام سے مشہور ہے) کہ قبیلہ مضر آڑے آتا ہے اور وہ ہمیں مدینہ آنے کا راستہ نہیں دیتا۔ عجیب بات ہے کہ حضرت عمرو بن اُمیہ کے مسلمان ہونے کے سبب سے خود قبیلہ مضر ان کا دشمن ہے لیکن عامر بن طفیل اسی رشتہ کی بنا پر حضرت عمرو بن اُمیہ کو آزاد کر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

جس کو خدا رکھے اسے کون چکھے

(۸۲۷) بخاری شریف و سیرت ابن ہشام ج ۲ و طبقات ابن سعد ج ۳

(۸۲۸) بخاری شریف ص ۵۸۷

(۸۲۹) بخاری شریف ص ۹۴۶ و ص ۴۱۱ وغیرہ

(۸۳۰) بخاری شریف ص ۵۸۷

(۸۳۱) فتح الباری ص ۳۱۲ ج ۷

(۸۳۲) بخاری شریف ص ۵۸۷

(۸۳۳) طبقات ابن سعد و سیرت ابن ہشام

(۸۳۴) سیرت ابن ہشام میں صرف چھ کی تعداد بیان کی گئی ہے لیکن موسیٰ بن عقبہ اور ابن سعد نے تعداد ۱۰ بیان کی ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں ہے ان دس میں سے تین کے نام نہیں بیان کیے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ باقی تین لوگ تابع کی حیثیت سے تھے اس لیے مؤرخین نے ان کے نام نہیں گنائے۔ فتح الباری ص ۳۰۴ ج ۷

(۸۳۵) بخاری شریف ۵۱

(۸۳۶) بعض روایتوں میں صرف اسی کا تذکرہ ہے کہ ان کو مکہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا مگر بظاہر یہ دونوں کام ان کے سپرد تھے۔ (واللہ اعلم)

(۸۳۷) اسی کے قریب رجیع مقام بھی تھا۔اسی بناپر اس سریہ کو سریۃ الرجیع کہا جاتا ہے۔

(۸۳۸) فقالوا لهم انا واللہ ما نرید قتلکم ولکنا نرید ان نصیب بکم شیا من اهل مکه ابن ہشام وابن سعد

(۸۳۹) بخاری شریف ص ۵۸۷

(۸۴۰) اشہرحرم یعنی قابل احترام مہینے رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم۔ یہ چار ہوتے تھے جن میں قتل وخون اور جنگ وغیرہ سے اجتناب کیا کرتے تھے۔

(۸۴۱) سیرت ابن ہشام وغیرہ

(۸۴۲) سیرۃ ابن ہشام

(۸۴۳) سیرۃ ابن ہشام ص ۱۳۲ ج ۲

(۸۴۴) طبقات ابن سعد ص ۴۰ ج ۳

(۸۴۵) بخاری شریف ص ۵۶۹

(۸۴۶) ایضاً

(۸۴۷) انا قد ابلغنا رسالۃ رسولك فبلغه الغداة ما یصنع بنا سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ذکر الرجیع

(۸۴۸) بخاری شریف ص ۵۷۱

(۸۴۹) سیرۃ ابن ہشام ص ۱۳۳ ج ۲

(۸۵۰) سیرۃ حلبیہ ص ۱۸۶ ج ۳

(۸۵۱) بخاری شریف ص ۵۶۹

(۸۵۲) سیرۃ ابن ہشام ص ۱۳۳ ج ۲

(۸۵۳) سیرۃ ابن ہشام ص ۱۳۶ ج ۲۔ بظاہر عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کو ضروری سمجھتے تھے کہ اعمال حکومت کسی دماغی عارضہ کے مریض نہ ہوں۔اسی بناپر انہوں نے تحقیق فرمائی پھر جب یقین ہوگیا کہ مرگی نہیں ہے تو ان کو بحال ہی نہیں کیا بلکہ اور ترقی دے دی (ابن ہشام)

(۸۵۴) بخاری شریف ص ۵۶۹ وسیرت ابن ہشام ص ۱۳۶ ج ۲

(۸۵۵) وجاء رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم خبر اهل بیر معونة وجاء ة تلك الليلته ایضا مصاب خبیب بن عدی و مرثد بن مرثد۔ طبقات ابنسعد ص ۳۷ ج ۳

(۸۵۶) البدایہ والنہایہ ص ۹۷ ج ۴ وسیرت طیبہ وغیرہا۔

(۸۵۷) البدایہ والنہایہ ص ۷۱ ج ۴

(۸۵۸) الاستیعاب ص ۴۴۳

(۸۵۹) واقدی کا بیان یہ ہے کہ ان کو ۶ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ حبش کے پاس بھیجا تھا۔ان کی دعوت پر ہی اس نے اسلام قبول کیا اور انہیں کے ذریعہ حضرت اُم حبیبہ کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ پھر ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی تحفہ دے کر ابوسفیان بن حرب کے پاس مکہ بھی بھیجا تھا۔استیعاب ص ۴۴۳ ومعالم التنزیل ص ۲۹۱

(۸۶۰) واقدی نے ساتھی کا نام سلمہ بن اسلم بتایا ہے اور ابن ہشام نے جو روایت ابن اسحاق سے کی ہے اس میں ساتھی کا نام جبار بن صخر ہے۔

(۸۶۱) البدایہ والنہایہ ص ۷۰ ج ۴

(۸۶۲) ابن سعد نے صفر بیان کیا ہے اور پھر یہ بھی تحریر کیا ہے کہ جیسے ہی اشہر حرم ختم ہوجائے یعنی محرم کا مہینہ جو اشہر حرم کا آخری مہینہ

ہوتا ہے گزرا حضرت خبیب اور حضرت زید بن دثنہ کو شہید کر دیا گیا۔ لہٰذا یہی توجیہ کی جائے گی ماہ صفر میں رجیع یا بیر معونہ کا واقعہ نہیں ہوا بلکہ یہ حادثے محرم کے آخری ایام میں ہوئے۔ البتہ حضرت زید اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہما کو چونکہ صفر میں شہید کیا گیا تھا اس بنا پر ابن سعد نے پورے واقعہ کو صفر کا حادثہ قرار دیا ہے۔

(۸۶۳) یعنی اشہر حرم گزرے کما هو مصرح في طبقات بن سعد وسيرة ابن هشام وغيرهما

(۸۶۴) سلمہ ابن اسلم یا جبار بن صخر (رضی اللہ عنہما)

(۸۶۵) سیرۃ حلبیہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا کہ حضرت خبیب کی لاش سولی پر سے اُتار لائیں۔ یہ اُتار کر لے چلے تھے کہ پہرہ دار نے ان کو گھیر لیا۔ انہوں نے لاش زمین پر ڈال دی تو وہ فوراً غائب ہوگئی یعنی زمین نے نگل لی۔ اسی وجہ سے ان کو بلیع الارض کہتے ہیں۔ ص ۱۸۶ مگر حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ لاش غائب کر دی گئی تھی۔ بدایہ ونہایہ ص ۲۷ ج ۴

(۸۶۶) البدایہ والنہایہ ص ۴

(۸۶۷) ابن ہشام وابن سعد وغیرہما

(۸۶۸) حضرات مؤرخین اور ارباب سیرت کے بیان میں منصوبہ کا لفظ نہیں ہے۔ بلکہ ایسے الفاظ ہیں جن سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وقتی طور پر یہ حرکت ہوگئی تھی۔ مگر بالا خانہ پر بڑے پتھر کا انتظام وقتی حرکت نہیں ہوسکتی۔ اس کی تیاری پہلے سے کی گئی تھی اسی کا نام منصوبہ ہے۔

(۸۶۹) فتح الباري تحت حديث بني النضير و مخرج رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم في دية الرجلين ص ۱۶۲ ج ۷

(۸۷۰) سیرۃ حلبیہ ص ۱۶۲ ج ۷

(۸۷۱) معالم التنزیل ص ۲۷۲

(۸۷۲) ابن سعد ص ۴۰ ج ۳

(۸۷۳) بغوی وغیرہ

(۸۷۴) یاد رکھنا چاہیے کہ آیت میں دست درازی کے ارادہ کو پورے گروہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ کسی فرد کی طرف نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منصوبہ پوری جماعت بنی نضیر کا تھا۔ کسی فرد کا نہیں تھا نہ اتفاقی تھا بلکہ پہلے سے طے شدہ تھا۔

(۸۷۵) فتح الباری ص ۲۶۱ ج ۷ بحوالہ ابن مردویہ وتفسیر مظہری ص ۲۳۰ ج ۹ بحوالہ ابوداؤد۔ بیہقی وعبد بن حمید وعبد الرزاق باسناد صحیح۔

(۸۷۶) سیرۃ حلبیہ ص ۲۹۱ ج ۲

(۸۷۷) ابن جریر وابن ابی حاتم۔ تفسیر مظہری ص ۶۳ ج ۳

(۸۷۸) سیرت حلبیہ وغیرہا۔

(۸۷۹) ایضاً

(۸۸۰) طبقات ابن سعد ص ۴۱ ج ۳

(۸۸۱) ایضاً، یہ ہے سبق آموز مستعدی

(۸۸۲) قال القاضي ثناء الله المحدث المفسر۔ تحت قوله تعالیٰ ولئن قوتلوا لا ينصر ونهم فيه معجزة حيث كان الا مرفي المستقبل كذلك فان بني نضيرا اخرجوا ولم يخزرج معهم عبدالله بن ابي بن سلول ولا منافقوا قريظه و قريظة قوتلوا وقتلوا ولم ينصرهم منافقوا مدينة تفسير مظهري ص ۲۵۰ ج ۲

(۸۸۳) بمنزلة لام التوطية في لان اخرجتم۔ لنخرجن معكم على القسم كما هو معروف

(۸۸۴) ابن سعد وسیرۃ حلبیہ۔

(۸۸۵) آنحضرت ﷺ کا ہر ایک فعل اور ہر ایک قول قانون کی دفعہ سمجھا جاتا ہے اور حضرات ائمہ مجتہدین اس پر اسی طرح بحث کرتے ہیں جیسے وضع قانون کے وقت کسی دفعہ پر بحث کی جاتی ہے اور اس سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ میں آنحضرت ﷺ کے عمل سے جو اشارات ملے ان کی بنا پر امام ابوحنیفہ کا مسلک تو یہ ہے کہ تخریب یعنی باغات یا کھیت پامال کر دینا درخت کٹوا دینا یا مکانات منہدم کر دینا بلاضرورت جائز نہیں ہے۔ البتہ فتح اور کامیابی حاصل کرنے کے مقصد سے یہ تخریب جائز ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر دشمن نے ہمارے علاقہ میں اس طرح تخریب کی ہو تب جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تخریب کو مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ اگر دشمن ایسا کمزور ہو کہ کامیابی یقینی ہو تو یہ تخریب جائز نہیں ہے۔ تفسیر مظہری ص ۲۳۶ ج ۹

(۸۸۶) سیرت حلبیہ ص ۲۹۴ ج ۲

(۸۸۷) ترجمہ: جو کھجوروں کے درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو یہ خدا کے حکم کے موافق ہوا اور اس لیے کہ فاسقوں و بدکاروں کو ذلیل کرے۔

(۸۸۸) سیرت حلبیہ ص ۲۹۴ ج ۲

(۸۸۹) قال قتادة كان المسلمون يخرجون ما يليهم من ظاهرها ويخربها اليهود من باطنها (تفسير ابن جرير)

(۸۹۰) تفسیر در منثور

(۸۹۱) حلقه بسكون اللام السلاح عاماً وقيل الدروع خاصته مجمع البحار

(۸۹۲) ابن سعد ج ۳ ص ۴۰ و تفسیر ابن جریر وغیرہما

(۸۹۳) سیرت حلبیہ ۲۹۴ ج ۲

(۸۹۴) سیرت حلبیہ ص ۲۹۵ ج ۲ و طبری

(۸۹۵) سیرت ابن ہشام حسن اسلامه وهو من كبار الصحابة (الاستيعاب)

(۸۹۶) یہ ایک مشہور حدیث کے راوی بھی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے آب پاشی کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ اُوپر کے نمبر والا (کھیت یا باغ والا) نہر کے پانی کو اس وقت تک روک سکتا ہے کہ اس کے باغ (یا کھیت) میں ٹخنوں تک پانی بھر جائے۔ الاستیعاب ص ۳۲/۲۱۳، ۳۱ ان يحبس الاعلى الاسفل حتى يبلغ الماء الى الكعبين ثم يرسل الاستيعاب ص ۲۱۳، ۳۱۳۲

(۸۹۷) ابن ہشام و سیرت حلبیہ وغیرہما

(۸۹۸) بالغ ہو گئے تھے کیونکہ نابالغ بچہ ماں باپ اور دار کے تابع ہوتا ہے۔ محمد میاں

(۸۹۹) ابوداؤد شریف کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام

(۹۰۰) سیرۃ حلبیہ ص ۲۹۳ ج ۲

(۹۰۱) ماخوذ از بخاری شریف باب حدیث بنی نضیر و فتح الباری و سیرت ابن ہشام۔

(۹۰۲) طبقات ابن سعد ص ۴۰ ج ۳

(۹۰۳) ہم یعنی جماعت انبیاء کی وراثت نہیں چلتی جو ہم چھوڑ دیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

(۹۰۴) بخاری شریف ص ۸۰۶ وغیرہ۔

(۹۰۵) طبقات ابن سعد ص ۴۲ ج ۳ و ابو داؤد باب فی صفایا النبی ﷺ

(۹۰۶) المتفق عليه اللفظ لابی داؤد باب فی ارزاق الذرية

(۹۰۷) جو شخص مال چھوڑ دے وہ اس کے وارثوں کا اور جو اپنے ذمہ قرض چھوڑے یا بے زر و بے پر بچے چھوڑے جن کا کوئی سہارا نہ ہو وہ میرے حوالے ہے اور میرے ذمہ ہے۔

(۹۰۸) کفار عرب کا بھی یہی دستور تھا کہ قربانی کے جانوروں کے گلے میں ناشتہ دان یا خانہ ساز ہار یا نعل لٹکا دیا کرتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ایسے جانوروں پر چور یا ڈاکو ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔

(۹۰۹) یہ قبیلہ خزاعہ کے ایک صاحب تھے۔ مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر ان کے اسلام لانے کا حال کفار قریش کو ابھی تک معلوم نہیں ہوا تھا۔

(۹۱۰) سیرۃ ابن ہشام

(۹۱۱) ارشاد ربانی ہے انا فتحنا لك فتحًا مبیناً (سورہ فتح) بے شک ہم نے تم کو فتح دی ہے فتح مبین (کھلی ہوئی کامیابی) اور واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی وہ مٹھی بھر جماعت جو آج تک قریش کی نظر میں مقہور و مغضوب تھی، جس کے لیے ان کا ایک ہی فیصلہ تھا کہ صفحۂ ہستی سے اس کو نیست و نابود کر دیا جائے جس کو قابل التفات طاقت تصور کرنا وہ اپنی شکست تصور کرتے تھے۔ اس کے ساتھ صلح کرنے کے یہ معنی تھے کہ قریش اس کو ایک طاقت تسلیم کر رہے ہیں۔ یعنی وہ قریش جن کا فیصلہ اب تک یہ تھا کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اب وہ اس فیصلہ کو واپس لے کر اپنے عزائم اور اپنے تمام منصوبوں کی شکست کا اعتراف کر رہے ہیں۔ تم غور کرو ایک پا افتادہ کمزور جماعت کی ایجی ٹیشن کے نتیجہ میں جب ایک قہار و جبار حکومت اس احتجاج کرنے والی جماعت کے نمائندوں سے گفت و شنید کرتی ہے تو یہ اس کمزور جماعت کی بہت بڑی کامیابی اور حکومت متسلطہ کے قشون قاہرہ کی ناکامی تصور کی جایا کرتی ہے۔ اس موقع پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وہ مشہور روایت بھی نقل کی ہے جس میں اس آیت کی شان نزول بیان کیا گیا ہے روایت کا ترجمہ یہ ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین مرتبہ ایک بات دریافت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے دل میں اس کا احساس ہوا میں خود کو ملامت کرنے لگا کہ کس قدر بدنصیبی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیخاطر مبارک پر یہ بار ڈالا کہ ایسی بات جس کا آپ جواب دینا نہیں چاہتے تھے اس کو بار بار دریافت کیا۔ یہ احساس اتنا بڑھا کہ میں نے اپنی اُونٹنی کو تیز کیا اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے ہٹ کر سب کے آگے پہنچ گیا اور اب مجھے یہ فکر تھی کہ میرے بارہ میں کوئی آیت نازل ہوگی جس میں مجھے اس حرکت پر ملامت کی جائے گی۔ میں اسی تشویش میں تھا کہ دفعتاً مجھ کو آواز دی گئی۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور دل میں ڈر رہا تھا کہ میری اس گستاخی کی سرزنش کے لیے کوئی آیت نازل ہوئی ہے۔ جب میں خدمت مبارک پہنچ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے دنیا اور مافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت تلاوت فرمائی ان فتحنا لك فتحًا مبینا ہم نے تم کو فتح عطا کی ہے۔ ایسی فتح جو کھلی ہوئی فتح ہے۔ ازالۃ الخفاء ص ۲۳۶ ج ۱

(۹۱۲) **سلسلہ بیعت:** حضرت ابراہیم بن محمد بن المنتشر فرماتے ہیں بیعت کا سلسلہ اسی آیت کے نزول سے شروع ہوا۔ چنانچہ پہلی بیعت اسی موقع پر لی گئی۔ یہ بیعت خدا کے لیے ہوئی تھی یعنی ہر ایک بیعت کرنے والا اپنے نفس کو خدا کے سپرد کرتا تھا اور اس کا عہد کرتا تھا کہ وہ بہر حال ''حق'' کی اطاعت کرے گا خواہ کوئی قربانی پیش کرنی پڑے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت لی۔ آپ بیعت کے وقت فرماتے تھے ''میری اطاعت اس وقت تک ہوگی جب تک میں خود اللہ تعالیٰ کا مطیع رہوں۔ اگر میں (معاذ اللہ) نافرمانی کروں تو پھر کوئی اطاعت نہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیعت کے وقت فرمایا کرتے تھے۔ بیعت خدا کی اور اطاعت حق کی۔ انہیں الفاظ کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی بیعت لیا کرتے تھے۔

وقت بیعت: حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دوپہر کا وقت تھا اور ہم کچھ آرام کرنے لگے تھے کہ دفعتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانچی نے اعلان کیا۔ ایھا الناس البیعة نزل روح القدس اے لوگو! آؤ بیعت کرو۔ روح القدس (حضرت جبرئیل علیہ السلام) نازل ہوئے ہیں۔ ہم فوراً ہڑبڑا کر اُٹھے اور رسالت مآب جناب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوئے۔ آپ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما

تھے۔ یہیں بیعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

(۹۱۳) حضرت نافع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ لوگ اس درخت کی زیارت کے لیے جاتے ہیں تو آپ نے اُسے کٹوادیا۔

(۹۱۴) ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں جس طرح کھل کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کفار مکہ کی مخالفت کی تھی اس کی تفصیلات کتب تاریخ وسیرت میں بکثرت موجود ہیں۔ پھر ہجرت کے بعد جب غزوہ بدر میں قریش کے ستر آدمی گرفتار ہوئے تب بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سب سے زیادہ سخت تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ان سب کو قتل کردیا جائے۔ یہ روایت کتب حدیث وتاریخ میں تفصیل سے موجود ہے۔

(۹۱۵) یعنی وہ تمام غنیمتیں (جو صحابہ کرام کے بعد) آج تک حاصل ہوئیں (ابن عباس رضی اللہ عنہ) فارس وروم (عبدالرحمٰن بن ابی یعلی رضی اللہ عنہ) فتح فارس (عطیہ) اوقات کا علم نہیں۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ وحضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ)

(۹۱۶) یعنی فیصلہ کردیا ہے کہ وہ تمہیں ملیں گی۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ وحضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ)

(۹۱۷) حضرت ابن جریج فرماتے ہیں سنۃ اللہ زمانہ سابق میں یہ رہی ہے کہ جب کوئی دشمن خدا کسی نبی کے مقابلہ میں صف آرا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی گرفت میں لے کر ختم کردیا یا اتنا مرعوب کردیا کہ اس کو فرار ہونا پڑا۔ چنانچہ فتح خیبر کے موقع پر بھی ایسا ہی ہوا۔ جنگجو قبائل کے بہادر سپاہی مرعوب ہوکر فرار ہوگئے اور ان کے فرار کی جس جس قبیلہ کو خبر ہوئی وہ اپنی جگہ پر پست ہوگئے۔ ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔

حضرت ابوالاسود ویلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جب بصرہ تشریف لائے تو آپ بیت المال میں تشریف لے گئے دیکھا کہ وہ سنہرے اور سفید سکوں سے پٹا پڑا ہے تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وعدکم اللہ مغانم کثیرۃ الخ (اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے) حضرت علی رضی اللہ عنہ وبن عباس رضی اللہ عنہما دونوں سے ایک روایت ہے جس میں مغانم کثیرہ کا مصداق وہ تمام غنیمتیں اور فتوحات قرار دی گئی ہیں جو فتح خیبر کے بعد سے اب تک ہوئی ہیں اور کف ایدی الناس لوگوں کے ہاتھوں کو روکا اس طرح کہ قریش نے صلح کرلی اور اخری لم تقدروا علیہا یعنی ان کے اوقات کا علم نہیں۔

(۹۱۸) بعض روایتوں میں یارب کے بجائے لاھم ہے یہ اللھم کا مخفف ہوتا ہے۔

(۹۱۹) یہ معاہدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب اور ترانہ پڑھنے والے کے آباء کے درمیان ہوا تھا (حسن الصحابہ فی شرح اشعار اصحابہ ص ۳۱۷ بحوالہ سیرۃ المصطفیٰ ۵۲ ج ۳)

(۹۲۰) یقول قلنا وقد اسلمنا (ابن ہشام ص ۲۶۲ ج ۲)

(۹۲۱) سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۰ ج ۲

(۹۲۲) ایضاً

(۹۲۳) فتح الباری ص ۴ ج ۸

(۹۲۴) سیرۃ ابن ہشام وغیرہ

(۹۲۵) جس خوبی کے ساتھ مکہ معظمہ پر قبضہ کیا گیا کہ حرم مکہ میں خونریزی نہیں ہوئی قریش نے اپنے آپ کو بے بس پایا اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) یہ اسی رازداری کی صورت میں ہوسکا یہ کوئی دھوکا نہیں تھا بلکہ خلق خدا پر شفقت خصوصاً قریش کی خیرخواہی اور حرم مکہ کے احترام کے لیے بہت ہی ضروری منصوبہ تھا جو پوری طرح کامیاب رہا۔

(۹۲۶) مجمع الجار

(۹۲۷) جھلک کیا تھی دھمکیاں تھیں یا معشر قریش فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاء کم بجیش کاللیل یسیر کالسیل فواللہ لو جاء کم وحدہ لنصرہ وانجزلہ وعدہ فانظر والانفسکم والسلام فتح الباری ص ۴۲۰ ج ۷ البدایہ والنہایہ ص ۲۸۴ ج ۱۲ اے گروہ قریش!

رسول اللہ ﷺ تم پر ایک لشکر لے کر پہنچ رہے ہیں سمجھو کہ پہنچ چکے ہیں۔ لشکر جیسے (بربادی اور ہلاکت) کی شب تاریک سیلاب کی طرح، رواں دواں خدا کی قسم اگر رسول اللہ ﷺ تم پر تنہا ٹوٹ پڑیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے اور فتح و کامرانی کے وعدہ کو پورا فرمائے۔ اب تم خود اپنا انجام سوچ لو۔

(۹۲۸) بخاری شریف تفسیر سورہ ممتحنہ و باب فضل من شھد بدرا

(۹۲۹) حضرات علماء نے فرمایا یہ عمومی اباحت نہیں ہے کہ ہر جائز و ناجائز ان کے لیے جائز ہو گیا جو چاہیں کریں (معاذ اللہ) بلکہ یہ نشاندہی ہے ان کی قلبی کیفیت کی کہ ان کے قلوب کفر و فسق اور نفاق و شقاق سے چاک ہو چکے ہیں۔ اب ان سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو بھی جائے تو فسق و فجور یا کفر و نفاق کا کوئی جذبہ اس کا محرک نہیں ہوگا بلکہ وہ کسی ایسی کمزوری کے باعث ہوگا جو تقاضا بشریت ہے اور اس بناء پر معافی اور درگزر کے قابل ہوگا اور واقعہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں صراحت فرمادی والزمھم کلمة التقوی و کانوا احق بھا واھلھا (آیت ۲۶ سورہ فتح) (اور جمادیا ان کو تقویٰ کی بات پر چسپاں کر دیا ان پر تقویٰ کا عنوان زریں اور وہ اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں) اور ارشاد فرمایا وحبب الیکم الایمان تا والعصیان (آیت ۸ سورہ حجرات) (اللہ تعالیٰ نے تم کو صحابہ کرام کو محبت ایمان سے لبریز کر دیا اور ایمان کو تمہارے دلوں میں سجا دیا اور کفر و فسق و عصیان سے تمہارے اندر سخت نفرت اور کراہیت پیدا کر دی (آیت ۷ و ۸ سورہ حجرات) تو اب اگر ان سے ان کی شان کے خلاف کوئی فعل سرزد ہوگا تو صرف بتقاضائے بشریت ایک لغزش ہوگی یہ نہیں ہوگا کہ حکم عدولی کا کوئی جذبہ اس کے تحت میں کام کر رہا ہو۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ جو عالم مافی الصدور ہیں ایسے گناہ سے پہلے ہی درگزر فرما چکے ہیں۔ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کا جواب ملاحظہ فرمایئے گویا اسی آیت کو سامنے رکھ کر جواب دے رہے ہیں۔

(۹۳۰) بخاری شریف فضل من شھد بدراً

(۹۳۱) بروز دوشنبہ ۲۲ دسمبر ۶۲۹ء (تقویم اسلامی)

(۹۳۲) بیعت عقبہ جو انتہائی رازداری کے ساتھ ہوئی حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس وقت موجود تھے۔ آنحضرت ﷺ کی حمایت میں حضرات انصار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا محمد ﷺ اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ ہم ہمیشہ دشمنوں کے مقابلہ میں سینہ سپر رہے ہیں۔ اب بھی ان کی حفاظت سے اُکتائے نہیں ہیں۔ تم بھی اگر سر ہتھیلی پر رکھ کر ان کی مدد کر سکو تو ساتھ لے جاؤ ورنہ ابھی جواب دے دو۔

(۹۳۳) تاکہ عوام میں ہیجان نہ ہو۔

(۹۳۴) زاد المعاد ص ۴۲۲

(۹۳۵) اس مہینہ میں غزوہ طائف ہوا تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ مجاہدین اسلام میں داخل تھے۔ جہاد میں شریک ہوتے ایک آنکھ زخمی ہوئی۔ پھر غزوہ یرموک میں اس آنکھ پر ضرب آئی۔ غزوہ یرموک میں آپ مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کر رہے تھے۔ ان کی تقریر کے چند جملے کس قدر ایمان افروز ہیں۔ الله الله عباد الله انصر والله ینصر کم اللھم ھذا یوم من ایامك اللھم انصر عبادك مسلمانو! خدا سے ڈرو اے اللہ کے بندو اللہ کی مدد کرو۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اے اللہ! یہ ایک خاص معرکہ کا دن ہے یہ فیصلہ کن معرکوں میں سے ایک معرکہ ہے۔ اے اللہ! اپنے بندوں کی مدد فرما۔ سیرۃ حلبیہ ص ۱۲۹ ج ۳۔ اس کے علاوہ خود حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے دربار ہرقل کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ اس وقت دل میں کراہیت تھی پھر اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کو داخل کر دیا۔ بخاری شریف ص ۴۱۳

(۹۳۶) زاد المعاد ص ۴۲۲ والبدایۃ والنہایۃ ص ۲۹۰ ج ۴

(۹۳۷) یہ بھی روایت ہے کہ حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء بھی مکہ والوں کو آگاہ کرنے کے بعد یہاں پہنچ گئے تھے۔

(۹۳۸) چنانچہ بیر معونہ کے حادثہ میں جب حضرت حرام بن ملحان کے نیزہ لگا اور آپ گرنے لگے تو آپ نے نعرہ لگایا۔ فزت ورب

الکعبہ رب الکعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔ یعنی راہ خدا میں قربان ہونا جو مقصد تھا وہ حاصل ہوگیا۔

(۹۳۹) خانہ کعبہ کا احترام اسلام میں بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پیش نظر موجودہ کعبہ تھا جو کعبہ نہیں بلکہ صنم خانہ تھا جہاں تین سو ساٹھ بت تھے جن کی قریش پوجا کیا کرتے تھے۔ اس کو پامال کرنا ہر ایک توحید پرست کا جذبہ تھا مگر چونکہ اس سے اشتعال پیدا ہوتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصوبہ کے خلاف تھا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فقرہ کو ناپسند فرمایا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تادیب کی۔

(۹۴۰) رمضان شریف میں قریش نیا غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ ارشاد گرامی کا اشارہ یہ ہے کعبہ کی عظمت بڑھ چڑھ کر ہوگی۔ حسب دستور اس پر غلاف چڑھایا جائے گا اور اس سال یہ خدمت مسلمان انجام دیں گے۔ (فتح الباری) اور ممکن ہے تاریخ سابق کی طرف اشارہ ہو کہ تبع یمن مکہ پر حملہ کرنے کے لیے آیا تھا مگر کچھ دانش وروں کے سمجھانے سے ایسا متاثر ہوا کہ حملہ کرنے کے بجائے مکہ معظمہ میں عقیدت مندوں کی طرح داخل ہوا۔ خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کی بجائے اس پر غلاف چڑھایا اور اس وقت سے غلاف چڑھانے کا طریقہ رائج ہوا۔ (واللہ اعلم)

(۹۴۱) اس واقعہ سے جس طرح نظام کی مضبوطی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جرأت مندانہ سیاست کا پتہ چلتا ہے ساتھ ساتھ غیر معمولی شفقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ تادیب ہم آغوش دلداری ہے۔

(۹۴۲) فتح الباری ص۸ ج۸

(۹۴۳) فتح الباری ص۸ ج۸

(۹۴۴) سیرۃ حلبیہ ص۹۶ ج۳

(۹۴۵) بخاری شریف میں۳۷۴ مسلم شریف و بدایۃ ونہایہ ص۳۰۰ ج۴

(۹۴۶) اس سے نماز چاشت کا استحباب بھی ثابت ہوتا ہے اور نماز فتح کا بھی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھی فتح مدائن کے بعد ایوان کسریٰ میں داخل ہو کر آٹھ رکعتیں پڑھی تھیں۔ البدایہ والنہایہ ص۳۰۰ ج۱

(۹۴۷) بخاری شریف میں۳۷۴ مسلم شریف والبدایۃ النہایہ ص۳۰۰ ج۴

(۹۴۸) زادالمعاد ص۴۲۴ ج۱

(۹۴۹) البدایہ والنہایہ ص۳۰۱ ج۲

(۹۵۰) یاد رکھنا چاہیے کہ اس خطبہ عالیہ کا پس منظر وہ واقعات ہیں جو اس لشکر کشی کا سبب بنے تھے۔ بنوبکر، بنوخزاعہ میں عرصہ دراز سے قصاص اور قصاص در قصاص کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔ اسی طویل سلسلہ کی کڑی اس وقت کا یہ واقعہ تھا کہ بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کیا۔ پھر ایک تصور یہ تھا کہ قبائل کے درجات میں بڑے درجہ کے قبیلہ کا کوئی آدمی مارا جاتا تو اس کے قصاص میں چھوٹے قبیلہ کے کئی کئی آدمی قتل کیے جاتے اسی طرح خون بہا میں بھی فرق ہوتا تھا۔ چنانچہ بنوبکر کے حامیوں میں بنوالاسود ابن رزن تھے۔ بنوالاسود کا کوئی آدمی مارا جاتا تو اس کا خون بہا دوچند ہوتا تھا۔ اس فقرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماضی کے ان تمام فتنہ انگیز سلسلوں کو ختم کر دیا۔ یعنی ماضی میں جو بھی قتل ہوا اب اس کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح آپ نے خود اپنے حلیف بنوخزاعہ کو ٹھنڈا کر دیا کہ وہ اب بنوبکر سے ان مظالم کا کوئی بدلہ یا قصاص نہیں مانگ سکیں گے جو حال ہی میں کیے تھے۔ جب بنوبکر نے بنوخزاعہ پر شب خون مارا تھا۔

(۹۵۱) ارشاد گرامی کا منشا یہ ہے کہ قتل کی تو قسمیں ہوں گی مثلاً ایک قسم قتل خطا ہے جیسے کسی انسان کو شکاری جانور سمجھا اور اس پر تیر چلا دیا جس سے وہ مر گیا یا کسی بے دھار چیز سے جیسے لاٹھی یا کوڑا کسی کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔ اس کو "شبہ عمد" کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی نوعیت کی بنا پر قتل کے احکام علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ ان کی سزائیں علیحدہ علیحدہ ہوں گی مگر یہ احکام سب کے لیے یکساں ہوں گے۔ مثلاً مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں دیت مغلظہ لازم ہوگی تو وہ سب کے لیے یکسان ہوگی کسی کے لیے دوگنی یا تین گنی نہیں ہوگی خواہ کوئی چھوٹا ہو یا بڑا

کالا ہو یا گوڑا۔

(۹۵۲) البدایۃ والنہایۃ ص ۳۰۱ ج ۴

(۹۵۳) ایضاً ص ۳۰۴ ج ۴

(۹۵۴) (روض الانف ص ۲۷۶ ج ۲ (بحوالہ سیرۃ المصطفیٰ)

(۹۵۵) ص ۳۰۶، ۳۰۷ ج ۴ البدایۃ والنہایۃ

(۹۵۶) البدایۃ والنہایۃ ص ۳۲۲ ج ۴

(۹۵۷) عجیب بات یہ ہے کہ اس قیاس کی تائید آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے ہوئی ہے جس کے الفاظ بھی یہی ہیں لن یغلب اثنا عشر الفامن قلة ترمذی شریف باب السرایا یعنی بارہ ہزار تعداد کی کمی کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔ البدایۃ والنہایۃ ص ۳۳۲ ج ۴

(۹۵۸) چنانچہ جس طرح غزوہ بدر میں آنحضرت ﷺ نے مٹی کی ایک مٹھی اُٹھا کر پھینکی جس کا گرد ہر ایک دشمن کی آنکھ میں پہنچا اس طرح جنگ حنین میں بھی آپ ﷺ نے ایک مشت خاک اُٹھا کر "شاہت الوجوہ" فرماتے ہوئے پھینکی جس سے دشمن فوج کے ہر فرد کا چہرہ اور اس کی آنکھیں گرد آلود ہو گئیں اور وہ بھاگنے پر مجبور ہوا۔

(۹۵۹) سیرۃ ابن ہشام وغیرہ

(۹۶۰) سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹۲ ج ۱

(۹۶۱) بخاری شریف ص ۶۱۷

(۹۶۲) جب آنحضرت ﷺ خواجہ عبد المطلب کی کفالت میں تھے تو اگر چہ ابھی سن مبارک چھ سات سال تھا مگر پیشانی پر آثار عظمت نمایاں تھے۔ خواجہ المطلب کہا کرتے تھے میرا یہ بچہ بڑی عظمت کا مالک ہوگا۔ خواجہ عبد المطلب کی یہ پیشین گوئی قریش اور قریش سے تعلق رکھنے والے قبائل میں مشہور تھی۔ اس موقع پر ان قبائل کو یہی پیشین گوئی یاد دلائی جا رہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

(۹۶۳) جب آنحضرت ﷺ خواجہ عبد المطلب کی کفالت میں تھے تو اگر چہ ابھی سن مبارک چھ سات سال تھا مگر پیشانی پر آثار عظمت نمایاں تھے۔ خواجہ المطلب کہا کرتے تھے میرا یہ بچہ بڑی عظمت کا مالک ہوگا۔ خواجہ عبد المطلب کی یہ پیشین گوئی قریش اور قریش سے تعلق رکھنے والے قبائل میں مشہور تھی اس موقع پر ان قبائل کو یہی پیشین گوئی قریش اور قریش سے تعلق رکھنے والے قبائل میں مشہور تھی اس موقع پر ان قبائل کو یہی پیشین گوئی یاد دلائی جا رہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

(۹۶۴) ابن ہشام وغیرہ

(۹۶۵) ابن اسحاق بحوالہ البدایہ والنہایہ ص ۳۴۷ ج ۴

(۹۶۶) واقدی کی روایت ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے منجنیق کا مشورہ دیا تھا اور خود بنایا تھا یا خیبر یا کسی اور مقام سے مل گیا تھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اس کو درست کیا تھا۔ بدایہ ونہایہ ص ۳۴۸ ج ۴ سیرۃ حلبیہ ۱۳۳ ج ۳ ابن ہشام کا بیان ہے کہ اہل طائف نے بھی یہ آلات فراہم کر لیے تھے اور عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمہ نے "جرش" جا کر ان کے بنانے اور چلانے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ص ۳۱۲ ج ۲ جرش یمن کا ایک مرکزی شہر تھا۔ (معجم البلدان)

(۹۶۷) سیرۃ حلبیہ ص ۱۳۲

(۹۶۸) سیرت حلبیہ ص ۱۳۱۲ ج ۳

(۹۶۹) سیرۃ ابن ہشام ص ۳۱۴ ج ۲

(۹۷۰) بکر، چرخی کو کہتے ہیں یہ چونکہ چرخی کے سہارے اُتر کر آئے تھے اس لیے ان کا نام ابو بکرہ پڑ گیا۔ اصل نام حارث بن کلدہ تھا۔ (حلبیہ ۱۳۲ ج ۳)

(۹۷۱) بخاری شریف ص ۶۱۹

(۹۷۲) ابن اسحاق بدایہ ونہایہ ص ۳۵۰ ج ۴

(۹۷۳) ایک تجربہ کار صاحب الرائے تھے ساٹھ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے۔ مسلمان ہونے کے بعد بھی ساٹھ سال عمر پائی۔ یزید کے زمانہ خلافت میں تقریباً ایک سو بیس سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ (الاستیعاب)

(۹۷۴) واقدی بحوالہ بدایہ ونہایہ ص ۳۵۰ ج ۴

(۹۷۵) ابن ہشام ۳۱۷ ج ۲

(۹۷۶) یہ وہی عروہ بن مسعود ہیں جن کی عظمت قریش میں یہاں تک مسلم تھی کہ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو پیغمبر بنا کر اس پر قرآن نازل کرنا تھا تو مکہ کے کسی بڑے سردار یا طائف کے رئیس اعظم عروہ بن مسعود پر نازل کرتا (سورہ زخرف) اس وقت یہ مسلمان ہوئے اور اس عزم کے ساتھ کہ اپنے اثر کو کام میں لا کر لوگوں کو راہِ راست پر لائیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ آپ کا بہت خطرناک اقدام ہوگا۔ حضرت عروہ کو اپنی مقبولیت اور اپنے اثر رسوخ پر یہاں تک اعتماد تھا کہ آنحضرت ﷺ کو اطمینان دلایا کہ لوگ مجھ کو اپنی آنکھوں سے زیادہ محبوب سمجھتے ہیں۔ انا احب الیھم من ابصارھم لیکن ہوا وہی جو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا انہوں نے جا کر لوگوں کو دعوتِ اسلام دی۔ اس وقت تک عوام میں اشتعال تھا۔ لوگوں نے ان کو شہید کر دیا۔ (الاستیعاب)

(۹۷۷) سیرۃ حلبیہ

(۹۷۸) بخاری شریف وغیرہ وسیرۃ حلبیہ ص ۱۳۵ ج ۳

(۹۷۹) بخاری شریف وفتح الباری باب غزوۃ الطائف

(۹۸۰) فتح الباری ص ۲۷ ج ۸

(۹۸۱) یہ انفرادی ملکیت کا احترام ہے۔ اسی بناء پر امیر یا خلیفہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا آرڈیننس جاری کرے جس سے انفرادی ملکیت ختم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

(۹۸۲) یعنی قبیلہ یا محلہ کے معاملات کا نگران (قیم) اس کا رابطہ حاکم بالا سے ہوتا تھا (مجمع البحار) اس طرح کا نظام قائم تھا۔

(۹۸۳) بخاری شریف ص ۳۱۹ ص ۳۴۵ وغیرہ

(۹۸۴) کنتم علی شفا حفرۃ من النار فانقذکم منھا آل عمران ۱۰۳

(۹۸۵) اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر (سورہ حج ع ۶)

(۹۸۶) چونکہ مقصود اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا اظہار ہے اس لیے معاملہ کو اپنی طرف سے شروع کیا نہ کہ بیچنے والوں کی طرف سے یعنی یہ نہیں کہا کہ مومنوں نے بیچ ڈالی بلکہ یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے خرید لی۔ خریدار طالب ہوا کرتا ہے گویا کہ معاملہ کا طالب وہ تھا۔ حالانکہ ہر طرح کی طلب واحتیاج سے وہ منزہ ہے اور جو متاع اس نے قبول کی وہ بھی اسی کی تھی اور جو معاوضہ بخشا وہ بھی اسی کا۔ مگر یہ ایک اعزاز ہے جو اہل ایمان کو حاصل ہے۔